کلیاتِ ابراہیم یوسف

(جلد سوم)

(ترتیب، ترجمہ اور دیگر مضامین)

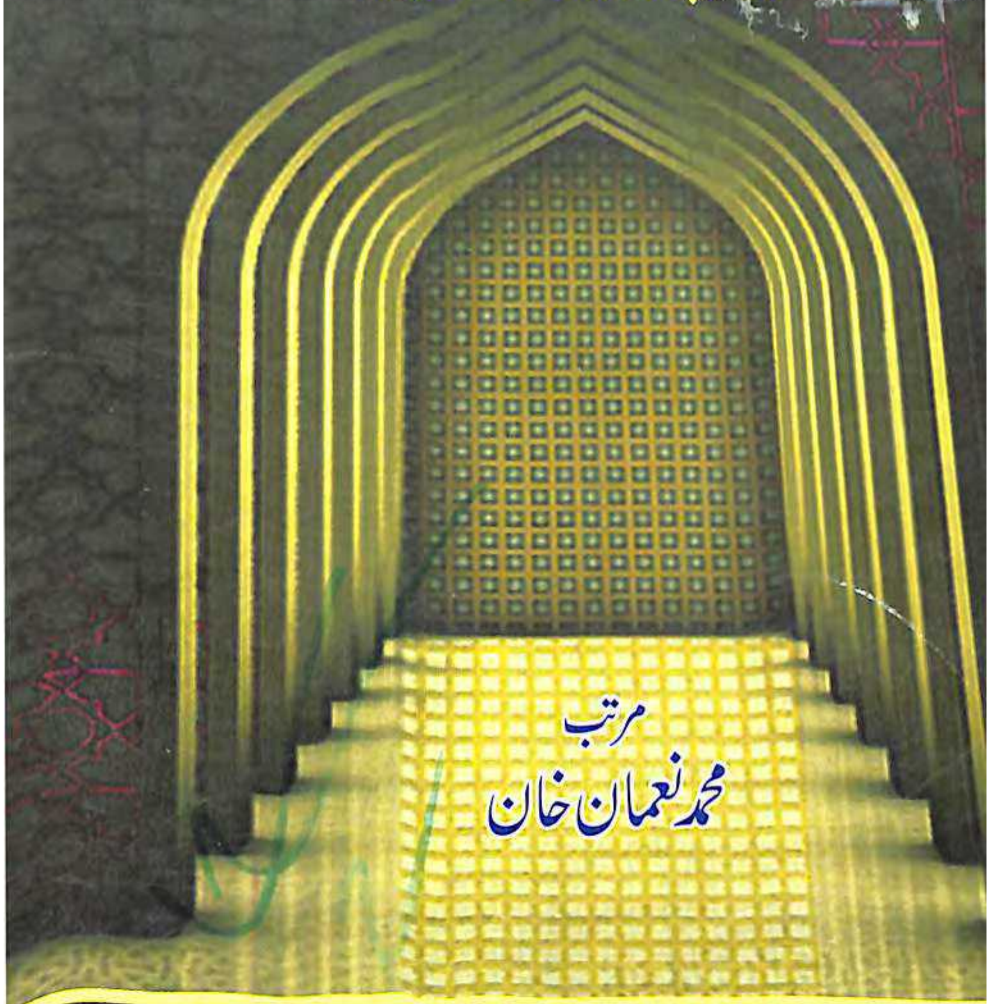

مرتب
محمد نعمان خان

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

1 A

کلیاتِ ابراہیم یوسف

(جلد اول)

(ڈرامے)

مرتب

محمد نعمان خان

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

وزارت ترقی انسانی وسائل، حکومت ہند

فروغ اردو بھون، FC-33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا، جسولہ، نئی دہلی۔110025

© قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

پہلی اشاعت : 2015
تعداد : 550
قیمت : -/1343 روپے (مکمل سیٹ)
سلسلۂ مطبوعات : 1836

Kulliyat-e-Irbaheem Yousuf Vol. 1
(Dramey)
Compiled by: Mohd. Nauman Khan

ISBN: 978-93-5160-072-5

ناشر: ڈائرکٹر، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، فروغ اردو بھون، FC-33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا، جسولہ، نئی دہلی 110025، فون نمبر: 49539000، فیکس: 49539099
شعبۂ فروخت: ویسٹ بلاک-8 آر۔ کے۔ پورم، نئی دہلی-110066
فون نمبر: 26109746، فیکس: 26108159
ای۔میل: urducouncil@gmail.com، ویب سائٹ: www.urducouncil.nic.in
طابع: لاہوتی پرنٹ ایڈز، جامع مسجد دہلی۔ 006 110
اس کتاب کی چھپائی میں (70GSM, TNPL Maplitho (Top کاغذ استعمال کیا گیا ہے۔

پیش لفظ

انسان کا اجتماعی شعور صدیوں کو محیط ہے۔ اظہار کے سانچوں پر قابو پانے میں صدیاں لگی ہیں۔ اظہار کے لسانی سانچے پر عبور پانا معجزے سے کم نہیں۔ زبان حقیقت سے مجاز تک کا نہایت بامعنی سفر ہے۔ مجاز کے توسط سے اشارے حقیقت کی ترسیل ہیں۔ مفروضے سے مفروضے کی منازل مشاہدے سے تجربے کی منزل ہے جو پیچیدگی سے آسانی کی طرف لے جاتی ہے۔ فکر سے اظہار اور اظہار سے تحریر کے مراحل میں رد و قبول کا سلسلہ جاری رہتا ہے۔ جذبے، احساسات اور اشیا کی شناخت کے لیے لفظیات کا انتخاب اور ان کی قبولیت کے لیے زمانہ درکار ہوتا ہے۔ زبان عمرانی، معاشرتی اور تہذیبی مظہر ہے۔ ایک دن میں زبان بنتی ہے نہ قواعد۔ نطق سے اظہار تک کا سفر صدیوں پر مشتمل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس میں پیچیدگی اور تنوع پایا جاتا ہے۔ زبان نامیاتی حقیقت ہے۔ اسی لیے نئے نئے سیاق میں ظاہر ہوتی ہے۔ ہر لفظ معنوی امکانات میں ایک سے زائد سیاق رکھتا ہے۔ ہر لفظ اپنے ساتھ مختلف تصورات لے کر ظاہر ہوتا ہے لیکن اس کی سادہ اور مجرد، دونوں صورتیں ممکن ہیں۔ ہر لفظ اپنی تخلیق کے بعد جب کچھ زمانی عرصہ گزار لیتا ہے تو اس کے معنوی حدود متعین ہو جاتے ہیں اور اس کی سند لغت فراہم کر دیتا ہے۔ اردو نے اپنا

ادبی سفر شروع کیا تو تحریر بھی اسے محفوظ کرتی گئی اور آج اردو کتابوں کے عظیم ذخیرے پر ہم فخر کرتے ہیں۔

اردو میں مختلف علوم وفنون کی کتابوں کو منتقل کرنا اور معیاری تحریروں کو پکی روشنائی عطا کرکے اردو حلقوں تک پہنچانا ہماری اہم ذمہ داری ہے۔ کونسل نے متنوع موضوعات پر کافی کتابیں شائع کی ہیں۔ کلیات ابراہیم یوسف کی اشاعت بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ یہ کتاب کلیات ابراہیم یوسف کے ڈراموں کی کلی ادبی شخصیت اور ادبی کارناموں سے دلچسپی رکھنے والوں کے لیے ایک قیمتی تحفہ ہوگی۔ خوشی ہے کہ کونسل نے ایک اہم ذخیرے کو محفوظ کرلیا ہے۔ امید ہے کونسل کی دیگر مطبوعات کی طرح اس کتاب کی بھی خاطر خواہ پذیرائی ہوگی۔

ڈاکٹر خواجہ محمد اکرام الدین

(ڈائرکٹر)

فہرست

○ مقدمہ: محمد نعمان خاں ix

سوکھے درخت

○ ایک کہانی 3

1. لاش کے گرد 5

2. ایڈیٹ 19

3. خون کی بوندیں 39

4. رات کی کہانی 51

5. چمگادڑیں 69

6. سوکھے درخت 91

طنزیہ ڈرامے

1. حیوان 107

2. بزدل 123

3. شاہدہ 139
4. وہ ایک نرس تھی 159
5. گونگے کے خواب 177
6. جمہور کے ابلیس 189
7. بیگم صاحبہ 207
8. مقابلے اور فیصلے 225
9. مرکز کی طرف 241
10. چھ سال بعد 257
11. دم خم 269
12. ایک حمام میں 283

دھوئیں کے آنچل

○ ایک عرض 309
1. وقت کے کراہتے رنگ 311
2. دھوئیں کے آنچل 349
3. کاغذ کی دھجی 411
4. زبیدہ 461
5. مغلوب غالب 489
6. نقلی خوشیاں اصلی چہرے 505

پانچ چھے ڈرامے

○ یہ ڈرامے 527
1. ٹوٹے ہوئے خوابوں کا درماں 529

2.	ڈاکٹر تمکین کی اُلجھن	545
3.	دہکتے انگارے گرتی برف	559
4.	اندھیری رات کا جگنو	573
5.	اُداس راہی، اُداس راہیں	587
6.	ایک پہیلی	601

اُداس موڑ

○	چاند کے سنگ ریزے	619
1.	پیرول پر رہائی	621
2.	افشاں یا نور افشاں	637
3.	موت سے پہلے آدمی	649
4.	تصویر اور جھوٹ	665
5.	تمانچا	677
6.	خطوط کی واپسی	693
7.	قدم قدم اُداس موڑ	705

مقدمہ

اردو کے معروف ڈراما نگار اور ادیب ابراہیم یوسف کا اصل نام محمد ابراہیم خاں، اور والد کا نام محمد یوسف خاں تھا۔ وہ 15 مئی 1925 کو بھوپال کے ایک معزز پٹھان خاندان میں پیدا ہوئے۔ ابراہیم یوسف کا آبائی پیشہ سپہ گری تھا۔ ان کے آبا و اجداد سترھویں صدی عیسوی میں افغانستان سے ہندوستان آئے اور بھوپال میں سکونت پذیر ہوکر ریاستی فوج میں ملازم ہوگئے۔ ابراہیم یوسف کی ابتدائی تعلیم حسب معمول گھر پر ہی ہوئی۔ انھوں نے ثانوی تعلیم الیگزینڈرا اسکول بھوپال میں مکمل کی۔ 1945 میں کرسچن کالج، اندور سے بی اے پاس کیا پھر وکرم یونیورسٹی اجین سے سیاسیات اور اردو ادب میں ایم اے اور علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے بی، ایڈ کی اسناد حاصل کیں۔ حصولِ تعلیم کے بعد مدھیہ پردیش کے محکمۂ جنگلات کے اکاؤنٹس کے دفتر میں ملازمت اختیار کی لیکن ادبی مزاج کا حامل ہونے کے سبب اس ملازمت کو خیرباد کہہ کر بہ حیثیت استاد، محکمۂ اسکولی تعلیمات، حکومت مدھیہ پردیش سے وابستہ ہوگئے اور پرنسپل کے عہدے سے سبکدوش ہوئے۔ مختصر علالت کے بعد 30 اکتوبر 1999 میں بھوپال میں ان کا انتقال ہوا اور یہیں تدفین عمل میں آئی۔

ابراہیم یوسف کو مطالعے کا شوق بچپن سے تھا۔ بھوپال کے ادبی ماحول نے ان کے

ادبی ذوق کو جلا بخشی۔ طبیعت نثر نگاری خصوصاً فکشن کی جانب مائل تھی اس لیے زمانۂ طالب علمی ہی میں کالج کی رومانوی زندگی سے متعلق ایک افسانہ 'فاختہ' (مطبوعہ حمیدیہ کالج میگزین) سے اپنی ادبی زندگی کا آغاز کیا۔ ابتدا میں ابراہیم بھوپالی بی اے کے نام سے لکھتے اور چھپتے تھے پھر ابراہیم یوسف کے نام سے لکھنے لگے اور یہی قلمی نام ان کی ادبی شناخت بن گیا۔ نوجوانی ہی میں وہ ترقی پسند ادبی تحریک سے وابستہ ہوگئے تھے اس لیے ابتدا ہی سے ان کی تحریروں میں ترقی پسند نظریات کا عکس دکھائی دیتا ہے۔

ابراہیم یوسف کی افسانہ نگاری کا ابھی آغاز ہی تھا کہ بھوپال کے مشہور شاعر اور کلامِ غالب کے معروف شارح، سہا مجددی کے مشورے پر 1943 میں انھوں نے ڈراما 'بہشت ارضی' تحریر کیا۔ سہا مجددی کی حوصلہ افزائی اور اپنی طبیعت کی مناسبت کے سبب انھیں ڈراما نگاری ایسی راس آئی کہ وہ ہمیشہ کے لیے اسی کے ہو رہے اور تمام عمر ڈراما نگاری میں صرف کردی۔ مختلف موضوعات پر انھوں نے 250 سے زیادہ ڈرامے تحریر کیے جن میں تقریباً 25 ڈرامے پورے وقت یعنی Full length کے ہیں اور بقیہ تمام یک بابی ہیں۔ ابراہیم یوسف کے تحریر کردہ کئی ڈرامے ہند و پاک کے موقر ادبی جرائد میں شائع ہو چکے ہیں۔ حسب ذیل سات مجموعے کتابی صورت میں شائع ہوئے ہیں:

1. سوکھے درخت	مکتبۂ افکار، بھوپال	1952
2. طنزیہ ڈرامے	نسیم بک ڈپو، لکھنؤ	1974
3. دھوئیں کے آنچل	نسیم بک ڈپو، لکھنؤ	1976
4. پانچ اچھے ڈرامے	نئی آواز، نئی دہلی	1978
5. اداس موڑ	نئی آواز، نئی دہلی	1983
6. الجھاوے	نئی آواز، نئی دہلی	1990
7. پرچھائیوں کا پیچھا	مدھیہ پردیش اردو اکادمی، بھوپال	1990

اردو ڈرامے کی روایت قدیم اور وقیع ہے لیکن ایسے ڈراما نگار بہت کم ہیں جنھیں خالصتاً ڈراما نگار کہا جاسکے۔

ابراہیم یوسف بنیادی طور پر ڈراما نگار ہیں لیکن انھوں نے ڈراموں کے علاوہ ایک ناول 'آبلے اور منزلیں' (1952) اور کئی تحقیقی، تنقیدی، تاثراتی مضامین، تبصرے، پیش لفظ بھی تحریر کیے ہیں۔ رومانیہ کے معروف ڈراما نگار 'یان لُیوکا کرجیکل' کا ڈراما 'Lost Letter' کا اردو ترجمہ 'گم شدہ خط' کے نام سے 1978 میں شائع کیا۔ سید ابوالفضل الفیاض کا تحریر کردہ اردو کا قدیم تاریخی ڈراما 'صولت عالمگیری' مرتب کیا اور اس پر ایک مبسوط مقدمہ تحریر کر کے 1976 میں شائع کیا۔

ابراہیم یوسف کا مطالعہ وسیع تھا۔ ڈرامے کے فن اصول، تکنیک، ارتقا اور موضوعات و مسائل پر ان کی گہری نگاہ تھی۔ وہ محض ڈراما نگار ہی نہ تھے۔ ڈرامے کے سچے عاشق، محقق، مبصر، مترجم اور نقاد بھی تھے۔ ڈراما نگاری کے فن کے اصول، تکنیک، اقسام اور ارتقا سے متعلق انھوں نے نہ صرف کئی مضامین تحریر کیے بلکہ درج ذیل کتابیں بھی تصنیف و تالیف کیں:

1. اندرسبھا اور اندرسبھائیں، مطبوعہ نسیم بک ڈپو، لکھنؤ 1980
2. اردو کے اہم ڈراما نگار (متقدمین) مالوہ پبلشنگ ہاؤس، بھوپال، 1981
3. اردو کے اہم ڈراما نگار (متوسطین) مالوہ پبلشنگ ہاؤس، بھوپال، 1984
4. اردو کے اہم ڈراما نگار (آغا حشر)، مالوہ پبلشنگ ہاؤس، بھوپال، 1982
5. ہندی ڈرامے کا ارتقا، مدھیہ پردیش اردو اکادمی، بھوپال، 1985
6. اردو ڈرامے کی تنقید کا جائزہ، مکتبہ جامعہ، نئی دہلی 1994

ابراہیم یوسف کے کئی ڈرامے ہندی اور دیگر زبانوں میں ترجمہ کیے گئے اور مختلف شہروں میں اسٹیج بھی کیے گئے۔ ان کے بعض ڈرامے مدھیہ پردیش ایس سی ای آر ٹی، این سی ای آر ٹی (نئی دہلی) اور مختلف ریاستی سرکاروں کے محکمۂ اعلیٰ تعلیمات کی نصابی کتابوں میں شامل ہیں۔ ابراہیم یوسف کی شخصیت، ڈراما نگاری اور طویل ادبی خدمات سے متعلق بمبئی یونیورسٹی، حیدرآباد یونیورسٹی اور اندور یونیورسٹی نے ریسرچ اسکالرس کو پی ایچ ڈی کی اسناد تفویض کیں۔ بیشتر ناقدین و محققین نے ان پر مضامین تحریر کیے ہیں۔ کئی اخبارات اور رسائل نے خصوصی گوشے شائع کیے اور مختلف نجی اور سرکاری اداروں نے ان کے اعزاز میں خصوصی

جلسے/سیمینار منعقد کر کے ان کی خدمات کا اعتراف کیا۔

ابراہیم یوسف کی طویل اور مسلسل ادبی خدمات کے اعتراف میں حکومتِ مدھیہ پردیش نے انھیں 'اقبال سمان' غالب انسٹی ٹیوٹ (نئی دہلی) نے 'غالب ایوارڈ' اور مدھیہ پردیش اردو اکادمی نے کل ہند 'میرتقی میر اعزاز' سے اعزازیاب کیا اور کئی ریاستی اردو اکادمیوں نے ان کی کتابوں پر نقد انعامات بھی دیے۔

ڈراما ایک قدیم صنفِ ادب ہے۔ عالمی ادب کے کئی آفاقی شاہ کار ڈرامے کی صورت میں ہی پیش کیے گئے ہیں۔ یونان اور ہندوستان ڈرامے کے اہم، قدیم مرکز رہے ہیں۔ یونان میں اگر ارسطو نے اپنی تصنیف بوطیقا (Poetics) میں یونانی ڈرامے کے اجزا اور اصول مرتب کر کے پہلی بار پیش کیے تو بھرت منی نے ہندوستانی ناٹک کے اصول وفن پر پہلی کتاب 'ناٹیہ شاستر' تصنیف کی۔ ہندوستانی ناٹک کا جنم مذہبی ماحول میں ہوا، وہ دیوی دیوتاؤں کی آغوش میں پروان چڑھا لیکن جوں جوں حالات تبدیل ہوتے گئے زندگی اور سماج کے مختلف النوع مسائل و معاملات ہندوستانی ڈرامے کا موضوع بننے لگے۔ موجودہ اردو ڈراما 'رام لیلا'، 'کرشن لیلا'، 'یاترا'، 'راس'، 'نوٹنکی'، 'سوانگ' اور اندر سبھاؤں سے ہوتا ہوا 'فارس'، 'براسک'، 'نکڑ ناٹک'، 'کل وقتی' (full length) 'یک بابی' اور ریڈیو ڈراما، ٹی وی ڈراما کی صوت میں تدریجی ارتقا کے سفر کی جانب گامزن ہے۔

عصرِ حاضر میں ڈرامے کے آخرالذکر تینوں اقسام بے حد مقبول ہیں۔ اردو کے بیشتر ڈراما نگاروں نے انھیں اقسام میں اپنی فنکارانہ صلاحیتوں کے جوہر دکھائے ہیں۔

یک بابی ڈراما کے تعلق سے ابراہیم یوسف کا نام خاص اہمیت کا حامل ہے۔ اردو ڈرامے کے معروف محقق و نقاد ڈاکٹر فصیح احمد صدیقی نے ان کے متعلق اپنی کتاب 'اردو یک بابی ڈراما' میں لکھا ہے:

> "اردو یک بابی ڈرامے کے ضمن میں صرف اتنا کہا جاسکتا ہے کہ کبھی کبھی یہ محسوس ہوتا ہے کہ ابراہیم یوسف پر جنات کا سایہ ہے۔"

ڈاکٹر ظ انصاری نے محمد خالد عابدی کے نام اپنے خط مورخہ 30اگست، 1985 میں لکھا تھا:

''ابراہیم یوسف جس شخص کا نام ہے وہ بڑے جیوٹ کا آدمی ہے۔ جب بھوپال اور گرد و نواح میں اسٹیج کے فن کا پوچھنے والا کوئی نہیں تھا تب ابراہیم یوسف نے ڈرامے کو اوڑھنا بچھونا بنایا۔ غزلچیوں کے اس گھونسلے میں جس نے کبھی ایک سے ایک اہلِ علم اور اہلِ قلم جما تھا یا اپنایا تھا (نواب صدیق حسن خاں سے لے کر ابوسعید بزمی اور مہدی جعفر تک) وہاں اس دلیر شخص نے ڈرامے پر کام ہی نہیں کیا، ڈرامے لکھے بھی..... سن لیجیے کہ ابراہیم یوسف کو نہ صرف یہ کہ اردو کی پوری ڈرامائی کائنات کا علم ہے بلکہ وہ خود پلے رائٹر ہے۔''

ابراہیم یوسف سے متعلق ظ انصاری کی مذکورہ بالا رائے جہاں حرف بہ حرف درست ہے وہیں معروف فکشن نگار کوثر چاند پوری مرحوم کی یہ رائے بھی 'ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات' کے مصداق مبنی بر حقیقت ہے جو انھوں نے ابراہیم یوسف کے ڈراموں کے پہلے مجموعے 'سوکھے درخت' (1952) کے مطالعے کے بعد اپنے مقالے 'ابراہیم یوسف' مطبوعہ ماہنامہ 'نیرنگ خیال' (پاکستان) میں تحریر کی تھی۔ وہ لکھتے ہیں:

''ترقی پسند ڈرامے کی سرگزشت اتنی طویل، حیرت انگیز اور حیات پرور نہیں جتنی افسانہ اور نظم کی ہے۔ ان حالات میں اگر کوئی نیا ڈراما نگار درمیان میں آئے تو ہمیں خوش آمدید کہنے کے لیے تیار رہنا چاہیے۔ اس وقت میں ایسے ہی ایک فنکار کا خیرمقدم کر رہا ہوں جس کی شہرت کا آفتاب ابھی ابھی 'سوکھے درخت' کی چوٹی پر طلوع ہوا ہے۔ میرا اشارہ بھوپال کے ہونہار نوجوان آرٹسٹ ابراہیم یوسف کی طرف ہے... جب اس کی کتاب 'سوکھے درخت' کوہستانی آبشار کا سا حسن اور اس کی روانی سے ملتی جلتی موسیقی بکھیرتی پریس سے نکلی

اور میں نے اسے پڑھا تو محسوس ہوا کہ ابراہیم مجھ سے دور نہیں بہت قریب ہے۔ وہ اپنے فن میں گھل مل کر میرے احساس پر چھا گیا ہے اور یہی فنکار کا حسن ہے، یہی اس کا خلوص ہے... ابراہیم ترقی پسندی کے بارے میں کسی غلط فہمی یا متضاد نظریے کا شکار نہیں۔ اس سلسلہ میں اس کا تصور بہت صاف، واضح اور صحت مند ہے۔ بدچلنی کا نام ترقی پسندی نہیں ہے۔ ترقی پسندی کی اخلاقی قدریں بہت وسیع ہیں۔ ابراہیم کے ڈراموں کا پلاٹ بہت صاف اور سادہ ہوتا ہے۔ ڈرامائی ترتیب نہایت حسین ہوتی ہے اور پیرایۂ اظہار بھی عمدہ ہوتا ہے... انجام میں کہیں کہیں استعجاب کی تکنیک بھی پائی جاتی ہے لیکن محض تکنیک کی خاطر وہ سطحیت، اور کھوکھلے پن کا شکار نہیں ہوتا، نہ ہی سرسری رومانیت میں الجھتا ہے۔ بلکہ ڈرامے کو کامیاب، موثر اور کامل طور پر زندگی اور ماحول سے ہم آہنگ بنانے کے لیے وہ پوری چابک دستی کے ساتھ اپنے ذہن میں فراہم کیے مواد کو ایک عمدہ اور خوبصورت تخلیق کے سانچے میں ڈھال دیتا ہے اور اس کی ذہنی تخلیقات میں جگہ جگہ تاج محل کے نقوش ابھر آتے ہیں۔ وہ مختلف واقعات بیان کرتا ہے، کرداروں میں بھی نمایاں تضاد دکھاتا ہے لیکن ڈراما وحدتِ تاثر کے مرکزی نقطے سے اِدھر اُدھر نہیں ہونے پاتا... زبان کی سادگی، سلاست، روانی اور برجستگی نے اس کے فن میں بڑی جان ڈال دی ہے۔ زبان ماحول کے ساتھ ساتھ یوں بدلتی جاتی ہے جیسے چلتی ریل کے ساتھ مناظر تبدیل ہوتے رہتے ہیں... ابراہیم یوسف سوسائٹی کی سڑی ہوئی لاش میں کلبلاتے ہوئے کیڑے احساس کی خوردبینی طاقتوں سے دیکھتا ہے اور اس کے شعور میں نفرت پھیل جاتی ہے۔ ہر کیڑے کو وہ اس ایٹم بم سے زیادہ مخدوش خیال کرتا

ہے جس نے ہیروشیما کو جلا کر راکھ کر دیا تھا۔ وہ بیماری کے ان بھیانک
جراثیم سے خود بھی دامن بچاتا ہے اور دوسروں کو بھی محفوظ رکھنے کی
کوشش کرتا ہے۔ کسی موقعے پر بھی اس نے کوئی وعظ نہیں کیا لیکن
گندے ماحول کی ایسی مکمل تصویر ہر جگہ کھینچ دی ہے جس کو دیکھتے
ہی قاری کے ذہن میں اجتناب اور احتیاط کا جذبہ جاگ اٹھتا ہے۔"

یہ حقیقت ہے کہ شاعر یا ادیب واعظ اور ناصح نہیں ہوتا۔ عصری مسائل اور حالات سے آگاہی اور ان کے مضر اثرات سے اجتناب و احتیاط ہی اس کا مقصد ہوتا ہے۔ ابراہیم یوسف نے اپنی تخلیقات خصوصاً ڈراموں کے ذریعے یہی انسانی اخلاقی اور ادبی فریضہ انجام دیا ہے اس لیے مقصود عمرانی کی اس رائے کو حق بہ جانب نہیں کہا جاسکتا ہے کہ:

"اعلیٰ ترقی پسند حلقوں کی طرف سے اس کتاب (سوکھے درخت) پر
صرف ایک اعتراض کیا جاسکتا ہے اور وہ یہ ہے کہ ابراہیم یوسف
نے ان ڈراموں میں سوسائٹی کو موجودہ بھیانک حالت سے نکالنے کا
کوئی راستہ نہیں بتایا حالانکہ ترقی پسندی کے دائرے میں حقیقت پرستی
کے علاوہ ارتقا کی سمت اشاریت بھی لازمی شے کے طور پر آتی
ہے۔"   (ماخوذ: 'سوکھے درخت اور ابراہیم یوسف)

بلاشبہ ابراہیم یوسف محض ایک کامیاب ڈراما نگار ہی نہ تھے بلکہ ڈرامے کے اچھے محقق و ناقد اور مبصر بھی تھے۔ فن ڈراما نگاری کے مسائل اور اس سے متعلق ناقدین کی بے اعتنائی، عصبیت اور وقتاً فوقتاً جاری کردہ فتووں اور بے سروپا فیصلوں سے وہ نہ صرف باخبر رہتے تھے بلکہ تحقیق اور حقائق کی روشنی میں ثبوت و استدلال کے ساتھ اپنی بات اس طرح پیش کرتے تھے کہ پڑھنے یا سننے والا، قائل ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا تھا۔ ابراہیم یوسف نے ڈرامے کی حمایت میں کئی مضامین اور کتب لکھ کر ڈرامے سے متعلق پھیلائی گئیں افواہوں اور غلط فہمیوں کو دور کرنے کی سعی کی ہے۔

اردو ڈرامے کے وجود، معیار اور اہمیت سے متعلق اٹھائے گئے بے بنیاد سوالات اور

افواہوں کا جواب دیتے ہوئے اپنے ڈراموں کے مجموعے 'دھوئیں کے آنچل' کے ابتدائی صفحات میں 'ایک عرض' کے عنوان سے انھوں نے لکھا ہے:

> ''اردو ڈراما عجیب عجیب افواہوں کا شکار ہے، یہ کہ اردو میں ڈراما ہے ہی نہیں، جو کچھ ہے بھی تو وہ معیاری نہیں۔ اردو ڈرامے پر اس طرح کی تنقید اور تبصرہ کرنے والے وہ حضرات ہیں جن کو ڈرامے سے کوئی دلچسپی نہیں، تو کیا ضرورت ہے کہ اس پر تحقیق و جستجو کی جائے۔ جن حضرات کو اردو ڈراما غیر معیاری نظر آتا ہے۔ وہ بدقسمتی سے رہتے ہندوستان میں ہیں، بولتے اردو ہیں مگر غور و فکر یورپین فضا میں کرتے ہیں۔ اگر کوئی چیز یورپین معیار پر پوری نہیں اترتی تو وہ ان کے نزدیک غیر معیاری ہوجاتی ہے۔ کچھ حضرات کو یہ شکایت ہے کہ ہمارا ڈراما یورپین ڈرامے کے مقابلے میں نوٹنکی معلوم ہوتا ہے۔ گویا نوٹنکی کوئی گالی ہے۔ جس کو برداشت نہیں کیا جاسکتا۔ حالانکہ نوٹنکی ہماری تہذیبی روایت ہے اور ہر تہذیبی روایت قابلِ احترام ہوتی ہے۔ اگر اردو ڈرامے پر نوٹنکی کے اثرات ہیں تو یہ قابلِ ستائش ہیں نہ کہ قابلِ لعنت۔ اگرچہ یہ نوٹنکی والی بات بھی ایک افواہ ہی ہے... ایک افواہ یہ بھی ہے کہ اردو کے ابتدائی ڈراما نگار کم پڑھے لکھے بلکہ جاہل لوگ تھے۔
>
> ان کو یورپین ڈرامے کے بارے میں علم نہیں تھا۔ اردو کے پڑھے لکھے اور شہرت یافتہ ادیبوں نے جن کو یورپین ڈرامے کا بھی علم تھا، ڈرامے کو منہ کیوں نہیں لگایا؟ اسی لیے نا کہ ان کے نزدیک ڈرامے لکھنا غیر مہذب حرکت تھی اور غیر شریفانہ عمل تھا۔ جس صنف کے بارے میں اس قدر تعصب پھیلا ہوا ہو، اس کے متعلق ہر افواہ پر لوگ خواہ مخواہ یقین کرلیتے ہیں...... سچ بات تو یہ ہے کہ ڈرامے کے

بارے میں ابتدا میں جو تعصب پیدا ہو گیا تھا وہ آج تک قائم ہے اور
جب تک یہ تعصب دور نہ ہوگا، اردو ڈراما ترقی نہیں کرے گا۔
کہا جاتا ہے کہ اردو کے پاس اسٹیج نہیں ہے اس لیے ڈرامے کی
طرف دھیان نہیں دیا جاتا۔ میں کہتا ہوں کہ اچھے ڈرامے لکھے
جائیں اسٹیج خود بہ خود بن جائے گا..
یہ چند مسائل ہیں جن پر غور کرنے کی ضرورت ہے۔ میری ناقدین
اور محققین سے بھی عرض ہے کہ وہ ڈرامے پر بھی سنجیدگی سے غور
فرمائیں... ڈراما اگر تحقیق کا موضوع ہو تو ایمان داری سے اس پر
کام کریں.... کسی تعصب اور ادبی سیاست کا شکار نہ ہوں۔ یہ
ڈرامے کی بڑی خدمت ہوگی۔"

ابراہیم یوسف نے تمام عمر جس طرح ڈراما نگاری کے مطالعے اور اس کی تخلیق، تحقیق، تنقید اور تجزیے میں صرف کر دی۔ وہ اپنی مثال آپ ہے۔ ڈراما نگاری اور اس کے متعلقات پر انھیں جو عبور اور اختصاص حاصل تھا وہ بہت کم ڈراما نگاروں کے حصے میں آسکا ہے۔ وقت اور حالات کے تقاضوں کے ساتھ اردو ڈراما نگاری کے ضمن میں ہونے والی تبدیلیوں اور کیے جانے والے تجربات پر ان کی گہری نظر تھی۔ موجودہ اردو ڈراما نگاری سے متعلق ان کی حسب ذیل رائے نہ صرف مبنی بر حقیقت ہے بلکہ اس سے ان کی ڈراما نگاری اور اس کے نصب العین کا اظہار بھی ہو جاتا ہے:

"آج ڈراما نہ دیوتاؤں کی حمد گا کر افزائشِ نسل اور زرخیزیِ فصل کے
لیے دعائیں مانگنے کے لیے ہے اور نہ کلیسا کا اسیر ہے کہ اُسے تبلیغ
کے لیے استعمال کیا جاتا ہو۔ آج ڈرامے کے محرکات، مذہبی اور
تفریحی نہ ہو کر وہ کشمکش ہے جس کے باعث انسان انتشار زندگی کا
شکار، اپنے ماحول سے گریزاں بلکہ اپنی ہی ذات سے بیزار نظر آتا
ہے اور اس قدر دل برداشتہ ہو گیا ہے کہ یہی ازم کو بطور پناہ گاہ کے

استعمال کرنے میں عافیت محسوس کرتا ہے...... معاشرے کی یہ جبریہ مصنوعی تشکیل آج کا وہ المیہ ہے جس سے منضبط نظامِ حیات پارہ پارہ ہوکر رہ گیا ہے اور جس نے مایوسی اور تلخی کو جنم دے کر جارحیت کے لیے فضا ہموار کی ہے۔ روایتی تہذیب انحطاط کا شکار ہے لیکن ابھرتی ہوئی نئی تہذیب کے سامنے کوئی ایسا نصب العین نہیں جس کے لیے جدوجہد کرنے کی امنگ پیدا ہو........... اس منتشر نظامِ حیات نے افراد کے مستقبل کو تاریک کردیا ہے اور وہ صرف خوابوں کی زندگی بسر کررہا ہے............... آج کا اردو ڈراما نگار سماجی مسائل سے ہٹ کر ادب برائے تخلیق نہیں کررہا ہے بلکہ سماج میں پیدا ہونے والے مسائل پر اس کی نظر ہے اور وہ اپنی فکر کی گہرائی اور شعور کی پختگی سے ان مسائل کو تشویش کی نظر سے دیکھ رہا ہے۔ اس سے واضح طور پر یہ رجحان سامنے آتا ہے کہ اردو ڈرامے کی رو جذباتیت سے عقلیت کی طرف بہنے لگی ہے..............................

اس زاویۂ نگاہ سے دیکھنے کے بعد ہم محسوس کرتے ہیں کہ ڈرامے کے بارے میں اردو ڈراما نگار کے نقطۂ نظر میں تبدیلی پیدا ہوئی ہے اور اگر کلی طور پر نہیں تو جزوی طور پر وہ بریخت کے خیالات سے متاثر ہوا ہے۔

ڈرامے کے اس بدلتے ہوئے رخ نے اردو ڈراما نگاروں کے سامنے فن کا مسئلہ بھی پیدا کیا ہے۔ اس کو احساس ہے کہ ڈرامے کے بدلتے ہوئے اس روپ کا ڈرامے کے ڈھائی سو سالہ پرانے قوانین ساتھ نہیں دے سکتے، اس لیے وہ نئے تجربات کی ضرورت محسوس کررہا ہے—"

(اردو ڈرامے کے دس سال، مطبوعہ ماہنامہ، شاعر بمبئی، ص 31-30)

حقیقت یہ ہے کہ ڈراما نگاری، ابراہیم یوسف کے لیے نہ تو صلہ وستائش کا وسیلہ تھی

اور نہ ہی تفننِ طبع یا حصول لطف و مسرت کا ذریعہ۔ وہ ایک ذہین، حساس فنکار تھے۔ ان کا مطالعہ اور مشاہدہ وسیع تھا۔ سماج کے متوسط طبقے کی روزمرہ زندگی کے مسائل مثلاً بے روزگاری، فیشن پرستی، رشتوں کی نزاکت، قدروں کا زوال، حقوق کی پامالی، حق تلفی، سماجی بدعنوانی اور استحصال، انسانی بے بسی، بے چارگی، حرص و ہوس، فسادات کی تباہ کاری وغیرہ پر وہ نہ صرف گہری نگاہ رکھتے تھے بلکہ یہی موضوعات ان کے ڈراموں کا عنوان بن جاتے تھے۔

ابراہیم یوسف کے ڈراموں کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ ادب برائے مقصد واصلاح کے قائل تھے۔ انسانی دردمندی اور انسانیت کی سربلندی ان کا شیوہ تھا، اسی لیے انھوں نے اپنے مافی الضمیر کے اظہار کے لیے ایک ایسی صنف ادب یعنی ڈراما نگاری کو اختیار کیا تھا جو کہ زندگی اور سماج سے سب سے زیادہ قریب تر ہے یا جس میں زندگی اور سماج کی حقیقتوں اور انسانی خیر و شر کو تحریری اور عملی طور پر موثر طریقے سے پیش کیے جانے کی زیادہ گنجائشیں موجود ہیں۔ ڈراموں کے ذریعے پیش کردہ اور بیان کردہ مسائل و معاملات پر قاری یا ناظر کی توجہ مبذول کرانا ہی ان کا اصل مقصد تھا۔ وہ جس موضوع پر قلم اٹھاتے اس سے متعلق تمام تر امور پر انصاف کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ ڈراما لکھتے وقت ان پر سرشاری اور استغراق کی جو کیفیت طاری رہتی تھی اس کے متعلق ان کے قریبی دوست اور افسانہ نگار انجم سلمانی نے لکھا ہے:

> ''عام طور پر وہ ڈراما شروع کرنے میں زیادہ غور و فکر کا عادی نہیں ہے۔ اس کا دماغ اپنے فن میں اتنا منجھ گیا ہے کہ آپ ہی آپ پلاٹ کا تانا بانا بننے لگتا ہے۔ البتہ جیسے جیسے پلاٹ نقطۂ عروج کی طرف بڑھتا ہے اور مختلف متصادمات ڈرامے میں زندگی پیدا کرنے لگتے ہیں۔ وہ لمحات، گھنٹے یا دن جتنے عرصے میں بھی وہ نقطۂ عروج پر پہنچے ابراہیم یوسف کی بے چینی، اضطراب اور تفکر اس کے ہر انداز، ہر جنبش سے آشکارا ہوتی ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ بالکل ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ابراہیم یوسف خود ہی اپنے ڈرامے کا ایک کردار

ہے۔ یہ تمام کیفیات اس پر اس وقت تک طاری رہتی ہیں جب تک
کہ اس کے ڈرامے کا نقطۂ عروج نہ گزر جائے۔۔''
(ماخوذ: ابراہیم یوسف اور اس کی ڈراما نگاری از انجم سلمانی، مطبوعہ،
نذر سجاد، ص 271)

ایک سچے، اچھے اور کامیاب ڈراما نگار کی خوبی یہی ہے کہ وہ اپنے ڈرامے کے ماحول میں کھوکر اس کے کرداروں میں اس طرح گھل مل جاتا ہے کہ گویا وہ بھی اسی ماحول اور حالات کا حصہ ہو۔ ابراہیم یوسف کے ڈراموں کی ان خصوصیات کے سبب ان کے ڈراموں میں حقیقت نگاری، واقعیت، دردمندی، ڈرامائیت اور اثر و تاثیر کے عناصر نمایاں نظر آتے ہیں۔ انسانی نفسیات، مسائل اور معاملات پر گہری نگاہ ہونے کے سبب وہ کرداروں کو ان کے اصل ماحول کے مطابق متعارف کراتے ہیں۔ ان کے کردار نہ تو شیطان ہیں اور نہ فرشتے بلکہ نیکی و بدی، خیر و شر کے حامل متوسط طبقے کے ایسے عام انسان ہیں جو حالات سے نبردآزما ہوتے ہوئے بہتر زندگی گزارنے یا زندگی کو گوارہ بنانے کی کوشش میں سرگرداں نظر آتے ہیں۔ حالات کی نامساعدت، استحصال اور غم نصیبی نے انھیں بے بس اور بے دست و پا ضرور کردیا ہے لیکن وہ زندگی سے مایوس نہیں ہیں۔

ابراہیم یوسف نے زندگی اور سماج سے متعلق ہر اس موضوع پر قلم اٹھایا ہے جو کہ ایک ذمے دار، حساس فنکار کو اپنی جانب متوجہ کرتا ہے۔ ڈرامے میں گہرائی، سچائی اور اثر و تاثیر پیدا کرنے کے لیے انھوں نے کرداروں کی خارجی کیفیات کے بجائے داخلی کشمکش کو ابھارنے کی سعی کی ہے۔ وہ موضوع کی اہمیت کے ساتھ ساتھ قاری کی پسند کو بھی ملحوظ رکھتے ہیں۔ ان کے ہاں نہ تو سطحیت ملتی ہے نہ ہی خالص رومانیت، ان کے ڈراموں میں حقیقت پسندی اور ترقی پسندی کا جو امتزاج ملتا ہے اس کے سبب ان کے اسلوب میں کہیں کہیں ایسی نشتریت بھی پیدا ہوگئی ہے جو کبھی کبھی خالص نصیحت کا روپ اختیار کرکے ڈرامے کو خشک اور گراں بار بنا دیتی ہے۔ لیکن ان کے یہاں یہ پہلو صرف سنگین مسائل کے حامل ڈراموں میں ہی نمایاں ہے، ان کے بیشتر ڈرامے اس نوع کے عیب سے عاری ہیں۔

ابراہیم یوسف کے کئی ڈرامے خالص طنزیہ ہیں بعض مزاحیہ اور بعض تجسس اور چونکا دینے والی کیفیت اور پراسراریت کے حامل بھی ہیں۔

یوں تو ابراہیم یوسف کے بیشتر ڈرامے موضوع، تکنیک اور فن کی کسوٹی اور اسٹیج کے تقاضوں پر پورے اترتے ہیں لیکن ان کے جن ڈراموں کو ہر لحاظ سے، کامیاب، معیاری اور پراثر کہا جاسکتا ہے ان میں 'وقت کے کراہتے رنگ'، 'دھوئیں کے آنچل'، 'زبیدہ'، 'قدم قدم اداس موڑ'، 'خاموشیاں'، 'تصویر اور جھوٹ'، 'ڈاکٹر تمکین کی الجھن'، 'ٹوٹے ہوئے خوابوں کا درماں'، 'افشاں یا نور افشاں'، 'تین نسلیں ایک دوز'، 'بادلوں کا سایہ'، 'اندھیری رات کا جگنو'، 'کمینہ کہیں کا'، 'صنم کدے'، 'گونگے کے خواب'، 'بڑھتے قدم'، 'جمہور کے ابلیس'، 'بیگم صاحبہ'، 'مرکز کی طرف'، 'سواگت'، 'حیوان'، 'سہاگ راگ'، 'اس حمام میں'، 'اداس راہی، اداس راہیں'، 'سلگتی روحیں'، 'بنتِ عم'، 'خودکشی'، 'دم خم'، 'میرے خواب' اور تاریخی نوعیت کے ڈراموں میں 'سلطان ٹیپو'، 'مانڈو کا پھول'، 'روپ متی'، 'معمار' اور 'مغلوب غالب' کے نام بطور خاص قابلِ ذکر ہیں۔

ابراہیم یوسف نے زور واثر پیدا کرنے کی خاطر، ڈراموں میں بعض کامیاب تجربات بھی کیے ہیں۔ مثلاً ان کے تین ڈرامے: 'اندھیری رات کا جگنو'، 'اداس راہی، اداس راہیں' اور 'بڑھتے قدم' میں یہ تجربہ کیا گیا ہے کہ یہ تینوں ڈرامے اپنے اپنے طور پر علاحدہ اکائی کی حیثیت رکھنے کے باوجود نفس موضوع کے اعتبار سے یہ تینوں مل کر ایک اکائی بن جاتے ہیں۔ ڈراما 'جو چپ رہے گی زبان خنجر' اپنی جگہ ایک اکائی ہے لیکن ڈراما 'وقت کے کراہتے رنگ' کے ساتھ مل کر بھی ایک ڈراما بن جاتا ہے۔ یہی معاملہ ڈراما 'کاغذ کی دھجی' اور 'وقت کے کراہتے رنگ' کا ہے کہ یہ دونوں ڈرامے علاحدہ ڈرامے بھی ہیں اور ایک ڈراما بھی! اسی طرح ان کے بعض ڈراموں کا اختتام انتہائی چونکانے والا بلکہ ایسا غیر یقینی ہوتا ہے کہ جس کی طرف قاری یا ناظر کا ذہن تیار نہیں ہوتا اور وہ بے اختیار چونک اٹھتا ہے۔ ابراہیم یوسف نے اپنے بعض ڈراموں میں فلسفیانہ موشگافی، تحلیل نفسی، تذبذب، شدید جذباتی اور نفسیاتی کشمکش، تجسس، سنسنی خیزی اور تحیر سے بھی کام لیا ہے۔ ان کے اس نوع کے جن ڈراموں

میں یہ تاثر آخر تک قائم رہتا ہے۔ ان میں 'چھے سال بعد'، 'طمانچہ'، 'موت سے پہلے آدمی'، 'بادلوں کا سایہ'، 'خاموشیاں'، 'والد صاحب'، 'ایک پہیلی'، 'داغ اور دھبے'، 'افشاں یا نورافشاں'، 'بیگم صاحبہ'، 'چنگاڑیں' اور 'پرچھائیوں کا پیچھا' کے نام پیش کیے جاسکتے ہیں۔

تخیل کی بلند پروازی کی مثال پیش کرنے اور ماورائی فضا قائم کرنے میں ان کے تحریر کردہ ڈرامے 'آسمانوں میں'، 'کردار کا کردار' اور 'سوانگت' کامیاب ڈرامے ہیں۔ تکنیکی حسن کاری، حسن تعمیر، ڈرامائیت اور پلاٹ کی بُنت کے اعتبار سے 'سوکھے درخت'، 'اہرام'، 'نقلی خوشیاں، اصلی چہرے'، 'وقت کے کراہتے رنگ'، 'دھوئیں کے آنچل'، 'شاہدہ'، 'تین نسلیں، ایک دور'، 'بادلوں کا سایہ'، 'تصویر اور جھوٹ'، 'اندھیری رات کا جگنو'، 'رنگ میں بھنگ'، '... اور یہ انسان'، 'ٹوٹے ہوئے خوابوں کا درماں'، 'بڑھتے قدم' وغیرہ ایسے اہم ڈرامے ہیں جنھیں کسی بھی زبان کے معیاری اور مثالی ڈراموں کے سامنے پیش کیا جاسکتا ہے۔ لیکن 'جوان'، 'بزدل'، 'الفی الفی میں'، 'لاش کے گرد' اور 'یوں بھی ہوتا ہے زمانے میں' ان کے ایسے ڈرامے ہیں جن میں موضوع کی سنگینی کے سبب کرداروں کی حد سے زیادہ بڑھی ہوئی نفسیاتی اور جذباتی کشمکش نے فن ڈراما کے فطری حسن کو خاصا مجروح کیا ہے اور یہ ڈرامے بعض فنی اسقام کا شکار ہوگئے ہیں۔

ڈراما 'دھوئیں کے آنچل' میں تعلیم یافتہ افراد کی معاشی پریشانیوں اور سماجی و تہذیبی قدروں کے ٹکراؤ کو خوبصورت انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ پانچ مناظر پر مشتمل اس یک بابی ڈرامے میں تمام ڈرامائی عناصر کو کامیابی کے ساتھ برتا گیا ہے لیکن اس کا انجام قدرے غیر متاثر کن اور غیر فطری اس لیے محسوس ہوتا ہے کہ ڈاکٹر قاسم کو محض اسقاط حمل کے ایک کیس کے سلسلے میں معتوب قرار دے کر ڈراما ختم کردیا جاتا ہے۔ یہ ڈراما 15 اپریل 1981 اور 16 ستمبر 1981 کو ٹیگور ہال، بھوپال میں کامیابی کے ساتھ اسٹیج کیا گیا تھا۔

ابراہیم یوسف نے سماجی، سیاسی، معاشرتی، تہذیبی اور نفسیاتی مسائل کے ساتھ بعض تاریخی نوعیت کے ڈرامے بھی تحریر کیے ہیں جن میں 'مغلوب غالب'، 'معمار'، 'سلطان ٹیپو' اور 'مانڈو کا پھول' ان کے ایسے کامیاب ڈرامے ہیں جن کے مطالعے سے متعلقہ موضوع،

اس کا تاریخی پس منظر، مخصوص ماحول و حالات اور اشخاص و افراد کے مزاج و مسائل، انداز فکر و نظر اور طرز زندگی کا بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

ڈراما 'معمار' میں جیسا کہ عنوان سے ظاہر ہے، ایک مخصوص پیشے سے وابستہ افراد کی پیشہ ورانہ نفسیات اور معاشرتی زندگی کے مسائل کو فن کارانہ انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ اس ڈرامے میں ڈراما نگار نے ترقی پسند نقطۂ نظر سے کام لے کر مزدور پیشہ افراد کے مسائل کو ابھارنے کی کوشش کی ہے۔ اجداد کے کارناموں پر فخر محسوس کرنا، فطرت انسانی کا خاصہ ہے۔ ڈراما 'معمار' کا مزدور کردار کلو بھی اپنے اسلاف کے ان کارناموں پر نازاں ہے جنھوں نے تاج محل کی تعمیر میں حصہ لیا تھا۔ ڈرامے میں بھیکو معمار اور دھنا شرابی کے کردار بھی متاثر کن ہیں۔

'کمینہ کہیں کا' میں ڈراما نگار نے متوسط گھرانوں کی چاردیواری میں پیش آنے والے غیر اخلاقی اور غیر مہذب حالات کو ڈرامائی کشمکش کے ساتھ اس طرح ظاہر کیا ہے کہ ڈراما پڑھنے یا دیکھنے والے اصلاح و عبرت حاصل کرسکیں۔ آمنہ، راحت اور راحت کی بیوی فاطمہ ڈرامے کے اہم کردار ہیں۔

ڈراما 'وقت کے کراہتے رنگ' موضوع، زبان، پیش کش اور ڈرامائی عناصر کے لحاظ سے معیاری ڈراما ہے جس میں معاشرتی اور خانگی حالات اور انسانی نفسیات کو فن کارانہ انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ یہ ڈراما ماہنامہ 'شاعر' بمبئی کے سال نامے 1972 میں شائع ہوا تھا۔ 27 مارچ 1982 کو مدھیہ پردیش اردو اکادمی نے اسے مع دوسرے ایکٹ 'کاغذ کی دھجی' کے ساتھ راجیو ورما کی زیرہدایت، ٹیگور ہال، بھوپال میں اسٹیج کیا۔

اس ڈرامے میں عاصم، خدیجہ بیگم (عاصم کی بیوی) عظمت خالا (نوکرانی) عالیہ (عاصم کی بیوہ بہو) شارق (عاصم کا بھتیجا) سبھی نے کردار نگاری کے اچھے نمونے پیش کیے ہیں لیکن عالیہ کا کردار سب سے زیادہ بھرپور اور متاثر کن ہے۔ ڈرامے میں عصر حاضر کی قدروں کے زوال کو پیش کیا گیا ہے۔ اگرچہ موضوع نیا نہیں ہے لیکن کامیاب پیش کش، برجستہ مکالمے اور اچھی کردار نگاری نے اسے ایک اچھا ڈراما بنا دیا ہے۔ بقول فصیح احمد صدیقی:

"فکری زاویے سے ڈرامے کا رتبہ کافی بلند ہے۔ اس کے بنیادی

خیال کی رفعت سے انکار ممکن نہیں۔ فی زمانہ مادی عیش و آرام اور جلبِ زر کو جو اہمیت مل گئی ہے۔ اس سے ہر ذی ہوش فن کار متنفر ہے۔ دولت کا لالچ اُسی کے بل پر رشتوں کا بننا یا ٹوٹنا ایک ایسا سانحہ ہے جس پر جس قدر نفرین کی جائے کم ہے۔ ڈرامے میں اسی تلخ حقیقت پر اظہارِ خیال کیا گیا ہے۔"

(اردو کا یک بابی ڈراما، سیریز3، ص 458-457)

غالب کے جشن صد سالہ کے موقعے پر اردو نثر و نظم میں متعدد تخلیقات منظرِ عام پر آئیں جن میں غالب کی شخصیت، عہد، ماحول اور ان کی نثری و شعری خدمات پر اظہار خیال کیا گیا۔ ابراہیم یوسف کا تحریر کردہ ڈراما: 'مغلوب غالب' بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے جس میں مرزا غالب کے علاوہ ان کی اہلیہ امراؤ بیگم، نوکر کلو اور کلیانی ملازمہ وفادار، دو گورے، ایک ہندوستانی سپاہی اور چند پڑوسیوں کے کرداروں کو 1857 کے انقلاب کے حالات کی روشنی میں پیش کیا گیا ہے۔ ڈرامے میں انگریزوں کے ظلم و جبر، غالب کے بھائی مرزا یوسف کی شہادت اور غالب کے اضطراب کی عکاسی متاثر کن انداز میں کی گئی ہے۔

انگریزوں کے ظلم و ستم اور 1857 کی دلی کا نقشہ ملاحظہ کیجیے:

مرزا غالب: (کلو کی طرف دیکھ کر) کیوں میاں کلو کیا خبر لائے، شہر کا کیا حال ہے۔

کلو: دھائیں، دھائیں گولیاں چل رہی ہیں، سرکار! کیا گناہ گار، کیا بے گناہ جو بھی سامنے آتا ہے گولی کا نشانہ بن جاتا ہے۔

مرزا غالب: ارے ہاں، میاں کلو۔۔۔ کچھ کلیان کا پتا ہے۔

کلو: وہ تو صبح ہی سے لاپتا ہے سرکار۔ خدا جانے زندہ بھی ہے یا کسی گورے کی گولی کا نشانہ بن گیا ہے۔

اس ڈرامے میں غالب کے مزاج کی فطری بذلہ سنجی اور حاضر جوابی کو بھی دلچسپ اور فن کارانہ انداز میں ظاہر کیا گیا ہے۔ مرزا غالب کو جب دو گورے پکڑ کر کرنل برون کے سامنے لے جاتے ہیں اور وہ تھوڑی دیر بعد صحیح سلامت گھر واپس آجاتے ہیں تو اس وقت

کا منظر اس طرح بیان کیا گیا ہے:

("... تھوڑی دیر بعد مرزا غالب چہرے پر پریشانی مگر ہونٹوں پر مسکراہٹ لیے داخل ہوتے ہیں۔ مرزا کو دیکھ کر امراؤ بیگم کی آنکھوں میں آنسو آجاتے ہیں اور بے اختیار زبان سے نکلتا ہے)۔"

امراؤ بیگم: خدا تیرا لاکھ لاکھ شکر و احسان ہے (مرزا کی طرف دیکھ کر) آپ کو کوئی صدمہ تو نہیں پہنچا۔

(مرزا گاؤ تکیے سے لگ کر بیٹھ جاتے ہیں اور مسکراتے ہوئے)

تھی خبر گرم کہ غالب کے اڑیں گے پُرزے
دیکھنے ہم بھی گئے تھے پہ تماشہ نہ ہوا

بیگم واللہ آج تو مرے آدھے مسلمان ہونے نے میری جان بچالی۔

امراؤ بیگم: خدا را تمسخر کسی اور وقت کے لیے اٹھا رکھیے۔ اس وقت تو یہ کلمات کفر زبان پر نہ لایئے۔

مرزا غالب: علیؑ کا بندہ ہوں، سچ بیگم! جھوٹ نہیں بولتا، اگر پورا مسلمان ہوتا تو آج احمد بخش خاں کی بھتیجی اور الٰہی بخش خاں معروف کی بیٹی بیوہ ہوگئی ہوتی۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

(امراؤ بیگم جانے کے لیے مڑتی ہیں) واللہ بیگم کہاں تشریف لے چلیں۔ امر واقعہ تو سنتی جایئے۔

امراؤ بیگم: میں پہلے شکرانے کا دوگانہ ادا کرلوں پھر حاضر ہوتی ہوں۔

مرزا غالب: دوگانہ بھی ادا کرلیجیے گا۔ اب سنیے۔ جب میں کرنل برون کے سامنے پیش ہوا تو اس نے میرے سر پر کلاہِ پپاخ، ایک برکا پاجامہ، سفید ململ کا انگرکھا اور اس پر یہ قبا دیکھ کر کہا: 'ول تم مسلمان ہے' میں نے کہا، 'آدھا، اس پر وہ حیران ہوا اور کہا آدھا کیسا؟ میں نے کہا شراب پیتا ہوں سور نہیں کھاتا۔ وہ مسکرایا اور باعزت رہائی کا حکم دے دیا۔ اب فرمایئے کیا پورے مسلمان کو یہ سعادت نصیب ہوسکتی تھی؟"

ڈرامے کے مکالمے دلچسپ اور موزوں ہیں اور فنی اعتبار سے بھی یہ ایک معیاری ڈراما ہے۔

ابراہیم یوسف کے ڈراموں کا پہلا مجموعہ 'سوکھے درخت' 1952 میں شائع ہوا جس میں چھ یک بابی ڈرامے 'لاش کے گرد'، 'ایڈیٹ'، 'خون کی بوندیں'، 'رات کی کہانی'، 'چمگادڑیں' اور 'سوکھے درخت' شامل ہیں۔ ان ڈراموں میں متوسط طبقے سے متعلق زندگی کی الجھنوں، بدحالی، ظلم و استحصال اور خانگی مسائل کو طنزیہ انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ ڈراما 'لاش کے گرد' میں زبیدہ مرکزی کردار کی حیثیت سے، اپاہج بہن اور بیمار ماں کا بوجھ اٹھاتی ہے اور ماں کے مرجانے کے بعد اس کے کفن اور تدفین کے خرچے کے لیے خود ایک سرمایہ دار کی ہوس کا شکار ہوجاتی ہے۔ غریبی، بے بسی، اور انسانی بے چارگی اس ڈرامے کا بنیادی موضوع ہے جسے ڈراما نگار نے دل سوزی اور اثرانگیزی کے ساتھ پیش کیا ہے۔ ڈراما 'ایڈیٹ' میں بھی سماج کی ایسی ہی تصویر پیش کی گئی ہے۔

'خون کی بوندیں' فسادات کے موضوع پر لکھا گیا پر اثر ڈراما ہے جس میں انسان کی شرپسند اور متعصب ذہنیت کو فن کارانہ چابکدستی کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔ ڈراما 'چمگادڑیں' میں ماڈرن سوسائٹی کی بے راہ رویوں کو بے نقاب کیا گیا ہے۔ 'سوکھے درخت' کا پلاٹ سماج کی اس تلخ حقیقت پر مبنی ہے جس میں بے گناہ اور معصوم نوجوان لڑکیاں اپنی خوشیوں اور آرزوؤں کی قربانی دینے پر مجبور کردی جاتی ہیں۔

مذکورہ بالا ڈراموں کا اسلوب اور مکالمے برجستہ اور پراثر ہیں اور ان کے سبھی کرداروں نے زندگی کے حقیقی رنگ کو کامیابی کے ساتھ نبایا ہے۔

مسائل کی سنگینی اور پیچیدگی کے سبب ابراہیم یوسف کے جن ڈراموں کا اسلوب خالص طنزیہ ہوگیا ہے انھیں، انھوں نے ایک علاحدہ مجموعہ 'طنزیہ ڈرامے' (مطبوعہ نسیم بکڈپو لکھنؤ) میں یکجا کرکے شائع کیا ہے۔ اس مجموعے میں درج ذیل بارہ ڈرامے 'حیوان'، 'بزدل'، 'شاہدہ'، 'وہ ایک نرس تھی'، 'گونگے کے خواب'، 'جمہور کے ابلیس'، 'بیگم صاحبہ'، 'مقابلے اور فیصلے'، 'مرکز کی طرف'، 'چھ سال بعد'، 'دم خم' اور 'ایک حمام میں' شامل ہیں۔

جیسا کہ ذکر کیا گیا ہے مذکورہ بالا تمام ڈراموں کا اسلوب خالص طنزیہ ہے۔ ڈراموں میں طنزیہ اسلوب کا استعمال، آسان کام نہیں ہے۔ ابراہیم یوسف نے ڈرامائیت کو برقرار رکھتے ہوئے طنزیہ اسلوب کو کامیابی کے ساتھ اس طرح برتا ہے کہ نہ تو ڈرامائیت مجروح ہوئی ہے اور نہ ہی طنز کی کاٹ میں کمی واقع ہو سکی ہے۔ بلکہ طنزیہ اسلوب ان ڈراموں کا ایک اضافی وصف بن گیا ہے۔ بطور نمونہ چند اقتباسات ملاحظہ کیجیے:

ڈراما 'شاہدہ' میں جب نصیر کہتا ہے: ''یہ بہکی بہکی باتیں نہیں ہیں، میری عزت نفس کا سوال ہے۔'' تو شاہدہ طنزیہ انداز میں جواب دیتی ہے:

''شاہدہ: عزتِ نفس! کس قدر خوبصورت لفظ تراشے ہیں حضرتِ انسان نے خود کو دھوکا دینے کے لیے (طنزیہ) عزتِ نفس، خودداری، عظمتِ انسانی اور جانے کیا کیا— اور ان سب کے لیے میرے پاس ایک لفظ ہے— ظاہرداری۔''

ڈراما 'اس حمام میں' جیسا کہ نام سے ظاہر ہے ہماری بدعنوان سوسائٹی کا منظرنامہ جس طرح پیش کیا گیا ہے وہ قابلِ مذمت ونفرین بھی ہے اور باعثِ عبرت و تاسف بھی! اس ڈرامے میں رمیش اور سریش جہاں اپنی شیطانی حرکات سے پورے ماحول کو داغ دار بنا دیتے ہیں وہیں کشور اور رادھا کے کردار اپنی مجبوریوں اور حالات کا شکار ہونے کے باوجود، اپنے ضمیر پر لبیک کہتے نظر آتے ہیں۔

ابراہیم یوسف کے ڈراموں کا ایک مجموعہ 'پانچ، چھے ڈرامے' کے نام سے شائع ہوا ہے، جس میں بظاہر چھ ڈرامے 'ٹوٹے ہوئے خوابوں کا درماں'، 'ڈاکٹر تمکین کی الجھن'، 'دہکتے انگارے، گرتی برف'، 'اندھیری رات کا جگنو'، 'اداس راہی اداس راہیں' اور 'ایک پہیلی' شامل ہیں لیکن ابراہیم یوسف نے اس مجموعے کا عنوان 'پانچ چھ ڈرامے' قائم کرکے قارئین کے لیے بھی ایک سوال کھڑا کردیا ہے۔ اس سوال کا جواب دیتے ہوئے انھوں نے مذکورہ بالا مجموعے کے پیش لفظ میں اس طرح وضاحت کی ہے کہ:

> ''یہ ڈرامے اپنی نوعیت کے اعتبار سے تجرباتی ڈرامے ہیں۔ تجرباتی اس لحاظ سے کہ ان میں وہ روایتی تصادم نہیں ہے جو ڈرامے کے

لیے مخصوص اور لازمی قرار دیا جاتا ہے۔ ان ڈراموں میں افراد کے
درمیان تصادم نہیں ہوتا بلکہ فرد اپنی ذات کے اندر خود سے جھگڑتا اور
داخلی کشمکش میں مبتلا نظر آتا ہے۔۔ اور اسی داخلی کشمکش سے ڈراما اپنے
نقطۂ عروج کو پہنچ جاتا ہے۔ موضوع کے اعتبار سے یہ ڈرامے صرف
کرداری ڈرامے ہیں۔"

ڈراموں کے اس مجموعے پر ڈاکٹر محمد حسن نے اپنے ادبی رسالہ 'عصری ادب' (اپریل تا اکتوبر 1980) میں تبصرہ کرتے ہوئے لکھا تھا:

"ابراہیم یوسف اردو کے ان گنے چنے کامیاب ڈراما نگاروں میں
ہیں جن کو ڈرامے لکھنے کا فن آتا ہے۔ پلاٹ میں حیرت و استعجاب
اور ڈرامائی کشمکش کے لیے نئے پہلو پیدا کرتے چلے جاتے ہیں اور
سب کچھ ایسی ہنرمندی اور بے اختیار طور پر کرتے ہیں کہ آورد کا
شبہ نہیں ہوتا۔ ان مختصر ڈراموں میں ابراہیم یوسف نے انسانی زندگی
اور شخصیت کے مختلف پہلوؤں کو کشمکش اور آویزش کے بنیادی نقاط پر
اسیر کرلیا ہے اور انھیں چابکدستی اور فنکارانہ مہارت کے ساتھ پیش کیا
ہے۔ اردو ڈرامے کے سنجیدہ طالب علم کے لیے ان کا مطالعہ دل چسپی
سے خالی نہ ہوگا۔"

ابراہیم یوسف کے مجموعے 'اداس موڑ' (مطبوعہ نئی آواز نئی دہلی 1982) میں سات یک بابی ڈرامے 'پیرول پر رہائی'، 'افشاں یا نورافشاں'، 'موت سے پہلے آدمی'، 'تصویر اور جھوٹ'، 'تمانچہ'، 'خطوط کی واپسی' اور 'قدم قدم اداس موڑ' شامل ہیں۔ ان ڈراموں کے کرداروں کی نفسیات اور ان کے موضوعات سے متعلق ابراہیم یوسف لکھتے ہیں:

"چاند کے سنگ ریزے بٹورنے اور خلاؤں کا سینہ چیرنے پر فخر
کرنے والا انسان اندر سے خود کتنا دکھی اور ٹوٹا پھوٹا ہے، یہی ان
ڈراموں کا موضوع ہے۔ خلاؤں کی تاریکیوں میں وہ اس طرح

کھو گیا کہ اپنے مسائل اور اپنے غموں کو بھول گیا ہے یا پھر ان کی طرف توجہ دینے کی اسے فرصت نہیں۔ وہ اپنے دکھوں کو اپنے کاندھوں پر اٹھائے پھرنے سے مطمئن ہے یا پھر انھیں اقسام ازل کا تحفہ سمجھ کر بطور مقدر قبول کر چکا ہے۔ان ڈراموں کا ہر کردار سوال کرتا ہے" کیا آپ کے پاس ہمارے درد کا درماں ہے؟ اور کہتا ہے کہ آپ ہمارا مقدر یا نفسیاتی کیفیت کہہ کر ہمیں مطمئن نہیں کر سکتے۔ یہ سب کچھ آپ کا دیا ہوا ہے۔آپ ہی کو اس کا علاج کرنا ہوگا۔کیا آپ کے پاس ہمارے دکھوں کا علاج ہے؟ کیا یہ انسان کی زندگی کا سب سے بڑا المیہ نہیں ہے کہ وہ اپنے دکھوں کے علاج سے گریز کرتا ہے؟"

انسانی مسائل و معاملات کے تئیں ابراہیم یوسف کی یہ فکر مندی ان کی انسان دوستی، دانش مندی، عصری آگہی کا نہ صرف بین ثبوت ہے بلکہ اس سے یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ وہ ایک ذمے دار، حساس اور باشعور ڈراما نگار تھے اور انھوں نے فن ڈراما کو انسانی زندگی اور سماج کے مختلف النوع مسائل کی ترجمانی کے لیے برتا تھا۔

ابراہیم یوسف کے ڈراموں کے مطالعے سے قاری ایک خاص نوع کی بصیرت و شعور سے ہم کنار ہوتا ہے۔ غالباً ڈراما نگار کا مقصد بھی یہی تھا۔

'پرچھائیوں کا پیچھا' ابراہیم یوسف کے ڈراموں کا ساتواں مجموعہ ہے جس میں چار ڈرامے: 'نالائق'، 'پرچھائیوں کا پیچھا'، 'راوی چین لکھتا ہے' اور 'روپ متی' شامل ہیں۔ ڈراما 'پرچھائیوں کا پیچھا' رویندر بھون بھوپال میں کامیابی سے اسٹیج کیا گیا تھا۔'روپ متی' تاریخی ڈراما ہے جو کہ 19 ویں صدی کی ڈرامائی تکنیک پر لکھا گیا ہے جس میں مانڈو کا رومانی ماحول، فطری حسن، جنگ کا تباہ کن ماحول، روپ متی اور باز بہادر کی مثالی محبت اور روپ متی کے ایثار کو تاریخی پس منظر میں موثر انداز میں پیش کیا گیا ہے۔

ابراہیم یوسف ماہر، تجربہ کار ڈراما نگار تھے۔ وہ ڈرامے کی تکنیک سے پوری طرح واقف تھے۔ اچھے معیاری اور کامیاب ڈرامے کی خصوصیات سے متعلق پوچھے گئے ایک

سوال کے جواب میں انھوں نے بتایا تھا:

> ''ڈرامے کی دو حیثیتیں ہوتی ہیں۔ ایک اس کا تمثیلی پہلو دوسرا ادبی... ڈرامے کی خوبی یہ ہونا چاہیے کہ وہ بغیر کسی دقت کے اور کم سے کم سرمایہ سے اسٹیج کیا جاسکے۔ ...ڈرامانگار کے خیال کو بحسن و خوبی پیش ہونا سب سے بڑی خوبی ہے... میرے نزدیک اچھے ڈرامے کے لیے نہ صرف اچھے موضوع کا انتخاب ضروری ہے بلکہ موضوع ایسا ہونا چاہیے جس میں شدید کشمکش اور تصادم کے زیادہ سے زیادہ مواقع ہوں۔ انسانی جذبات اور احساسات کا بھرپور احساس ہوسکے۔ ایکٹر کے لیے عمل اور حرکات کی زیادہ سے زیادہ گنجائش ہو اور ڈائرکٹر کے لیے ایسے مواقع ہوں کہ وہ فن کارانہ طور پر ڈرامانگار کے مافی الضمیر کو بخوبی سمجھنے اور پیش کرنے میں کوئی عملی دقت محسوس نہ کرے... ڈرامے میں غیرضروری کردار نہ ہونا چاہیے... طویل مکالمے ڈرامے کو تباہ کردیتے ہیں۔ میں ذاتی طور پر کم سے کم اور مختصر سے مختصر مکالموں کا قائل ہوں.... ایک خاموش سین ایک مکالماتی سین کے مقابلے میں کہیں زیادہ متاثر کرتا ہے... مکالموں کی زبان عام فہم اور پراثر ہونا چاہیے۔''

(ماخوذ: ماہنامہ 'شاعر' بمبئی گوشۂ ابراہیم یوسف)

ابراہیم یوسف کے بیشتر ڈرامے مذکورہ بالاخصوصیات کے حامل ہیں۔ ان کے یک بابی ڈراموں میں زمان و مکان اور تاثر ہر لحاظ سے وحدت کے نمونے کو پیش کرنے کی کوشش ملتی ہے۔

ابراہیم یوسف نے عام طور پر سادہ، سلیس اور عام فہم زبان استعمال کی ہے لیکن محل وقوع کے اعتبار سے حسب ضرورت فلسفیانہ، عالمانہ اور شاعرانہ زبان کا استعمال بھی ان کے یہاں ڈرامے کو ایک نئی آب و تاب عطا کرتا ہے۔ مثلاً: گناہ کے سلسلے میں مختلف

کرداروں کی زبانی مختلف فلسفیانہ خیال کا اظہار وہ اس طرح کرتے ہیں:

''پروفیسر: گناہ وہ ہے جو کیا نہ جاسکے۔ جو کیا جاسکے وہ گناہ نہیں... وہ ایک رنگین خواب بن جاتا ہے۔

ثروت: .... میں گناہ اس کو سمجھتا ہوں کہ ہم کسی کام کے کرنے اور نہ کرنے کی کشمکش میں مبتلا رہیں۔

شہزادی: میں گناہ اس بازی کو سمجھتی ہوں جس میں انسان داؤ لگائے، ہارے جیتے، جیتی ہوئی بازی گناہ نہیں ہوتی۔

نگہت: میں گناہ وہی سمجھتی ہوں جس کو چھپایا جائے۔'' (ڈراما 'بہشتِ ارضی')

ڈرامے کی زبان میں ڈرامائیت اشاریت اور دلچسپی کا ہونا ضروری ہے۔ ابراہیم یوسف کے یہاں یہ عناصر باہم دگر نظر آتے ہیں۔ ڈرامے کو موثر بنانے کے لیے انھوں نے سچویشن کے اعتبار سے کہیں کہیں شاعرانہ انداز بھی اختیار کیا ہے۔ مثلاً

''عشرت: سچ سچ! میں نے دیکھا جیسے دنیا ایک انگڑائی لے رہی ہے۔ ہر طرف شادابی ہے، حسن ہے، بہاریں ہیں۔ یہ معلوم ہوتا ہے جیسے مالوہ کی رات اور بنارس کی صبح ایک سنگم پر آگئی ہے۔ نغموں کا ایک دریا ہے جس نے فضا کو مسحور کردیا ہے۔ ایک حسین جادو ہے جس کی آغوش میں ساری دنیا سمٹ آئی ہے جہاں سدا بہار پھول کھلے ہیں جنھوں نے فضا کو معطر کردیا ہے۔ کلی کے چٹکنے پر قہقہے بلند ہوتے ہیں۔ پہاڑوں سے ایک ندی محبوبہ کی طرح اٹھلاتی چلی آرہی ہے جس کے سنگ ریزوں میں ہیروں کی تابانی ہے اور اسی کنارے پر میں کھڑا ہوں۔'' (ڈراما: 'میرے خواب')

تاریخی ڈراما 'مانڈو کا پھول' میں مصاحب خاں کی زبانی روپ متی کے حسن بے مثال اور کمال فن کا نقشہ اس طرح کھینچا گیا ہے کہ باز بہادر، روپ متی پر نادیدہ عاشق ہوجاتا ہے۔

''مصاحب خاں: جہاں پناہ! یہ مبالغہ نہیں حقیقت ہے۔ یہ ایسی سچائی ہے جیسے ہم روز سورج کو طلوع ہوتے دیکھتے ہیں۔ جب وہ ستار پر کوئی دھن چھیڑتی ہے تو ہرن کُیل کرنا بھول

جاتے ہیں۔ پانی کی لہریں اس کو سر اٹھا اٹھا کر دیکھتی ہیں۔ طاؤس اپنا رقص بھول جاتا ہے۔ فضا ساکت ہوجاتی ہے۔ جہاں پناہ... اس کی انگلیاں مخروطی ہیں، آنکھیں نرگسی ہیں، زلفیں شبِ فرقت سے دراز ہیں، گردن صراحی دار ہے۔ اس کے دانت الماس کی طرح، پیشانی ہلال کو شرماتی ہے، ابرو دودھاری تلوار ہیں، عارضِ رنگیں سے گلاب شرماتا ہے۔ اگر وہ اپنا جوڑا کھول دے تو دنیا میں اندھیرا ہوجائے۔"

حالات کی ناساعدت اور مسائل کی سنگینی اور تلخی کے سبب ابراہیم یوسف کے ڈراموں میں اکثر جگہ طنز ونشتریت کی کیفیت پیدا ہوگئی ہے۔ انھوں نے خالص طنزیہ ڈرامے بھی لکھے ہیں اور ان کے غیر طنزیہ ڈراموں میں بھی یہ عنصر نمایاں نظر آتا ہے۔ جس کے سبب انھیں ایک کامیاب ڈراما نگار ہی نہیں اچھا طنز نگار بھی کہا جاسکتا ہے۔ اپنی بات کو موثر بنانے یا موضوع سے انصاف کرنے کی خاطر اکثر جگہ وہ طنز ونشتریت کا سہارا لیتے ہیں اور اپنے مقصد میں کامیاب ہوجاتے ہیں۔ ان کے طنز کا دائرہ خاصا وسیع ہے۔ وہ ایک مشاق جراح کی طرح سماج اور افراد کے رگ و پے میں طنز کے نشتر چبھو کر اپنے مقصد کے حصول کی تکمیل کرتے ہیں۔ ان کے طنز کا وار بڑا کاری ہوتا ہے۔ مثلاً ڈراما 'معمار' میں دھنا اپنے دل کا غم اس طرح ظاہر کرتا ہے:

> "....مردوں کے لیے تاج محل بنتے ہیں اور جندوں کو جھونپڑیاں نہیں ملتیں۔ تاج بی بی کا روجہ دیکھنے لوگ دور دیسوں سے آتے ہیں مگر گریبوں کی جھونپڑیوں میں کوئی جھانک کر نہیں دیکھتا۔ یہی دھرم ہے نا بھگوان کا... یہی نیائے ہے؟"

> "وہ..... بہت مقدس! تم اس کو کوٹھے پر لے جا کر بٹھا دیتے ہو اور پھر..... اور پھر خود ہی گاہک بن کر پہنچ جاتے ہو—"
>
> (ڈراما: کردار کا کردار)

> "پاکیزہ: ..... ڈاکٹروں کو جب تک فیس ملتی رہتی ہے وہ نا امید نہیں

ہوتے۔" (ڈراما: صنم کدے)

کیونکہ ابراہیم یوسف کے ڈراموں میں موضوعات و مسائل کا تنوع ملتا ہے۔ اس لیے ان کے کرداروں کے مزاج و ماحول میں یکسانیت پیدا نہیں ہو سکی ہے۔ انھوں نے ہر طبقہ، فرقے، عمر، پیشے اور ماحول سے متعلق کرداروں کی روزمرہ زندگی کے مسائل کو اپنے ڈراموں کا موضوع بنایا ہے اور سنجیدہ، المیہ، طربیہ، جذباتی، معاشرتی، اصلاحی، مقصدی اور نفسیاتی ہر طرح کے تاثر کو ظاہر کرنے کے لیے ڈرامے تحریر کیے ہیں۔ ان کے ڈراموں کے کردار حقیقت سے قریب نظر آتے ہیں۔ ابراہیم یوسف کی ڈراما نگاری سے متعلق ڈاکٹر سید حامد حسین کی یہ رائے درست ہے کہ:

> "ابراہیم یوسف نے نہ کبھی بت شکنی کا دعویٰ کیا اور نہ کبھی انھیں نئے بت تراشنے کا زعم رہا۔ لیکن اس کے باوجود انھوں نے اردو کے ایک بابی ڈرامے کو عہد جدید کے رجحانات کو قبول کرنے کا اہل بنایا ہے۔ انھوں نے ایک ایکٹ کے تنگ پیمانے میں انسانی ذہن و دماغ کی کشمکش کو سمیٹ کر پیش کرنے کے کامیاب تجربے کیے ہیں... اور یہ واضح کر دیا ہے کہ ڈراما اپنی دلچسپی کے لیے خارجی زیبائش، ظاہری کشمکش، سنسنی خیزی اور شعبدہ کاری کا مرہون منت نہیں۔ خود انسانی زندگی اپنے دامن میں جو مسائل سمیٹے ہوئے ہے وہی داستانِ حیات کو دلکش بنانے کے لیے کچھ کم نہیں ہے..... انھوں نے اپنے تین سو سے زیادہ ڈراموں کے ذریعے یہ واضح کر دیا ہے کہ ہماری روزمرہ کی گرد و پیش کی زندگی میں ڈرامائی موضوعات کی کوئی کمی نہیں ہے۔ اصل ضرورت فنی بصیرت کی ہے۔"

(ابراہیم یوسف کی ڈراما نگاری ماہنامہ 'شاعر' بمبئی جلد 46، شمارہ 11، 1975)

جیسا کہ لکھا جا چکا ہے، ابراہیم یوسف نے ڈراما نگاری کے علاوہ ڈرامے کے آغاز و ارتقا، فن، اصول اور تکنیک پر بھی مضامین اور کتابیں تحریر کی ہیں۔ ان کی کتاب 'اندر سبھا اور

اندرسبھائیں' (مطبوعہ نسیم بک ڈپو، لکھنؤ، 1980) موضوع کی اہمیت اور جامعیت کے اعتبار سے ان کا اہم تحقیقی کارنامہ ہے۔ دو حصوں پر مشتمل اس تحقیقی کتاب کے پہلے حصے میں اندرسبھاؤں کے پس منظر، محرکات اور ان کی فنی اور تاریخی اہمیت، لوک ناٹک اور اندرسبھا امانت، ام التمثیلات اندرسبھا امانت، اندرسبھا امانت اور اندرسبھا مداری لال، زمانی تقدم کا مسئلہ، ماہ منیر معروف بہ اندرسبھا مداری لال اور دو قدیم اندرسبھائیں (الف) بزم سلیمان (ب) جشن پرستان کا تعارف اور تجزیہ نہایت تحقیقی ژرف نگاہی اور تنقیدی بصیرت کے ساتھ پیش کیا ہے جب کہ کتاب کے دوسرے حصے میں مذکورہ بالا چاروں اندرسبھاؤں کے متن کو زمانی ترتیب کے ساتھ اصل مسودے کی روشنی میں ترتیب دے کر، ضمیمہ نمبر1 اور ضمیمہ نمبر2 میں مختلف تھیٹریکل کمپنیوں کے ذریعے کھیلی گئیں مختلف اندرسبھاؤں کی تفصیل پیش کی ہے۔ موضوع کے اعتبار سے یہ نہایت وقیع اور اہم کام ہے جس کے مطالعے سے ابراہیم یوسف کی تحقیقی دروں بینی، علمیت، ریاضت اور فنی صلاحیت کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔ بقول ظ انصاری:

> "اندرسبھا گزشتہ صدی کے وسط میں ہمارا اولین اوپیرا (Opera) ہے جو رہس کے بعد اودھ کی گنگا جمنی تہذیب کی ساری نفاست اور کثافت لیے ہوئے نمودار ہوا تھا۔ نوٹنکی کے عوامی اسٹیج کے بعد کی اور موجودہ ڈرامے سے پہلے کی یہ ایک درمیانی سیڑھی ہے جس سے تہذیبی منظر اور لسانی نقشے تک پہنچنے میں مدد ملتی ہے..... ابراہیم یوسف نے اس موضوع پر بڑا قابلِ قدر کام کیا ہے۔"
>
> (ماخوذ: 'کتاب شناسی'، اگست 1981، ص 35)

حقیقت یہ ہے کہ 'اندرسبھا اور اندرسبھائیں' ایک علمی تصنیف ہی نہیں ہے بلکہ ڈرامے کی تنقید میں اضافے کی حیثیت رکھتی ہے۔

ابراہیم یوسف کا مرتب کردہ 'صولت عالم گیری' اردو کا ایک قدیم، تاریخی ڈراما ہے جسے مولوی سید ابوالفضل الفیاض نے 1292 ہجری مطابق 1871 میں لکھا تھا۔ لیکن دست و برد

زمانہ کے ہاتھوں اس کا متن عام طور پر دستیاب نہیں تھا۔ ابراہیم یوسف نے اسے مرتب کر کے اور اس پر طویل مقدمہ تحریر کر کے ادارۂ ادب اردو، علوی بکڈپو بمبئی سے 1976 میں کتابی صورت میں شائع کرا کے اردو ڈراما کے شائقین کے لیے بطور تحفہ پیش کیا ہے۔

اگر چہ یہ اردو کا پہلا ڈراما نہیں ہے لیکن اردو کے اس قدیم ڈرامے سے متعلق فصیح احمد صدیقی کی یہ رائے صحیح ہے کہ:

> ''صولت عالم گیری کو بھی اردو کا پہلا دستیاب شدہ ڈراما نہیں کہہ سکتے تاہم اس کی اہمیت اس لحاظ سے بہت بڑھ جاتی ہے کہ یہ ڈراما 1843 تا 1857 کے درمیانی عہد کی ایک درخشاں کڑی ہے... چنانچہ کہا جاسکتا ہے کہ 'رادھا کنہیا کا قصہ' کے بعد اردو ڈرامے کی ایک قابلِ توقیر اور سائنٹفک صورت 'صولت عالمگیری' میں ہی نظر آتی ہے۔''
>
> (سخن ہائے گفتنی، مشمولہ: صولت عالمگیری، مرتبہ: ابراہیم یوسف)

ابراہیم یوسف صولت عالم گیری کو اردو کا پہلا یورپی طرز کا ڈراما تسلیم کرتے ہیں۔ انھوں نے 'صولت عالمگیری' میں شامل اپنے مقدمے میں اردو کا پہلا ڈراما اور ابتدائی دور کے اہم اردو ڈراما پر بحث کرتے ہوئے ڈراما اور ناٹک کو ایک ہی چیز ماننے پر اصرار کیا ہے۔ ڈراما 'صولت عالم گیری' سے متعلق ان کا خیال ہے:

> ''میں نے اپنے مضمون مطبوعہ 'شاعر' بمبئی مارچ 1974 میں 'صولت عالمگیری' کو قدیم ڈراما لکھا ہے اور اب بھی پہلا طبع زاد ڈراما کہنے کے مقابلے میں قدیم ڈراما کہنا ہی مناسب سمجھتا ہوں۔ کیونکہ اگر اس کو پہلا طبع زاد ڈراما تسلیم نہ بھی کیا جائے تو اس سے اس کی اس خوبی پر کوئی اثر نہیں پڑتا کہ یہ خالص یورپی انداز کا لکھا ہوا پہلا اردو ڈراما ہے۔''

'ہندی ڈرامے کا ارتقا' (ویدک دور سے 1948 تک) (مطبوعہ مدھیہ پردیش اردو اکادمی 1985:

ابراہیم یوسف کو محض یہی احساس نہیں تھا کہ اردو ڈرامانگاری پر خاطرخواہ کام نہیں ہوا ہے بلکہ انھیں اس بات کا بھی ملال تھا کہ اہل اردو سنسکرت، ہندی، بنگلہ اور ہندوستان کی دیگر علاقائی زبانوں کے ڈرامائی ادب سے اس لیے بے خبر یا ناواقف ہیں کہ اردو میں مذکورہ بالا زبانوں کے ادب خصوصاً ڈرامائی ادب پر کوئی تحقیقی یا تعارفی کام نہیں ہوسکا ہے۔ ابراہیم یوسف کا خیال تھا کہ اردو کے ڈرامائی ادب کی روایت اور صورت حال کو سمجھنے اور اس کے معیار و مزاج سے متعلق صحیح رائے قائم کرنے کے لیے ضروری ہے کہ قدیم ہندوستانی زبانوں اور اردو کی معاصر زبانوں کے ڈرامائی ادب کو پرکھا اور سمجھا جائے۔ چنانچہ مذکورہ بالا کتاب اسی مقصد کے حصول کے لیے قلم بند کی گئی ہے۔ کتاب کی وجہ تسمیہ کے سلسلے میں ابتدائی صفحات میں 'عرض مصنف' کے عنوان سے ابراہیم یوسف نے لکھا ہے:

> "اردو ڈرامے کی طرف توجہ نہ دینا تو اردو میں روایت بن گئی ہے لیکن اسی کے ساتھ دوسری زبانوں کے ڈرامائی ادب کی طرف بھی کم توجہ دی جاتی ہے بلکہ اگر یوں کہا جائے کہ بالکل توجہ نہیں دی جاتی تو کچھ غیر مناسب نہ ہوگا۔ مراٹھی، گجراتی، اور بنگالی زبانوں میں اچھا ڈرامائی ادب موجود ہے لیکن وہ حضرات جو صرف اردو سے واقف ہیں اور اردو ہی کے ذریعے دیگر زبانوں کے ادب سے واقفیت حاصل کرنا چاہتے ہیں ان کو دوسری زبانوں کے ڈرامائی ادب سے کوئی واقفیت نہیں ہوتی۔ سنسکرت میں دنیا کا بہترین ادب موجود ہے مگر اردو میں سنسکرت ڈرامے کی کوئی تاریخ موجود نہیں ہے۔ چند بکھرے ہوئے مضامین ہیں اور وہ بھی... رسائل کے اوراق میں دفن ہوکر رہ گئے ہیں۔ یہی حالت ہندی ڈرامے کے بارے میں ہے۔ شاید ہی اردو میں ہندی ڈرامے کے بارے میں کچھ لکھا گیا ہو اور اگر لکھا گیا ہے تو وہ کم از کم میری نظر سے نہیں گزرا۔ یہ حقیری کوشش اسی سلسلے میں ہے کہ اردو داں حضرات سنسکرت اور ہندی ڈرامے

کے بارے میں معلومات حاصل کرسکیں۔"

مذکورہ بالا کتاب چار ابواب پر مشتمل ہے۔ پہلے باب میں 'ابتدائیہ' کے عنوان سے مختلف قدیم ملکوں اور زبانوں میں ڈرامے کے آغاز و ارتقا کے علل و اسباب پر تحقیقی استدلال کے ساتھ اظہار خیال کیا گیا ہے اور ناٹک کی ہندوستانی روایات، ناٹیہ شاستر، روپک، اپ روپک اور ناٹک کے اجزائے ترکیبی پر تفصیلی بحث کی گئی ہے۔ دوسرے باب میں ہندوستانی ناٹک کے عہد بہ عہد ارتقا مثلاً ناٹک کے ویدک دور، پراکرت ڈراما، سنسکرت ڈراما اور اہم ڈراما نگاروں پر تبصرہ کرتے ہوئے سنسکرت ناٹک کے زوال کے اسباب پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ تیسرا باب، لوک ناٹک، جاترا یاترا ناٹک اور وانگ سے متعلق ہے جب کہ چوتھے باب میں ہندی ناٹک اور اس کے مختلف ادوار اور اہم ناٹک کاروں کے ناٹکوں کا جائزہ پیش کرتے ہوئے ہندی رنگ منچ، ہندی رنگ منچ کے چند ناٹک کار اور ہندی میں ایکانکی ناٹک پر سیر حاصل گفتگو کی گئی ہے۔ اس طرح اس کتاب کے مطالعے سے سنسکرت اور ہندی ناٹک کی پوری تاریخ، اس کی فنی خصوصیات، موضوعات اور پیش کش کا بخوبی علم ہوجاتا ہے۔

ابراہیم یوسف نے یہ کام فرض کفایہ کے بطور انجام دے کر اردو والوں کے لیے تحقیق وتنقید وتفہیم کی نئی راہیں کھول دی ہیں۔ کتاب کے آخر میں کتابیات کے علاوہ ڈرامے کی مصطلحات اور ڈراما نگاروں کے ناموں کا اشاریہ بھی شامل اشاعت ہے۔ اس اعتبار سے اپنی نوعیت کا یہ ایک ایسا اہم، وقیع اور منفرد تحقیقی کام ہے جس کے لیے آنے والی نسلیں استفادہ کرکے ڈرامائی ادب میں خاطر خواہ اضافہ کرتی رہیں گی۔

'گم شدہ خط' دراصل رومانیہ کے معروف حقیقت نگار ڈراما نویس یان لیوکا کرجیل (Ion Luca Caragiale) کا ڈراما 'A Lost Letter' (1884) کا اردو ترجمہ ہے جسے ابراہیم یوسف نے اردو میں منتقل کیا اور جولائی 1978 میں نسیم بکڈپو، لکھنؤ نے اسے شائع کیا۔ اردو میں ترجمہ شدہ اس ڈرامے کے آغاز میں ابراہیم یوسف نے تعارف کے عنوان سے نہ صرف اصل ڈراما نگار کی شخصیت اور ادبی خدمات کا تعارف کرایا ہے بلکہ مذکورہ بالا ڈرامے کے موضوع، فن، تکنیک، اسلوب پر بھی اپنی رائے کا اظہار کرتے ہوئے لکھا ہے:

"کرہجیل کی تخلیقات رومانین ادب میں کلاسک ہی نہیں بلکہ قوم کا قیمتی سرمایہ ہیں۔ اس کی تصانیف کے نمایاں خد و خال اس کی حقیقت نگاری، اس کا اندازِ بیان اور اس دور کی صحیح اور کامیاب ترجمانی ہے۔ اس کی تحریروں میں اس زمانے کے سماج، مختلف سماجی طبقوں ان کے احساسات و جذبات ان کا انداز فکر اور ان کی دلچسپیاں نمایاں طور پر ظاہر ہوتی ہیں... اپنی غیر معمولی ذہانت اور انداز بیان سے کرہجیل نے نہ صرف سوسائٹی کا نقشہ ہی کھینچا بلکہ اس دور کی ناانصافیوں اور ظلم و ستم کو بھی بے نقاب کیا ہے۔ یہ عظیم فن کار ایک طرف تو اعلیٰ طبقے کی بدعنوانیوں اور ظلم و ستم پر بھرپور وار کرتا ہے اور دوسری طرف عوام سے والہانہ محبت کرتا ہے جن کو وہ حقیقی آقا اور تخلیق کا منبع قرار دیتا ہے۔ ان کے دکھ درد کو اپنا دکھ درد سمجھتا ہے۔ یہ عظیم مصنف کسی ایک زمانے کا نہیں بلکہ ہر زمانے کا فن کار ہے۔ اس کی تصانیف لافانی ہیں... کرہجیل کی تخلیقات میں فن کا ترقی پسندانہ نظریہ ملتا ہے، حقیقت نگاری ہے، جمہوری نظریات ہیں۔ وہ کہتا ہے کہ بڑے فن کار کے لیے حقیقت نگاری سب سے اہم ہے۔ وہ کہتا ہے کہ ایک حقیقت پسند فن کار کو مسلسل اپنے زمانے کی برائیوں سے لڑتے رہنا چاہیے۔"

اردو میں ترجمہ شدہ 'گمشدہ خط' کے سلسلے میں ابراہیم یوسف نے لکھا ہے:

"اصل ڈرامے میں کوئی تحریف یا اضافہ نہیں کیا گیا ہے۔ کوشش کی گئی ہے کہ ترجمے میں کوئی الجھاؤ یا پیچیدگی پیدا نہ ہو۔ عام فہم اور سلیس ہو۔"

بلاشبہ ابراہیم یوسف نے ایک عالمی شہرت یافتہ اہم ڈراما نگار اور اس کے شاہ کار ڈرامے سے جس طرح اہلِ اردو کو متعارف کرایا ہے، اس کے لیے وہ تعریف و تحسین کے مستحق ہیں۔

'اردو کے اہم ڈرامانگار (متقدمین، متوسطین) اور (آغا حشر): مذکورہ بالا عنوان سے ابراہیم یوسف نے تین کتابیں لکھیں جنھیں علی الترتیب 1981، 1984 اور 1982 میں مالوہ پبلشنگ ہاؤس، بھوپال نے شائع کیا۔ اول الذکر کتاب یعنی اردو کے اہم ڈرامانگار (متقدمین) میں اردو کے چھ اہم قدیم ڈرامانگار: نسروان جی مہروان جی آرام، محمود میاں رونق، محمد الف خاں حباب، حافظ محمد عبداللہ، کریم الدین مراد اور حسینی میاں ظریف کے نام شامل ہیں۔ اس کتاب کے دوسرے حصے یعنی متوسطین میں اردو کے تین اہم ڈرامانگار ونایک پرشاد (طالب) سید مہدی حسن احسن لکھنوی اور پنڈت نرائن پرشاد بے تاب اور تیسرے حصے میں آغا حشر کے حالات زندگی اور ان کی ڈرامانگاری پر نہ صرف اظہار خیال کیا ہے بلکہ ڈرامے کے پیش رو محققین و ناقدین کی غلطیوں کی نشان دہی بھی کی ہے۔

مذکورہ بالا تینوں کتابوں میں شامل مواد ایسا اہم تحقیقی کام ہے جسے ابراہیم یوسف نے ڈرامے کے فن ارتقا اور اردو ڈراموں کے عمیق مطالعے کے بعد انجام دیا ہے۔ اس کے مطالعے سے ڈرامے سے متعلق ابراہیم یوسف کی غیرمعمولی معلومات اور تحقیقی، تنقیدی نیز تجزیاتی صلاحیتوں کا اندازہ ہوتا ہے۔

مذکورہ بالا کتابی سیریز کے پہلے جز یعنی 'متقدمین' کے ابتدائی صفحات میں ابراہیم یوسف نے بعنوان 'ابتدائی ڈراموں کے بارے میں' 28 صفحات پر مشتمل جو تحریر شامل کی ہے اس نے اس وجہ سے اردو کے قدیم ڈراموں سے متعلق ایک دستاویزی حیثیت اختیار کرلی ہے کہ اس میں ابراہیم یوسف نے اردو ڈراما کے مختلف مسائل سے متعلق بہت ہی غلط فہمیوں اور مفروضات کا جواب براہین اور دلائل کے ساتھ دیا ہے۔

ابراہیم یوسف اگرچہ جہانگیر جی پستن جی کھمباتا کے اس دعوے سے متفق ہیں کہ 'بمبئی اور پورے ہندوستان میں اردو ناٹکوں کو پارسیوں ہی نے پھیلایا تھا، لیکن کھمباتا کے اس خیال کو صحیح نہیں سمجھتے ہیں کہ ''اردو ناٹک کا پہلا مصنف بھی پارسی تھا۔''

اس ضمن میں ابراہیم یوسف کا خیال ہے کہ:

''مسٹر کھمباتا کا یہ دعویٰ کہ اردو ناٹکوں کو پورے ہندوستان میں

> پارسیوں نے پھیلایا حقیقت بنتی ہے۔ قطع نظر اس کے کہ ان کی خدمات تجارتی نقطۂ نظر سے میکانکی اور کرتبی اسٹیج کے لیے زیادہ تھیں اور اصل ڈرامے کے لیے کم۔" کھمباتا کے ثانی الذکر دعوے کو وہ پورے طور پر اس لیے تسلیم نہیں کرتے ہیں کہ بقول ان کے: "اردو کے پارسی ڈراما نگاروں اور ان کے ابتدائی ڈراموں کی تاریخ تاریکی میں ہے اور جو کچھ ہے وہ الجھن پیدا کرنے کے لیے کافی ہے۔"

اسی طرح ڈراما 'رستم و سہراب' اور 'خورشید' سے متعلق تراجم نیز تحقیقی تنقیدی کاموں سے پیدا ہونے والی غلط فہمیوں سے بھی ابراہیم یوسف نے پردہ اٹھایا ہے اور حقائق کی روشنی میں اپنے دلائل پیش کیے ہیں۔ ابراہیم یوسف نے اردو کے ابتدائی ڈراموں میں استعمال ہونے والی زبان سے متعلق پیدا ہونے والی غلط فہمیوں کا ازالہ بھی تحقیقی اور لسانیاتی استدلال کے ساتھ کیا ہے۔

اردو کے ابتدائی ڈراما نگاروں کے حالات زندگی سے متعلق ڈرامے کے محققین اور ناقدین میں خاصا اختلاف رائے پایا جاتا ہے۔ ابراہیم یوسف نے اس مشکل اور پیچیدہ کام کو حل کرنے یا پیدا شدہ اختلافات کو حقائق سے ہم کنار کرنے کی بھی کوشش کی ہے۔

اردو ڈراما نگاری کی تاریخ کے ادوار سے متعلق بھی غلط مبحث عام ہے۔ ابراہم یوسف نے منطقی اور تحقیقی طریقۂ کار سے کام لے کر اس مسئلے کو بھی بڑی حد تک سلجھانے کی کوشش کی ہے۔ اردو ڈرامے کے ادوار اور ان کی بدلتی صورت حال سے متعلق ان کا خیال ہے کہ:

> "اردو ڈرامے کا اولین دور اندرسبھائی اثرات کا دور ہے جو کم و بیش انیسویں صدی کی آخری دہائی تک قائم رہتا ہے۔"

اردو ڈرامے کے دوسرے دور سے متعلق انھوں نے لکھا ہے:

> "طالب بنارسی نے جو پودا لگایا تھا اس نے انیسویں صدی کی آخری دہائی سے پھل دینا شروع کردیا۔ یہ اردو ڈرامے میں ایک نیا موڑ تھا۔ اس موڑ کے ساتھ ہی ایک نیا دور شروع ہوا جس کو ہم اردو ڈرامے کا

دورِ دوم کہہ سکتے ہیں اور جو اس وقت تک قائم رہا جب تک 1930-32 تک اسٹیج نے فلم کے سامنے ہتھیار نہ ڈال دیے... 1930-32 کے بعد جب اردو ڈرامے کا رشتہ تجارتی تھیٹر سے ٹوٹنے لگا تو اردو ڈراما کالجوں اور اسکولوں کے اسٹیج پر پناہ لینے پر مجبور ہوگیا... کالجوں اور اسکولوں میں یک بابی یا مختصر ڈراموں کی مانگ بڑھی، اس لیے پورے وقت کے ڈراموں کی طرف سے ڈراما نگاروں کی توجہ ہٹ کر یک بابی ڈرامے پر مرکوز ہوگئی۔ اس لیے اس دور کو ہم اردو میں ایک اور رجحان ٹیلی ڈراموں کا پیدا ہوا جس میں ڈرامے خالص ادبی نقطۂ نظر سے پڑھنے کے لیے لکھے گئے اس طرح آہستہ آہستہ اردو ڈرامے کا رشتہ اسٹیج سے ٹوٹ گیا۔ لیکن آزادی کے بعد پھر ڈرامے کی اہمیت بڑھنا شروع ہوئی۔ دوسری زبانوں کے ساتھ ساتھ اردو ڈراما بھی بیرونی ممالک میں چلنے والی تحریکات سے متاثر ہوا اور اردو ڈراما نگاروں نے بھی نئے نئے تجربات کرنا شروع کیے۔“

اردو ڈرامے کے آغاز و ارتقا نیز بدلتی صورتِ حال کے علل و اسباب سے متعلق ابراہیم یوسف نے بہت صحیح تجزیہ پیش کرکے دلائل کے ساتھ اپنے جن خیالات کا اظہار کیا ہے انھیں بڑی حد تک قابلِ قبول اور قرینِ قیاس کہا جاسکتا ہے۔

ابراہیم یوسف نے اپنے اس مقدمے میں اردو تجارتی تھیٹر سے وابستہ ڈراما نگاروں کی طویل فہرست میں انتخاب سے کام لے کر، دورِ اوّل کے صرف چھ ڈراما نگاروں (جن کے نام ابتدا میں تحریر کردیے گئے ہیں) کا انتخاب کرکے ان سے متعلق تمام ضروری اور اہم معلومات کو زیرِنظر کتاب میں پیش کرکے ایک اہم کام انجام دیا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ مذکورہ بالا چھ ڈراما نگاروں کو ہم دورِ اوّل یا اندرسبھائی دور کے ڈرامانویس کہہ سکتے ہیں۔

کتاب کے دوسرے حصے یعنی (متوسطین) کے بارے میں انھوں نے لکھا ہے:

"دورِ دوم کی فہرست اور بھی طویل تھی، اس میں چار ڈراما نگاروں
یعنی طالب، احسن، بے تاب اور آغا حشر کا انتخاب کیا گیا۔"

مذکورہ بالا چاروں ڈراما نگاروں کی صحیح تاریخ پیدائش کا علم نہ ہونے کے سبب تقدیم و تاخیر کا مسئلہ پیدا ہوا تو ابراہیم یوسف نے اس مسئلہ کا حل اس طرح نکالا کہ "جس کا مطبوعہ ڈراما پہلے کا ہے وہ پہلے اور جس کا بعد کا ہے وہ بعد میں اسی ترتیب سے یہاں جگہ دی گئی ہے۔"

دورِ متوسطین کے ڈراموں اور ڈراما نگاروں کے متعلق ابراہیم یوسف نے اپنے پیش لفظ میں لکھا ہے:

"اردو ڈرامے کا یہ دور متوسطین کا دور ہے جسے بالعموم پارسی تھیٹر کا نام دیا جاتا ہے، جو اردو ڈرامے کا اہم ترین دور ہے۔ پارسیوں نے اردو تھیٹر کو تجارتی بنیادوں پر شروع کیا تھا... ظاہر ہے کہ جب ان کے اس شوق نے تجارتی صورت اختیار کی تو فن کے مقابلے میں حصولِ زر ان کے پیشِ نظر تھا اس لیے اچھے اسکرپٹ کے مقابلے میں انھوں نے ڈرامے میں ان ذرائع کا استعمال کیا جس سے وہ زیادہ سے زیادہ لوگوں کے تفریحی جذبات کی تسکین کر سکیں... اس طرح اس دور میں اسکرپٹ ثانوی چیز ہو کر رہ گیا تھا اور ڈراما نگار جن کی حیثیت ملازم کی ہوتی تھی، وہی کچھ لکھنے پر مجبور تھے جس سے مالک کو زیادہ سے زیادہ نفع حاصل ہو سکے۔"

دورِ متوسطین کی صورت حال اور خصوصیات پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے ابراہیم یوسف نے یہ صحیح لکھا ہے کہ:

"اس دور کی اہم خصوصیت یہ ہے کہ اب اردو ڈراما اندر سبھائی دور سے نکل آیا، اگرچہ اس سے خالص اردو ڈرامے کی موت ہو گئی اور اردو ڈراما اپنا کوئی علاحدہ وجود قائم نہ کر سکا مگر یہ بات ضرور ہوئی کہ اردو ڈرامے میں سماجی مسائل کو جگہ مل گئی.... اردو ڈرامے میں یہ

> تبدیلی گزرے ہوئے دور سے ایک خاموش بغاوت تھی جس کے اچھے اثرات آنے والے دور پر پڑے۔ خاص طور پر جب یک بابی ڈراموں کا دور آیا تو یک بابی ڈرامے مسائلی ڈرامے بن کر سامنے آئے جنھوں نے اردو ڈرامے کو ایک وقار بخشا اور سماجی، سیاسی، معاشی، معاشرتی ہر قسم کے مسائل اردو ڈرامے میں پیش کیے جانے لگے۔ نفسیاتی الجھنیں بھی ڈرامے کا موضوع بن گئیں۔ کرداری ڈراموں پر زور دیا جانے لگا اور متوسطین نے جو ایک دھندلی سی راہ دکھلائی تھی آنے والی نسل نے اسے روشن کر دیا۔"

دور متوسطین کے اہم ڈرامانگاروں میں آغا حشر کا نام بھی شامل ہے۔ کیونکہ وہ اس دور کے سب سے اہم اور مقبول ڈراما نگار ہیں اور ان پر سب سے زیادہ لکھا گیا ہے اس لیے ابراہیم یوسف نے ان سے متعلق ایک علاحدہ جلد کا اہتمام کیا۔ 'اردو کے اہم ڈراما نگار' سیریز کی آخری کتاب پورے طور پر آغا حشر سے متعلق ہے جس میں آغا حشر کی شخصیت اور ڈرامانگاری سے متعلق سبھی اہم اور ضروری معلومات پیش کردی گئی ہیں۔ اس جلد کے آخر میں تین ضمیمے بھی شامل ہیں۔ ضمیمہ نمبر1 میں آغا حشر سے متعلق آغا جمیل کاشمیری کا خط، ضمیمہ نمبر 2 میں آغا حشر کے چند مشہور گانے اور ضمیمہ نمبر3 میں وہ اپیل شامل ہے جو 'یوم حشر' منانے کے لیے جاری کی گئی تھی اور جس میں کئی اہم شخصیات کے دستخط تھے۔ یہ ضمیمے اس لیے شامل کیے گئے تا کہ ان کے مطالعے کے بعد آغا حشر کی اہمیت اور مقام و مرتبے کا اندازہ لگایا جاسکے۔

ابراہیم یوسف کی کتاب 'اردو ڈرامے کی تنقید کا جائزہ' چار ابواب پر مشتمل ہے جس میں اردو ڈرامے کے اہم ناقدین، مبصرین و محققین کی خدمات کے ساتھ ساتھ آزادی سے پہلے اور بعد کے اردو ڈرامے کی تنقید کا جائزہ بھی پیش کیا گیا ہے۔ اس کتاب کی وجہ تسمیہ کے متعلق ابراہیم یوسف نے اپنے پیش لفظ میں لکھا ہے:

> "اس کتاب کو ترتیب دینے کا مقصد یہ ہے کہ اردو ڈرامے کی تنقید

کے محرکات اور رجحانات ایک جگہ جمع کر دیے جائیں جو ابتدا۔
حال کارفرما رہے ہیں۔ چونکہ ہر صنف ادب وقت کے تقاضوں کے
مطابق ہیئت اور موضوعات میں تبدیلیاں قبول کرتی ہے۔ اسی کے
ساتھ تنقید بھی اپنے راستے بدلتی ہے۔ اردو ڈرامے کی تنقید بھی اس
اصول سے مستثنیٰ نہیں ہے اس نے بھی گرم و سرد حالات دیکھے ہیں
اور آج بھی ایک بہتر افق کی تلاش میں ہے۔"

اس کتاب میں اردو ڈراما نگاری، اس کے فن اور بدلتے ہوئے اصول نقد پر ایسا سیر حاصل مواد پیش کیا گیا ہے کہ اس کے مطالعے سے نہ صرف پوری تصویر سامنے آجاتی ہے بلکہ ڈراما نگاری سے متعلق ابراہیم یوسف کے وسیع تر مطالعے اور وقیع تر آرا کا بھی علم ہوتا ہے۔

ڈراما نگاری کا فن، اصول، تکنیک اور اردو ڈرامے کی ابتدا و ارتقا اور بدلتی ہوئی صورت حال سے متعلق ابراہیم یوسف کے ذریعے لکھی جانے والی تمام تحقیقی تنقیدی کتابیں، تراجم، ترتیب اور مضامین وغیرہ کے مطالعے سے جہاں فن ڈراما نگاری اور اردو میں ڈراما نگاری سے متعلق کئی اہم معلومات حاصل ہوتی ہیں، کئی غلط فہمیاں دور ہوتی ہیں، کئی سوالات کے جوابات مل جاتے ہیں، کئی ٹوٹی ہوئی کڑیاں جڑ جاتی ہیں، ڈرامے میں کیے گئے مختلف تکنیکی اور فنی تجربوں کا علم ہوتا ہے۔ ڈراموں کے صحیح متن کی گتھیاں سلجھتی ہیں، اصلی اور نقلی طبع زاد اور ترجمہ شدہ، اہم و غیراہم ڈراموں اور ڈراما نگاروں کا پتہ چلتا ہے وہیں ڈرامے کے قدآور ماہرین، محققین اور ناقدین کے ذریعے صادر کیے ہوئے غلط فیصلے، حاصل شدہ غلط نتائج اور پیدا کردہ غلط فہمیوں اور افواہوں پر سے بھی پردے اٹھتے ہیں اور اصل حقیقت سامنے آکر صحیح نتائج اخذ کرنے اور صحیح رائے قائم کرنے میں مدد ملتی ہے۔ ڈراما نگاری سے متعلق ابراہیم یوسف نے اپنے فیصلوں یا نتائج میں کسی قسم کی ادعائیت سے کام نہیں لیا ہے۔ جو بات کہی ہے حقائق یا اصل متن کی روشنی میں کہی ہے اور جن امور تک ان کی رسائی نہیں ہو سکی ہے ان سے عدم دستیابی یا لاعلمی کا اظہار کر کے نہ صرف معذرت کرلی ہے بلکہ انھیں آنے والی نسل کے محققین و ناقدین پر چھوڑ دیا ہے۔ تاکہ وہ ان

سلسلوں کو آگے بڑھائیں اور اردو ڈرامے کی بقا اور اس کے ارتقا کے لیے معیاری تحقیقی تنقیدی کام انجام دے سکیں۔

بلاشبہ ابراہیم یوسف ڈراما کے سچے عاشق تھے۔ ڈراما نگاری اور اس سے متعلق ان کے تمام ادبی کام اس صنف ادب سے ان کے فطری لگاؤ، عمیق مطالعے، وسیع تر مشاہدے اور ان کی غیر معمولی تحقیقی، تنقیدی اور تخلیقی صلاحیتوں کا مظہر ہیں۔

اردو میں ایسے ڈراما نگار بہت کم ہیں جنھوں نے ڈرامے کی تخلیق کے ساتھ ساتھ اس کی تحقیق، تنقید، تالیف اور ترجمہ پر بھی اتنا وقیع اور معیاری کام انجام دیا ہو جتنا کہ ابراہیم یوسف نے انجام دیا ہے۔ انھوں نے اپنی تمام عمر ڈراما نگاری کی خدمت میں صرف کردی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ وہ تعداد و معیار دونوں اعتبار سے ایک اچھے اور کامیاب ڈراما نگار ہی نہیں تھے بلکہ ڈرامے کے بہت اچھے محقق، نقاد، مبصر، مترجم اور مولف بھی تھے۔

ابراہیم یوسف کے ڈراموں کے سات مجموعے اور فن ڈراما نگاری سے متعلق چھ تحقیقی، تنقیدی کتابیں، ترجمہ شدہ ایک ڈراما، ترتیب شدہ ایک قدیم ڈراما اور ہند و پاک کے موقر ادبی جرائد میں شائع ان کے ڈرامے اور مضامین اب بآسانی دستیاب نہیں ہیں۔ ابراہیم یوسف اردو ڈراما نگاری کی تاریخ میں ایک اہم مقام رکھتے ہیں اس لیے ان کی شخصیت اور مجموعی ادبی خدمات کے پیش نظر اور ان پر یا اردو ڈراما نگاری پر تحقیقی کام انجام دینے والے اسکالرس کے لیے ان کے کلیات کی اشاعت وقت کی اہم ضرورت تھی، جس کی اشاعت کی تکمیل، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی کی جانب سے اس کے خصوصی اشاعتی پروجیکٹ کے تحت عمل میں آرہی ہے۔

'کلیات ابراہیم یوسف' چار جلدوں پر مشتمل ہے۔ پہلی جلد میں ابراہیم یوسف کے ڈراموں کے پانچ مجموعے 'سوکھے درخت'، 'طنزیہ ڈرامے'، 'دھوئیں کے آنچل'، 'پانچ چھے ڈرامے'، اداس موڑ' اور دوسری جلد میں 'الجھاوے'، 'پرچھائیوں کا پیچھا' اور رسائل میں شائع ڈرامے شامل اشاعت ہیں۔ تیسری جلد ابراہیم یوسف کی تالیف 'اندر سبھا اور اندر سبھائیں'، ترجمہ شدہ ڈراما 'گم شدہ خط' مرتب کردہ ڈراما 'صولت عالم گیری' اور رسائل میں شائع

مضامین پر مشتمل ہے جب کہ چوتھی اور آخری جلد میں ابراہیم یوسف کی تحقیقی تنقیدی کتب اردو کے اہم ڈراما نگار (متقدمین، متوسطین اور آغا حشر) 'اردو ڈرامے کی تنقید کا جائزہ'، 'ہندی ڈرامے کا ارتقا' اور ناول 'آبلے اور منزلیں' کو شامل کیا گیا ہے۔

'کلیات ابراہیم یوسف' کی اشاعت پر میں قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان (نئی دہلی) کے ارباب حل وعقد، خصوصاً پروفیسر وسیم بریلوی وائس چیئرمین (این سی پی یو ایل) اور اس کے فعال ڈائرکٹر ڈاکٹر خواجہ محمد اکرام الدین، میرے کرم فرما اور پروجیکٹ کمیٹی کے سربراہ پروفیسر گوپی چند نارنگ صاحب اور کمیٹی کے جملہ اراکین کا دل کی گہرائیوں سے شکریہ ادا کرتا ہوں۔

میرے عزیز دوست پروفیسر خالد محمود اور کرم فرما پروفیسر عتیق اللہ صاحب جس طرح میرے نجی اور ادبی کاموں میں میری پرخلوص معاونت فرماتے رہے ہیں اس کے لیے شکریے کا لفظ میرے جذبات کی مساعدت نہیں کرتا۔ بہرحال اپنے خوشگوار اخلاقی فرض کی ادائیگی کے لیے میں ہران حضرات کا شکرگزار ہوں۔

ابراہیم یوسف (مرحوم) کے اس کلیات سے متعلق تمام تر مواد کی فراہمی میں ان کے ورثا خصوصاً ان کے بیٹے محمد علی خاں عرف تاج میاں نے میری بھرپور معاونت کی ہے۔ میں ان کا بھی شکرگزار ہوں۔

امید کہ یہ کلیات اردو ڈراما نگاری، ابراہیم یوسف کی شخصیت اور ادبی خدمات پر تحقیقی تنقیدی کام کرنے والے ریسرچ اسکالرس اور محققین کے لیے معاون ثابت ہوگا اور ادبی حلقوں میں اس کی خاطرخواہ پذیرائی ہوگی۔

محمد نعمان خاں

سوکھے درخت

ایک کہانی

جب میں تمھارے پاس پہنچا تو تم نے حسب معمول دیر میں آنے کی شکایت کی اور جب میں نے اس کتاب کا مسودہ بتلا کر کہا کہ میں اس کا انتساب تمھارے نام کرنا چاہتا ہوں تو تم شرما گئیں اور بولیں کہ ''کیا آپ میرا نام بھی لکھ دیں گے۔'' میں نے کہا ''اس میں کیا حرج ہے'' تم بولیں ''اس سے تو بڑی بدنامی ہوگی لوگ جانے کیا سمجھیں گے۔'' میں نے کہا ''اچھا'' پھر میں اس کا انتساب اس خاتون کے نام کروں گا جو اپنے نام تک کا پردہ کرتی ہے۔'' اور تم مسکرانے لگیں۔

18 جون 1952

ابراہیم یوسف
بیرون پیردروازہ
(بھوپال)

لاش کے گرد

منظر اور کردار

(یہ ان چھوٹے چھوٹے کوارٹروں میں سے ایک کوارٹر کی کہانی ہے جو عالیشان کوٹھیوں کے پاس اس لیے بنائے جاتے ہیں کہ ان میں رہنے والے کوٹھی کے حسنِ ظاہری کو برقرار رکھنے کے علاوہ کوٹھیوں میں رہنے والوں کی خدمت بھی کرسکیں— یہ ایک ایسی رات کی کہانی ہے جب کہ تاریکی کے دیوتا اپنے پر پھیلائے ہوئے تھے اور ہوا کے دیوتا کی خوفناک سانسیں اس قدر تیز ہوگئی تھیں کہ کوارٹر میں جلتا ہوا دیا خوف سے کانپ رہا تھا۔ گرج اور چمک کا دیوتا اپنے جلال کا آخری مظاہرہ کررہا تھا— یہ 8-7 سالہ معصوم طاہرہ کی کہانی ہے جس کے چہرہ کی معصومیت پر اداسی اور پریشانی کی گھٹائیں چھائی ہوئی تھیں اور جو اپنی ماں کی پٹی سے لگی اس کے کراہنے کی آواز سن رہی تھیں— یہ بیس اکیس سالہ مفلوج زینت کی کہانی ہے جس کی رگ رگ سے جوانی پھوٹی پڑرہی تھی۔ مگر قدرت نے جس کو مفلوج بدن عطا کرکے ایک پھٹے پرانے بستر پر ڈال دیا تھا جو یاس اور ناامیدی کی مکمل تصویر بنی اپنی ماں کی آخری سانسیں گن رہی تھی— یہ سترہ اٹھارہ سالہ حسین اور صحت مند زبیدہ کی کہانی ہے جو جھلملاتے ہوئے چراغ کے نیچے بیٹھی تھی جس کے چہرہ پر معصومیت اور تقدس

کے علاوہ جوانی کا اُبھار تھا اور اعضا متناسب لیکن چہرہ سے یہ معلوم ہوتا تھا کہ دنیا کے افکار اس کے گرد جمع ہیں — یہ گِدھ جیسی آنکھوں والے منور کی کہانی ہے جو زبیدہ کے سامنے اس کا آخری فیصلہ سننے کے لیے بیٹھا تھا۔ جو اپنے آقا رحمٰن میاں کا سچا غم خوار تھا اور جس کو 25 روپے تنخواہ اس لیے ملتی تھی کہ وہ ان کے لیے ہر رات ایک نئی چھوکری فراہم کرے اور موقع ملنے پر ان کی چھوڑی ہوئی پلیٹ سے خود بھی کچھ چکھ لے — یہ بڑھیا کے بابا رحیم کی کہانی ہے جو بڑھیا اور اس کی تینوں بچیوں کا آخری سہارا تھا جو ایک مہینہ سے لاپتا تھا اور جس کی تلاش میں پولیس متعدد مرتبہ اس چھوٹے سے کوارٹر کو اپنے قدموں سے زینت بخش چکی تھی۔ یہ رحمٰن میاں کی کہانی ہے جن کی جیب میں پیسہ تھا اور رگوں میں جوانی کا خون اور غرور کا نشہ — یہ اس وقت کی کہانی ہے جب زبیدہ کے گالوں پر آنسو کے موتی بہہ رہے تھے اور کوارٹر میں بوڑھی کی سسکیاں سنائی دے رہی تھیں — یہ اس وقت کی کہانی ہے جب منور زبیدہ سے کہہ رہا تھا —)

منور : زبیدہ! میرا کہا مان لے۔ میں تیری بھلائی کو کہہ رہا ہوں۔ پاگل نہ بن۔ میں تیری برائی نہیں چاہتا۔

زبیدہ : چچا! گناہوں کا بوجھ دے کر بتلانا چاہتے ہو کہ یہ جواہرات ہیں۔ (رو کر) نہیں نہیں — مجھے ایسے جواہرات نہیں چاہئیں۔

منور : تجھ جیسی ہر نا سمجھ لڑکی پہلی مرتبہ لذت کو گناہ ہی سمجھتی ہے۔

زینت : چچا! اگر تمھارے کوئی لڑکی ہوتی تو کیا تم اس سے اسی طرح سودا کرتے۔ ماں چند گھنٹوں کی مہمان ہے اگر وہ سن لیتی تو تمھاری ان موٹی موٹی مونچھوں کو نوچ کر پھینک دیتی۔

منور : (زینت کی بات پر دھیان نہ دے کر) ہاں تو زبیدہ! تیرا آخری فیصلہ کیا ہے؟ اب میں کچھ زیادہ نہیں بولوں گا — (مونچھوں پر ہاتھ پھیر کر) بہت سمجھا چکا اتنا اور سن لے یہ سودا مہنگا نہیں۔ عمر بھر راج کرے گی۔

زبیدہ : بس بس کہہ چکی اب تم جاؤ۔ (رونے لگتی ہے) آج تم کیسی باتیں کر رہے ہو۔ شرم نہیں آتی تم کو۔ (ہچکیوں کی آواز تیز ہو جاتی ہے)

منور : (کھڑے ہوکر) بس تو میں جارہا ہوں۔ لیکن یاد رکھ زبیدہ کہ تیرے غرور کا سر جھکے گا۔

(منور مونچھوں پر ہاتھ پھیرتا ہوا کمرہ سے نکل جاتا ہے۔ زبیدہ دوڑ کر اپنی قریب المرگ ماں سے لپٹ جاتی ہے اور ہچکیوں سے رونے لگتی ہے۔ پھر ایک دم جذبات اور خوف سے مغلوب ہوکر)

زبیدہ : ماں— ابھی نہ مرو ماں— ماں— میری ماں۔

(برابر روتی رہتی ہے)

طاہرہ : (زبیدہ سے لپٹ کر) زبیدہ آپا روتی کیوں ہو— اماں کہتی تھیں وہ ابھی نہیں مریں گی— ابھی انھیں تمھاری شادی کرنا ہے۔ بھیا کی بہو لانا ہے تم روتی کیوں ہو۔ زبیدہ آپا— وہ ابھی نہیں مریں گی۔

(زبیدہ طاہرہ کو چمٹا کر اسے پیار کرتی ہے اور اپنے آنسو پونچھتی ہے اور طاہرہ کے سر پر ہاتھ پھیرنے لگتی ہے)۔

زبیدہ : نہیں میری ننھی— وہ ابھی نہیں مریں گی۔

زینت : (دعا کے لیے ہاتھ اٹھا کر) اے خدا تو بڑا رحیم و کریم ہے— غریبوں کی اُمید کا آخری سہارا ہے۔ ہماری حالت پر رحم کر اپنے حبیبؐ پاک کے صدقے میں اپنی خدائی کے صدقے میں (زینت کی آنکھوں میں آنسو آجاتے ہیں) اے خدا اگر تیری مشیت ایک جان ہی کی بھینٹ چاہتی ہے۔ تو پھر ماں کے بدلے مجھے اٹھا لے میں مفلوج اور اپاہج ہوں— دنیا کو میری ضرورت نہیں۔

(ایک قہقہہ فضا میں گونجتا ہے اور سڑک پر سے ایک موٹر تیزی سے گزر جاتی ہے۔ اس قہقہہ سے کوارٹر کی فضا میں ایک ہلچل پیدا ہوجاتی ہے۔ زبیدہ اور زینت اس بے وقت قہقہہ سے کانپ جاتی ہیں اور کوارٹر میں ایک سکوت سا چھا جاتا ہے۔ اس سکوت میں بڑھیا کے کراہنے کی آواز پیدا ہوتی ہے۔ زبیدہ خوف زدہ نظروں سے بڑھیا کو دیکھتی ہے)

بڑھیا : زبیدہ بیٹی — پانی — (کراہتی ہے) پیاس پانی — بیٹی — زبیدہ — زبیدہ پانی —

زبیدہ : (تیزی سے اٹھ کر) لائی ماں — اب کیسی طبیعت ہے؟

بڑھیا : (کراہتے ہوئے) زبیدہ بیٹی — جلدی بڑی پیاس ہے بیٹی۔ موت کی پیاس —

زبیدہ : ایسا نہ کہو۔ ماں (ایک کونے میں رکھے ہوئے مٹی کے گھڑے میں سے پانی لاکر) لو ماں —

بڑھیا : جلدی لا بیٹی — یا خدا — (کراہتی ہے) کتنی پیاس ہے — حلق میں کانٹے پڑ رہے ہیں — یہ مجھے دکھائی کیوں نہیں دیتا۔ آسمان پر اندھیرا کیوں ہے — اے خدا —

زبیدہ : (اس کے گلے میں ہاتھ ڈال کر سہارا دے کر اٹھاتے ہوئے) لو ماں پانی پی لو — اب طبیعت کیسی ہے؟ (بڑھیا گھبرا کر پانی کا پیالہ ختم کرتی ہے۔ ہونٹوں کو چاٹتی ہے اور بستر پر لیٹ جاتی ہے)

بڑھیا : (کراہتے ہوئے) رحیم کہاں گیا۔ ابھی تو یہیں کھڑا تھا۔ دیکھو تو شریر پھر چلا گیا — مگر — میرے لیے — اوہ دل میں کیسا درد اٹھ رہا ہے — دوا لینے گیا ہے وہ ابھی ضرور آئے گا — اوہ اوہ —

(نڈھال ہو کر گردن ایک طرف ڈال دیتی ہے)

زبیدہ : (گھبرا کر بڑھیا کے دونوں بازو پکڑ کر) ماں — ماں — تم بولتی کیوں نہیں (روتے ہوئے اسے جھنجھوڑتی ہے) ماں — ماں — یہ دیکھو ننھی طاہرہ تمھارے پاس بیٹھی ہے۔ اس سے دو چار باتیں تو کر لو ماں —

(بڑھیا آہستہ آہستہ آنکھیں کھولتی ہے)

بڑھیا : بیٹی زبیدہ — طاہرہ کہاں ہے؟

زبیدہ : (طاہرہ کو گود میں اٹھا کر بڑھیا پر جھکاتے ہوئے) یہ ہے ماں — دیکھو تمھارے پاس ہے اس کو پیار تو کر لو — دیکھو ماں یہ رو رہی ہے —

(بڑھیا دونوں ہاتھ بڑھا کر اس کے گالوں کو چھوتی ہے اور پھر اپنا سر اوپر

اٹھانے کی کوشش کرتی ہے۔ زبیدہ طاہرہ کو اور اس کے پاس کر دیتی ہے۔
بڑھیا طاہرہ کو پیار کرتی ہے۔ طاہرہ روتے ہوئے)

طاہرہ : ماں! ماں!!! ابھی مرنا نہیں ماں۔ ابھی تو تمھیں بھیا کی بہو لانا ہے۔ ماں ابھی تمھیں زبیدہ آپا کی شادی بھی تو کرنا ہے۔

(بڑھیا کے چہرہ پر مسکراہٹ آجاتی ہے پھر نحیف اور کمزور آواز میں)

بڑھیا : ہاں ابھی نہیں مروں گی بیٹی— مجھے — مجھے تیرے بھیا کی— بہو لانا ہے— زبیدہ کی شادی کرنا ہے۔ زینت کہاں ہے بیٹی؟

زینت : تیرے ہی پاس ہوں ماں— اے خدا ہماری ماں پر رحم کر۔

بڑھیا : رحیم نہیں آیا۔ وہ ضرور آئے گا۔ میرا دل گواہی دیتا ہے۔ مگر جانے وہ ہے کہاں زبیدہ بیٹی تو طاہرہ اور زینت کا خیال رکھنا۔ (ایک زوردار ہچکی آتی ہے) دیکھو دیکھو وہ رحیم آرہا ہے۔ وہ گھبرایا ہوا کیوں ہے۔ وہ میرے لیے ضرور دوا— میرے لیے پانی— اوہ میرے خدا (ایک زوردار ہچکی آتی ہے آنکھیں پتھرا جاتی ہیں۔ سر ایک جانب ڈھلک جاتا ہے۔ زبیدہ گھبرا کر طاہرہ کو زمین پر بٹھا دیتی ہے۔ اور بڑھیا کی نبض دیکھتی ہے پھر ایک دم چیخ کر۔

زبیدہ : ماں— ماں— (رونے لگتی ہے) تم ہمیں تنہا چھوڑ کر چلی گئیں ماں— ماں— ماں۔

زینت : زبیدہ کیا ہوا ماں کو— زبیدہ بولو— تم رو کیوں رہی ہو۔ (زینت بھی رونے لگتی ہے۔ طاہرہ بھی چلا کر روتی ہے اور بڑھیا سے لپٹ جاتی ہے)

طاہرہ : ماں تم تو کہتی تھیں کہ تمھیں زبیدہ آپا کی شادی کرنا ہے— تم ابھی نہیں مروگی ماں— تمھیں بھیا کی بہو لانا ہے ماں ماں—

(پھر بڑھیا کی لاش سے چمٹ جاتی ہے— زبیدہ اسے علیحدہ کرتی ہے۔ اپنے آنسو پونچھتی ہے اور پھٹا ہوا لحاف ماں کی لاش پر ڈال دیتی ہے اور پھر ایک دم رونے لگتی ہے ہوا اور تیز چلنے لگتی ہے۔ کھڑکی کے پاس لگا ہوا سڑک کا بلب

یکا یک گل ہو جاتا ہے اور اس کی روشنی کوارٹر میں آنا بند ہو جاتی ہے جس سے کوارٹر میں تاریکی بہت زیادہ ہو جاتی ہے۔ کوارٹر میں جلتا ہوا دیا برابر جھلملاتا رہتا ہے)

زینت : رحیم بھیا ایک مہینہ سے نہیں آئے۔ اب کیا ہوگا زبیدہ (زبیدہ کچھ جواب نہیں دیتی) اب کیا ہوگا (سسکیوں سے روتی ہے) اس وقت کوئی اتنا بھی تو نہیں ہے کہ شریف کو خبر کردے۔ وہ تم سے شادی کرنا چاہتا ہے نا زبیدہ— وہ ہماری ضرور مدد کرے گا۔

زبیدہ : ہاں وہ ضرور مدد کرے گا— مگر اس تاریک رات میں اُسے خبر کیسے ہو؟ کیا میں جاؤں وہاں؟

زینت : نہیں زبیدہ— تو نہ جا۔ جانے منور نے کیا منصوبہ باندھا ہے۔

طاہرہ : میں جاؤں زینت آپا— مجھے تو ڈر نہیں لگتا—

زبیدہ : (طاہرہ کو پیار کرتی ہے۔ ایک دم کوارٹر کھلتا ہے اور رحیم گھبرایا ہوا داخل ہوتا ہے چھپنے کے لیے اِدھر اُدھر دیکھتا ہے)

طاہرہ : (دوڑ کر اس کے پاس جاتے ہوئے) رحیم بھیا آ گئے۔

رحیم : ہشت! خاموش رہ۔

(چھپنے کی کوشش کرتا ہے)

زبیدہ : مگر بھیا— ماں—

رحیم : مرنے دو ماں کو— دیکھ دروازہ پر تو کوئی نہیں ہے۔

زبیدہ : (ٹھنڈی سانس بھر کر) ماں مر ہی گئی بھیا۔

رحیم : (ایک دم جیسے خود کو بھول کر) ماں مر گئی— کیا سچ مچ مر گئی (دوڑ کر اس کے پلنگ کے پاس جا کر) ماں کیا تم مر گئیں۔ سچ مچ مر گئیں ماں— (بڑھیا کی لاش سے لپٹ کر رونے لگتا ہے) ماں میں تو تمھیں سے ملنے آیا تھا ماں— ماں۔ ماں۔ بولو نا— تم خاموش کیوں ہو۔

زینت : رحیم بھیا— (رو کر) وہ تمھارے لیے بہو لانے گئی ہیں۔ کتنی خواہش تھی انھیں تمھاری بہو لانے کی۔ آخری وقت تک وہ تمھیں یاد کرتی رہیں (سسکیاں بھر

کر) مگر تم نہیں آئے۔ ان کی بے نور آنکھیں آنسو بہاتی رہیں۔ جو مہینہ بھر سے تمھیں دیکھنے کے لیے دروازہ پر لگی رہتی تھیں۔ تم نہیں آئے بھیا۔

طاہرہ : بھیا— بھیا— (رحیم سے لپٹ جاتی ہے)

رحیم : (طاہرہ کو چمٹا کر) میری ننھی بہن روتی کیوں ہے۔ میں تو موجود ہوں۔ تیرا بھائی۔ تیرا باپ۔ تیری ماں— تیری ماں کہاں مری ہے۔ مری تو رحیم کی ماں ہے۔ میری بچی میری بہن۔

طاہرہ : ماں کہتی تھی وہ تیری بہو لائے گی۔ زبیدہ آپا کی شادی کرے گی۔

رحیم : میں کروں گا زبیدہ کی شادی۔ ماں تم نے میرا راستہ بھی نہ دیکھا۔ (آنسو پونچھ کر) دیکھو میں آگیا ماں۔

زبیدہ : اب کیا ہوگا بھیا۔

رحیم : سب کچھ ٹھیک ہوجائے گا زبیدہ۔ تو فکر کیوں کرتی ہے۔ اب تو میں آگیا ہوں۔

زبیدہ : (اسی طرح سوچتے ہوئے) لیکن بھیا— دو روز سے گھر میں کھانے کا انتظام نہیں۔ (طاہرہ کو گود میں لے کر پیار کرتے ہوئے) طاہرہ بھوک سے تڑپتی رہی ہے جس ماں نے اپنی زندگی ہمیں پرورش کرنے میں صرف کردی کیا. اُسے کفن بھی نصیب نہ ہوگا؟

رحیم : (اٹھ کر پرعزم لہجہ میں) ماں کو کفن ضرور ملے گا۔ یہ محبت کرنے والی لاش بے کفن نہیں ہوسکتی۔

زبیدہ : لیکن بھیا۔ (آنسو پونچھ کر) ہم بھیک تو نہیں مانگ سکتے اور پھر بھیک دینے والے بھی تو بھیک کے معاوضہ کی اُمید میں دیتے ہیں۔

رحیم : بھیک! کفن کے لیے بھیک؟ (پُرعزم لہجہ میں) نہیں ایسا نہیں ہوسکتا۔ وہ ہاتھ بھیک کے لیے بڑھ سکتے ہیں جو دنیا کی دولت میں اپنا بھی حصہ سمجھتے ہیں۔ (کمرہ میں ٹہلنے لگتا ہے کچھ دیر خاموشی رہتی ہے پھر ایک دم رحیم جوش میں آکر) نہیں نہیں میری ماں کی لاش بے کفن نہیں رہ سکتی۔ میں اپنے حصہ کا

نوالہ حلق میں سے بھی چھین سکتا ہوں۔ میرے بازوؤں میں قوت ہے۔
(ایک دم دروازہ کھلتا ہے اور ایک قہقہہ کمرہ کی نیم تاریک فضا میں گونج اٹھتا ہے سب کی نظریں دروازہ پر اٹھتی ہیں۔ ایک پولیس سب انسپکٹر اور دو کانسٹبل جن میں ایک زبیدہ کا عاشق شریف بھی کھڑا ہے)

سب انسپکٹر : (قہقہہ مار کر) آخر پھنس ہی گئے۔۔۔ (اپنے ریوالور پر ہاتھ رکھ کر) اپنی جگہ سے نہ ہلنا۔

رحیم : (اپنی جگہ پر ساکت کھڑا رہتا ہے پھر آہستہ سے) آپ!

سب انسپکٹر : ہاں میں (قہقہہ لگا کر) بہت دنوں تک پولس کی آنکھوں میں خاک جھونکتے رہے۔۔۔ لیکن بچ نہ سکے۔

زبیدہ : (طاہرہ کو گود سے اتار کر) خدا کے لیے رحم کیجیے۔ اب ہماری امیدوں کا آخری سہارا یہی ہے۔

سب انسپکٹر : (قہقہہ لگا کر) آخری سہارا۔۔۔ (مسکرا کر) تم سفارش کر رہی ہو۔
(مونچھوں پر ہاتھ پھیرتا ہے)

زبیدہ : خدا کے لیے رحم کیجیے۔

سب انسپکٹر : (قہقہہ لگا کر) رحم!

زینت : (اٹھنے کی کوشش کرتے ہوئے) خدا آپ کو اس کا اجر دے گا۔

زبیدہ : دیکھیے نا ہماری ماں کی لاش گھر میں پڑی ہے۔ اگر رحیم بھیا نہ رہے تو یہ یہیں سڑ جائے گی۔

سب انسپکٹر : (تعجب سے) لاش!

زبیدہ : ہاں لاش۔ (چارپائی کی طرف اشارہ کرکے) حضور خدا کے لیے رحم کیجیے (شریف کے پاس جا کر) تم خدا کے لیے کچھ کرو شریف (شریف خاموش رہتا ہے) تم خاموش کیوں ہو۔ شریف۔ کچھ بولو شریف (شریف کی آنکھوں میں آنسو دیکھ کر) تم رو رہے ہو شریف یہ وقت رونے کا نہیں۔۔۔ خدا کے لیے کچھ کرو۔

طاہرہ : (سب انسپکٹر کے پاس جاکر اس کے پاؤں پڑتے ہوئے) بھیا کو نہ لے جایئے— پھر زبیدہ آپا کی شادی کون کرے گا—؟

سب انسپکٹر : (طاہرہ کو گود میں اٹھا کر پیار سے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے) بیٹی میں مجبور ہوں۔

طاہرہ : شریف بھیا! تم ہی کچھ کرو— ہمارے بھیا کو نہ لے جاؤ۔

(شریف خاموش رہتا ہے۔ تینوں بہنیں رونے لگتی ہیں۔ رحیم بڑھ کر سب انسپکٹر کی گود سے طاہرہ کو لیتا ہے اور اسے پیار کرتا ہے۔ پھر زبیدہ کے سر پر ہاتھ پھیر کر)

رحیم : زبیدہ! صبر کرو اور خدا پر بھروسہ رکھو۔ وہ بڑا کارساز ہے۔ طاہرہ اور زینت کا خیال رکھنا (پھر زینت کے پاس جاکر اس سے لپٹ جاتا ہے اور اس کی آنکھوں میں آنسو آجاتے ہیں۔ زینت کے آنسو پونچھتا ہے۔ پھر اس سے الگ ہوکر سب انسپکٹر کی طرف دیکھ کر ٹھنڈی سانس بھر کر) چلیے سب انسپکٹر صاحب۔ میں تیار ہوں۔ (اس کی نظر پھر یکا یک ماں کی لاش پر پڑتی ہے۔ ایک دم اس سے لپٹ کر) ماں! تم ہمیں تنہا چھوڑ کر چلی گئیں— اور اب میں تمھیں تنہا چھوڑ کر جارہا ہوں۔ خدا کے حضور میں عرض کردینا کہ میں بے قصور ہوں۔

(سب انسپکٹر کی طرف بڑھتا ہے)

سب انسپکٹر : رحیم مجھے افسوس ہے۔ مگر میں مجبور ہوں۔ یہ میرا فرض ہے۔

رحیم : آپ اپنا فرض ادا کیجیے۔ آپ کا قصور نہیں۔

(آہستہ آہستہ چل کر دروازہ کے پاس جاتا ہے۔ پلٹ کر پورے کمرہ پر نظر ڈالتا ہے۔ اور آنسو پونچھتا ہوا نکل جاتا ہے۔ اس کے پیچھے سب انسپکٹر، شریف اور دوسرا سپاہی بھی نکل جاتے ہیں کمرہ میں ایک کہرام مچ جاتا ہے۔ کچھ منٹ تک رونے کی آوازیں آتی رہتی ہیں جو آہستہ آہستہ سسکیوں میں تبدیل ہوجاتی ہیں۔ طاہرہ آہستہ آہستہ سسکیاں لیتے ہوئے فرش پر لیٹ جاتی ہے۔ کچھ دیر بعد اس کی سسکیاں بند ہوجاتی ہیں اور وہ سوجاتی ہے۔ زبیدہ زینت کے پاس جاکر بیٹھ جاتی ہے اور دونوں برابر سسکیوں سے روتی

رہتی ہے۔ کبھی کبھی زینت کے منہ سے اللہ اور خدا کے الفاظ سنائی دیتے ہیں۔ جیسے وہ خدا کے حضور میں کچھ دعا مانگ رہی ہو۔ کچھ دیر بعد)

زینت : زبیدہ! (زبیدہ اپنی آنکھیں زینت کے چہرہ پر گاڑ دیتی ہے) سن رہی ہو۔

زبیدہ : (ٹھنڈی سانس بھر کر) ہاں زینت آپا کہو۔

زینت : زندگی بھی کیا عجیب ہے۔ اس میں ہر واقعہ کہانی بن جاتا ہے۔

زبیدہ : بعض اوقات آپ عجیب باتیں کرنے لگتی ہیں۔

زینت : اب میں بستر پر پڑے پڑے اور کرتی بھی کیا ہوں۔ یہی سوچا کرتی ہوں۔ اب آج کی بات لو۔ یہ کیا ایک کہانی سے کم ہے؟ زبیدہ!— کبھی میں سوچتی ہوں کہ یہ دنیا ختم کیوں نہیں ہوجاتی۔ جو ایک کے لیے ہے اور دوسرے کے لیے نہیں۔ (زبیدہ خاموش رہتی ہے اور برابر کسی خیال میں کھوئے رہتی ہے)۔ خدا کی مرضی۔

زبیدہ : خدا کی مرضی!— بعض وقت تو اس مرضی کے خلاف—

زینت : نہیں زبیدہ توبہ کر— ناامید ہوکر خدا کے سہارے کو بھول جانا بہت بڑا گناہ ہے۔ اس کے سہارے تو غریب زندہ رہتے ہیں۔

زبیدہ : اور وہ زندگی کیا ہوتی ہے۔ کیڑے مکوڑوں سے بدتر۔

زینت : نہیں زبیدہ نا اُمید مت ہو۔ خدا نا اُمیدوں اور بے کسوں کو سہارا دیتا ہے۔ اس کے یہاں دیر ہے اندھیر نہیں۔

زبیدہ : یہی دیر تو اب اندھیر بن گئی ہے۔ جانے یہ اندھیر کب تک رہے گا۔ (کچھ دیر خاموش رہ کر) اب ماں کی لاش کا کیا ہوگا؟

زینت : جو خدا کو منظور ہوگا۔

(رحمٰن دروازہ میں سے داخل ہوکر مسکراتا ہے اور آگے بڑھتے ہوئے)

رحمٰن : خدا کو نہیں جو ہمیں منظور ہوگا۔ تو تمھاری ماں مرگئی۔

زینت : ہاں رحمٰن میاں۔ ہم کو بے سہارا چھوڑ کر چل بسی۔

رحمٰن : اور تمھارے بھائی کو بھی پولس نے گرفتار کرلیا۔

زینت : ہاں! بے قصور!!

رحمٰن : (مسکرا کر) بے قصور ہی سہی۔ لیکن اب وہ تمھارے پاس نہیں ہے۔ (زبیدہ کی طرف دیکھ کر) کہو زبیدہ! اب کیا ارادہ ہے۔

زبیدہ : جو خدا کو منظور ہوگا۔

رحمٰن : (قہقہہ لگا کر) جو خدا کو منظور ہوگا! (ہنہ — یہ بھی ایک ہی رہی۔ ابھی تو تم خدا کے خلاف بغاوت کر رہی تھیں اور اب خدا کی مرضی کے راگ الاپنے لگیں — کس قدر بے وقوف ہوتے ہو تم لوگ — میں اس وقت بھی تمھاری مدد کرنے کو تیار ہوں — کہو تمھیں منظور ہے؟

زبیدہ : رحمٰن میاں وقت بے وقت —

رحمٰن : ارے چھوڑو وقت بے وقت کو۔ کاروبار میں وقت بے وقت کیسا۔ کہو تم تیار ہو؟

زبیدہ : خدا کے لیے رحمٰن میاں انسان بنیے۔

رحمٰن : (قہقہہ لگا کر) انسان! تو تمھیں میرے انسان ہونے میں شک ہے۔ میں انسانوں کی طرح رہتا ہوں۔ کھاتا پیتا ہوں۔ اٹھتا بیٹھتا ہوں۔ پھر بھی تمھیں میرے انسان ہونے میں شک ہے۔ (مسکرا کر) خیر بھئی میں حیوان ہی سہی اب ایک حیوان تمھاری مدد کرنا چاہتا ہے۔ کہو تم کو منظور ہے۔

زبیدہ : جی نہیں۔

رحمٰن : تمھاری مرضی — معلوم ہوتا ہے کہ تمھیں اپنی ماں سے کوئی محبت نہیں۔ دیکھو زبیدہ یہ لاش یونہی بے کفن پڑی سڑ جائے گی اور کوئی ہاتھ بھی نہ لگائے گا۔ سمجھیں تم۔ بلاوجہ کیوں اپنی ماں کی مٹی خراب کرتی ہو۔

زبیدہ : لیکن —

رحمٰن : لیکن اور مگر نے ہمیشہ دنیا کو مصیبتوں میں مبتلا رکھا ہے۔ یہ پس و پیش تباہ ہونے کا پیش خیمہ ہے۔ سمجھ لو اس کو۔ میرے پاس دولت ہے عزت ہے اور میں تمھاری مدد کرنا چاہتا ہوں۔

زینت : ایسی مدد نہیں چاہیے۔ ہمیں خدا اور رسول کو منہ دکھانا ہے۔

رحمٰن : تم دکھانے اور چھپانے میں الجھی رہو۔ زبیدہ جو وقت سے فائدہ نہیں اٹھاتا ہے وہ احمق ہے۔ اگر تم وقت سے فائدہ اٹھانا نہیں چاہتیں تو نہ چاہو۔ مگر یاد رکھو یہ لاش یہیں کیڑے مکوڑوں کی خوراک بن جائے گی اور کوئی نظر اٹھا کر بھی نہ دیکھے گا۔ زبیدہ کفن دینا تو کجا مٹی دینے والا بھی نصیب نہ ہوگا۔ ابھی وقت ہے سوچ لو۔

زبیدہ : (اپنے دونوں ہاتھ کانوں پر رکھ کر) خدا کے لیے چپ رہیے۔

رحمٰن : زبیدہ! میں ان لوگوں میں سے نہیں ہوں جو لوگوں کو مجبور سمجھ کر وقت سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ مجھے تم سے ہمدردی ہے اس لیے میں تمھاری مدد کرنا چاہتا ہوں بھلا سوچو تو اس ضد سے کیا فائدہ بہرحال تم کسی نہ کسی کی تو ہوکر رہوگی۔ پھر مجھ میں کیا خرابی ہے۔

زبیدہ : لیکن—

رحمٰن : لیکن ویکن کچھ نہیں۔ میں تمھاری ماں کے لیے کفن فراہم کرسکتا ہوں اس کی مٹی کا انتظام کرسکتا ہوں۔ تم سب بہنوں کی زندگی خوشگوار بنا سکتا ہوں۔

زبیدہ : لیکن رحمٰن میاں یہ گناہ ہے۔

رحمٰن : گناہ! دنیا میں گناہ کا وجود صرف اس قدر ہے کہ ہم اس سے ڈرتے ہیں۔ ڈر کا نام گناہ ہے خود میں ذرا سی جرأت پیدا کرو۔ پھر دیکھو گناہ میں کس قدر لذت ہے زبیدہ بے وقوفی کا کوئی علاج نہیں۔ (زبیدہ کے پاس جاکر اس کا ہاتھ پکڑ کر) آؤ میرے ساتھ چلو خوف کو دل میں جگہ نہ دو۔

زبیدہ : (اپنا ہاتھ چھڑا کر) نہیں نہیں ایسا نہیں ہوسکتا۔ میں اپنی ماں کا کفن اس طرح نہیں خرید سکتی۔

رحمٰن : ڈرو نہیں زبیدہ۔ دنیا اسی طرح چلتی ہے بلا معاوضہ کوئی کسی کی مدد نہیں کرتا۔ اٹھو (ہاتھ پکڑتا ہے اور زبیدہ کسی گہری سوچ میں مبتلا ہوجاتی ہے) سوچو نہیں ورنہ گمراہ ہوجاؤ گی۔ کیا تمھیں اچھا معلوم ہوگا کہ تمھاری ماں کی لاش جس نے تمھارے

لیے ہزاروں تکالیف برداشت کی ہیں اس طرح بے گور وکفن پڑی رہے۔ اٹھو چلو!

زبیدہ : (ہاتھ کھینچ کر) مجھے ذرا سوچنے دیجیے۔

رحمٰن : (ہاتھ چھوڑ کر) بس تو سوچتی رہو ایک دن، دو دن، چار دن، چار مہینے، یہاں تک کہ یہ لاش یہیں سڑ جائے۔ بدبو پھیلے، کیڑے مکوڑے —

زبیدہ : رحمٰن میاں خدا کے لیے ایسا نہ کہیے۔

رحمٰن : یہ تو نتیجہ ہونے ہی کو ہے — آؤ اور میرا کہا مانو اب میں بار بار تم سے نہیں کہہ سکتا (زبیدہ کا ہاتھ پکڑ کر) آؤ چلتی ہو؟

(زبیدہ اٹھ کر کھڑی ہو جاتی ہے۔ زینت زبیدہ کو کھڑی ہو کر دیکھتے ہوئے)

زینت : زبیدہ کیا کرتی ہو میری بہن، سوچو میری بہن! یہ دھوکا ہے فریب ہے!

رحمٰن : (مسکرا کر) زینت بے چارگی کو تو اس کی حالت نے بزدل بنا دیا ہے۔ زبیدہ آؤ!

(آگے بڑھتا ہے)

زینت : زبیدہ! زبیدہ!! کیا کرتی ہو۔ (اٹھنے کی کوشش کرتی ہے۔ زبیدہ دروازہ کی جانب بڑھتی ہے۔ زینت چلا چلا کر) رحمٰن میاں خدا کے لیے اس کو دھوکا نہ دو وہ ابھی بچی ہے۔ رحمٰن میاں اگر تم نے کفن کی قیمت ایک عصمت ہی ہے تو میں حاضر ہوں۔ دنیا کو میری ضرورت نہیں ہے۔

رحمٰن : (طنزیہ قہقہہ لگا کر) تم حاضر ہو۔ (قہقہہ لگا کر) جب دنیا کو تمھاری ضرورت نہیں تو مجھے کیا ضرورت ہوگی۔

زینت : زبیدہ! خدا کے لیے نہ جاؤ زبیدہ (شریف داخل ہوتا ہے) شریف خدا کے لیے اس کو روکو وہ جا رہی ہے اپنی زندگی تباہ کرنے اپنی عصمت سے اپنی ماں کا کفن خریدنے۔ شریف روکو خدا کے لیے روکو۔

(شریف مبہوت کھڑا رہتا ہے۔ زبیدہ برابر دروازہ کی جانب بڑھتی رہتی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے ہے کہ وہ نہ کچھ سوچ رہی ہے اور نہ سمجھ رہی ہے نہ سن رہی ہے۔ زبیدہ اور رحمٰن دروازہ کے پاس پہنچ جاتے ہیں — دروازہ کے

پاس پہنچ کر رکتی ہے اور پلٹ کر کمرہ کو چاروں طرف دیکھتی ہے۔ اس کی نظر شریف پر پڑتی ہے۔ نگاہیں چار ہوتی ہیں۔ یکایک اپنا ہاتھ چھڑا کر پلٹتی ہے۔ اور دوڑ کر شریف سے لپٹ جاتی ہے۔ شریف اس کو غصہ سے علیحدگی کر کے)

شریف : الگ ہٹو۔۔

زینت : زبیدہ بے قصور ہے۔ شریف ہے۔ اُسے دھوکا دیا گیا ہے۔۔ شریف وہ بے قصور ہے۔

شریف : میں تمھاری مدد کرنے آیا تھا لیکن جو مصیبتوں سے گھبرا کر خود کو اس قدر گرالے میں اس کے قابل نہیں۔ (جیب میں ہاتھ ڈال کر کچھ روپیہ نکال کر زبیدہ پر پھینکتے ہوئے) یہ لو اس سے اپنی ماں کا کفن خرید لینا۔۔ تم اب رحمٰن میاں کے ساتھ جا سکتی ہو۔

(غصہ سے کمرہ سے نکل جاتا ہے)

زینت : (چیخ کر) شریف! شریف!! ٹھیرو۔ زبیدہ اس کو روکو۔

(بستر سے اٹھنے کی کوشش کرتی ہے مگر گر پڑتی ہے۔ اس کی چیخ پکار سے طاہرہ کی آنکھ کھل جاتی ہے اور وہ اٹھ کر بیٹھ جاتی ہے)

زبیدہ : (ایک خوفناک قہقہہ لگا کر) ہاہاہا۔۔ رحمٰن میاں۔۔ میں رحمٰن میاں کے پاس جارہی ہوں۔۔ ہاہاہا۔۔

(بے تحاشہ پاگلوں کی طرح بھاگتی ہے اور دور تک اس کے قہقہے سنائی دیتے ہیں۔

زینت : طاہرہ۔

طاہرہ : یہ روپے۔۔ (روپے سمیٹنے لگتی ہے)

زینت : (ٹھنڈی سانس بھر کر) ہاں۔۔ ماں کے کفن کے ہیں۔۔

(پردہ)

(1949)

ایڈیٹ

افرادِ تمثیل

(1) حمید (ایک نوجوان) (2) نصرت (حمید کا دوست) (3) کلثوم (حمید کی ملازمہ)
(4) وحید (کلثوم کا بچہ) (5) آئرین اور (6) شیریں (سوسائٹی پسند خواتین) (7) ایک پانچ چھ سالہ بچہ اور بیرون مکان سے مختلف آوازیں

(حمید کے مکان کا کمرہ جو بالائی حصہ میں ہے۔ اس کمرہ کے مشرقی مغربی اور شمالی جانب تین کمرے ہیں اور تینوں کے دروازے اس کمرہ میں کھلتے ہیں۔ جنوبی جانب بھی کمرہ میں ایک دروازہ ہے جس کے سامنے ایک برآمدہ نظر آتا ہے۔ یہ دروازہ اس پورے حصہ کے صدر دروازہ کا بھی کام دیتا ہے۔ جنوبی مغربی کونے میں ایک غسل خانہ ہے۔ برآمدہ میں کھڑے ہونے سے شہر کی ایک بارونق سڑک نظر آتی ہے جس پر ہمیشہ ٹرافک رہتا ہے اور مختلف قسم کا شور وغل کمرہ میں آتا رہتا ہے۔

کمرہ کا ساز و سامان اور آرائش و زیبائش ایک خوش حال متوسط طبقہ کے گھرانے کی طرح ہے۔ ایک معمولی قسم کی دری کا فرش ہے۔ جنوبی مشرقی کونے میں ایک چھوٹی سی میز

رکھی ہے جس پر ایک گل دان میں پھول سجے ہوئے ہیں۔ شمالی مشرقی کونے میں ایک اور میز رکھی ہے جس پر کتابیں، قلم دوات اور رائٹنگ پیڈ وغیرہ بے ترتیب پڑے ہیں۔ ایک ٹائم پیس رکھی ہے جس کا چہرہ کمرہ کی طرف نہیں دیوار کی طرف ہے۔ غسل خانہ کے دروازہ سے ملی ہوئی ایک سنگھار میز رکھی ہے جس پر کچھ شیشیاں اور کنگھے وغیرہ بے ترتیب پڑے ہیں۔ اس کے پاس ایک آرام کرسی پڑی ہے جس پر ایک کتاب اور ایک ملا دلا اخبار پڑا ہے دیواروں پر تصاویر آویزاں ہیں مگر سب کی سب آڑی ترچھی ہیں۔

اس وقت کمرہ میں ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے نصرت کھڑا بال برابر کر رہا ہے۔ غسل خانہ میں پانی گرنے کی آواز آ رہی ہے۔

نصرت : (آئینہ میں بال برابر کرتے ہوئے) ابے نہا بھی چکا یا نہیں۔ کہاں کی غلاظت تھپی ہے تیرے بدن پر— نہانے کیا جاتا ہے کہ غسل خانہ کا قبالہ اپنے نام لکھا لیتا ہے۔ (غسل خانہ میں مسلسل پانی گرنے کی آواز) بیٹا قیامت کے دن ایک ایک قطرہ کا حساب دینا پڑے گا۔ سمجھ لے— (قہقہہ مار کر ہنستا ہے) ابے دیر ہو رہی ہے نکل بھی— (چہرہ کو مختلف زاویوں سے دیکھتے ہوئے چٹکیاں بجا بجا کر گاتا ہے) ایک بار پھر کہو ذرا کہ مجھ کو تم سے پیار ہے۔ ایک بار پھر کہو ذرا— کہ مجھ کو تم سے پیار ہے۔

(حمید تولیہ سے سر ملتا ہوا کمرہ سے نکلتا ہے اور ڈریسنگ ٹیبل کی طرف بڑھتے ہوئے)

حمید: زبان ہے یا قینچی۔ جو چلتی ہے تو رکنے کا نام ہی نہیں لیتی۔

نصرت : (اسی طرح مٹک کر گاتے ہوئے) کہ مجھ کو تم سے پیار ہے— مجھ کو تم سے پیار ہے۔

حمید : ابھی ابھی شکل آئینہ میں دیکھی ہے پھر بھی غلط فہمی دور نہیں ہوئی— کون بدذوق تجھ سے کہے گا کہ "مجھ کو تم سے پیار ہے۔"

(حمید زوردار قہقہہ لگاتا ہے اور نصرت آئینہ میں اپنی شکل دیکھتے ہوئے)

نصرت : کیا برائی ہے اس شکل میں (حمید کی طرف مڑکر) یہ چھوٹی چھوٹی اندر دھنسی ہوئی آنکھیں۔ ذرا شہناز کے دل سے پوچھو میری جان کس قدر تعریف کی تھی اس نے جب میں نے ہوٹل کا بل ادا کیا تھا اور یہ موٹے موٹے ہونٹ رس بھرا ہے ان میں میرے دوست (قہقہے لگاتا ہے اور حمید کے کاندھوں پر ہاتھ رکھ کر) اچھا اچھا اب جلدی تیار ہولو (دوسرے کمرے کی جانب جاتے ہوئے) تم میری رنگت کو سیاہ کہتے ہو۔ شہناز، شیلا، مس جون اور جانے کس کس نے میرے گالوں سے اپنے گال لگا کر اس سیاہ رنگت میں سفید گوٹ لگائی ہے (قہقہہ لگاتا ہے) کہ مجھ کو تم سے پیار ہے (گاتا ہوا دوسرے کمرے میں چلا جاتا ہے۔ حمید کچھ دیر سوچتا ہے اور پھر ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے کھڑے ہوکر بال برابر کرنے لگتا ہے۔ پاس والے کمرہ سے آواز)

آواز : کہہ دیا کمبخت سے اب سوجا۔ مگر چلائے جارہا ہے نکما۔ چوری کروں تیرے لیے روٹی کی۔

(حمید غور سے آواز کو سنتا ہے۔ ڈریسنگ ٹیبل کی دراز سے ڈھونڈ کر ایک روپیہ نکالتا ہے اور اسے اچھال کر طنزیہ مسکرا کر)

حمید : ایک روپیہ چاندی کا سکہ۔ ہنہ۔

(دوسرے کمرہ سے نصرت کی آواز)

نصرت : ابے جلدی تیار ہولے۔ سورج ڈوبتے وقت شکار اچھا لگتا ہے۔

(قہقہہ کی آواز)

حمید : شکار! (روپیہ دیکھ کر) صرف ایک روپیہ (سوئچ دبا کر کمرہ میں روشنی کرتا ہے اور دروازہ میں کھڑے ہوکر سڑک پر دیکھنے لگتا ہے) سرخ، گلابی، سبز اور کاسنی ساڑھیاں— اور ان کے نوچ پھینکنے کی قیمت (روپیہ دیکھ کر ہوا میں اچھالتا ہے اور مسکراتا ہے) اس روپے میں کھوٹ زیادہ ہے جبھی کھنکھناہٹ ہے—

ہر کھوئی چیز میں کھنکھناہٹ ہوتی ہے۔

(روپیہ جیب میں رکھ لیتا ہے۔ نصرت دوسرے کمرہ سے واپس آتا ہے)

نصرت : اچھا آپ ابھی تک آرام فرما رہے ہیں— ابے چلے گا بھی یا نہیں— کہہ بھی دیا شام کے وقت شکار اچھا لگتا ہے۔ اس وقت کبوتریاں، بن ٹھن کر نکلتی ہیں اور سیر کے لیے پارکوں، کلبوں اور ہوٹلوں میں جمع ہو جاتی ہیں— بیٹا ذرا سی سستی میں شکار ہاتھ سے نکل جاتا ہے (حمید پھر روپیہ ہوا میں اچھالتا ہے) کیا بچوں کی طرح روپے سے کھیل رہا ہے۔

حمید : جیب میں صرف ایک روپیہ ہے— اور بالکل آخری۔

نصرت : آخری! (قہقہہ لگا کر) آخری لمحوں میں زندگی ہوتی ہے میرے دوست!

حمید : لیکن نصرت—

نصرت : لیکن ویکن کچھ نہیں— جانِ من نہیں جائیں گے کسی اعلیٰ ہوٹل میں۔ کوئی تھرڈ کلاس ریسٹورنٹ ہی سہی— آنکھیں لڑانے کو کوئی کبوتری مل ہی جائے گی— (آنکھ مار کر ٹھک کر گاتا ہے) جوانی کے دامن کو رنگین بنالے— اچھا اب جلد اُٹھو—

حمید: (افسردہ لہجہ میں) وحید بھوکا ہے— ابھی روٹی کے لیے—

نصرت : ابے ہٹا بھی— وہ تو کلثوم اُسے بہلا لے گی۔

حمید : مگر دل تو نہیں بہلے گا۔

نصرت : (مسکرا کر ڈرامائی انداز سے) جب ایک ٹن ٹن چھوکری اپنے ملائم اور گورے گورے ہاتھوں میں تیرے ہاتھ لے کر کہے گی— ڈارلنگ آئی لو یو— تو دل بہلے گا ہی نہیں مچل جائے گا۔ (قہقہہ مار کر) چل اٹھ اب— دیر ہو رہی ہے۔

(ایک چھ سات سالہ بچہ داخل ہو کر)

بچہ : اماں نے ایک روپیہ قرض مانگا ہے۔

نصرت : (بچہ کو غور سے دیکھ کر) آپ کی تعریف؟

حمید : (سنجیدگی سے) محلہ کی ایک بیوہ کا بچہ ہے۔

نصرت : (قہقہہ مار کر) بیوہ کا— (شرارت سے مسکرا کر) ہوگی کوئی شرنارتھی۔

حمید : (سنجیدگی سے) نہیں (بچہ سے) اپنی اماں سے کہہ دو کہ آپ ہی آکر لے جائیے (بچہ چلا جاتا ہے)

نصرت : اچھا بیٹا تو اس داؤ پر لگے ہو— اور ہم سے کہا تک نہیں۔ (سنجیدگی سے) اچھا جلدی بتاؤ یہ کون ہے؟

حمید : (بیزاری سے) کہہ تو دیا۔ ایک غریب بیوہ ہے پڑوس میں رہتی ہے۔

نصرت : (شرارت سے مسکرا کر) پنجاب سے آئی ہے یا دلّی سے۔

حمید : (غصہ سے) جہنم سے۔

نصرت : بہت گنہگار معلوم ہوتی ہے (قہقہہ مار کر) چلو بھئی کبوتری خود ہی جال میں پھنس گئی (مسکرا کر) بیٹا اگر آریَن کو معلوم ہوگیا کہ امانت میں خیانت کر رہے ہو تو وہ بے بھاؤ پڑیں گے کہ چندیا گنجی ہوجائے گی—
(دروازہ کی جانب جاتے ہوئے) اچھا بھئی ہم تو چل دیے۔

حمید : تو سچ مچ جا ہی رہے ہو۔

نصرت : ہاں— کیوں نہیں؟ (جیب میں ہاتھ ڈال کر ایک نوٹ نکال کر دکھلاتے ہوئے) جب تک یہ کاغذ کا ٹکڑا جس پر لکھا ہے۔ I promise to pay the bearer the sum of Rs.5/ on demand of any offer of issue. لکھا ہوا جیب میں ہے ضرور جاؤں گا (ڈرامائی انداز سے) اور کبوتریاں پھنستی رہیں گی۔

حمید : (حقارت) کاغذ کا ٹکڑا۔

نصرت : (مذاق کے انداز میں سنجیدہ شکل بنا کر) بٹیا یہ گورنمنٹ کا سکہ ہے۔ اس کی توہین جرم ہے۔ (قہقہہ لگا کر) یہ کاغذ کا ٹکڑا نہیں لاسہ ہے لاسہ۔ (قہقہہ لگاتا ہے)

حمید : مگر صرف پانچ روپے — ان سے کیا ہوتا ہے؟ دیکھو آج کلثوم نے —
نصرت : پانچ روپے — ایک ٹن ٹن کھنکھناتی لونڈیا — کسی اعلیٰ ہوٹل میں ڈنر کوئی اچھا سا پکچر — اور پھر رات بھر —
حمید : (لقمہ دے کر) صرف پانچ روپے۔ (طنزیہ مسکراتا ہے)
نصرت : نہیں سمجھے۔ (حمید کے قریب آتے ہوئے) استادوں کے یہ داؤ بھی سیکھ لو کیا یاد کرو گے کسی سخی سے پالا پڑا تھا۔ اگر تمھارے ساتھ ایک اچھی سی لونڈیا ہو تو سڑک پر ملنے والا پہلا احمق دوست کسی ہوٹل میں ڈنر کے لیے مدعو کرتا ہے اور دوسرا۔ (ہنس کر) کسی پکچر کے لیے — اچھا بھئی چل دیے۔
حمید : اور آج کلثوم نے بھی نوٹس دے دیا ہے — اگر اس کو کچھ اس وقت نہیں دیا گیا تو وہ چلی جائے گی۔
نصرت : کچھ خوشامد کر لینا۔ ہاتھ پاؤں جوڑ لینا۔ خدا بھی خوشامد سے راضی ہو جاتا ہے اور پھر وہ تو تمھارے چکر میں پھنسی ہوئی ہے۔
حمید : لیکن اب وہ ماننے والی نہیں — تین مہینے سے اُسے کچھ نہیں دیا گیا ہے۔
نصرت : تو پھر روٹیاں اپنے ہاتھ سے پکائیں گے۔ یہ تجربہ بھی اچھا رہے گا — گلابی جاڑوں کی چاندنی راتیں تنہا بسر نہیں ہوتیں۔
(ڈرامائی انداز سے سلام کر کے نکل جاتا ہے۔ حمید کمرہ میں ٹہلنے لگتا ہے۔ پھر دروازہ میں کھڑے ہو کر باہر دیکھنے لگتا ہے۔ دوسرے کمرہ سے پھر آواز)
آواز : کم بخت سوتا ہے یا نہیں۔ بھوک بھوک۔ بھوک — اب مجھے کھالے کہاں سے لاؤں تیرے لیے روٹی۔
حمید : کلثوم۔ ارے کلثوم۔
آواز : بس چپ چاپ پڑا رہنا۔ اگر ذرا بھی رویا تو وہ تھپڑ جماؤں گی کہ سب بھوک بھول جائے گا۔

(چند سیکنڈ بعد کلثوم آتی ہے)

حمید : کیا آج گھر میں کچھ نہیں ہے؟ اگر کچھ تھوڑا بہت ہو تو وحید کے لیے کچھ انتظام کردو۔

کلثوم : خاک رکھا ہے۔ بچہ کا دودھ تھا تو نصرت میاں کی جانے کون چہیتی آ گئیں۔ اور چائے کی فرمائش ہوگئی۔ لاکھ سمجھایا کہ بچہ بھوکا بلکے گا تو لگے ہاتھ پاؤں جوڑنے— ٹھونس دیا اس کے کلیجا میں۔

حمید :تو محلے میں سے کچھ انتظام کرلیا ہوتا۔ آج کل میں ابا میاں کا منی آرڈر آنے ہی والا ہے۔

کلثوم : کہیں کا بھی رکھا ہے تم نے مجھے— نکو ہوگئی ہوں میں تو۔ محلے والا کوئی بھی اچھی نظر سے دیکھتا ہے مجھے— میری صورت دیکھتے ہی ناک بھوں چڑھانے لگتے ہیں— سب شریف زادیاں ہی تو رہتی ہیں اس محلے میں۔

حمید : تو کچھ ہوٹل ہی میں انتظام کرلیا ہوتا۔

کلثوم : اس کے پہلے ہی کے پیسے ادا نہیں کیے— اب صورت دیکھ کر دھتکار دیتا ہے۔

حمید : (کچھ سوچ کر) اُسے سلانے کی کوشش کرو۔

کلثوم : سوئے گا کیا خاک— جب پیٹ میں آگ لگی ہو تو کیا خاک نیند آئے گی۔

حمید : اچھا دیکھو— (جیب میں ہاتھ ڈالتا ہے۔ آئرین کمرہ میں داخل ہو کر)

آئرین : ہلو ڈارلنگ کہاں غائب ہو دو ہفتوں سے۔

حمید : اوہ آئرین— آؤ— (ایک کرسی کی طرف اشارہ کرکے) بیٹھو— کدھر راستہ بھول گئیں آج۔

آئرین : (کرسی پر بیٹھتے ہوئے) میں تو دو ہفتے سے آپ کا انتظار کر رہی ہوں۔

حمید : میں آج کل مصروف زیادہ ہوں۔ (کلثوم سے) اچھا کلثوم دیکھو میں ابھی کچھ انتظام کرتا ہوں۔

(کلثوم آئرین کو غصہ سے دیکھتی ہے اور دوسرے کمرہ میں چلی جاتی ہے)

آئرین : ہوٹل۔ کلب۔ پارک۔ تھیٹر ہر جگہ سے غائب۔ آخر ایسے بھی کیا بزی ہیں آپ۔

حمید : بس تم سے ملاقات نہ ہو تو سمجھ لو کہ میں بزی ہوں۔

آئرین : بزی! ایسا بھی کیا کہ انسان اپنی تفریح ہی کو چھوڑ دے— یہ مصروفیت تو کیا اچھی خاصی بیماری ہے۔

حمید : (مسکرا کر) اگر تم میری مجبوری کو بیماری سمجھتی ہو تو اس بیماری کا میرے پاس کوئی علاج نہیں۔

آئرین : بیماری یقینی بیماری— اب مجھے دیکھیے کس قدر مصروف رہتی ہوں صبح سے ٹیوشن پر گئی— آ کر جیسے تیسے کھانا کھایا۔ دفتر بھاگی۔ دن بھر ٹائپ کے کی بورڈ پر انگلیاں رگڑیں۔ بدخط آفیسروں اور کلرکوں کے ہینڈ رائٹنگ پر آنکھیں پھوڑیں۔ تب کہیں شام کو فرصت ملی۔ لیکن میں نے کلب اور تفریح کو دور سے سلام نہیں کیا (مسکرا کر) اور اگر میں اس قدر محنت نہ کروں تو تین چھوٹے چھوٹے بہن بھائیوں اور بوڑھے ماں باپ کا پیٹ کیسے بھرے۔

حمید : آج کل میں بھی اسی پیٹ بھرنے کے مسئلہ پر غور کر رہا ہوں۔

آئرین : (شوخی سے) ڈونٹ بی سوسیریس اباؤٹ اٹ— یہ ایک ہنگامی ضرورت ہے۔

حمید : (طنزیہ مسکرا کر) ہنگامی— نہیں— بالکل خدا کی طرح جو ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گی۔

آئرین : (شوخی سے) اچھا تو آج کل آپ فلسفی ہوتے جا رہے ہیں— بہت سنجیدہ ہو آج کل— بھئی یہ سنجیدگی بھی عجیب بیماری ہے جو آج کل کے ہر نوجوان کو لگ گئی ہے— یہ تو متعدی معلوم ہوتی ہے۔

حمید : اپنا دامن بچائے رکھنا کہیں تم کو بھی نہ لگ جائے۔

(بچہ داخل ہو کر)

بچہ : اماں نے کہا ہے کہ پڑوسیوں کا یہی حق ہوتا ہے۔

حمید : (محبت سے بچہ کو دیکھ کر) اور کیا کہا ہے تمھاری ماں نے۔

بچہ : اور کہا ہے کہ ایک پڑوسی بھوکا مرے اور دوسرا عیش کرے۔ خدا کے یہاں جواب دینا پڑے گا۔

حمید : جاؤ— اپنی اماں کو یہیں بھیج دو۔

(بچہ چلا جاتا ہے)

آئرین : یہ کس کا بچہ ہے۔

حمید : اک بیوہ کا۔

آئرین : اوہ— (قہقہہ مار کر) I thought her to be your keep

حمید : جی ہاں— ساون کے اندھے کو تو ہرا ہرا ہی سوجھتا ہے۔

آئرین : ناراض ہو گئے— بھئی معاف کرنا۔ ارے ہاں کل آپ پارٹی میں کیوں نہیں آئے؟

حمید : کیسی پارٹی؟

آئرین : رمیش کے یہاں— کیا لطف آیا ہے۔ شمیم اور رمیش بری طرح چڑھا گئے اور وہ اودھم مچائی کہ لطف آ گیا— پہلے تو سیاسیات پر خوب چونچم چانچا ہوئی اور فیصلہ یہاں ہوا کہ رمیش نے شمیم سے کہا کہ تم کیمونسٹ ہو غنڈے— اور شمیم نے رمیش سے کہا کہ تم امریکہ— اس کے بعد گالی بک دی۔ مجبوراً لوگوں کو بیچ بچاؤ کرنا پڑا۔

حمید : (مسکرا کر) اچھا۔

آئرین : اور پھر جو رمیش نے شکنتلا کی وہ خبر لی ہے کہ رُلا رُلا دی بے چاری کو۔ ساڑھی تک پھاڑ ڈالی اس کی۔

حمید : اچھا ہوا یہ نزلہ تم پر نہیں گرا۔

آئرین : وہ تو شمیم میری طرف متوجہ ہوا تھا مگر میں نے لفٹ ہی نہیں دیا— مگر تھی بڑی شان دار پارٹی— بہت ہی لطف آیا۔

حمید : کیوں نہیں (طنزیہ مسکرا کر) جہاں عورتوں کی ساڑھیاں پھاڑی جاتی ہوں غم

غلط کرنے کے لیے ایک دوسرے کو گالیاں دی جاتی ہوں وہاں لطف نہیں آئے گا تو کیا ہوگا۔

آئرین : کیا بات ہے ڈیر— آج کچھ اکھڑے اکھڑے سے ہو۔

حمید : ہاں کبھی ایسا بھی ہوتا ہے— جس طرح کبھی کبھی تم شادی کا نام سن کر اکھڑ جاتی ہے (ہوا کا ایک سرد جھونکا آتا ہے)

آئرین : کس قدر لطیف سردی ہے۔ مجھے یہ سردی بہت پسند ہے۔ آج چاند بھی پورا ہے۔ (باہر سے ایک زوردار قہقہہ کی گونج اور پھر آواز)

آواز : حرامجادی سوریہ کو جب سے بیاہ کرلایو ہوں ایک دن سکھ نہیں ملو۔

(حمید دروازہ کے باہر جھانکتا ہے)

آئرین : کون ہیں یہ؟

حمید : کوئی دوشرابی ہیں۔

آواز : سدا بیمار رہتا ہے۔ کل ہی دلی کی لیڈی ڈاکٹرنی کا نسخہ منگا کر پلایو ہے۔

دوسری آواز: اور میری جروا۔ شکل چڑیلوں کی سی مگر دماگ بادشاہزادیوں کے سے آٹھ دن سے پہلے پاس پھٹکنے نہیں دیتی اور دارو پیکر جاؤ تو کھولی سے باہر سلاتی ہے۔ مجھے تو آوارہ لگتی ہے۔ کوئی دن چٹیا پکڑ کر نکال باہر کروں گا چھنال کو— دیدے مٹکاتی پھرت ہے اِدھر اُدھر۔

پہلی آواز : اب دن بھر مجوری کرو اور شام کو دارو نہ ملے اور جورو کھولی سے باہر سلائے کیا جندگی ہوئی یہ— پورے پانچ سو روپیا دیے تھے اس کے باپ کو۔ اب نکھرے کرت ہے چھنال۔

آئرین : (فاتحانہ مسکرا کر) سنا آپ نے۔ ہسبنڈ اور وائف کوئی بھی satisfy نہیں اس زندگی سے۔

حمید : یہ ان زندگیوں کا حال ہے جو موت سے بدتر ہیں۔ کیڑے مکوڑے تو اپنی غذا گندگی ہی میں حاصل کر لیتے ہیں اور یہ محنت مزدوری کر کے بھی بھوکے رہتے

ہیں۔ ان کی زندگی میں خوشی کی انتہا یہ ہے کہ شام کو نشہ میں مست ہوکر اپنی بیویوں کے جسموں کو جھنجھوڑیں اور ہر رات اُن سے ایک بچہ کی امید رکھیں۔ یہ اپنے پیٹ کی آگ جنسی آگ سے ٹھنڈی کرنا چاہتے ہیں۔

آذرین : (مسکرا کر) معلوم ہوتا ہے آج کل جیب میں پیسہ نہیں ہے جبھی قوم کا درد پیدا ہوگیا ہے (قہقہہ لگاتی ہے)

حمید : ہاں۔ اس لیے کہ اب فاقہ عام ہوتا جارہا ہے اور تم بھی اس سے بچنے کے لیے ہزاروں دھت کرم کرتی ہو — (ایک کرسی پر بیٹھ کر) یہ تمھارے ساتھ ہی نہیں میرے ساتھ بھی ہے — اور کروڑوں کے ساتھ ہے۔ میں نے بھی پیٹ بھرنے کے لیے ہزاروں چولے بدلے — مگر اب ہر روز بیٹھا بیٹھا انتظار کرتا ہوں کہ ڈاکیہ ابا میاں کا منی آرڈر لے کر اب آیا اب آیا۔ مگر اس کم بخت کو بھی مجھ ہی سے دشمنی ہے۔

آذرین : چھوڑیے ان باتوں کو — آیئے کہیں باہر چلیں۔

حمید : جب جیب میں پیسہ نہیں ہوتا تو کہیں جانے کو جی نہیں چاہتا۔

آذرین : راستہ میں رمیش، شمیم کوئی مل ہی جائے گا۔ دس پانچ روپے تو اُن سے بھی قرض لیے جاسکتے ہیں۔

حمید : (آذرین کا چہرہ دیکھ کر) قرض! خدا بچائے دوستوں کے قرض سے — (وحید کے رونے کی آواز) بھئی تم ہی جاؤ۔

کلثوم کی آواز: کم بخت سوئے گا بھی یا نہیں یہ لے۔

(طمانچہ کی آواز اور وحید کے زور سے چیخ کر رونے کی آواز)

حمید : کلثوم — ارے کلثوم — کیوں مار رہی ہے بچہ کو۔ شرم نہیں آتی بچہ کو مارتے ہوئے — غصہ ہے مجھ پر اور اُتار رہی ہو اس پر۔ (آذرین سے) بھئی معاف کرنا میں آج قطعی نہیں جاسکتا — (بلند آواز سے) کلثوم یہاں آؤ — اچھا آذرین گڈ نائٹ۔

(اس کمرہ کی طرف بڑھتا ہے جس میں کلثوم ہے۔ کلثوم وحید کا ہاتھ پکڑے ہوئے آتی ہے۔ وحید کے گالوں پر آنسو بہہ رہے ہیں)۔

آئرین : (غصہ سے حمید کو دیکھتے ہوئے) بدتمیز لیڈیز سے کس طرح behave کرتے ہیں یہ بھی نہیں معلوم جنگلی کہیں کے۔

(غصہ سے کمرہ سے نکل جاتی ہے)

حمید : مارنے پیٹنے سے کہیں بھوک بجھتی ہے۔ اور پھر اتنا سا بچہ سمجھتا ہے کہ تم مار رہی ہو تو وہ خاموش ہو جائے۔

کلثوم : (غصہ سے) اس کم بخت کی وجہ سے زندگی عذاب ہوگئی ہے۔ سوچتی ہوں کہ گلا گھونٹ کر مار ڈالوں کہ تم سے نجات ملے۔

حمید : (وحید کو گود میں اٹھا کر پیار کرتے ہوئے) اگر تم مجھ سے اس قدر اکتا چکی ہو تو علاحدہ ہو جاؤ مگر اس ننھی سی جان کی کیوں دشمن ہوگئی ہو۔

کلثوم : میں تو تم سے کبھی کی علاحدہ ہوگئی ہوتی۔ مگر اس کم بخت کا خیال ہے کہ در در روٹی مانگتا پھرے گا۔ مجھے تو بیگم انیس کبھی کا کہہ رہی ہیں کہ ان کے یہاں چلی آؤں۔ مگر پھر اس کا خیال آتا ہے کہ ان کے بچوں کی لات جوتی میں رہے گا۔

حمید : اگر تم یہ ارادہ کر چکی ہو تو تمھیں چلی جانا چاہیے۔ مگر —

کلثوم : انسان پیٹ پالنے کے لیے ہی سب کچھ کرتا ہے۔ مگر تمھارے یہاں تو اب پیٹ بھی نہیں بھرتا— جانے کہاں کی حرافائیں آجاتی ہیں ان کے لیے۔ خوب نکلتا ہے تمھارے پاس پیسہ اور میں ٹھیری چھوکری— جب چاہا اشارہ کیا بلا لیا— جب کسی نے تمھارے منہ پر طمانچہ مارا تم نے آکر میرا ہاتھ پکڑ لیا۔

حمید : خیر ان باتوں کی ضرورت نہیں۔ اس سودے میں جتنا میرا قصور ہے اتنا ہی تمھارا۔

کلثوم : ہاں اس لیے تو میں چاہتی ہوں کہ علاحدہ ہو جاؤں۔ میں اپنی غلطی کو سمجھ گئی ہوں۔

حمید : شوق سے جاؤ— تمھیں روکتا کون ہے۔

کلثوم : ہاں ہاں اسی وقت چلی جاتی ہوں (وحید کو حمید کی گود سے لیتے ہوئے) چھوڑ دو اس بچہ کو— اچھا ہے ذرا غیروں کی لات جوتی میں رہے۔ تمھارا نام تو روشن ہو۔

حمید : اگر قسمت میں یہ بدنامی لکھی ہے تو وہ بھی ہو کر رہے گی۔ مگر اس ننھی سی جان کو گھر سے بھوکا نہیں نکال سکتا۔ تم ذرا ٹھیرو— میں اس کے لیے کھانے کا کچھ انتظام کروں۔

کلثوم : خیر اب اس کی ضرورت نہیں— میں جہاں جا کر پڑوں گی وہیں اس کو بھی دو روٹیاں مل جائیں گی۔ (بچہ کو گھسیٹتے ہوئے) چل سمجھ لے کہ تیرا باپ مرگیا۔

حمید : (ٹھنڈی سانس بھر کر) ہاں غریب باپ کی اولاد یتیم ہوتی ہے (غصہ سے وحید کو کلثوم سے چھینتے ہوئے) چھوڑ دو بچہ کو تم سے اس سے زیادہ اور کیا توقع ہوسکتی ہے (نفرت سے) آج وحید کی ماں ہو کل جس کے یہاں نوکری کرو گی اس کے بچہ کی ماں بنو گی تمھارا بچہ کہیں نہیں گیا۔

کلثوم : لیکن میں اس کو یہاں نہیں چھوڑ سکتی اور پھر اس پر تمھارا حق بھی کیا ہے۔

حمید : کیوں؟ میں اس کا باپ ہوں۔

کلثوم : اس کے باپ تم نہیں— وہ ہے جس کا نام میونسپلٹی کے رجسٹر میں لکھا ہے۔

(حمید ایک دم سکتہ میں رہ جاتا ہے اور ایک کرسی پر خاموش بیٹھ جاتا ہے۔ کچھ دیر بعد گردن اٹھا کر)

حمید : خدا کے لیے کلثوم بچہ پر یہ ظلم نہ کرو— اب تم خود اپنی آنکھوں سے دیکھ رہی ہو کہ میں خود نوکری کے لیے کس قدر پریشان ہوں— ابا میاں کو بھی تار دے کر روپیہ منگوایا ہے۔ آج کل میں آنے ہی والا ہے— اور مجھے بھی کہیں نہ کہیں نوکری مل ہی جائے گی ہمیشہ تو یونہی زندگی نہیں گزرے گی۔

کلثوم : جانے کب سے تو یہی کہہ رہے ہو کہ آج نوکر ہوا کل ہوا۔ مگر ہمیں تو آج تک اس کی ہوا بھی نہیں آئی۔

حمید : جانتی ہو ابھی ابھی آزادی ملی ہے۔ اپنے نیتاؤں نے ابھی کرسیاں سنبھالی ہیں

پہلے ان کے عزیز رشتہ داروں کا حق ہے۔ پھر جنھوں نے جنگِ آزادی میں جیلیں کاٹی ہیں ان کا۔ اور کہیں تیسرا نمبر اپنا ہے۔ جاؤ بچہ کو بہلا لو— تم ذرا ذرا سی بات میں ناراض ہو جاتی ہو۔

کلثوم : (وحید کو گود میں اٹھا کر) مجھے تو ان مالزادیوں سے چڑھ ہے جو یہاں آجاتی ہیں— اب تم اچھے خاصے جا رہے تھے کچھ انتظام ہو جاتا مگر آن مریں یہاں— کون تھی یہ؟

حمید : میں جس کچہری میں تھا اُسی میں ٹائپسٹ ہے۔ جاؤ بچہ کو سُلانے کی کوشش کرو۔ (کلثوم اپنے کمرہ کی طرف جاتی ہے) کلثوم (مسکرا کر)۔ (یہ تو بتلاتی جاؤ اس بچہ کا باپ کون ہے؟

(کلثوم مسکراتی ہوئی اپنے کمرہ میں چلی جاتی ہے۔ حمید کمرہ میں ٹہلنے لگتا ہے۔ کچھ دیر بعد نصرت ایک لڑکی کو لیے ہوئے آتا ہے۔ لڑکی شراب کے نشہ میں دھت ہے اور نصرت کا سہارا لیے ہوئے چل رہی ہے)

نصرت : (حمید کی طرف اشارہ کر کے) شیریں! یہ ہیں میرے دوست حمید۔

شیریں : فیرنڈ— ہلو مسٹر— (لڑکھڑاتی ہوئی بڑھتی ہے اور گرنے لگتی ہے۔ حمید اس کو سہارا دیتا ہے) ہلو فیرنڈ۔

حمید : یہ بلا کہاں سے لے آئے؟

شیریں : فرینڈ— ہی ہی ہی۔

نصرت : کبوتری ہے کبوتری— کہو بیٹا کیسا مال ہے؟

حمید : تمھارا سر ہے۔

شیریں : (حمید سے جھولتے ہوئے) آئی لو یو ڈارلنگ۔ ہی ہی ہی—

حمید : کہاں سے پکڑ لائے اس بلا کو؟

نصرت : کر لو بیٹا کچھ دیر عیش۔ کیا یاد کرو گے کوئی دوست ملا تھا۔

حمید : تم کسی دن جوتے پڑواؤ گے اس محلے میں۔ سب شریف لوگ رہتے ہیں۔

نصرت : (قہقہہ لگا کر) سب اتنے ہی شریف ہیں جتنے تم۔ جتنا میں۔ جتنی کلثوم، بھیا حمام میں سب ننگے ہیں۔ کون کس کو دیکھتا ہے۔ سب اپنا اپنا ننگا پن چھپاتے ہیں۔

حمید : مگر تم نے یہ حماقت کیا کہ اُسے یہاں لے آئے۔

نصرت : بڑی چار سو بیس کرنا پڑی اور تم حماقت کہتے ہو۔ ہوٹل میں بیٹھی چائے کی چسکیاں لے رہی تھی دو پیک وہسکی کے پلائے پھر بھی چلنے پر راضی نہیں ہوئی۔ رشید مارا کوٹا ہوٹل میں آ گیا اُس سے قرض لے کر دو پیک پلائے جب بالکل مدھوش ہوگئی تب کہیں لایا۔

حمید : تمھارا تو دماغ خراب ہوگیا ہے۔ اب خود ہی سنبھالو اس عذاب کو۔ میرا پیچھا چھوڑاؤ— دو من کی لاش آن بیٹھی گود میں۔

نصرت : (شیریں سے) کم آن ڈارلنگ۔

شیریں : شٹ اَپ یوفول— (حمید سے) ے آئی کس یو ڈارلنگ۔

حمید : نو نو تھینک یو۔

نصرت : یہ لیجیے ہماری بلی ہمیں سے میاؤں— جیب خالی کرادی ہماری اور جا بیٹھیں اُن کی گود میں۔

حمید : بابا سنبھال، اس عذاب کو۔ میں اس وقت قطعی اس موڈ میں نہیں ہوں۔

نصرت : یہ تو اچھی خاصی راجرس کی قینچی ہے۔ جیب کاٹ لیتی ہے اور رسید ندارد۔

حمید : پہلے نہیں سوچا تھا یہ، اب بھگتو۔

نصرت : ہوٹل میں تو بھیگی بلی بنی بیٹھی تھی یہ کیا معلوم تھا کہ پیٹ میں ڈاڑھی ہے گز بھر کی۔

حمید : بس تو اب بھگتو۔ لیکن میرا پیچھا چھوڑاؤ (شیریں حمید سے لپٹ جاتی ہے) یہ تو گلے کا ہار ہوگئی اگر ایک دو پیک اور پی لیتی تو ننگی ناچتی ہوئی آتی راستہ بھر۔

نصرت : تو اب ننگی ہونے میں کیا کسر ہے۔ دیکھو کیسی گداز رانیں ہیں۔

حمید : بھئی تو تو بہت بدتمیز ہوگیا ہے۔ معلوم ہوتا ہے جیسے دلالی کر رہا ہو (مسکرا کر) تیرا خاندانی پیشہ کیا ہے؟

نصرت : (مسکرا کر) دلالی۔ باپ نے بھی یہی پیشہ اختیار کیا تھا۔ اپنی تین لڑکیوں کی دلالی کی۔ مگر شرائط ذرا سخت تھیں۔ گیارہ گیارہ ہزار مہر۔ جس میں سے نصف پہلے داخل کرنا ہوگا نصف طلاق کے وقت لڑکے کے لیے حسین نوجوان تعلیم یافتہ اور معقول تنخواہ کا ہونا ضروری ہے— تینوں بیٹیوں کے گیارہ گیارہ ہزار وصول کیے۔ اب دو کمپنیوں کا ڈائرکٹر ہے میرا باپ اور چونکہ میں اس کی اس دلالی میں شامل نہیں تھا اس واسطے ایک پیسہ نہیں ملا مجھ کو (قہقہہ مار کر) ارادہ ہے کہ اسے لکھ دوں کہ ابا جان ایک چکلے کے منیجر اور ہوجاؤ خوب آمدنی ہوگی۔

حمید : اچھا اچھا اب یہ بکواس بند کر۔ نہ سوچتا ہے نہ سمجھتا ہے بس کہنے لگتا ہے۔

نصرت : دوست میں خوب سوچتا ہوں اور سمجھتا ہوں۔ میں اپنی ان بہنوں کے متعلق سوچتا ہوں جن کی عمریں اٹھارہ اور چوبیس سال کے درمیان ہیں اور جن کے اب کوئی گیارہ ہزار ادا نہیں کرسکتا۔ ایک دن وہ شیریں بن جائیں گی اور ہوٹلوں میں بیٹھ کر گاہکوں کا انتظار کریں گی کہ وہ آئیں اور انھیں خریدیں (شیریں کا ہاتھ پکڑ کر) کم آن ڈارلنگ۔

(شیریں کو دوسرے کمرہ میں لے جاتا ہے اور دروازہ بند کرلیتا ہے۔ حمید کچھ دیر کمرہ میں ٹہلتا رہتا ہے۔ پھر کلثوم کے کمرہ کے پاس جاکر)

حمید : کلثوم— ارے کلثوم— کیا وحید سوگیا۔

کلثوم : ابھی ابھی سویا ہے۔ شور نہ کیجیے جاگ جائے گا۔

حمید : ذرا یہاں تو آؤ— اب ناراض تو نہیں ہو۔

کلثوم : خاموش رہیے۔ ابھی سویا ہے اگر جاگ گیا تو مصیبت آجائے گی۔

(حمید پھر کمرہ میں ٹہلنے لگتا ہے۔ کلثوم کمرہ کے دروازے سے منہ باہر نکال کر) آج یہی سزا ہے تمہارے۔

حمید : لیکن سنو تو۔

(کلثوم دروازہ بند کرلیتی ہے۔ حمید کمرہ میں پھر ٹہلنے لگتا ہے۔ کچھ دیر بعد آئرین پھر داخل ہوتی ہے)۔

آئرین : دیکھی اپنے فرینڈ شمیم کی حرکت۔ ابھی راستہ میں مل گئے تھے۔ مجھے ہوٹل میں لے گئے وہاں سے سینما کا پروگرام تھا۔ ہوٹل میں شکنتلا مل گئی۔ بس اس کی دم کے پیچھے بندھ گئے— سخت انسلٹ کی ہے میری خیر میں بھی وہ بدلہ لوں گی کہ عمر بھر یاد نہ کریں تو میرا نام۔

حمید : بھئی تم لوگوں کی ذرا ذرا میں انسلٹ ہوجاتی ہے (آئرین کی ناک پکڑ کر) ابھی تک تو اپنی جگہ پر ہے۔ غائب نہیں ہوئی۔

آئرین : (حمید کا ہاتھ جھٹک کر) بی سیریس ڈارلنگ یہ انسلٹ نہیں تو اور کیا ہے۔ مجھے تو دو پیک اس طرح پلائے جیسے خیرات دے رہے ہوں۔

حمید : (مسکرا کر) تم کو تو معلوم ہے کہ وہ اس سے لو کرتا ہے۔

آئرین : لو— ہنہ— ہم کو معلوم ہے اس ڈرامے کی حقیقت۔ کل ہی رمیش نے اس کے ساتھ بدتمیزیاں کیں اور وہ ہنستے رہے اور چھ مہینے پہلے جو abortion ہاسپٹل میں کرایا تھا، ڈرامہ کلائی میکس پر تو اسی وقت پہنچ گیا تھا۔ یہ لو نہیں اچھا خاصا فراڈ ہے۔ سچائی اس قدر ہے کہ شکنتلا دلالی کررہی ہیں شمیم اور عطیہ کے درمیان میں۔ بس اسی لیے اس کی خوشامد میں لگے رہتے ہیں۔

حمید : اب abortion ایسا کوئی جرم تو ہے نہیں۔ برتھ کنٹرول نہیں abortion سہی۔ گاندھی جی بھی تو برتھ کنٹرول کے حامی تھے اگر زندہ رہتے تو— abortion کی بھی حمایت کرتے— اچھا سرکار یہ بتلاؤ اس وقت مجھ غریب کے حال پر کیسے رحم آ گیا۔

آئرین : اس وقت میں بالکل confused ہوں۔ مرد کس قدر خود غرض ہوتا ہے جی چاہتا ہے کہ اس کی نسل ہی کو ختم کردیا جائے۔

حمید : اگر abortion اور برتھ کنٹرول کی یہی رفتار رہی تو خود ختم ہوجائے گی تمھیں

تکلیف کرنے کی ضرورت نہیں۔ حوا کی یہ بیٹی جو سوسائٹی کی زینت ہے اُسے
نسل آدم سے کب محبت ہے۔

آئرین : خیر میں اس وقت اس موضوع پر بحث کرنا نہیں چاہتی۔ تم تنہا ہونا۔

حمید : ہاں تنہا ہی سمجھو۔

آئرین : آج رات میں یہیں گزاروں گی۔

حمید : زہے نصیب — شمیم کے علاوہ اور کوئی نہیں پھنسا ہوٹل میں۔

آئرین : اگر کوئی میری طرف آنکھ اٹھا کر بھی دیکھ لیتا تو اسے دھتکارتی کہ سب شیخی
کرکری ہو جاتی مردوں کی۔

حمید : تو بھئی مجھے معاف کرو کہیں شمیم کا غصہ مجھ پر اترنے لگا تو میری اچھی خاصی
ناک غائب ہو جائے گی۔

آئرین : تم تو جانے کیوں الٹی سیدھی باتیں کر رہے ہو۔

حمید : میں کیا جانوں عورتوں سے کس طرح behave کرتے ہیں۔ اچھا خاصا
ایڈیٹ ہوں۔

آئرین : تم تو لفظ پکڑتے ہو ڈیر — خیر اس وقت تو کچھ شراب کا انتظام کرو، کھانے کی
ایسی کوئی خاص ضرورت نہیں — اگر کوئی ضرورت ہوئی تو بعد میں دیکھیں گے۔
(حمید کچھ دیر سوچتا ہے۔ پھر جیب میں ہاتھ ڈال کر روپیہ نکال کر اچھالتے
ہوئے)

حمید : لیکن شراب کی دوکانیں تو سب بند ہو گئی ہوں گی نو بج گئے ہیں۔

آئرین : کوئی دیسی شراب ہی سہی۔ دیسی شراب کی دوکانیں تو گیارہ بجے تک کھلی
رہتی ہیں (حمید کچھ سوچنے لگتا ہے) ڈارلنگ جلدی چلے جاؤ — ایک دو پیک
کے بعد اس چاندنی رات کا لطف آجائے گا۔
(نصرت کے کمرہ سے قہقہوں کی آواز) کون ہے یہ؟

حمید : نصرت کے ساتھ کوئی لڑکی ہے۔

آئرین : (شرارت سے مسکرا کر) تم ویٹنگ لسٹ میں تو نہیں ہو؟

حمید : اوہ نو نو— اچھا ذرا میں کپڑے بدل لوں۔

(دوسرے کمرہ میں جاتا ہے اور کچھ دیر بعد لباس تبدیل کر کے آتا ہے۔ اسی وقت بچہ دروازہ میں سے داخل ہو کر)

بچہ : آپ کو اماں بلا رہی ہیں۔

حمید : دیکھو میں اس وقت—

آواز : میں یہیں کھڑی ہوں— کہیے آپ نے کس لیے یاد فرمایا تھا—

حمید : اوہ— آپ تو آ ہی گئیں۔

آواز : آپ ہی نے تو بلایا تھا۔

حمید : لیکن میں نے تو یونہی کہہ دیا تھا کہ آپ نہیں آئیں گی۔

آواز : کس طرح نہ آتی۔ بچہ صبح سے بھوکا ہے— آپ سے قرض مانگا تھا لیکن آپ نے یہ شرط لگا دی میں خود آؤں— میں حاضر ہو گئی۔

(حمید چند سیکنڈ خاموش رہتا ہے)

حمید : میں خود صبح سے بھوکا ہوں۔ اپنی سفید پوشی کا بھرم رکھنے کے لیے یہ شرط لگا دی تھی کہ نہ آپ آئیں گی اور نہ میرا بھرم کھلے گا۔

(شرمندگی میں اپنے بالوں سے کھیلنے لگتا ہے)

آواز : خیر بیٹا آؤ صبر کرو۔

(بچہ باہر جاتا ہے۔ حمید ایک دو سیکنڈ سوچتا ہے)

حمید : دیکھیے— سنیے تو

آواز : جی فرمائیے۔

حمید : میرے پاس اس وقت صرف ایک روپیہ ہے۔ وہ آپ لے جائیے اور کھانے کا انتظام کر لیجیے۔ اگر ہو سکے تو کچھ یہاں بھی بھیج دیجیے گا۔ آج وحید بھی بھوکا

سویا ہے۔ ذرا بچہ کو یہاں بھیج دیجیے۔

آئرین : (گھبرا کر) کیا کر رہے ہو ڈیر ــــ پھر شراب ــــ

(حمید اس کا کوئی جواب نہیں دیتا ــــ بچہ داخل ہوتا ہے)

حمید : (بچہ کو روپیہ دیتے ہوئے) لو بیٹا ــــ لے جاؤ ــــ

(روپیہ دے کر محبت سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرتا ہے۔ بچہ روپیہ لے کر چلا جاتا ہے۔ حمید آہستہ آہستہ آ کر ایک کرسی پر بیٹھ جاتا ہے)

آئرین : بلا وجہ میرا ٹائم ویسٹ کیا ــــ پہلے ہی سے کہہ دیتے۔

(میز پر سے ہینڈ بیگ اٹھا کر جاتے ہوئے) ایڈیٹ کہیں کے۔

(کمرہ سے نکل جاتی ہے۔ حمید اسے دیکھ کر مسکراتا رہتا ہے۔ اٹھ کر کمرہ میں ٹہلتا ہے۔ کلثوم کے کمرہ کے پاس جا کر دروازہ کو کھٹکھٹاتا ہے۔ کوئی جواب نہیں آتا)۔

حمید : کلثوم ــــ کلثوم ــــ دروازہ تو کھولو۔

کلثوم : بس سو جایئے۔ بھوک میں مذاق اچھا نہیں لگتا۔

(حمید پھر کمرہ میں ٹہلنے لگتا ہے۔ نصرت کے کمرہ سے قہقہوں کی آوازیں آتی ہیں)

حمید : (مسکرا کر) حمید صاحب واقعی آپ ایڈیٹ ہیں ایڈیٹ۔

(پردہ)

(1951)

خون کی بوندیں

افرادِ تمثیل

(1) منصور (ایک مصور) (2) اندو (ایک رقاصہ) (3) ورما (اندو اور منصور کا دوست) (4) شکنتلا (اندو کی سہیلی ایک سوسائٹی پسند خاتون ملازمہ، فسادیوں کا گروہ اور پولس وغیرہ)

منصور کا کمرہ، جو اس کے نگار خانہ کا کام بھی دیتا ہے۔ چونکہ ایک اچھا مصور ہونے کے ساتھ ساتھ وہ ایک اچھا مجسمہ ساز بھی ہے۔ اس واسطے تمام کمرہ میں بہترین مجسمے جس پر منصور کو کل ہند نمائشوں میں انعامات ملے ہیں، رکھے ہیں۔ تمام کمرہ میں متعدد تصاویر آویزاں ہیں جن میں کئی تصاویر گزشتہ سالوں میں سال کی شاہ کار تصاویر قرار دی جا چکی ہیں — تمام نگار خانہ میں بڑے بڑے آئینہ لگے ہیں۔ کمرہ میں چاروں طرف روشن دان ہیں جن میں بڑے بڑے شیشے لگے ہیں۔ کمرہ میں کئی کھڑکیاں ہیں جو اس وقت روشنی کے لیے کھلی ہوئی ہیں۔ کمرہ میں متعدد الماریاں رکھی ہیں جن میں قیمتی کتابیں بہترین گرد پوش کی سلیقہ سے چنی ہوئی ہیں۔ نگار خانہ میں دو دروازے ہیں۔ ایک اندرون مکان کھلتا ہے اور دوسرا بیرون مکان۔ دروازوں اور کھڑکیوں پر قیمتی ریشمی پردے پڑے ہیں۔ تمام کھڑکیوں کے پردے اس وقت ہٹا

دیے گئے ہیں۔ کرسیاں اور صوفے سلیقہ سے رکھے ہوئے ہیں۔ دن کے تقریباً نو بجے ہیں۔

اندو ایک کرسی پر سفید ساڑھی پہنے بیٹھی ہے۔ پاس ہی منصور ایک ڈھیلا ڈھالا لبادہ پہنے کھڑا ہے۔ ایک ہاتھ میں رنگوں کی کشتی ہے اور دوسرے میں برش۔ اس کے سامنے ایک اسٹینڈ پر ایک پردہ ہے جس پر اندو کی تصویر بنی ہوئی ہے۔ منصور کے پاس ایک چھوٹی سی میز رکھی ہے جس پر سگریٹ کا ایک ٹن اور ماچس پڑی ہے۔ منصور آہستہ آہستہ گنگنا رہا ہے کبھی تصویر کو دیکھتا ہے اور کبھی اندو کو اور پھر برش تصویر پر چلانے لگتا ہے۔ اندو خاموشی سے منصور کو دیکھ رہی ہے کچھ دیر بعد انگڑائی لے کر۔

اندو : منصور بھیا۔

منصور : (اپنے کام میں مشغول رہتے ہوئے) کیا ہے اندو؟

اندو : بس کیجیے— میں تو اب بیٹھے بیٹھے اُکتا گئی۔

منصور : (اس طرح کام میں مشغول رہتے ہوئے) بس اندو تھوڑی دیر اور— (اندو کو دیکھ کر) فنیشنگ ٹچیز ہیں— میں بھی تو—

اندو : (قطع کلام کرکے) تو پھر بس کیجیے۔ بے کار بیٹھے بیٹھے تو سر میں درد ہونے لگا۔

منصور : (پھر اپنے کام میں مشغول ہوکر) دیکھ اندو— آج تصویر مکمل ہو جائے گی۔

اندو : یہ تو ٹھیک ہے— مگر—

منصور : (برش اور کشتی میز پر رکھتے ہوئے) اچھا اچھا جیسی تیری مرضی— میں اپنی اندو رانی کو ناراض کرنا نہیں چاہتا۔

(تصویر کو بغور دیکھنے لگتا ہے۔ اندو کرسی سے اٹھ کر منصور کے پاس مسکرا کر آتے ہوئے)

اندو : شکریہ آپ کا منصور بھیا۔

منصور : (اندو کو پیار کی نظروں سے دیکھ کر) میں اندو رانی کو بہت پریشان کرتا ہوں (مسکرا کر) ناراض تو نہیں ہوتیں؟

اندو : (شرارت سے مسکرا کر) بہت۔ میں تو آپ سے عاجز آچکی ہوں۔

منصور : (تصویر کو دیکھتے ہوئے) اچھا اندو— تجھے یہ تصویر پسند بھی ہے یا نہیں؟
اندو : (شرارت سے مسکرا کر) قطعی نہیں— لیکن آپ محنت ضرور کر رہے ہیں۔
منصور : مجھے محنت کی پرواہ نہیں— مگر اس کا خیال ضرور ہے کہ—
اندو : (مسکرا کر لقمہ دیتے ہوئے) میں پریشان ہوتی ہوں— اس میں پریشانی کی کون سی بات ہے۔
منصور : تجھے میری محنت کا احساس ہے۔ بس کافی ہے (اندو کا چہرہ دیکھ کر) اور جس وقت تو یہ کہتی ہے کہ مجھے یہ تصویر پسند ہے تو میں سمجھتا ہوں کہ مجھے میرا انعام مل گیا۔
اندو : لیکن میں تو صرف ظاہری خوبصورتی دیکھتی ہوں— فن کی باریکیاں کیا سمجھوں۔
منصور : اگر دنیا کے تمام فن کار مل کر اس کی ہر ایک لائن میں خامیاں نکالیں تب بھی میرے دل کو اس سے تسکین ہو جائے گی کہ اندو رانی نے اسے پسند کر لیا ہے اور بس یہی کافی ہے۔ (ملازمہ داخل ہو کر)
ملازمہ : (اندو رانی— بیگم صاحبہ آپ کا انتظار کر رہی ہیں۔ ناشتہ نہیں کیجیے گا؟
منصور : (تعجب سے) ہیں اندو— تم نے ابھی تک ناشتہ نہیں کیا۔
اندو : (مسکرا کر) میں تو بستر سے اٹھ کر چلی آئی تھی کہ آپ سے عرض کروں کہ آج رکھشا بندھن ہے— راکھی باندھوں گی آپ کے— اور یہاں آپ نے قید کر لیا۔
منصور : (مسکرا کر) ضرور باندھو— مجھے کب انکار ہے— اچھا جاؤ ناشتہ کرو۔ دیکھو اندو مجھے لاپرواہی بالکل پسند نہیں۔

(اندو اور ملازمہ نگارخانہ سے نکل جاتی ہیں۔ منصور تصویر کو غور سے دیکھنے لگتا ہے۔ کمرہ میں ٹہلتا ہے اور کچھ گنگناتا ہے۔ پھر تصویر کے پاس کھڑے ہو کر اسے غور سے دیکھتے ہوئے)

منصور : اندورانی— تیرا منصور بھیا بدنامی سے نہیں ڈرتا۔ کاش دنیا والے کچھ وسیع النظر ہوتے— خیر— کبھی تو— (ورما داخل ہو کر)
ورما : ہلو منصور— کیا ہو رہا ہے۔

منصور : آہا مسٹر ورما۔ بھئی یہ چاند صبح صبح کیسے نکل آیا۔ کہو مزاج تو اچھے ہیں۔

ورما : (مسکرا کر) جی رہا ہوں۔ کیا گوشہ نشین ہو گئے ہو؟ یہ کلب آنا جانا کیوں چھوڑ دیا۔؟

منصور : کیا بتلاؤں۔ آج کل بہت عدیم الفرصت ہوں۔ اول تو نجمی کی موت کے بعد اپنی زندگی میں ایک کمی محسوس کرنے لگا ہوں اور دوسرے (سگریٹ جلا کر) لو سگریٹ پیو۔ اور دوسرے جب سے اندو میرے ساتھ ہے میں ایک ذمہ داری محسوس کرنے لگا ہوں۔

ورما : تم نے اندو کے لیے جو قربانیاں دی ہیں وہ قابل رشک ہیں۔ مگر افسوس اس کا ہے کہ دنیا کچھ۔

منصور : (طنزیہ مسکرا کر) ورما!۔ (ورما کا چہرہ غور سے دیکھ کر) افسوس تو ان لوگوں کو ہوتا ہے جو کسی لالچ یا خودغرضی کے لیے قربانی دیتے ہیں۔ میں قربانی کو ایک مقدس فرض سمجھتا ہوں۔

ورما : (چہرہ پر سنجیدگی پیدا کرتے ہوئے) یہ انسانی زندگی کی معراج ہے۔ ڈیر منصور! لیکن ہماری سوسائٹی اس قدر وسیع النظر نہیں کہ تمھاری قربانی کی قدر کرتے۔

منصور : کسی چیز کی قدر اس کا انعام ہے اور انعام کی خواہش اعتراف شکست۔ (طنزیہ مسکرا کر) اچھا یہ کہو کیسے آنا ہوا۔

ورما : ویسے ہی چلا آیا۔ کئی روز سے ملاقات نہیں ہوئی تھی۔ (کچھ دیر خاموش رہ کر) کیوں منصور اندو کی زندگی میں جو خلیج پیدا ہو گئی ہے وہ پر نہیں کی جا سکتی۔

منصور : کیوں نہیں؟۔ میری عین خواہش ہے کہ۔

ورما : (سگریٹ جلا کر) جوانی اور پھر عورت کی جوانی۔ بہشت کی رعنائیوں چاند کی دلکشی اور پھولوں کی نکہت سے مرکب ہے۔ اس پر غم والم کے بادل اچھے نہیں لگتے۔

منصور : (مسکرا کر) یہ شاعر کب سے ہو گئے؟

ورما : جس وقت سے فرض اور محبت کی کشمکش میں محبت نے فتح پائی ہے۔

منصور : نجمی کی موت کے بعد وہ اور کس سے شادی کو تیار ہوگی۔ یہ میں نہیں کہہ سکتا اور معاف کرنا تم ایک جذباتی انسان ہو— جو وقتی طور پر مشتعل ہوجاتا ہے— مگر فوراً ہی یہ آگ بجھ جاتی ہے۔

ورما : میں ایک جذباتی انسان ضرور ہوں مگر بچہ کی طرح انگارہ کو ایک چمکدار کھلونا سمجھ کر تو نہیں اٹھا سکتا۔ (سگریٹ کا بڑا سا کش لے کر) میں اس سوسائٹی کے منہ پر ایک طمانچہ مارنا چاہتا ہوں جو اندو سے اس لیے نفرت کرتی ہے کہ وہ نجمی سے محبت کرتی تھی۔

منصور : تم جانتے ہو کہ نجمی کی موت کے بعد اس نے میرا سہارا ڈھونڈا ہے جب کہ تمھاری سوسائٹی اس کو ٹھکرا چکی تھی۔ میں اُسے سہارا دینے کو تیار ہوا۔ اس نے مجھ پر بھروسہ کیا— خیر— میں تم میں ایک جرأت عمل پاتا ہوں— مگر—

ورما : تم میری طرف سے ہمیشہ مشکوک رہتے ہو (مسکرا کر) تمھاری حالت اس عورت کی طرح ہے جس کی ساڑھی غیر مرد کے جھٹکے سے کھل گئی ہو اور جو برہنگی سے قطع نظر یہ سوچ رہی ہو کہ ساڑھی پھٹ تو نہیں گئی۔

منصور : ہاں— (مسکرا کر) میں یہی دیکھتا ہوں۔ لیکن تم دیکھتے ہو کہ ساڑھی میلی تو نہیں ہوگئی۔

(شگفتلا مسکراتی ہوئی داخل ہوتی ہے)

منصور : (شگفتلا کو دیکھ کر) اوہ ہو— کہیے مزاج تو اچھے ہیں۔

شگفتلا : عنایت ہے آپ کی۔ (ورما سے مخاطب ہوکر) کہیے مسٹر ورما آج تو صبح صبح نازل ہوگئے آپ۔

ورما : جی ہاں بس آ ہی گیا— کہیے ڈاکٹر صاحب کے مزاج کیسے ہیں۔ آج کل نظر نہیں آتے؟

شگفتلا : (مسکرا کر) دن رات وہ ہیں اور مریض۔ فرصت کہاں ہے ان کو۔

منصور : (کرسی کی طرف اشارہ کرکے) تشریف رکھیے— کوئی خدمت میرے لائق۔

شکنتلا : (کرسی پر بیٹھتے ہوئے) بس مہربانی ہے آپ کی— کہیے اندو کہاں ہے!

منصور : اندر ہے— (ورما سے) مسٹر ورما کبھی آپ نے اپنے اس خیال کا اظہار اندو سے بھی کیا۔

ورما : ہاں— لیکن صاف الفاظ میں نہیں— وہ خود کچھ اس قدر سمجھ دار ہے کہ جب اس موضوع پر گفتگو ہوتی ہے وہ بات صاف اڑا جاتی ہے۔

شکنتلا : کس موضوع پر؟

منصور : اندو کی آئندہ زندگی پر۔

شکنتلا : میں بھی کئی روز سے سوچ رہی تھی کہ آپ سے اس موضوع پر گفتگو کروں لیکن موقع ہی نہیں ملا۔ میرا خیال ہے آپ کا اس سے علٰحیدہ ہو جانا ہی بہتر ہے۔ ہم دنیا کی زبان نہیں پکڑ سکتے۔

منصور : ہاں دنیا کچھ اس قدر کور باطن ہے کہ کسی چیز کو حقیقت کی نگاہ سے نہیں دیکھتی— لیکن— (سگریٹ کا کش لے کر) آخر کیا کیا جائے— معلوم نہیں اندو اسے پسند بھی کرے گی یا نہیں— میری تو دلی خواہش ہے کہ وہ شادی کر لے۔

شکنتلا : یہ میرا ذمہ ہے— میں اسے راضی کرلوں گی۔

منصور : (دروازہ کی جانب جاتے ہوئے) میں اُسے یہیں بھیجے دیتا ہوں آپ ابھی کوشش کیجیے۔ (نگارخانہ سے نکل جاتا ہے)

شکنتلا : (کچھ دیر خاموش رہ کر) ورما— تم مطمئن رہو— میں اُسے راضی کرلوں گی۔ مجھے اس منصور سے ہمیشہ کی عداوت ہے— دنیا منصور کو فرشتہ سمجھتی ہو مگر میں نہیں۔

ورما : مجھے بھی اس کم بخت سے نفرت ہے— مگر وہ اس قدر چکنا گھڑا ہے کہ اُسے لعن وطعن کی بھی تو پرواہ نہیں— وہ اس کا کئی بار اظہار کر چکا ہے۔

شکنتلا : اس کا یہ بار بار اظہار ہی تو اعترافِ شکست ہے۔ جب کسی چکنی چیز پر کھڑے ہو کر انسان کے قدم ڈگمگاتے ہیں تو وہ بھی چلاتا ہے کہ وہ چکنی چیز پر کھڑا ہے مگر اسے اس کی پرواہ نہیں۔ بہرحال آج ہم جس کام کے لیے

آئے ہیں اسے پیدا ہی کریں گے۔ (باہر سے قدموں کی آہٹ) مسٹر ورما— آپ باہر تشریف رکھیے۔

(ورما تیز تیز قدموں سے نگار خانہ سے نکل جاتا ہے— اندو داخل ہوتی ہے)۔

اندو : کیوں شکنتلا— خیریت تو ہے— یہ راستہ کیسے بھول گئیں۔

شکنتلا : آؤ اندو— ارے یہ تم نے شکل کیسی بنا رکھی ہے۔ میں تو بہت دیر سے تمھارا انتظار کر رہی تھی۔

اندو : ناشتہ کے بعد اماں سے گفتگو کرنے لگی تھی— مسٹر ورما کہاں ہیں۔

شکنتلا : انتظار کرتے کرتے چلے گئے— بھئی تم بھی خوب ہو۔ کلب آنا جانا کیوں چھوڑ دیا۔ کلب کا اسٹیج تو اب تمھارے ناچوں کے لیے ترس رہا ہے۔

اندو : ہاں اب میں نے ناچنا چھوڑ دیا ہے۔

شکنتلا : (تعجب سے) کیوں خیریت تو ہے۔

اندو : میں جس کے لیے ڈانس کرتی تھی جب وہی نہیں رہا تو پھر ڈانس کیسا۔

شکنتلا : (ایک کتاب دکھلاتے ہوئے) یہ کتاب دیکھی تم نے؟

اندو : ہاں— (طنزیہ) کیسی؟

شکنتلا : دنیا نجمی کو بھول چکی ہے مگر ابھی تم دنیا کی نظروں کے سامنے ہو۔ نجمی کے ڈراموں پر تبصرہ ہے— لیکن تمھارے کیریکٹر پر حملہ کہ اس کی تباہی کا سبب تم ہو۔

اندو : تو میرے پاس اس کا کوئی علاج نہیں— ہاں میں ایسی چیزوں کو دیکھ کر مسکرا دیتی ہوں۔

شکنتلا : خیر چھوڑو ان باتوں کو— میں تمھیں ایک صائب رائے دینا چاہتی ہوں۔

اندو : (مسکرا کر) مجھے معلوم ہے— تم یہی کہو گی کہ شادی کرلو۔ ورما سے— مگر معاف کرنا میں شادی کے لیے تیار نہیں۔

شکنتلا : اندو مجبور تو تمھیں کوئی نہیں کرسکتا۔ لیکن کم از کم میں اس قدر ضرور کہہ سکتی ہوں کہ شادی اور محبت دو علاحدہ علاحدہ چیزیں ہیں۔

اندو : ممکن ہے تمھارا خیال درست ہو لیکن میں شادی اس واسطے کرنا نہیں چاہتی کہ اب محبت نہیں کرسکتی۔

شکنتلا : لیکن شادی ایک حقیقت ہے۔ زندگی کا ایک کیف ہے۔ ایک نشہ ہے اور سب سے بڑی بات تو یہ ہے کہ اس زندگی میں ہزاروں رومانس پیدا ہو جاتے ہیں۔

اندو : (مسکرا کر) یہ سب کچھ ٹھیک ہے (طنزیہ مسکرا کر) اور یہ رومانس تمھیں کو مبارک ہو— مجھے تو بخشو۔

شکنتلا : لیکن تم یہاں کب تک زندگی گزاروگی۔ ہم آج کل کسی پر بھروسہ نہیں کرسکتے۔

اندو : (غصہ سے) دیکھو شکنتلا— میں سب کچھ برداشت کرسکتی ہوں مگر منصور بھیا کے متعلق کچھ نہیں سن سکتی۔

شکنتلا : لیکن آخر ورما میں کیا برائی ہے— وہ تمھارے لیے بہت سی قربانیاں دے چکا ہے۔

اندو : تو کیا انھوں نے قربانیاں اس لیے دی تھیں کہ ایک روز شادی کے دعوے دار بن کر آجائیں۔ (ورما غصہ سے کمرہ میں داخل ہوکر)

ورما : بس۔ بہت ہو چکا— منصور نے انھیں ایسے بہت سے سبق پڑھا رکھے ہیں۔ (غصہ سے بلند آواز میں) مسلمان خود کو علاحدہ قوم بتلاتے ہیں اور پاکستان مانگتے ہیں۔ انھیں اکھنڈ بھارت سے نفرت ہے۔ انھیں ہماری ہر چیز سے نفرت ہے۔ پھر ہم ان سے نفرت کیوں نہ کریں۔ دنیا کہاں کی کہاں پہنچ چکی ہے۔ چاروں طرف خون کی ندیاں بہہ رہی ہیں اور یہ خواب خرگوش میں رواداری کی رٹ لگائے جارہی ہیں۔ سن لو اندو ذرا کان کھول کر۔ ہم یہ برداشت نہیں کرسکتے کہ تم یہاں رہو۔

اندو : بس کہہ چکے آپ— یہ خون کی ندیاں نہ پاکستان کے لیے ہیں نہ اکھنڈ بھارت کے لیے۔ یہ صرف چند انسانوں کی خودغرضی ہے اور انفرادی عداوت— عوام کو آپ جیسے چند خودغرض بھڑکا رہے ہیں— ہماری مشترکہ تہذیب ختم کی جارہی ہے۔ تاریخ میں بدنما داغ چھوڑے جارہے ہیں۔ اور

دنیا کے سامنے ہمیں وحشیوں سے بھی زیادہ ذلیل کیا جارہا ہے۔ (ٹھنڈی ہوکر آہستہ آہستہ) ہمارا تو فرض اس وقت آپس کی دشمنی اور عداوت کو ختم کرنا ہے۔ جھگڑے مٹانے کی ضرورت ہے بڑھانے کی نہیں۔ چند اشتعال انگیز جملے کہہ کر ہزار سال پرانے رشتوں کو کیوں توڑا جائے۔

ورما : خیر میں یہ نصیحتیں سننے یہاں نہیں آیا ہوں — میں تم سے اب صرف اس قدر کہہ سکتا ہوں کہ تم منصور کے ساتھ نہیں رہ سکتیں۔ بڑا پارسا بنا پھرتا ہے۔

اندو : (غصہ سے) خاموش رہیے۔ میں کہہ چکی ہوں کہ منصور بھیا کے متعلق کچھ نہیں سن سکتی۔

ورما : (غصہ سے) اس شخص کے متعلق نہیں سن سکتیں جس کے نزدیک قول وفعل اور اصول بے معنی چیزیں ہیں۔ جس کا مذہب بت شکنی کی تعلیم دیتا ہے لیکن بت تراشی اور مصوری جس کا پیشہ ہے جو مذہب کا نہیں ہوا وہ کسی کا نہیں ہوسکتا۔ خیر میں دیکھ لوں گا۔ (غصہ سے نگارخانہ سے نکل جاتا ہے)

اندو : (شکنتلا سے مخاطب ہوکر) سمجھ میں نہیں آتا کہ آخر اس فساد کو پاکستان اکھنڈ بھارت۔ مذہبی لڑائی اور جہاد کا کیوں نام دیا جاتا ہے۔ (نگارخانہ میں ٹہلنے لگتی ہے) بھائی بھائی کے چھرا گھونپ دیتا ہے اور فاتحانہ مسکراتا ہے۔

شکنتلا : اندو! حالات ہی کچھ ایسے پیدا ہوگئے ہیں جنھوں نے ہمیں مجبور کردیا ہے ان حالات سے ہم خود کو نہیں بچا سکتے۔

اندو : (نفرت سے شکنتلا کو دیکھ کر) شکنتلا! مجھے تم سے بحیثیت ایک عورت کے ایسے خیالات کی اُمید نہ تھی۔ تم عورت ہو تمھارے جذبات میں محبت خلوص اور ہمدردی ہونا چاہیے۔

شکنتلا : ضرور ہونا چاہیے — مگر میں چند وجوہ کی بنا پر —

اندو : ان کو مٹا چکی ہوں۔ (طنزیہ) کسی سے ذاتی بغض وعناد ہوگا۔

شکنتلا : (اٹھ کر) خیر کچھ بھی ہو۔ (دروازہ کی جانب جاتے ہوئے) تم جو کچھ کررہی

ہو اس کے نتائج اچھے نہ ہوں گے۔

اندو : اس نصیحت کا شکریہ — (غصہ سے) میں ان تمام نتائج کو برداشت کرنے کو تیار ہوں۔

(شکنتلا کمرہ سے نکل جاتی ہے۔ اندو نگار خانہ میں ٹہلنے لگتی ہے۔ منصور داخل ہوکر اندو کا چہرہ دیکھ کر)

منصور : ورما اور شکنتلا چل دیے۔

اندو : جی ہاں —

(منصور اندو کا چہرہ غور سے دیکھتا ہے جس پر اس وقت غم و غصہ اور نفرت کے ملے جلے اثرات ہیں۔ اس کے خیالات کو دوسری جانب متوجہ کرنے کے واسطے)

منصور : آؤ اندو — اب تصویر مکمل کرلیں۔

اندو : (چہرہ پر مسکراہٹ پیدا کرنے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے) آپ اس قدر سخت محنت کرتے ہیں۔ مجھے ڈر ہے کہ کہیں آپ پاگل نہ ہو جائیں۔

منصور : (مسکرا کر) نہیں نہیں — پاگل ہوتے ہیں بزدل اور میں بزدل نہیں — لیکن تمھیں میری مصروفیت کا اس قدر خیال کیوں ہے۔

اندو : (شرارت آمیز مسکراہٹ پیدا کرتے ہوئے) (آپ کی مصروفیت کا مجھے خیال رہتا ہے۔ آپ تو خوش فہمی میں مبتلا ہوگئے۔ لیکن ہاں آپ کی صحت کا ضرور خیال ہے۔

منصور : (مسکرا کر) اندو! یہاں صحت پہلے ہی کہاں کی اچھی تھی — تم مطمئن رہو — میری صحت اپنی جگہ سے ہلنے والی نہیں۔

اندو : کچھ اماں کا بھی خیال ہے کہیں وہ یہ نہ سوچیں کہ میں آپ کا خیال نہیں رکھتی۔

منصور : تو پھر یوں کہو۔ (شرارت سے مسکرا کر) کہ اماں کے سوچنے کا خیال زیادہ ہے۔

اندو : (کچھ شرمندہ سی ہوکر) ہاں یونہی سمجھ لیجیے۔ آپ میرے منصور بھیا تھوڑا ہی ہیں جو دل دکھے۔

منصور : تو پھر منصور بھیا بڑے خوش قسمت ہیں — (دور سے شور و غل کی آوازیں جو

آہستہ آہستہ قریب ہوتی جاتی ہیں) یہ شور وغل کیسا ہے؟

(اندو کے چہرے پر غم وغصہ اور نفرت کے جذبات پیدا ہوتے ہیں۔ آوازیں قریب اور قریب تر ہوتی جاتی ہیں)

اندو : وہی خود غرض کتے ہیں جو تہذیب وتمدن۔ فن اور ادب کو تباہ و برباد کرنے کا بیڑہ اٹھا چکے ہیں جو اپنی تباہی پر مسکرا رہے ہیں اور اپنی تاریخ کے اوراق کو سیاہ کر رہے ہیں۔

(شور بالکل مکان کے پاس آتا ہے۔ منصور ایک کھڑکی سے باہر جھانکتا ہے ایک پتھر آکر کھڑکی کے شیشوں پر لگتا ہے جس سے شیشہ چکنا چور ہو جاتا ہے۔ منصور پیچھے ہٹ جاتا ہے۔ اس کے بعد متعدد پتھر شیشوں اور دیواروں پر آکر لگتے ہیں اور کچھ پتھر نگارخانہ میں آکر گرتے ہیں۔ اندو گھبرا کر منصور کو دیکھتی ہے۔ منصور بھی بدحواس سا ہو جاتا ہے۔ کچھ آدمیوں کی نگارخانہ کے پاس دوڑنے اور چلانے کی آوازیں آتی ہیں اور چند سیکنڈ بعد کچھ لوگ نگارخانہ میں داخل ہوتے ہیں ان کے ساتھ ورما بھی ہے)۔

ورما : (منصور کی طرف اشارہ کرے) یہی وہ منصور ہے جس نے ایک ہندو عورت کو اپنے ساتھ جبراً رکھ چھوڑا ہے۔

(لوگ چلاتے ہوئے لاٹھیاں تان کر منصور پر لپکتے ہیں)

اندو : (منصور اور ان لوگوں کے درمیان میں آکر) نہیں نہیں۔ میں خود یہاں اپنی خوشی سے رہتی ہوں۔ کسی نے مجھے جبراً نہیں رکھ چھوڑا ہے۔

ورما : (اندو کا ہاتھ پکڑ کر درمیان سے علیٰحدہ کرتے ہوئے) ہٹ جاؤ ہمیں انتقام لینا ہے۔ اندو زور زور سے چلاتی ہے۔ منصور خاموش کھڑا رہتا ہے۔ ایک شخص منصور پر لاٹھی سے حملہ کرتا ہے اور اس کے سر سے خون جاری ہو جاتا ہے اور چکرا کر گر پڑتا ہے)۔

ورما : (چیخ کر لوگوں کو مخاطب کرتے ہوئے) مٹا دو اس بہشت ارضی کو۔ فنا کر دو اس طلسم خیال کو۔ اینٹ سے اینٹ بجا دو اس نگارخانہ کی۔ ہمیشہ کے لیے

اس کے نام و شہرت پر پردہ ڈال دو۔

اندو : (چیخ چیخ کر) ایسا نہ کرو— ایسا نہ کرو— وہ تمھارے بھائی ہیں۔

(لوگ مجسموں۔ تصویروں اور دیگر قیمتی سامان کو توڑنے پھوڑنے میں مشغول ہوجاتے ہیں۔ الماریاں توڑ ڈالتے ہیں ایک آخری الماری کی طرف بڑھتے ہیں)

اندو : اس الماری کو ہاتھ نہ لگانا۔ اس میں نجمی کے ڈراموں کے مسودے ہیں۔ اس میں اتحاد کے دیوتا چھپے ہوئے ہیں۔ اس میں رواداری، خلوص، محبت اور پریم کے لازوال شہ پارے ہیں۔

(الماری کی جانب بڑھتی ہے۔ ایک شخص ایک مجسمہ اٹھا کر پھینکتا ہے جو اس کی پنڈلی میں آکر لگتا ہے اور اس کی پنڈلی ٹوٹ جاتی ہے وہ چیخ کر گر پڑتی ہے۔ دوسرا مجسمہ اس کے سر میں آکر لگتا ہے اور سر سے خون جاری ہوجاتا ہے۔ لوگ اس الماری میں آگ لگا دیتے ہیں۔ ایک بڑا مجسمہ منصور کے سیدھے ہاتھ پر آکر گرتا ہے اس سے اس کی انگلیاں چکنا چور ہوجاتی ہیں۔ کچھ دیر ہنگامہ جاری رہتا ہے پھر پولیس بندوقیں لیے نگارخانہ میں داخل ہوتی ہے اور فسادیوں کو گرفتار کرلیتی ہے)

اندو : (آہستہ آہستہ سر اٹھا کر) دیکھا اس دشمنی کا نتیجہ۔

(پولس والے تمام فسادیوں کو گرفتار کرکے لے جاتے ہیں چند پولس والے اندو اور منصور کے پاس رہ جاتے ہیں۔ اندو اپنی ساڑھی کا ایک حصہ پھاڑ کر جو خون سے بھرا ہوا ہے منصور کی کلائی پر باندھتے ہوئے)۔

اندو : آج رکھشا بندھن ہے نا—

(منصور آہستہ آہستہ سر اٹھانے کی کوشش کرکے اندو کو دیکھتا ہے اس کے سر سے بہتے ہوئے خون کے قطرات اندو کی باندھی ہوئی راکھی پر گرتے ہیں اور اندو کے خون میں جذب ہوجاتے ہیں۔ دونوں راکھی کو اور پھر ایک دوسرے کو مسکرا کر دیکھتے ہیں)۔

(پردہ)

(1946)

رات کی کہانی

افرادِ تمثیل (کردار)

(1) اسلم (2) عمر (دوست) (3) برجیس (ایک نوجوان لڑکی) (4) بھابی (ایک ہمسایہ عورت

ایک کمرہ جس میں سامان تو قیمتی ہے مگر بے ترتیب پڑا ہے۔ دو پلنگ بچھے ہیں جن پر صاف ستھرے بستر ہیں۔ مشرقی جانب دیوار سے لگی ایک میز رکھی ہے جس پر لکھنے پڑھنے کا سامان رکھا ہے مگر کتابیں قلم و دوات پیڈ وغیرہ سب بکھرے پڑے ہیں۔ میز کے نیچے ملے دلے اخباروں کا ڈھیر لگا ہے۔ شمالی جانب ایک کھڑکی ہے جو کھلی ہوئی ہے اور جس میں سے ٹھنڈی ہوا کے جھونکے کمرہ میں داخل ہو رہے ہیں اس کھڑکی کے بالمقابل دیوار کے پاس ایک میز بچھی ہے جس کے پاس ایک کرسی پر اسلم بیٹھا ہے اور میز پر خاموشی سے تاش بچھا رہاہے۔ کمرہ میں بہت سی تصاویر اور اسکیچ لٹکے ہوئے ہیں۔ ایک کونے میں ایک اسٹینڈ پر ایک نامکمل تصویر لٹک رہی ہے۔ اس کے پاس ایک چھوٹی سی میز رکھی ہے جس پر تصویر کشی کا سامان پڑا ہوا ہے۔ اس اسٹینڈ کے پاس دروازہ ہے جو بیرون مکان جانے کا کام

دیتا ہے۔ ایک پلنگ پر عمر لیٹا اخبار دیکھ رہا ہے۔ بھابی کمرہ میں سامان ترتیب دیتی پھر رہی ہے بھابی کی عمر تیس سال کے قریب ہے۔ چہرہ جاذب نظر ہے۔ پلنگ پر بستر برابر کرتے ہوئے۔

بھابی : آخر تم لوگ اس قدر لاپرواہ کیوں ہو۔۔۔ بھئی غضب کے غیر ذمہ دار ہو (ٹھنڈی ہوا کا ایک تیز جھونکا کمرہ میں داخل ہوتا ہے) اس قدر ٹھنڈی ہوا چل رہی ہے اور تم لوگوں کو ذرا پرواہ نہیں۔ (کمبل اٹھا کر اسلم پر پھینکتے ہوئے) لو اسے اوڑھ لو۔ (کمبل سے اسلم کے میز پر بچھے ہوئے تاش بکھر جاتے ہیں۔ اسلم نظریں اٹھا کر بھابی کو دیکھتا ہے۔ بھابی پھر اپنے کام میں مشغول ہو جاتی ہیں)۔

اسلم : مگر بھابی۔۔۔

بھابی : (پلٹ کر اسلم کو دیکھ کر قطع کلام کرتے ہوئے) مگر وگر کچھ نہیں۔ اگر سردی لگ گئی تو جان کے لالے پڑ جائیں گے (اسلم کمبل اوڑھ کر پھر تاش جمانے لگتا ہے۔ بھابی عمر کی جانب جاتے ہوئے) اگر تم لوگوں کو اپنا خیال نہیں تو کم از کم میرا خیال تو کرو اگر بیمار پڑ گئے تو مصیبت آ جائے گی۔ تم لوگوں سے تو اپنا علاج بھی نہیں ہوگا۔ عمر برابر اخبار پڑھتا رہتا ہے اس پر کمبل ڈالتے ہوئے) بھئی خوب ہیں آپ دونوں بزرگ بھی اخبار پڑھا جا رہا ہے اور یہ خبر نہیں کہ اندھیرا ہو گیا ہے۔ روشنی کر لی جائے (پاس لگا ہوا سوئچ دباتی ہے کمرہ میں روشنی ہو جاتی ہے) خدا غارت کرے، اس مال زادی انگریزی کو۔ ایسی باریک لکھی جاتی ہے کہ خدا کی پناہ (کھڑکی کی طرف جاتے ہوئے) ابھی تو اچھی خاصی شکل ہے آنکھوں پر چشمہ رکھ جائے گا تو اچھے خاصے ہونق معلوم ہونے لگو گے (کھڑکی بند کرتی ہے)

عمر : (اخبار پر سے نظریں اٹھا کر بھابی کو دیکھتے ہوئے) مگر بھابی ہم تو۔۔۔

بھابی : (مسکرا کر) عاجز ہیں۔ اب کس چیز سے بیزاری پیدا ہو گئی۔ کھانے پینے سے آپ عاجز ہیں۔ چلنے پھرنے سے آپ عاجز ہیں ہنسنے بولنے سے آپ عاجز

ہیں۔ (ڈرامائی انداز سے) آپ کی زندگی مسلسل بیزاری ہے۔

اسلم : (مسکرا کر تاشوں پر سے نظریں اٹھا کر) اور بھابی (بھابی پلٹ کر اسلم کو دیکھتی ہے) یہ تو آپ سے بھی عاجز ہیں۔

بھابی : وہ تو میں جانتی ہوں (مسکرا کر) اب مجھے ان کی بیزاری کی پرواہ نہیں (مسکرا کر) ذرا الٹی کھوپڑی کے جو ٹھیرے۔

اسلم : اور بھابی— یہ تو—

عمر : ق(قطع کلام کرکے) دیکھو بھابی یہ میرے خلاف مستقل پروپیگنڈا کر رہا ہے۔ یہ بات اچھی نہیں ہے۔

اسلم : اور تم جو میرے خلاف پروپیگنڈا کرتے پھرتے ہو کہ یہ—

بھابی : (مسکرا کر قطع کلام کرکے) بھئی ہم اس جھگڑے سے عاجز ہیں۔

(دونوں مسکرا کر خاموش ہوجاتے ہیں عمر پلنگ پر لیٹتے ہوئے)

عمر : اچھا بھابی— تم ہم دونوں کا اس قدر خیال کیوں رکھتی ہو۔

بھابی : (مسکرا کر) اس لیے کہ آپ زندگی سے عاجز ہیں (اسلم کی طرف اشارہ کرکے) اور یہ حضرت! انھیں پیشنس کھیلنے سے فرصت نہیں ملتی اور اس کے علاوہ آپ کچھ—

اسلم : احمق ہیں۔

(عمر مسکرا دیتا ہے اور بھابی کھلکھلا کر ہنس دیتی ہے۔ بھابی جا کر میز پر کتابیں برابر کرنے لگتی ہے۔ عمر اخبار پڑھنے لگتا ہے اور اسلم میز پر بچھے ہوئے کارڈس برابر کرنے لگتا ہے۔ باہر ہوا کا زور بڑھتا ہوا معلوم ہوتا ہے اور بارش بھی آہستہ آہستہ ہونے لگتی ہے۔ بھابی کھڑکی کے پاس جا کر کھڑکی کھول کر باہر دیکھتی ہے اور پھر کھڑکی بند کردیتی ہے۔ پھر دونوں سے مخاطب ہوکر)

بھابی : آج بہت زور کی بارش ہوگی (کچھ دیر خاموش رہ کر) شاید اولے بھی پڑیں۔ آپ دونوں ذرا احتیاط سے سونا اور دیکھو آج کہیں باہر جانے کی بھی ضرورت

نہیں موسم بہت خراب ہے (دروازہ کی طرف جاتے ہوئے) اب میں جا رہی ہوں (دروازہ کے پاس پہنچ کر پلٹ کر دیکھتی ہے اور اسلم سے) دیکھو تم نے پھر کمبل الگ کر دیا اُسے اوڑھ لو۔ (اسلم بھابی کو دیکھتا ہے اور پھر لاپرواہی سے کمبل اپنے اوپر ڈال لیتا ہے۔ بھابی مسکرا کر کمرہ سے نکل جاتی ہے اور دروازہ بند کر لیتی ہے۔عمر اخبار پر سے نظریں اٹھا کر اسلم کو دیکھتے ہوئے)

: صاحب! ہم اس بھابی سے بڑے عاجز ہیں۔ اچھی گلے پڑی ہے۔ یہ کیوں آتی ہے؟ کیا چاہتی ہے؟ کچھ سمجھ میں نہیں آتا اور ایسے حکم دیتی ہے کہ خدا کی پناہ (بیزاری سے) بالکل عاجز ہیں ہم تو (کچھ سوچتے ہوئے) آخر یہ چاہتی کیا ہے۔ روپیہ پیسہ یہ نہیں لیتی کبھی کوئی تحفہ قبول نہیں کرتی آخر اس کا مقصد کیا ہے— کچھ سمجھ میں نہیں آتا—

اسلم : (مسکرا کر) شاید وہ تم سے عشق کرتی ہے۔

عمر : جی ہاں اس روز ذرا گستاخ نظروں سے دیکھ لیا تھا تو وہ ڈانٹ پڑی تھی کہ آج تک یاد ہے۔

اسلم : (مسکرا کر) اور وہ تھپڑ بھول گئے۔

عمر : تھپڑ بھی یاد ہے۔مگر سوال یہ ہے کہ وہ چاہتی کیا ہے۔

اسلم : وہ چاہتی کیا ہے؟— شاید وہ کچھ نہیں چاہتی۔

(عمر پھر اخبار پڑھنے لگتا ہے اور اسلم تاش پر نظریں جما دیتا ہے ایک زور کا جھونکا آتا ہے جس سے کھڑکی کھل جاتی ہے اور اسلم کی میز پر بچھے ہوئے تاش فرش پر بکھر جاتے ہیں۔ اسلم غصہ سے باقی کارڈز بھی فرش پر پھینک دیتا ہے۔عمر اخبار پر سے نظریں اٹھا کر اسلم کو دیکھتے ہوئے)

عمر : اسلم! ایک غریب لڑکی کے لیے شوہر کی ضرورت ہے۔

اسلم : (مسکرا کر) تو پھر دیر کیا ہے۔ بھیج دو ایک درخواست۔

عمر : (اپنی دھن میں) غریب لڑکی کے لیے۔

اسلم : تو آپ سے کیا کوئی شہزادی شادی کرے گی۔
(مسکرا کر عمر کو دیکھتا ہے اور دوسرے کمرہ میں چلا جاتا ہے)

عمر : غریب لڑکی کے لے (اخبار پلنگ پر پھینک دیتا ہے اور کمرہ میں ٹہلنے لگتا ہے) غریب لڑکی (سگریٹ جلاتا ہے اور سوچتے ہوئے) اگر امیر ہوتی تو؟ (مسکرا کر) اس کے ہزاروں عاشق ہوتے وہ ان کو پرکھتی ان کا امتحان لیتی اور ان میں ہزاروں نقص نکالتی اور — (کچھ دیر خاموش رہ کر) اسلم!

اسلم : (دوسرے کمرہ سے) بولے جاؤ میں سن رہا ہوں۔

عمر : (بیزاری سے) تم تو احمق ہو۔

اسلم : (وہیں سے قہقہہ مار کر) حسد کی ضرورت نہیں میرے حصہ کی کچھ حماقت تم لے سکتے ہو۔ (عمر کمرہ میں ٹہلتا رہتا ہے پھر خود ہی بولتا ہے)

عمر : ہنہ — اس کی معمولی سی مسکراہٹ پر دل و جان تو کیا سونا چاندی نچھاور ہوتا مگر اس غریب لڑکی کی مسکراہٹیں بدن کا لوچ خواہشات تمنائیں اور آرزوئیں بازار میں بیچنے کے لیے رکھ دی گئی ہیں۔ مگر خریدار نہیں ملتے۔
(اسلم دوسرے کمرہ سے ایک پرانا سا اوورکوٹ پہنے ہوئے آتا ہے اور عمر کے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر)

اسلم : عمر! آخر ہماری اس ویران دنیا میں کوئی مونالزا مسکراہٹیں بکھرتی ہوئی کیوں نہیں آتی۔ میں اس طوفانی رات میں جب کہ بارش ہو اور سرد ہوا چل رہی ہو ایک آتشدان چاہتا ہوں جس کی گرمی سے سردی گلابی ہوجائے۔ مجھے دنیا کی کوئی فکر نہ ہو اور میں بیٹھا ہوا —

عمر : پیشنس کھیل رہا ہوں (مسکرا کر) اس پیشنس سے عاجز ہیں ہم۔

اسلم : (اپنی ہی دھن میں دیوار کو تاکتے ہوئے) ہاں پیشنس کھیل رہا ہوں۔ مریم کا تقدس سیتا کی عصمت اور ہیلن کے حسن کا ایک پیکر مونالزا کی مسکراہٹ لیے ایک چائے کی پیالی میرے سامنے رکھ رہا ہو — میں صرف ایک ایسی رات چاہتا ہوں۔

عمر : (مسکرا کر) اور یہاں بھابی کی ڈانٹ ڈپٹ کے علاوہ کچھ نہیں۔

اسلم : اور شاید ہم اس کی یہ ڈانٹ ڈپٹ اس لیے برداشت کر رہے ہیں کہ وہ ایک عورت ہے۔

عمر : (بیزاری سے) مگر میں ان سیتاؤں ساوتریوں اور ہیلنوں سے عاجز ہوں جن کے سینہ میں زلیخا کے دل کی تڑپ ہو۔

اسلم : (عمر کے چہرہ کو غور سے دیکھ کر) تاکہ یوسف کا دامن پیچھے سے نہیں آگے سے پھٹے۔

عمر : (اپنی ہی دھن میں) اسلم! میں نے ایک مریم ایک سیتا۔ ایک ساوتری اور ایک ہیلن سے محبت کی تھی جس کے سینہ میں زلیخا کا دل نہیں پتھر تھا— وہ میری محبت سے دور دور بھاگتی رہی۔ اپنے تقدس اور اپنی عصمت اور اپنے حسن کے غرور میں— محبت کا انجام نفرت ہے میرے دوست (سگریٹ کا کش لے کر خاموشی سے کمرہ میں ٹہلنے لگتا ہے پھر اسلم سے مخاطب ہو کر) مجھے اب ان بھولی بھالی ساوتریوں کے تقدس سے نفرت ہے جو سیتا بننے کے خواب دیکھتی ہیں (قہقہہ مار کر نفرت سے ہنستا ہے پھر غصہ سے) ان کا یونہی سر بازار نیلام ہو اور میں یونہی قہقہے لگاؤں تاکہ ان کی خودداریاں مجروح ہو جائیں اور ان کا غرور آنکھوں سے آنسو بن کر بہہ نکلے۔

(بھابی انگیٹھی میں آگ لیے داخل ہوتی ہے اور مسکرا کر)

بھابی : یہ آنسو کیوں بہائے جا رہے ہیں ایسی کون سی مصیبت آن پڑی ہے۔

اسلم : (مسکرا کر) ہاں— اب یہ سیتاؤں، مریموں اور ساوتریوں سے عاجز آ گئے ہیں۔ (بھابی مسکرا دیتی ہے عمر کی جانب متوجہ ہو کر) میری طرح ٹینس کھیلنا سیکھو میرے دوست سب غم دور ہو جائیں گے۔

عمر : (غصہ سے) یہ کیوں نہیں کہتے کہ جنگل میں جا بیٹھوں۔

اسلم : یہ تو اور بھی اچھا ہے بہت سی جوانیاں تم سے اپنی مرادوں کی بھیک مانگنے آئیں گے (طنزیہ مسکرا کر) عیش ہوں گے دوست عیش۔

(ہنستا ہے بھابی عمر کو غور سے دیکھ کر)

بھابی : یہ دعا کیوں نہیں مانگتے کہ پھر بنگال جیسا کوئی قحط پڑے اور پھر جوانیاں اور مقدس عصمتیں سر بازار نیلام ہوں۔

اسلم : بھابی! کیا تم سمجھتی ہو کہ یہ دور قحط سے کچھ کم ہے اس وقت تو عصمتوں کی قیمت چاول کی ایک مٹھی تھی بھی مگر اب (طنزیہ مسکرا کر) عصمت کی حفاظت کے لیے عصمتیں بکی جاتی ہیں (بھابی، استفسارانہ انداز میں اسلم کو دیکھتی ہے۔ اسلم اخبار اٹھا کر پڑھتا ہے) ایک جوان العمر غریب لڑکی کے لیے رشتہ کی ضرورت ہے (طنزیہ مسکرا کر) یہ عصمت کی حفاظت کے لیے عصمت بیچنا نہیں تو اور کیا ہے؟ (بھابی خاموش ہوجاتی ہے اور کچھ سوچنے لگتی ہے کچھ دیر کمرہ پر سکوت رہتا ہے۔ باہر بارش زور سے ہورہی ہے۔ کچھ دیر بعد ژالہ باری شروع ہوجاتی ہے۔ بھابی کو سردی کا احساس ہوتا ہے اور وہ اپنی ساڑھی اپنے گرد لپیٹ لیتی ہے)

بھابی : سردی زیادہ ہے تم دونوں انگیٹھی کے پاس کیوں نہیں آجاتے (دونوں بھابی کی باتوں پر دھیان نہیں دیتے اپنے ہی خیالات میں کھوئے ہوئے نظر آتے ہیں۔ بھابی دونوں کو دیکھ کر) کیا سوچ رہے ہو؟ (اسلم مڑ کر بھابی کو دیکھتا ہے۔ اس کی نظریں کچھ اجنبی سی معلوم ہوتی ہیں) میں کہتی ہوں تم دونوں انگیٹھی کے پاس آجاؤ۔

(عمر آہستہ آہستہ انگیٹھی کی جانب بڑھتا ہے۔ اسلم بھابی کو سر سے پیر تک دیکھتا ہے جو اس وقت انگیٹھی کے پاس کھڑی ہے۔ روشنی کے علاوہ اس وقت دہکتے ہوئے انگاروں کا عکس اس کے چہرہ پر پڑرہا ہے جس سے اس کا چہرہ زیادہ حسین اور روشن نظر آرہا ہے اور اس کی عمر بھی کم معلوم ہورہی ہے۔ اسلم بھابی کو غور سے دیکھتا ہے۔ بھابی کی نظریں نیچی ہوجاتی ہیں اسلم اپنا منہ دوسری جانب پھیرتے ہوئے۔

اسلم : بارش تیز ہے ژالہ باری بھی ہورہی ہے (کچھ بے چین سا ہوکر) بھابی تم جاؤ

اس طرح تنہا رات کو نہ گھوما کرو (عمر پلٹ کر اسلم کو دیکھتا ہے) بھابی اس رات میں جب طوفان اور سناٹا بھی ہو۔

(بھابی کانپ سی جاتی ہے اور چہرہ پر بے چینی کے آثار پیدا ہوتے ہیں۔ اسلم خاموش ہوکر سگریٹ کے لمبے لمبے کش لگانے لگتا ہے۔ بھابی کچھ سوچ کر انگیٹھی کے پاس بیٹھ جاتی ہے اور اسلم کی طرف دیکھ کر)

بھابی : کیوں چلی جاؤں؟

اسلم : (پھر پلٹ کر بھابی کو دیکھ کر) بھابی ایک ایسی ہی طوفانی رات تھی۔ برجیس مجھ سے محبت کرتی تھی۔

عمر : (چونک کر) برجیس!

اسلم : (اپنی ہی دھن میں) ہاں برجیس۔ اس نے مجھ پر بھروسہ کیا۔ اس طوفانی رات میں (بے چین ہوکر) بھابی تم جاؤ خدا کے لیے جاؤ۔ تم میں ماں کا پیار اور بہن کا خلوص ہے۔ بھابی! برجیس بھی تمہاری طرح مخلص اور غریب تھی۔

بھابی : (ٹھنڈی سانس بھرکر) جانے کتنی برجیس غربت کی قربا نگاہ پر بھینٹ ہوچکی ہیں۔ میں ہمیشہ سے ایسی ہی غریب ہوں جیسی کہ اب۔ بنگال کے قحط میں میرا سب کچھ لٹ گیا۔ میری خواہش ایک اچھی ماں اور ایک اچھی بیوی بننے کی تھی مگر کس کی خواہشیں پوری ہوئی ہیں— میں نے تم سے خلوص پیدا کیا اور آج تم بھی گھر سے نکال رہے ہو۔

(اٹھ کھڑی ہوجاتی ہے اور دروازہ کی جانب جاتی ہے)

: بھابی ٹھیرو۔ بارش تیز اور سرد ہوا ہے۔ کہیں سردی نہ لگ جائے۔ (بھابی مڑ کر دونوں کو دیکھتی ہے۔ آنکھوں میں آنسو آجاتے ہیں اور کمرہ سے نکل جاتی ہے اور دروازہ احتیاط سے بند کردیتی ہے) بھابی! بھابی!! (خاموش ہوجاتا ہے۔ کچھ دیر کمرہ پر کامل سکوت طاری رہتا ہے۔ عمر اسلم کو دیکھ کر افسردہ لہجہ میں) تم نے بھابی کو ناراض کردیا۔ اچھا نہیں کیا وہ خلوص اور محبت کی تلاش میں

یہاں آئی تھی۔ (بالکل کھوئے ہوئے انداز میں انگیٹھی کو گھورتے ہوئے) وہ ماں بن کر محبت، بہن بن کر پیار، اور عورت بن کر حکومت کرنا چاہتی تھی۔ تمہیں اس کے جذبات کا احترام کرنا چاہیے۔

اسلم : جس روز سے برجیس کی عصمت کا محل میرے ہاتھوں مسمار ہوا ہے اس روز سے مجھے خود پر اعتماد نہیں رہا (سگریٹ کا بڑا سا کش لے کر باقی سگریٹ انگیٹھی میں پھینک دیتا ہے اور پھر ٹھنڈی سانس بھر کر) میں زندگی سے بھاگ جانا چاہتا ہوں۔

عمر : اور زندگی سے بھاگ کر کیا کرو گے؟ جس دن سے میں اپنی محبت میں ناکام ہوا ہوں اس دن سے میں نے زندگی کے ہنگاموں میں کھو جانے کا ارادہ کرلیا ہے اس ایک سال کے عرصہ میں میں نے دو شاہکار تصاویر بنائی ہیں۔

(اسلم اس کا کوئی جواب نہیں دیتا۔ دونوں خاموش ہوجاتے ہیں باہر بارش کا زور بڑھتا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ اسلم دوسرا سگریٹ جلا کر پینے لگتا ہے پھر انگیٹھی کو گھورتے ہوئے)

اسلم : عمر! میں نے بھابی کو ناراض کردیا۔ (خاموش ہوجاتا ہے کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد) مجھے بھابی سے معافی مانگنا چاہیے اس کی خفگی میں بھی کس قدر پیار ہوتا ہے۔ شاید وہ اب یہاں کبھی نہیں آئے گی۔ اب وہ مجھے معاف نہیں کرے گی۔

عمر : میں اس کی ایک شاہکار تصویر بناؤں گا اور اس کے نیچے لکھوں گا ''مصور کی بھابی۔''

اسلم : اور میں اس کو امر کرنے کے لیے ایک ڈراما لکھوں گا جس کی وہ ہیروئن ہوگی ایک لافانی کردار (عمر اس کا کوئی جواب نہیں دیتا کچھ خاموش سا بیٹھا رہتا ہے اور پھر اٹھ کر دوسرے کمرہ میں چلا جاتا ہے۔ اسلم اٹھ کر کمرہ میں ٹہلنے لگتا ہے اور کچھ دیر گنگناتا رہتا ہے۔ اخبار اٹھا کر اس کے اوراق الٹ پلٹ کرنے لگتا ہے پھر انگیٹھی کے پاس بیٹھ کر زور سے پڑھتا ہے) ایک جوان العمر لڑکی کے لیے شوہر کی ضرورت ہے۔ (دروازہ کھلتا ہے اور ایک لڑکی دروازہ میں آکر کھڑی ہوجاتی ہے۔ اسلم اس کی آمد سے لاپرواہ سوچتے ہوئے) جانے

کون ہوگی وہ غم نصیب (ٹھنڈی سانس بھرتا ہے)

لڑکی : (آگے بڑھتے ہوئے) وہ غم نصیب لڑکی—

(اسلم چونک کر پلٹ کر دیکھتا ہے اور لڑکی پر نظر ڈال کر)

اسلم : کون برجیس! (اٹھ کھڑا ہو جاتا ہے)

برجیس : ہاں برجیس— وہ غم نصیب جس کا بازار میں نیلام کیا جارہا ہے جس کا کوئی گاہک نہیں جو اشتہار دے کر بیچی جارہی ہے۔

اسلم : مگر برجیس تم؟

برجیس: ہاں ہم لوگ دو مہینے سے سامنے والے مکان میں رہ رہے ہیں۔

اسلم : مگر برجیس—

برجیس : ہاں— میں نے سوچا آج طوفانی رات ہے بارش ہورہی یہ میرا حسن ہے تمھاری جوانی ہے۔ ایک مرتبہ چل کر پھر کیوں نہ دھوکا کھاؤں۔

(طنزیہ مسکراتی ہے اسلم دوسری طرف منہ پھیر لیتا ہے)

اسلم : خدا کے لیے برجیس دل کے پھپھولے نہ پھوڑو۔ میں شرمندہ ہوں۔

برجیس : شرمندہ ہوں! ادھر میری طرف دیکھو کیا میرے ماتھے پر جو کلنک کا ٹیکا ہے اُسے تم دیکھنا بھی پسند نہیں کرتے؟

اسلم : میں اپنا سیاہ چہرہ تمھیں دکھانا نہیں چاہتا۔

برجیس : داغ تو میرے چہرہ پر ہے تم تو دیوتاؤں کی طرح پاک ہو۔

اسلم : برجیس! (ایک دم پلٹ کر برجیس کے دونوں بازو پکڑ کر) برجیس! خدا کے لیے مجھے معاف کردو۔

برجیس : (ایک جھٹکے سے خود کو چھڑا کر) میرے ناپاک جسم سے ہاتھ نہ لگاؤ۔

اسلم : خدا کے لیے مجھے معاف کردو میں شرمندہ ہوں۔

برجیس : شرمندہ ہونے کی ضرورت نہیں ابھی تو بہت سی برجیس ہیں جن کو تم اپنا کھلونا بنا سکتے ہو۔

اسلم : وہ میری بھول تھی برجیس۔ میری غلطی تھی۔ میں نادم ہوں۔

برجیس : نادم! اسلم میں نے تم سے محبت کی تھی اور پھر اپنا سب کچھ تمھارے حوالہ کر دیا اس کا تم نے اچھا بدلہ دیا۔

اسلم : میں اس قدر شرمندہ ہوا برجیس کہ تمھارے سامنے آنے کی ہمت نہ ہوئی۔ میں زندگی سے دور دور بھاگنے لگا— تمھاری معافی کا ایک لفظ مجھے نئی زندگی دے سکتا ہے۔

برجیس : زندگی! زندگی تو اب اور کوئی برجیس بخشے گی وہی جو ابھی تمھارے کمرہ سے گئی تھی۔

اسلم : وہ— وہ— مگر وہ تو بھابی تھی۔

برجیس : بھابی! کون بھابی؟

اسلم : وہ بس بھابی ہے۔ روز ہمارے یہاں آتی ہے ہمارا سب کام کرتی ہے ہمیں ڈانٹتی ڈپٹتی ہے۔ برجیس ہم اس سے بہت ڈرتے ہیں۔ اور عمر تو بے حد ڈرتا ہے۔

برجیس : (سوچتے ہوئے) عمر! کون عمر؟

اسلم : عمر! عمر کو نہیں جانتیں؟ وہ میرا دوست ہے اس نے مجھے اپنے ساتھ اس کمرہ میں رکھ چھوڑا ہے وہ بہت اچھا آدمی ہے بہت ہی اچھا (بلند آواز سے) عمر! ارے عمر—

عمر : (دوسرے کمرہ سے) کیا ہے؟ کیوں شور کر رہے ہو۔

(برجیس غور سے آواز کو سنتی ہے جیسے اُسے پہچاننے کی کوشش کر رہی ہو)

اسلم : ابے ادھر آ دیکھ برجیس آئی ہے (دوسرے کمرہ کے دروازہ کی جانب بڑھتے ہوئے) میں بہت خوش ہوں، ابے دوڑ کر آنا (عمر دوسرے کمرے سے آتا ہے اور اس کی نظر برجیس پر پڑتی ہے دونوں کی نظریں چار ہوتی ہیں۔ دونوں گھبرا جاتے ہیں) دیکھو یہ ہے برجیس۔ یہ پگلی مجھ سے ناراض ہوگئی ہے— ہے نا پگلی— یہ مانتی ہی نہیں کہ میں اپنی غلطی پر نادم ہوں۔ ابھی کہہ رہی تھی کہ بھابی میری زندگی میں ہے بھلا ہم بھابی سے کس قدر ڈرتے ہیں۔ اس کی شخصیت میں تو بہن کا پیار، ماں کی محبت، اور ملکہ کا رعب ہے وہ ہمیں کس

بری طرح ڈانٹتی ہے (مسکرا کر) اچھا اچھا میں خود اسے یہاں بلائے لاتا ہوں۔ وہ مجھ سے ابھی ابھی ناراض بھی ہوگئی تھی۔

(خوشی سے تیز تیز دروازہ کی جانب جاتا ہے)

عمر : اسلم! برساتی اوڑھ لو بارش تیز ہو رہی ہے۔

اسلم : (خوشی سے بھاگتے ہوئے) نہیں۔

(کمرہ سے نکل جاتا ہے۔ کمرہ پر کامل خاموشی طاری ہو جاتی ہے۔ باہر بارش کا زور بڑھتا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ کمرہ میں کافی سردی ہے برجیس سردی سے کانپ رہی ہے۔ کچھ دیر عمر خاموشی سے کمرہ میں ٹہلتا رہتا ہے۔ پھر برجیس سے مخاطب ہو کر)

عمر : سردی زیادہ ہے برجیس انگیٹھی کے پاس آجاؤ (برجیس غیر اختیار طور پر انگیٹھی کے پاس جاتی ہے اور اپنا کمبل جو وہ اوڑھے ہوئے ہے الگ ڈال کر انگیٹھی کے پاس بیٹھ کر اس میں آگ برابر کرنے لگتی ہے) برجیس! (برجیس نظریں اٹھا کر عمر کو دیکھتی ہے جو ٹھنڈی سانس بھر کر خاموش ہو جاتا ہے۔ کچھ دیر خاموش کھڑا رہتا ہے۔ سگریٹ سلگاتا ہے۔ برجیس کو غور سے دیکھتا ہے پھر آہستہ سے) برجیس! (برجیس پھر نظریں اٹھا کر عمر کو دیکھتی ہے ٹھنڈی سانس بھر کر) اسلم تم سے کس قدر محبت کرتا ہے۔

برجیس: اسلم! (تلخ لہجہ میں) مجھے اسلم سے محبت تھی مگر اب نفرت ہے۔

عمر : (تعجب سے) نفرت! برجیس!! تم —

برجیس : ہاں نفرت!

عمر : مگر وہ اس قدر معصوم ہے کہ کوئی بھی اس سے نفرت نہیں کرسکتا۔

برجیس : مگر میں کرتی ہوں (خاموش ہو جاتی ہے۔ کچھ دیر پھر خاموش رہتی ہے۔ برجیس نظریں اٹھا کر عمر کو دیکھتی ہے جو خاموش کھڑا سگریٹ پی رہا ہے) عمر! میں اُس سے بے پناہ محبت کرتی تھی یہاں تک کہ میں نے اپنی عصمت کو اس کی عزت سمجھ کر اس کے حوالے کردی مگر وہ — جس چیز کی اسے خواہش تھی

مل گئی تو مجھے چھوڑ کر چلا آیا۔

عمر : مگر وہ کیوں آیا کبھی تم نے اس پر غور نہیں کیا وہ خود سے شرمندہ ہے۔

برجیس : مجھے اس پر غور کرنے کی ضرورت نہیں۔ (پھر خاموش ہو جاتی ہے اور انگیٹھی میں انگارے برابر کرنے لگتی ہے۔ پھر آہستہ آہستہ نظریں اٹھا کر) عمر تم مجھ سے کس قدر محبت کرتے تھے۔ تم مالدار تھے، خوش اخلاق تھے، حسین بھی تھے مگر میں نے اسلم کو پسند کیا اس سے محبت کی جس کے نتیجہ میں (طنزیہ مسکرا کر) آج میرا کوئی خریدار نہیں۔ مجھے بیچنے کے لیے اخباروں میں اشتہارات شائع کیے جا رہے ہیں (طنزیہ ہنستی ہے) بلیک مارکٹ کیا جا رہا ہے۔ دنیا میں ہر جگہ زندگی کے ہر شعبہ میں چور بازاری ہے (طنزیہ مسکرا کر) میرا عیب چھپانے کے لیے میرے اوپر غربت کا لیبل لگایا جا رہا ہے، کہ کوئی خریدار مل جائے۔

عمر : مگر اسلم تم سے اب بھی محبت کرتا ہے وہ اپنے کیے پر پشیمان ہے۔

برجیس : میں بھی اپنے کیے پر پشیمان ہوں مجھے اس سے نفرت ہے۔

عمر : لیکن وہ اس قدر شرمندہ ہے کہ زندگی سے بیزار ہو گیا ہے۔

برجیس : مجھے اس کی خوشی ہے اگر وہ مر جائے تو میں قہقہے لگاؤں۔

عمر : وہ کس قدر لاوبالی ہے یہ تو تم جانتی ہو اسلم ایک سیدھا سادہ بچہ ہے۔

برجیس : (برہم ہو کر) خوب بچہ ہے— میرے سامنے نام نہ لو اس کا۔

عمر : اس کا نام، اس کی شہرت، اس کی عزت، سب کچھ تباہ ہو چکی ہے۔ اس نے دو سال میں صرف ایک ڈراما لکھا ہے اس کے شعروں میں حزن و ملال کے علاوہ اب کچھ نہیں۔ تمھاری ادنیٰ سی مسکراہٹ، ذرا سی قربانی اس کو تباہی سے بچا سکتی ہے وہ پاگل سا ہو گیا ہے برجیس خدا کے لیے اب اُسے بچاؤ اس کی ذرا سی غلطی کی اتنی بڑی سزا نہ دو۔

برجیس : تم اتنے بڑے جرم کو ذرا سی غلطی کہتے ہو۔

عمر : جرم! تو پھر مجرم کون ہے؟ تم یا وہ (خاموش ہو جاتا ہے اور کمرہ میں ٹہلنے لگتا

ہے۔ پھر برجیس کے پاس آکر ٹھنڈی سانس بھر کر) ہاں برجیس محبت کرنا جرم ہے اور اپنے کیے پر پشیمان ہونا اس سے بڑا جرم۔

برجیس : لیکن—

عمر : (اپنی ہی دھن میں) میں نے تم سے محبت کی خدا سے بڑھ کر تم کو چاہا مگر تم مجھ سے بیزار رہیں۔ خیر تم نے مجھ سے نفرت کی۔ ٹھیک کیا۔ اسلم نے تم سے محبت کی اس کی سزا تم یہ دے رہی ہو کہ تم کو اس سے نفرت ہوگئی ہے اور مجھ سے اس جرم کی سزا یہ ملی ہے کہ— (ٹھنڈی سانس بھر کر) مجھ سے ایسی عورتوں سے نفرت ہوگئی ہے جن کے سینوں میں دل نہیں پتھر ہیں۔

برجیس : اور میں ایسے مردوں سے نفرت کرنے لگی ہوں جن کے سینوں میں پتھر تڑپتے مچلتے دل ہیں اور ان دلوں میں جذبات ہیں (اٹھ کر کھڑی ہو کر) میں جا رہی ہوں (کمبل اوڑھ کر دروازہ کی جانب بڑھتی ہے عمر راستہ روک کر)

عمر : برجیس کہاں چلیں خدا را ذرا سوچو تمھارا نیلام کیا جا رہا ہے۔ جانے کس کے پلو باندھ دی جاؤ گی اور تمھاری زندگی ہمیشہ کے لیے تلخ ہو جائے گی۔

برجیس : (آگے بڑھتے ہوئے) وہ مجھے منظور ہے— (پھر رک کر) اچھا تم مجھے معاف کرسکتے ہو— میرے جرم کو۔

عمر : مگر برجیس تم بے قصور ہو۔

برجیس : (طنزیہ قہقہہ مار کر) ایسی طوفانی رات میں جب کہ تنہائی بھی ہے تم بھی اسلم بن جانا چاہتے ہو (غصہ سے) مجھے آج تک کسی مرد نے معاف نہیں کیا حتیٰ کہ میرا باپ اور بھائی بھی مجھے مجرم قرار دیتے ہیں اور تم—

عمر : مگر تمام مرد ایک جیسے نہیں ہوتے۔

برجیس : تمام مرد ایک جیسے ہوتے ہیں اور سب جذبات میں بہہ کر ایک جیسی غلطی کرتے ہیں۔

عمر : (برجیس کا راستہ چھوڑ کر انگیٹھی کے پاس آکر) میں تمھاری ایک ایسی تصویر

بنانا چاہتا ہوں جو دنیا کا شاہ کار ہو۔ جس پر مونا لزا کی مسکراہٹ قربان ہوجائے جس پر مریم کی معصوم تصویریں شرما جائیں اور جس پر—

برجیس : (انگیٹھی کی طرف بڑھتے ہوئے) مگر عمر—

عمر : جس وقت میں نے تمھیں پہلی بار دیکھا تھا تو ایک ایسی زندگی کا نقشہ نظروں کے سامنے کھنچ گیا تھا جو حسن و شباب اور نور و نکہت سے معمور تھا۔

برجیس : تم مرد— جہاں کوئی حسین عورت دیکھی اور خیالی دنیا آباد کرنے لگے۔ اگر میں تمھیں قبول کرلوں تو مجھے کیا ملے گا۔ ایک ایسا مرد جس نے زندگی کو اس کے اصل روپ میں کبھی نہیں دیکھا۔

عمر : مگر برجیس ذرا سوچو تو۔

برجیس : جس کی زندگی تباہ ہوچکی ہے وہ کچھ سوچنا نہیں چاہتی— (پلٹ کر تیز تیز قدموں سے دروازہ کی جانب جاتے ہوئے) میں جارہی ہوں۔

عمر : (برہم ہوکر) ٹھیر جاؤ! (برجیس ایک دم رک جاتی ہے) تم یہ سمجھتی ہو کہ اس طرح دو زندگیاں تباہ کرکے جاسکتی ہو۔ (برجیس پلٹ کر عمر کو دیکھتی ہے اور کانپ سی جاتی ہے آنکھوں میں خوف جھلکنے لگتا ہے۔ عمر تیز قدموں سے برجیس کے پاس جاکر اس کے دونوں بازو پکڑ کر ہلاتے ہوئے) اگر تم جانا ہی چاہتی ہو تو دو دلوں کا انجام اپنی آنکھوں سے دیکھتی جاؤ (برجیس کو چھوڑ کر میز کے پاس جاتا ہے اور دراز میں سے کاغذوں کا ایک پلندہ نکال کر انگیٹھی میں ڈالتے ہوئے) یہ دیکھو اسلم کا دل جل رہا ہے۔ اس کا آخری ڈراما جس پر اس نے دو سال محنت کی ہے اور جس کو وہ تمھارے نام معنون کرنا چاہتا تھا وہ تمھیں امر کررہا تھا مگر تم مررہی ہو (پاگلوں کی طرح قہقہے مار کر ہنستا ہے۔ کمرہ میں لٹکے ہوئے اسکیچوں اور تصاویر کو نوچ کر انگیٹھی میں ڈالتے ہوئے) اور یہ عمر جل رہا ہے دیکھو لو شاید تمھارے جذبہ انتقام کی تسکین ہوسکے۔

(اور تصاویر نوچتا ہے برجیس اسے پکڑ کر)

برجیس : آخر تم چاہتے کیا ہو عمر۔

عمر : میں کیا چاہتا ہوں۔ میں برباد ہو جانا چاہتا ہوں۔

برجیس : (اس کے ہاتھ سے تصاویر چھین کر) خدا کے لیے ان کو نہ جلاؤ۔

عمر : (برجیس کے ہاتھ سے تصاویر چھین کر انگیٹھی میں پھینکتے ہوئے) نکل جاؤ برجیس نکل جاؤ (ہاتھ پکڑ کر گھسیٹ کر دروازہ کے پاس لے جا کر) نکل جاؤ اب تمھاری یہاں ضرورت نہیں۔

برجیس : مگر سنو تو عمر! (عمر اس کا ہاتھ پکڑ کر دروازہ سے باہر نکال دیتا ہے اور دروازہ بند کر لیتا ہے برجیس دروازہ کھٹکھٹاتی ہے) لیکن سنو تو عمر۔ دروازہ کھولو۔ کیا پاگل پن ہے تم دونوں مجھ سے محبت کرتے ہو۔ اس کا انجام کیا ہوگا۔

عمر : (غصہ سے) انجام تو جو ہونا تھا وہ ہو چکا (کمرہ میں ٹہلتے ہوئے) تمھارا اشتہار دیا جا چکا ہے۔ اب تمھیں بہت سے عمر اور اسلم مل جائیں گے (طنزیہ) پرانے مال کی بھی نیلام میں اچھی قیمت مل جاتی ہے۔ (قہقہے لگا کر ہنستا ہے۔ برجیس کچھ دیر دروازہ کو کھٹکھٹاتی ہے اور ہچکیوں کی آواز آتی رہتی ہے عمر کمرہ میں ٹہلتا رہتا ہے۔ باہر برجیس کے قدموں کی آواز آتی ہے اور ہچکیاں رک جاتی ہیں۔ عمر دروازہ کھول کر دیکھتا ہے۔ برجیس جا چکی ہے آہستہ آہستہ چل کر انگیٹھی کے پاس آتا ہے باقی تصویروں اور اسکیچوں کو اُتار کر انگیٹھی کے پاس بیٹھ کر جلانے لگتا ہے۔ اسلم بھاگتا ہوا کمرہ میں داخل ہوتا ہے۔ اس کے پیچھے پیچھے بھابی داخل ہوتی ہے)۔

اسلم : (کمرہ میں چاروں طرف دیکھ کر) برجیس!۔۔۔ (عمر کو دیکھ کر جو خاموشی سے تصویریں جلا رہا ہے) برجیس کہاں ہے؟

عمر : (تصویروں کو جلاتے ہوئے انگیٹھی میں جلتی ہوئی تصویریں دیکھ کر ٹھنڈی سانس بھر کر) اسلم! برجیس مر گئی۔

اسلم : (بلند آواز سے) عمر!

8 A

عمر : (اسی طرح سنجیدگی سے) ہاں اسلم مر گئی (ڈراما کے آدھے جلے ہوئے اوراق دکھلا کر) یہ دیکھو اسلم تمھارا دل جل رہا ہے۔ تم اسے اس ڈرامے سے امر کردینا چاہتے تھے (طنزیہ ہنستا ہے) مگر وہ مر رہی ہے۔

(مسودہ کو پھر انگیٹھی میں پھینک دیتا ہے اور تصویریں اور اسکیچ پھاڑ پھاڑ کر انگیٹھی میں ڈالنے لگتا ہے۔ اسلم دوڑ کر جلا ہوا مسودہ انگیٹھی میں سے اٹھا کر افسردہ لہجہ میں)

اسلم : یہ کیا کیا تم نے عمر؟

عمر : (مسودہ اس کے ہاتھوں سے چھین کر پھر انگیٹھی میں ڈالتے ہوئے) میں نے اچھا ہی کیا اسلم۔ اس کو جل جانے دو۔ (انگیٹھی کی طرف اشارہ کرکے) یہ دیکھو۔ میرا دل تمھارے دل سے زیادہ تیزی سے جل رہا ہے — وہ چلی گئی اور اب کبھی نہیں آئے گی۔

اسلم : لیکن وہ گئی کہاں؟

عمر : مجھے نہیں معلوم۔

اسلم : لیکن کیوں گئی؟

عمر : میں نے اسے نکال دیا۔

اسلم : (تعجب سے) تم نے!

عمر : ہاں میں نے — ہم دونوں ایک ہی لڑکی سے محبت کرتے تھے اور وہ —

اسلم : تم محبت کرتے تھے؟

عمر : (ٹھنڈی سانس بھر کر) ہاں میں بھی محبت کرتا تھا۔

اسلم : مگر عمر میں اب اُس کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا۔

عمر : (اٹھ کر کھڑے ہوتے ہوئے) اور میں بھی اس کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا — مگر وہ دونوں ہم دونوں سے نفرت کرتی تھی (کمرہ میں ٹہلتے ہوئے) تم اس کی نظروں میں بے وفا تھے اور میں (طنزیہ مسکرا کر) خیالی دنیا آباد کرنے والا صرف جس کو وہ قبول نہیں کرسکتی تھی۔ وہ مرد کی صورت سے بھاگنے لگی تھی وہ مردوں

سے نفرت کرتی تھی (آہستہ آہستہ میز کے پاس جاتا ہے اور تاشوں کی گڈی اٹھا کر اسلم کی طرف پھینکتے ہوئے) لو دوست پیشنس کھیلو سب غم دور ہو جائیں گے۔

اسلم : تم نے اس کو نکال دیا برا کیا — میں اس کو منا لوں گا۔ (باہر بارش کا زور بڑھتا ہوا معلوم ہوتا ہے) جانے بیچاری کہاں گئی (بجلی زور سے چمکتی ہے اور بادل گرجتا ہے) مگر نہیں (تیز تیز قدموں سے دروازہ کی طرف جاتے ہوئے) میں اسے ڈھونڈ لاؤں گا۔

بھابی : (راستہ روک کر) کہاں جارہے ہو بہت تیز بارش ہے (بھاگتا ہوا دروازے سے نکل جاتا ہے سڑک پر اس کے دوڑنے کی آواز آتی رہتی ہے۔ عمر کھڑکی کھول کر باہر دیکھتا ہے بارش زور شور سے ہو رہی ہے۔ سڑک تاریک ہے۔ بجلی چمکتی ہے اور اسلم کی آواز برجیس برجیس پکارتی ہوئی سنائی دیتی ہے پھر بجلی چمکتی ہے عمر کھڑکی بند کر کے ٹھنڈی سانس بھر کر)

عمر : بھابی — دور دو سائے حرکت کر رہے ہیں۔ (کچھ دیر کمرہ میں خاموشی سے ٹہلتا رہتا ہے پھر بھابی سے مخاطب ہو کر) بھابی تم بھی جاؤ۔

بھابی : نہیں — تمہیں اس وقت ایک عورت کی ضرورت ہے۔

عمر : (ٹھنڈی سانس بھر کر) نہیں بھابی — تم چلی جاؤ۔

بھابی : اب میں جانے کے لیے نہیں آئی ہوں۔

عمر : مگر بھابی —

بھابی : (عمر کی نظروں میں نظریں ڈال کر) ہاں۔

(انگیٹھی کی طرف بڑھتی ہے عمر اس کے دونوں بازو مضبوطی سے پکڑ کر)

عمر : بھابی —

(بھابی بالکل بے جان ہو کر خود کو عمر کی باہوں میں گرا دیتی ہے)

(پردہ)

(1951)

چمگادڑیں

افراد تمثیل (ممبران کلب)

(1) جعفر (2) سکینہ (3) گوپال (4) پروفیسر گپتا (6) کامریڈ سکینہ (7) مالتی (8) فیاض (9) مسز گپتا (10) شاہد (11) شکیل

ایک شاندار کلب کا بار۔ جعفر ایک میز کے سامنے بیٹھا شراب پی رہا ہے۔ سامنے میز پر ایک شراب کی بوتل اور دو گلاس رکھے ہیں۔ بوتل میں شراب آدھی رہ گئی ہے۔ گلاس دونوں خالی ہیں۔ جعفر ایک گلاس سے کھیل رہا ہے۔ سکینہ ٹینس کا ریکٹ گھماتی ہوئی پاس سے گزرتی ہے۔ جعفر سکینہ کو دیکھ کر۔

جعفر : ہلو مس سکینہ۔

سکینہ : (رُک کر جعفر کو دیکھ کر) او ہو مسٹر جعفر۔ بھئی عید کا چاند ہو گئے آپ تو۔

(جعفر اٹھ کر مصافحہ کرتا ہے۔ سکینہ پاس کی کرسی پر بیٹھتے ہوئے)۔

ارے صاحب کہاں غائب رہے اتنے روز — واللہ خوب ہیں آپ جو غائب

ہوتے ہیں تو رسید تک ندارد— ہمیں تو آپ کے سورگ باشی ہونے کا یقین ہوگیا تھا اور انا للہ پڑھ کر دل کو تسکین بھی دے لی تھی۔

جعفر : کیا بتلاؤں صاحب— ابا جان کے بزنس نے جان ضیق میں کر رکھی ہے۔ بمبئی، مدراس، کلکتہ جانے کہاں کہاں مارا مارا پھرتا رہا۔

سکینہ : (مسکرا کر) پھر تو خوب ہاتھ مارا ہوگا۔
(چہرہ پر گری ہوئی لٹ برابر کرتی ہے)

جعفر : کیا خاک ہاتھ مارا— بڑے میاں اس معاملہ میں بڑے گھاگ ہیں کوڑی کوڑی کا حساب لے لیا ہے کہیے مزاج تو اچھے ہیں۔

سکینہ : مزاج! عیش سے گزر رہی ہے۔

جعفر : سنا ہے (مسکرا کر) آپ کے ابا جان نے کسی احمق کو پھانسا ہے۔ بہت جلد آپ اس کی دھرم پتنی ہونے والی ہیں۔

سکینہ : کیا بتاؤں عجیب احمق سے پالا پڑا ہے۔ صاحب ایسا بے غیرت تو میں نے ساری عمر میں نہیں دیکھا۔ ہزار بار دھتکارا مگر ٹلنے کا نام نہیں لیتا۔ مہمانوں کے کمرہ پر قبضہ جما رکھا ہے۔

جعفر : (قہقہہ مار کر) اچھا— کیا پی جیے گا۔ (بلند آواز سے) بوائے۔

سکینہ : نو نو— تھینکس— اس وقت نہیں۔

جعفر : یہ زاہد خشک کب سے ہوگئیں۔ بلاوجہ تکلف نہ کیجیے گا۔

سکینہ : جی نہیں تکلف نہیں۔ (اٹھ کر) اچھا اجازت دیجیے (ایک ادھیڑ عمر کے مرد کو تنہا بیٹھا دیکھ کر) پروفیسر گپتا کس مشغولیت سے پی رہے ہیں۔

جعفر : (پلٹ کر گپتا کو دیکھ کر) آج کل مسز گپتا کا کیا حال ہے؟

سکینہ : آجکل دونوں میں اَن بن ہے۔ ایک دوسرے سے بیزار ہیں۔ وہ پنگ پانگ روم میں شاہد کے ساتھ قہقہے لگا رہی ہیں اور یہ اپنے غموں کو وہسکی میں غرق کر رہے ہیں۔ (بلند آواز سے) ہلو پروفیسر ہاؤ آر یو۔

گپتا : (پلٹ کر سکینہ کو دیکھ کر) ہاؤ آر یو مس سکینہ۔ کیسے میچ کا کیا رزلٹ رہا؟

سکینہ : سکس نات — سکس نات پر دھو دیا اور کیا۔

گپتا : مس وائکس تو بڑی برہم ہوں گی۔

سکینہ : منہ اتر گیا۔ بے چاری کا۔

(ایک نوجوان داخل ہوتا ہے گپتا نوجوان کو دیکھ کر)

گپتا : ہلو مائی ڈیر! سرخ چین کی کیا خبریں ہیں؟

نوجوان : سب ٹھیک ٹھاک ہیں — آپ سرخ چین کی فکر نہ کیجیے — اپنے سر کی خیر منائیے۔

گپتا : میرا سر! (قہقہہ مار کر) ارے بھئی یہ تو پہلے ہی گنجا ہے۔

(بار میں ایک زوردار قہقہہ پڑتا ہے۔ نوجوان مسکراتا ہوا گزر جاتا ہے۔

سکینہ : بھئی یہ کامریڈ سکینہ بھی خوب ہے۔ ہر طرف سے آوازے کسے جاتے ہیں مگر اپنی دھن کا پکا ہے نہ کلب آنا چھوڑتا ہے اور نہ سیاسی عقائد میں فرق پڑتا ہے۔

جعفر : نرا احمق ہے احمق — کہیے کدھر چل دیں۔

سکینہ : ذرا بال روم میں جارہی ہوں — اچھا۔

(جانے کے لیے مڑتی ہے گوپال داخل ہوتا ہے اور سکینہ کی طرف بڑھتے ہوئے)

گوپال : ہلو مس سکینہ۔

سکینہ : ہلو مسٹر گوپال۔

(مصافحہ کرتی ہے)

گوپال : مس سکینہ کمال کر دیا آج تو۔ اسٹریٹ سیٹ لیا۔ مس وائکس کے چہرہ پر تو ہوائیاں اڑنے لگی تھیں — مگر صاحب آپ نے ان کے بیک ہینڈ سے خوب فائدہ اٹھایا۔

سکینہ : بیک ہینڈ سے فائدہ نہ اُٹھاتی تو کیا کرتی؟ اور ان کے بیرسٹر صاحب کا بھی تو

منہ لٹک گیا تھا۔

(گوپال قہقہہ لگاتا ہے)

گوپال : ارے بھئی جعفر کیا کر رہے ہو ذرا چل کر دیکھو تو بڑا زوردار برج ہو رہا ہے مسٹر شاہد اور مسز گپتا بڑے زوروں پر ہیں۔

جعفر : اچھا۔

گوپال : رضیہ اور مصرا نے انھیں دس روپے پائنٹ پر چیلنج کیا تھا۔

جعفر : اچھا یہ مصرا صاحب کب سے فضول خرچی کرنے لگے۔

گوپال : جب سے رضیہ سے دوستی ہوئی ہے۔ ابھی تھری نو ٹرمپ پر فور ڈاؤن ہو چکے ہیں۔ بڑا لطف آرہا ہے — چلو تو۔

جعفر : اماں بیٹھو تو چلتے ہیں۔

(گوپال کرسی پر بیٹھ جاتا ہے سکینہ جاتے ہوئے)

سکینہ : اچھا خدا حافظ مسٹر جعفر۔

جعفر : خدا حافظ۔

(سکینہ چلی جاتی ہے)

جعفر : ہاں کہو گوپال — کیا حال چال ہیں؟ کوئی نیا شکار؟

گوپال : نئے شکار کی بات چیت تو بعد میں ہوگی۔ حضرت یہ بتاؤ ہوا مس سکینہ سے کوئی اپائنٹمنٹ۔

جعفر : نہیں تو — وہ تو یونہی اِدھر اُدھر کی باتیں ہو رہی تھیں۔

گوپال : کیوں بناتے ہو — من خوب می شناسم پیران پارسارا۔ (سگریٹ کیس بڑھا کر) لو پیو گے۔

جعفر : کیوں نہیں (سگریٹ لیتے ہوئے) کہو کیا پیو گے؟

گوپال : پینے پلانے کے معاملہ میں ہم بہت فراخ دل ہیں۔ ٹھرا بھی مل جائے تو انکار نہیں۔

جعفر : (بلند آواز سے) بوائے وہسکی (گوپال سے مخاطب ہوکر) ہاں اب سنایئے نئے شکار کا حال— یار خدا کی قسم اس مہینے میں تو ترس گیا۔

گوپال : پھر وہی بے پر کی— یہ کیوں نہیں کہتے کہ گھاٹ گھاٹ کا پانی پیا ملکوں ملکوں میں دانا چگا۔

جعفر : کہیں ایک دن بھی قیام کیا ہو— پاؤں پر سنیچر سوار تھا— کہو ہے کوئی کبوتری—؟

(ملازم وہسکی کی ایک بوتل میز پر رکھ کر چلا جاتا ہے)

گوپال : کبوتری وبوتری تو نہیں— ایک چگادڑ ضرور ہے۔

جعفر : (شراب کا گلاس گوپال کو دیتے ہوئے) بھئی یہ چگادڑ کیا ہوتی ہے۔

گوپال : (مسکرا کر) چگادڑ، ایک پرندہ ہوتا ہے جو دن بھر الٹا لٹکا رہتا ہے اور رات کو دانے پانی کی تلاش میں نکلتا ہے۔

جعفر : کیا بہکی بہکی باتیں کررہے ہو۔

گوپال : (شراب کا گھونٹ لیتے ہوئے) بنام چگادڑ۔ (مسکرا کر) تم جانتے ہو میں بہکی بہکی باتیں تو کرتا نہیں۔ ہاں صاحب! تو چگادڑ کی عمر کوئی بیس سال کے قریب ہے گداز جسم ہے بڑی بڑی آنکھیں ہیں پتلی سی کمر ہے گندمی رنگ ہے دائیں گال پر ایک تل ہے آواز دلکش ہے گانا جانتی ہے رقص سے بھی دلچسپی ہے مگر صرف ملکتی ہے ایک عدد شوہر کی مالک ہے اور سب سے بڑی بات یہ کہ سستا نسخہ ہے۔

جعفر : (مسکرا کر) بھئی تو نے تو ایک سانس میں سب کچھ بتلا دیا۔ بالکل کسی تھرڈ کلاس ہوٹل کے ملازم کی طرح جس سے اگر دھوکے سے پوچھ بیٹھو کہ کیا پکا ہے؟ تو وہ ایک ہی سانس میں بریانی، قورمہ، کوفتہ، چھوٹا گوشت، بڑا گوشت، پائے، سری کردہ، بھیجا الم غلم سب کچھ کہہ ڈالتا ہے۔ ہاں تو یہ سستا نسخہ کیسے ہے؟

گوپال : یعنی صرف پچیس روپے۔

جعفر : (تعجب سے) صرف پچیس روپے۔

گوپال : جی ہاں — کہیے آپ کو کوئی اعتراض ہے؟

جعفر : ہرگز نہیں — اور اس کا شوہر نامدار۔

گوپال : اس نے چمگادڑ کو قطعی معاشی آزادی دے رکھی ہے۔ وہ تو خود اس کے لیے کام فراہم کرتا ہے۔ جانتے ہو مسٹر جعفر آج کل مہنگائی کا زمانہ ہے ایک ہی آدمی کی کمائی پر زندگی نہیں گزر سکتی۔

جعفر : خیر یہ بکواس بند کرو۔

گوپال : آہا تو گویا یہ بکواس ہے۔ خیر وہ تو چھوٹی چمگادڑ ہے مگر یہ بڑی بڑی چمگادڑیں جو آپ کے کلب کی ممبر ہیں۔ مس سکینہ۔ مس شیلا۔ مس وانک۔ مس ہرمزجی وغیرہ۔

جعفر : اچھا تو یہ بتاؤ اس کا نام کیا ہے؟

گوپال : نام تو مس چمگادڑ ہی سمجھو۔ ویسے موقع اور وقت کے لحاظ سے تبدیل ہوتا رہتا ہے۔ اگر تمہارے پاس اڑ کر آئے گی تو اس کا نام فریدہ۔ نجمہ، ناہید، سلمٰی، اور شمسہ ہوگا۔ اگر میرے کاندھے پر بیٹھی تو اس کا نام سرسوتی، شکنتلا، موہنی اور لاجونتی، ہوگا اور اگر جانسن سے آنکھیں لڑائے گی تو پھر آیرین، پمیلا، ایلن اور الزبتھ ہوگا (کامریڈ سکینہ پاس سے گزرتا ہے) ہلو کامریڈ۔

سکینہ : ہلو گوپال

گوپال : آؤ بیٹھو — کیا پیو گے پلاؤ گے نہیں۔

سکینہ : نہیں بھئی۔ یہ شربت میرے بس کا نہیں۔

گوپال : اماں بیٹھنے میں کیا ہرج ہے (سکینہ ایک کرسی گھسیٹ کر بیٹھ جاتا ہے) کہو کیسے آئے تھے۔

سکینہ : ذرا کلب کی لائبریری میں آیا تھا۔

گوپال : کیوں خیریت تو ہے۔

سکینہ : ایک کتاب کی تلاش تھی، مگر آپ کی لائبریری کیا ہے اچھا خاصا ردی خانہ ہے ایک کتاب ڈھنگ کی نہیں۔ عجیب واہیات کتابوں کا ڈھیر ہے۔ نیوڈس آف

آل نیشنز کے ڈھیر اور ان پر معلومات کے ذخیرے۔ کہیں مذہبی کتابوں کے انبار اور کہیں جنسیات پر فرائڈ کے نظریات۔

گپتا : (اپنی جگہ سے اٹھ کر ان لوگوں کی طرف آتے ہوئے) یہ کارل مارکس کا کیپٹیل ہے اور نہ لینن کے خطبات۔ کیوں کامریڈ۔

(پاس ہی ایک کرسی پر بیٹھ جاتا ہے)

سکینہ : فیشن کے طور پر یہ کتابیں بھی ہیں مگر ممبران کے ذوق سلیم کی داد دینا پڑتی ہے کہ آج تک ان کے ورق تک نہیں کٹے۔

جعفر : (سگریٹ کا کش لے کر) مانو کامریڈ! کیا کوئی ریسرچ کر رہے ہو؟

سکینہ : نہیں— ریسرچ تو نہیں۔ میں اپنے ملک میں عورتوں کے معاشی مسائل پر ایک مضمون لکھنے والا ہوں اس کے لیے کچھ مواد کی ضرورت ہے۔

گوپال : (شراب کا پیالہ میز پر رکھ کر) اہا ہا وہ مارا— دیکھو مائی ڈیر جعفر میں کہتا ہوں صاحب ہمارے یہ کامریڈ بڑے دور کی کوڑی لاتے ہیں— ابھی ہم اسی پر گفتگو کر رہے تھے اور صاحب آج کل تو یہ ہمارے یہاں کی problem ہے۔ کیونکہ پروفیسر گپتا (گپتا شراب کے نشہ میں گردن ہلاتا ہے) کامریڈ میرا تو عقیدہ ہے کہ عورتوں کو قطعی معاشی آزادی حاصل ہونا چاہیے اس سے ہمارے بہت سے مسائل حل ہو جائیں گے۔ Burning problem

جعفر : اوہ ہو اوہ ہو— پھر سنجیدہ گفتگو شروع ہوگئی۔ صاحب یہ کلب کا بار ہے اسمبلی ہال نہیں۔

گپتا : ڈونٹ بی ایڈیٹ مائی ڈیر جعفر— ہمیں اس مسئلے کو سنجیدگی سے حل کرنا ہے۔

جعفر : میں قطعی سنجیدگی کے لیے تیار نہیں۔ یہ بات بالکل ایسی ہی ہے جیسے ہماری جیب میں پیسے نہ ہوں اور ہمیں شراب کی ضرورت ہو۔

سکینہ : بالکل ٹھیک جعفر۔ ہمیں یہ سوچنا ہے کہ ہماری جیب میں پیسے کیسے آئیں۔

گپتا : میں عورتوں کی معاشی آزادی کا کئی سبب سے مخالف ہوں۔

جعفر : (لقمہ دیتے ہوئے) اول یہ کہ ہمیں عورتیں مہنگے داموں پر ملیں گی۔

گپتا : کیا بدتمیزی ہے مائی ڈیر۔ کبھی سنجیدہ ہونا جانتے ہی نہیں۔

جعفر : بھئی اس سنجیدگی سے ہم تو بور ہو گئے (اٹھ کر کھڑے ہوتے ہوئے) چل دیے۔ کم آن گوپال۔ دیکھیں برج کا کیا حال ہے۔

گوپال : اماں بیٹھو تو۔

جعفر : چھوڑو— سنجیدہ مسائل میں الجھ کر بلا وجہ کون وقت ضائع کرے۔

(شاہد اور مسز گپتا قہقہے لگاتے ہوئے داخل ہوتے ہیں)

مسز گپتا : ہلو کامریڈ— ارے بھئی کہاں رہتے ہو تمھیں دیکھنے کو تو آنکھیں ترس گئیں تم سے تو کئی اہم پرابلمز پر گفتگو کرنا ہے۔

سکینہ : (مسکرا کر) ڈاکٹر گپتا— جس وقت آپ فرمائیں میں حاضر ہو جاؤں۔ بھلا ایسی کون سی پرابلمز ہیں جن پر آپ کو میری رائے کی ضرورت ہے۔

مسز گپتا : کئی پرابلمز ہیں۔ میں ان کے متعلق آپ کے نظریات معلوم کرنا چاہتی ہوں۔

سکینہ : لیکن نظریات کو سمجھ لینے سے کیا فائدہ اگر ان پر عمل نہ کیا جائے۔

مسز گپتا : نظریات کے تو صرف ہوائی قلعے ہی اچھے معلوم ہوتے ہیں کامریڈ۔ عمل کرنا اپنے بس کا روگ نہیں۔ (زوردار قہقہہ لگاتی ہے اور شاہد کا ہاتھ پکڑ کر) کم آن ڈارلنگ (شاہد اور مسز گپتا ایک میز پر جا کر بیٹھ جاتے ہیں اور شراب پینے لگتے ہیں)

سکینہ : اچھا مجھے اجازت دیجیے۔

گوپال : کیوں کامریڈ ایسی بھی کیا جلدی ہے۔ کیا کوئی اسٹرائک کرانا ہے۔

سکینہ : (مسکرا کر) جی ہاں!

گوپال : خدا خیر کرے— کہاں؟

سکینہ : چکلوں میں۔

جعفر : کیوں خیریت تو ہے؟

سکینہ : جی ہاں — کسی شخص کو اس وقت تک ان عورتوں سے تعلق رکھنے کا حق نہیں جب تک وہ اپنی ایک بہن کو ان کوٹھوں کی زینت نہ بنا دیں۔

(چلا جاتا ہے)

گوپال : لو جعفر — ہوشیار ہو — ہے کوئی بہن۔

جعفر : اماں بالکل کریک ہے۔ مجھے تو کچھ اسکرو لوز معلوم ہوتے ہیں۔

(پروفیسر گپتا بھی اٹھ کر چلا جاتا ہے)

گوپال : (آہستہ سے) یار اس الو کے پٹھے شاہد نے ڈاکٹر گپتا کو خوب پھانسا ہے۔ ڈاکٹر گپتا کی ساری کمائی اس کی نذر ہو رہی ہے۔

جعفر : یہ تو وہی مثل ہے کہ خدا دے اور بندہ لے۔

گوپال : آخر اس شاہد میں ایسی کون سی بات ہے جس پر وہ فریفتہ ہے۔

جعفر : (شراب کا گھونٹ لے کر مسکرا کر) سنا ہے اسے نوجوان لونڈوں کو اپنے ساتھ رکھنے کا مرض ہے (سگریٹ کا کش لے کر) اور پھر شاہد جوان ہے حسین ہے۔ تندرست ہے بس لکھ ہے اور کیا چاہیے۔

گوپال : تو یار ہم میں کیا کمی ہے۔ تندرستی دیکھ لو اچھے خاصے سانڈ بنے پھرتے ہیں اس سے زیادہ خوشامدی اور باتونی ہیں جوان ہیں اور اگر اس سے حسین نہیں تو کم بھی نہیں۔

جعفر : یہ تو اپنا اپنا نصیب ہے (شراب کا گھونٹ لے کر) تو گوپال تمھاری اس چمگادڑ سے ہمیں بھی ملواؤ نا۔

گوپال : جس روز کہو یہ تو بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔

جعفر : تو پھر نیک کام میں دیر کاہے کی۔ رہے آج ہی کوئی پروگرام — کیا اس کے گھر پر چلنا ہوگا۔

گوپال : نہیں وہ تمھارے گھر پر بھی آسکتی ہے۔

جعفر : مگر وہاں بڑے میاں نے چاروں طرف پہرہ جو بٹھا رکھا ہے۔

گوپال : تو پھر میرا گھر حاضر ہے۔ مگر اس طرح گھر پر بلانے میں کچھ مصارف زیادہ ہو جائیں گے۔

جعفر : اس کی پرواہ نہ کرو۔

گوپال : بس دونی مزدوری سمجھو— کچھ روپیہ اس کے شوہر کی نذر کرنا پڑیں گے اور کچھ اوپری مصارف۔

جعفر : یہ سب کچھ منظور ہے (مسکرا کر) اور آدھی رات بھی آپ کی نذر— بس۔

(مالتی آتی ہے اور جعفر کے پاس آکر)

مالتی : ہلو مسٹر جعفر۔

جعفر : ہلو مالتی۔ اب آرہی ہو۔

مالتی : (بیٹھتے ہوئے) بس سیدھی گھر سے چلی آرہی ہوں— پتا جی کے کان لوگوں نے ایسے بھر دیے ہیں کہ گھر سے نکلنے ہی نہیں دیتے۔

جعفر : وہی آپ کے منظورِ نظر جانسن ہوں گے۔

مالتی : جی ہاں یہ انھی کی کرامت معلوم ہوتی ہے۔ آج کل پتا جی سے بڑی گاڑھی چھن رہی ہے۔ ان کے سامنے کراس ورڈس کا دانہ ڈال رکھا ہے دن بھر دونوں اس میں مشغول رہتے ہیں۔ دن بھر ڈکشنریاں کھلی رہتی ہیں۔

جعفر : آپ کے پتا جی روپیہ ایسے ہی فضول طریقوں سے حاصل کرنے کی کوشش کرتے رہتے ہیں۔

مالتی : بس چاہتے ہیں کہ روپیہ آتا جائے اور خرچ نہ ہو۔ کل ایک ساڑھی پسند آئی مگر ان کی تجوری سے روپیہ نکلنا تھا نہ نکلا۔ آپ نے جو ساڑھی لاکر دی تھی اسے بے حد پسند کیا۔

جعفر : مہربانی ہے ان کی کہ میرا تحفہ پسند کرلیا۔ کہیے کچھ پی جیے گا۔

مالتی : کیوں نہیں۔ (جعفر شراب کا گلاس دیتا ہے مالتی مسکرا کر پی جاتی ہے) مسٹر جعفر! اب تو آپ کے یہاں پارٹیوں کا پروگرام جیسے ختم ہی ہوگیا۔

جعفر : جی نہیں۔ جس روز آپ فرمائیں (مسکرا کر) ہم تو اشارے کے منتظر رہتے ہیں۔
مالتی : (شراب کا دوسرا گھونٹ لے کر) کیا آج تھیٹر کا پروگرام نہیں بن سکتا۔
جعفر : کیوں نہیں۔
مالتی : میں آج کی رات فری ہوں۔
جعفر : تو ضرور چلیے سینما تھیٹر جو آپ پسند فرمائیں۔
(گوپال شراب کا ایک پیک اور پیتا ہے اور خاموشی سے اٹھ کر چلا جاتا ہے)
مالتی : مجھے اس گوپال کی شکل سے نفرت ہے۔
جعفر : کیوں خیریت تو ہے کیا غلطی ہوگئی اس بیچارے سے۔
مالتی : انتہائی منحوس ہے اگر صبح صبح اس کی شکل دیکھ لو تو کھانا نہ ملے دن بھر — سنا ہے انتہائی گندہ پیشہ کرتا ہے۔
جعفر : تو اس میں حرج ہی کیا ہے؟ (جعفر کی آنکھوں اور ہاتھ کی جنبش سے معلوم ہوتا ہے کہ شراب کا نشہ اس پر پورے طور سے چڑھ چکا ہے) دنیا کے تمام پیشے گندے ہیں۔ مائی ڈیر مالتی! غربت دنیا میں سب کچھ کراتی ہے۔ گوپال بھی ایسا کچھ کھاتا پیتا آدمی نہیں۔ اگر اس طرح اپنا شوق پورا کر لیتا ہے تو کیا حرج ہے۔
مالتی : لیکن ایک ایسا شخص ہمارے کلب کا ممبر ہوگا۔ کلب کے لیے انتہائی شرم کی بات ہے۔
جعفر : شرم! کانے پر اس کو ہنسنے کا حق ہے جو خود کانا نہ ہو۔
مالتی : لیکن مسٹر جعفر —
جعفر : (قطع کلام کر کے) آپ اس کلب کی ممبر کیوں ہیں اس لیے کہ آپ کو اس کلب کی سوسائٹی پسند ہے اور اگر وہی چیز گوپال کے دل کو بھی بھاتی ہے تو آپ کو اعتراض ہے۔ میں پوچھتا ہوں اس کلب کی کون سی ایسی ممبر ہے جو اپنے آپ کو باعصمت کہہ سکے — صاحب میں کہتا ہوں —

مالتی : خیر چھوڑو اس بحث کو — تو پھر آج تھیٹر کا پروگرام رہا۔

جعفر : آپ مجھ سے تھیٹر دیکھنے کے لیے کیوں مصر ہیں۔ اس لیے کہ آپ کی جیب میں پیسہ نہیں ہے۔ آپ کی شرم و حیا و خودداری ختم ہو چکی ہے اور آپ اپنی عصمت ہتھیلی پر رکھ کر صرف تھیٹر دیکھنے کے لیے وہ ہتھیلی میرے سپرد کر رہی ہیں۔

مالتی : تم تو پی کر بہک جاتے ہو (اٹھ کر جعفر کا ہاتھ پکڑ کر کھینچتے ہوئے) چلو آؤ زیادہ نہ پیو بلا وجہ لوگ تماشا دیکھیں گے۔

(جعفر اٹھ کر کھڑا ہوتا ہے اور مالتی کے ساتھ جاتا ہے اور دوسرے دروازہ سے گوپال اور فیاض آتے ہیں اور اسی میز پر بیٹھ جاتے ہیں)

فیاض : بوائے — برانڈی۔

گوپال : یار فیاض۔ جعفر کو پھانس تو لیا ہے مگر یہ مالتی بری پیچھے لگی ہے۔ اس کو کسی طرح ٹالو۔

فیاض : کس قدر مل جانے کی اُمید ہے۔

گوپال : سو تک تو پتھر پر رکھے ہیں مگر دیکھو۔

فیاض : میں نے کب انکار کیا ہے۔

گوپال : ابے جا ہمیشہ یونہی کہہ دیتا ہے (ملازم شراب کی بوتل اور گلاس میز پر رکھ کر چلا جاتا ہے) ابے تو تو ایسا گھاگ ہے آج تک اس سے تنہائی میں ملنے تک نہیں دیا بیٹا۔ پیسے کا پیسہ کما رہے ہو اور عیش نفع میں۔

فیاض : مجھے کب انکار ہے۔ آج ہی وہ تیرے گھر رہے گی — آدھی رات جعفر کی آدھی رات تیری — مگر یہ مالتی۔

گوپال : اسے تو میں کھسکا ہی دوں گا مگر — (مسکراتا ہے)

(دونوں شراب پینے لگتے ہیں سکینہ آتی ہے۔ گوپال سکینہ کو دیکھ کر)

گوپال : فیاض تم ذرا کھسک لو مجھے سکینہ سے گفتگو کرنا ہے ورنہ جعفر ہاتھ سے نکل جائے گا۔ (فیاض اٹھ کر چلا جاتا ہے) آیئے مس سکینہ تشریف رکھیے۔

(سکینہ پاس کرسی پر بیٹھ جاتی ہے۔شراب کا پیالہ بڑھاتے ہوئے) لیجیے۔

سکینہ : تھینکس۔ مسٹر گوپال اس وقت نہیں۔

گوپال : (مسکرا کر) کوئی نئی چیز تو نہیں۔ پھر پرہیز کیوں؟

سکینہ : پرہیز تو نہیں— مگر اس وقت نہیں۔

گوپال : بس تو بسم اللہ (پیالہ سکینہ کے ہاتھ میں دے دیتا ہے۔سکینہ مسکرا کر پینے لگتی ہے) صاحب اس مالتی نے جعفر پر بڑا برا قبضہ جمایا ہے۔

سکینہ : مالتی! مگر اس نے کلب آنا جانا چھوڑ دیا ہے۔

گوپال : (قہقہہ مار کر) کلب آنا جانا چھوڑ دیا ہے! گویا تو سوچ ہے کھا کر بلی حج کو جارہی ہے۔ اگر مالتی کلب آنا جانا چھوڑ دے تو یہ نئی نئی ساڑھیاں۔ فیشن کے لوازمات اور اچھی سوسائٹی میں کس طرح move کرے۔

سکینہ : مجھے تو اس سے نفرت ہے۔کم بخت نے اپنے کو اس قدر گرالیا ہے کہ خدا کی پناہ۔

گوپال : یہ سب آپ لوگوں کی مہربانیاں ہیں کہ اُسے ڈھیل دے رکھی ہے۔

سکینہ : لیکن ہم تو کم ازکم خود کو اتنا نہیں گرا سکتے۔

گوپال : خود کو گرانے کا سوال نہیں اس کو راستہ سے ہٹانے کا سوال ہے— اب آج ہی جعفر کے ساتھ تھیٹر کا پروگرام ہے خوب گلچھرے اڑائے گی۔

سکینہ : لیکن گوپال—

گوپال : لیکن ویکن کچھ نہیں۔ اگر گھی سیدھی انگلی سے نہیں نکلتا تو پھر ٹیڑھی انگلی سے نکالا جاتا ہے— لیکن اگر یہی لیل ونہار ہے تو آج جعفر قبضہ میں ہے۔ کل اجیت ہوگا۔ پرسوں شکیل اور نرائن اور پھر یہ فہرست شیطان کی آنت بنتی جائے گی۔

(پروفیسر گپتا اور سکینہ آتے ہیں)

گپتا : کہو مس سکینہ کیا ہو رہا ہے؟

سکینہ : آیئے تشریف رکھیے (تو ایک شراب کا پیالہ گپتا کو دیتی ہے اور دوسرا سکینہ کی

طرف بڑھاتی ہے)

سکینہ : شکریہ! یہ تو فرصت کے کام ہیں۔

سکینہ : اور غم غلط کرنے کا ذریعہ۔

سکینہ : مگر میں زندگی سے فرار کا قائل نہیں۔ (پروفیسر گپتا سے مخاطب ہوکر) مگر پروفیسر ہمیں ذاتی معاملات سے قطع نظر ان حالات پر غور کرنا ہے۔ چند خواتین نے روشن خیالی کا مقصد یہ سمجھ رکھا ہے کہ اخلاقی قدروں کو ملیامیٹ کردیا جائے۔ لیکن تمام خواتین تو اس مرض میں مبتلا نہیں۔ یہی نہیں بلکہ اگر سب کو خود کفالتی بنا دیا جائے تو ان کی یہ بے راہ روی خود بخود ختم ہوجائے گی۔ وہ مجبور ہوں گی کہ اپنی ذمے داری محسوس کریں اور اخلاقی قدروں کی پابند ہوکر ان کا احترام کریں۔

سکینہ : (نشہ کی وجہ سے جس کی زبان میں لکنت پیدا ہوگئی ہے) مگر کامریڈ نبولی کڑوی ہی اچھی لگتی ہے اگر اس میں شہد بھر دیا جائے تو وہ نبولی نہیں رہے گی۔

(جعفر پاس آکر کھڑا ہوجاتا ہے سکینہ قہقہہ مارتی ہے)

جعفر : کہیے خیریت تو ہے۔ یہ دیوار قہقہہ کیوں بنی جارہی ہیں۔

سکینہ : دیوار قہقہہ! (پھر قہقہہ مار کر سکینہ سے) مسٹر کامریڈ آپ کو جانے کیا مینیا ہے کہ آپ ہمیشہ بحث کے موڈ میں رہتے ہیں۔ صاحب کبھی تو غیر سنجیدہ ہوکر ہنسنے بولنے کا موقع دیا کیجیے۔

سکینہ : (کسی قدر برہم ہوکر) میں نے کبھی آپ سے بحث کرنے کی کوشش نہیں کی— آپ جس سوسائٹی میں رہ کر تباہ ہوچکی ہیں۔ اس سے باہر نکلنا آپ کے بس کا روگ نہیں اور نہ مجھے آپ سے بحث ہے میں ایک نئی عورت کے جنم کے متعلق سوچ رہا ہوں۔

سکینہ : (قہقہہ لگا کر) نئی عورت کے جنم کے متعلق سوچ رہا ہوں۔

(قہقہہ پر قہقہہ لگاتی ہے)

9 A

سکینہ : جی ہاں۔ ایک نئی عورت کے جنم کے متعلق جو عنقریب انقلاب سے پیدا ہوگی جو آپ سے زیادہ قابل احترام اور باعزت ہوگی جس کی سوسائٹی آپ سے بلند اور پاکیزہ ہوگی جس کی اخلاقی قدروں پر آپ کی گندی سوسائٹی کی مہر نہ ہوگی اور جس کی عزتِ نفس کی قیمت کسی تھیٹر اور سنیما کا پروگرام یا ایک برانڈی کی بوتل نہ ہوگی۔

سکینہ : (غصہ سے) بہت بے ہودہ ہیں آپ۔

(اٹھ کر چلی جاتی ہے جعفر پاس بیٹھتے ہوئے)

جعفر : یار کامریڈ تم بھی عجیب الٹی کھوپڑی کے ہو— بلا وجہ مس سکینہ کو ناراض کر دیا جانتے ہو تیز مزاج کی عورت ہے اس سے الجھنے کا نتیجہ سوائے ٹائیں ٹائیں فش اور کچھ نہیں ہوسکتا۔

سکینہ : صاحب ان کی یہ تیز مزاجی ان کے چاہنے والوں کے لیے ہوگی اور میرا نام اس فہرست میں نہیں۔ مجھے کیا پڑی ہے کہ حق بات کہنے سے چوکوں۔

جعفر : لیکن حق بات کہنے کے لیے بھی تو موقع اور مقام کا خیال ضروری ہے۔

سکینہ : اس رگ کو تو اسی وقت دبا دیا جائے گا جب یہ ابھرے گی۔ وقت اور مقام کی قید نہیں۔

جعفر : مگر بابا تم تو ترقی پسند ہو تمھیں سب سے زیادہ عورت کا احترام کرنا چاہیے۔

سکینہ : لیکن بدچلنی کا نام ترقی پسندی نہیں ہے کہ اپنے ہر کمینہ پن پر ترقی پسندی کا پردہ ڈال دیا جائے۔ ترقی پسندی کی اخلاقی قدریں بہت بلند ہیں۔

جعفر : تمھاری باتیں تو ہماری سمجھ میں نہیں آتیں۔ گرگٹ کی طرح رنگ بدلتے ہو۔

سکینہ : لیکن میں آپ کی طرح اس کا قائل نہیں چت بھی میری پٹ بھی میری جہاں ضرورت پڑی ترقی پسند بن گئے اور جہاں ضرورت ہوئی اس کا مضحکہ اڑانے لگے۔

جعفر : یار کامریڈ تم بلاوجہ ناراض ہو رہے ہو (مذاق کے انداز میں ہاتھ جوڑ کر) بابا

قصور ہوا ہمیں کیا معلوم تھا کہ تم گلے کا ہار بن جاؤ گے۔

(سکینہ غصہ سے جعفر کو دیکھتا ہے اور اٹھ کر چلا جاتا ہے۔ اس کے پیچھے پیچھے گپتا بھی جاتا ہے۔ کچھ دیر بعد مالتی آتی ہے اور جعفر کے پاس بیٹھ جاتی ہے)

مالتی : دیکھو جعفر! اس قدر شراب پینا اچھا نہیں اس سے صحت پر برا اثر پڑتا ہے۔

جعفر : یہاں صحت پہلے ہی کہاں اچھی تھی جو اب خیال رکھا جائے۔

مالتی : یہ تو جان بوجھ کر خودکشی کرنا ہے۔ تم اس قدر کمزور ہوگئے ہو کہ اب شراب برداشت نہیں کر سکتے اور بلا وجہ اول فول بکنے لگتے ہو۔

جعفر : اول فول بکنے لگتا ہوں (قہقہہ مار کر) یا کھری کھری باتیں کرنے لگتا ہوں؟

مالتی : خیر کھری کھری باتیں ہی سہی۔ مگر ہم پی کر اس قدر بہک جائیں کہ لوگ ہمارے متعلق غلط رائے قایم کرلیں یہ بھی تو بہت برا ہے۔

جعفر : یعنی لوگ ہم کو کم ظرف سمجھنے لگیں۔ مگر صاحب کیا کیا جائے آج کل ظرف کا پیمانہ صرف پیسہ ہے۔ ایک روز تمھیں نے مجھے شراب پینے کے لیے مجبور کیا تھا کیوں کہ اس وقت میرے پاس روپے کی کوئی کمی نہ تھی اور آج روپیہ کچھ کم ہوگیا ہے تو میرا ظرف ناپا اور تولا جانے لگا۔

(سکینہ اپنی جگہ سے اٹھ کر ان دونوں کے پاس آ کر بیٹھتی ہے پھر مالتی سے مخاطب ہوکر)

سکینہ : کیوں مالتی آج کلب کیسے آن دھمکیں۔ لوگوں نے تو تمھارے متعلق عجیب عجیب افواہیں پھیلا رکھی ہیں کہ تم نے شادی کرلی ہے۔ بھئی ہمیں تو اس پر بالکل اعتبار نہیں آیا۔ بھلا ہم لوگ مدعو نہیں کیے جاتے ایسا کہیں ہوسکتا ہے؟

مالتی : شادی! (قہقہہ مار کر) غلط ہے لگائی بجھائی کسی کی۔

(گوپال آتا ہے۔ سکینہ کو مسکرا کر دیکھتا ہے پھر جعفر سے مخاطب ہوکر)

گوپال : مسٹر جعفر! عجیب بے ہوش انسان ہو۔ کلب کی ورکنگ کمیٹی کا اجلاس ہورہا ہے۔ اور تم یہاں براجمان ہو۔

جعفر : ارے بھئی میں تو قطعی بھول گیا (اٹھ کر جاتے ہوئے) چلو۔

(گوپال اور جعفر جاتے ہیں۔ گوپال جاتے جاتے سکینہ کو آنکھ کا اشارہ کرتا ہے)

سکینہ : مالتی! تو بھی کہاں شادی وادی کے چکر میں پڑی ہے ہم آزاد پرندوں کے لیے یہ سب سے بڑا جال ہے۔ اری احمق اب دیکھ آج جعفر کے ساتھ تھیٹر کا پروگرام ہے۔ کل کسی اور کے ساتھ ہوگا۔ اگر شادی کرلی تو پھر یہ آزادی کہاں؟

مالتی : (سکینہ کو غور سے دیکھ کر) یہ کون سی برائی ہے۔ تمھیں ان پروگراموں کا موقع مل جائے گا۔

سکینہ : بھئی ہم اُن لوگوں میں سے نہیں ہیں جو چڑھتی بیل گرائیں تو تو بلا وجہ بدظن ہو رہی ہے۔ ارے ہاں تیرے اس کیس کا کیا ہوا؟

مالتی : کس کیس کا؟

سکینہ : (مسکرا کر) وہی abortion والا۔

مالتی : اس کا کیا حشر ہوگا وہی ہوا جو تمھارے کیس کا ہوا تھا۔ اب میرے پتا جی خان بہادر صاحب کی طرح تو ہیں نہیں کہ پہلے گھر سے نکالا پھر گھر میں رکھ لیا ان کی ناک اس معاملہ میں ذرا بڑی ہے۔

سکینہ : کیوں نہ ہوگی۔ اس سے ان کی تجوری میں روپیہ آتا ہی تو ہے جاتا تو نہیں۔

مالتی : ہاں مگر تھوڑے بدقسمت ضرور ہیں۔ انھوں نے تو ہزار کوشش کی کہ کہیں کمشنر بنا دیے جائیں مگر معلوم ہوا کہ اس معاملہ میں خان بہادر خوش قسمت رہے۔ نہ ہینگ لگی نہ پھٹکری اور رنگ بھی چوکھا آیا۔

سکینہ : ہم تو اس کے قائل نہیں کہ ہینگ لگے نہ پھٹکری اور رنگ چوکھا آئے۔ تمھارے پتا جی نے کچھ کھوٹے سکے چلانے کی کوشش کی ہوگی۔

مالتی : ہاں یونہی سمجھ لو کہ خان بہادر صاحب نے گھسے گھسائے اور چلے چلائے سکوں سے کام لے لیا۔

سکینہ : (کھڑی ہو کر) حضور سکہ جتنا پرانا ہوتا ہے اس کی قیمت اتنی ہی زیادہ ہوتی

ہے (قہقہہ لگاتی ہے اور چلی جاتی ہے۔ مالتی خاموش بیٹھ کر سوچنے لگتی ہے۔ شکیل مالتی کے پاس سے گزرتا ہے اور مالتی کو دیکھ کر)

شکیل : اوہ ہوس مالتی۔ (پاس بیٹھتے ہوئے) ارے بھئی یہ چاند کدھر نکل آیا۔ ہم تو خودکو اس روشنی سے محروم سمجھنے لگے تھے۔

مالتی : (مسکرا کر) اچھا ہوا کہ آپ کی غلط فہمی دور ہوگئی۔

شکیل : اگر دو چار روز اور غیر حاضر رہتیں تو غلط فہمی یقین میں تبدیل ہو جاتی (سر سے پیر تک مالتی کو دیکھ کر) بھئی خدا کی قسم مالتی غضب کی جامہ زیب ہو۔ اور رنگوں کے انتخاب میں تو تمھیں کمال حاصل ہے۔ کیا ساڑھی انتخاب کی ہے۔ بس کلب میں یہ تمھارا ہی حصہ ہے۔

مالتی : (مسکرا کر) تو پسند ہے یہ ساڑھی آپ کو؟

شکیل : کیوں نہیں۔ ارے صاحب آپ کے انتخاب کی داد تو ہر حالت میں دینی ہی پڑتی ہے۔

مالتی : شکریہ! یہ ساڑھی مسٹر جعفر کلکتہ سے لائے تھے۔ کہہ رہے تھے کہ ہزاروں میں سے انتخاب کی تھی۔

شکیل : بھئی کمال کر دیا وہ بھی اس قدر باذوق ہوگئے ہیں کہ ایسی ساڑھی انتخاب کر لی (مسکرا کر) ورنہ اس معاملہ میں تو میں ان کو بالکل بدھو سمجھتا تھا۔ مگر معلوم ہوا کہ اب ان میں بھی تمیز پیدا ہوتا جارہا ہے (پھر سر سے پیر تک مالتی کو غور سے دیکھ کر) مگر صاحب کپڑوں میں پہننے والے کے ذوق کو بھی بڑا دخل ہوتا ہے۔ اگر اچھے کپڑے کو بدسلیقگی سے پہنا جائے تو اس کا ستیاناس ہو جاتا ہے (پھر مالتی کو غور سے دیکھ کر سگریٹ جلاتے ہوئے) اب دیکھیے یہ ساڑھی کچھ زیادہ قیمتی نہیں یہی پچاس روپے کی ہوگی مگر آپ نے جس سلیقہ سے استعمال کیا ہے اُس سے ہزاروں کی معلوم ہوتی ہے۔ صاحب کپڑوں کے استعمال میں تو کوئی آپ کی برابری نہیں کرسکتا۔

مالتی : (مسکرا کر) شکریہ! (شراب کا ایک گھونٹ لے کر) اور کیوں صاحب یہ چپکے چپکے اسٹوڈی بیکر خرید لی اور ہمیں ہوا تک نہ دی وہ تو آج رضیہ نے کہا جب معلوم ہوا۔

شکیل : جی ہاں آپ سے ملاقات بھی ہوئی ہو— ہمیں تو معلوم ہوا تھا کہ آپ پردہ نشین ہوگئی ہیں— ارے ہاں۔ میں بھول ہی گیا۔ ہیرا لال کئی دن سے پیچھے پڑا ہوا ہے کہ نیا مال آگیا ہے۔ کل گیا تو اس نے کچھ ساڑھیاں دکھلائیں۔ مجھے دو ساڑھیاں بے حد پسند آئیں۔ میں نے انھیں محفوظ کرادیا ہے چل کر دیکھ لیجیے اور نند لال اینڈ جوہری کے یہاں کل آویزے بہت پسند آئے ہیرے اس خوبصورتی سے جڑے ہیں کہ بس دل لوٹ پوٹ ہوگیا— کل تو میں نے آپ کو فون بھی کیا تھا مگر آپ گھر پر موجود نہیں تھیں مجھے ڈر ہے کہ کسی دوسرے نے ان پر قبضہ نہ کرلیا ہو اچھی چیز بازار میں بار بار نہیں آتی چلیے چل کر پسند فرمالیجیے۔

مالتی : لیکن—

شکیل : لیکن ویکن کچھ نہیں۔ یہاں سے چل کر ساڑھیاں اٹھائیں گے پھر نند لال اینڈ جوہری کے یہاں چلیں گے۔ خدا کرے ان آویزوں پر کسی کی نظر نہ پڑی ہو مجھے بے حد پسند ہیں۔ وہاں سے چل کر کسی ہوٹل میں کھانا کھائیں گے اور پھر تھیٹر روپ متی اور باز بہادر اسٹیج کیا جارہا ہے۔ بڑی رومینٹک کہانی ہے۔

(جعفر اور گوپال آتے ہیں)

جعفر : (غصہ سے) صاحب میں اس کو قطعی پسند نہیں کرتا کہ کلب ہر شخص کے لیے کھول دیا جائے اور ہر ایکس، وائی، زیڈ اس کا ممبر بن سکے۔ کلب تو کیا ہوگا اچھا خاصہ مرغی خانہ ہوگا۔ جس میں اصیل اور دوغلی نسل کا فرق ہی باقی نہ رہے گا یہ صاحب آپ کے کامریڈ سکینہ بھی عجیب الٹی کھوپڑی کے ہیں۔ یہ

گھوڑوں اور خچروں کو ایک لکڑی سے ہانکنا چاہتے ہیں۔ اول تو مجھے ان کے ہی ممبر ہونے پر اعتراض ہے۔

شکیل : اماں جعفر! کیا ہوا اس قدر برہم کیوں ہو؟

جعفر : ہلو شکیل! صاحب میں تو اس کلب ہی سے استعفیٰ دیے دیتا ہوں۔ بھلا سوچیے تو کامریڈ سکینہ اس بات پر زور دے رہے ہیں کہ کلب کی ممبرشپ وسیع کرنے کے لیے اس کے دروازے سب کے لیے کھول دیے جائیں۔

مالتی : ارے چھوڑو بھی— آپ بھی کہاں کا غم پال رہے ہیں۔

جعفر : ارے صاحب غم کی بات ہی ہے۔ یہاں تو دل جل رہا ہے اور آپ کو مذاق سوجھا ہے۔

مالتی : خیر دل جلانے کی بات نہیں۔ (جعفر کے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر) بھئی جعفر! معاف کرنا شکیل مجبور کر رہے ہیں کہ میں ان کے ساتھ پکچر دیکھوں۔ میں نے تو ہزار کہا کہ میں مسٹر جعفر کے ساتھ پروگرام بنا چکی ہوں مگر یہ برابر مصر ہیں۔

جعفر : (مالتی کو سر سے پیر تک دیکھ کر) تو خدا حافظ۔ بھلا مجھ سے کہنے کی کیا ضرورت تھی۔

مالتی : نہیں ضرورت کیوں نہیں۔ یہ اخلاق سے گری ہوئی بات ہے۔

جعفر : (کسی قدر غصہ سے) اجی ہٹایئے۔ آپ بھی کہاں اخلاق کے چکر میں پھنسی ہیں۔ ہم لوگوں کی اخلاقی قدریں ہی جدا ہیں۔ اگر ہم لوگ اخلاقی قدروں کے پابند ہو جائیں تو خدا کو ایک نئی دنیا تخلیق کرنا پڑے (شکیل کو طنزیہ مسکرا کر دیکھ کر) شکیل! وش یو سوئٹ ڈریمس۔

شکیل : تھینک یو۔

(گوپال کرسی پر بیٹھ جاتا ہے اور شکیل مالتی کو لے کر جاتا ہے)

گوپال : بھئی یہ مالتی تو بڑی کاروباری ہے۔

جعفر : اور آپ کو آج معلوم ہوا abortion کے سلسلہ میں مجھ سے اجیت سے اور

نرائن سے سینکڑوں روپیہ مار چکی ہے سب کو احمق بنایا ہے۔

(سکینہ اور ستیش پاس سے گزرتے ہیں)

ستیش : ہلو جعفر۔

جعفر : ہلو ستیش۔ کہاں چل دیے۔

ستیش : ذرا پکچر کا پروگرام ہے۔

(سکینہ اور ستیش چلے جاتے ہیں)

جعفر : تو آج کل سکینہ کی مہربانی ستیش پر ہے معلوم ہوتا ہے بھائی کے سر میں کچھ بال زیادہ ہوگئے ہیں۔

گوپال : دوچار روز میں چندیا نظر آنے لگے گی۔ مگر صاحب سکینہ کے پاس جانے کون سالا سر ہے کہ جب تک بال و پر نہ نچ جائیں پھنسا ہوا نکل نہیں سکتا۔

جعفر : یہ تو کوئی ہمارے دل سے پوچھے۔ بال و پر نچنا تو الگ رہا کھال تک اُتر گئی۔ اس گرہ کٹ سے خدا بچائے اس کے کاٹے کا منتر نہیں۔ خیر چھوڑو ان باتوں کو میں تو اِن چیزوں کا عادی ہو چکا ہوں۔ ہاں بھئی— (مسکرا کر) تمھارے اس چمگادڑ کے ساتھ پروگرام طے ہے نا۔

گوپال : بالکل۔

جعفر : اچھا تو میں ذرا لائبریری تک جارہا ہوں۔ نو بجے مجھے بلا لینا۔

(جعفر اٹھ کر چلا جاتا ہے۔ گوپال ایک گلاس شراب پیتا ہے اور اٹھ کر کھڑا ہوتا ہے۔ فیاض آکر)

فیاض : گوپال! جعفر کا پروگرام کینسل۔

گوپال : کیوں؟

فیاض : ایک دوسری موٹی مرغی پھانس لی ہے۔

(جانے کے لیے مڑتا ہے)

گوپال : مگر سنو تو۔

ہے (قہقہہ لگاتی ہے اور چلی جاتی ہے۔ مالتی خاموش بیٹھ کر سوچنے لگتی ہے۔ شکیل مالتی کے پاس سے گزرتا ہے اور مالتی کو دیکھ کر)

شکیل : اوہ ہوس مالتی۔ (پاس بیٹھتے ہوئے) ارے بھئی یہ چاند کدھر نکل آیا۔ ہم تو خود کو اس روشنی سے محروم سمجھنے لگے تھے۔

مالتی : (مسکرا کر) اچھا ہوا کہ آپ کی غلط فہمی دور ہوگئی۔

شکیل : اگر دو چار روز اور غیر حاضر رہتیں تو غلط فہمی یقین میں تبدیل ہو جاتی (سر سے پیر تک مالتی کو دیکھ کر) بھئی خدا کی قسم مالتی غضب کی جامہ زیب ہو۔ اور رنگوں کے انتخاب میں تو تمھیں کمال حاصل ہے۔ کیا ساڑھی انتخاب کی ہے۔ بس کلب میں یہ تمھارا ہی حصہ ہے۔

مالتی : (مسکرا کر) تو پسند ہے یہ ساڑھی آپ کو؟

شکیل : کیوں نہیں۔ ارے صاحب آپ کے انتخاب کی داد تو ہر حالت میں دینی ہی پڑتی ہے۔

مالتی : شکریہ! یہ ساڑھی مسٹر جعفر کلکتہ سے لائے تھے۔ کہہ رہے تھے کہ ہزاروں میں سے انتخاب کی تھی۔

شکیل : بھئی کمال کر دیا وہ بھی اس قدر باذوق ہو گئے ہیں کہ ایسی ساڑھی انتخاب کر لی (مسکرا کر) ورنہ اس معاملہ میں تو میں ان کو بالکل بدھو سمجھتا تھا۔ مگر معلوم ہوا کہ اب ان میں بھی تمیز پیدا ہوتا جا رہا ہے (پھر سر سے پیر تک مالتی کو غور سے دیکھ کر) مگر صاحب کپڑوں میں پہننے والے کے ذوق کو بھی بڑا دخل ہوتا ہے۔ اگر اچھے کپڑے کو بدسلیقگی سے پہنا جائے تو اس کا ستیاناس ہو جاتا ہے (پھر مالتی کو غور سے دیکھ کر سگریٹ جلاتے ہوئے) اب دیکھیے یہ ساڑھی کچھ زیادہ قیمتی نہیں یہی پچاس روپے کی ہوگی مگر آپ نے جس سلیقہ سے استعمال کیا ہے اُس سے ہزاروں کی معلوم ہوتی ہے۔ صاحب کپڑوں کے استعمال میں تو کوئی آپ کی برابری نہیں کر سکتا۔

مالتی : (مسکرا کر) شکریہ! (شراب کا ایک گھونٹ لے کر) اور کیوں صاحب یہ چپکے چپکے اسٹوڈی بیکر خرید لی اور ہمیں ہوا تک نہ دی وہ تو آج رضیہ نے کہا جب معلوم ہوا۔

شکیل : جی ہاں آپ سے ملاقات بھی ہوئی ہو— ہمیں تو معلوم ہوا تھا کہ آپ پردہ نشین ہوگئی ہیں— ارے ہاں۔ میں بھول ہی گیا۔ ہیرالال کئی دن سے پیچھے پڑا ہوا ہے کہ نیا مال آگیا ہے۔ کل گیا تو اس نے کچھ ساڑھیاں دکھلائیں۔ مجھے دو ساڑھیاں بے حد پسند آئیں۔ میں نے انھیں محفوظ کرادیا ہے چل کر دیکھ لیجیے اور نند لال اینڈ جوہری کے یہاں کل آویزے بہت پسند آئے ہیرے اس خوبصورتی سے جڑے ہیں کہ بس دل لوٹ پوٹ ہوگیا— کل تو میں نے آپ کو فون بھی کیا تھا مگر آپ گھر پر موجود نہیں تھیں مجھے ڈر ہے کہ کسی دوسرے نے ان پر قبضہ نہ کرلیا ہو اچھی چیز بازار میں بار بار نہیں آتی چلیے چل کر پسند فرمالیجیے۔

مالتی : لیکن—

شکیل : لیکن ویکن کچھ نہیں۔ یہاں سے چل کر ساڑھیاں اٹھائیں گے پھر نند لال اینڈ جوہری کے یہاں چلیں گے۔ خدا کرے ان آویزوں پر کسی کی نظر نہ پڑی ہو مجھے بے حد پسند ہیں۔ وہاں سے چل کر کسی ہوٹل میں کھانا کھائیں گے اور پھر تھیٹر روپ متی اور بازبہادر اسٹیج کیا جارہا ہے۔ بڑی رومینٹک کہانی ہے۔

(جعفر اور گوپال آتے ہیں)

جعفر : (غصہ سے) صاحب میں اس کو قطعی پسند نہیں کرتا کہ کلب ہر شخص کے لیے کھول دیا جائے اور ہر ایکس، وائی، زیڈ اس کا ممبر بن سکے۔ کلب تو کیا ہوگا اچھا خاصہ مرغی خانہ ہوگا۔ جس میں اصیل اور دوغلی نسل کا فرق ہی باقی نہ رہے گا یہ صاحب آپ کے کامریڈ سکینہ بھی عجیب الٹی کھوپڑی کے ہیں۔ یہ

فیاض : نہیں بھئی— تم اس کو کسی طرح بہلا دینا۔ میں اس وقت ایک شخص کے ساتھ جارہا ہوں۔

(تیز تیز قدموں سے چلا جاتا ہے اور گوپال خاموش کھڑا رہتا ہے۔ بوتل اٹھا کر شراب بھرتا ہے مگر بوتل خالی ہوچکی ہے چاروں طرف نظریں دوڑاتا ہے۔ بار خالی ہوچکا ہے صرف ملازم ایک اسٹول پر بیٹھا اونگھ رہا ہے)

(پردہ)

(1952)

سوکھے درخت

افرادِ تمثیل

(1) انور (ایک مالدار شہری) (2) بیگم انور (انور صاحب کی بیوی) (3) نجمہ (انور صاحب کی لڑکی) (4) ثروت (نجمہ کا شوہر) (5) جمیل (ثروت کا دوست) (6) مریم (انور صاحب کی پرورش کی ہوئی پڑھی لکھی لڑکی)

ایک شاندار کوٹھی کا بہت ہی پرتکلف کمرہ۔ یہ کمرہ مہمانوں کے لیے مخصوص ہے۔ کمرہ میں تمام ضروری سامان موجود ہے۔ ایک ڈریسنگ ٹیبل لکھنے پڑھنے کے واسطے ایک میز چند کرسیاں، صوفے، ایک الماری میں چند کتابیں اور مسہری پر ایک صاف و شفاف بستر — یہ سامان ہمیشہ اس کمرہ میں موجود رہتا ہے تاکہ ضرورت کے وقت سامان کی فراہمی میں وقت کا سامنا نہ کرنا پڑے۔ اس کمرہ میں ثروت ٹھیرا ہوا ہے۔ کمرہ کوٹھی کے بالائی حصہ میں ہے۔ مشرقی جانب ایک کھڑکی ہے جس میں کھڑے ہونے سے کوٹھی کا مختصر پارک نظر آتا ہے جس کا ہر پودا اور درخت موسم خزاں کے باعث اپنی پتیاں جھاڑ چکا ہے کمرے میں جنوبی جانب ایک دروازہ ہے جس میں ریشمی پردے پڑے ہوئے ہیں۔

اس وقت دن کے تقریباً 9 بجے ہیں سورج پہاڑوں کی اوٹ سے نکل کر بلند ہو چکا ہے۔ اس کی کرنیں کھڑکی کی راہ سے داخل ہو رہی ہیں۔ ثروت گرمی کے احساس سے بے نیاز کھڑکی میں کھڑا پہاڑوں پر سوکھے درختوں کو دیکھ رہا ہے۔ جمیل ایک صوفے پر نیم دراز ایک کتاب کا مطالعہ کر رہا ہے۔ کچھ دیر کمرہ میں خاموش رہتی ہے پھر ثروت یکا یک جمیل سے مخاطب ہو کر۔

ثروت : جمیل!

جمیل : (اسی طرح کتاب پر نظریں جمائے ہوئے) ہنہ۔

ثروت : کبھی تم نے ان سوکھے درختوں کو دیکھ کر اس پر غور کیا ہے کہ موسم خزاں میں ان میں کس قدر کشش اور جاذبیت پیدا ہو جاتی ہے۔

جمیل : اسی طرح کتاب پر نظریں جمائے ہوئے) ان سوکھے درختوں اور پودوں کو بارہا دیکھا ہے لیکن موسم خزاں میں کوئی جاذبیت اور کشش نہیں پائی۔

(کتاب صوفہ پر رکھ کر آہستہ آہستہ ثروت کے پاس آتا ہے اور کھڑکی سے باہر سوکھے پودوں اور درختوں کو دیکھنے لگتا ہے)

ثروت : (اسی طرح باہر دیکھتے ہوئے) اگر انسان صاحب ذوق ہو تو وہ ہر چیز میں کوئی نہ کوئی حسن اور کوئی نہ کوئی ندرت ڈھونڈ ہی نکالتا ہے (جمیل کی طرف مڑ کر) تم سوکھے درختوں کو دیکھ کر خیال کرتے ہوگے کہ کب موسم بہار آئے اور یہ پھر سبز لباس پہنیں اور میں سوچتا ہوں کہ یہ ہمیشہ یونہی رہیں کہ میرے دل میں امید کی کرن باقی رہے کہ بہار ضرور آئے گی۔۔ (پھر کھڑکی سے باہر درختوں کو دیکھنے لگتا ہے۔ کچھ دیر بعد) جمیل!

جمیل : (جو درختوں کو دیکھنے میں مشغول ہے) کیا ہے؟

ثروت : (کمرہ کو چاروں طرف سے دیکھتے ہوئے) اگر یہ سامان عیش نہ ہو تو انسان کیا ایک خوشگوار زندگی نہیں گزار سکتا؟

جمیل : (جیب سے سگریٹ نکال کر جلاتا ہے اور کچھ دیر سوچنے کے بعد) ثروت!

میں محسوس کرتا ہوں کہ تم یہاں آ کر کچھ کھوئے کھوئے سے رہتے ہو اور کسی چیز کو چھپانے کی کوشش کرتے ہو (سگریٹ کا کش لے کر) کیا مجھے اس کا سبب پوچھنے کا حق نہیں ہے؟

(ثروت کچھ دیر خاموشی سے سوچتا ہے۔ کمرہ کو چاروں طرف سے دیکھتا ہے پھر آہستہ آہستہ)

ثروت : جمیل! میں یہاں آ کر محسوس کرتا ہوں کہ میں نے اپنی چچا زاد بہن نجمہ سے شادی کر کے بڑی غلطی کی ہے۔

جمیل : کیوں؟ لیکن اس سے پہلے تو تم نے کبھی اس کا اظہار نہیں کیا۔

ثروت : ہاں۔۔ جب میں یہاں سے جاتا ہوں تو اس مشغول زندگی میں سب کچھ بھول جاتا ہوں۔ لیکن یہاں آ کر۔۔

جمیل : لیکن یہاں آ کر...

ثروت : یہاں آ کر مجھے دو آنکھیں اس طرح گھورتی ہیں جیسے گزشتہ وعدہ یاد دلا رہی ہوں۔

جمیل : (تعجب سے) گزشتہ وعدہ!

ثروت : ہاں۔۔ مریم کی دو آنکھیں۔۔ وہ کہتی ہیں کہ تم نے مجھ سے کوئی وعدہ کیا تھا اور پھر سوال کرتی ہیں کہ کیا بھول گئے۔ میں بھلا اس کا کیا جواب دوں۔ صرف تڑپ کر رہ جاتا ہوں۔

جمیل : (تعجب سے) مریم؟

ثروت : ہاں معصوم اور مظلوم مریم۔۔ کبھی کبھی ان آنکھوں میں ایک تشکر ہوتا ہے شاید وہ کہتی ہیں کہ تم نے وعدہ بھلا دیا اچھا کیا۔ لیکن شکریہ ادا کرتی ہیں کہ اس کا جسم گناہ سے پاک رہا۔

جمیل : ثروت! کیا تمھاری آنکھیں اب بھی مریم کو انھی نظروں سے دیکھنے کی عادی ہیں جن سے پہلے کبھی تم دیکھا کرتے تھے۔

ثروت : ہاں— (حسرت سے ٹھنڈی سانس بھر کر) مگر اب یہ خواب و خیال سے زیادہ نہیں۔ یہ ایک مجذوب کی خواہش ہے جو چاند سے روشنی چھین لینا چاہتا ہو (جمیل اور ثروت خاموش ہو جاتے ہیں کچھ دیر بعد مریم داخل ہوتی ہے اور جمیل کو دیکھ کر ٹھٹھک جاتی ہے)

مریم : (نظریں جھکا کر شرماتے ہوئے) ثروت میاں— آپ کو بیگم صاحبہ یاد فرما رہی ہیں۔

ثروت : کیا کام ہے؟

مریم : مجھے اس کا علم نہیں۔

(ثروت کمرہ سے نکل جاتا ہے۔ مریم بھی جانے کے لیے مڑتی ہے)

جمیل : مریم صاحبہ۔

مریم : (رُک کر) جی۔

جمیل : ذرا ٹھہریے مجھے آپ سے ایک ضروری کام ہے۔

مریم : (گھبرا کر) مجھ سے— میں—

جمیل : جی ہاں آپ سے (کچھ دیر خاموش رہ کر سوچتے ہوئے) آپ ثروت سے محبت کرتی ہیں— دیکھیے مجھے اس کا علم ہو چکا ہے۔ مجھے یہ بھی معلوم ہو چکا ہے کہ اس نے آپ سے کوئی وعدہ کیا اور بھلا دیا— یہ اس کی کمزوری ہے۔ مگر—

مریم : ان کی اس کمزوری میں— بڑی کشش ہے۔

جمیل : ہاں اس میں اور بھی پرکشش کمزوریاں ہیں۔ لیکن آپ مجھے یہ بتلایئے کہ کیا آپ اب بھی اس سے اسی طرح محبت کرتی ہیں۔

مریم : تیر کمان سے نکلنے کے بعد واپس نہیں آتا۔

(منہ چھپا کر آنسو پونچھتی ہے)

جمیل : عورت کے آنسوؤں کی قیمت اس قدر سستی نہیں ہے اور پھر رونا تو جذبات کی

فضول خرچی ہے— یہ کہیے کہ کیا آپ اب بھی اس سے محبت کرتی ہیں۔
دیکھیے موسم خزاں کے بعد درختوں میں بھی نئی کونپلیں نکلتی ہیں۔

مریم : اب یہ صرف کہانی ہی کہانی ہے۔ مستقبل کی اُمید میں کوئی کہاں تک جی سکتا ہے اور پھر میں ایک یتیم لڑکی تھی۔ سیٹھ صاحب نے میری پرورش کی کیا میں نجمہ بہن سے—

جمیل : لیکن محبت کو احسان پر قربان کرنا دانشمندی نہیں ہے۔

مریم : لیکن مجبوری۔

جمیل : مجبوری کی زنجیریں بہت کمزور ہوتی ہیں۔ ذرا جھٹکا دیجیے ٹوٹ جائیں گی۔

مریم : مگر—

جمیل : مگر وگر کچھ نہیں— میں آپ سے وعدہ کرتا ہوں۔

(نجمہ داخل ہوتی ہے اور غصہ سے دونوں کو دیکھ کر)

نجمہ : مریم! یہاں کیا کررہی ہو— جاؤ اپنا کام کرو۔

(مریم آہستہ آہستہ کمرہ سے نکل جاتی ہے۔ جمیل اطمینان سے سگریٹ پیتا ہوتا ہے۔ کچھ دیر نجمہ کمرہ میں ٹہلتی رہتی ہے۔ پھر غصہ سے)

نجمہ : جمیل صاحب مجھے آپ سے یہ اُمید نہ تھی۔

جمیل : کیا اُمید نہ تھی؟

نجمہ : یہی کہ آپ دوستی کے پردے میں ہمارا سکھ چین چھیننے کی کوشش کریں گے۔ میں سب کچھ سن چکی ہوں۔

جمیل : اگر آپ نہ سنتیں تو میں خود ہی سنا دیتا— اچھا ہی ہوا کہ آپ نے سب کچھ سن لیا— آپ سے شادی کرکے ثروت کا سکھ چین سب کچھ برباد ہوچکا ہے۔

نجمہ : کچھ بھی ہو انھوں نے اب مجھ سے شادی کرلی ہے۔

جمیل : اس میں یہی تو کمزوری ہے کہ وہ کسی سے کسی بات پر انکار نہیں کرسکتا۔ لیکن میں بھی تو اُسے برباد ہوتے نہیں دیکھ سکتا۔

نجمہ : لیکن شریف انسان وہ ہوتے ہیں جو خاندان میں صلح و آشتی کا پیغام دیتے ہیں۔

جمیل : اور میں کہاں جنگ کا الٹی میٹم دے رہا ہوں۔ لیکن میں یہ بھی نہیں چاہتا کہ ثروت کے دل میں جو محبت کی شمع جل رہی ہے وہ بجھ جائے۔

نجمہ : (غصہ سے) کمینہ کہیں کے۔

(جمیل سر سے پیر تک نجمہ کو دیکھتا ہے اور کمرہ سے باہر نکل جاتا ہے۔ نجمہ کچھ دیر کمرہ میں ٹہلتی رہتی ہے اور پھر زور زور سے چیخ کر)

نجمہ : اماں بیا— اماں بیا—

بیگم انور کی دور سے آواز۔ ''کیوں چیخ رہی ہو۔'' کچھ منٹ کے بعد بیگم انور داخل ہوتی ہیں بیگم انور کی عمر چالیس سال کے قریب ہے۔ لیکن ابھی تک خودنمائی کا جذبہ موجود ہے۔ شوخ رنگ کا لباس استعمال کرتی ہیں۔ کلب اور سوسائٹی سے کافی دلچسپی ہے)

بیگم انور : کیا بات ہے— یہ پاگلوں کی طرح کیوں چیخ رہی ہو۔

نجمہ : (دوڑ کر اپنی ماں سے لپٹ کر) اماں بیا— (ہچکیوں سے رونے لگتی ہے)

بیگم انور : کیا بات ہے— کچھ کہو تو— (نجمہ برابر روتی رہتی ہے) آخر کچھ کہو بھی۔

نجمہ : مریم—

بیگم انور : مریم! کیا کیا مریم نے؟

نجمہ : وہ اُن سے— وہ اُن سے محبت کرتی ہے اور وہ بھی۔

بیگم انور : (غصہ سے) ثروت سے محبت کرتی ہے؟ یہ مجال اس مالزادی کی— میں نے اس لیے اس کو اپنی اولاد کی طرح پالا تھا— لیکن تمھیں اس کا علم کیسے ہوا۔

نجمہ : میں جمیل صاحب سے ان کی خیریت دریافت کرنے آئی تھی کہ یہ راز معلوم ہوا— جمیل اُن کے ہمراز ہیں۔

بیگم انور : جمیل! وہ کمینہ لوفر— جبھی تو کہتی ہوں کہ ان رذیلوں کو منہ لگانا اچھا نہیں (کچھ دیر سوچنے کے بعد) اچھا دیکھو میں کچھ انتظام کرتی ہوں۔

نجمہ : محبت کا بھوت تدبیروں سے نہیں اترتا— (شکست خوردہ لہجہ میں) مریم بلا کی حسین ہے (انور صاحب داخل ہوتے ہیں۔ ان کی عمر تقریباً 55 سال کے قریب ہے۔ موٹے تازے انسان ہیں۔ رنگ سیاہی مائل ہے۔ جنگ کے زمانہ میں چور بازاری کے ذریعہ کافی روپیہ کما لیا ہے۔ شہر کے بڑے سرمایہ داروں میں شمار ہوتے ہیں۔ اور بیگم انور سے ہمیشہ مرعوب رہتے ہیں۔ کمرہ میں داخل ہوکر ماحول سے ناواقفیت کی بنا پر)

انور : یہ لیجیے— آپ یہاں تشریف رکھتی ہیں— دیکھیے آج میں نے کچھ دوستوں کو چائے پر مدعو کیا ہے— آپ—

بیگم انور : انتظام کرلینا— (نجمہ سے) تم اپنے کمرہ میں جاؤ بیٹی۔

(انور صاحب نجمہ کو دیکھ کر)

انور : کیا بات ہے بیٹی؟

بیگم انور : کوئی بات نہیں— جاؤ بیٹی تم اپنے کمرہ میں جاؤ۔

(نجمہ آہستہ آہستہ کمرہ سے نکل جاتی ہے)

انور : (پریشان ہوکر) کچھ مجھے بھی کہو نا— (بیگم انور کھڑکی کے پاس جاکر کھڑی ہوجاتی ہیں) بھئی مجھ سے کہو گی بھی کہ نہیں— تم اس قدر پریشان کیوں ہو۔ نجمہ کیوں رو رہی تھی۔

بیگم انور : (اسی طرح باہر دیکھتے ہوئے) رو رہی تھی بیچاری اپنی قسمت کو۔

انور : اپنی قسمت کو؟ (کھانسی کا دورہ پڑتا ہے اور نڈھال ہوکر ایک کرسی پر بیٹھ جاتے ہیں) کیا مطلب ہے تمھارا؟

بیگم انور : مطلب— (کچھ دیر سوچ کر) مریم اپنے تمام ساحرانہ جال ثروت پر پھینک چکی ہے۔

انور : مریم۔

بیگم انور : جی ہاں آپ کی چہیتی مریم۔

انور : (سوچتے ہوئے) لیکن وہ اس قدر معصوم اور بھولی بھالی ہے کہ میں اس کے متعلق یہ رائے قائم نہیں کر سکتا۔

بیگم انور : یہ حقیقت ہے— اب تدبیر سوچنے کا وقت ہے۔

انور : اور پھر ثروت انتہائی شریف اور نیک لڑکا ہے وہ اس کے جال میں کیسے پھنس گیا۔

بیگم انور : لیکن جمیل اس کا دوست ہے— خدا بری صحبت سے بچائے۔ اس کے علاوہ مریم کیا کم حسین ہے وہ اچھے اچھے مردوں کو اپنے جال میں پھانس سکتی ہے۔

انور : (مسکرا کر) تو گویا آپ—

بیگم انور : (قطع کلام کر کے) مذاق چھوڑیئے— (سوچتے ہوئے) اب کیا تدبیر کی جائے۔

انور : تدبیر— (کھانسی کا دورہ پڑتا ہے کچھ دیر بعد) میں ثروت کو سمجھانے کی کوشش کروں گا— وہ میرا کہا مان لے گا۔

بیگم انور : غیر ممکن— جوانی دیوانی ہوتی ہے— بڑھاپے کی نصیحتیں جوانی کی ہوس سے ٹکر نہیں لے سکتیں— (کچھ دیر سوچ کر) کیا ایسا نہیں ہو سکتا— (پھر خود ہی جواب دے کر) بس یہی تدبیر ہے— کہ— آپ مریم سے نکاح کر لیں۔

انور : (گھبرا کر) میں نکاح کر لوں۔

بیگم انور : جی آپ— اور آپ نہیں تو کیا میں—

انور : تمہیں تو مجھ پر غصہ اتارنا آتا ہے— ذرا میری عمر اور اس کی عمر تو دیکھو اور پھر میں نے اس کی کس طرح پرورش کی ہے— اس کے علاوہ میں دائم المریض ہوں— میرے بعد مریم کا کیا ہوگا؟

بیگم انور : جہنم میں جائے مریم— لیکن میں اس کی جوانی پر اپنی لڑکی کی جوانی قربان نہیں کر سکتی۔

10A

انور : لیکن بیگم۔۔۔ دنیا کیا کہے گی اس پر بھی تو غور کرو۔

بیگم انور : دنیا کچھ کہے کچھ سنے۔۔۔ مجھے اس کی پرواہ نہیں۔۔۔ مجھے نجمہ سے محبت ہے دنیا والوں سے نہیں۔

انور : (پریشان ہوکر) لیکن دنیا مجھ پر ہنسے گی۔۔۔ نہیں نہیں یہ مجھ سے ہرگز نہیں ہوسکتا۔

بیگم انور : ہوسکتا ہے اور ہوگا۔۔۔ آپ بلا وجہ ضد نہ کیجیے۔

انور : لیکن تم مجھ سے ایسی بات کہہ رہی ہو کہ۔۔۔

بیگم انور : (قطع کلام کرکے) میں مجبور ہی نہیں کر رہی ہوں بلکہ ارادہ کرچکی ہوں کہ ایسا ہوکر رہے گا۔

انور : لیکن بیگم مریم کے متعلق تو سوچو وہ ایک معصوم کونپل ہے۔ اور۔۔۔

بیگم انور : میں کہتی ہوں کہ بحث کی گنجائش نہیں۔۔۔ (چیخ کر) مریم اری او مریم۔۔۔

انور : (گھبرا کر) کرتی کیا ہو۔۔۔ پاگل تو نہیں ہوگئی ہو۔

بیگم انور : ہاں پاگل ہوگئی ہوں۔۔۔ مریم او مریم۔

(مریم آہستہ آہستہ کمرہ میں داخل ہوتی ہے)

مریم : بیگم صاحبہ آپ نے یاد فرمایا تھا۔

بیگم انور : نہیں۔۔۔ (انور صاحب کی طرف اشارہ کرکے) تمھارے حضور نے (انور صاحب سے مخاطب ہوکر) آپ مطمئن رہیے۔ آج ایک شاندار پارٹی کا انتظام ہوجائے گا۔ (انور صاحب رحم طلب نگاہوں سے بیگم انور کو دیکھتے ہیں مگر وہ کمرہ سے نکل جاتی ہیں۔ انور صاحب کچھ دیر خاموش رہتے ہیں۔ اُن کے لب ہلتے ہیں جیسے کچھ کہنا چاہتے ہیں۔ مریم خاموش کھڑی ان کے چہرہ کے اتار چڑھاؤ دیکھتی رہتی ہے۔ انور صاحب اٹھ کر کھڑکی کے پاس جاکر کھڑے ہوجاتے ہیں۔ کچھ دیر خاموشی سے باہر دیکھتے رہتے ہیں۔ پھر کانپتی ہوئی آواز میں)،

انور : مریم۔

مریم : جی۔

انور : یہاں آؤ میرے پاس (مریم ان کے پاس جاکر کھڑی ہوجاتی ہے) ان سامنے والے سوکھے درختوں کو دیکھو۔ یہ مرجھا گئے ہیں نا۔

مریم : جی ہاں۔

انور : کیا یہ ہمیشہ اسی طرح مرجھائے رہیں گے۔ میرا خیال ہے نہیں! ایک روز ان میں نئی کونپلیں نکلیں گی اور پھر یہ تر و تازہ ہوجائیں گے۔

(آہستہ آہستہ کھانستے ہیں اور جواب کے انتظار میں مریم کا چہرہ دیکھتے ہیں)

مریم : (نظریں جھکا کر) جی ہاں — خزاں کے بعد بہار ضرور آتی ہے۔

انور : یہ سامنے سوکھے درخت اسی امید پر جی رہے ہیں کہ ان میں ابھی بہاریں پوشیدہ ہیں۔

مریم : جی ہاں۔

انور : اور باغبان قدرت نے انھیں اسی واسطے چھوڑ دیا ہے کہ بوڑھے درختوں پر بہاریں آئیں اور ان میں پھر جوانی کی لہر دوڑے۔ ورنہ باد خزاں کے جھونکے انھیں خس و خاشاک کی طرح جڑ ہی سے اکھاڑ کر پھینک دیتے۔

مریم : جی ہاں — یہ تو صحیح ہے۔

انور : مریم یہی حالت ان بوڑھوں کی ہے جن کی نگاہوں میں پژمردگی کے آثار ہیں (کھانستے ہیں) جن کے چہروں پر جھریاں ہیں جن کے بال جوانی کا سیاہ لبادہ اتار کر پیری کی سفید عبا پہن چکے ہیں۔ لیکن جن کے دلوں میں امنگیں ہیں — تازہ بہاروں اور نئی کونپلوں کی امید میں۔

(مریم حیرت سے انور صاحب کا چہرہ دیکھتی ہے۔ چہرہ پر خوف کے آثار ہیں۔ اس کی نگاہوں سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس کو محسوس کرچکی ہے کہ اس کے گرد جال بچھایا جارہا ہے)

مریم : لیکن حضور—

(انور صاحب قطع کلام کر کے جیسے اُسے بولنے کی اجازت دینا نہیں چاہتے)

انور : مریم! میری اِن مرجھائی ہوئی آنکھوں کو نہ دیکھو۔ جوانی بڑھاپے کو بھی اپنے رنگ میں رنگ لیتی ہے— میں تمھیں— میں خود کو پھر جوان بنانا چاہتا ہوں

(مریم کے چہرہ سے ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے کسی نے اس چہرہ پر طمانچہ مار دیا ہو۔ وہ بے ساختہ حضور کہہ کر دروازہ کی جانب مڑتی ہے)

انور : مریم— میرے دل کو نہ ٹھکراؤ— کہاں چلیں۔

مریم : لیکن حضور—

انور : مریم میں نے اسی واسطے تمھاری پرورش کی تھی۔ اُمیدوں کا سہارا لے کر— دل میں ایک اُمید تھی کہ ایک روز—

مریم : (چیخ کر روتے ہوئے) خدا را ایسا نہ کہیے— آپ نے جس شفقت اور محبت سے پرورش کی تھی وہ پدرانہ شفقت تھی۔

انور : نہیں مریم— میں نے تمھاری پرورش اُمیدوں کا سہارا لے کر کی تھی۔ مریم—

مریم : خدا کے لیے حضور چپ رہیے— نشہ دولت کی بھٹی میں انسانیت کو نہ پگھلائیے— خودغرضی کے لیے شرافت فروخت نہ کیجیے۔

انور : میں ایسے گستاخانہ وعظ سننے کا عادی نہیں۔

مریم : لیکن سوچیے تو دنیا کیا کہے گی۔ لوگوں کی نظروں میں آپ کی کیا عزت ہوگی۔

انور : دنیا والے بکتے ہیں اور میں ان کی پرواہ نہیں کرتا— کسی کے کہنے سننے پر میں اپنی خواہشات کیوں قربان کردوں۔

مریم : لیکن حضور—

انور : خاموش رہو— آج شام—

مریم : تو یوں کہیے کہ اپنے احسانات کا بدلہ میری جوانی سے لینا چاہتے ہیں۔ اور ظلم کی تاریخ میں ایک اور باب کا اضافہ کرنا چاہتے ہیں— تا کہ جب انسانیت

اور مساوات کا دور آئے تو دنیا آپ اور آپ کی نسل پر لعنت بھیجے— آپ دمہ کے بیمار ہیں اور موت کے قریب۔ لیکن آپ اپنی ہڈیوں میں مجھے جکڑنا چاہتے ہیں۔

انور : خاموش رہو۔ میں اس قسم کی باتیں سننے کا عادی نہیں— (زور دار کھانسی کا دورہ پڑتا ہے۔ دورہ ختم ہونے کے بعد اٹھتے ہوئے دروازہ کے پاس جاکر) آج شام— مریم—

(کمرہ سے نکل جاتے ہیں۔ مریم ایک صوفے پر گرکر رونے لگتی ہے۔ کچھ دیر بعد ثروت داخل ہوتا ہے اور مریم کو روتے دیکھ کر)

ثروت : کیا بات ہے مریم— (مریم نظریں اٹھا کر ثروت کو دیکھتی ہے) میں ان آنکھوں میں آنسو دیکھنے کے لیے نہیں، مسکراہٹ دیکھنے کے لیے زندہ ہوں۔

مریم : (ٹھنڈی سانس بھر کر) ان آنکھوں کی مسکراہٹ ایک جوانی کا خواب تھا جس کا طلسم اب ٹوٹ چکا ہے۔

ثروت : (کھڑکی سے باہر اشارہ کرکے) ان سوکھے درختوں کو دیکھو کبھی ان میں بہاریں تھیں اب خزاں کا دور ہے۔ پھر ایک بار بہاریں آئیں گی۔

مریم : خدا را ان درختوں کا ذکر نہ کیجیے۔ جن سوکھے درختوں کی ہوس نے مجھے جلا کر خاکستر کردیا ہے۔ (مریم پھر ہچکیوں سے رونے لگتی ہے۔ ثروت کچھ دیر خاموش کھڑا رہتا ہے پھر اس کے قریب جاکر اس کے چہرہ سے دوپٹا ہٹا کر)

ثروت : کیا بات ہے مریم! تم اس قدر پریشان کیوں ہو— کیا بات ہے آخر کچھ کہوگی بھی یا نہیں۔

مریم : سوکھے درختوں میں پھر بہار آرہی ہے۔ مردہ جسم میں پھر جوانی کی لہر ہے۔ پھر دولت اور احسان جوانی کی بھینٹ چاہتا ہے۔

ثروت : (پریشان ہوکر) مریم— میں کچھ نہیں سمجھا۔ کیا مقصد ہے تمھارا۔

مریم : (ٹھنڈی سانس بھر کر) اب سمجھنے کی ضرورت بھی نہیں۔ جو کچھ ہونا تھا وہ ہو چکا۔

ثروت : آخر کچھ کہو بھی تو— میں تمھارا مقصد نہیں سمجھا۔

مریم : (ہچکیوں سے روتے ہوئے) حضور کی رگوں میں پھر جوانی مچل رہی ہے وہ— وہ— مجھے—

ثروت : (چیخ کر) مریم خاموش رہو— ایسا ہرگز نہیں ہوسکتا— میں ایسا ہرگز نہیں ہونے دوں گا— (ٹھنڈی سانس بھر کر) مریم! میں یہاں ہمیشہ ایک توقع لے کر آتا تھا ایک اُمید کا سہارا لے کر— خوابوں کی ایک دنیا آباد کرتا ہوا۔ میں سوچا کرتا تھا کہ مریم ایک روز میری ہوگی۔ میں ایک حسین اور خوبصورت مکان بناؤں گا— جس میں مختصر مگر تمام ضروری سامان ہوگا۔ ایک چھوٹا سا پارک ہوگا۔

مریم : لیکن اب یہ کچھ نہیں ہوسکتا۔

ثروت : یہ ضرور ہوکر رہے گا۔

مریم : آپ مجھ سے ایک وعدہ کیجیے۔

ثروت : میں نے اپنی زندگی میں ہمیشہ وعدے کیے ہیں مگر اب کوئی وعدہ نہیں کرسکتا— اب میں نے جو ارادہ کیا ہے وہ ہوکر رہے گا۔

مریم : مگر— دیکھیے تو—

ثروت : نہیں کچھ نہیں— مجھے بہکانے کی کوشش نہ کرو۔

(جمیل گھبرایا ہوا داخل ہوتا ہے)

جمیل : غضب ہوگیا ثروت۔

ثروت : کیا بات ہے— کیا غضب ہوگیا— غضب تو اب ہوگا۔

جمیل : (گھبرا کر) ابھی حضور مکان کے بالائی حصہ پر چڑھ رہے تھے زینہ پر انھیں دورہ پڑ گیا اور وہ نیچے گرے— میرا خیال ہے— شاید وہ—

(ثروت جمیل کو غور سے دیکھتا ہے اور پھر طنزیہ مسکرا کر)

ثروت : تو سوکھے درختوں میں بہار نہیں آئی۔

(جمیل حیرت سے ثروت کا چہرہ دیکھتا ہے)

(پردہ)

(1946)

طنزیہ ڈرامے

حیوان

افرادِ تمثیل

(1) شمیم (ایک نوجوان) (2) غزل (شمیم کی دوست) (3) ارمان (شمیم کا دوست) (4) صوفیہ (ارمان کی بیوی)

منظر

ارمان کے مکان کا ایک سجا ہوا کمرہ۔ جس میں ہر چیز قیمتی اور موجودہ فیشن کے مطابق ہے۔ سجاوٹ میں خوش ذوقی کا ثبوت دیا گیا ہے۔

رات کے آٹھ ساڑھے آٹھ بجے ہیں۔ ارمان خاموش بیٹھا ایک کتاب دیکھ رہا ہے کہ شمیم کمرے میں داخل ہوتا ہے ارمان شمیم کو دیکھ کر۔

ارمان: آؤ شمیم بیٹھو۔ بہت دیر سے آئے۔ تمھارا ہی انتظار کر رہا تھا۔

(شمیم ایک صوفے پر بیٹھ جاتا ہے۔ ارمان شمیم کو دیکھ کر)

ارمان: ابھی سیٹھ جھک جھک مل آیا تھا۔ (شمیم سگریٹ جلا کر ایک لمبا سا کش لیتا ہے اور سوالیہ نظروں سے ارمان کو دیکھتا ہے) دو ہزار روپے دے گیا ہے۔

شمیم: دو ہزار! کیسے دو ہزار؟

ارمان: (مسکرا کر) رشوت کے (طنزیہ) کیا تم سمجھتے ہو کہ وہ اپنی لڑکی کی شادی تمھارے ساتھ رچا رہا ہے کہ جہیز میں روپیہ دے گا۔

شمیم: مگر ارمان۔

ارمان: اور اُس نے تمھاری پارٹی والوں کو پہلے ہی رشوت دے دی ہے اس کے مل میں ہڑتال نہیں ہوگی سوائے اس کے کہ تم اپنے دو ہزار بھی کھو دو۔

شمیم: مگر دو ہزار تو۔

ارمان: ویسے بھاگتے بھوت کی لنگوٹی کافی ہوتی ہے (مسکرا کر) اُس نے ہڑتال کی تاریخ گزر جانے پر کچھ اور نذرانہ دینے کا بھی وعدہ کیا ہے (کچھ دیر خاموش رہ کر) اس روپے کو تم اپنے پاس رکھو جو نذرانہ ملے گا۔ وہ میرا کمیشن ہوگا (شمیم خاموش رہتا ہے) غزل کہاں ہے؟

شمیم: میں اسے کلب میں چھوڑ آیا تھا۔ دیکھو کب تک واپس آتی ہے۔

ارمان: غزل (مسکرا کر) اس کا باپ کوئی شاعر واعر ہے جو ایسا نام رکھا ہے۔

شمیم: (مسکرا کر) نام تو اس کا غزالہ ہے مگر میں محبت سے اسے غزل کہتا ہوں اور اسے بھی یہ نام پسند ہے۔

ارمان: (ہنس کر) اب اگر کوئی لڑکی تمھاری محبت کا دم بھرے تو اس کا نام مرثیہ خانم رکھ دینا (شرارت سے مسکرا کر) مگر تم نے اس کو ہتھیا کہاں سے لیا۔

شمیم: بہت پرانی دوستی ہے۔ مجھے اس کی آوارہ مزاجی پسند ہے۔

ارمان: آوارہ مزاجی! تمھیں بھی واہیات باتیں کرنے میں مزہ آتا ہے۔

شمیم: واہیات باتیں نہیں ہیں حقیقت ہے (مسکرا کر) اس قدر حقیقت پسند ہے کہ اپنی آوارگی کی ہر داستان مجھے آ کر سنا دیتی ہے۔

ارمان: اور تم۔

شمیم: میں مزے لے کر سنتا ہوں اور جب وہ کسی موٹے آدمی کو پھانستی ہے تو اپنی

محبت کا واسطہ دے کر اپنا کوئی الو بھی سیدھا کر لیتا ہوں۔

ارمان: (مسکرا کر) اور اس راز کا انکشاف آج کر رہے ہو۔

شمیم: تم جیسے گرگ باراں دیدہ سے کچھ کہنا سقراط کو فلسفے پر لیکچر دینا ہے۔

ارمان: کیا تم اس سے محبت کرتے ہو۔

شمیم: نہ میں اس سے محبت کرتا ہوں اور نہ وہ مجھ سے دونوں اپنا اپنا مطلب پورا کرتے ہیں (ہنس کر) مجھے اس سے صرف اس قدر محبت ہے کہ جب وہ اپنی آوارگی سے تھک جاتی ہے تو میرے پاس ستانے کے لیے آجاتی ہے۔

ارمان: اور ہم آج تک تکلف ہی میں انتقال فرماتے رہے ہیں۔

شمیم: خدا تمھیں غریق رحمت فرماتا رہے۔ بھابھی صوفیہ کہاں ہیں۔

ارمان: اپنی ایک سہیلی کے ساتھ کلب گئی ہیں۔

شمیم: اور تم۔

ارمان: میں (مسکرا کر) سیٹھ جھک جھک مل سے جھک جھک کرتا رہا۔ کمبخت پانچ سو سے آگے نہیں بڑھتا تھا۔ 'سیٹھ' کی قسمیں دیتا رہا۔

شمیم: (ہنس کر) قسموں کے لیے بھگوان کو کہاں چھپا آیا تھا۔

ارمان: (مسکرا کر) تجوری میں۔ کافی داؤ پیچ کے بعد کم بخت پھنسا ہے۔

(شمیم مسکراتا ہے اور صوفے کی پشت سے ٹیک لگا کر اطمینان سے سگریٹ کے کش لگانے لگتا ہے۔ ارمان اٹھ کر الماری کے پاس جاتا ہے۔ شراب کی بوتل اور گلاس لا کر میز پر رکھتا ہے کہ — پاس کی مسجد سے عشا کی نماز کے لیے اذان کی آواز آتی ہے۔ شمیم کان لگا کر سنتا ہے پھر مسکرا کر)

شمیم: مجھے بیر شرع سے کچھ نہیں مگر اس اتفاق کو کیا کہوں
کہ جو وقت بادہ نوشی کا ہے وہی عین وقت نماز ہے

ارمان: باموقع شعر پڑھنے میں حاکم ہو (گلاس میں شراب ڈالتے ہوئے)۔ کل رات کہاں غائب رہے تھے غزل تمھارے انتظار میں بے چین رہی۔

شیم: (مسکرا کر) شبنم کے ساتھ تھا۔ (شرارت سے مسکراتا ہے ارمان کی آنکھوں میں بھی شرارت آمیز مسکراہٹ آتی ہے اور اس کے لب ہلتے ہیں۔ شیم مسکرا کر اُس کے بولنے سے پہلے:

ذکرِ شبِ وصال ہو کیا قصہ مختصر
جس بات سے وہ ڈرتے تھے وہ بات ہوگئی

ارمان: خدا کی قسم؟ بڑے موذی کو مارا۔ شبنم چالاک بلی کی طرح دودھ پیتی رہی ہے۔

شیم: اور جہاں بس نہیں چلا وہاں دودھ پھینکتی رہی ہے۔ روفی کو کس قدر بدنام کیا۔ بیچارہ اپنی نیک نیتی میں مارا گیا۔

(صوفیہ داخل ہوتی ہے اس نے شراب پی رکھی تھی ہلکا ہلکا نشہ ہے آنکھوں میں سرخ ڈورے ہیں چال سے شرابی کیفیت ظاہر ہورہی ہے۔ بسنتی ساڑی اور اسی رنگ کا بلاؤز پہنے ہے۔ ملیح رنگ ہے۔ قد اور جسم غیر معمولی تناسب ہیں جس سے دلکشی بہت زیادہ ہوگئی ہے دونوں کے قریب آکر مسکرا کر)

صوفیہ: شیم! آج تم دن بھر کہاں غائب رہے بڑے لاپرواہ ہو۔

شیم: پارٹی آفس میں کام کرتا رہا۔

صوفیہ: غزل تمھارے لیے دن بھر بے چین رہی۔

ارمان: (مسکرا کر) اور تم نے دن میں کتنی مرتبہ شیم کو یاد کیا۔

صوفیہ: (الماری میں سے ایک اور گلاس لاتے ہوئے) غزل کی بے چینی مجھ سے دیکھی نہیں جارہی تھی (گلاس میں شراب لے کر ہلکا سا گھونٹ لے کر) غزل تم سے بہت محبت کرتی ہے۔

ارمان: (طنزیہ) اتنی ہی جتنی تم مجھ سے محبت کرتی ہو۔

صوفیہ: (اٹھلا کر) اور میں نے تم سے کب محبت نہیں کی (مسکرا کر) تم کو تو جلی کٹی سنانے میں مزہ آتا ہے۔ (ایک کرسی پر بیٹھ کر) جہاں تم نے دو گھونٹ پیے اور بہکنا شروع کیا۔

ارمان: (مسکرا کر) ہر سمجھ دار عورت اپنے شوہر کو عام طور پر بہکا ہوا ہی سمجھتی ہے۔

صوفیہ: (ہنس کر) کم سے کم تم نے آج میری سمجھ داری کا اعتراف کرلیا۔

ارمان: اور میں نے تمھاری نا سمجھی کا ایک اعلان کیا ہے۔

صوفیہ: ہر مرد اپنی بیوی کو نا سمجھ سمجھ کر بے وقوف بنانے کی کوشش کرتا ہے۔

شمیم: (مسکرا کر کھڑے ہوتے ہوئے) مہابھارت کی داغ بیل پڑ رہی ہے۔ اس لیے میں تو چل دیا۔

صوفیہ: (شمیم کا ہاتھ پکڑ کر بٹھلاتے ہوئے) بیٹھو (گلاس میں شراب بھرتے ہوئے) تم سے تو آج بہت سی باتیں کرنا ہیں۔ (شمیم بیٹھ جاتا ہے) آج کلب میں غزل تم سے علاحدہ علاحدہ کیوں رہی۔ کیا بات تھی؟

شمیم: (مسکرا کر شراب کا گھونٹ لے کر) تو آپ کلب میں تھیں (صوفیہ مسکرا کر اثبات میں سر ہلاتی ہے) یہ ہم دونوں کے راز ہیں آپ جان کر کیا کیجیے گا۔

صوفیہ: مگر تم دونوں تو آپس میں محبت کرتے ہو۔

شمیم: محبت کرنے سے نہ مجھے انکار ہے نہ اسے (شراب کا دوسرا گھونٹ لے کر) لیکن ہم دونوں میں جو معاہدہ ہے اس پر دونوں پوری طرح عمل کرتے ہیں۔

صوفیہ: معاہدہ! کیسا معاہدہ؟

شمیم: یہی کہ اگر— ہم میں سے کوئی کسی دوسرے سے وقتی طور پر محبت کرنے لگے تو اس پر ایک دوسرے کو اعتراض نہ ہوگا۔

(صوفیہ قہقہے لگاتی ہے شراب کا ایک گھونٹ لے کر ارمان کی طرف دیکھ کر مسکراتے ہوئے)

صوفیہ: کہو کرتے ہو ایسا معاہدہ۔

ارمان: (ہنس کر) اس کی کیا گارنٹی ہے کہ تم معاہدہ کی پابندی کروگی۔ (مسکرا کر) ہمیں معاہدہ میں تھوڑی سی تبدیلی کرنا پڑے گی۔

صوفیہ کیسی تبدیلی۔

ارمان: ہم دونوں شادی شدہ ہیں۔ اس لیے محبت کے بجائے ہمیں نکاح کا لفظ استعمال کرنا پڑے گا۔

صوفیہ: (ارمان کا چہرہ دیکھ کر) کس طرح۔

ارمان: یعنی اگر ہم میں سے کوئی وقتی طور پر کسی اور سے نکاح کرے تو ایک دوسرے کو اعتراض نہ ہوگا۔

(شمیم قہقہہ مار کر ہنستا ہے۔ صوفیہ مسکرا کر)

صوفیہ: لعنت ہے کس قدر واہیات خیال ہے۔ (شمیم کی طرف دیکھ کر) تم دونوں کا معاہدہ بھی عجیب ہے۔

شمیم: شادی بھی ایک معاہدہ ہے اور محبت بھی ایک معاہدہ اور پھر ہر معاہدے میں کچھ نہ کچھ شرائط تو ہوتی ہی ہیں۔ (شراب کا گھونٹ لے کر) صوفیہ بھابی آپ کو تعجب ہوگا کہ میری اس کی ملاقات پانچ سال سے ہے مگر میں نے آج تک اس کے جسم کو چھوا تک نہیں۔

صوفیہ: اب زیادہ افلاطونی باتیں نہ کرو۔

شمیم: یقین کیجیے۔ میں نے اس راز کو پالیا ہے کہ وہ مجھ سے جسمانی تعلق کی آرزومند ہے اور جس روز میں اس کمزوری کا شکار ہوا وہ اس طرح اڑ جائے گی جیسے پنجرہ کا پنچھی کھل جانے پر اڑ جاتا ہے۔

صوفیہ: (مسکرا کر) تم ننگے ہی نہیں بے حد چالاک بھی ہو۔ (شراب کا آخری گھونٹ لے کر گلاس رکھتی ہے اور کھڑی ہو کر دوسرے کمرے کی طرف جاتی ہے۔)

شمیم: ارے کہاں چلیں یہیں بیٹھیے نا۔

صوفیہ: آج بہت تھک گئی ہوں بیٹھا نہیں جا رہا ہے۔

(دوسرے کمرے میں چلی جاتی ہے۔ شمیم اور ارمان دونوں خاموشی سے اپنے اپنے گلاسوں کی شراب ختم کرتے ہیں۔ ارمان کھڑے ہو کر)

ارمان: وہ روپیہ ابھی لا دوں یا صبح لے لو گے۔

شمیم: ایسی کیا جلدی ہے صبح دے دینا۔ کہاں چل دیے بیٹھو۔

ارمان: تجوری کی چابیاں اٹھا لاؤں کہیں صوفیہ کے ہاتھ نہ پڑ جائیں۔

(دوسرے کمرے میں چلا جاتا ہے۔ شمیم گلاس میں اور شراب لیتا ہے اسے غور سے دیکھتا ہے۔ انگلیوں سے میز پر طبلہ بجاتا ہے۔ سگریٹ جلا کر اس کے لمبے لمبے کش لیتا ہے اور سیٹی سے کسی انگریزی گانے کی دھن بجاتا ہے کہ غزل کمرے میں آتی ہے اور شمیم کے پاس بیٹھ کر)۔

غزل: جہنمی، انتہائی کنجوس اور لومڑی کی طرح چالاک ہے۔ (شمیم غزل کو غور سے دیکھتا ہے۔ شراب کی وجہ سے غزل کی آنکھیں ادھ کھلی ہیں۔ چہرہ سرخ ہو رہا ہے۔ دو تین لٹیں چہرے پر جھول رہی ہیں۔ دلکشی صوفیہ سے زیادہ ہے۔ خاص طور پر جنسی کشش بے حد ہے۔ شمیم کو اس طرح اپنی طرف دیکھتے ہوئے آنکھیں جھپکا کر) میری طرف یوں کیوں گھور رہے ہو۔

شمیم: دیکھ رہا ہوں کہ شراب پی کر تو تم اور بھی قیامت ہو جاتی ہو۔

غزل: جہنمی میں تمھاری آنکھیں پھوڑ دوں گی۔

شمیم: تمھاری راہ میں بچھانے کے لیے ہیں (مسکرا کر) پھوڑ دو۔

غزل: خوشامد کرنے میں نمبر اوّل ہو۔ جہنمی کہیں کے۔

(نشہ کی وجہ سے آنکھیں بند ہونے لگتی ہیں)

شمیم: (مسکرا کر) شبستاں میں آئی کچھ اس ناز سے
کہ جیسے چمن میں بہار آگئی

(غزل مسکرا کر آنکھیں جھپکاتی ہے پھر ایک گلاس کی طرف اشارہ کر کے)

غزل: دو گھونٹ دینا۔ کم بخت سر پھٹا جا رہا ہے۔

شمیم: تم نے بہت زیادہ پی لی ہے۔ اب نہ پیو۔

غزل: (گلاس کی طرف ہاتھ بڑھا کر) اب نصیحت رہنے دو۔۔۔ اپنے ہاتھ سے گلاس میں شراب لینا چاہتی ہے۔ مگر ہاتھ قابو میں نہیں ہے۔ شمیم اس کے ہاتھ سے

بوتل لیتا ہے اور تھوڑی سی ایک گلاس میں ڈال دیتا ہے۔ غزل ایک ہی گھونٹ میں حلق سے اتار جاتی ہے اور سر کو اس طرح جھٹکا دیتی ہے جیسے سر کا بوجھ ابھی ابھی اُتارا ہو۔ (آنکھیں کوشش سے کھولتے ہوئے) جہنمی بے حد چالاک ہے۔

(پھر ایک دم قہقہہ مار کر ہنستی ہے۔ شیم حیرت سے اس کی طرف دیکھتا ہے)

شمیم: کیا بات ہے؟

غزل: مزہ آ گیا۔ اس کی بیوی نے جونہی مجھے اس کے ساتھ دیکھا ایسی جھپٹ کر آئی جیسے شیرنی شکار پر (پھر قہقہہ مار کر) وہ بیچارہ بھی اس کے پیچھے پیچھے اس طرح گیا جیسے پالتو کتا۔

شمیم: تو پھر اصل معاملے پر گفتگو نہیں ہوئی۔

غزل: ابھی نہیں۔

شمیم: غضب کر دیا۔ سارا بنا بنایا کھیل بگڑ جائے گا۔

غزل: خاک بگڑ جائے گا۔ اب تو کھیل بننے کا موقع آیا ہے۔ (آنکھیں جھپکا کر شمیم کو دیکھتے ہوئے) اس کی بیوی اس کی کمزوری ہے۔ میں اس سے پورا فائدہ اٹھاؤں گی۔

(شمیم ایک دیوار کو تاکنے لگتا ہے) شمیم! کیا سوچ رہے ہو۔

شمیم: کچھ نہیں۔

غزل: تمھاری یہ اداسی مجھے ایک نظر نہیں بھاتی۔ ایک دو گھونٹ اور پی لو۔ (شمیم خاموش رہتا ہے) لاؤ میں اپنے ہاتھ سے پلا دوں (کھڑی ہوتی ہے بوتل سے شراب گلاس میں سے گر جاتی ہے۔ گلاس شمیم کی طرف بڑھاتے ہوئے) بس لو۔ اللہ شافی کر کے پی جاؤ۔ (شمیم ہاتھ بڑھا کر گلاس لینا چاہتا ہے۔ غزل ہاتھ کھینچ کر) نہیں میں اپنے ہاتھ سے پلاؤں گی۔ (گلاس شمیم کے منہ سے لگانا چاہتی ہے۔ مگر لڑکھڑا کر شمیم کی گود میں گر جاتی ہے۔ (شراب اور

11A

گلاس فرش پر گر جاتے ہیں غزل شیم کے گلے میں ہاتھ ڈال کر) جی چاہتا ہے تمام زندگی یونہی تمھارے آغوش میں پڑی رہوں۔

شمیم: تم بہت جلد جذباتی ہو جاتی ہو۔

غزل: ہشت (شمیم کو اپنی طرف کھینچتے ہوئے) ڈیڈ اسٹون Dead Stone جہنمی۔

(غزل شمیم کا منہ چومنا چاہتی ہے شمیم اپنا منہ الگ کرتے ہوئے)۔

شمیم: مجھے یہ مذاق ہرگز پسند نہیں۔

غزل: مذاق!

شمیم: یہاں ارمان ہے اگر اس نے دیکھ لیا تو کیا کہے گا۔

غزل: دیکھ لینے دو۔ اوّل نمبر کا جہنمی ہے ننگا۔ صورت سے پارسا بنا پھرتا ہے۔

شمیم: نہ وہ صورت سے پارسا ہے نہ عمل سے۔

غزل: پھر تم نے اس سے دوستی کیوں کر رکھی ہے۔

شمیم: (غزل کو گود سے ہٹاتے ہوئے)۔ میں نے تو تم سے بھی دوستی کر رکھی ہے۔

غزل: بس دوستی! جہنمی کہیں کے۔ اور میں تم سے محبت کرتی ہوں۔

شمیم: مگر تم نے آج کم بخت کو ہاتھ سے برا چھوڑا۔

غزل: تم میرے معاملات میں دخل نہ دو ورنہ سر پھوڑ دوں گی۔

شمیم: تمھارے سر پھوڑنے سے پہلے ہی میرا سر پھوٹ جائے گا۔ اس سے وہ تحریر ہر قیمت پر حاصل کرنا ہے۔

غزل: ہو جائے گی تم اس قدر پریشان کیوں ہو۔

شمیم: تم نہیں سمجھتیں۔ اس سے میری پبلک لائف کا گہرا تعلق ہے میری کمزوری اس کے ہاتھ میں ہے۔

غزل: (قہقہہ مار کر) اور اس کی کمزوری میرے ہاتھ میں ہے۔

(قہقہے پر قہقہہ لگاتی ہے۔ ارمان واپس آتا ہے اور دونوں کو مسکرا کر دیکھتے ہوئے)۔

ارمان: یہ قہقہے کیوں لگائے جا رہے ہیں۔

غزل: اس کی کمزوری میرے ہاتھ میں ہے اور ان کی کمزوری اس کے ہاتھ میں۔ (قہقہہ لگاتی ہے۔ ارمان حیرت سے)

ارمان: کیا مطلب؟

شمیم: کچھ نہیں۔ غزل تو بہک گئی ہے۔

غزل: جہنمی، میں کبھی زندگی میں بہکی ہوں؟ دو چار بوتلیں اور بھی چڑھا جاؤں تب بھی نہیں بہک سکتی۔ (شمیم کی طرف اشارہ کر کے میں اس جہنمی کی طرح کم ظرف نہیں ہوں۔)

شمیم: اچھا اب تم جا کر آرام کرو۔

غزل: آرام نہیں۔

شمیم: مگر مجھے نیند آ رہی ہے۔

غزل: تو جاؤ جہنم میں۔ (ارمان کی طرف دیکھ کر) بزدل ہے ڈیڈ اسٹون۔ (شمیم مسکراتا ہے اور کھڑا ہو کر دوسرے کمرے کی طرف جاتا ہے) لعنت ہو تم پر کچھ دیر بھی میرے پاس نہیں بیٹھ سکتے کام دنیا بھر کے کرانا چاہتے ہو۔ یہ کر دو وہ کر دو۔ جہنمی۔ (شمیم کوئی جواب نہیں دیتا اور دوسرے کمرے میں چلا جاتا ہے۔ غزل ارمان کی طرف دیکھ کر) بیٹھو۔ کھڑے کیوں ہو۔ (ارمان غزل کے پاس صوفے پر بیٹھ جاتا ہے) یہ شمیم ہے نا انتہائی پاجی اور جہنمی، پانچ سال سے برابر دھوکے دے رہا ہے میں اس سے محبت کرتی ہوں اور یہ خاک مجھ سے محبت نہیں کرتا۔

ارمان: (مسکرا کر) بس تم برابر محبت کیے جاؤ ایک روز وہ بھی تم سے محبت کرنے لگے گا۔

غزل: خاک کرنے لگے گا۔ جہنمی۔ اوّل نمبر کا پاجی ہے۔ تمھیں نہیں معلوم مسٹر ارمان اس کی سب ترقی کے پیچھے کس کا ہاتھ ہے۔

ارمان: جانتا ہوں (مسکرا کر) تمھارا ہاتھ ہے۔

غزل: اور پھر وہ مجھ سے محبت نہیں کرتا۔ میں ایک روز اس کا سر پھوڑ دوں گی۔ مار ڈالوں گی۔ کل ہی مجھ سے روپیہ لے کر گیا اور سارا کا سارا شبنم پر خرچ کردیا۔ پاجی۔ جہنمی۔

ارمان: لیکن وہ تو کہہ رہا تھا کہ وہ تم سے محبت کرتا ہے۔

غزل: جھوٹ بولتا ہے (شراب کا ایک گھونٹ لے کر) جی چاہتا ہے اس کی ایک آنکھ پھوڑ دوں۔ (پھر خود ہی قہقہہ لگا کر ہنستی ہے) اس سے محبت کرنا چھوڑ دوں، مجھ سے کوئی بھی محبت کرسکتا ہے (زبان میں تھوڑی سی لڑکھڑاہٹ پیدا ہوتی ہے جیسے اب نشہ اس پر اثر کر رہا ہو۔ پھر ارمان کو نشیلی آنکھوں سے دیکھ کر) تم مجھ سے محبت کرسکتے ہو؟

ارمان: میں! مگر تم تو۔

غزل: میں شمیم کو گولی ماردوں گی۔ میں شراب پی کر کم ظرف نہیں بن جاتی۔ ذرا جلی کٹی کرنے لگتی ہوں اور وہ میرے غصے کو ہنس کر ٹال جاتا ہے— ننگا جہنمی۔ ہاں تو تم مجھ سے محبت کرسکتے ہو۔

ارمان: (شرارت سے مسکرا کر) میں ذرا شمیم سے رائے لے لوں۔

غزل: شمیم سے! وہ اول درجے کا پاجی اور مکار ہے۔ کیا تمھاری بیوی سے محبت کرنے کی اس نے تم سے رائے لی تھی۔ اس سے کیا رائے لو گے۔

ارمان: مگر وہ میرا دوست ہے۔ کہیں وہ برا نہ مان جائے۔

غزل: وہ کچھ نہیں کہے گا۔ اس نے مجھے کبھی کسی سے محبت کرنے کو منع نہیں کیا۔ میرا سر پھٹا جارہا ہے ایک گلاس شراب دینا (ارمان گلاس میں شراب بھر کر دیتا ہے غزل گلاس اپنے منہ تک لے جاتی ہے پھر ایک دم) نہیں پہلا گھونٹ تم پیو (گلاس ارمان کے منہ سے لگاتی ہے اور اس کی گود میں گرجاتی ہے۔ ارمان اس کے ہاتھ سے گلاس لے کر ایک گھونٹ پیتا ہے اور اپنی گود میں لیٹی

ہوئی غزل کے منہ سے گلاس لگا دیتا ہے۔ غزل ایک گھونٹ لے کر) شمیم
بالکل یونہی ہے جہنمی باجی۔ کیا میں حسین نہیں ہوں۔

ارمان: (مسکرا کر) کون کہتا ہے۔

غزل: شاید میں حسین نہیں ہوں۔ جب ہی تو شمیم مجھ سے محبت نہیں کرتا۔ اگر تم مجھ سے محبت کرنے لگو تو میں تمھارے لیے بھی وہی سب کچھ کر سکتی ہوں جو شمیم کے لیے کرتی رہی ہوں۔

(صوفیہ کمرے میں داخل ہوتی ہے اور ماحول سے بے خبر)

صوفیہ: کیوں جی یہ جھوٹ کب سے بولنے لگے؟

ارمان: کیسا جھوٹ؟

صوفیہ: مجھ سے تو کہہ رہے تھے کہ روپیہ نہیں ہے اب یہ تکیے کے نیچے دو ہزار کیسے رکھے ہیں۔

ارمان: وہ شمیم کا روپیہ ہے۔

صوفیہ: جھوٹ (قریب آتی ہے اور غزل کو ارمان کی گود میں دیکھ کر) یہ کیا ہو رہا ہے۔
(غزل مشکل سے ارمان کی گود سے اٹھتے ہوئے)

غزل: میں مسٹر ارمان سے محبت کر رہی ہوں۔

صوفیہ: باجی۔ کمینی۔ میرے ہی گھر میں میرے ہی شوہر سے محبت کر رہی ہے۔

غزل: (لڑکھڑاتی ہوئی زبان سے) تو کیا ہوا۔ تم بھی تو شمیم سے محبت کرتی ہو۔ وہ میرا ہے میرا۔

صوفیہ: کیا بک رہی ہے۔ میں تیرا سر پھوڑ دوں گی۔

غزل: اور میں تیرا۔ میں سب کچھ دیکھ چکی ہوں۔ مجھے سب معلوم ہے۔

صوفیہ: (غصہ سے کانپتے ہوئے) کیا دیکھ چکی۔ بدنیت۔

غزل: (لڑکھڑاتی آواز میں) جو کچھ پرسوں رات کو ہوا ہے۔

صوفیہ: پرسوں کیا ہوا ہے مکار۔ حرافہ۔

غزل: تم سمجھتی ہو کہ میں شراب کے نشہ میں دھت پڑی تھی۔ میں نے سب کچھ دیکھ لیا اور سن لیا ہے۔ تم دھیرے دھیرے کمرے میں آئیں اور— اور— (قہقہہ مار کر ہنستی ہے) اور کیا سب کچھ کہہ دوں (ارمان کی طرف دیکھ کر) تمھاری بیوی اول نمبر کی آوارہ ہے۔ جہنمی۔

صوفیہ: (غصہ سے کانپتے ہوئے) دیکھ۔ دیکھ۔ (مٹھیاں بند کر کے غزل کی طرف بڑھتے ہوئے) میں تیرا گلا گھونٹ دوں گی۔ پاجن۔

غزل: ننگی عورتوں کو اپنا ننگ پن چھپانا چاہیے۔ دوسروں کی طرف اشارے نہیں کرنا چاہئیں۔ میں مسٹر ارمان سے محبت کرنے لگی ہوں۔ تم جا کر شمیم سے محبت کرو ابھی ابھی کمرے میں آ گیا ہے۔

(صوفیہ غصہ سے بے قابو ہو کر غزل سے لپٹ جاتی ہے اور اُس کے بال پکڑ کر نوچتی ہے۔ ارمان صوفیہ کا ہاتھ پکڑ کر علاحدہ کرتے ہوئے)

ارمان: یہ کیا بدتمیزی ہے (صوفیہ سے) بے ہودہ۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ تم اور شمیم اس قدر آگے بڑھ سکتے ہو۔

صوفیہ: اور مجھے بھی نہیں معلوم تھا کہ تم اس قدر نیچے گر سکتے ہو کہ اپنی بیوی کے سامنے ہی۔

ارمان: صوفیہ! خاموش رہو۔ ایسا نہ ہو کہ—

صوفیہ: تم مجھے مار بیٹھو گے؟ (غزل کی طرف لپک کر) میں اس کتیا کی چمڑی ادھیڑ دوں گی۔ پاپن۔

(ارمان صوفیہ کو پکڑتے ہوئے)

ارمان: میں کہہ رہا ہوں کہ—

(صوفیہ کو دھکا دیتا ہے اور وہ ایک بے بس پرندے کی طرح ایک صوفے پر گر جاتی ہے۔ غزل قہقہہ لگاتی ہے اطمینان سے شراب کا گھونٹ لے کر اپنی ساڑی کا پلو کمر سے کستے ہوئے۔)

غزل: ہٹ جا ارمان۔ دیکھتی ہوں کہ کون کس کی چمڑی ادھیڑتا ہے۔ (صوفیہ شیرنی کی طرح پھرتی سے صوفے سے اٹھ کر مقابلے کے لیے تیار ہوجاتی ہے ارمان دونوں کے بیچ میں آکر)

ارمان: کیا بے ہودگی ہے۔ صوفیہ اپنے کمرے میں جاؤ۔

صوفیہ: (چیخ کر) نہیں تم ہٹ جاؤ یہ سمجھتی ہے کہ (شمیم دوسرے کمرے سے آکر)

شمیم: یہ کیا دھینگا مشتی ہے۔ ارے بھابی آپ——

غزل: (قہقہے لگا کر) بھابی۔ بھابی۔ پاجی۔ جہنمی ابھی تک بھابی تم سمجھتے ہو کہ میں نے کچھ نہیں دیکھا کچھ نہیں سنا۔ میں نشہ میں دھت پڑی تھی۔ (ہنس کر) جہنمی نکّے میں نے سب کچھ دیکھ اور سن لیا ہے۔

شمیم: کیا دیکھ اور سن لیا ہے۔

غزل: پرسوں کی بات۔ اب میں نے تم سے محبت کرنا چھوڑ دیا ہے۔ الو کے پٹھے۔

شمیم: (ہنس کر) غزل زیادہ پی گئی ہے۔

غزل: زیادہ پی گئی ہے! (ہنستی ہے) ابھی مجھ میں بہت ہوش ہے جہنمی میں جھوٹ بول سکتی ہوں تم کو دھوکا دے سکتی ہوں۔ تم بڑے جہاندیدہ سمجھتے ہو خود کو (طنزیہ مسکرا کر پرس اٹھا کر کھولتی اور اس میں سے ایک کاغذ نکال کر شمیم کو بتلا کر) یہی وہ کاغذ ہے جسے تم حاصل کرنا چاہتے تھے؟

شمیم: (کاغذ کی طرف دیکھ کر) لاؤ یہ کاغذ مجھے دو۔

غزل: (ہاتھ کھینچتے ہوئے) اب یہ کاغذ تم کو نہیں ملے گا۔

شمیم: مگر یہ کاغذ بہت اہم ہے۔

غزل: اسی لیے میں اسے اپنے پاس رکھوں گی (بکھرے بال برابر کرکے) اس جہنمی نے میرے جسم کو۔ اُف کس قدر درندہ تھا ظالم (بازو کی طرف اشارہ کرکے) میرے بازو اور گال کو دانتوں سے کاٹ لیا۔

شمیم: مگر یہ کاغذ۔

(آگے بڑھ کر چھینا چاہتا ہے۔ غزل پیچھے ہٹ کر)

غزل: شمیم مجھ سے دور رہنا ورنہ۔ (آنکھوں سے غصہ اور نفرت ظاہر ہوتی ہے) تم مجھ سے روپیہ لے کر شبنم پر خرچ کرو اور میں دیکھتی رہوں۔ تم میرے سامنے میرے کمرے میں (صوفیہ کی طرف اشارہ کرکے) اس ڈائن کے ساتھ رنگ رلیاں مناؤ اور میں دیکھتی رہوں۔ اب میں تمھیں تباہ کرکے دم لوں گی جب تم بالکل نکمے اور ہارے ہوئے جواری بن جاؤ گے تب مجھ سے سچی محبت کرنے لگو گے۔

شمیم: (ان باتوں پر دھیان نہ دے کر) کاغذ مجھے دو— ورنہ— (غزل کی طرف بڑھتا ہے۔ غزل پیچھے ہٹ کر)

غزل: شمیم مجھ سے دور رہنا یہ نہ سمجھنا کہ تم مرد ہو اور طاقتور (شمیم اس سے لپٹ کر کاغذ چھینا چاہتا ہے۔ غزل بری طرح اس کے ہاتھ میں کاٹ لیتی ہے شمیم گھبرا کر غزل کو چھوڑ دیتا ہے(مجھ سے دور رہو)۔

شمیم: (غصہ سے بے قابو ہوکر) میں کہتا ہوں یہ کاغذ مجھے دے دو۔ ورنہ (پھر غزل کی طرف بڑھتا ہے۔ ارمان دونوں کے بیچ میں آکر۔)

ارمان: شمیم تم حد سے بڑھتے جارہے ہو۔

شمیم: ارمان تم ہمارے بیچ میں نہ پڑو (ارمان کو دھکا دے کر غزل پر جھپٹتا ہے اور ایک زوردار طمانچہ غزل کے مارتے ہوئے) لاؤ کاغذ مجھے دو ورنہ— (پھر ہاتھ اٹھاتا ہے ارمان اس کا ہاتھ پکڑ لیتا ہے) ارمان! مجھے چھوڑ دو (دونوں میں جھوما جھٹکی ہونے لگتی ہے۔ صوفیہ بہت پھرتی سے غزل کے ہاتھ سے کاغذ چھین لیتی ہے۔ غزل اس کی طرف پلٹتی ہے مگر صوفیہ اس کے ٹکڑے ٹکڑے کردیتی ہے۔ ارمان اور شمیم دونوں حیرت سے دیکھتے ہیں۔ صوفیہ کاغذ کے پرزے کھڑکی سے باہر پھینکتے ہوئے شمیم کا ہاتھ پکڑ کر)

صوفیہ: آؤ شمیم۔ (اپنے کمرے کی طرف لے جاتے ہوئے) گولی مارو ان حیوانوں

کو (شمیم کو اپنے کمرے میں لے جاتی ہے اور کمرہ اندر سے بند کر لیتی ہے۔
ارمان اور غزل خاموش کھڑے رہ جاتے ہیں۔ چند منٹ بعد۔

غزل: جہنمی۔۔ (ارمان کے گلے میں باہیں ڈال کر) میں تم کو تنہا نہیں چھوڑوں گی۔
(مسکرا کر ارمان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر) میرے پیارے حیوان۔

(پردہ)

(مطبوعہ افکار کراچی، جون 1962)

بزدل

افرادِ تمثیل

(1) احمد (ایک بے کار نوجوان) (2) عذرا (احمد کی بیوی) (3) رقیہ بیگم (احمد کی والدہ) (4) عزیز (احمد کا دوست) (5) انیس احمد (ایک پرانے خیال کے باعزت شہری

منظر

ایک چھوٹا سا کمرہ جس میں پرانا فرنیچر ہے مگر صاف ستھرا ہے اور سلیقہ سے اس طرح سجایا گیا ہے کہ اندازہ ہوتا ہے کہ گھر کے لوگ سلیقہ مند ہیں۔ دیواروں پر جو تصاویر آویزاں ہیں اُن کی صفائی کا خاص طور پر خیال رکھا گیا ہے۔ کمرے میں پرانی دری کا فرش ہے جو جابجا شکستہ اور بوسیدہ ہے۔ کمرے کا مشرقی دروازہ بیرون مکان کھلتا ہے اور اس میں داخل ہوتے ہی نظر سامنے کی دیوار پر ایک تصویر پر پڑتی ہے جو احمد کی مرحوم بیوی کی ہے جس میں احمد کے چہرے پر خفیف مسکراہٹ اور اس کی بیوی کے چہرے پر شرم ہے اور نگاہیں جھکی ہوئی ہیں۔ تصویر شادی کے بعد کی ہے جس میں احمد کی بیوی عروسی لباس پہنے ہے۔ مشرقی دروازے کے دونوں جانب دو چھوٹی چھوٹی کھڑکیاں ہیں جن پر پردے

پڑے ہیں مگر دروازے پر پردے کے بجائے چق ہے۔

جنوبی دروازے سے ملی ہوئی ایک چھوٹی سی الماری رکھی ہوئی ہے، جس میں چند کتابیں سلیقے سے رکھی ہیں۔ الماری پرانی ہے جس کا ایک شیشہ پھوٹا ہوا ہے۔ الماری کے پاس ایک بہت پرانی وضع کی آرام کرسی اور اس کے سامنے ایک چھوٹی سی میز رکھی ہے۔ کرسی، میز اور الماری تینوں عرصے سے پالش سے محروم ہیں اور ان پر رگڑ کے بہت سے نشانات ہیں۔ شمالی مغربی کونے میں ایک پرانا صوفہ رکھا ہے جس کی پوشش میلی اور بوسیدہ ہے جس کو چھپانے کے لیے اس پر گدیاں رکھ دی گئی ہیں۔ اس کے پاس ہی ایک چھوٹی سی میز رکھی ہے۔ اس صوفے سیٹ سے ذرا ہٹ کر جنوبی دیوار میں ایک دروازہ ہے جو اندرون مکان کھلتا ہے جس پر ایک بوسیدہ سا پردہ پڑا ہے جس کی وجہ سے دوسرے کمرے کا کچھ نظر نہیں آتا۔ مغربی دیوار کے پاس احمد کی تصویر کے بالکل نیچے ایک چارپائی بچھی ہے جس پر صاف ستھرا بستر بچھا ہے۔

صبح کے تقریباً نو بجے ہیں مگر کھڑکیوں پر پردے پڑے ہیں۔ دروازے اور کھڑکیوں میں سے سورج کی شعاعیں چھن چھن کر آ رہی ہیں۔ کمرے میں عزیز ہیں۔ احمد کچھ دیر خاموش رہ کر سوچتے ہوئے۔

احمد: عزیز! ایسا محسوس ہوتا ہے کہ میں نے عذرا سے ایک رات صرف ایک رات کے لیے نکاح کیا تھا۔

عزیز: (حیرت سے) ایک رات! لیکن تم تو کالج کے زمانے سے اسے چاہتے ہو۔

احمد: ہاں — (سگریٹ کا لمبا کش لے کر دھواں اس طرح ہوا میں چھوڑتا ہے جیسے اپنے خیالات کو جمع کر رہا ہو۔ پھر سوچتے ہوئے) مگر میں محسوس کرتا ہوں جیسے میری مرحوم بیوی کی روح اس گھر کے تمام ماحول پر چھائی ہوئی ہے۔ اور وہ بھی —

(دیوار پر لگی ہوئی تصویر کو دیکھ کر خاموش ہو جاتا ہے۔ عزیز چند سیکنڈ سوالیہ نظروں سے احمد کو دیکھتا رہتا ہے مگر اسے قطعی خاموش پا کر)۔

عزیز: کیا عذرا تم سے محبت نہیں کرتی۔

احمد: کرتی ہے اور اپنے فرائض کو بھی پوری طرح انجام دیتی ہے مگر کوئی کسک اس کے دل میں ہے جس نے اس کو نڈھال کر دیا ہے۔

عزیز: شاید وہ محسوس کرتی ہے کہ تم—

احمد: (بات کاٹ کر) میں نے محسوس کیا ہے کہ اس کا مرحوم شوہر اس کی پوری شخصیت پر غالب آچکا ہے۔ اس کے لباس کا انتخاب، رنگوں کی پسند کرے کی سجاوٹ یہاں تک کہ خیالات— اس کے پہلے شوہر کی شخصیت مجھے شکست دینے پر تلی ہوئی ہے۔ (دونوں خاموش ہو جاتے ہیں کچھ دیر بعد احمد بلند آواز سے) عذرا۔ عذرا۔

عذرا: (کمرے میں داخل ہو کر) جی۔

احمد: ارے بھئی چائے تیار ہوئی یا نہیں۔

عذرا: تیار ہوگئی ہے لا رہی ہوں۔ (واپس چلی جاتی ہے کچھ دیر بعد پھر واپس آتی ہے۔ کشتی میز پر رکھ کر چائے بناتے ہوئے) عزیز صاحب! اس مرتبہ تو بہت دن میں تشریف لائے۔

عزیز: بزنس کے سلسلے میں باہر گیا ہوا تھا۔ کل ہی واپس آیا ہوں۔ (عذرا چائے کی پیالی اس کی طرف بڑھاتی ہے۔ چائے کی پیالی لیتے ہوئے) آپ کو میری وجہ سے بہت تکلیف ہوتی ہے۔

عذرا: تکلیف کیسی۔

عزیز: (مسکرا کر) یہی کہ اب بے وقت آپ کو چولھے کے پاس جانا پڑا۔

عذرا: کہاں کا جرم ہو گیا (مسکرا کر دوسری پیالی احمد کو دیتے ہوئے)۔ چائے بنانے میں کتنا وقت صرف ہوتا ہے۔ (ایک کرسی پر بیٹھ کر خود بھی چائے پیتے ہوئے)۔ آپ کی والدہ تو خیریت سے ہیں۔

عزیز: جی ہاں خدا کا شکر ہے۔ آپ تشریف ہی نہیں لائیں۔ وہ تو اکثر آپ کو یاد

کرتی رہتی ہیں۔

عذرا: کیا عرض کروں۔ مصروف رہتی ہوں بشرطِ فرصت ضرور حاضر ہو جاؤں گی۔

عزیز: (مسکرا کر) ٹالنے کے لیے لوگ اکثر فرصت نہ ہونے کا بہانہ کرہی دیتے ہیں۔

عذرا: بہانہ تو میں نہیں کررہی ہوں۔ اب اگر آپ بہانا سمجھتے ہیں تو میں کیا عرض کروں۔ (بات ٹالنے کے انداز میں) اور ہاں آپ کی شادی کا کیا ہوا۔

عزیز: شادی وادی کیسی بس امی کی خواہش ہے کہ وہ اس فرض سے سبکدوش ہوجائیں۔ ویسے مجھے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔

عذرا: دلچسپی۔۔۔ (مسکرا کر) کیا لڑکی پسند نہیں ہے۔

عزیز: (طنزیہ مسکرا کر) لڑکی پسند کرنے والا میں کون ہوتا ہوں یہ حق تو امی نے اپنے لیے محفوظ کرلیا ہے۔

عذرا: (مسکرا کر) پھر تو وہ کافی دوراندیشی سے کام لے رہی ہیں۔

عزیز: آپ کیا اس سلسلے میں بھی ان کی ہم خیال ہیں۔

احمد: جی ہاں۔۔۔ عذرا اور امی تو وقت کے تیز رفتار گھوڑے کی باگیں کھینچے رہنا چاہتی ہیں۔

عذرا: (مسکرا کر) ہم گھوڑے کو بے قابو کر دینا نہیں چاہتے۔ سرپٹ دوڑتا ہوا گھوڑا اکثر ٹھوکر کھا جاتا ہے۔

احمد: اور بحث میں کوئی تم سے جیت نہیں سکتا۔ دلیلوں کا جواب تم آنسوؤں سے جو دیتی ہو۔

عزیز: اماں چھوڑو اس واہیات بحث کو۔ بہرحال ابھی تو میں اس شادی وادی کو ٹال رہا ہوں۔

(عذرا کوئی جواب نہیں دیتی۔ خاموشی سے چائے کے برتن اٹھا کر چلی جاتی ہے۔ احمد چند سکنڈ خاموش رہ کر)

احمد: دیکھا تم نے کس قدر بدل گئی ہے ایک زمانہ وہ تھا کہ سارے پرانے رسم و رواج

ختم کر دینا چاہتی تھی اور آج اڑتے ہوئے وقت کے پر کاٹنا چاہتی ہے۔

عزیز: انسان کو بدلتے دیر نہیں لگتی۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ اب اس گھر میں آ کر مجھے ایک نئے ماحول کا احساس ہوتا ہے جو مرحوم بھابی کے زمانے سے بالکل مختلف ہے شاید تم نے عذرا کو سمجھنے میں غلطی کی تھی۔

احمد: نہیں میں نے کوئی غلطی نہیں کی تھی یہ تو سب اس کی بعد کی ٹریننگ کا نتیجہ ہے جو اس نے تین سال تک اپنے مرحوم شوہر سے لی ہے۔

عزیز: چھوڑو— یہ فضول باتیں ہیں اس سے زندگی اور تلخ ہوتی ہے تمھاری ناکام زندگی کا مجھے بھی افسوس ہے بہرحال اب جو کچھ ہے اسے نبھانا پڑے گا۔

احمد: کیا خاک نبھانا پڑے گا۔ اسے میرے دوستوں سے چڑ ہے بالخصوص تم سے۔

عزیز: چھوڑو— (طنزیہ) میں خود ایسا کہاں کا اچھا ہوں۔ پھر بھی اس گھر میں داخل ہوتے ہی مرحوم بھابی کی یادستاتی ضرور ہے۔

احمد: مجھے عذرا کے رویہ کا افسوس ہے اس کی طرف سے میں معذرت خواہ ہوں۔

عزیز: کیسی باتیں کرتے ہو بھئی یہ تو اپنا اپنا نصیب ہے ہم تو ازل ہی سے ان کے دشمن ہیں (کھڑے ہوکر) اچھا بھئی چلتا ہوں اب کب ملاقات ہوگی۔

احمد: شام ہی کو اس سے ملنے آؤں گا۔

عزیز: اچھا تو شام کو چھ بجے میں گھر پر تمھارا انتظار کروں گا۔

(عزیز چلا جاتا ہے۔ احمد سگریٹ کے کش لگانے لگتا ہے۔ کچھ دیر بعد عذرا پان لے کر آتی ہے پھر حیرت سے)

عذرا: عزیز صاحب گئے۔ میں تو اُن کے لیے پان لائی تھی۔

احمد: (طنزیہ) اس قدر جلدی اس تکلیف کی کیا ضرورت تھی وہ تو آپ کی خوش اخلاقی کا ویسے ہی قائل ہے۔

عذرا: ایسی دیر بھی کہاں کی ہوئی ہے زیادہ سے زیادہ دو منٹ ہوئے ہوں گے (طنز کا جواب طنز سے دیتے ہوئے) میں دونوں ہاتھوں ہی سے کام کرتی ہوں۔

احمد: یہ تو میں بھی دیکھتا ہوں بدقسمت ہوں کہ آپ کے لیے کسی ملازمہ کا انتظام نہیں کرسکتا۔

عذرا: اور میں نے کب ملازمہ کی خواہش کی ہے۔ ویسے اگر آپ کو مجھے دکھ دینے میں مزہ آتا ہے تو جو آپ کا جی چاہے کہہ لیجیے۔

احمد: بھلا یہ کون سا طریقہ ہے کہ چائے لائی گئی پھر پان کے متعلق سوچا گیا۔ اصل بات تو یہ ہے کہ آپ کو میرے دوستوں ہی سے چڑ ہے (طنزیہ) ابھی عزیز آپ کی بہت تعریف کررہا تھا۔

عذرا: (حیرت سے طنزیہ) میری اور تعریف!

احمد: جی ہاں۔ آپ کے اخلاق کی آپ کی مروت کی۔

عذرا: اخلاق اور مروت — (احمد کو دیکھ کر) بداخلاقی کا اظہار تو میں نے کبھی نہیں کیا رہا مروت کا سوال تو ہر شخص کے ساتھ مروت برتنا بھی اچھا نہیں ہوتا اور کم ازکم آپ کے دوستوں میں عزیز صاحب مجھے بالکل پسند نہیں ہیں۔

احمد: اس لیے کہ وہ آپ کے ساتھ اخلاق سے پیش آتا ہے۔

عذرا: ان کے اخلاق میں مجھے بداخلاقی نظر آتی ہے ان کا ہمیشہ مجھے تحائف دینے کی کوشش کرنا پسند نہیں ہے۔

احمد: آپ کے اسی اخلاق کی تو وہ تعریف کررہا تھا۔ وہ کس قدر خلوص سے آپ کے لیے تحفے لاتا ہے اور آپ یوں ٹھکرا دیتی ہیں جیسے ان کی کوئی اہمیت ہی نہیں۔ اُسے ذلیل کرنے میں آپ کو مزہ آتا ہے۔

عذرا: جو خود ذلیل ہونے کی کوشش کرے اس کا کوئی علاج نہیں ہے۔

احمد: اسے صرف میرا خیال ہے۔ ورنہ وہ اس قدر گیا گزرا نہیں ہے کہ آپ کی خوشامد کرتا پھرے۔

عذرا: اپنے اور کس کس دوست کی بیوی کو وہ یوں تحائف دیتے پھرتے ہیں۔

احمد: (غصہ سے) مجھے جاسوسی میں مزہ نہیں آتا۔ آپ کو تو میرے دوست میرے

خیالات اور میری پسند سب ہی ناپسند ہیں۔

عذرا: میں آپ کی ہر پسند کا خیال رکھتی ہوں۔ آخر میری بھی کوئی پسند ہے۔

احمد: آپ کی ہر پسند آپ کے مرحوم شوہر کی پسند ہے یا پھر میری مرحوم بیوی کی۔ آپ اس طرح ایک تیر سے دو شکار مارنا چاہتی ہیں۔

(عذرا احمد کو دیکھتی ہے اور اس کی آنکھوں میں آنسو آجاتے ہیں اور ڈوپٹے کے پلو سے آنسو پونچھ کر آہستہ سے) کہتی ہے۔

عذرا: لیجیے آپ تو پان کھا لیجیے۔

(احمد نظریں اٹھا کر عذرا کو دیکھتا ہے پھر آنکھوں میں آنسو دیکھ کر غصہ سے)۔

احمد: مجھے یہ ٹسوے بہانا بالکل پسند نہیں ہے۔

(اٹھ کر دروازے کی طرف جاتا ہے۔ اسی وقت احمد کی والدہ رقیہ بیگم داخل ہوتی ہیں اور احمد کو دیکھ کر)

رقیہ بیگم: کہاں جارہا ہے؟ عزیز چلا گیا؟

احمد: (غصہ سے) جی ہاں چلا گیا۔ آپ کی بہو کے اخلاق سے بے حد متاثر ہوا۔ دوسرے کمرے میں چلا جاتا ہے۔ رقیہ بیگم عذرا کی آنکھوں میں آنسو دیکھ کر)۔

رقیہ بیگم: کیا بات ہے بیٹی— کیا پھر کوئی جھگڑا ہوگیا۔

عذرا: جی جھگڑا تو کوئی نہیں ہوا۔

رقیہ بیگم: پھر رو کیوں رہی ہو؟ (عذرا خاموش رہتی ہے محبت کے لہجے میں سمجھانے کے انداز میں) اپنی پہلی بیوی کے مرنے سے احمد بالکل پاگل سا ہوگیا ہے۔ وہ اُسے بھلانے کی کوشش کرتا ہے مگر اس کی یاد— بیٹی تو ہی کوشش کر کہ وہ اس کو بھول جائے۔

عذرا: امی! میں تو برابر کوشش کرتی ہوں مگر اس گھر کے ماحول پر ان کی مرحوم بیوی کی حکومت ہے وہ شاید اس کو کبھی نہ بھول سکیں گے۔

رقیہ بیگم: یہ بات نہیں ہے بیٹی۔ وہ آج کل مالی پریشانیوں میں مبتلا ہے اس لیے کبھی

کبھی اس میں جھنجھلاہٹ پیدا ہو جاتی ہے اس کا خیال رکھا کر۔

عذرا: میں تو برابر کوشش کرتی ہوں مگر— (خاموش ہو جاتی ہے اور دوپٹے کے پلو سے آنسو پونچھنے لگتی ہے۔ کچھ دیر خاموش رہ کر) اسی لیے میں نے یہ نوکری کر لی ہے کہ ان کا ہاتھ بٹا سکوں مگر وہ اسے پسند نہیں کرتے۔

رقیہ بیگم: تیرا نوکری کرنا مجھے بھی پسند نہیں بیٹی— ہمارے خاندان میں عورتوں نے کبھی نوکری نہیں کی۔ زمانہ کیا کہتا ہوگا۔

عذرا: زمانہ کیا کہے گا امی— ہر شخص اپنی فکر میں مبتلا ہے دوسروں کو دیکھنے کی اسے فرصت ہی کہاں ہے۔

رقیہ بیگم: پھر بھی بیٹی— ہمارے گھر کی بہو یوں ماری ماری پھرے مجھے تو بالکل پسند نہیں۔

عذرا: لیکن میں جس بچی کو پڑھاتی ہوں وہ بڑا شریف گھرانہ ہے امی۔

رقیہ: تو نوکری تو نوکری ہی ہے بیٹی— چاہے وہ کسی دفتر کی ہو چاہے کسی شریف گھرانے میں بچیوں کے پڑھانے کی۔

عذرا: امی! آج کل تو اچھے اچھے گھرانے کی عورتیں نوکریاں کر رہی ہیں۔ اب یہ کوئی بری چیز تو نہیں رہی ہے۔

رقیہ بیگم: اچھے گھرانے برے گھرانے بن چکے ہیں بیٹی۔ (کچھ دیر خاموش رہ کر) احمد۔ ارے احمد (احمد کمرے میں آتا ہے اور خاموشی سے ایک کرسی پر بیٹھ جاتا ہے) دیکھ احمد— تو بہو کو بہت دکھ دینے لگا ہے مجھے یہ پسند نہیں ہے۔

احمد: مگر امی۔ جانے کیوں مجھے اب اس گھر کی ہر چیز بری معلوم ہوتی ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے اس گھر کا ماحول مجھے کھانے کو دوڑ رہا ہے۔

رقیہ بیگم: کچھ بھی ہو۔ (پرعزم لہجے میں) اگر بہو کو ذرا بھی تکلیف ہوئی تو یاد رکھنا میں دودھ نہیں بخشوں گی۔

عذرا: (گھبرا کر) امی! آپ کیا کہہ رہی ہیں۔

رقیہ بیگم: میں سیدانی ہوں اور اس کو بہو نہیں بیٹی کہہ کر گھر میں لائی ہوں۔ سمجھا— اگر

اس کو دکھ پہنچا تو یاد رکھ اپنی ماں کی بدعا تجھے لگے گی۔

احمد: (گھبرا کر) امی—

(رقیہ بیگم تیز تیز قدموں سے چلی جاتی ہے احمد خاموش کرسی پر بیٹھا خلا میں گھورتا رہتا ہے اُس کے چہرے سے پریشانی اور نا اُمیدی کے آثار ظاہر ہوتے ہیں۔ عذرا کچھ دیر خاموش رہ کر)

عذرا: آپ کو امی کی باتوں پر دھیان نہیں دینا چاہیے وہ آپ سے بہت محبت کرتی ہیں۔

احمد: ہاں وہ مجھ سے بہت محبت کرتی تھیں۔ مگر اب ان کی ساری محبت کو تم نے چھین لیا ہے۔

عذرا: (تعجب سے) میں نے!

احمد: ہاں تم نے۔ (آنکھوں میں آنسو بھر کر) انھوں نے ایسی سخت باتیں زندگی بھر مجھ سے نہیں کہیں۔ تمھارے آتے ہی جیسے اس گھر میں بھونچال آ گیا ہے۔ سکون تو جیسے اس گھر سے رخصت ہوگیا۔

عذرا: اگر میں اتنی ہی بری تھی تو مجھے اس گھر میں لانے کی کیا ضرورت تھی—

احمد: مجھے کیا پتا تھا کہ اب تم کالج والی عذرا نہیں جس کو میں نے ہمیشہ پسند کیا تھا ہمیشہ چاہا تھا اب تم کوئی دوسری عذرا ہو جس سے میں کبھی واقف نہیں تھا۔ جس میں نہ پہلا سا خلوص ہے۔ نہ پیار۔ تم بالکل بدل گئی ہو عذرا۔

عذرا: میں تو نہیں بدلی ہوں آپ بدل گئے ہیں۔ آپ کو میری ہر چیز ناپسند ہے۔ میرا لباس، میری پسند، میرے خیالات اور میرا اندازِ فکر (کسی قدر غصہ مگر نااُمیدی کے لہجے میں) ابھی تک آپ پر آپ کی مرحوم بیوی کی حکومت ہے۔

احمد: اور تم پر تمھارے مرحوم شوہر کی۔ تمھارے خیالات کو اُس نے بالکل بدل ڈالا ہے۔

عذرا: (آنکھوں میں آنسو بھر کر) آپ کو مجھ سے اس قدر نفرت ہے مجھے اس کا علم نہیں تھا۔ اگر شرفا میں طلاق کوئی معیوب بات نہ ہوتی تو اس کا حل—

احمد: (بات کاٹ کر) عذرا— مجھے اس قدر ضیق نہ کر کہ میں خودکشی کرلوں۔ تمھاری نوکری نے میرے خاندانی وقار کو ویسے ہی ٹھیس پہنچائی ہے اب طلاق کا نام لے کر۔ مجھے رذیلوں اور کمینوں کی صف میں نہ کھڑا کرو۔

عذرا: وہ تو میں پہلے ہی جانتی تھی کہ آپ کو میرا نوکری کرنا پسند نہیں ہے۔ (غصہ سے کھڑے ہوکر) مگر میری نوکری اس سے کہیں زیادہ باعزت ہے کہ میں آپ کے عزیز صاحب جیسے دوست کے تحفے قبول کروں۔

احمد: عذرا— عزیز پر مجھے پورا اعتماد ہے۔

عذرا: آپ کو اعتماد ہوگا مگر مجھے نہیں۔ مجھے ان کی شرافت اور کردار پر ہمیشہ شک رہا ہے اور آج سے نہیں کالج کے زمانے سے۔ آپ کی پہلی شادی ہوجانے کے بعد انھوں نے مجھے جس طرح پریشان کیا میری پہلی شادی ہوجانے کے بعد بھی وہ جس طرح میرے پیچھے پڑے رہے اُس کے سننے سے آپ کو کوئی خوشی نہیں ہوگی (غصہ سے) بہتر ہے کہ آپ انھیں یہاں آنے جانے سے روک دیں۔

احمد: یہ نہیں ہوسکتا عذرا۔ تم سے نکاح کرانے میں اس کا بڑا ہاتھ ہے وہ میرا محسن ہے اور میں اس کا قرض دار بھی ہوں۔

عذرا: پھر آپ کو مجھ سے کوئی شکایت نہیں ہونا چاہیے۔ میں جانتی ہوں کہ وہ میرے خلاف آپ کے کس طرح کان بھرتے رہتے ہیں۔ وہ آپ کی مرحوم بیوی کی آپ کے سامنے اس طرح تعریف کرتے رہتے ہیں کہ میں ہمیشہ آپ کے دل میں کانٹے کی طرح کھٹکتی رہوں۔

احمد: تمھیں عزیز سے نہیں میری مرحوم بیوی سے عداوت ہے اور کوئی بات نہیں۔

عذرا: اگر آپ یوں سمجھتے ہیں تو یونہی سہی (دروازے کی طرف جاتے ہوئے) اگر آپ نے ان کا آنا جانا بند نہیں کیا تو پھر میں خود ایک دن انھیں روک دوں گی پھر آپ کو شکایت نہیں ہونا چاہیے۔

احمد: یہ میرا گھر ہے میری پسند ہے کہ کون آئے اور کون نہیں۔ تم کو اس میں دخل دینے کی ضرورت نہیں۔

عذرا: بالکل ہے۔ لچے اور لفنگوں کے لیے یہاں کوئی جگہ نہیں ہے۔

احمد: (غصہ سے) عذرا خاموش رہو۔ کیا تم اپنے پہلے شوہر کے دوستوں کو بھی لچے اور لفنگے کہا کرتی تھیں۔

عذرا: کبھی نہیں۔ لیکن کیا آپ کی مرحوم بیوی نے کبھی ایسے لوگوں کے لیے اپنے گھر کے دروازے بند نہیں کیے۔

احمد: عذرا، تم نے میری مرحوم بیوی کے متعلق ایک لفظ بھی کہا تو مجھ سے برا کوئی نہ ہوگا۔ وہ تمھاری طرح پچاس ساٹھ روپے کے لیے ماری ماری نہیں پھرتی تھی۔

عذرا: (غصہ اور نفرت سے) ایسا نہ ہو کہ میں آپ کی بیوی کے متعلق کوئی ایسی بات کہہ دوں جس سے اس کو تکلیف ہو۔

احمد: تم اس کے متعلق کہہ بھی کیا سکتی ہو۔

عذرا: یہ کہ عزت محنت کی کمائی میں ہے گھر پر بیٹھ کے تحفے قبول کرنے میں نہیں۔

احمد: (غصہ سے) عذرا! تم کمینہ پن کی حد تک بڑھ گئی ہو۔

عذرا: کمینہ پن!

(احمد کو تعجب سے چند سکنڈ دیکھتی ہے اور پھر بے اختیار ہچکیوں سے رونے لگتی ہے۔ چند سکنڈ روتی ہے اور پھر دروازے کی طرف بڑھتی ہے احمد خاموشی سے عذرا کو دیکھتا ہے۔ اس کے چہرے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ عذرا کے رونے سے متاثر ہوگیا ہے۔ ذرا ڈوپٹے سے آنسو پونچھتی ہے اور دروازے کے پاس پہنچ جاتی ہے۔ احمد ایک دم کچھ سوچ کر)۔

احمد: عذرا— (عذرا مڑ کر نہیں دیکھتی۔ احمد عذرا کے پاس جا کر اس کے دونوں بازو پکڑ کر) عذرا مجھے معاف کردو (ندامت کے لہجے میں) میں تم کو وہ محبت نہیں

دے سکا جو تم کو اپنے پہلے شوہر سے ملتی رہی ہے۔

عذرا: (ہچکیوں سے روتے ہوئے) اس میں آپ کا کیا قصور ہے۔ قصور میری اپنی قسمت کا ہے شاید میرے نصیب میں سکھ ہے ہی نہیں۔

(پھر دروازے کی طرف بڑھتی ہے۔ احمد اسے روکتے ہوئے)۔

احمد: عذرا سچ سچ میں شرمندہ ہوں۔ (اس کا ہاتھ پکڑ کر ایک کرسی پر بٹھلاتے ہوئے)۔ میں تم سے محبت کرتا ہوں عذرا مگر میں محسوس کرتا ہوں کہ میری زندگی میں جھنجھلاہٹ پیدا ہوگئی ہے (عذرا نے ڈوپٹے سے اس کے آنسو پونچھ کر) یہ جھنجھلاہٹ پہلے کبھی نہیں تھی۔

عذرا: (اپنی سسکیوں پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے)۔ مگر — مگر۔

احمد: (بات کاٹ کر) مجھے قربانیوں اور تمھارے احساسات کا علم ہے — میں —

(دروازے پر دستک) کون صاحب؟

آواز: انیس احمد۔

عذرا: (آہستہ سے) اوہ — انیس صاحب (جلدی سے آنسو پونچھ کر کھڑی ہوکر) آپ انھیں بلا لیجیے میں ابھی آتی ہوں۔

(دوسرے کمرے میں چلی جاتی ہے۔ احمد دروازے کے پاس جاکر دروازہ کھولتے ہوئے)۔

احمد: تشریف لایئے (انیس احمد اندر آتے ہیں۔ عمر پچاس سال سے زیادہ ہے۔ سفید فرنچ کٹ داڑھی ہے۔ سیاہ شیروانی پہنے ہیں آنکھوں پر سنہری فریم کا چشمہ ہے) معاف کیجیے گا۔ آپ کو دروازے پر بلا وجہ انتظار کرنا پڑا۔

انیس احمد: (مسکرا کر) واہ میاں۔ ہم پہلی مرتبہ آپ کے گھر آئے اور آپ نے شرمندہ کرنا شروع کردیا۔

احمد: (کرسی کی طرف اشارہ کرکے) تشریف رکھیے (کرسی پر بیٹھ جاتے ہیں)۔ فرمایئے۔ اس وقت کیسے تکلیف فرمائی۔

انیس احمد: میں نے تکلیف نہیں فرمائی بلکہ تم لوگوں کو تکلیف دینے آیا ہوں۔ (چند سیکنڈ خاموش رہ کر) عذرا بیٹی کہاں ہے۔

احمد: وہ اندر دوسرے کمرے میں ہے۔ بلاؤں— (پھر جواب کا انتظار کیے بغیر) عذرا— عذرا— انیس احمد صاحب آئے ہیں۔ (پھر انیس احمد صاحب سے مخاطب ہوکر) ہم لوگ ابھی آپ ہی کا ذکر کررہے تھے۔ کہیے رشیدہ تو اچھی ہے۔

انیس احمد: بالکل ٹھیک اور بھلی چنگی ہے (مسکرا کر) اسی کی ضد کی وجہ سے مجھے اس وقت یہاں آنا پڑا ہے۔ (عذرا کمرے میں آتی ہے صاف معلوم ہوتا ہے کہ اس نے منہ دھو لیا ہے مگر آنکھیں ابھی تک سرخ ہیں۔ کمرے میں داخل ہوکر انیس صاحب کو سلام کرتی ہے وہ مسکرا کر سلام کا جواب دے کر) کہو بیٹی خیریت تو ہے۔ (غور سے عذرا کو دیکھ کر) تمھاری آنکھیں سرخ کیوں ہورہی ہیں۔

عذرا: جی کوئی خاص بات نہیں۔ رات زیادہ دیر تک جاگتی رہی تھی۔

انیس احمد: مگر انسان کو اپنی صحت کا پورا پورا خیال رکھنا چاہیے۔

احمد: (محبت آمیز لہجے میں) کوئی اپنی صحت کا خیال رکھے تو اس سے کہا جائے۔ میں تو کہہ کہہ کر ہار گیا۔ رات کے دو دو بجے تک کتابیں ہیں اور عذرا— آپ ہی سمجھائیے (مسکرا کر) شاید آپ کی نصیحت کا کچھ اثر ہو۔

انیس احمد: کیوں بھئی کیا بات ہے (عذرا مسکرا کر نظریں جھکا لیتی ہے)۔ ارے بھئی تم دونوں بیٹھو نا۔ (عذرا اور احمد سامنے کرسیوں پر بیٹھ جاتے ہیں انیس احمد عذرا سے) رشیدہ نے رو دھو کر مجھے بھیجا ہے۔

عذرا: کل میں حاضر نہ ہوسکی جس کا مجھے افسوس ہے ایک ضروری کام میں ایسی الجھی کہ—

انیس احمد: نہیں نہیں کوئی بات نہیں— بات دراصل یہ ہے کہ میرے پڑوس میں کرنل خورشید رہتے ہیں۔ (عذرا کی طرف دیکھ کر) تم تو جانتی ہوگی انھیں؟

عذرا: (نظریں جھکا کر) جی ہاں ان کی بیگم صاحبہ سے ایک مرتبہ آپ کے یہاں

ملاقات ہوئی تھی۔

انیس احمد: بڑے شریف لوگ ہیں۔ ہاں تو وہ لوگ اپنے بچوں کو لے کر کشمیر جا رہے ہیں۔ رشیدہ بھی ضد کر رہی ہے۔

عذرا: آپ اسے بھی کشمیر لے جایئے۔

انیس احمد: میں اس قدر لمبے سفر سے بہت گھبراتا ہوں کرنل صاحب اپنے ساتھ لے جانے کو تیار ہیں۔

عذرا: پھر تو یہ اور بھی اچھا ہے ان کے بچے بھی ساتھ ہوں گے۔

انیس احمد: رشیدہ جس قدر شریر اور ضدی ہے وہ تو تم جانتی ہی ہو ایسی صورت میں اس کا تنہا بھیجنا مناسب نہیں ہے اور دس سال کی عمر ہی کیا ہوتی ہے کہ غیروں کے ساتھ بھیج دیا جائے۔

عذرا: پھر آپ نے کیا سوچا۔

انیس احمد: ابھی کچھ نہیں۔ اس سلسلے میں تم سے مشورہ کرنا تھا۔ (مسکرا کر) بلکہ تم سے زیادہ احمد میاں سے مشورہ ضروری ہے۔ (احمد نظریں اٹھا کر انیس احمد کو دیکھتا ہے) میاں احمد! میں چاہتا ہوں کہ تم اور عذرا بھی کشمیر کا ایک چکر لگا آؤ— وہاں نجیب اللہ خاں میرے سالے رہتے ہیں ان کی ایک لڑکی اور دو لڑکے کالج میں پڑھتے ہیں ان کے یہاں قیام کرنا۔

احمد: بات دراصل یہ ہے کہ—

انیس احمد: (بات کاٹ کر) دیکھو بھئی (مسکرا کر) بہانے بازی نہیں چلے گی۔

احمد: بہانے بازی نہیں ہے۔ بات دراصل یہ ہے کہ مجھے ایک نوکری ملنے کی امید ہے میری عدم موجودگی میں ممکن ہے کہ—

انیس احمد: اس کی ذمہ داری مجھ پر چھوڑ دو۔ ارے بھئی زندگی کے پچاس پچپن سال اسی شہر میں گزارے ہیں جھک نہیں مارا ہے۔ کیا میں تمھارے اتنے کام بھی نہیں آ سکتا۔

احمد: یہ تو آپ کی بزرگانہ شفقت ہے— اگر عذرا تنہا چلی جائیں تو کوئی حرج ہے۔

انیس احمد: حرج ہے اور ضرور ہے۔ وہاں نجیب اللہ خاں کے لڑکوں کا ساتھ ہوگا میں اس کا تنہا جانا پسند نہیں کروں گا۔

احمد: (مسکرا کر) عذرا پڑھی لکھی ہے اور سمجھ دار ہے اور پھر تنہا گھومنا پھرنا آج کل کہاں معیوب ہے۔

انیس احمد: بھئی ہم ٹھہرے اگلے وقتوں کے لوگ ہمارے لیے تو ضرور معیوب ہے (مسکرا کر) تم نئی روشنی کے لوگ اس کو معیوب نہیں سمجھتے۔

احمد: برا تو میں بھی سمجھتا ہوں مگر— (طنزیہ) وہ آپ کی ملازم جو ٹھہری آپ کے ہر حکم کی تعمیل کرنا ہوگی۔

انیس احمد: کیسی بچوں کی سی باتیں کرتے ہو میں نے کبھی اسے ملازم نہیں سمجھا (کھڑے ہوکر) اگر تمھیں اعتراض ہے تو رشیدہ بھی نہیں جائے گی۔

احمد: دیکھیے مجھے سوچنے کا موقع دیجیے۔ میں امی سے اور مشورہ کرلوں۔

انیس احمد: ضرور مشورہ کرلو۔ (کھڑے ہوکر دروازے کی طرف جاتے ہوئے) میں مجبور نہیں کررہا ہوں صرف درخواست ہے۔

احمد: ارے آپ پان—

انیس احمد: نہیں نہیں شکریہ— (مسکرا کر) میں پان نہیں کھاتا ہوں۔ (کمرے سے چلے جاتے ہیں۔" کچھ دیر خاموشی کے بعد احمد عذرا سے)

احمد: آپ نے ساٹھ روپے کی ملازمت کیا کی ہے گویا پورا خاندان احسان مند ہوگیا ہے۔

عذرا: آپ کو تو بلاوجہ شک کرنے کا عارضہ ہے۔ یہ ہماری مرضی ہے کہ ہم بچی کے ساتھ کشمیر جائیں یا نہ جائیں۔

احمد: اگر نہ جائیں گے تو پھر آپ کی ملازمت۔

عذرا: اگر ملازمت چلی گئی تو خدا رزاق، دروازے تو بند نہیں کردے گا۔ دنیا بہت وسیع ہے۔

احمد: جی ہاں دنیا بہت وسیع ہے اس قدر وسیع ہے کہ ڈیڑھ سال سے میں اس دنیا میں بھٹک رہا ہوں اور کوئی نوکری نہیں ملتی۔ تم ضرور رشیدہ کے ساتھ کشمیر چلی جاؤ۔

عذرا: میں ہرگز تنہا نہیں جاؤں گی۔ میں نے رشیدہ کو پڑھانے کی نوکری کی ہے اس کے ساتھ ماری ماری پھرنے کی نہیں آج شام جا کر اس نوکری ہی کو لات مار دوں گی۔

احمد: نہیں عذرا یہ مناسب نہیں ہے۔ انیس احمد صاحب بے حد شریف انسان ہیں۔

عذرا: ان کی شرافت کو چاٹنا نہیں ہے۔

(اٹھ کر دروازے کی طرف جاتی ہے)

احمد: دیکھو عذرا۔۔۔ (عذرا پلٹ کر دیکھتی ہے)۔ انھوں نے مجھے بھی نوکری دلانے کا وعدہ کیا ہے اس صورت میں تمھارا نوکری چھوڑنا مناسب نہیں ہے۔ پھر نوکری یوں آسانی سے نہیں ملے گی۔

عذرا: ملے یا نہ ملے مجھے اس کی پرواہ نہیں ہے۔

احمد: مگر عذرا ابھی مجھے نوکری ملنے کی کوئی امید نہیں ہے۔

عذرا: یہ پھر دیکھا جائے گا بہرحال اب مجھے نوکری نہیں کرنا ہے۔

احمد: مگر۔۔۔ مگر۔۔۔

(عذرا کمرے سے چلی جاتی ہے۔ احمد کرسی سے اٹھ کر ٹہلنے لگتا ہے اس کے چہرے پر پریشانی اور شکست کے آثار ہیں)۔

(پردہ)

(مطبوعہ شاہراہ دہلی، ستمبر 1960)

شاہدہ

افراد تمثیل

(1) شاہدہ (2) امینہ (3) نصیر (4) غیور (5) چاروں آپس میں دوست

منظر

ایک چھوٹا سا کمرہ۔ جس میں سامان معمولی بھی ہے اور قیمتی بھی مگر سب سلیقے سے سجایا گیا ہے۔ کمرے میں دو دروازے ہیں ایک دروازہ بیرون مکان کھلتا ہے جس کے سامنے ایک برآمدہ نظر آتا ہے دروازے پر پردہ پڑا ہے جو اگرچہ ریشمی ہے مگر پرانا ہے۔ دوسرا دروازہ مغربی جانب ہے جو ایک دوسرے کمرے میں کھلتا ہے اس پر بھی پہلے دروازہ کی طرح پردہ پڑا ہوا ہے۔ اس دروازے سے لگی ہوئی ایک سنگھار میز رکھی ہے جو پرانے ماڈل کی ہے مگر سامان قیمتی اور فیشن ایبل ہے۔ دوسری جانب ایک پلنگ بچھا ہے جس پر صاف ستھرا بستر ہے۔

پہلے دروازے کے دونوں جانب دو کھڑکیاں ہیں جن پر پردے لٹک رہے ہیں۔ کھڑکیوں میں کھڑے ہونے سے تقریباً بیس گز کے فاصلے پر ایک سڑک نظر آتی ہے۔

مشرقی دیوار سے لگا ہوا ایک صوفہ سیٹ رکھا ہے جو نیا اور فیشن کے مطابق ہے۔ بیچ کمرے میں ایک گول میز رکھی ہے جس پر گل دان میں پھول سجے ہوئے ہیں۔ اس وقت صبح کے تقریباً نو بجے ہیں کمرے میں نصیر اور شاہدہ ہیں دونوں صوفہ سیٹ پر ایک دوسرے کے سامنے ہیں۔ نصیر کچھ دیر خاموش رہ کر۔

نصیر: ابھی جو شخص آپ کے گھر سے نکل کر گیا ہے۔ یہ کون تھا۔

شاہدہ: (حافظہ پر زور دے کر) کون شخص؟

نصیر: ابھی ابھی جو باہر گیا ہے۔

مشاہدہ: اوہ— وہ شخص۔ جانے کیا نام تھا۔ (مسکرا کر) ویسے ہی راہ چلتے مجھ پر عاشق ہوگیا تھا۔

نصیر: راہ چلتے!

شاہدہ: ہاں— (طنزیہ مسکرا کر) کبھی کبھی راہ چلتے عاشقوں سے واسطہ پڑ جاتا ہے۔ (نصیر سگریٹ جلا کر اس کا لمبا سا کش لیتا ہے۔ شاہدہ چند سیکنڈ خاموش رہ کر) میں دوکان پر کچھ سامان خرید رہی تھی کہ وہ للچائی ہوئی نظروں سے مجھے گھورنے لگا۔

نصیر: اچھا۔

شاہدہ: (مسکرا کر) مجھے اس کی للچائی ہوئی نظروں پر رحم آگیا۔

نصیر: (طنزیہ) اور تم اسے گھر لے آئیں۔

شاہدہ: اور کیا کرتی۔ مجھے ایسے ندیدے مردوں پر رحم آجاتا ہے اور پھر میں کہانی کی پے چیدگیوں کے مقابلے میں اُس کے اختتام میں دلچسپی لیتی ہوں۔

نصیر: مگر شاہدہ۔

شاہدہ: (قطع کلام کر کے) یہ راہ چلتے عاشق بھی عجیب واہیات قسم کے لوگ ہوتے ہیں۔ جانے کیا اونٹ پٹانگ باتیں کرتے ہیں۔

نصیر: مگر شاہدہ یوں زندگی۔

شاہدہ: (پھر قطع کلام کرکے) چھوڑو تم پھر کوئی نصیحت کرو گے۔ میں جسم اور روح کی پاکیزگی کو صرف بیواؤں کے لیے مخصوص سمجھتی ہوں۔ (طنزیہ) اور پھر کبھی کبھی زندگی سے مذاق بھی تو کیا جاتا ہے۔

نصیر: بے حد خطرناک مذاق ہے۔

شاہدہ: مگر دلچسپ

نصیر: تم اُسے نہیں پہچانتی مگر میں جانتا ہوں۔

شاہدہ: اچھا۔۔ کون ہے۔

نصیر: امینہ کا شوہر۔! (چند سیکنڈ خاموش رہ کر) خیر۔۔ کہو بہت دن میں درشن دیے۔

نصیر: ہاں زندگی کی الجھنیں ساتھ نہیں چھوڑتیں۔

شاہدہ: یا تم الجھنوں کا ساتھ نہیں چھوڑتے۔ (ہنس کر) میری طرح زندگی سے مذاق کرنا سیکھو۔ الجھنیں تم سے دور بھاگیں گی۔

نصیر: میں آگ سے کھیلنا نہیں چاہتا۔ صرف حرارت حاصل کرنا چاہتا ہوں۔

شاہدہ: پھر فلسفے پر اتر آئے۔ مجھے ان فلسفیوں پر رحم آتا ہے جنھوں نے سیدھی سادی زندگی کو فلسفے اور منطق میں الجھا کر مشکل بنا دیا ہے (نصیر کسی خیال میں کھو جاتا ہے۔ شاہدہ چند منٹ خاموش رہ کر) تمھارے مقدمے کا کیا ہوا۔

نصیر: مقدمہ! اس میں کوئی جان نظر نہیں آتی۔

شاہدہ: (جھنجھلا کر) اور غیور کیا کر رہے ہیں۔

نصیر: جوان کا فرض ہے (طنزیہ) وہ میرے لیے دولت عزت اور شہرت کیسے چھوڑ سکتے ہیں۔

شاہدہ: (غصہ اور جھنجھلاہٹ سے) مگر میں نے ان سے کہا تھا کہ وہ اس مقدمے کو اپنے ہاتھ میں نہ لیں۔

نصیر: آخر کیوں؟

شاہدہ: میں تم کو ہارتے ہوئے دیکھنا نہیں چاہتی۔

نصیر: (کسی قدر برہم ہوکر) اور تم یہ چاہتی ہو کہ میری نظریں ہمیشہ کے لیے غیور کے سامنے جھک جائیں۔

شاہدہ: معاملہ معمولی نہیں— بیس ہزار کا ہے۔

نصیر: بیس لاکھ کا ہو۔ میں کسی کو یہ موقع دینا نہیں چاہتا کہ وہ میرے معاملات میں دخل دے۔

شاہدہ: یہ معاملات میں دخل دینا نہیں نصیر۔ تم مجھے سمجھنے کی کوشش کرو کہ میں تم سے محبت کرتی ہوں۔

نصیر: مجھے تمھاری محبت پر اعتراض نہیں کہ تم مجھ سے یا کسی دوسرے سے کیوں محبت کرتی ہو۔ مگر تم یوں میری محبت خرید نہیں سکتیں۔

شاہدہ: محبت کی خرید وفروخت نہیں ہوتی— یہ تو ایک—

نصیر: (قطع کلام کر کے طنزیہ) خرید و فروحت نہیں ہوتی! راستے چلتے عاشق تلاش کرنا خرید فروخت نہیں ہے۔

شاہدہ: نصیر! میں تم سے محبت کرتی ہوں اور کرتی رہوں گی۔ رہا راہ چلتے عاشقوں کا سوال۔ تو میں کہہ چکی ہوں کہ زندگی سے مذاق کرنا چاہتی ہوں۔

نصیر: مگر میں تم سے محبت نہیں کر سکتا۔

شاہدہ: (مسکرا کر) اور میں نے تم کو کب مجبور کیا کہ تم بھی مجھ سے محبت کرو۔ جہاں میں زندگی میں اور مذاق کرتی ہوں۔ وہاں ایک یہ بھی ہے کہ ایک ایسے شخص سے محبت کرتی ہوں، جو مجھ سے نفرت کرتا ہے۔

نصیر: اور مجھے اس وقت خود سے بھی نفرت ہوجاتی۔ جب مجھے یہ معلوم ہوتا ہے کہ تم نے میرے لیے کچھ کیا۔ تم میرے متعلق غیور سے کچھ نہ کہنا۔

شاہدہ: پھر وہی بہکی بہکی باتیں۔

نصیر: یہ بہکی باتیں نہیں ہیں میری عزت نفس کا سوال ہے۔

شاہدہ: عزتِ نفس! کس قدر خوبصورت لفظ تراشے ہیں حضرتِ انسان نے خود کو دھوکا دینے کے لیے۔ (طنزیہ) عزت نفس، خودداری، عظمت انسانی اور جانے کیا کیا۔۔۔ اور ان سب کے لیے میرے پاس ایک لفظ ہے۔ ظاہر داری۔

نصیر: تم اس قدر پستی میں گر چکی ہو کہ ان لفظوں سے خود کو دھوکا بھی نہیں دے سکتیں۔

شاہدہ: دھوکا! میں کیوں دھوکا دوں خود کو۔۔۔ میں جس زندگی سے مذاق کرنا چاہتی ہوں اس کو دھوکے کی بھول بھلیاں میں مبتلا کرنا نہیں چاہتی۔

نصیر: اور میں تمھارے وجود ہی کو انسانی عظمت کے لیے لعنت سمجھتا ہوں۔

شاہدہ: پھر وہی خوبصورت الفاظ کا تانا بانا۔۔۔ (اٹھ کر ٹہلنے لگتی ہے۔ نصیر کے پاس جا کر) نصیر! تم خود ایک فریب میں مبتلا ہو۔

نصیر: (نظریں اٹھا کر تعجب سے) فریب میں!

شاہدہ: جب تم اپنی خودداری کا ذکر کرتے ہو تو مجھے معلوم ہوتا ہے کہ تم نے میرے منہ پر ایک طمانچہ مار دیا ہے۔

نصیر: (حیرت سے شاہدہ کا چہرہ دیکھ کر) کیا مطلب!

شاہدہ: مطلب یہ کہ تم ایک روایتی مرد ہو۔

نصیر: (مسکرا کر) روایتی مرد!۔۔۔ (ہنس کر) تم بھی بڑے خوبصورت لفظ تراش لیتی ہو۔ روایتی مرد۔۔۔ سے تمھارا کیا مقصد ہے؟

شاہدہ: وہی مرد جو ازل ہی سے یہ سمجھتا رہا ہے کہ عورت کی تمام ذمہ داری مرد پر ہے۔ عورت مرد کے لیے کچھ نہیں کر سکتی۔
(نصیر قہقہہ مار کر ہنستا ہے)۔ چند سیکنڈ خاموش رہتا ہے پھر مسکرا کر)

نصیر: تم غیور سے میرے لیے جو کچھ چاہتی ہو اس کا معاوضہ اسے کیا دوگی۔

شاہدہ: (ہنس کر) شاید وہی۔ اقلیدسی جسم جس کی ترکیب خالص تمھاری ایجاد ہے۔
(نصیر قہقہہ مار کر ہنستا ہے جس میں طنز اور نفرت نمایاں ہے۔ شاہدہ اس طنز

اور نفرت کو محسوس کرتی ہے مگر خاموش رہتی ہے۔ نصیر چند منٹ شاہدہ کو دیکھتا رہتا ہے پھر مسکرا کر)

نصیر: اور اسی لیے میں تمھاری کوئی مدد لینا نہیں چاہتا۔

(شاہدہ طنزیہ ہنستی ہے۔ پھر چند سیکنڈ خاموش رہ کر)

شاہدہ: چائے پیو گے؟ (نصیر خاموش رہتا ہے۔ شاہدہ نصیر کا چہرہ مسکرا کر دیکھتے ہوئے طنزیہ) خدا کی قسم میری کمائی کی نہیں ہے۔ خالص اسی کی کمائی کی ہے جو انھوں نے لڑکیوں کو قرآن پڑھا کر حاصل کی ہے۔

نصیر: (ہنس کر) پھر مجھے کوئی اعتراض نہیں۔

شاہدہ: شکریہ!

(شاہدہ دوسرے کمرے میں چلی جاتی ہے۔ نصیر دوسرا سگریٹ جلا کر اس کے دوچار کش لگاتا ہے۔ کچھ دیر بعد امینہ کمرے میں آتی ہے اور نصیر کو تنہا کمرے میں بیٹھا دیکھ کر)

امینہ: اوہو— مسٹر نصیر— کیا ہو رہا ہے۔

نصیر: (کرسی سے تھوڑا اٹھ کر) آداب! (مسکرا کر) چائے کا انتظار— (کرسی کی طرف اشارہ کر کے) تشریف رکھیے— (امینہ سامنے کرسی پر بیٹھ جاتی ہے) کہیے انوار کے ساتھ کیسی گزر رہی ہے۔

امینہ: بہت عمدہ۔ (نصیر حیرت سے امینہ کا چہرہ دیکھتا ہے امینہ مسکرا کر) آپ کو حیرت کیوں ہے؟

نصیر: اس لیے کہ حیرت کی بات ہی ہے۔ تم دونوں کے مزاجوں میں کس قدر اختلاف ہے۔

امینہ: اختلاف! نہیں تو—

نصیر: لیکن انوار—

امینہ: (قطع کلام کر کے) ہم دونوں میں معاہدہ ہے کہ ایک دوسرے کے ذاتی

معاملات میں دخل نہ دیں گے— اس لیے سب کچھ ٹھیک چل رہا ہے۔

نصیر: کیا تم اس کو برداشت کرسکتی ہو کہ—

اینہ: (پھر قطع کلام کرکے) عورت جو کچھ چاہے برداشت کرسکتی ہے۔

نصیر: یہی تو حیرت ہے۔

اینہ: (خفیف سے طنز سے) اس لیے کہ آپ کو اس کو اپنا حق سمجھتے ہی رہے کہ مرد ہی عورت کے لیے سب کچھ کرسکتا ہے۔ عورت مرد کے لیے کچھ نہیں۔

نصیر: دنیا کا نظام ہی اس طرح چل رہا ہے۔

اینہ: (مسکرا کر) اور اب۔ ''زمانے کے انداز بدل گئے۔'' (چند سیکنڈ خاموش رہ کر) آپ شادی کیوں نہیں کر لیتے؟

نصیر: شادی! میں!!! (مسکرا کر) کس سے؟

اینہ: شاہدہ سے۔

نصیر: (ہنس کر) شاہدہ سے! (طنزیہ) بڑا نیک مشورہ ہے۔

اینہ: (طنز کو محسوس کرکے) تو پھر نیک کام میں دیر کیوں؟

نصیر: (بگڑ کر) مگر میں شاہدہ سے نفرت کرتا ہوں۔

اینہ: (مسکرا کر) تو پھر اس کے گھر کے چکر کیوں لگائے جاتے ہیں۔

نصیر: اس لیے کہ مجھے اس کا اقلیدسی جسم ''پسند ہے (اینہ بے ساختہ ہنس دیتی ہے۔ نصیر جھنجھلا کر اسے دیکھتا ہے۔ اینہ مسکرا کر ہنسی روک لیتی ہے) ہنسی کا کیا مطلب ہے۔

اینہ: کچھ نہیں۔

نصیر: آخر کچھ مطلب تو ضرور ہے؟

اینہ: سوچتی ہوں کہ آپ لوگ خود فریبی میں مبتلا ہوکر کیسے کیسے تضادوں کا شکار ہوجاتے ہیں۔

نصیر: تضاد۔

امینہ: ہاں — (چند سیکنڈ خاموش رہتی ہے۔ نصیر سوالیہ نظروں سے اس کا چہرہ دیکھتا ہے امینہ موضوع بدلنے کے انداز میں) کہیے نجمہ سے بھی ملاقات ہوتی ہے یا نہیں۔

نصیر: عرصہ سے ملاقات نہیں ہوئی۔

امینہ: کیوں! کیا مصروفیت زیادہ ہے۔

نصیر: مصروفیت تو کچھ زیادہ نہیں۔ (سگریٹ کا کش لے کر) اس کے والد عجیب دقیانوسی قسم کے بزرگ ہیں۔ ہم دونوں کی ملاقات پر انھیں اعتراض ہوتا ہے اور نجمہ بھی ان کی مرضی کے خلاف کچھ کرنا پسند نہیں کرتی۔

امینہ: کیا کبھی اس نے اس کا اظہار کیا۔

نصیر: نہیں۔ میں نے ہی ملنا جلنا ترک کر دیا ہے۔

امینہ: اچھا — (کچھ دیر خاموش رہ کر) کل تو سلیم کے یہاں بھی آپ کا بہت انتظار رہا۔

نصیر: سلیم کے یہاں — ! کیوں؟

امینہ: ویسے ہی — خیال تھا کہ آپ آئیں گے اور سلیم بھی کہہ رہی تھی کہ آپ سے بہت دن سے ملاقات نہیں ہوئی۔

نصیر: میں آ کر بھی کیا کرتا۔ ہمیشہ ایسی واہی تباہی باتیں کرتی ہے کہ الجھن ہونے لگی ہے۔ (امینہ خاموش سی رہتی ہے نصیر سگریٹ کے چند کش لگا کر) یہ شاہدہ غیور سے ملنا جلنا ترک کیوں نہیں کر دیتی؟

امینہ: (نصیر کا چہرہ دیکھ کر) کیوں؟

نصیر: کہتی ہے نا کہ اسے غیور سے نفرت ہے۔

امینہ: (طنزیہ مسکرا کر) آپ کو بھی تو شاہدہ سے نفرت ہے پھر آپ اس سے ملنا جلنا کیوں ترک نہیں کر دیتے۔

(نصیر نظریں جھکا کر خاموش ہو جاتا ہے کچھ دیر بعد شاہدہ چائے لے کر آتی

13A

ہے اور امینہ کو دیکھ کر)

شاہدہ: اوہو— کب تشریف لے آئیں حضور۔

امینہ: ابھی آئی ہوں۔ (شاہدہ چائے کی کشتی میز پر رکھ کر چائے بنانے لگتی ہے امینہ اس کو خاموش دیکھ کر) امی کہاں ہیں۔

شاہدہ: (اپنے کام میں مشغول رہتے ہوئے) اندر ہیں۔ کئی بار تمھیں......... چائے پی چکی ہیں۔ جانے سے پہلے ان سے مل لینا۔

امینہ: سچ پوچھوتو میں ان ہی سے ملنے آئی تھی۔ (کھڑی ہوکر) میں پہلے اُن سے مل لوں۔

شاہدہ: چائے تو پی لو۔

امینہ: میں چائے پی کر آئی ہوں۔

(کمرے سے دوسرے کمرے میں چلی جاتی ہے۔ کچھ دیر خاموشی رہتی ہے۔ شاہدہ چائے کی پیالی نصیر کی طرف بڑھا کر)

شاہدہ: لیجیے— کیا سوچ رہے ہیں آپ؟

نصیر: (ایک دم چونک کر) کچھ نہیں۔ (چائے کی پیالی شاہدہ سے لیتا ہے۔ کچھ دیر سوچتا رہتا ہے اور سگریٹ کے کشوں کے ساتھ ساتھ چائے کے بھی دو چار گھونٹ لیتا ہے پھر شاہدہ کی طرف دیکھ کر جو سامنے کرسی پر بیٹھی چائے پی رہی ہے) شاہدہ! (شاہدہ نظریں اٹھا کر نصیر کو دیکھتی ہے)۔ ایک بات پوچھوں؟ سچ جواب دو گی؟ (شاہدہ پیالی رکھ کر سوالیہ نگاہوں سے نصیر کو دیکھتی ہے) کیا تم سچ مچ غیور سے نفرت کرتی ہو— (شاہدہ سوچتے ہوئے اثبات میں سر ہلاتی ہے) کیوں؟— وہ تو تم سے محبت کرتا ہے۔

شاہدہ: ہاں— مگر میں اس سے نفرت کرتی ہوں۔

نصیر: آخر کیوں؟

شاہدہ: چھوڑیے یہ کوئی دلچسپ موضوع نہیں ہے۔

نصیر: مگر میں خود کو مطمئن کرنا چاہتا ہوں۔

شاہدہ: کس سلسلے میں؟

نصیر: یہی کہ تمھارے دل میں اس کی طرف سے نفرت ہے۔

شاہدہ: کہہ تو دیا اس سے نفرت کرتی ہوں۔

نصیر: تو پھر اس سے ملنے کے لیے کیوں بیتاب رہتی ہو۔

شاہدہ: (ہنس کر) اس لیے کہ وہ مرے سامنے آکر اس قدر نیاز مند ہو جاتا ہے کہ مجھے اپنے اندر ایک خود اعتمادی کا احساس ہونے لگتا ہے۔ میری نفس موٹی ہوجاتی ہے۔

نصیر: تو پھر نفرت کا کیا سبب ہے۔

شاہدہ: (سوچتے ہوئے) میں نے کہا نا کہ یہ کوئی دلچسپ موضوع نہیں ہے (کچھ دیر خاموش رہ کر ٹھنڈی سانس بھر کر) آپ کو اس سے کوئی خوشی نہ ہوگی۔

نصیر: مگر پھر بھی۔

شاہدہ: (کچھ دیر خاموش رہ کر) میں زندگی کے جس راستے پر چل رہی ہوں۔ اس پر اس نے لاکر کھڑا کیا ہے۔ اس لیے میں اس سے نفرت کرتی ہوں۔

نصیر: تم نے اس سے غلط رہنمائی قبول ہی کیوں کی۔

شاہدہ: میں نے اس کو غلط سمجھا اور اس نے میری کچھ نادانیوں او رکمزوریوں سے فائدہ اٹھا کر غلط راستے پر ڈال دیا۔

(نصیر خاموش ہوکر کچھ سوچنے لگتا ہے اور سگریٹ کے لمبے لمبے کش لیتا ہے۔ شاہدہ چائے کے برتن کشتی میں جمع کرنے لگتی ہے۔ کچھ دیر بعد امینہ واپس کمرے میں آتی ہے۔ دونوں کو خاموش دیکھ کر مسکراتی ہے۔ پھر ایک کرسی پر بیٹھ کر)

امینہ: کیا آپ دونوں نے مرن برت رکھا ہے۔

شاہدہ: (سامان دوسرے کمرے کی طرف لے جاتے ہوئے)۔ میں ابھی آتی ہوں۔

(شاہدہ کمرے سے چلی جاتی ہے۔ امینہ تصویر کی طرف دیکھ کر)

امینہ: کس بات پر جھگڑا ہو گیا؟

نصیر: کوئی جھگڑا نہیں ہوا۔ (اٹھ کر دروازے کی طرف جاتے ہوئے) میں جا رہا ہوں آپ مجھ سے باہر ریسٹوراں میں مل لیجیے گا۔

(نصیر جواب کا انتظار کیے بغیر کمرے سے چلا جاتا ہے۔ امینہ خاموش بیٹھی سوچتی رہتی ہے۔ کچھ دیر بعد شاہدہ واپس آ کر)

شاہدہ: کیا مسٹر نصیر چل دیئے۔

امینہ: ہاں۔ (شاہدہ کا چہرہ دیکھ کر) کیا جھگڑا ہو گیا۔

شاہدہ: نہیں تو— (امینہ کچھ سوچنے لگتی ہے۔ شاہدہ کرسی پر بیٹھ کر مسکراتے ہوئے) یہ تم نے شادی کر لی اور ہم کو پوچھا تک نہیں۔ ارے بھئی اُن سے ہماری ملاقات تو کراؤ۔

امینہ: (کچھ دیر سوچ کر) تم کو ان سے مل کر خوشی نہیں ہوگی۔

شاہدہ: کیوں؟ ظاہر ہے تمھارا انتخاب برا تو نہ ہوگا۔

امینہ: ہاں انتخاب تو برا نہیں مگر— (خاموش ہو جاتی ہے۔ شاہدہ سوالیہ انداز میں اس کا چہرہ دیکھنے لگتی ہے۔ امینہ کچھ دیر خاموش رہ کر مسکراتے ہوئے) میں تم کو ان سے چھپائے رکھنا چاہتی ہوں۔

شاہدہ: (طنزیہ مسکرا کر) کیوں؟

امینہ: اس لیے کہ ایک بار تم ان کی تعریف مجھ سے کر چکی ہو اور وہ اکثر تمھاری تعریف کرتے رہتے ہیں۔ (سوچتے ہوئے) مجھے ڈر ہے کہ کہیں تم ان کو مجھ سے چھین نہ لو۔

شاہدہ: (قہقہہ مار کر) پاگل ہوئی ہو۔ (حسرت سے) میری حالت تو اس مسافر کی طرح ہے جو ریل گاڑی میں بیٹھ کر مناظر کو دیکھتا چلا جائے اور کبھی کبھی کسی منظر کی تعریف اپنے ہم سفر سے بھی کر دے۔ (مسکرا کر) تم بالکل مطمئن رہو اور کسی روز انھیں یہاں چائے پر لاؤ۔ (دروازے پر دستک) کون ہے؟

آواز: غیور۔

شاہدہ: تشریف لائیے۔

(غیور کمرے میں آتا ہے اور امینہ کو دیکھ کر)

غیور: اوہ آپ بھی یہاں موجود ہیں۔ آداب عرض ہے۔

امینہ: آداب— آیئے۔

غیور: (شاہدہ کی طرف دیکھ کر) یہ نصیر نے کیا حالت بنا رکھی ہے۔ ابھی راستے میں مل گیا تھا بے حد پریشان اور کھویا کھویا سا نظر آرہا تھا۔

شاہدہ: (طنزیہ) آپ کی ہی مہربانی ہے۔

غیور: (تعجب سے) میری!

شاہدہ: جی ہاں— بیس ہزار کی بات کوئی معمولی نہیں ہوتی (چند سیکنڈ خاموش رہ کر) میں نے تو آپ سے عرض کیا تھا کہ آپ اس کے خلاف مقدمہ اپنے ہاتھ میں نہ لیں۔

غیور: مگر شاہدہ کوئی تھرڈ کلاس وکیل بھی ہو تب بھی مقدمہ اس کے خلاف ہی جائے گا۔

شاہدہ: یوں کہیے کہ آپ اپنے محنتانہ کے لیے اس کی زندگی تباہ کرنے پر تلے ہوئے ہیں۔ روپے سے بہت پیار ہے۔

غیور: نہیں یہ بات نہیں مگر—

شاہدہ: مگر وگر کچھ نہیں۔ میں یہ دو رخی پالیسی پسند نہیں کرتی۔ میرے دوست آپ کے دوست ہونا چاہئیں۔

غیور: تم تو بلا وجہ ناراض ہوتی ہو۔

شاہدہ: ناراض ہونے کی بات ہوگی تو میں ضرور ناراض ہوں گی۔

(امینہ کھڑے ہوکر)

امینہ: بھئی مجھے اجازت دو۔

شاہدہ: بیٹھو— ایسی بھی کیا جلدی ہے۔

امینہ: (مسکرا کر) ابھی نصیر سے ملنا ہے۔ (دروازے کی طرف جاتے ہوئے) اچھا خدا حافظ۔

شاہدہ: خدا حافظ۔ اپنے شوہر کو کسی روز چائے پر ضرور لانا۔

امینہ: اچھا بھئی کسی روز لے آؤں گی۔

(کمرے سے چلی جاتی ہے کچھ دیر کمرے میں خاموشی رہتی ہے۔ غیور شاہدہ کو غور سے دیکھ کر مسکراتے ہوئے)۔

غیور: شاید تم مجھ سے بیٹھنے کو بھی نہیں کہو گی۔

شاہدہ: (کرسی کی طرف اشارہ کر کے) تشریف رکھیے۔

غیور: (کرسی پر بیٹھتے ہوئے) شکریہ! جیب میں ہاتھ ڈال کر ایک چھوٹا سا بکس نکال کر اسے کھولتا ہے اور شاہدہ کو بتلاتے ہوئے) دیکھیے یہ آویزے آپ کو پسند ہیں۔

شاہدہ: اوہ۔۔۔ (بکس لے کر غور سے آویزوں کو دیکھتے ہوئے) بہت خوب۔ بہت خوبصورت ہیں۔

غیور: اور قیمتی بھی۔ کہیے آپ کو پسند ہیں۔

شاہدہ: بہت۔۔۔ بے حد پسند ہیں۔

غیور: (شاہدہ کے ہاتھ سے بکس لے کر) لائیے میں پہنا دوں۔ (شاہدہ بکس دے کر اپنا چہرہ غیور کی طرف بڑھا دیتی ہے۔ غیور آویزے کانوں میں پہناتا ہے مگر ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے وہ اس کے گالوں سے بھی ہاتھ لگانے کی کوشش کر رہا ہے جس کو شاہدہ محسوس کر لیتی ہے اور اس کے چہرے پر ایک طنزیہ مسکراہٹ نمودار ہوتی ہے۔ غیور آویزے پہنا کر ذرا پیچھے ہٹ کر شاہدہ کا چہرہ غور سے دیکھ کر) کس قدر بھلے معلوم ہوتے ہیں۔ یہ آپ کے کانوں میں۔

شاہدہ: (مسکرا کر) شکریہ۔

غیور: میں حسن کا تصور دولت سے علاحدہ نہیں کر سکتا۔ پھٹے پرانے اور بوسیدہ کپڑے

جسم کو زنگ لگا دیتے ہیں۔ دولت سے علاحدہ حسن کا تصور میرے نزدیک اس قیمتی شراب کی طرح ہے جو بوسیدہ اور گندی بوتلوں میں بھر دی گئی ہے۔

شاہدہ: (طنزیہ) اچھا۔

غیور: جی ہاں۔ جب تک خوبصورت اور مدور سینے پر نکلس نہ جگمگائے جب تک گلابی رخساروں پر آویزوں کا عکس نہ ہو اور جب تک خوبصورت پیروں سے روندنے کے لیے ایرانی قالین نہ ہوں حسن محض بے کار ہے ایک سراب۔

شاہدہ: (طنزیہ) کس شاعر کو پڑھ آئے ہو آج۔

غیور: نہیں شاہدہ۔ سچ سچ یہ میرا اپنا تصور ہے۔ میں حسن کی بے چارگی برداشت نہیں کرسکتا۔

شاہدہ: جب ہی تم دنیا بھر کے حسن کو سجانے کے لیے دنیا بھر کی دولت جمع کرلینا چاہتے ہو تاکہ اس سے حسن کو بلیک میل کرسکو۔

غیور: نہیں میرا مقصد یہ نہیں ہے بلکہ ــــ

شاہدہ: (قطع کلام کرکے) اور کیا ہے۔(طنزیہ) میری طرف دیکھو۔ (غیور نظریں اٹھاکر شاہدہ کو دیکھتا ہے۔ شاہدہ آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر)
میری آنکھیں نرگسی ہیں، میری گردن صراحی دار ہے۔ میرے رخسار گلابی ہیں۔ میرا سینہ مدور اور سخت ہے۔ میرے جسم کا ہر ہر عضو متناسب ہے اور ان سب کی خواہش نے تم کو ایسی پستی میں گرادیا جہاں تم بلیک میل کرنے پر اتر آئے۔

غیور: بلیک میل! شاہدہ میں تم سے شادی کا خواہش مند ہوں۔

شاہدہ: شادی! یہ جانتے ہوئے کہ میں تم سے نفرت کرتی ہوں۔

غیور: ہاں یہ جانتے ہوئے کہ تم مجھ سے نفرت کرتی ہو لیکن یہ نفرت ایک دن محبت میں بدل سکتی ہے۔

شاہدہ: اور نفرت کو بدلنے میں بدلنے کے لیے تم مجھے تحائف کے احسانوں میں دبا

دینا چاہتے ہو۔

غیور: نہیں یہ بات نہیں شاہدہ— بلکہ—

شاہدہ: (قطع کلام کرکے) مسٹر غیور! یاد رکھیے میں آپ کے احسانوں کا بدلہ اسی روز چکا چکی ہوں جب کہ آپ نے میری ایک اچھی ماں اور ایک اچھی بیوی بننے کے تصور کو اپنی ہوس سے پاش پاش کر دیا تھا۔

غیور: شاہدہ مجھے تم سے محبت ہے۔

شاہدہ: آج تک مجھے کوئی ایسا مرد نہیں ملا جس نے اپنی محبت کا اظہار نہ کیا ہو اور تم— (نفرت سے) تم تو اپنے ایک ایک پاسے کی قیمت مجھ سے وصول کر لیتے ہو۔

غیور: (تعجب سے) میں!

شاہدہ: ہاں— تم— تم— جب تم مجھے کوئی تحفہ دیتے ہو تو میرے جسم کو اس طرح ٹٹولنے کی کوشش کرتے ہو جیسے اس شہ رگ کی تلاش ہو جہاں سے سارا خون کھینچا جا سکے۔

غیور: یہ تمھارا وہم ہے شاہدہ۔

شاہدہ: وہم!— نصیر نے تم سے زیادہ مجھے تحفے دیے۔ مگر کبھی اس نے میرے جسم کو ہاتھ تک نہیں لگایا حالانکہ میری خود خواہش رہی کہ کبھی تو وہ میرے ہونٹوں کو محبت سے چوم لے۔

غیور: (جھنجھلاہٹ سے) تو یہ اس کی بزدلی ہے۔

شاہدہ: (طنزیہ) اور تم جو کچھ کر چکے ہو اور کرتے ہو وہ عالی ہمتی، جوانمردی اور حسن پرستی ہے مجھے تم جیسے بزدل مردوں سے نفرت ہے۔

(غیور کچھ دیر خاموش رہتا ہے اور سگریٹ جلا کر پینے لگتا ہے۔ شاہدہ نظریں جھکا کر کچھ سوچنے لگتی ہے اور غیور برابر اس کے چہرے کو ٹکٹکی باندھے گھورتا رہتا ہے۔ پھر کچھ دیر بعد آہستہ سے)

غیور: شاہدہ! (شاہدہ نظریں اٹھا کر اسے دیکھتی ہے غیور چند سیکنڈ رک کر) کیا آج رات تم میرے ساتھ کھانا کھا سکتی ہو۔

شاہدہ: نہیں۔

غیور: کیوں؟

شاہدہ: رات کو تاریکی میں تم مجھے مردم خور نظر آتے ہو۔ مجھے تمھارے خیال سے ڈر اور تمھارے تصور سے گھن آنے لگتی ہے۔

غیور: کسی اور سے وعدہ کر چکی ہو۔

شاہدہ: ہاں۔

غیور: نصیر سے؟

شاہدہ: نہیں۔ وہ مجھ سے کبھی رات میں ملنے کا خواہش مند نہیں رہا۔

غیور: تو پھر اور کس سے؟

شاہدہ: کسی اور سے

غیور: خیر — تو پھر اور کبھی سہی۔ (کھڑے ہوکر) خدا حافظ۔

شاہدہ: خدا حافظ۔

غیور: کل تم سے ملاقات ہو سکتی ہے۔

شاہدہ: ضرور — (غیور دروازے کے پاس جاتا ہے) سنیے — (غیور پلٹ کر شاہدہ کو دیکھتا ہے) نصیر کو مقدمہ ہارنا نہیں چاہیے۔

غیور: مگر —

شاہدہ: مگر اگر کچھ نہیں۔

غیور: اچھا — وہ مقدمہ نہیں ہارے گا۔

(غیور کمرے سے نکل جاتا ہے۔ شاہدہ کچھ دیر بیٹھی سوچتی رہتی ہے۔ پھر اٹھ کر کھڑکی سے باہر دیکھنے لگتی ہے۔ چند منٹ بعد سنگھار میز کے پاس جا کر کھڑی ہوتی ہے اور آئینے میں اپنی شکل دیکھتی ہے اور اس پر بکھرا ہوا سامان

سلیقے سے رکھتی ہے۔ نصیر کمرے میں آتا ہے۔ شاہدہ کو اس کا عکس سنگھار میز
کے آئینے میں نظر آتا ہے۔ شاہدہ پلٹ کر نصیر کو دیکھتے ہوئے)

شاہدہ: (آہستہ آہستہ آگے بڑھتے ہوئے) شاہدہ!— (شاہدہ غور سے نصیر کے چہرے کو دیکھتی ہے جس پر کچھ غیر معمولی جذبات کے آثار ہیں۔ نصیر ایک کرسی پر بیٹھ کر خاموش رہ کر) مسٹر غیور تشریف لے گئے۔

شاہدہ: (نصیر کی طرف آتے ہوئے) کبھی کے گئے۔— (نصیر کے پاس آکر) کہیے خیریت تو ہے۔

نصیر: (سوچتے ہوئے) شاہدہ! تم غیور سے نہ ملا کرو۔

شاہدہ: کیوں؟— (اس طرح جیسے غیور کے لیے سخت نفرت کا اظہار کر رہی ہو) وہ تو میرے پرانے دوست ہیں۔

نصیر: مگر میں اس کو پسند نہیں کرتا۔

شاہدہ: مگر مسٹر نصیر— میں—

نصیر: (قطع کلام کر کے) آج میں نے یہ فیصلہ کر لیا ہے کہ تم کو ان درندوں سے بچا لوں۔

شاہدہ: درندوں سے۔

نصیر: ہاں— غیور جیسے لوگوں کو میں درندہ ہی سمجھتا ہوں اور میں نے یہ فیصلہ کر لیا ہے کہ— (کچھ دیر خاموش رہ کر شاہدہ کے چہرے کو گھورتے ہوئے جو نیچی نظریں کیے خاموش بیٹھی ہے) تم سے شادی کر لوں۔

شاہدہ: شادی!— (پھر سنگھار میز کے پاس جا کر کھڑی ہو جاتی ہے اور نصیر کو دیکھ کر) شادی اور مجھ سے!

نصیر: ہاں— کیا تم کو کوئی اعتراض ہے؟

شاہدہ: لیکن میں نے کبھی آپ سے شادی کرنے کے بارے میں نہیں سوچا۔

نصیر: مگر تم مجھ سے—

شاہدہ: ہاں تم سے محبت کرتی ہوں مگر شادی تم سے نہیں کرسکتی۔

نصیر: کیوں؟ (شاہدہ خاموش رہتی ہے) مگر آج میں یہ فیصلہ کر کے آیا ہوں۔

شاہدہ: مگر میں نے یہ فیصلہ کبھی نہیں کیا۔ (آنکھوں میں آنسو آجاتے ہیں۔ اپنے ڈوپٹے کے پلو سے آنسو پونچھ کر) نصیر! میں تم سے شادی نہیں کرسکتی۔

نصیر: (غصہ سے) تو پھر تم اپنی محبت کا اظہار کر کے مجھے دھوکا کیوں دیتی رہیں۔

شاہدہ: میں نے کبھی بھی یہ نہیں کہا کہ میں تم سے شادی کرنا چاہتی ہوں۔

نصیر: (طنزیہ اور غصہ سے) تم جیسی عورت سے اور توقع بھی کیا کی جاسکتی ہے۔ تمھاری زندگی سراسر فراڈ ہے دھوکا ہے۔ تم اپنی زندگی کو معمہ بنانا چاہتی ہو مگر وہ میرے لیے معمہ نہیں ہے ایک کھلی ہوئی کتاب ہے جس کے ہر صفحہ پر دھوکا، فریب، بدچلنی، آوارگی ذلت اور خواری کی کہانیاں بھری پڑی ہیں۔

شاہدہ: (دونوں کانوں پر ہاتھ رکھ کر) خدا کے لیے چپ رہو نصیر۔

نصیر: (اور بلند آواز سے) میں چپ نہیں رہ سکتا۔ ہرگز نہیں رہ سکتا (شاہدہ کے پاس جاکر اس کے دونوں ہاتھ پکڑ کر کانوں پر سے علاحدہ کرتے ہوئے) تم وہ کمینی عورت ہو جو اچھی ماں اور اچھی بیوی بننے سے انکار کرتی ہو۔ تم وہ ذلیل مخلوق ہو جو امینہ کے شوہر کو بھی تباہی کے راستے پر لے جارہی ہو۔

شاہدہ: (پھر دونوں کانوں پر ہاتھ رکھ کر منہ دوسری طرف پھیر کر) نصیر! خدا کے لیے چپ رہو۔ (ہچکیوں سے رونے لگتی ہے۔ اور پاس بچھے ہوئے پلنگ پر گر جاتی ہے۔ نصیر اس کے دونوں بازو پکڑ کر کھڑا کرتا ہے)۔ نصیر—

نصیر: (طنزیہ) اس بستر پر روتی ہوئی تم بھلی نہیں معلوم ہوتیں۔ اس سیج پر تو تم دوسروں کے پہلو گرما کر قہقہے لگاتی ہو۔

شاہدہ: (چیخ کر) نصیر۔

(نصیر کے گالوں پر دو طمانچے رسید کردیتی ہے۔ نصیر جواب میں دو طمانچے مار کر)

نصیر: مجھے اس کا غم نہیں کہ تم مجھ سے شادی کرنا نہیں چاہتیں۔ غم اس کا ہے کہ میں نے تم سے شادی کی خواہش ہی کیوں کی۔ (پھر ایک دم جیسے جوش میں آ کر) تم جو کہ ذلیل ہو۔ کمینی ہو اور اس جانور کی طرح ہو جس کو مردار خوری میں مزہ آتا ہے۔

(پھر شاہدہ کو دھکا دے کر پلنگ پر گرا دیتا ہے شاہدہ ہچکیوں سے رونے لگتی ہے)

شاہدہ: خدا کے لیے نصیر تم جاؤ۔ میں تم سے شادی نہیں کر سکتی۔ ہرگز نہیں کر سکتی۔

(نصیر چند سیکنڈ خاموش کھڑے ہو کر شاہدہ کو دیکھتا ہے۔ پھر تیز تیز قدموں سے غصہ میں دروازے کی طرف جاتا ہے۔ اسی وقت امینہ کمرے میں آتی ہے اور چند سیکنڈ میں ماحول کا جائزہ لے کر)

امینہ: کیا بات ہے مسٹر نصیر۔

نصیر: کچھ نہیں۔

(امینہ کو غصے سے دھکا دیتے ہوئے کمرے سے نکل جاتا ہے۔ امینہ چند سیکنڈ خاموش کھڑی رہتی ہے پھر شاہدہ کے پاس آتی ہے جو پلنگ پر اوندھی لیٹی ہوئی ہچکیوں سے رو رہی ہے۔ چند سیکنڈ پلنگ کے پاس کھڑی رہتی ہے پھر پلنگ پر بیٹھ کر شاہدہ کے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر)

امینہ: کیا بات ہے شاہدہ۔ (شاہدہ برابر ہچکیوں سے روتی رہتی ہے) آخر کہو تو بات کیا ہے۔

شاہدہ: (اسی طرح روتے ہوئے ہچکیوں کے درمیان) امینہ! میں نصیر سے شادی نہیں کر سکتی ہرگز نہیں کر سکتی۔

امینہ: نصیر سے شادی نہیں کر سکتیں۔ آخر یہ تم کیا کہہ رہی ہو۔

شاہدہ: ہاں امینہ — میں اس سے شادی نہیں کر سکتی (بیٹھ کر ہچکیوں پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے) میں نے اس سے شادی سے انکار کر دیا ہے۔

امینہ: انکار کر دیا! میں نے تو بڑی کوشش سے اس کو راضی کیا تھا یہ تم نے کیا کر دیا۔

شاہدہ: میں نے اچھا ہی کیا امینہ — وہ بہت شریف انسان ہے میں اس کے قابل نہیں۔

امینہ: غضب کیا۔ میرے سب کیے کرائے پر پانی پھیر دیا۔

شاہدہ: مگر امینہ وہ بہت شریف انسان ہے بہت شریف۔

امینہ: لیکن کبھی تو تم شادی کرو گی ہی۔

شاہدہ: ہاں کروں گی۔ مگر اس سے نہیں۔

امینہ: تو پھر کس سے؟

شاہدہ: غور سے۔

امینہ: شیدو رسے! کیا بک رہی ہو۔ اس سے تو تم نفرت کرتی ہو۔

شاہدہ: ہاں نفرت کرتی ہوں مگر —

امینہ: مگر کیا — آخر یہ کیا فیصلہ ہے۔

شاہدہ: صحیح فیصلہ ہے میں اس کو تمام زندگی ذلیل کرنا چاہتی ہوں۔ اس کو ذہنی اذیت پہنچانا چاہتی ہوں۔

امینہ: ذہنی اذیت۔

(امینہ سے لپٹ کر ہچکیوں سے رونے لگتی ہے۔)

(پردہ)

(مطبوعہ شاعر، بمبئی 1959)

وہ ایک نرس تھی

افرادِ تمثیل

(1) نرملا ڈیوڈ (ایک نرس) (2) ڈیوڈ (نرملا کا شوہر) (3) جمی (نرملا ڈیوڈ کا دس گیارہ سال کا لڑکا) (4) شانتی (نرس، نرملا ڈیوڈ کی پڑوسن) (5) الطاف، رمیش (اسکول کے دو طالب علم) (6) دو آدمی (پولیس کا سپاہی وغیرہ)

منظر

ایک سرکاری کوارٹر جس میں پردہ اٹھنے پر ایک چھوٹا سا صحن دکھائی دیتا ہے۔ صحن کے بعد ایک دالان جس کے نصف حصہ میں دیوار بنی ہوئی ہے جو دھوئیں سے کالی ہے جس سے پتا چلتا ہے کہ اس دیوار کی آڑ میں باورچی خانہ ہے— اس دالان کے پیچھے ایک کمرہ نظر آتا ہے جس میں ایک دروازہ ہے جس پر بہت معمولی کپڑے کا پردہ پڑا ہوا ہے جس کی وجہ سے کمرے کے اندر کا حصہ نظر نہیں آتا۔ دالان میں ایک چارپائی بچھی ہے۔ صحن میں ایک رسی بندھی ہے جس پر دو تین ساڑیاں لٹک رہی ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ انھیں دھوکر ابھی ابھی لٹکایا گیا ہے۔ صحن میں ایک چارپائی بچھی ہے۔

ڈیوڈ چارپائی پر بیٹھا ہے۔ نرملا ڈیوڈ دالان میں ٹہل رہی ہے ماحول سے معلوم ہوتا ہے کہ دونوں میں کسی بات پر جھگڑا ہو رہا ہے۔ نرملا یکایک پلٹ کر ڈیوڈ کو دیکھ کر۔

نرملا: تم سے کس نے کہا تھا کہ تم نوکری چھوڑ کر یہاں چلے آؤ۔

ڈیوڈ: انسان شادی اسی لیے کرتا ہے کہ سکھ چین کی زندگی بسر کرے آخر کہاں تک میں ہوٹلوں کی روٹیاں توڑتا رہتا۔

نرملا: تو یوں کہو کہ میں باورچن ہوں کہ تمھیں روٹیاں ٹھونک ٹھونک کر کھلاؤں اور تم پڑے ہوئے چارپائی توڑتے رہو۔

ڈیوڈ: میں چارپائی توڑنے کے لیے یہاں نہیں آیا ہوں۔ دو چار دن میں مجھے کوئی کام مل جائے گا۔

نرملا: خاک مل جائے گا جو لگے روزگار کو ٹھکرا دے اسے ٹھوکروں کے علاوہ کچھ نہیں ملتا۔

ڈیوڈ: تو یوں کہو تم مجھے ٹھکرا دینا چاہتی ہو۔ تمھیں مجھ سے کوئی پیار نہیں کوئی محبت نہیں۔

نرملا: تم محبت اور پیار اسی کو سمجھتے ہو کہ میں تمھارے پاؤں دباتی رہوں تمھاری ہاں میں ہاں ملاتی رہوں۔

ڈیوڈ: (افسوس اور شکست خوردہ لہجے میں) نرملا! میں نے تمھارے لیے اپنے عزیز و اقارب بہن بھائی۔ ماں باپ یہاں تک کہ اپنے مذہب کو بھی تیاگ دیا مجھے نہیں معلوم تھا کہ تم ایک دن ایسی طوطا چشمی برتو گی۔

نرملا: تو کوئی احسان نہیں کیا تم نے۔ تم جیسے چھتیس مجھے مل جاتے۔ کیا یہ کم ہے کہ میں نے تمھارے لڑکے کو جنم دیا اور اب اس کی دیکھ بھال کرتی ہوں۔

ڈیوڈ: میں نے لاکھ بار تو کہا کہ لڑکے کو میرے حوالے کر دو میں اس کی تعلیم کا اچھا انتظام کروں گا مگر تم کب راضی ہوئیں۔

نرملا: اہاہا— ننگے نواب قلعے پہ گھر— دھرا کیا ہے گانٹھ میں جو بچے کی پرورش کی ذمہ داری سنبھالتے۔

ڈیوڈ: (غصہ سے) بچے کے نام پر تم میری کمائی کا ایک ایک پیسہ مجھ سے اینٹھتی رہیں تمھیں ایسا کہتے شرم آنا چاہیے۔

نرملا: اچھا اب زیادہ سر نہ پڑو۔نہیں تو محلے والے تماشہ دیکھیں گے۔

ڈیوڈ: محلے والے تو تین دن سے روز ہی تماشہ دیکھ رہے ہیں۔ اب اور کون سا تماشہ دیکھنا باقی رہ گیا ہے۔

نرملا: اچھا اب چپکے سے گھر سے چلے جاؤ، تمھاری باتوں سے میری آنکھوں میں خون اتر رہا ہے۔

ڈیوڈ: (ٹھنڈی سانس بھر کر) خیر نرملا، انسان کو زندگی میں بہت سے تلخ تجربات ہوتے ہیں (کھڑے ہوکر اپنے دونوں ہاتھ پتلون کی جیبوں میں ڈالتے ہوئے) انھی تجربات سے انسان بہت کچھ سیکھتا ہے۔

(آہستہ آہستہ گردن جھکائے چلا جاتا ہے اور کوارٹر سے باہر نکل جاتا ہے۔ نرملا غصہ سے ٹہلنے لگتی ہے۔ پھر چار پائی پر بیٹھ جاتی ہے۔ کچھ دیر بعد باہر سے آواز)

آواز: نرلا— نرملا۔

نرملا: کیا بات ہے شانتی۔

(شانتی اندر آکر مسکراتے ہوئے)۔

شانتی: کیا پھر کوئی جھگڑا ہوگیا۔ تیز تیز باتیں کیوں ہو رہی تھیں۔

نرملا: (غصہ سے شانتی کو دیکھ کر) تجھے میرے گھر کی جاسوسی کرنے میں کیا مزہ آتا ہے۔

شانتی: اب پڑوس میں رہتی ہوں تو دو باتیں کان میں پڑ ہی جاتی ہیں۔ (نرملا کے پاس دالان میں آتے ہوئے) آخر تو نے اپنا مزاج اتنا چڑچڑا کیوں بنا لیا ہے۔ بے چارہ سال چھ مہینے میں تیرے پاس آجاتا ہے تو تو کتوں جیسا برتاؤ کرتی ہے اس کے ساتھ۔

نرملا: اگر تجھے اتنی ہی ہمدردی ہے اس سے تو رکھ لے اپنے پاس۔

شانتی: (مسکرا کر) میرے لیے تو بس پتا ایک ہی کافی ہے۔ (مسکراہٹ میں طنز پیدا کرتے ہوئے) دوسروں کے گھروں کو تاکنے جھانکنے کی میری عادت نہیں۔

نرملا: اوہ ہو بڑی کنواری مریم کا اوتار بنتی ہے۔ بے چاری دیکھ شانتی مجھے اپنے معاملات میں دوسروں کا دخل دینا پسند نہیں ہے۔

شانتی: (مسکرا کر) نرملا! میں تجھ سے جھگڑا کرنے نہیں آئی ہوں بھلا تو خود سوچ۔ تجھے اس آئے دن کی چخ چخ سے کیا ملتا ہے۔ آخر وہ بھی انسان ہے انسان سے انسانوں جیسا برتاؤ کرنا چاہیے کتوں جیسا نہیں۔ ذرا سوچ اس نے تیرے لیے کیسی بڑی بڑی قربانیاں دی ہیں۔

نرملا: تو جسے قربانی کہتی ہے میں اسے خودغرضی سمجھتی ہوں۔ اس جیسے چھتیس میرے پلو میں بندھے رہتے ہیں۔

شانتی: چھتیس تیرے پلو میں بندھے رہیں مگر قربانی سب نہیں دیتے۔ قربانی کوئی ایک ہی دیتا ہے۔ کتنے ہیں جو تیرے لیے اپنا مذہب تک چھوڑ دیں۔

نرملا: اسی لیے تو مجھے ان سے نفرت ہے جو زندگی کو فینسی ڈریس شو سمجھتے ہیں۔ جہاں کوئی عورت نظر پر چڑھی اور انھوں نے لباس بدلا۔

شانتی: (مسکرا کر) کس قدر غلط سمجھا ہے تو نے انسان کے جذبات اور احساسات کو۔ اری پگلی۔

نرملا: (بات کاٹ کر) میں ایک نرس ہوں۔ مجھے ہر روز نئے نئے مردوں سے واسطہ پڑتا ہے۔ دم توڑتے ہوئے مرد کی نبض پر جب بھی ہاتھ رکھا ہے تو اس کی رفتار میں جنسی تناؤ کا احساس پایا ہے۔

شانتی: (سنجیدہ ہوکر) میں بھی نرس ہوں۔ میں نے تو ایسا محسوس کیا ہے کہ اس تناؤ میں ہماری ہمدردی کے لیے شکرگزاری کا احساس ہوتا ہے۔

نرملا: یہ اپنی اپنی سمجھ کا پھیر ہے۔ ہر بیمار مرد ہمیں ایسی پیاسی نگاہوں سے دیکھتا ہے جیسے ہمیں نگل جائے گا۔ ہماری ہستی کیا ہے؟ ہماری شخصیت کیا ہے؟ ہماری

چال ڈھال ہماری مسکراہٹیں سب بناوٹی ہیں ہم اسپتال میں ایک طوائف سے کم نہیں۔

شانتی: (غیر محسوس نفرت آمیز لہجے میں) تم ہم کے بجائے میں کا لفظ استعمال کرو۔ میں اپنے پیشے کا احترام کرتی ہوں تم جن نگاہوں کو پیاسی کہتی ہو میں انھیں ہمدردی کی ایک خواہش ایک تمنا دیکھتی ہوں۔

نرملا: (غصہ سے) اس لیے کہ تم حسین نہیں ہو۔ خوبصورت نہیں ہو تم میں جنسی کشش نہیں ہے۔

شانتی: اور میں انھیں عورت کی Disqualification نہیں سمجھتی (مسکرا کر) ویسے میں تم سے جوان ضرور ہوں۔ تم جانے کس خود فریبی اور غلط فہمی میں مبتلا ہو۔ عورت کو مرد کا پیار بار بار نہیں ملتا۔

نرملا: مجھے نہیں چاہیے ایسے مرد کا پیار جسے بچے پیدا کرنے میں مزا آتا ہے۔

شانتی: یہی تو مصیبت ہے کہ ساری داستانِ محبت میں تم کو صرف اتنا یاد ہے کہ تم اس کے بچے کی ماں ہو۔ اس کا پیار اس کی محبت، اس کی قربانی اور اس کا تم سے لگاؤ سب کچھ بھول چکی ہو۔ تمھیں اپنے بچے سے بھی محبت نہیں۔

نرملا: میرے ان ہاتھوں نے اتنے بچے جنائے ہیں کہ اب مجھے بچوں سے بھی نفرت ہوگئی ہے۔

شانتی: تمھیں اس دنیا میں اپنے علاوہ کچھ اور دکھائی نہیں دیتا اس سے بڑھ کر تمھاری بھول اور کیا ہوسکتی ہے۔ اس دنیا میں صرف میں ہی نہیں تم بھی ہو۔

نرملا: اچھا اچھا۔ رہنے دو اپنا بھاشن۔ مجھے تمھاری نصیحت کی ضرورت نہیں ہے اور نہ ہمدردی کی۔ میں آپ اپنے کی ذمہ دار ہوں۔ (طنزیہ) بڑی پتی بھگت ہے۔ بیچاری انھیں الجھنوں سے تو سب کی آنکھوں کا تارا بننا چاہتی ہے۔ نہ صورت نہ شکل چولھے میں سے نکل۔ پرائے مردوں سے ہمدردی جتانے میں حاکم سے حاکم۔

شانتی: تجھ سے تو ہمدردی کرنا بھی مصیبت ہے نرملا۔

نرملا: میں جانتی ہوں تیری ہمدردی کا راز۔ رات بھر میرے گھر والے کے ساتھ گلچھرے اڑاتی رہی اور میں یہاں انگاروں پر لوٹتی رہی۔

شانتی: نیچے زمین اوپر آسمان ہے نرملا۔ کچھ تو سوچا کر تو نے لڑ کر اسے گھر سے نکال دیا۔ وہ قسمت کا مارا دو گھڑی بھر کے لیے میرے پاس آبیٹھا تو یہ گلچھرے اڑانا ہو گیا۔ اپنے جیسا سب کو کیوں سمجھتی ہے۔

نرملا: میں کیسی ہوں وہ بھی کہنا۔ (طنزیہ) ہاں تیری طرح پتی بھگتی کا ڈھنڈورا نہیں پیٹتی پھرتی۔

شانتی: بس اب چپ رہ نہیں تو ساری قلعی کھول دوں گی۔ پھر تلملائی تلملائی پھرے گی۔

نرملا: تو کہہ نا۔ روکتا کون ہے۔ میرے بھی منہ میں زبان ہے۔ (شانتی کوئی جواب نہیں دیتی) میں ان گیدڑ بھبکیوں میں آنے والی نہیں ہوں (فخریہ) میں نے اچھے اچھوں کو ننگی کا ناچ نچایا ہے تجھ بیچاری کی کیا حیثیت ہے۔

شانتی: کیوں محلے والوں کو سناتی ہے۔ تجھے اپنی عزت کا خیال نہیں تو دوسروں کا تو پاس لحاظ کر۔

نرملا: کہاں کی عزت والی ہے جو پاس لحاظ کروں۔

شانتی: اچھا بابا اب چپ رہ تو ہی بڑی سہی۔ میں کل ڈاکٹر صاحب سے کہہ کر دوسرے کوارٹر میں اٹھ جاؤں گی پھر تیرے من کو چین آجائے گا۔

نرملا: اگر ڈاکٹر تیرا یار لگتا ہے تو اس سے بھی کہہ دیکھ— ایسے تین سو ساٹھ ڈاکٹروں کو گھاس ڈال چکی ہوں۔ دو چار ہمیشہ جیب میں پڑے رہتے ہیں۔

(ایک شخص کوارٹر میں داخل ہو کر)

آدمی: ارے بائی جی کس پر بگڑ رہی ہو۔

نرملا: (پلٹ کر غصہ سے) کیا میں کوٹھے پر بیٹھنے والی طوائف ہوں جو بائی جی کہتا ہے۔

آدمی: ایک کیس ہے (طنزیہ) بی بی جی۔

نرملا: کیس ہے تو میں کیا کروں۔ ڈیوٹی والی نرس کے پاس کیوں نہیں جاتا۔ کیا سارے جہاں کا ٹھیکا میں نے ہی لے رکھا ہے۔

آدمی: (مسکرا کر مونچھوں پر ہاتھ پھیر کر) تھانیدار صاحب نے کہا تھا تم کو ہی بلا لاؤں۔

نرملا: یوں کیوں نہیں کہتا کہ تھانیدار صاحب کے یہاں سے آیا ہے (کمرے میں جاتے ہوئے) ٹھہر جا میں چلتی ہوں۔ (کمرے میں چلی جاتی ہے اور اندر سے دروازہ بند کر کے) تھانیدار صاحب علاقے سے کب لوٹے۔

آدمی: آج صبح ہی لوٹے ہیں۔

(شانتی طنزیہ مسکراتی ہے اور چلی جاتی ہے۔ نرملا کمرے کے اندر سے)

نرملا: اب ان کی مسز کی طبیعت کیسی ہے۔

آدمی: ابھی کو دکھلانا ہے ڈاکٹر بابو نے بولا ہے کہ اس کی رپورٹ کے بعد دوائی لکھیں گے۔

نرملا: ڈاکٹر صاحب وہیں بیٹھے ہیں؟

آدمی: نہیں وہ تو پہلے آئے ہیں۔ تھانیدار صاحب اکیلے بیٹھے ہیں — (شرارت سے مسکرا کر) آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔ (کچھ دیر بعد نرملا ڈیوڈ کمرے سے نکلتی ہے اس نے ساڑی بدل لی ہے چہرے پر ہلکا ہلکا پاؤڈر سے ہونٹوں پر لپ اسٹک نمایاں ہے۔ باہر آ کر بلند آواز سے)

نرملا: جمی — ارے او جمی — (آہستہ سے) جانے کہاں جا کر مر گیا۔ (پھر بلند آواز سے) ارے او جمی۔ (دور سے جمی کی آواز 'آیا ممی' نرملا آہستہ سے) جانے کہاں کے لچے لفنگوں کے ساتھ مارا مارا پھرتا ہے دن بھر۔ (کچھ دیر بعد جمی آتا ہے عمر دس گیارہ سال کی ہے کیوں رے کہاں جھک مارتا پھرتا ہے۔ کتنی مرتبہ منع کیا کہ ان آوارہ لڑکوں کے ساتھ مارا مارا نہ پھرا کر۔

جمی: ممی میں تو —

نرملا: بس چپ رہ میں ایک کیس پر جا رہی ہوں۔

جمی: میں بھی چلوں۔

نرملا: ہاں تو میرا باڈی گارڈ ہے نا— چل گھر میں بیٹھ۔ کہیں آنا جانا نہیں۔ (جمی غصہ سے برا سا منہ بناتا ہے) گھر اکیلا مت چھوڑنا۔

جمی: ممی! پاپا کہاں گئے!

نرملا: جہنم میں۔ پاپا سے بڑا پیار ہے لاڈلے کو (آدمی کی طرف دیکھ کر) آؤ چلو— (دروازے کے پاس جاکر پھر پلٹ کر جمی کو دیکھ کر) اگر گھر سے کہیں باہر گیا تو یاد رکھنا چمڑی ادھیڑ دوں گی۔

(آگے آگے نرملا اور پیچھے پیچھے آدمی جاتا ہے۔ جمی ماں کی پیٹھ پھرتے ہی اس کی طرف دیکھ کر منہ چڑاتا ہے۔ نرملا اور آدمی کوارٹر سے نکل جاتے ہیں۔ جمی کچھ دیر خاموش کھڑا رہتا ہے پھر کوارٹر کے دروازے سے جھانک کر باہر دیکھتا ہے۔ عجیب طرح سے مٹکتا ہوا سیٹی بجاتا ہے اور دالان میں آکر کھڑا ہوجاتا ہے اور پھر زور سے سیٹی بجاتا ہے، باہر سے سیٹی کا جواب آتا ہے اور کچھ دیر بعد ایک سترہ اٹھارہ سالہ لڑکا کوارٹر کے دروازے سے جھانکتا ہے۔ جمی آنکھ مار کر لڑکے کو اندر آنے کا اشارہ کرتا ہے۔ لڑکا اندر آتے ہوئے)۔

رمیش: کہاں گئی تیری ممی!

جمی: تھانیدار صاحب کے یہاں— آج شام کا کیا پروگرام ہے۔

رمیش: تیرے ساتھ کیا کوئی پروگرام بنائے۔ وقت پر دھوکا دیتا ہے۔ اس ندی پر چلنے کو کہا پر تیری ہمت نہیں پڑی۔

جمی: ندی پر لڑکے ہمیشہ گندے کھیل کھیلتے ہیں۔ ہمیشہ مجھ کو ہی لڑکی بناتے ہیں۔

رمیش: اچھا تو تو اپنے آپ کو لڑکا سمجھتا ہے۔ اپنی شکل تو دیکھ بے چارے اور آواز بالکل لڑکیوں کی طرح ہے۔ خیر تو ہمارے ساتھ چل۔ میرے سامنے کوئی مذاق کرے گا تو سب کی چٹنی بنا دوں گا۔

جمی: کیوں ڈھینگیں دیتا ہے بس دیکھ لی تیری بہادری اس دن میری ممی نے ایک

ڈانٹ پلائی تو منہ لٹکا کر چلا گیا۔

رمیش: تیری ممی کے کون منہ پڑے (مسکرا کر) مجھے تیرا خیال آ گیا تھا نہیں تو وہ سناتا کہ وہ بھی یاد کرتی۔ میں عورتوں کے منہ ویسے ہی نہیں پڑتا۔ (جمی قہقہہ مار کر ہنس کر)

جمی: ہیرو جیسے ڈائیلاگ بولتا ہے۔ دلیپ کمار بننے کا بڑا شوق ہے۔ پر دلیپ کمار چوری نہیں کرتا تو نے چوری کی تھی۔

رمیش: میں نے چوری کیوں کی تھی جانتا بھی ہے تو (جمی کو دیکھ کر) اگر میں چوری نہیں کرتا تو۔ (جمی بش شرٹ کی طرف اشارہ کر کے) تو یہ ریشمی بش شرٹ نہیں پہنے ہوتے بیٹا۔ میری چوری کو دعا دے۔

جمی: اچھا تو تو نے میرے لیے چوری کی تھی۔

رمیش: میں نے کس کے لیے چوری کی تھی اس کو چھوڑ۔ یہ بتلا الطاف آتا ہے تیری ممی کے پاس۔

جمی: روز آتا ہے۔

(جمی رمیش کی شکل دیکھ کر قہقہہ مارتا ہے)

رمیش: ابے ہنس کیوں رہا ہے۔

جمی: کل میں نے کیا چکما دیا۔ وہ چارپائی پر سو رہا تھا۔ میں نے کہہ دیا پاپا ہیں اور وہ ڈر کر بھاگ گیا۔

رمیش: (غصہ سے) میں الطاف کا سر پھوڑ دوں گا۔ نہیں تو میرا بھی نام رمیش نہیں۔

جمی: لیکن تو اس سے کیوں جلتا ہے۔ وہ تو تیرا کلاس فیلو ہے۔

رمیش: تو نہیں سمجھے گا ان باتوں کو (نفرت سے) تیری ممی بڑی لالچی ہے۔

جمی: اب تجھے میری ممی سے بیر ہو گیا ہے۔

رمیش: تیری ممی سے بیر۔ (کچھ سوچ کر) دیکھ جمی۔ اب اگر تو الطاف کے ساتھ کھیلا یا اس سے بولا تو میں سب باتیں تیری ممی سے کہہ دوں گا۔ (اسی وقت نرملا

آتی ہے اور رمیش کو گھر میں دیکھ کر غصہ سے)

نرملا: کیوں رمیش تو پھر آیا میرے گھر۔

رمیش: ایک بار نہیں سو بار آؤں گا۔ اب تم نے مجھے آنے سے روکا تو میں سب کے سامنے سب باتیں کہہ دوں گا۔

نرملا: (غصہ سے) کیا کہہ دے گا۔ یاد رکھو رمیش میں بہت خراب عورت ہوں۔

رمیش: وہ تو سب ہی کہتے ہیں۔ تم نے میری زندگی تباہ کردی ہے۔

نرملا: میں نے تیری زندگی تباہ کردی ہے؟

رمیش: ہاں تم نے جب تک میرے پاس پیسے رہے تم مجھے خوب بہلاتی پھسلاتی رہیں۔ میٹھی میٹھی باتیں کرتی رہیں، اب مجھے گھر سے بھگاتی ہو۔

نرملا: تیرے پاس پیسے، چور کہیں کا۔

رمیش: اور میں نے چوری کس کے لیے کی تھی تمھارے لیے ہاں تمھارے لیے۔

نرملا: اوہ ہو یہ بات ہے۔ یہ سبق تجھے کس نے پڑھایا ہے۔

رمیش: اب میں ایسا بچہ نہیں ہوں کہ کسی کے پڑھائے ہوئے سبق کو طوطے کی طرح رٹنے لگوں۔ لوگ سچ کہتے ہیں کہ تم ڈائن ہو۔

نرملا: اگر میں ڈائن ہوں تو پھر بار بار میرے پاس کیوں آتا ہے۔

رمیش: اب میں تمھیں آسانی سے چھوڑنے والا نہیں ہوں جب تک اپنے پیسے وصول نہ کرلوں۔

نرملا: یہ دم خم ہیں۔ مجھے پولیس میں اطلاع کرنا پڑے گی۔

رمیش: ایک بار نہیں سو بار کر دیکھو اب مجھے پولیس کا ڈر نہیں ہے۔

نرملا: ہاں کیوں ہوگا۔ پولیس کی جوتیاں کھا کر مضبوط جو ہوگیا ہے۔

رمیش: ہاں۔۔۔ تم تھانیدار صاحب کی دوستی پر زیادہ نہ اترانا۔ (دروازہ کی طرف جاتے ہوئے) جب تک میں تمھیں تباہ نہیں کردوں گا چین سے نہیں بیٹھوں گا۔

نرملا: اچھا اچھا جو تجھ سے بنے کرلینا۔ بہت دیکھے ہیں تجھ جیسے تیس مار خاں۔ اور

ہاں سن لے اب اگر اس گھر میں قدم رکھا تو پاؤں توڑ دوں گی۔

رمیش: مر گئے پاؤں توڑنے والے اور ہاں یہ بھی سن لو جس دن میں نے الطاف کو اس گھر میں آتے دیکھا تو اسے جان سے ہی مار ڈالوں گا۔ (رمیش چلا جاتا ہے نرملا جمی سے)

نرملا: کیوں رے جمی میں نے کتنی بار تجھ سے کہا کہ تو اس رمیش کی دوستی چھوڑ دے مگر تو باز نہیں آتا۔ اب اگر تجھے اس کے ساتھ دیکھ لیا تو زندہ چبا جاؤں گی۔

جمی: مگر وہ میرا دوست ہے ممی۔

نرملا: تجھے اس کی دوستی چھوڑنا پڑے گی۔

جمی: اگر میں نے اس کی دوستی چھوڑ دی تو وہ— تو وہ—

نرملا: تو وہ کیا— بولتا کیوں نہیں۔

جمی: تو وہ مجھے مارے گا— اور وہ—

نرملا: مارے گا کیسے—؟ میں پولیس میں اس کی رپورٹ لکھوا دوں گی۔

جمی: نہیں ممی ایسا نہ کرنا نہیں تو وہ— نہیں تو وہ—

نرملا: پھر وہ— وہ— بولتا کیوں نہیں کیا بات ہے۔

جمی: ممی— ممی—

(رونے لگتا ہے)

نرملا: ارے تو روتا کیوں ہے کم بخت کیا باپ مرگیا کچھ منہ سے تو پھوٹ کہ روئے ہی جائے گا۔

جمی: نہیں ممی میں نہیں کہوں گا۔ میں نہیں کہوں گا وہ بری بات۔

نرملا: بری بات ہے! کیسی بری بات ہے؟

جمی: بہت بری بات ہے ممی۔ رمیش سب سے کہہ دے گا۔ جمی رونے لگتا ہے۔ نرملا اسے دو تین طمانچے مار کر)۔

نرملا: جانے کس منحوس باپ کی اولاد ہے کم بخت اور گھوم پھر آوارہ لڑکوں میں اب

لڑکیوں کی طرح آنسو بہا رہا ہے ہتھیارا۔ (جمی کو ڈھکیل کر) نکل اس گھر سے اور جا اپنے باپ کے پاس۔ جانے کس گھڑی جنم دیا تھا پاپی کو۔

جمی: (روتے ہوئے) ممی—

نرملا: (پھر دھکا دے کر) میں تیری شکل دیکھنا نہیں چاہتی نکل میرے گھر سے (دھکے دے کر جمی کو گھر سے نکال دیتی ہے اور دروازہ بند کر لیتی ہے۔ باہر سے جمی کے رونے کی آوازیں برابر آتی رہتی ہیں۔ کچھ دیر بعد) اب رونا بند کرے گا یا نہیں۔ کیا باپ مر گیا ہے جو یوں رو رہا ہے۔

جمی: دروازہ کھول دو ممی۔ (دروازہ ہلا کر) دروازہ کھول دو ممی۔

نرملا: دروازہ نہیں کھلے گا اب جا کر رہ انہی لڑکوں کے ساتھ جن سے تیرا یارانہ ہے۔

جمی: ممی! دروازہ کھول دو۔

(نرملا دروازہ کھول کر جمی کا ہاتھ پکڑ کر اندر گھسیٹتی ہے اور دو چار دھپ رسید کر کے کمرے کی طرف لے جاتے ہوئے۔)

نرملا: جا اب چپکا پڑ رہ۔ اب اگر گھر سے نکلا تو یاد رکھنا جان سے مار ڈالوں گی۔ (الطاف داخل ہوتا ہے۔ عمر سترہ اٹھارہ سال کے قریب ہے۔ اچھا لباس پہنے ہے جس سے کھاتے پیتے گھرانے کا معلوم ہوتا ہے۔ نرملا جمی کو کمرے کے اندر کر کے) بس اب باہر مت نکلنا۔

الطاف: ارے کیا بات ہے یہ آپ جمی کو یوں کیوں مار رہی ہیں۔

نرملا: (الطاف کی بات پر دھیان نہ دے کر) اسی لیے سمجھاتی تھی کہ آوارہ لڑکوں کے ساتھ نہ گھوما کر۔

الطاف: آخر کچھ کہیے تو کیا بات ہے۔

نرملا: آوارہ لڑکوں کے ساتھ ساتھ گھوم گھوم کر بدچلن ہو گیا ہے لاکھ سمجھاتی ہوں مگر اس کے کان پر جوں تک نہیں رینگتی۔

الطاف: میں نے بھی جمی سے لاکھ بار کہا کہ رمیش کے ساتھ ندی پر نہ جایا کر مگر اسے

جانے کیا مزہ آتا ہے اس کے ساتھ جانے میں۔

نرملا: اس کم بخت رمیش نے تو جان ضیق کر رکھی ہے مرتا بھی تو نہیں کہ جان کو سکون ملے۔

الطاف: ندی پر ایسے گندے کھیل کھیلے جاتے ہیں کہ کہہ نہیں سکتا۔

نرملا: اور تم نے آج تک یہ سب کچھ مجھ سے چھپایا۔

الطاف: ایک دن سختی سے منع کیا تو اس نے ہیڈ ماسٹر سے جا کر شکایت کر دی اور وہ الٹا مجھ پر بگڑا۔

نرملا: مجھ سے کہا ہوتا میں اس ہیڈ ماسٹر کو بھی سمجھ لیتی۔

الطاف: ارے چھوڑیے ہیڈ ماسٹر خود الٹی کھوپڑی کا ہے اس نے میرے باپ کو لکھ بھیجا ہے کہ میرا چال چلن ٹھیک نہیں ہے آپ کے یہاں میرا آنا جانا ہے۔

نرملا: تو سارے جہاں کا درد اس کے جگر میں کیوں ہے۔

الطاف: جانے کس دماغ کا ہے اسکول میں دن بھر لڑکوں پر غراتا رہتا ہے۔

نرملا: پھر تمھارے پتا جی نے کیا کہا۔

الطاف: آج کل میں وہ خود آنے والے ہیں۔ کم بخت ہیڈ ماسٹر ان سے جانے کیا کیا لگائے گا۔

نرملا: تم نے ہیڈ ماسٹر سے کہہ دیا ہوتا کہ ہمارے تمھارے فیملی ریلیشن ہے۔

الطاف: کوئی آدمی ہو تو بات کی جائے۔ منٹ منٹ پر تو کاٹ کھانے کو دوڑتا ہے۔ میں نے تو لاکھ کہا مگر اس نے ایک نہ سنی بلکہ اس نے تو آپ کے متعلق کہا کہ آپ اچھی عورت نہیں ہیں۔

نرملا: وہ خود کہاں کا اچھا ہے صورت سے لچا معلوم ہوتا ہے۔ ابھی مجھ سے واسطہ نہیں پڑا ہے۔ دو منٹ میں ساری اکڑفوں نہ نکال دوں تو میرا نام نرملا نہیں۔

الطاف: اس نے مجھ سے کہا ہے کہ اب اگر میں آپ کے گھر آیا گیا تو وہ مجھے اسکول سے نکال دے گا۔

نرملا: بڑا آیا ہے اسکول سے نکالنے والا۔ اس کے باپ کا اسکول ہے نا۔

الطاف: اپنی سی۔ آئی۔ ڈی چھوڑ رکھی ہے میرے پیچھے چھپ چھپا کر آتا ہوں آپ کے پاس۔

نرملا: کوئی کہیں آئے جائے اسے کیوں فکر لگی رہتی ہے۔

الطاف: کہتا ہے اسکول کے ڈسپلن پر برا اثر پڑتا ہے۔

نرملا: اوہو بڑا آیا ہے ڈسپلن والا۔ یہی تو ایک رہ گیا ہے قوم میں ڈسپلن پیدا کرنے والا۔

الطاف: میں یہی کہنے آیا تھا کہ ابا جان کو آپ ایسی پٹی پڑھا دینا کہ وہ ہیڈ ماسٹر سے الجھ پڑیں۔ ان کا غصہ بہت تیز ہے۔

نرملا: خیر میں دیکھ لوں گی تم فکر نہ کرو۔

الطاف: آپ کے دونوں بلاؤز سل گئے ہیں شام کو لیتا آؤں گا۔ مسٹر ڈیوڈ تو شام کو گھر پر ہی ہوں گے۔

نرملا: ہوں گے تو کہاں کا غضب ہو جائے گا۔

الطاف: اچھا تو اب میں جا رہا ہوں۔
(دروازہ کی طرف جاتا ہے)

نرملا: شام کو ضرور آنا۔ بھولنا نہیں۔

الطاف: اچھا۔

(الطاف کمرے سے چلا جاتا ہے۔ نرملا دالان میں ٹہلنے لگتی ہے کمرے میں سے آہستہ آہستہ سسکیوں کی آواز)

نرملا: ابھی تک چپ نہیں ہوا۔ کس کی جان کو رو رہا ہے (کمرے کا دروازہ کھولتی ہے جمی دروازے کے پاس کھڑا رو رہا ہے۔ اس کا ہاتھ پکڑ کر باہر گھسیٹتے ہوئے) اب کیوں روئے جا رہا ہے۔ میں کہتی ہوں تو مرجاتا تو اچھا تھا۔

جمی: ممی! (نرملا سے لپٹ جاتا ہے) اب میں یہاں نہیں رہوں گا۔

نرملا: یہاں نہیں رہے گا تو کیا جہنم میں جا کر رہے گا۔

جمی: مگر ممی۔

نرملا: بس چپ رہ۔ اور تو نے الطاف کی شکایت ہیڈ ماسٹر سے کیوں کی تھی۔

جمی: ممی الطاف بہت خراب لڑکا ہے۔

نرملا: وہ تو خراب لڑکا ہے اور رمیش بھگوان کا اوتار ہے۔

جمی: وہ مجھ سے گندی گندی باتیں کرتا ہے— اور—

نرملا: اور کیا بول چپ کیوں ہوگیا۔

جمی: وہ تمھارے بارے میں گندی باتیں کرتا ہے۔ کہتا ہے اس نے ساڑی لاکر دی ہے بلاؤز سلوا کر دیے ہیں۔

نرملا: کہنے دے اس سے کیا تیری ذات کم ہوجاتی ہے۔

جمی: اسکول میں لڑکے مجھے چھیڑتے ہیں۔ میرا مذاق اڑاتے ہیں۔ اب میں اسکول پڑھنے نہیں جاؤں گا۔

نرملا: اسکول پڑھنے نہیں جائے گا تو کیا بھاڑ جھونکنے جایا کرے گا۔

جمی: نہیں ممی ہیڈ ماسٹر کو سب معلوم ہوگیا ہے اور وہ بھی مجھے برا لڑکا سمجھنے لگا ہے پہلے بہت پیار کرتا تھا۔

نرملا: میں ماسٹر شادی لال سے کہہ دوں گی وہ اسکول میں تیرا خیال رکھیں گے۔

جمی: اسکول میں ماسٹر شادی لال کی سنتا کون ہے۔ سب سے ہی تو لڑتے پھرتے ہیں اور ان کا ہمارے گھر آنا جانا بھی دوسرے ماسٹر پسند نہیں کرتے۔ ایسا کیوں ہے ممی۔ سب ہم کو برا کیوں سمجھتے ہیں۔

نرملا: سمجھنے دے کم بختوں کو کتوں کے بھونکنے سے کارواں نہیں رکتا۔

جمی: — کہیں دوسرے گاؤں چلو ممی۔ جہاں لوگ ہمیں اچھا سمجھیں ہم پاپا کے ساتھ رہا کریں۔

نرملا: اچھا تو اب تیرے پاپا نے تجھے بہلایا پھسلایا ہے آنے دے آج انھیں گھر میں کیسے آڑے ہاتھوں لیتی ہوں (اسی وقت ڈیوڈ کمرے میں آتا ہے۔ اس

کے چہرے سے غصہ ظاہر ہورہا ہے اور اس پر سخت ہیجانی کیفیت طاری ہے۔
نرملا اسے دیکھ کر) کیوں جی یہ تم نے جمی کو کیا سبق پڑھا دیا ہے۔

ڈیوڈ: (غصہ سے)اسے تو میں بعد میں سبق پڑھاؤں گا پہلے تم کو سبق پڑھا دوں۔ آخر تم نے یہ کیا گندگی پھیلا رکھی ہے۔

نرملا: اچھا تو تم مجھ سے جواب طلب کر رہے ہو۔

ڈیوڈ: ہاں جواب طلب کر رہا ہوں۔ ذرا بازار میں جا کر دیکھو کیا تماشہ ہو رہا ہے۔

نرملا: کیا تماشہ ہورہا ہے۔

ڈیوڈ: آپ کے کرتوتوں کا ڈراما۔ سارے بازار والے تھوتھو کر رہے ہیں آخر یہ اسکول کے لونڈوں کو کیوں منہ لگا رکھا ہے کہ وہ رات دن گھر میں گھسے رہتے ہیں۔

نرملا: میری مرضی جسے چاہوں گی گھر میں آنے دوں گی۔

ڈیوڈ: اور وہ بازار میں لڑیں گے اور سارے قصبے میں تھوتھو ہوگی۔ رمیش اور الطاف نے بازار میں لڑکر ایک ڈراما کر رکھا ہے۔

نرملا: لڑتے ہیں تو لڑیں۔ میں نے ان سے لڑنے کو نہیں کہا ہے۔

ڈیوڈ: آپ نے نہیں کہا ہے مگر ڈرامے کی ہیروئن آپ ہی ہیں۔

نرملا: دیکھو جی تمھیں ایسی باتیں کرنے کا حق نہیں ہے۔

ڈیوڈ: مجھے ایسی باتیں کرنے کا حق نہیں ہے۔ نرملا! تم کو اسی وقت اس قصبے سے میرے ساتھ چلنا ہوگا۔ میں ایک منٹ تمھارا یہاں رہنا برداشت نہیں کروں گا۔

نرملا: اوہو آج تو بڑا حق جتلا رہے ہو۔ میرے گھر سے نکل جاؤ سیدھے سیدھے۔

ڈیوڈ: دیکھو نرملا بہت ہوگئی اگر تم سیدھے طرح نہیں مانو گی تو۔

نرملا: تم مجھے مارو گے پیٹو گے۔

ڈیوڈ: ہاں ماروں گا۔ پیٹوں گا۔

نرملا: یہ ہمت ہے (ڈیوڈ کو دھکے دیتے ہوئے)۔ نکل جا گھر سے نامراد پاجی۔
(ڈیوڈ نرملا کی چوٹی پکڑ کر دو تین طمانچے رسید کرتا ہے)۔

ڈیوڈ: — آوارہ — بدچلن۔

(نرملا زور سے اس کے ہاتھ میں کاٹ لیتی ہے۔ ڈیوڈ اس کی چوٹی چھوڑ دیتا ہے۔ جمی زور زور سے روتا ہے۔ نرملا ڈیوڈ کو دھکے دیتے ہوئے)

نرملا: نکل جا میرے گھر سے۔

ڈیوڈ: (چیخ کر) نرملا دیکھو ہوش میں آجاؤ نہیں تو تمھارے حق میں برا ہوگا۔

نرملا: دیکھ لوں گی جو ہوگا۔ (ڈیوڈ کو باہر نکال کر دروازہ بند کرتے ہوئے) اب اس گھر میں قدم رکھا تو مجھ سے برا کوئی نہ ہوگا
(جمی دروازے کی طرف جاتے ہوئے)

جمی: میں بھی پاپا کے ساتھ جاؤں گا۔

نرملا: (جمی کا ہاتھ پکڑ کر) بڑا آیا ہے پاپا کے ساتھ جانے والا چل جا کر کمرے میں لیٹ نہیں تو دو دھپ رسید کروں گی سب پاپا پاپا بھول جائے گا۔
(کمرے کی طرف گھسیٹ کر لے جاتی ہے۔ دروازے پر آواز)

آواز: مسٹر مسٹر۔

نرملا: کون ہے۔
(جمی کو کمرے میں بند کر دیتی ہے)

آواز: آپ کو ڈاکٹر صاحب نے بلایا ہے جلدی چلیے۔

نرملا: بی بی جی کہاں ہیں۔

آواز: وہ تو کل اپنے میکے چلی گئی ہیں۔ تار آیا تھا۔

نرملا: چلتی ہوں اور کون ہے وہاں۔

آواز: کوئی نہیں۔ ڈاکٹر صاحب اکیلے بیٹھے ہیں۔

(دروازہ کھولتی ہے۔ اسی وقت پولیس کا سپاہی آتا ہے۔)

سپاہی: آپ کو اسی وقت تھانے میں بلایا ہے۔

نرملا: میں ایک ضروری کام سے جارہی ہوں۔ کیا بات ہے؟

سپاہی: یہ تو آپ کو تھانے میں چل کر ہی معلوم ہوگا۔ دو لڑکوں میں لڑائی ہوگئی ہے اسی میں آپ کو گواہی دینا ہے۔

نرملا: میں کسی گواہی شہادت میں نہیں جاتی مجھے ایک ضروری کام سے جانا ہے۔

سپاہی: ضروری کام پھر ہوتا رہے گا۔ ابھی تو آپ میرے ساتھ چلیے۔

(نرملا پہلے تو کچھ سوچتی ہے پھر آہستہ آہستہ قدموں سے سپاہی کے ساتھ باہر چلی جاتی ہے۔)

(پردہ)

(گیلنڈی، امرت سر، 8 اگست 1963)

گونگے کے خواب

افرادِ تمثیل

(1) جمیل (اسکول ماسٹر) (2) سلمیٰ (جمیل کی بیوی) (3) شکیلہ (جمیل کی لڑکی) (4) نعیم (جمیل کا لڑکا) (5) عورت (ایک پڑوسن)

منظر

جب پردہ اٹھتا ہے تو ایک کمرہ نظر آتا ہے جس میں سامنے ایک تخت بچھا ہوا ہے اس پر سفید فرش ہے دیوار سے لگا ہوا ایک گاؤ تکیہ رکھا ہے جس کے پاس ایک پاندان رکھا ہے۔ تخت کے نیچے پائے سے لگا ہوا اگالدان رکھا ہے دیواروں پر طغرے آویزاں ہیں جن میں قرآن کی آیات جلی حروف میں لکھی ہوئی ہیں۔ مشرقی جانب کونے میں ایک دروازہ ہے جس پر گہرے نیلے رنگ کا ایک معمولی موٹے کپڑے کا پردہ لٹک رہا ہے۔ اسی دیوار میں کچھ کھونٹیاں ہیں جن پر کئی رنگ کے مختلف کپڑے ٹنگے ہوئے ہیں اسی دیوار کے پاس ایک آرام کرسی پڑی ہے۔ مغربی جانب دیوار میں کچھ طاق ہیں جن میں کچھ سگریٹوں کے ڈبے پڑے ہیں۔ ایک طاق میں ایک ٹائم پیس رکھی ہے اور تیسرے طاق میں کچھ

کتابیں بے ترتیب بھری ہوئی ہیں۔ اس طاق کے پاس ایک معمولی سی چھوٹی سی میز رکھی ہے جس پر دو چار کتابیں۔ کاپیاں اور قلم دوات بے ترتیب پڑے ہیں اور میز کے پاس ایک معمولی سی کرسی رکھی ہے۔ اس میز کے پاس ایک اور دروازہ ہے جو ایک دوسرے کمرے میں کھلتا ہے اس پر بھی پہلے دروازے کی طرح نیلا اور موٹا سا پردہ پڑا ہوا ہے۔

جب پردہ اٹھتا ہے تو سامنے تخت پر سلمٰی بیٹھی ہوئی نظر آتی ہے اس کی عمر چالیس سال کے قریب ہے۔ مگر دیکھنے میں چالیس سے زیادہ نظر آتی ہے چہرے پر ایک خاص قسم کی سنجیدگی ہے اس کا لباس معمولی ہے مگر صاف ستھرا ہے بالوں کی ایک لٹ سفید ہے جو بالکل سامنے نظر آ رہی ہے۔

میز کے پاس کرسی پر نعیم اکڑوں بیٹھا ہے اور ایک کتاب پر جھکا ہوا اسے غور سے پڑھ رہا ہے۔ اس کی عمر دس گیارہ سال کے قریب ہے۔ سفید رنگ کی قمیص اور نیلا نیکر پہنے ہے اور صورت سے کافی اسمارٹ معلوم ہوتا ہے آنکھوں میں ذہانت کی چمک ہے اس کے بال سیاہ اور گھنگھریالے ہیں جو اس کی پیشانی پر پڑے ہوئے ہیں سلمٰی کچھ دیر اسے خاموشی سے دیکھتے رہنے کے بعد۔

سلمٰی: ارے نعیم بیٹا۔ ذرا میری عینک تو اٹھا دے میں تیرے باپ کی شیروانی میں پیوند لگا دوں ابھی آکر مانگیں گے۔

نعیم: (کتاب پر سے نظریں نہ اٹھا کر) دیکھتیں نہیں امی ــــ میں پڑھ رہا ہوں۔

سلمٰی: (طنزیہ اور غصہ سے) بڑا آیا ہے پڑھنے والا ایک تو باپ نے پڑھ کر تیر مارا ہے کچھ بیٹا تیر مار لے گا۔

نعیم: دیکھتیں نہیں ــ ابا جان ماسٹر ہیں ماسٹر۔ کتنے بہت سے لڑکوں کو پڑھاتے ہیں۔

سلمٰی: خاک پڑھاتے ہیں۔ (مسکرا کر) بہکاتے ہیں بہکاتے۔ چل اٹھ میری عینک لادے۔ دیکھ وہ سامنے والے طاق پر رکھی ہے۔

(نعیم اٹھ کر عینک لا کر دیتا ہے)۔

نعیم: یہ لیجیے۔ 15

سلمیٰ: اور دیکھو وہ سامنے والی شیروانی بھی اٹھا دو (نعیم کھونٹی پر سے شیروانی لاکر دیتا ہے) کتنے دنوں سے کہہ رہی ہوں کہ ایک شیروانی کا کپڑا لے آؤ مگر خیال ہی نہیں شیروانی میں بھلا پیوند کیا بھلا معلوم ہوگا۔ (عینک لگا کر الٹ پلٹ کر دیکھتی ہے پھر نظریں اٹھا کر) ذرا بیٹا جاکر تو دیکھ تیری بہن ابھی تک نہیں آئی ہے۔

نعیم: امی! آپ تو بلا وجہ پریشان ہوتی ہیں۔ آتی ہی ہوں گی۔

سلمیٰ: میں تو اس لونڈیا سے عاجز ہوں ساڑھے چار بج گئے مگر بیگم صاحبہ غائب ہیں۔

نعیم: ابھی تو کالج کی چھٹی ہوئی ہوگی امی۔

سلمیٰ: باتیں بنانا خوب آتا ہے چل جا دیکھ۔

نعیم: آپ تو پڑھنے بھی نہیں دیتیں۔

سلمیٰ: جا میرا منا دیکھ تو آ۔ جلدی سے آکر کہنا۔ دیکھوں تو کتنی جلدی آتا ہے۔ ذرا گلی کے نکڑ تک دیکھ آنا۔ (نعیم برا سا منہ بنا کر باہر چلا جاتا ہے سلمیٰ شیروانی سینے لگتی ہے۔ کچھ دیر بعد اسی دروازے سے جمیل داخل ہوتا ہے اور سلمیٰ کے پاس تخت پر بیٹھ کر)

جمیل: نعیم کہاں گیا۔

سلمیٰ: ذرا گلی کے نکڑ تک بھیجا ہے شکیلہ کے دیکھنے کو اب ساڑھے چار بج گئے مگر اس کا پتہ نہیں۔

جمیل: آتی ہوگی۔ آخر کالج سے یہاں تک آئے گی بھی تو۔

سلمیٰ: میرے دل پر تو ہول سا ہونے لگتا ہے۔ میں تو کہتی ہوں۔ اب اس کا پڑھنا لکھنا بند کرو یہ سب تو امیروں کے چوچلے ہیں۔ جوان لڑکی یوں سڑکوں پر ماری ماری پھرے مجھے تو بالکل پسند نہیں۔

جمیل: تمھاری تو وہی مثل ہے کہ مرغے کی ایک ٹانگ۔ بغیر پڑھے لکھے کی آج کل

کون قدر کرتا ہے۔

سلمیٰ: مگر لڑکی کو ایم۔ اے، بی اے کرا کے نوکری تو کرانا ہے نہیں۔ بس جتنا پڑھنا تھا پڑھ لیا اور اگر ایسا ہی پڑھانے کا شوق ہے تو بس کا انتظام کردو اس میں بیٹھ کر چلی جایا کرے گی اور آجایا کرے گی۔

جمیل: تم تو رئیسوں کی باتیں کرتی ہو کالج کی فیس تو وقت پر ادا ہوتی نہیں یہ بس کی فیس کہاں سے آئے گی۔

سلمیٰ: جو تم پچیس سال سے تعلیمات میں جھک مار رہے ہو تو کیا تمھارے لیے اتنا بھی نہیں ہوسکتا کہ تمھاری بچی کی بس کی فیس معاف ہوجائے۔

جمیل: ہو کیوں نہیں سکتی۔

سلمیٰ: پھر کوشش کیوں نہیں کرتے۔

جمیل: (طنز اور غصہ سے) مجھے بھیک مانگنے کے لیے ہاتھ پھیلانا نہیں آتا یہ خود حکومت کے سوچنے کی بات ہے۔ اچھا لاؤ شیروانی ٹھیک کردی۔

سلمیٰ: تم تو ہتھیلی پر سرسوں جمائے ہو دیکھ تو رہے ہو پیوند پاری کررہی ہوں (سینے میں مشغول ہوجاتی ہے۔ جمیل کھڑا ہوکر شیروانی اتارتا ہے اور اسے کھونٹی پر ٹانگتا ہے اور تھکے ہوئے انداز میں کرسی پر بیٹھ جاتا ہے (سلمیٰ نظریں اٹھا کر جمیل کو دیکھ کر) آج بھی تنخواہ نہیں ملی۔

جمیل: نہیں۔

سلمیٰ: (سینے میں مشغول ہوکر) آخر یہ ہوگیا ہے چھ تاریخ ہوگئی اور تنخواہ نہیں ملی۔ یہاں تو آج گھر میں آٹا تک نہیں ہے۔

جمیل: صبر کرو۔ (طنزیہ مسکرا کر) خدا صبر کرنے والوں کو بڑے اجر عطا فرماتا ہے۔

سلمیٰ: ہم تو اجر کی امید میں رات گزار لیں گے مگر بچوں کا کیا ہوگا۔ (کچھ دیر خاموش رہ کر) آخر یہ تنخواہ میں کیا گڑبڑ ہوگئی ہے۔

جمیل: ہیڈ آفس کے ایک کلرک کو غصہ آگیا ہے۔

سلمیٰ: کیوں؟

جمیل: ان کے صاحبزادے کا داخلہ ہمارے اسکول میں نہ ہوسکا اس لیے انھوں نے ہمارا رزق بند کردیا ہے۔

سلمیٰ: داخلہ کرنا یا نہ کرنا تمھارے ذمہ تو نہیں پھر تم پر یہ عتاب کیوں ہے۔

جمیل: ابھی جاکر میں کلرک سے پوچھ لوں گا۔ لاؤ میری شیروانی دو۔ (سلمیٰ پھر سینے میں مشغول ہوجاتی ہے) کیا آج بھی چائے نہیں ہے۔

سلمیٰ: چائے کیا تیار کرتی شکر بھی ہو گھر میں (کچھ دیر خاموش رہ کر) تمھاری اس ترقی کا کیا ہوا جو ہر سال ہوتی ہے۔

جمیل: کاغذ گیا ہوا ہے۔

سلمیٰ: مگر پانچ چھ مہینے تو ہوگئے ہیں کب تک کاغذ طے نہ ہوگا۔

جمیل: جب تک کلرک کو فرصت نہ ہو بلکہ یوں کہو کہ اس کو رحم نہ آجائے۔ (نعیم واپس کمرے میں آکر)۔

نعیم: امی! آپا کا تو دور دور پتا نہیں ہے۔

سلمیٰ: اس لڑکی نے پریشان کررکھا ہے میرا دل تو ہولوں پر ہوتا ہے۔ اب تو پانچ بج گئے ہوں گے؟ (جمیل سے مخاطب ہوکر) دیکھو جی! کل سے اس لڑکی کی پڑھائی بند۔ سیانی لڑکی ہے مجھے تو ڈر معلوم ہوتا ہے۔

جمیل: (مسکرا کر) چلیے آپ کو پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ آتی ہی ہوگی۔ لاؤ میری شیروانی دو۔

سلمیٰ: بھلا شیروانی میں پیوند کیا بھلا معلوم ہوگا۔ (شیروانی جمیل کو دے کر) اب خدا کے لیے اسے پنشن دے دو۔

جمیل: (مسکرا کر) ابھی اس کی سروس پوری نہیں ہوئی۔ (شیروانی پہن کر دیکھتا ہے)۔ ایک آدھ سال تو اور چل جائے گی۔

سلمیٰ: اب خدا کے لیے ایک نئی بنا لو — اور ہاں وہ رشید صاحب کے یہاں سے

پیسے ملے یا نہیں۔

جمیل: ابھی نہیں۔

سلمٰی: تو پھر مانگتے کیوں نہیں — کیا دو مہینے سے تم خیرات ہی میں محنت کر رہے ہو۔

جمیل: کئی مرتبہ تو مانگ چکا ہوں اب نہیں دیتے تو کیا لڑ پڑوں۔

سلمٰی: میں لڑنے کو کب کہتی ہوں۔ تم نے ٹیوشن سے ان کی لڑکی کو پڑھایا ہے انھیں روپیہ دینا چاہیے۔ تم کوئی خیرات تو نہیں مانگ رہے ہو۔

جمیل: ٹیوشن کے پیسے لوگ خیرات سمجھ کر ہی دیتے ہیں۔ میں نے خود سوچا تھا کہ وہ پیسے دیں گے تو شیروانی بنا لوں گا۔ (ٹھنڈی سانس بھر کر) مگر میرے ساتھی ہیں وفادار ساتھ چھوڑتے ہی نہیں۔

سلمٰی: کیا مطلب!

جمیل: یہی کہ جیسے غریبی۔ خاص یار وفادار۔ جب سے ساتھ لگی ہے۔ کبھی بے وفائی نہیں کی۔ کس قدر ہاتھ پیر مارے دو مضامین میں ایم اے پاس کیا کہ شاید کالج میں چانس مل جائے مگر واہ ری تقدیر۔ کبھی تو یہ جواب ملا کہ تم تھرڈ کلاس ہو اور جب سیکنڈ کلاس دکھلایا تو کہا گیا کہ تم جونیر ہو اور دوسرا ساتھی — (مسکرا کر) اس جگہ تمھارا نام لیا جا سکتا ہے۔

سلمٰی: تمھیں تو جھگڑا کرنے میں مزہ آتا ہے خود تو ہاتھ پیر ہلاتے نہیں بنتا کم بخت اور منحوس مجھے سمجھتے ہو۔

جمیل: (مسکرا کر) بھئی اگلے لوگوں نے کہا ہے اولاد مرد کی قسمت سے اور دولت عورت کی قسمت سے۔ کیا یہ غلط ہو سکتا ہے (مسکرا کر) اور مجھے تو اس کا پورا تجربہ ہو گیا۔

سلمٰی: ہاں میں منحوس ہوں۔

جمیل: چلو چھوڑو اس بحث کو میری ہی قسمت بری ہے۔ جانے اللہ میاں کو مجھ سے کون سی عداوت ہے۔

سلمیٰ: ارے توبہ کرو۔ کفر کے کلمے زبان سے نکالتے ہو۔ جب ہی تو یہ مصیبتیں آتی ہیں۔

جمیل: سلمیٰ ہماری زندگی تو گزر ہی جائے گی۔ مجھے تو اولاد کی فکر ہے باپ کی غریبی کی سزا اولاد کو بھگتنا پڑے یہ کہاں کا انصاف ہے۔

سلمیٰ: تم تو ذرا میں نا اُمید ہو جاتے ہو۔ کیا تم کو خدا کی ذات پر بھروسہ نہیں ہے۔

جمیل: (ٹھنڈی سانس بھر کر) خدا کی ذات پر بھروسہ تو ہے اپنے بچوں کے ہی لیے ترستے ہیں۔ معصوم چہرے مسکراہٹوں کے لیے ترستے ہیں۔ میری خواہش ہے کہ میرے بچے اچھے اسکولوں میں تعلیم حاصل کریں۔ (کچھ نا اُمید اور افسردہ لہجے میں) کم از کم ایسے اسکول تو نہ ہوں جہاں یہ پڑھایا جاتا ہو کہ امیر خسرو اکبر کے دربار میں تھا (سوچتا ہوا کرسی پر بیٹھ جاتا ہے کچھ دیر بعد ایک بوڑھی عورت آتی ہے جمیل اسے دیکھ کر) آیئے آیئے کریم کی اماں— کہیے اب کریم کیسا ہے۔

عورت: اب تو ٹھیک ہے۔

جمیل: ہاں میں نے کل اسے اسکول میں دیکھا تھا۔ بہت کمزور ہو گیا ہے۔

عورت: بیماری بھی تو بہت اٹھائی ہے۔ میں نے تو کہا تھا ابھی دو چار دن اسکول نہ جا مگر اس نے مانا نہیں۔

جمیل: بہت شوقین اور ذہین ہے مگر دیکھیے ابھی اس کو گھر پر زیادہ محنت نہ کرنے دیجیے گا۔ (تخت کی طرف اشارہ کر) آپ بیٹھیے نا۔

عورت: (تخت پر بیٹھتے ہوئے) وہ سنے بھی کسی کی۔ میں تو لاکھ سمجھاتی ہوں مگر وہ بارہ ایک سے پہلے سوتا ہی نہیں۔ کہہ رہا تھا امتحان قریب آ گیا ہے۔

جمیل: جی ہاں مارچ کے مہینے میں امتحان ہوگا۔ دو مہینے رہ گئے ہیں۔

عورت: اس نے امتحان کی فیس کے لیے جو درخواست دی تھی اس کا کیا ہوا۔

جمیل: جی وہ درخواست— (کچھ دیر خاموش رہ کر) نامنظور ہو گئی۔

عورت: نامنظور ہو گئی!

جمیل: جی ہاں — میں نے تو اپنی پوری کوشش کر کے ہیڈ ماسٹر کو راضی کر لیا تھا مگر عین وقت پر ایک ایم۔ ایل۔ اے ایک ایسے لڑکے کی سفارش لے کر آگئے جس کا باپ خود دو چار لڑکوں کی فیس ادا کر سکتا ہے بس بے چارہ کریم محروم ہو گیا۔

سلمیٰ: مگر یہ بات خود ہیڈ ماسٹر کو بھی تو دیکھنا چاہیے تھی۔

جمیل: دریا میں رہ کر مگر مچھ سے کون بیر مول لیتا ہے۔

سلمیٰ: لیکن انصاف بھی تو ایک چیز ہے۔

جمیل: جب سوسائٹی کی چولیں ڈھیلی ہو جاتی ہیں تو اعلیٰ قدریں باقی نہیں رہتیں۔

عورت: مگر اب اس کی فیس کا کیا ہوگا۔

جمیل: (سوچتے ہوئے) آپ پریشان نہ ہوں کوئی انتظام ہو ہی جائے گا۔

عورت: مگر کیسے؟

جمیل: خدا پر بھروسہ کیجیے کوئی نہ کوئی انتظام ہوگا۔

عورت: مگر فیس داخل کرنا تو اب ضروری ہے۔

جمیل: کریم میرا بچہ ہے آپ اطمینان رکھیے کوئی انتظام ضرور ہوگا۔

عورت: میں کس منہ سے آپ کا شکریہ ادا کروں آپ نے مجھ غریب بیوہ کو بہت سہارا دیا ہے۔

جمیل: شکریہ ادا کرنے کی ضرورت نہیں ہے وہ اس قدر ذہین اور سعادت مند ہے کہ اس سے محبت کرنے کو جی چاہتا ہے آپ مطمئن رہیے انتظام ضرور ہوگا۔

عورت: (کھڑی ہو کر) اچھا تو اب مجھے اجازت دیجیے۔

جمیل: خدا حافظ۔ مگر دیکھیے وہ ابھی بیماری سے اٹھا ہے۔ آپ ذرا احتیاط برتیے گا۔

عورت: بہت اچھا۔

(عورت کمرے سے چلی جاتی ہے۔ جمیل کمرے میں ٹہلنے لگتا ہے پھر سلمیٰ سے مخاطب ہو کر)

جمیل: کیوں سلمیٰ۔ مجھے رشید صاحب کے یہاں سے جو پیسے ملنے والے ہیں اگر

اس سے کریم کی فیس ادا کروں تو کیسا ہے ایک مہینے اور تکلیف اٹھالیں گے مگر ایک بچے کی زندگی سدھر جائے گی۔

سلمیٰ: ہاں ہاں ضرور— بے چاری بیوہ ہے کریم نے میٹرک پاس کرلیا تو ہمیں دعائیں دے گی۔

جمیل: ویسے میں نے طے کرلیا ہے کہ رشید صاحب کے یہاں سے جو روپیہ ملا کریں گے اس سے ہم شکیلہ کی بس کی فیس ادا کردیا کریں گے۔

سلمیٰ: مگر انھوں نے دو مہینے سے پیسے نہیں دیے آج اُن سے ضرور تقاضا کیجیے گا۔

جمیل: بھئی مجھ سے تقاضا نہیں کرتے بنتا۔ ویسے رشید صاحب ہیں نیک آدمی۔

سلمیٰ: تم تو سب ہی کو نیک سمجھتے ہو آخر مانگنے میں کیا حرج ہے۔

جمیل: حرج تو کوئی نہیں مگر مجھے کچھ برا معلوم ہوتا ہے کہ ان کی بچی کے سامنے تقاضا کروں۔ بچی کے دل میں میرے لیے کیا خاک عزت رہ جائے گی۔

سلمیٰ: تو تنہائی میں مانگ لینا (شکیلہ کمرے میں آتی ہے سلمیٰ شکیلہ کو دیکھ کر) کہاں تھیں بیگم صاحبہ! اب ساڑھے پانچ بجے تشریف لا رہی ہیں۔ (شکیلہ خاموش رہتی ہے) اب سرکار بولتی کیوں نہیں۔

شکیلہ: ویسے ہی کالج میں دیر ہوگئی۔

سلمیٰ: مگر میں نے کہا ہے کہ کالج ختم ہوتے ہی سیدھی گھر آیا کرو۔ مجھے یہ لچھن پسند نہیں۔

شکیلہ: (ٹھنڈی سانس بھر کر) امی! اب نہ میں جلدی جایا کروں گی نہ دیر میں آیا کروں گی۔

(منہ چھپا کر ڈوپٹے سے آنسو پونچھتی ہے۔)

جمیل: کیا بات ہے بیٹی— رونے کیوں لگیں۔

شکیلہ: کچھ نہیں ابا جان۔ کوئی خاص بات نہیں۔

جمیل: پھر رو کیوں رہی ہو؟ (شکیلہ کے قریب جا کر) کیا بات ہے۔

شکیلہ: میرا نام کالج سے کٹ گیا ہے۔

جمیل: نام کٹ گیا ہے! آخر کیوں؟

شکیلہ: پانچ مہینے سے کالج کی فیس ادا نہیں ہوئی تھی۔

جمیل: فیس ادا ہو جاتی۔ پرنسپل صاحب سے نہیں کہا۔

شکیلہ: میں انھی کے پاس گئی تھی اسی لیے تو دیر ہو گئی۔

جمیل: پھر انھوں نے کیا کہا؟

شکیلہ: بے حد ہمدردی فرمائی مگر کہا کہ وہ اس معاملہ میں مجبور ہیں۔

جمیل: مجبور! (کمرے میں ٹہلتا ہے) آخر اس میں کون سی مجبوری تھی۔

شکیلہ: قاعدے اور ضابطے کی۔ اصول کی۔

جمیل: قاعدے ضابطے اور اصول انسان کی آسائش کے لیے بنائے جاتے ہیں نہ کہ اس کو اور مصیبتوں میں مبتلا کرنے کے لیے یہ سماج کو ترقی دینے کے لیے ہیں نہ کہ اس کو اور پستی میں گھسیٹنے کے لیے۔ یہ انسان کی شخصیت کو ترقی دینے کے لیے ہیں نہ کہ ایک بڑھتی اور ابھرتی شخصیت کا گلا گھونٹنے کے لیے۔

شکیلہ: (ناامیدی اور یاس کے لہجے میں) مگر قاعدے اور ضابطے اپنی جگہ پر ہیں وہ لچک نہیں سکتے۔

جمیل: وہ ضابطے اور قاعدے جن میں لچک نہ ہو ٹوٹ جایا کرتے ہیں سوسائٹی کے لیے وہ مقام عبرت ناک ہوتا ہے جب اس کے قاعدوں میں لچک نہ رہے۔ ان کے لیے سوائے اس کے کہ وہ توڑ دیے جائیں اور کوئی راستہ باقی نہیں رہتا۔

شکیلہ: (ٹھنڈی سانس بھر کر) جن لوگوں کے لیے قاعدے لچک نہیں سکتے ان کے لیے ٹوٹ کیسے سکتے ہیں۔
(آنسو پونچھتی ہے)۔

جمیل: اپلے پر جمی ہوئی راکھ کو یہ سمجھ لینا کہ وہ خوابیدہ ہے ایندھن ڈال دیا جائے تو

وہ بھڑک اٹھتی ہے اور اس میں سے ایسی بجلیاں نکلتی ہیں جو اپنے اور گرد کے نظام کو جھلس دیتی ہیں۔

شکیلہ: (آنسو پونچھ کر ٹھنڈی سانس بھر کر) ابا جان! بجلیاں انھی دلوں میں پیدا ہوتی ہیں جن میں حرارت طبعی باقی ہو جس دل میں حرارت طبعی باقی نہ رہے وہاں بجلیاں پہنچ کر بھی کیا لیں گی۔

جمیل: بجلیوں کو قید کیا جاسکتا ہے مگر ان سے حرارت نہیں چھینی جاسکتی۔ انسان کو مجبور کیا جاسکتا ہے۔ مگر اس کی فطرت نہیں بدلی جاسکتی۔ انسان کا جب تک دل دھڑک رہا ہے اور اس کے خون میں گرمی ہے۔ وہ بغاوت کی چنگاریاں بھی اپنے دل میں ضرور پوشیدہ رکھے گا۔

شکیلہ: (آنسو پونچھ کر) مگر ابا جان—

جمیل: (بات کاٹ کر) بیٹی! تمھاری آنکھوں کے یہ آنسو وہ پانی نہیں جو آگ کو ٹھنڈا کر دیتا ہے۔ یہ وہ آتش سیال ہے جس سے نظام بنتا اور بگڑتا ہے (شکیلہ کے سر پر ہاتھ پھیر کر) جاؤ بیٹی۔ کل تمھاری فیس کا انتظام ہو جائے گا۔ (مسکرا کر) ابھی تو تمھارا باپ موجود ہے۔ (طنزیہ) جس کے لیے لیڈران قوم یہ کہتے رہتے ہیں کہ اساتذہ کو قربانیاں دینی ہوں گی جب اس کو ساری قوم کے لیے قربانیاں دینا ہے تو کیا وہ اپنی لڑکی کے لیے قربانی نہیں دے گا۔

(شکیلہ آنسو پونچھتی ہوئی دوسرے کمرے میں چلی جاتی ہے جمیل پھر کمرے میں ٹہلنے لگتا ہے۔ سلمیٰ نظریں اٹھا کر)

سلمیٰ: یہ ایک نئی مصیبت آگئی۔

جمیل: مصیبت! (مسکرا کر) سلمیٰ! ایک اسکول ٹیچر کی زندگی مصیبتوں کے لیے ہی ہے اس کو سوسائٹی نے کچھ دینا نہیں سیکھا ہمیشہ اس سے مانگتی ہی رہی ہے اور وہ دیتا رہا ہے۔ لیکن اگر اس کے خون کا آخری قطرہ بھی نچوڑا گیا— تو پھر یہ پیمانہ ایسا چھلکے گا کہ پھر سوسائٹی کے چہرے پر ایک دوسرا ہی غازہ ہوگا۔

سلمیٰ: ابھی نہ تو سوسائٹی کے چہرے پر غازہ ملا جا رہا ہے اور نہ پیمانہ چھلک رہا ہے ....ابھی تو شکیلہ کی فیس کا مسئلہ ہے۔

جمیل: (مسکرا کر) اس کا بھی انتظام ہو جائے گا۔ (گھڑی دیکھ کر) چھ بجنے والے ہیں رشید صاحب کے یہاں ہو آؤں۔ اُن سے آج رقم وصول کرلوں گا۔ (جانے کے لیے مڑتا ہے پھر پلٹ کر) اور ہاں دیکھو شکیلہ کی دلدہی کرنا وہ بہت نااُمید ہے (دروازے پر دستک) نعیم جا کر دیکھو کون ہے۔ (نعیم اٹھ کر جاتا ہے اور کچھ دیر بعد ایک خط لا کر دیتا ہے۔ جمیل لفافہ کھول کر پڑھتا ہے اور کرسی پر بیٹھ جاتا ہے۔)

سلمیٰ: کس کا خط ہے؟

جمیل: رشید صاحب کا۔

سلمیٰ: کیا لکھا ہے؟

جمیل: لکھا ہے۔ (انتہائی طنزیہ اور افسردہ لہجے میں) ماسٹر صاحب! فی الحال آپ کو تکلیف کی ضرورت نہیں جس وقت ضرورت ہوگی۔ آپ کو تکلیف دی جائے گی۔ میرے ذمہ آپ کا کچھ مطالبہ ہے اس کا انتظام کر رہا ہوں انتظام ہو جانے پر بھجوادوں گا۔

(جمیل ٹھنڈی سانس بھر کر خط دوبارہ لفافے میں رکھتا ہے۔)

(پردہ)

جمہور کے ابلیس

افرادِ تمثیل

(1) موہن (ایک دھوکے باز آوارہ مزاج وکیل) (2) ریتا (ایک آوارہ مزاج لڑکی) (3) جان (ریتا کا بھائی، نوکری کی تلاش میں) (4) روز (ایک حسین لڑکی) (5) شرت (ایک شہری)

منظر

ایک مکان کا کمرہ جو ایک وکیل کا دفتر ہے۔ اعلیٰ قسم کا فرنیچر ہے میز کرسیاں صاف ستھری ہیں اور سلیقے سے رکھی ہوئی ہیں میز پر ٹیلی فون رکھا ہے الماریوں میں قانون کی موٹی موٹی کتابیں سجی ہوئی ہیں۔ کمرے میں دری کا فرش ہے، دروازوں پر خوبصورت پردے لٹکے ہوئے ہیں، دیواروں پر لیڈروں کی تصاویر آویزاں ہیں۔

دروازے میں سے ایک اندرون مکان کھلتا ہے اور دوسرا بیرون مکان اس دروازے کے دونوں جانب کھڑکیاں ہیں جو کھلی ہوئی ہیں۔ دروازہ بھی کھلا ہوا ہے اور جب ہوا سے پردہ اڑ جاتا ہے تو سامنے ایک مختصر سا برآمدہ نظر آنے لگتا ہے۔ موہن ایک صوفے پر نیم

دراز لیٹا ہوا اخبار دیکھ رہا ہے کہ جان داخل ہوتا ہے۔ موہن اخبار پر سے نظریں ہٹا کر دیکھتا ہے اور اخبار ایک طرف ڈالتے ہوئے سیدھا ہو جاتا ہے۔

موہن: ہلو جان۔ آج کدھر بھول پڑے۔ (ایک کرسی کی طرف اشارہ کرکے) آؤ آؤ بیٹھو (جان کرسی پر بیٹھ جاتا ہے) میں تو کئی روز سے تمھاری راہ دیکھ رہا تھا۔

جان: کیا بتاؤں مسٹر موہن آج کل بے حد پریشان ہوں۔

موہن: (مسکرا کر) وہ تو مجھے معلوم ہے اور اسی لیے میں نے ایک مرتبہ آدمی بھی تمھارے گھر بھیجا تھا (چند سیکنڈ خاموش رہ کر) مسٹر جوشی سے تمھارے بارے میں گفتگو ہوئی تھی۔

جان: اچھا— پھر کوئی خاطر خواہ نتیجہ نکلا۔

موہن: (مسکرا کر) کیوں نہیں۔ تم تو جانتے ہو کہ اسمبلی میں مسٹر جوشی کا خاص اثر ہے (جان اثبات میں سر ہلاتا ہے) منسٹر تک ان سے جھکتے ہیں۔ انھوں نے ایک منسٹر سے تمھارے بارے میں گفتگو کرلی ہے۔

جان: اچھا— پھر کیا ہوا۔

موہن: پھر کیا ہوا— بھئی کسی منسٹر کی یہ ہمت ہوسکتی ہے کہ وہ ان کی سفارش رد کردے فوراً وعدہ کرلیا کہ تمھارے لیے کسی اچھی نوکری کا بندوبست کردیا جائے گا۔

جان: شکریہ مسٹر موہن۔ بڑی مہربانی ہے آپ کی۔

موہن: اس میں مہربانی اور شکریہ کی کون سی بات ہے (کچھ دیر خاموش رہ کر ایک سگریٹ جلاتا ہے اور دوسری جان کی طرف بڑھاتے ہوئے) آج کل مس روز کس حال میں ہیں۔

جان: (موہن کو سر سے پیر تک دیکھ کر) میری کئی روز سے ملاقات نہیں ہوئی اچھی ہی ہوں گی۔

موہن: (مسکرا کر) بھئی کیسے آدمی ہو اس کو اس قدر چاہتے ہو پھر بھی ملاقات نہیں کرتے۔

جان: مسٹر موہن! جب انسان پریشان ہوتا ہے تو (مسکرا کر) عشق بھی رفو چکر ہوجاتا ہے۔

موہن: پریشانیاں! یار تعجب ہے بھلا پریشانیوں کا اس سے کیا تعلق (مسکرا کر) اگر مس روز چند لمحے میرے ساتھ گزار دیں تو میں زندگی بھر کی پریشانیوں کو بھول سکتا ہوں (جان نظریں اٹھا کر موہن کو دیکھتا ہے) برا نہ ماننا جان (مسکرا کر) اچھی چیز ہر شخص ہی چاہتا ہے۔

جان: لیکن مسٹر موہن۔ میں اس سے بہت محبت کرتا ہوں اب تو بہت جلد شادی کرنے والا ہوں۔ بس نوکری ملنے کی دیر ہے۔

موہن: مبارک ہو— مگر جان میری محبت بھی اس کے لیے بے پناہ ہے۔

جان: مسٹر موہن—

موہن: (بات کاٹ کر مسکراتے ہوئے) کیا ایسا نہیں ہوسکتا کہ شادی تم کرو اور محبت میں۔

جان: اس سے زیادہ واہیات خیال اور کچھ نہیں ہوسکتا۔

موہن: خیال کو تم واہیات کہہ لو مگر اس کاروباری دنیا میں ہر واہیات چیز حقیقت ہے (چند سیکنڈ خاموش رہ کر سگریٹ کا کش لے کر) تمھیں معلوم ہے کہ محلے والوں کے خیالات مس روز کے خاندان بالخصوص مس روز کے متعلق اچھے نہیں ہیں۔

جان: تو اس سے کیا فرق پڑتا ہے مس روز کو میں اچھی طرح جانتا ہوں۔

موہن: بڑا فرق پڑتا ہے مسٹر جوشی کو محلے والے مجبور کررہے ہیں کہ وہ مس روز کے خاندان کو اس محلے سے دفن کرادیں وہ تو میں مسٹر جوشی کے اس طرح کان بھرتا رہتا ہوں کہ وہ محلے والوں کی شکایات پر دھیان نہیں دیتے۔

جان: لیکن اہل محلہ کو کسی کے ذاتی معاملات میں کیا دلچسپی ہے۔

موہن: کیوں نہیں کیا ان کے اپنے جوان لڑکے نہیں ہیں۔

جان: کیا نوجوان لڑکے اور لڑکیاں ہر محلے میں نہیں ہوتے۔

موہن: مگر اس خاندان کا مدعیہ ضرور قابل اعتراض ہے۔ مسٹر جوشی تو ایک مرتبہ اس سلسلے میں پولیس کو فون کرنے والے تھے وہ تو میں نے انھیں روک دیا۔ (جان خاموش رہتا ہے۔ موہن کچھ دیر بعد) اور پھر فلپ کی بات علاحدہ ہے شراب پی کر اودھم مچاتا ہے اور کالج آنے جانے والی لڑکیوں پر فقرہ بازی کرتا ہے یہ کوئی اچھی باتیں ہیں۔

جان: فلپ کا معاملہ اپنا ذاتی ہے اس سے مس روز کا کیا واسطہ۔

موہن: جان تم جذباتی زیادہ ہو حالاں کہ تمھیں حقیقت پسند ہونا چاہیے۔ بھئی یہ تو ایک کاروباری معاملہ ہے۔ فلپ مس روز کا بھائی ہے اور اگر مس روز کسی اچھے کردار کی مالک ہوتی تو شاید یہ سب کچھ میں تم سے نہیں کہتا۔

جان: مگر مسٹر موہن آپ جو کچھ کہہ رہے ہیں یہ کیسے ممکن ہے۔

موہن: اس ترقی یافتہ دور میں بھی تم فرسودہ خیالات میں الجھے ہوئے ہو (جان خاموش بیٹھا سوچتا رہتا ہے۔ موہن کچھ دیر خاموش رہ کر) آج کی دنیا میں ایک اچھی نوکری اور جیب میں پیسہ سب کچھ ہے (مسکرا کر) اور پھر میں مس روز کو تم سے چھین تو نہیں رہا ہوں۔

(جان کھڑے ہوکر دروازے کی طرف جاتے ہوئے)

جان: میں غور کروں گا۔

موہن: تو میں مسٹر جوشی سے کہہ کر تمھاری نوکری طے کرالوں۔

(جان پلٹ کر موہن کو دیکھتا ہے اور مسکراتا ہوا کمرے سے نکل جاتا ہے اسی وقت شرت بابو کمرے میں داخل ہوتا ہے اور جان پر ایک نفرت آمیز نگاہ ڈالتا ہے مگر جان اس پر دھیان نہیں دیتا)۔

شرت: مسٹر موہن! مسٹر جوشی کہاں ہیں۔

موہن: آیئے آیئے شرت بابو۔ تشریف رکھیے۔ (شرت ایک صوفے پر بیٹھ جاتا

ہے۔ موہن اس کے پاس آتے ہوئے) جوشی صاحب تو ایک میٹنگ میں تشریف لے گئے ہیں۔

شرت: کب تک واپس آجائیں گے۔

موہن: پتا نہیں۔ میٹنگ کے بعد انھیں ایک ڈنر میں جانا ہے۔ شاید کچھ رات گئے واپس آئیں (مسکرا کر) کیا بات ہے۔

شرت: مسٹر موہن! اب یہ محلہ شریفوں کے رہنے کے قابل نہیں رہا۔

موہن: (مسکرا کر) کیا بات ہوئی آخر کچھ کہیے تو۔

شرت: بات کیا ہوئی وہی فلپ کا لچاپن۔ کل مولوی اشفاق کی لڑکی کالج جارہی تھی کہ فلپ نے اس پر آوازہ کسا ایک مسلمان پان والا، اس کی حمایت میں بولا، فلپ تو چپکے سے چلتا بنا مگر دھنی رام فلپ کی حمایت میں کھڑا ہوگیا۔ وہ تو بات ٹل گئی نہیں تو ہندو مسلم جھگڑا کھڑا ہو ہی گیا تھا۔

موہن: مگر دھنی رام کو فلپ کی حمایت کی کیا ضرورت تھی، فلپ اول درجے کا لچا ہے۔

شرت: دھنی رام فلپ کی حمایت کیوں نہ کرتا آخر اس کا فلپ کی بہن روز سے معاشقہ ہے۔ صاحب اس خاندان نے سارے محلے میں اودھم مچا رکھا ہے۔

موہن: وہ تو یہ خاندان جب اس محلے میں آیا تھا میرا ماتھا اسی وقت ٹھنکا تھا اول درجے کے لچے اور بدمعاش ہیں۔ آخر آپ محلے کے بزرگ کیوں اس طرح خاموش ہیں۔

شرت: اپنی آبرو ہر شخص بچاتا ہے مسٹر موہن۔ پولیس والوں کا اس گھر میں آنا جانا ہے کون ان سے الجھ کر مصیبت مول لے۔

موہن: اگر ایسی بات ہے تو میں مسٹر جوشی سے اس کے متعلق بات کروں گا۔

شرت: مسٹر جوشی سے ہم کئی بار کہہ چکے ہیں مگر ان کی خاموشی سمجھ میں نہیں آتی۔

موہن: شرت بابو! آپ کو تو معلوم ہے کہ مسٹر جوشی بے حد مصروف آدمی ہیں۔ اسمبلی، پارٹیاں، ڈنر، میٹنگ ان سے انھیں فرصت ہی نہیں ملتی۔ بہتر تو یہ ہے

کہ آپ اپنے اثر و رسوخ سے کام لے کر انھیں سمجھائیں۔

شرت: (کھڑے ہوکر) مسٹر موہن۔ آپ مسٹر جوشی سے اس سلسلے میں گفتگو کیجیے کہ وہ پولیس سے کہہ کر محلے میں ایسی حرکتیں بند کرائیں۔

موہن: ضرور ضرور۔ (شرت دروازے کی طرف جاتا ہے۔ اور ہاں (شرت پلٹ کر موہن کو دیکھتا ہے) آپ ذرا اس روز کے باپ سے ملیے اور مس روز سے بھی کہ وہ کلب کو منع کریں کہ وہ ایسی حرکتیں بند کردے۔ مس روز سے کہیے کہ اگر انھوں نے اپنا رویہ نہیں بدلا تو ان کی بھی کھینچا تانی ہوگی۔ اگر کوئی قانونی مدد کی ضرورت ہو تو میں حاضر ہوں۔

شرت: شکریہ!

(شرت چلا جاتا ہے موہن معنی خیز انداز میں مسکراتا ہے اور صوفے پر بیٹھ کر اخبار دیکھنے لگتا ہے مگر اس کے انداز سے ظاہر ہوتا ہے کہ اسے اخبار سے کوئی دلچسپی نہیں بلکہ خیالات کہیں اور ہیں کہ ریتا کمرے میں داخل ہوتی ہے اور موہن کو دیکھ کر)

ریتا: ہلو موہن۔

موہن: (موہن نظریں اٹھا کر ریتا کو دیکھتا ہے اور مسکرا کر) ہلو ریتا۔ ''وہ آئیں گھر میں ہمارے خدا کی قدرت ہے۔'' کہو اچھی تو ہو۔

ریتا: جی رہی ہوں۔ (مسکرا کر) آپ کا مزاج کیسا ہے۔

موہن: ہم کیا اور ہمارا مزاج کیا (مسکرا کر) مزاج تو ہمیشہ عورتوں کا ہوتا ہے۔ (ریتا اٹھلاتی ہوئی موہن کی طرف آتی ہے۔ موہن شرارت سے مسکرا کر) دلکشی چال میں ایسی کہ ستارے رک جائیں۔

ریتا: (مسکرا کر) سرکشی ناز میں ایسی کہ گورنر جھک جائیں۔

موہن: ارے گورنر کس چیز کا نام ہے۔ فرشتے بھی سجدہ کریں۔ (ایک کرسی کی طرف اشارہ کرکے) بیٹھو (ریتا ایک کرسی پر بیٹھ جاتی ہے) ڈارلنگ غضب کی ظالم

ہو تڑپانے میں مزہ آتا ہے۔

ریٹا: (مسکرا کر) اچھا جی۔ عالم یہ ہے کہ سو سو چکر لگاؤ مگر حضور کا پتا نہیں کہ کہاں ہیں اور الزام ہم پر دھرا جا رہا ہے۔

موہن: ڈارلنگ! کیا بتلاؤں مصروفیت نے بے بس کر دیا ہے مسٹر جوشی غیر معمولی اعتماد کرتے ہیں اب تو ان کے زیادہ مقدمے بھی مجھے ہی دیکھنا پڑتے ہیں۔

ریٹا: یہ مصروفیت نہیں روگ ہے۔

موہن: ہاں یہ مصروفیت روگ ہی بن گئی ہے۔ مسٹر جوشی کی زندگی جس قدر مصروف ہے اس سے کہیں زیادہ میری زندگی۔ وہ تو میٹنگوں اور جلسوں میں مصروف رہتے ہیں اور ان کا باقی کام مجھے دیکھنا پڑتا ہے اب اس وقت تم آ گئی ہو تو کچھ سکون سا محسوس ہو رہا ہے۔

ریٹا: ڈارلنگ! (مسکرا کر) میں تو اب یہ محسوس کرتی ہوں کہ تمھارے دل میں میرا کوئی چارم اور دلکشی نہیں رہی ہے۔

موہن: ریٹا ڈارلنگ! اگر تمھیں مجھے دکھ دینے میں مزہ آتا ہے تو جو جی چاہے کہہ ڈالو (مسکرا کر) ویسے میں یہ محسوس کرتا ہوں کہ میری زندگی کی تازگی تم ہی ہو۔

ریٹا: آج معلوم ہوتا ہے کہ شاعری کے موڈ میں ہو— اور ہاں تم نے اس سلسلے میں کیا سوچا۔

موہن: کس سلسلے میں؟

ریٹا: زیادہ نہ بنو ڈارلنگ۔ اب میں جذباتی ہیجان میں مبتلا ہو چکی ہوں۔ میری راتوں کی نیند حرام ہو گئی ہے۔ میں سوچتی ہوں کہ۔

موہن: (بات کاٹ کر) ارے ہاں ابھی جان میرے پاس آیا تھا۔ مسٹر جوشی نے اس کے لیے ایک اچھی نوکری کا بندوبست کر دیا ہے۔

ریٹا: اچھا— مسٹر جوشی کا میری طرف سے شکریہ ادا کر دیجیے گا۔

موہن: (مسکرا کر) مسٹر جوشی کا!! اور ہمیں پھوکٹ ہی میں ٹرخا دو گی۔

ریتا: (کھڑی ہوتی ہے اور سوچتی ہوئی کھڑکی کے پاس جاتی ہے پھر ٹھنڈی سانس بھر کر) میں نے تو تمھیں موہن وہ سب کچھ دے دیا جو میرا سب سے قیمتی سرمایہ تھا۔ کیا اب بھی تم کو شکریہ کی ضرورت ہے۔

(موہن اٹھ کر ریتا کے پاس جاتا ہے اس کے دونوں بازو پکڑ کر چہرہ اپنی جانب کرتے ہوئے)

موہن: ڈارلنگ! ایسا کہہ کر تم میری محبت کا مذاق اڑا رہی ہو تم نہیں جانتیں کہ مجھے تم سے کس قدر محبت ہے۔

ریتا: محبت اس وقت بھلی معلوم ہوتی ہے جب تک انسان کسی آفت میں نہ پھنسے۔ کسی آفت میں پھنس جانے کے بعد محبت عذاب بن جاتی ہے۔

موہن: کیسی باتیں کرتی ہو ڈارلنگ۔

ریتا: موہن! میں سوچتی ہوں کہ اب کیا ہوگا کچھ دن کے بعد راز فاش ہو جائے گا۔ پھر (موہن کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر) کیا تم یہ کہہ سکو گے کہ یہ بچہ میرا ہے میری اولاد ہے۔

(موہن ریتا کے بازو چھوڑ کر کھڑکی سے باہر دیکھتے ہوئے بے دلی سے)

موہن: میں کوشش کروں گا کہ اپنے اندر اتنی جرأت پیدا کر سکوں۔

ریتا: اور وہ جرأت تم میں پیدا نہیں ہوگی موہن یہ میں جانتی ہوں۔ (موہن کے کاندھے پر سر رکھ کر) موہن تم نے مجھے دھوکا دیا ہے بہت بڑا دھوکا۔ (موہن خاموش رہتا ہے۔ ریتا اس کا چہرہ اپنی طرف کرتے ہوئے) موہن! میں انتظار کرتی رہی کہ ایک دن تم کہو گے کہ آؤ ریتا ہم دونوں سول میرج کر لیں مگر یہ انتظار طویل ہوتا گیا اس قدر طویل کہ اس نے ناامیدی کی سرحدوں کو چھو لیا۔

موہن: مگر میں تم سے محبت کرتا ہوں ڈارلنگ بے پناہ محبت۔

ریتا: ایک لفظ محبت میں اس قدر نشہ ہوتا ہے کہ عورت سب کچھ بھول جاتی ہے اور

اس کی طرف اس طرح دوڑتی ہے جیسے پیا سا سراب کی طرف موہن! مجھے اس بدنامی سے بچا لو (جذباتی انداز میں) نہیں تو میں زندہ نہ رہ سکوں گی۔ موہن میں مرجاؤں گی۔ موہن میں مرجاؤں گی۔

(موہن خاموشی سے سوچتا رہتا ہے۔ پھر آہستہ سے ریٹا کے دونوں بازو پکڑ کر)

موہن: ریٹا ڈارلنگ! تم مسٹر جوشی کی سماجی اور سیاسی زندگی سے واقف ہو۔ میرا اور مسٹر جوشی کا جو تعلق ہے وہ بھی ظاہر ہے ایسی صورت میں میرا کوئی غلط قدم ہم دونوں کی زندگی تباہ کردے گا کیا تم اس کو پسند کروگی۔

ریٹا: لیکن اب میں کیا کروں موہن (آنکھوں میں آنسو آجاتے ہیں) میری سمجھ میں نہیں آتا کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔

موہن: اگر میری رائے مانو تو سارا الزام فلپ پر رکھ دو۔

ریٹا: مگر یہ غلط ہے جھوٹ سراسر بے انصافی ہے۔

موہن: اوہ ڈارلنگ! تم سمجھتی کیوں نہیں۔ یہ سیاست ہے اوّل تو فلپ ایک نمبر کا لچا اور بدمعاش ہے لوگ فوراً اس پر یقین کرلیں گے اور جب تم اسے قانونی چارہ جوئی کی دھمکی دوگی تو وہ اس قدر بزدل ہے کہ فوراً تم سے شادی کرلے گا۔ اسے پیسے کی ضرورت ہوگی جو میں اسے دیتا رہوں گا۔ (مسکرا کر) ظاہر ہے کہ پھر اسے میرے اور تمھارے تعلقات پر اعتراض نہ ہوگا۔

ریٹا: یہ سراسر بے انصافی ہوگی ظلم ہوگا۔

موہن: سیاست میں انصاف اور بے انصافی کوئی چیز نہیں یہ تو کھلا سودا ہے۔

ریٹا: لیکن ایسا سودا بھی کیا جس سے کسی کی عزت خطرے میں پڑ جائے۔

موہن: عزت! کس کی عزت؟ فلپ کی! ریٹا تم سمجھ دار ہوتے ہوئے اگر فلپ کی کوئی عزت سمجھتی ہو تو مجھے تمھاری سمجھ داری پر شک کرنا پڑے گا (ریٹا کو اپنی جانب کھینچتے ہوئے) ڈارلنگ! سمجھ داری یہ ہوتی ہے کہ انسان کے دونوں

ہاتھوں میں لڈو رہیں (مسکرا کر)

رند کے رند رہے ہاتھ سے جنت نہ گئی

(ریٹا کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر) ریٹا! سچ بتاؤ کیا تم کو مجھ سے محبت ہے (ریٹا اثبات میں سر ہلاتی ہے) کیا تم میرے لیے اس قدر قربانی بھی نہیں دے سکتیں۔

ریٹا: مگر میرا ضمیر مجھے اس کی اجازت نہیں دیتا۔

موہن: (ریٹا کے ہاتھ چھوڑ کر) ضمیر! ضمیر!! ضمیر!!! یہ انسان کی بزدلی کا دوسرا نام ہے جس پر اخلاق کا خوبصورت روغن کر دیا گیا ہے جس کی چمک دمک نے بیٹے کو باپ سے۔ بھائی کو بھائی سے اور انسان کو انسان سے لڑا دیا (ریٹا کے دونوں بازو پکڑ کر) ریٹا ڈارلنگ جب ہم کسی کشمکش میں کامیاب ہو جاتے ہیں تو وہی ضمیر جو ہمیں ملامت کر رہا ہوتا ہے دبک کر بیٹھ جاتا ہے اور ہمارا سر غرور سے تن جاتا ہے اس فخر و غرور سے تنے ہوئے سر کو دیکھ کر خود ضمیر اپنے پر لعنت ملامت کرنے لگتا ہے۔

ریٹا: مگر ڈارلنگ۔

موہن: (قطع کلام کر کے) ریٹا! تم ایک مرتبہ اپنے ضمیر کا گلا گھونٹ دو پھر دیکھو کہ تم مطمئن ہو یا نہیں۔ ریٹا ڈارلنگ! تم ایک مرتبہ تو میری خاطر میرا کہا مان لو۔

ریٹا: میں تمھارا ہر کہا ماننے کو تیار ہوں موہن۔ مگر تم مجھ سے وہ بات کیوں کرانا چاہتے ہو جس کو میرا جی نہیں چاہتا۔

موہن: ریٹا! اس وقت سوال جی چاہنے یا چاہنے کا نہیں ہے یہ زندگی کا سوال ہے۔

ریٹا: لیکن اگر فلپ نے شادی سے انکار کر دیا تو میں کہیں کی نہ رہوں گی۔

موہن: اس کا انکار کرنا غیر ممکن ہے (سوچتے ہوئے) بہتر یہ ہے کہ تم روز پر بھی دباؤ ڈالو اس پر قانونی چارہ جوئی کی دھمکی دو — وہ ضرور فلپ کو تیار کر لے گی۔

ریٹا: لیکن اگر روز کے کہنے پر بھی فلپ نہ مانا تو پھر کیا ہوگا۔

موہن: فلپ، روز کی کمائی پر زندہ ہے وہ روز کی بات مان لے گا (ریٹا سوچتی ہے) اسے صرف ڈرانے دھمکانے سے ہی کام بن جائے گا روز کا کردار جیسا کچھ ہے وہ سب پر ظاہر ہے (کھڑکی سے باہر جھانکتا ہے پھر ایک دم پیچھے ہٹ کر) ارے۔ یہ روز ادھر کیوں آرہی ہے۔ میں دوسرے کمرے میں جاتا ہوں (ریٹا کا کندھا تھپ تھپاتے ہوئے) خود اعتمادی سے کام لینا کہیں کمزوری ظاہر نہ ہونے دینا۔

(تیزی سے دوسرے کمرے میں چلا جاتا ہے۔ ریٹا اطمینان کا انداز بنا کر ایک صوفے پر بیٹھ جاتی ہے اور پاس پڑا ہوا اخبار دیکھنے لگتی ہے تھوڑی دیر بعد روز داخل ہوتی ہے اور ریٹا کو کمرے میں دیکھ کر)

روز: ہلو ریٹا۔

ریٹا: ہلو روز (اخبار صوفے پر رکھتے ہوئے) کہو یہاں کیسے۔

روز: مسٹر موہن سے ایک کام تھا گھر پر ہیں یا نہیں۔

ریٹا: نہیں۔ میں خود انہیں کا انتظار کر رہی تھی۔ کیا کوئی ضروری کام ہے (اپنے پاس صوفے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے)۔ بیٹھو۔ ایسا کیا ضروری کام ہے۔

روز: مسٹر موہن ہی سے کام تھا (صوفے پر بیٹھتے ہوئے) اب تم سے کیا کہوں۔

ریٹا: کچھ تو کہو کچھ پریشان نظر آرہی ہو۔

روز: ایسی کوئی خاص پریشانی نہیں ہے۔

ریٹا: آخر پھر بھی کیا بات ہے۔

روز: اس محلے میں کیا آئے کہ زندگی عذاب بن گئی۔ ابھی شرت بابو اور مولوی اشفاق گھر پر چڑھ دوڑے اور ہزاروں دھمکیاں دیں۔

ریٹا: دھمکیاں— آخر کیوں۔

روز: جی ہاں دھمکیاں کہ فلپ ایسا ہے ویسا ہے۔ ہم یہ کریں گے وہ کریں گے۔ اور پھر مجھ پر بھی ایسے گندے چھینٹے اچھالے کہ خدا کی پناہ۔

ریٹا: بھئی روز معاف کرنا۔۔ (روز کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر) فلپ جس قدر خبیث ہے اس کا شاید تمھیں اس قدر علم نہیں جتنا مجھ کو ہے۔

(روز ریٹا کو حیرت سے دیکھتی ہے پھر کچھ دیر بعد)

روز: میں تمھارا مطلب نہیں سمجھی۔

ریٹا: میرا مطلب وہی ہے جو میں کہہ رہی ہوں کہ فلپ نمبر اول کا لفنگا بدمعاش اور خبیث ہے (ایکٹنگ کے انداز میں) اس نے مجھے دھوکا دیا ہے میری زندگی تباہ کی ہے۔

روز: ریٹا۔ کیا بک رہی ہو۔

ریٹا: بک نہیں رہی ہوں حقیقت بیان کر رہی ہوں۔ اس نے مجھے شادی کا دھوکا دیا اور آج جب کہ میں بدنامی کے چوراہے پر ننگی کھڑی ہوں وہ مجھے ٹھکرا رہا ہے۔

روز: مگر ریٹا تم نے یہ سب کچھ مجھ سے پہلے کیوں نہیں کہا۔

ریٹا: تم میں اور اس میں فرق بھی کیا ہے۔ دونوں ایک ہی تھیلی کے چٹے بٹے ہو۔۔ میں مسٹر موہن سے قانونی مشورہ لینے آئی ہوں۔

روز: اگر فلپ قصور وار ہے تو اس کو ضرور سزا ملنی چاہیے مگر تم مجھ پر جو الزام لگا رہی ہو اس پر مجھے اعتراض ہے۔

ریٹا: اعتراض (قہقہہ مار کر) نو سو چوہے کھا کر بلی حج کو جا رہی ہے۔ کیا تمھارے کارنامے ہم سے چھپے ہوئے ہیں۔

(روز ریٹا کو غصہ اور نفرت سے دیکھتے ہوئے)

روز:

اتنی نہ بڑھا پاکیٔ داماں کی حکایت
دامن کو ذرا دیکھ ذرا بند قبا دیکھ

ریٹا! اپنے گریبان میں نظر ڈالو کانچ کے گھر میں بیٹھ کر دوسروں پر پتھر نہیں پھینکا کرتے۔

ریٹا: روز! تمھیں جن نگاہوں سے چاہنے والے چاہتے ہیں اس سے میں خوب

واقف ہوں۔

(روز طنزیہ مسکرا کر جس میں خوداعتمادی کی پوری جھلک ہے)

روز: اگر نوجوان میرے جسم ہی کو چاہتے ہیں تو مجھے اس پر کیا اعتراض ہوسکتا ہے۔ ان کی یہ چاہت غیر فطری نہیں ہے۔

ریٹا: (نفرت آمیز طنز سے) اور تم ان کو اپنا جسم حوالے بھی کر دیتی ہو۔

روز: (خود اعتمادی کی مسکراہٹ سے طنزیہ) ہاں اگر کوئی میرے جسم کو خلوص سے چاہے (نفرت سے) تم خلوص اور ہوس میں فرق نہیں کرسکتیں۔

ریٹا: تم خلوص اور ہوس میں فرق کرلو۔ بات اصل میں ایک ہی ہے۔

روز: تم اس لیے خلوص اور ہوس میں فرق نہیں کرسکتیں کہ تم ہمیشہ اوروں کے پیچھے دوڑتی رہی ہو۔

ریٹا: (طنزیہ) اور تم؟

روز: (فخریہ) میں نے مردوں کو اپنے پیچھے دوڑایا ہے اس لیے خلوص اور ہوس کے فرق کو خوب سمجھتی ہوں۔ تم مردوں کے اشاروں پر ناچتی رہی ہو اور میں نے مردوں کو اپنے اشاروں پر نچایا ہے۔

ریٹا: (کھسیانے پن سے) تو گویا تم ایک کامیاب کھلاڑی ہو۔

روز: بے شک (طنزیہ مسکرا کر) اگر عورت عیاشی کرے مگر پروقار انداز میں تو یہ اس کی بڑی کامیابی ہے۔

ریٹا: (قہقہہ مار کر) عیاشی اور پروقار انداز میں۔ بہت خوب۔ بہت خوب (طنزیہ) یہ تو کسی ادبی شاہ کار کا کوئی عظیم موضوع ہے۔

روم: ادبی شاہ کار ہو یا کوئی عظیم موضوع۔ مگر جہاں عورت بک جاتی ہے وہاں عورت کی عظمت ختم ہوجاتی ہے۔

ریٹا: خیر میں تم سے کسی مسئلے پر الجھنا نہیں چاہتی۔ سوال، فلپ کا ہے اسے اپنے کیے کی سزا بھگتنا پڑے گی۔

روز: اگر فلپ قصوروار ہے تو اسے ضرور سزا ملنا چاہیے مجھے اس سے کیا لینا دینا ہے۔

ریٹا: (طنزیہ مسکرا کر کھڑی ہو کر) لینا دینا کیوں نہیں پھر تمھارا کاروبار ٹھپ ہو جائے گا نا۔

روز: کون سا کاروبار!

ریٹا: (دروازے کی طرف جاتے ہوئے) وہی جسے تم پروقار عیاشی کہتی ہو۔

روز: (غصے سے) ریٹا! میں اپنی عزت کرنا جانتی ہوں۔ ایک بھوکی شیرنی پر پتھر پھینکنا خطرناک ہوتا ہے۔

ریٹا: بھوکی شیرنی (طنزیہ قہقہہ مار کر) دیکھوں گی کہ بھوکی شیرنی میں کس قدر دم خم ہے۔
(دروازے کے پاس پہنچ جاتی ہے کہ موہن اسی دروازے سے داخل ہوتا ہے اور ریٹا کو جاتے ہوئے دیکھ کر)

موہن: ہلو ریٹا۔۔۔ کہاں چل دیں۔۔۔ یہ قہقہے کیوں لگائے جا رہے ہیں۔

ریٹا: ایک بھوکی شیرنی آپ کے کمرے میں گھس آئی ہے۔ آپ اس سے نپٹئے۔ اک ضروری کام تھا پھر حاضر ہو جاؤں گی۔
(وہ چلی جاتی ہے موہن روز سے مخاطب ہو کر)

موہن: مس روز! آپ؟ خدا کی شان ہے کہ غریب خانے کو نوازا کہیے مزاج تو اچھا ہے۔

روز: مجھے آپ سے ایک ضروری کام تھا۔

موہن: ضروری کام ہوتا رہے گا۔ یہ فرمایئے ریٹا سے کس بات پر جھپٹ ہوگئی۔

روز: وہ میرا اور اس کا ذاتی معاملہ ہے اس سے میں نمٹ لوں گی مجھے آپ کی قانونی مدد درکار ہے۔

موہن: (مسکرا کر روز کے پاس بیٹھتے ہوئے)۔ قانونی مدد! کس سلسلے میں؟

روز: ابھی مسٹر شرت اور مولوی اشفاق میرے گھر آئے تھے انھوں نے فلپ کو برا بھلا کہا اور میری ذات پر ناروا حملے کیے میری توہین کی میں ان پر ہتک عزت

کا دعویٰ کرنا چاہتی ہوں۔

موہن: ہتک عزت کا دعویٰ۔ مس روز یہ دونوں محلے کے ہی نہیں شہر کے باعزت لوگوں میں شمار ہوتے ہیں۔

روز: تو انھیں دوسروں کی پگڑی اچھالنے کا پروانہ مل گیا ہے۔

موہن: نہیں یہ بات نہیں اُن کے خلاف جرم ثابت کرنا بڑا مشکل ہو جائے گا وہ اپنے تمام اثرات سے کام لیں گے اور پھر مسٹر جوشی بھی شاید ان کے مقابلے میں خاموشی اختیار کرلیں ان دونوں نے الیکشن میں ان کی بڑی مدد کی تھی۔

روز: اگر الیکشن اس قدر بری چیز ہے کہ یہ حق پرستی کو ناحق پرستی میں بدل دیتی ہے اور سچائی کو بے انصافی میں تو اسے فوراً ختم ہو جانا چاہیے۔

موہن: (ہنس کر) مس روز! اس کاروباری دنیا میں آپ کی یہ تمنا صدا بہ صحرا سے زیادہ حقیقت نہیں رکھتی آج کا انسان اس ہاتھ دے کر اس ہاتھ لینا چاہتا ہے۔

روز: (موہن کو غور سے دیکھ کر) اور میں آپ کا وکالت نامہ کسی خیراتی مقدمے کے لیے نہیں چاہتی۔

موہن: (مسکرا کر) اور یہ کوئی قومی کام بھی نہیں۔

روز: اور قومی کام بھی لوگ کہاں بے غرضی سے کرتے ہیں۔ خیر۔ بتلائیے آپ کا جو محنتانہ ہوگا وہ پیش کر دیا جائے گا۔

موہن: (مسکرا کر) میں پڑوسیوں سے محنتانہ نہیں لیا کرتا۔ مگر سوال یہ ہے کہ شرت بابو اور مولوی اشفاق سے بیر کیوں لیا جائے اور پھر مسٹر جوشی بھی اس کو پسند نہیں کریں گے۔

روز: مگر مسٹر جوشی اسمبلی میں ہمارے نمائندے ہیں۔ انھیں اپنے ووٹرس کو ایک پلڑے میں تولنا چاہیے۔

موہن: آپ مسٹر جوشی کو اس قدر نہیں جانتیں جس قدر میں۔ وہ ایسے وقت میں جب کہ الیکشن سر پر ہے ایسے لوگوں سے دشمنی نہیں لے سکتے جو ان کے کسی طرح

کام آسکتے ہیں اور اگر آپ برا نہ مانیں تو ایک بات عرض کروں۔

روز: ضرور فرمایئے۔ میں یہاں برا ماننے کے لیے حاضر نہیں ہوئی ہوں۔

موہن: ویسے مجھے کہنا تو نہیں چاہیے مگر کہنا پڑ رہا ہے کہ آپ کا خاندان محلے میں بے حد بدنام ہے۔ شہادتیں حاصل کرنا دشوار ہوگا اور آپ تو جانتی ہیں کہ عدالت صرف شہادتیں چاہتی ہے۔

روز: اگر مسٹر شرت اور مولوی اشفاق میں شرافت ہے تو وہ خود اپنے خلاف شہادت دیں گے۔

موہن: (قہقہہ مار کر) مس روز آپ جس قدر حسین ہیں اسی قدر معصوم بھی یہ مجھے آج ہی معلوم ہوا کیا مجرم کبھی اقبال جرم بھی کرتا ہے (سنجیدہ ہوکر) ہاں ایک بات ہوسکتی ہے۔

روز: فرمایئے۔

موہن: میں مسٹر جوشی کے ذریعے مسٹر شرت اور مولوی اشفاق کو مجبور کراؤں کہ وہ آئندہ اس قسم کی حرکت نہ کریں عدالت میں کچھ ہونے ہوانے کا نہیں۔ میں نے متعدد بار مسٹر جوشی کو آپ کے خلاف پولیس میں رپورٹ کرنے سے باز رکھا ہے۔

روز: آپ نے!

موہن: جی ہاں (فخریہ انداز میں) آپ جانتی ہیں کہ مسٹر جوشی میرا خاص خیال رکھتے ہیں اپنے زیادہ تر مقدمات میرے سپرد کردیتے ہیں اور زیادہ تر سیاسی مشورہ بھی مجھ سے لیتے ہیں۔

روز: (موہن کو غور سے دیکھ کر) لیکن یہ مہربانی آپ نے کس سلسلے میں فرمائی تھی آپ تو دنیا کو صرف کاروبار ہی سمجھتے ہیں۔

موہن: (پہلے روز کو غور سے دیکھتا ہے پھر نظریں جھکا کر مسکراتے ہوئے) دنیا تو کاروبار ہے ہی مس روز مگر دنیا میں کچھ ہستیاں ایسی بھی ہیں جن سے کاروبار

کرنے کو جی نہیں چاہتا۔

روز: (موہن کو غور سے دیکھ کر طنزیہ مسکرا کر) اور ان میں سے ایک میں ہوں۔

موہن: مس روز یہ مبالغہ نہیں حقیقت ہے کہ آپ پہلی ہی نظر میں لوگوں کے دل و دماغ میں سما جاتی ہیں۔

روم: (طنزیہ) شکریہ! (لہجہ بدل کر) مسٹر موہن میں آپ سے قانونی مشورہ کرنے آئی تھی عشق بازی کرنے نہیں۔

موہن: میں نے اپنا مقدمہ آپ کے سامنے پیش کر دیا ہے جس کا میں عرصے سے متمنی تھا۔

روز: (کھڑی ہو کر) مسٹر موہن! آپ میں اور مجھ میں بڑا فرق ہے۔

موہن: فرق کس قسم کا۔

روز: سماجی حیثیت کا انداز فکر کا۔

موہن: سماجی حیثیت تو اضافی چیز ہے لیکن انداز فکر سے آپ کا کیا مطلب ہے۔

روز: میرا انداز فکر ایک مخصوص ماحول کی پیداوار ہے انداز بیان انداز فکر ایک دوسرے ماحول کا۔ ان دونوں کو قریب لانے کی کوشش مشکل ہی نہیں بلکہ مہلک ہے۔

موہن: لیکن مس روز سوال وسعت نظر کا ہے۔

روز: اگر وسعت نظر کا مطلب یہ ہے کہ انسان اپنے کلچر اور اپنی تہذیب کو دوسرے کے کلچر اور تہذیب میں ضم کر دے تو مجھے اسی وسعت نظر سے گھن آتی ہے۔

موہن: (برہم ہو کر) اور آپ کو اس ماحول سے گھن نہیں آتی جس میں آپ زندگی گزار رہی ہیں مسٹر جوشی ایسے خیالات کو پسند نہیں کرتے۔

روز: (غصہ سے) آپ کے مسٹر جوشی کیا کیا کرتے ہیں۔ وہ آپ کے بھگوان ہو سکتے ہیں میرے خدا نہیں۔

موہن: (برہم ہو کر) مس روز! آپ کو مسٹر جوشی کے متعلق اس قسم کے الفاظ کہنے کا

حق نہیں ہے وہ اسمبلی کے ایک باعزت ممبر ہیں۔

روز: اگر اسمبلی کی ممبری خدائی کے ہم معنی ہے تو میں اس کو قبول نہیں کر سکتی۔

موہن: مگر مسٹر جوشی کے آپ پر احسانات ہیں۔

روز: مجھ پر!

موہن: جی ہاں۔ جان کو نوکری دلانے کے لیے انھوں نے ایڑی چوٹی کا زور لگا دیا ہے۔

روز: یہ احسان تو جان پر ہوا مجھ پر نہیں۔

موہن: مس روز میں نے تو ایک کاروبار کرنا چاہا تھا جس سے آپ ہر روز کی اس دانتا کل سے بچ سکتی تھیں مگر آپ شاید۔

روز: (بات کاٹ کر) مسٹر موہن! اگر مجھے اپنے آپ کو بیچنا ہی ہوگا تو مجھے اپنے ہی لوگوں کی کمی نہ ہوگی۔ آپ سے کاروبار کرنے کی ضرورت نہیں۔ مجھے بہت سے وکیل مل سکتے ہیں۔

موہن: مگر مس روز! آپ مسٹر جوشی کے اثرات کو بھی جانتی ہیں۔

روز: جی ہاں میں جانتی ہوں۔ ان سے کہہ کر آپ توپ لگوا دیجیے۔ غصہ اور طنز سے موہن کو دیکھتی ہے اور تیز تیز قدموں سے کمرے سے چلی جاتی ہے۔

(پردہ)

(شاعر بمبئی، نومبر 1961)

بیگم صاحبہ

افرادِ تمثیل

(1) بیگم صاحبہ (ایک مالدار بیوہ) (2) خالدہ (بیگم صاحبہ کی بہن کی لڑکی) (3) انیس (بیگم صاحبہ کے دیور کا لڑکا) (4) اشفاق (انیس کا دوست) (5) کنیزہ (بیگم صاحبہ کی ملازمہ)

منظر

بیگم صاحبہ کا ڈرائنگ روم جو اعلیٰ طبقہ کی شان کے مطابق سجا ہوا ہے جس میں مشرقی اور مغربی تہذیبوں کا ایک خوشگوار امتزاج ہے۔ صوفہ سیٹ کے ساتھ ساتھ خالص مشرقی انداز میں تخت پر گاؤ تکیہ وغیرہ سلیقے سے رکھے ہوئے ہیں۔ تخت پر ایک پاندان رکھا ہے اور تخت کے نیچے ایک اگالدان۔ صوفے سیٹ، ریڈیو وغیرہ اعلیٰ قسم کے ہیں پورے کمرے میں دری کا فرش ہے جس پر جابجا اعلیٰ قسم کے قالین بچھے ہوئے ہیں۔ دروازوں پر قیمتی ریشمی پردے آویزاں ہیں۔ کمرے کی سجاوٹ سے نفاست اور سلیقہ ظاہر ہوتا ہے۔

صبح کے تقریباً دس بجے ہیں مگر موسم سرد ہے۔ بیگم صاحبہ ایک قیمتی شال اوڑھے صوفے پر آنکھیں بند کیے بیٹھی ہیں۔ اُن کے سامنے ایک آرام دہ کرسی پر خالدہ بیٹھی ہے۔

اس کی گود میں ایک کتاب رکھی ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے اس نے ابھی ابھی پڑھ کے اسے ختم کیا ہے۔ کچھ دیر بیگم صاحبہ آنکھیں بند کیے بیٹھی رہتی ہیں پھر آنکھیں کھول کر۔

بیگم صاحبہ: خالدہ! (خالدہ نظریں اٹھا کر بیگم صاحبہ کو دیکھتی ہے)۔ ذرا بیٹی مجھے ایک پان دے دو (خالدہ گود میں رکھی ہوئی کتاب سامنے میز پر رکھ کر کھڑی ہوتی ہے)۔ دیکھو— چونا زیادہ نہ تھوپ دینا (خالدہ تخت پر بیٹھ کر پان لگاتی ہے۔ بیگم صاحبہ پھر آنکھیں بند کر کے صوفے کی پشت سے ٹیک لگا کر) جانے تمھیں یہ جاسوسی ناول کیوں پسند ہیں (خالدہ کوئی جواب نہیں دیتی۔ خاموشی سے پان لاکر بیگم صاحبہ کو دیتی ہے۔ بیگم صاحبہ آنکھیں کھول کر گلوری اٹھاتی ہیں۔ پھر گلوری دیکھ کر) کتنی مرتبہ سمجھایا کہ پان صاف کرلیا کرو بڑی بدتمیز ہے یہ (گلوری صاف کر کے ایک خاص انداز سے منہ میں رکھتی ہیں) بیٹھ جاؤ (خالدہ پھر اپنی کرسی پر بیٹھ جاتی ہے۔ کچھ دیر خاموش رہ کر) انیس ابھی تک نہیں آیا۔ آنے کو تو کہہ گیا تھا نا؟

خالدہ: (نظریں جھکا کر) کہہ تو گئے تھے۔

بیگم صاحبہ: اب تک تو آجانا چاہیے تھا۔

خالدہ: آج ان کا ٹینس میچ ہے اس کی تیاری میں لگے ہوں گے۔

بیگم صاحبہ: ارے ہاں ٹھیک تو ہے (مسکرا کر آنکھیں کھول کر) میں تو بھول ہی گئی۔ (چند سیکنڈ خاموش رہ کر) پرسوں کرکٹ میں تو میری سانس رک گئی تھی جب اس کا اسکور 98 پر آکر رک گیا تھا۔

خالدہ: (حیرت سے 98 پر؟ کس کا؟

بیگم صاحبہ: (چونک کر) میرا مطلب اشفاق سے ہے۔

خالدہ: (مسکرا کر) میں سمجھی آپ انیس کو کہہ رہی ہیں۔ میں نے تو انھیں زندگی میں 98 رن بناتے نہیں دیکھا۔

بیگم صاحبہ: وہ کھیل میں کبھی سنجیدہ نہیں ہوتا۔

خالدہ: ممکن ہے ایسا ہو مگر — (خاموش ہوجاتی ہے بیگم صاحبہ سوالیہ نظروں سے دیکھتی ہیں۔ خالدہ چند سیکنڈ خاموش رہ کر) جہاں 90 سے زیادہ رن ہوئے اور ان کے ہاتھ پیر پھولے۔ ایک دم اکسایٹڈ ہوجاتے ہیں۔ اس روز اچھا خاصا کھیل رہے تھے کہ فضول میں کیچ دے دیا۔ بالکل اناڑیوں کی طرح۔

بیگم صاحبہ: اب یہ تو کھیل ہے اس میں بھی قسمت کو بڑا دخل ہوتا ہے۔

خالدہ: حماقت کو قسمت کا نام نہ دیجیے۔ آخر اشفاق بھی تو ہیں 90 سے زیادہ رن ہوتے ہی وہ کس قدر محتاط ہوجاتے ہیں۔

بیگم صاحبہ: (مشکوک نظروں سے خالدہ کو دیکھتی ہیں۔ خالدہ نظریں جھکا لیتی ہے) کرکٹ بائی چانس مشہور ہے اور ٹینس میں اشفاق اس کا مقابلہ نہیں کرسکتا۔

خالدہ: ٹینس میں کہاں کا تیر مار لیتے ہیں۔ فلش اس میں بھی اچھا نہیں ہے۔ (کنیزہ داخل ہوئی ہیں۔ خالدہ اور بیگم صاحبہ اسے غور سے دیکھتی ہیں)

کنیزہ: بیگم صاحبہ! آپ کا فون ہے۔

بیگم صاحبہ: فون! (ایسی کھوئی کھوئی نظروں سے اسے دیکھتی ہیں۔ جیسے فون کا مطلب یہ نہ سمجھی ہوں) فون۔

کنیزہ: جی ہاں۔ فون۔

بیگم صاحبہ: اوہ فون۔ کس کا؟

کنیزہ: بیگم سرور کا۔

بیگم صاحبہ: بیگم سرور کا۔ اوہ یاد آیا آج ان کی لڑکی کی سالگرہ ہے کیوں خالدہ؟ ذرا جاکر فون سن لو اور اگر پارٹی کا کہیں تو کہہ دینا میں ضرور آؤں گی۔

(خالدہ اٹھ کر دروازے کی طرف جاتی ہے۔ جونہی دروازے کے پاس پہنچتی ہے انیس داخل ہوتا ہے اور دونوں میں ٹکر ہوتے ہوتے بچتی ہے۔ انیس فوراً راستہ چھوڑ کر کھڑا ہوجاتا ہے۔ اور مسکرا کر فوجی سلام کرتا ہے۔ خالدہ مسکرا کر کمرے سے نکل جاتی ہے۔ اس کے پیچھے پیچھے کنیزہ جاتی ہے۔ انیس

ملازمہ کو دیکھ کر)۔

انیس: آج تو بڑی بنی ٹھنی ہے کیا دوسرے نکاح کا ارادہ ہے۔ (کنیزہ مسکرکر انیس کو دیکھتی ہے اور کمرے سے نکل جاتی ہے۔ انیس بیگم صاحبہ کے پاس آ کر) چچی جان آداب عرض ہے۔

بیگم صاحبہ: (گردن ہلا کر مسکراتے ہوئے جواب دے کر) کیوں اتنی دیر کہاں لگا دی؟

انیس: چچی جان آج ٹینس کا میچ ہے بس اسی کی تیاری کر رہا تھا۔

بیگم صاحبہ: (مسکرا کر) بس رہنے دے۔ ابھی خالدہ تیرے کھیل کی بہت برائی کر رہی تھی۔

انیس: (سامنے کرسی پر بیٹھ کر) چچی جان بس یہ ہیں دل جلانے والی باتیں۔ کسی روز میں اس سے لڑ پڑوں گا۔

بیگم صاحبہ: کیا لڑ پڑے گا۔ سچ ہی تو کہہ رہی تھی۔

انیس: وہ کھیل دیکھنے نہ آئے تو سنچری بنا کر بتلا دوں اور یہ محترمہ اس قدر تیزی میں کہاں گئی ہیں۔

بیگم صاحبہ: (مسکرا کر) گھبرا نہیں آتی ہوگی۔ فون سننے گئی ہے۔

انیس: میں سمجھا چائے بنانے گئی ہے۔ (کھڑے ہو کر) میں ان سے چائے بنانے کا کہہ آؤں؟ ہمیشہ خراب چائے بناتی ہیں محترمہ۔

بیگم صاحبہ: چل چل بیٹھ یہ چائے کا وقت نہیں ہے۔ اور ہاں یہ اشفاق کئی دن سے نظر نہیں آیا کہاں ہے۔

انیس: بے حد پریشان ہے نوکری کے لیے مارا مارا پھر رہا ہے۔

بیگم صاحبہ: نوکری کے لیے!

انیس: جی ہاں! ایک بیوہ ماں، ایک جوان بہن اور دو چھوٹے بھائیوں کی ذمہ داریاں ہیں اور نوکری نام کی کوئی چیز اس کی قسمت میں نہیں ہے میں جا کر اسے فون کر دوں؟

بیگم صاحبہ: کیوں؟

انیس: کہوں گا چچی جان بلا رہی ہیں ابھی دوڑا ہوا آئے گا۔

بیگم صاحبہ: آخر اسے ایسی کیا پڑی ہے (خالدہ داخل ہوتی ہے۔ بیگم صاحبہ اسے دیکھ کر) کیا بات تھی!

خالدہ: وہی سالگرہ کی دعوت تھی۔

بیگم صاحبہ: پھر تو نے کیا کہا؟

خالدہ: میں نے کہہ دیا آپ ضرور تشریف لائیں گی۔

بیگم صاحبہ: اور تو نہیں چلے گی؟

خالدہ: بلایا تو مجھے بھی ہے۔

بیگم صاحبہ: پھر تو ضرور چلنا نہیں تو برا مانیں گی۔ (انیس سے) جا اب تو جا کر فون کر لے۔

انیس: بہت اچھا— مگر چچی جان۔ (خالدہ کی طرف اشارہ کر کے) آپ ان محترمہ کو فون پر نہ بھیجا کیجیے۔

بیگم صاحبہ: (مسکرا کر) کیوں؟

انیس: (دروازے کی طرف جاتے ہوئے) محترمہ ایسی آوازیں نکالتی ہیں جیسے بلیاں لڑ رہی ہوں۔

(تیزی سے کمرے سے چلا جاتا ہے۔ بیگم صاحبہ مسکرا کر خالدہ کو دیکھتی ہیں۔ خالدہ نظریں جھکا کر کرسی پر بیٹھ جاتی ہیں۔

بیگم صاحبہ: یہ انیس تیرے ہاتھ دھو کر پیچھے پڑ گیا ہے (مسکرا کر) برا نہ ماننا تجھے بہت پسند کرتا ہے (خالدہ گردن جھکا کر نظریں نیچی کر لیتی ہے بیگم صاحبہ غور سے اسے دیکھتی ہیں۔ کچھ دیر خاموش رہتی ہے۔ انیس واپس آتا ہے) فون کر دیا؟

انیس: لائن خالی نہیں تھی۔ خالدہ کی طرف دیکھ کر) اگر تکلیف نہ ہو تو چائے پلوا دیجیے۔ (مسکرا کر) میرے لیے چائے کا کوئی وقت نہیں ہے۔ (خالدہ

اس طرح سے اسے دیکھتی ہے جیسے کچھ کہنے والی ہو، انیس اسے بولنے کا موقع نہ دے کر) مجھے معلوم ہے کہ آپ کچھ ڈاکٹری اصولوں کی تلقین [illegible] مجھے آپ کی نصیحتیں قبول نہیں ہیں۔

خالدہ: (بلند آواز سے) کنیزہ۔

انیس: جی نہیں۔ میں آپ کے ہاتھ کی بنی ہوئی چائے پینا چاہتا ہوں۔ مجھے اس وقت اچھی بنی ہوئی چائے کی خواہش نہیں ہے (بیگم صاحبہ مسکراتی ہیں۔ خالدہ بھی مسکراتی ہوئی اٹھ کر دروازے کی طرف جاتی ہے) چچی جان! آج کل کی لڑکیاں بے حد سست اور کام چور ہوتی ہیں۔

(خالدہ کوئی جواب نہیں دیتی اور کمرے سے چلی جاتی ہے کچھ دیر خاموش رہتی ہے بیگم صاحبہ آنکھیں بند کیے سوچتی ہیں پھر آہستہ آہستہ آنکھیں کھول کر جیسے نیند سے جاگ رہی ہوں)۔

بیگم صاحبہ: انیس۔ (انیس بیگم صاحبہ کی طرف متوجہ ہوتا ہے) میرا خیال ہے کہ

انیس: آپ کا خیال بے حد دلچسپ اور عمدہ ہوتا ہے۔ فرمایئے۔

بیگم صاحبہ: (مسکرا کر) اگر میں اشفاق کو سو ڈیڑھ سو روپے ماہوار دے دیا کروں تو وہ انہیں قبول کرلیا کرے گا؟

انیس: (ہنس کر) پہلے تو میں ہی قبول کرلوں گا۔ مگر کس خوشی میں؟

بیگم صاحبہ: (مسکرا کر) میں اسے کچھ ذمہ داریاں بھی سونپنا چاہتی ہوں۔

انیس: پھر تو وہی ٹھیک رہے گا۔ ایسی کون سی ذمہ داریاں ہیں۔

بیگم صاحبہ: یہی بزنس کی دیکھ بھال۔

انیس: بزنس کی دیکھ بھال (کچھ سوچ کر) بزنس کی دیکھ بھال تو کم کرے گا۔ آپ کا دماغ زیادہ چاٹے گا۔

بیگم صاحبہ: (مسکرا کر) یہ کیا برائی ہے۔ میں بھی یہ چاہتی ہوں۔ اکیلی جو رہتی ہوں۔

انیس: کیا خالدہ کی فضول باتوں سے آپ کا جی نہیں بھرتا۔

بیگم صاحبہ: خالدہ بہت کم سخن لڑکی ہے۔ ہاں تو وہ اسے قبول کرے گا یا نہیں۔

انیس: پریشان حال تو ہر چیز کو قبول کر لیتا ہے — مگر (بیگم صاحبہ سوالیہ نظروں سے انیس کو دیکھتی ہیں) بزنس اس کے بس کا ہے نہیں۔

بیگم صاحبہ: ذہین ہے۔ جلد ہی بزنس کے گر بھی سیکھ لے گا۔

انیس: اور پھر اس کا کھیل تو ختم ہی سمجھو۔ (شرارت سے تھوڑی سانس بھر کر) میاں اشفاق گئے ہاتھ سے خدا مغفرت کرے اچھا کھیلتے تھے۔

(خاموش ہو جاتا ہے اور چہرے پر سنجیدگی آجاتی ہے اور خلا میں اس طرح گھورتا ہے جیسے ایک دم کسی گہری فکر میں مبتلا ہو گیا ہو۔ بیگم صاحبہ اس کی یہ حالت دیکھ کر)

بیگم صاحبہ: کیا بات ہے انیس؟

انیس: (ٹھنڈی سانس بھر کر) کوئی بات نہیں (بات ٹالنے کے انداز میں) یہ خالدہ ابھی تک چائے نہیں لائی — میں کہتا ہوں چچی جان —

بیگم صاحبہ: (قطع کلام کر کے) اب بات کیوں ٹال رہا ہے۔ سچ کہہ کیا بات ہے۔

انیس: میں نے عرض تو کیا کوئی بات نہیں۔

بیگم صاحبہ: کوئی بات تو ضرور ہے۔ تو کسی سوچ میں پڑ گیا (چند سیکنڈ خاموش رہ کر) میں جانتی ہوں کہ تو کیا سوچ رہا ہے۔ (انیس سوالیہ انداز میں بیگم صاحبہ کو دیکھتا ہے۔ بیگم صاحبہ مسکرا کر) تو خالدہ کے متعلق سوچ رہا ہے۔

انیس: (کھوئے ہوئے انداز میں) خالدہ کے متعلق؟

بیگم صاحبہ: یہی کہ تو خالدہ کو چاہتا ہے اور سوچتا ہے کہ کہیں خالدہ اور اشفاق کا ساتھ۔

انیس: ارے نہیں چچی جان — آپ بھی کیا فضول بات سوچ رہی ہیں۔ اگر میں خالدہ سے محبت کرتا بھی ہوں تو بھی۔

بیگم صاحبہ: تو ضرور۔ خالدہ سے محبت کرتا ہے۔

انیس: مان لیجیے میں خالدہ سے محبت کرتا ہوں پھر بھی خالدہ کو تو آزاد رائے رکھنے کا

اس طرح سے اسے دیکھتی ہے جیسے کچھ کہنے والی ہو، انیس اسے بولنے کا (موقع نہ دے کر) مجھے معلوم ہے کہ آپ کچھ ڈاکٹری اصولوں کی تلقین فرمائیں گی مگر مجھے آپ کی نصیحتیں قبول نہیں ہیں۔

خالدہ: (بلند آواز سے) کنیزہ۔

انیس: جی نہیں۔ میں آپ کے ہاتھ کی بنی ہوئی چائے پینا چاہتا ہوں۔ مجھے اس وقت اچھی بنی ہوئی چائے کی خواہش نہیں ہے (بیگم صاحبہ مسکراتی ہیں۔ خالدہ بھی مسکراتی ہوئی اٹھ کر دروازے کی طرف جاتی ہے) بچی جان! آج کل کی لڑکیاں بے حد سست اور کام چور ہوتی ہیں۔

(خالدہ کوئی جواب نہیں دیتی اور کمرے سے چلی جاتی ہے کچھ دیر خاموش رہتی ہے بیگم صاحبہ آنکھیں بند کیے سوچتی ہیں پھر آہستہ آہستہ آنکھیں کھول کر جیسے نیند سے جاگ رہی ہوں)۔

بیگم صاحبہ: انیس۔ (انیس بیگم صاحبہ کی طرف متوجہ ہوتا ہے) میرا خیال ہے کہ

انیس: آپ کا خیال بے حد دلچسپ اور عمدہ ہوتا ہے۔ فرمایئے۔

بیگم صاحبہ: (مسکرا کر) اگر میں اشفاق کو سو ڈیڑھ سو روپے ماہوار دے دیا کروں تو وہ انھیں قبول کرلیا کرے گا؟

انیس: (ہنس کر) پہلے تو میں ہی قبول کرلوں گا۔ مگر کس خوشی میں؟

بیگم صاحبہ: (مسکرا کر) میں اسے کچھ ذمہ داریاں بھی سونپنا چاہتی ہوں۔

انیس: پھر تو وہی ٹھیک رہے گا۔ ایسی کون سی ذمہ داریاں ہیں۔

بیگم صاحبہ: یہی بزنس کی دیکھ بھال۔

انیس: بزنس کی دیکھ بھال (کچھ سوچ کر) بزنس کی دیکھ بھال تو کم کرے گا۔ آپ کا دماغ زیادہ چاٹے گا۔

بیگم صاحبہ: (مسکرا کر) یہ کیا برائی ہے۔ میں بھی یہ چاہتی ہوں۔ اکیلی جو رہتی ہوں۔

انیس: کیا خالدہ کی فضول باتوں سے آپ کا جی نہیں بھرتا۔

بیگم صاحبہ: خالدہ بہت کم سخن لڑکی ہے۔ ہاں تو وہ اسے قبول کرے گا یا نہیں۔

انیس: پریشان حال تو ہر چیز کو قبول کرلیتا ہے— مگر (بیگم صاحبہ سوالیہ نظروں سے انیس کو دیکھتی ہیں) بزنس اس کے بس کا ہے نہیں۔

بیگم صاحبہ: ذہین ہے۔ جلد ہی بزنس کے گر بھی سیکھ لے گا۔

انیس: اور پھر اس کا کھیل تو ختم ہی سمجھو۔ (شرارت سے تھوڑی سانس بھر کر) میاں اشفاق گئے ہاتھ سے خدا مغفرت کرے اچھا کھیلتے تھے۔

(خاموش ہوجاتا ہے اور چہرے پر سنجیدگی آجاتی ہے اور خلا میں اس طرح گھورتا ہے جیسے ایک دم کسی گہری فکر میں مبتلا ہوگیا ہو۔ بیگم صاحبہ اس کی یہ حالت دیکھ کر)

بیگم صاحبہ: کیا بات ہے انیس؟

انیس: (ٹھنڈی سانس بھر کر) کوئی بات نہیں (بات ٹالنے کے انداز میں) یہ خالدہ ابھی تک چائے نہیں لائی— میں کہتا ہوں چچی جان—

بیگم صاحبہ: (قطع کلام کرکے) اب بات کیوں ٹال رہا ہے۔ سچ کہہ کیا بات ہے۔

انیس: میں نے عرض تو کیا کوئی بات نہیں۔

بیگم صاحبہ: کوئی بات تو ضرور ہے۔ تو کسی سوچ میں پڑ گیا (چند سیکنڈ خاموش رہ کر) میں جانتی ہوں کہ تو کیا سوچ رہا ہے۔ (انیس سوالیہ انداز میں بیگم صاحبہ کو دیکھتا ہے۔ بیگم صاحبہ مسکرا کر) تو خالدہ کے متعلق سوچ رہا ہے۔

انیس: (کھوئے ہوئے انداز میں) خالدہ کے متعلق؟

بیگم صاحبہ: یہی کہ تو خالدہ کو چاہتا ہے اور سوچتا ہے کہ کہیں خالدہ اور اشفاق کا ساتھ۔

انیس: ارے نہیں چچی جان— آپ بھی کیا فضول بات سوچ رہی ہیں۔ اگر میں خالدہ سے محبت کرتا بھی ہوں تو بھی۔

بیگم صاحبہ: تو ضرور۔ خالدہ سے محبت کرتا ہے۔

انیس: مان لیجیے میں خالدہ سے محبت کرتا ہوں پھر بھی خالدہ کو تو آزاد رائے رکھنے کا

حق ہے۔

بیگم صاحبہ: اگر خالدہ کی شادی اشفاق سے ہو جائے پھر؟

انیس: مجھے افسوس نہیں ہوگا۔ اشفاق بھی برا نہیں ہے۔

(کنیزہ کمرے میں آکر)

کنیزہ: بیگم صاحبہ۔ اشفاق میاں تشریف لائے ہیں۔

بیگم صاحبہ: اشفاق!

کنیزہ: جی ہاں۔

انیس: اسے یہیں بھیج دو۔ باہر کھڑا کیا دروازے گن رہا ہے (کنیزہ چلی جاتی ہے بیگم صاحبہ ذرا سنبھل کر بیٹھ جاتی ہے۔ تھوڑی دیر بعد اشفاق کمرے میں آتا ہے اور بیگم صاحبہ کو ادب سے جھک کر سلام کرتا ہے بیگم صاحبہ مسکرا کر گردن ہلا کر جواب دیتی ہیں) آیئے اشفاق مرحوم۔

اشفاق: (مسکرا کر انیس کو دیکھتے ہوئے) آپ یہاں تشریف رکھتے ہیں۔ میں آپ ہی کے گھر سے چلا آرہا ہوں۔ وہاں معلوم ہوا کہ آپ وہاں سے انتقال فرما چکے ہیں۔

بیگم صاحبہ: یہ کون سی محبت ہے۔ بدشگونی کے الفاظ زبان سے نہیں نکالا کرتے۔ (اشفاق کی طرف دیکھ کر) بیٹھو— کہاں رہے اتنے دن۔

اشفاق: ذرا مصروف رہا— (کرسی پر بیٹھ کر) اس لیے حاضر نہ ہوسکا۔

بیگم صاحبہ: اور میں ہر روز تمھاری راہ دیکھتی رہی۔

اشفاق: بیگم صاحبہ میں شرمندہ ہوں (انیس کی طرف اشارہ کرکے) سب قصور ان حضرت کا ہے۔

انیس: (تعجب سے مسکرا کر) میرا؟

اشفاق: جی ہاں۔ میں نے جب یہاں آنے کا پروگرام بنایا تو آپ نے کوئی ایسا پروگرام بنالیا کہ میں یہاں نہ آسکوں۔

انیس: یہ لیجیے۔ (بیگم صاحبہ کی طرف دیکھ کر) چچی جان آپ تو اسے بزنس منیجر بنانے کے بجائے پروپگنڈہ سکریٹری بنا لیجیے خوب کامیاب رہے گا۔ جھوٹ بولنے میں کمال حاصل ہے۔ (کھڑے ہوکر) میں ذرا جاکر خالدہ کو بیدار کروں۔ (بیگم صاحبہ نظریں اٹھا کر انیس کو دیکھتی ہیں)۔ دیکھیے نا ایک گھنٹہ ہوگیا ہے کہ چائے بنانے گئی ہیں شاید سوگئی ہو۔

بیگم صاحبہ: ارے بیٹھ آتی ہی ہوگی۔

انیس: (انیس دروازے کی طرف جاتے ہوئے) اشفاق آگیا ہے آپ کا دماغ چاٹنے کے لیے۔

اشفاق: (مسکرا کر) تم نے کہاں چھوڑا ہوگا میرے لیے۔ جانے کب سے تو براجمان ہو۔ (انیس کوئی جواب نہیں دیتا اور کمرے سے چلا جاتا ہے۔بیگم صاحبہ اشفاق کو دیکھ کر) یہ انیس آج تم سے جلی کٹی باتیں کیوں کررہا ہے۔

اشفاق: پتا نہیں۔

بیگم صاحبہ: کیا کوئی جھگڑا ہوگیا ہے۔

اشفاق: جی نہیں۔ بھلا میرا اس سے جھگڑا ہوسکتا ہے؟ اور پھر جھگڑے کی کوئی بات بھی ہو کل ہی اپنے والد نفیس صاحب سے میری سفارش کررہا تھا کہ مجھے کوئی اچھی سی نوکری دلوادیں۔

بیگم صاحبہ: ارے ہاں تمھیں ابھی تک کوئی نوکری نہیں ملی۔

اشفاق: جی نہیں۔ (طنزیہ مسکرا کر) سرکاری نوکری حاصل کرنے کے لیے اگر اور کچھ نہیں تو کم ازکم کسی پارٹی کا الیکشن ورکر تو ہونا ہی چاہیے۔

بیگم صاحبہ: میں نے تمھارے لیے ایک نوکری کا انتظام کیا ہے جانے تم اسے پسند کروگے یا نہیں۔

اشفاق: میرے لیے۔

بیگم صاحبہ: ہاں— اور اسی سلسلے میں میں ابھی انیس سے بات کررہی تھی۔ (بیگم صاحبہ

خاموش ہو جاتی ہیں۔ اشفاق سوالیہ نگاہوں سے انھیں دیکھتا ہے بیگم صاحبہ کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد) کچھ دن سے میرے کاروبار کی حالت بڑی خراب ہو رہی ہے جو لوگ کام کر رہے ہیں ان سے میں تنگ آ چکی ہوں اگر تم اس کی دیکھ بھال کرنے لگو تو کیا برائی ہے کم از کم نقصان تو نہ ہوگا۔

اشفاق: مگر بیگم صاحبہ۔

بیگم صاحبہ: (بات کاٹ کر) یہی کہو گے کہ کاروبار میں تمھیں کوئی تجربہ نہیں ہے۔ تو وہ بھی جلد ہو جائے گا۔

اشفاق: (مسکرا کر) مگر میں ایسا ڈاکٹر بننا نہیں چاہتا۔ جو کئی مریضوں کی جان لے کر تجربہ حاصل کرتا ہے۔

بیگم صاحبہ: تمھارا کام تو صرف نگرانی ہوگا کہ نوکر چاکر حرام خوری نہ کریں۔

اشفاق: مگر بیگم صاحبہ بات دراصل یہ ہے کہ۔

بیگم صاحبہ: (بات کاٹ کر) اشفاق! میں چاہتی ہوں کہ میرے پاس رہو۔

اشفاق: میں آپ کی خدمت میں حاضر تو ہوتا رہتا ہوں۔ آپ جو حکم دیں گی اس کے لیے حاضر ہوں۔

بیگم صاحبہ: کہاں آئے ہو ہفتوں انتظار کرتی ہوں تب کہیں صورت دکھلاتے ہو۔

اشفاق: ذرا نوکری کے چکر میں پھنسا ہوا ہوں ورنہ——

بیگم صاحبہ: اور میں اسی چکر کو ختم کر دینا چاہتی ہوں۔

(اشفاق نظریں اٹھا کر بیگم صاحبہ کو دیکھتا ہے جو اسے عجیب نظروں سے گھور رہی ہیں جن میں ایک عجیب طرح کے وحشت نمایاں ہے۔ جس سے اشفاق گھبرا جاتا ہے پھر ایک دم کھڑے ہو کر)

اشفاق: مجھے اجازت دیجیے۔ پھر حاضر ہو جاؤں گا۔

بیگم صاحبہ: بیٹھ جاؤ (اشفاق اس طرح بیٹھ جاتا ہے جیسے بیگم صاحبہ کی نظروں سے مسحور ہو گیا ہو) مجھے تم سے بہت سی باتیں کرنا ہیں۔

اشفاق: بیگم صاحبہ۔

(اشفاق خاموش ہو کر کچھ سوچتا ہے کہ انیس کمرے میں داخل ہوتے ہوئے)۔

انیس: چچی جان! آج کل کی لڑکیاں سست اور کام چور ہی نہیں ہوتیں غیر ذمہ دار بھی ہوتی ہیں (خالدہ داخل ہوتی ہے خالدہ کی طرف اشارہ کرکے) محترمہ نے چائے دانی پر ایسی مشق ستم فرمائی کہ بے چاری قطعی مرحوم و مغفور ہو کر رہ گئی۔

بیگم صاحبہ: (کھوئے ہوئے انداز میں) چائے دانی۔

انیس: جی ہاں— (کرسی پر بیٹھتے ہوئے) وہی سیٹ جو آپ نے ابھی ابھی نمائش میں سے خریدا تھا۔ مجھے تو اس میں ایک مرتبہ بھی چائے پینا نصیب نہیں ہوا۔ (مصنوعی ٹھنڈی سانس بھر کر)

حسرت ان غنچوں پہ ہے جو بن کھلے مرجھا گئے

(خالدہ سے) یاد رکھیے مسٹر اشفاق اس گھر میں منیجر ہو کر آرہے ہیں اس بے پروائی کو معاف نہیں کریں گے اور آپ کو کوڑی کوڑی کا حساب دینا پڑے گا۔

بیگم صاحبہ: (مسکرا کر) پھوٹ گئی تو کہاں کا غضب ہو گیا کون سی قسمت لے گئی۔ تو تو ایسی ہائے ویلا مچا رہا ہے۔ جیسے گھر ہی لٹ گیا ہو۔

انیس: بس چچی جان آپ کی اس محبت ہی نے تو ان محترمہ کا دماغ ساتویں آسمان پر پہنچا دیا ہے۔

بیگم صاحبہ: بس بس رہنے دے (خالدہ سے) چائے نہیں بنائی۔

خالدہ: کنیزہ لا رہی ہے۔

انیس: چائے اور چائے کا سامان ضائع ہونے پر مجھے اس قدر صدمہ ہوتا ہے کہ بیان سے باہر ہے۔ چائے پینا ہی تو میرا محبوب مشغلہ ہے۔

بیگم صاحبہ: تیرا محبوب مشغلہ کیا نہیں ہے۔ (مسکرا کر) خراب کرکٹ کھیلنا۔ گیم پائنٹ پر ٹینس میں ہارنا اور ہمیشہ منحوس الفاظ زبان سے نکالنا۔ (کنیزہ چائے لے کر آتی ہے اور میز پر رکھ کر چلی جاتی ہے (بیگم صاحبہ خالدہ سے) بیٹی چائے

بنانا۔ (خالدہ کرسی پر بیٹھ کر چائے بنانے لگتی ہے۔ بیگم صاحبہ انیس سے) اور انیس ذرا بازار جاکر بیگم سروری کی بچی کے لیے کوئی تحفہ خرید لا۔ اس کی سالگرہ ہے۔

انیس: چچی جان۔ خدا کی قسم۔ یہ کام مجھ سے نہ ہوگا۔

بیگم صاحبہ: (مسکرا کر) کیوں؟ ایسا کہاں کا مشکل کام ہے۔

انیس: لڑکیوں کے لیے تحفے پسند کرنا مجھے نہیں آتا۔

بیگم صاحبہ: خالدہ کو ساتھ لے جانا۔ وہ بھی تو کوئی چیز خریدے گی۔

نہیں: پھر تو رہا سہا ہوش بھی جاتا رہے گا۔ یہ کم قیمت میں اچھا تحفہ خریدنے کی ضد کرتی ہیں اور بیچ ماپے میری اچھی خاصی انسلٹ ہو جاتی ہے۔

بیگم صاحبہ: کفایت شعاری کیا کوئی بری بات ہے۔

انیس: بھلا ایسی بھی کفایت شعاری کس کام کی۔ بولنے میں کفایت شعاری، پیسہ خرچ کرنے میں کفایت شعاری۔ بس اگر فضول خرچی ہے تو سونے میں۔

بیگم صاحبہ: (مسکرا کر) اور تیرے کھیل کی برائی میں بھی کوئی فضول خرچی کرتی ہے۔

(اشفاق جو بے حد سنجیدہ ہے ہنس دیتا ہے اور خالدہ صرف مسکرا کر رہ جاتی ہے)

انیس: جی ہاں۔ اور انھی سب باتوں سے میرا جی جلتا ہے۔ (خالدہ چائے کی پیالی اشفاق کی طرف بڑھاتی ہے۔ انیس خالدہ کو دیکھ کر) ابھی مسٹر اشفاق منیجر ہوکر آئے نہیں کہ تم نے خوشامد شروع کردی۔ لڑکیاں ان معاملوں میں ہوتی ہیں سمجھ دار۔ (خالدہ دوسری پیالی بیگم صاحبہ کی طرف بڑھاتی ہے)۔ اچھا تو گویا ہم تھرڈ کلاس ہیں۔ (تیسری پیالی انیس کی طرف بڑھاتی ہے۔ پیالی لیتے ہوئے) میں بھی مسٹر اشفاق کو ایسی پٹی پڑھاؤں گا کہ تمھارا جیب خرچ بند کرا کے ہی دم لوں گا۔

بیگم صاحبہ: (چائے کا گھونٹ لے کر) اچھا اچھا اب جلدی سے چائے پی لے اور بازار چلا جا۔ (مسکرا کر) اس قدر باتوں کی فضول خرچی اچھی نہیں ہوتی۔

انیس: خدا نے میری قسمت میں صرف باتیں ہی کرنا لکھا ہے۔ چچی جان (چائے کا گھونٹ لے کر) آپ نے مسٹر اشفاق کی تقرری کا حکم صادر فرما دیا۔ (بیگم صاحبہ خاموش رہتی ہیں۔ اشفاق گردن جھکائے چائے پیتا رہتا ہے۔ اشفاق کی طرف دیکھ کر) اشفاق! فوراً آفر قبول کرلینا۔ (ہلکے سے طنز سے) اس قدر ٹھاٹ کی نوکری عمر بھر نہیں ملے گی۔ (اشفاق اس طرح نظریں اٹھا کر دیکھتا ہے جیسے اس طنز کو سمجھ گیا ہو۔ انیس اشفاق سے نظریں ملا کر) چچی جان تمھارا خیال رکھتی ہیں اور خالدہ کو تمھارا کھیل پسند ہے اور ہاں بھئی ایک کام میرا کرنا۔ (خالدہ کی طرف اشارہ کرکے) ان محترمہ کو ذرا اچھا برج کھیلنا سکھا دینا ہمیشہ الٹی سیدھی اور غلط کالیں لگاتی ہیں۔

اشفاق: (جیسے اکتا کر) مگر نوکری ہی کون مسخرہ کر رہا ہے۔ (طنزیہ مسکرا کر) جو حضور نے قبل از وقت احکامات صادر فرمانا شروع کردیے۔ (خالی پیالی میز پر رکھ کر) بیگم صاحبہ اب مجھے اجازت دیجیے۔

بیگم صاحبہ: بیٹھو۔ ابھی بھی جلدی کیا ہے چلے جانا۔

اشفاق: کچھ ضروری کام ہیں۔ پھر حاضر ہو جاؤں گا۔

بیگم صاحبہ: (مسکرا کر) برا مان گئے؟ (انیس کی طرف اشارہ کرکے) اس کی زبان تو قینچی کی طرح چلتی ہے۔ (پھر اشفاق سے بیٹھو، بیٹھو چلے جانا (اشفاق کھڑا رہتا ہے)۔ میں کہتی ہوں بیٹھ جاؤ۔ (انیس سے) اور تو ذرا بازار، جا کر کوئی اچھی سی چیز خرید لا۔ چھ سات سال کی بچی ہے۔ (اشفاق سے) بیٹھتے کیوں نہیں۔

اشفاق: بیگم صاحبہ۔

بیگم صاحبہ: معلوم ہے تمھیں ضروری کام ہے۔ چلے جانا ابھی بیٹھ جاؤ۔
(اشفاق بادلِ نخواستہ بیٹھ جاتا ہے)(جاؤ خالدہ تم بھی جاؤ)۔

انیس: (چائے کی پیالی میز پر رکھ کر خالدہ سے) چلیے۔ (بیگم صاحبہ کی طرف دیکھ کر) چچی جان ان محترمہ کو سمجھا دیجیے کہ کفایت شعاری کی لالچ میں میرا وقت

ضائع نہ کریں اور نہ میری انسلٹ کرائیں۔ (خالدہ اور انیس کمرے سے چلے جاتے ہیں۔ کمرے پر مکمل خاموشی رہتی ہے۔ اشفاق کی نگاہوں سے الجھن کا اظہار ہو رہا ہے کچھ دیر بعد بیگم صاحبہ آنکھیں کھول کر اشفاق کو دیکھتے ہوئے)۔

بیگم صاحبہ: انیس خالدہ سے محبت کرتا ہے۔

اشفاق: جی ہاں وہ اس کا اظہار مجھ سے کر چکا ہے۔

بیگم صاحبہ: اس کا خیال ہے کہ تم خالدہ کی زندگی میں داخل ہو رہے ہو۔

اشفاق: شاید وہ یہی سوچتا ہے۔ (مسکرا کر) اور جب ہی وہ اکثر جلی کٹی باتیں بھی کرنے لگا ہے۔

بیگم صاحبہ: اور تمھیں یہ ناگوار گزرتا ہے؟

اشفاق: جی نہیں۔ (مسکرا کر) مجھے اس کی سادگی پر رحم آتا ہے بیگم صاحبہ! جو شخص غم دوراں میں مبتلا ہو وہ غم جاناں کیسے پال سکتا ہے۔

بیگم صاحبہ: اور میں تمھیں غم دوراں سے نکالنا چاہتی ہوں۔

اشفاق: (مسکرا کر) اور میں غم دوراں سے بہت ڈرتا ہوں۔

بیگم صاحبہ: کیوں!۔۔ کیا اس میں زندگی کی بھرپور ادائیں نہیں ہیں۔

اشفاق: زندگی کی بھرپور ادائیں! میں تو سمجھتا ہوں کہ عشق کرنا صرف بے کار لوگوں کا مشغلہ ہے۔

بیگم صاحبہ: (تعجب سے) بے کار لوگوں کا مشغلہ۔

اشفاق: جی ہاں۔ جیسے لوگ بے کاری میں شطرنج کھیلنے لگتے ہیں۔ اسی طرح عشق کرنے لگتے ہیں۔ (بیگم صاحبہ اشفاق کو غور سے دیکھتی ہیں اشفاق مسکرا کر) جس طرح شطرنج میں داؤں پیچ آزمائے جاتے ہیں۔ رقیب کو زیر کرنے کے لیے چالیں چلی جاتی ہیں۔ مہروں کو آگے پیچھے کیا جاتا ہے اور پھر شطرنج میں تو مہروں کی چالیں مقرر ہوتی ہیں اس میں پتا نہیں کہ پیدل ایک ہی گھر چلے گا یا گھوڑے کی طرح ڈھائی گھر اچھل جائے گا۔

بیگم صاحبہ: (ہنس کر) تم کافی سمجھ دار ہو اشفاق (مسکرا کر) بہتر ہے دل کے پاس رہے پاسبانِ عقل، خیر تم نے میرے آفر کے متعلق کیا سوچا؟

اشفاق: بیگم صاحبہ! میں آپ کی مہربانی کا شکرگزار ہوں مگر مجھے اس خدمت سے معاف رکھا جائے۔

بیگم صاحبہ: مجھے تمھارے مستقبل کی فکر ہے اشفاق۔

اشفاق: شکریہ! بات دراصل یہ ہے کہ میں انہیں سے کسی قسم کا بگاڑ کرنا پسند نہیں کرتا۔ (مسکرا کر) وہ کئی دن سے یوں ہی جلی کٹی باتیں کر رہا ہے۔

بیگم صاحبہ: خالدہ کی جلد ہی شادی ہوجائے گی۔ (غور سے اشفاق کے چہرے کے تاثرات دیکھتی ہیں جو گردن جھکائے بیٹھا ہے)۔ اس کے بعد میری وہی جان لیوا تنہائی ہوگی جسے ختم کرنے کے لیے میں نے خالدہ کو اپنے ساتھ رکھ چھوڑا ہے (ٹھنڈی سانس بھر کر) ایک تیس سالہ بیوہ زندگی کا لمبا سفر تنہا تو طے نہیں کرسکتی۔

اشفاق: بیگم صاحبہ—

بیگم صاحبہ: (اپنی ہی دھن میں) دنیا میں ہر چیز خریدی جاتی ہے تمنائیں، آرزوئیں اور خواب اور اس کے لیے پیسے کی ضرورت ہوتی ہے۔

اشفاق: مگر دنیا میں کچھ ایسے بھی ہیں جو صرف ذہنی سکون ہی کو ہر دکھ کا مداوا سمجھتے ہیں۔

بیگم صاحبہ: اشفاق! یہ خیال صرف شکست خوردہ ذہنیتوں کا ہے۔

اشفاق: شکست خوردہ ذہنیتوں سے مراد شاید آپ کی ان لوگوں سے ہے جو اپنی تمناؤں، آرزوؤں اور خوابوں کو ایک حد سے آگے نہیں بڑھنے دیتے۔

بیگم صاحبہ: نہیں۔ ان لوگوں سے ہے جو اپنی تمناؤں، آرزوؤں اور خوابوں سے ڈر کر ان کا گلا گھونٹ دیتے ہیں میرے بھی کچھ خواب ہیں اور میں ان کی تعبیر چاہتی ہوں۔

اشفاق: آپ کے خواب!

بیگم صاحبہ: ہاں میرا خواب تم ہو اشفاق۔

اشفاق: بیگم صاحبہ۔ (کھڑے ہوکر) مجھے اب اجازت دیجیے۔

بیگم صاحبہ: بیٹھو۔

اشفاق: جی نہیں۔ میں نے ہمیشہ آپ کی عزت کی ہے۔ (کمرے میں ٹہلنے لگتا ہے۔ بیگم صاحبہ خاموشی سے اسے دیکھتی رہتی ہیں۔ کچھ دیر ٹہلنے کے بعد) میں اپنی اس کمزوری سے واقف ہوں کہ میں غریب ہوں اور غریب کی ہر چیز خریدی جاسکتی ہے۔ اس کا دماغ اس کی آرزوئیں اس کی تمنائیں اور اس کے خواب اور اس کا جسم۔ بیگم صاحبہ! آپ مجھ سے عزت پوزیشن اور عمر میں بڑی ہیں آپ کا اس قسم کا مذاق کچھ اچھا نہیں لگتا۔

بیگم صاحبہ: میں مذاق نہیں کررہی ہوں اشفاق۔ تیس سالہ بیوہ کو زندگی کے راستے کے لیے ایک ہم سفر کی ضرورت ہوتی ہے۔

اشفاق: مگر ہم سفر مناسب ہونا چاہیے۔

بیگم صاحبہ: تم بہت مناسب ہو۔ تم میرا وہ خواب ہو جو میں نے ہوش سنبھالنے کے بعد دیکھنا شروع کردیا تھا۔

اشفاق: (تلخی سے) آپ کے آفر پر مجھے غور کرنا ہوگا کہ کہیں سودا مہنگا نہ ہو فی الحال مجھے اجازت دیجیے میں پھر حاضر ہوجاؤں گا۔

بیگم صاحبہ: تم نہیں آؤگے یہ میں جانتی ہوں۔ (اٹھ کر اشفاق کے پاس جاکر) اشفاق میں بازی ہار رہی ہوں مگر پھر بھی میں نے اس کا اظہار کردیا ہے جس کا میں بہت دن سے انتظار کررہی تھی۔ (اشفاق خاموشی سے دروازے کی طرف جاتا ہے) تم کو جب میری سچائی کا یقین ہوجائے تو میرے پاس آجانا۔ اشفاق دروازے کے پاس پہنچ جاتا ہے۔) میں تمھارا انتظار کرتی رہوں گی۔ اشفاق پلٹ کر بیگم صاحبہ کو دیکھتا ہے جن کی نگاہوں میں پیاس ہے) مجھے غلط نہ سمجھنا اشفاق ایک تیس سالہ بیوہ کو محبت کرنے کا اتنا ہی حق ہے جتنا ایک بیس سالہ

کنواری کو۔ (اشفاق دروازے کے پاس رک کر کھڑا ہوجاتا ہے اور بیگم صاحبہ کوغور سے دیکھتا ہے)۔ مجھے یوں کیوں گھور رہے ہو۔

اشفاق: کچھ نہیں۔۔۔ یوں ہی۔۔۔ میں آپ کے آفر کے متعلق غور کررہا ہوں کہ اگر میں خود کو بیچ ڈالوں تو سودا مہنگا تو نہیں ہوگا۔

(خاموش ہوجاتا ہے۔ بیگم صاحبہ امیداور نا امیدی سے اشفاق کو دیکھتی رہتی ہیں۔ کچھ دیر بعد انیس اور اس کے پیچھے پیچھے خالدہ کمرے میں آتے ہیں۔ انیس اشفاق کو دیکھ کر)

انیس: یہ دربانی کیوں کررہے ہو؟ (بیگم صاحبہ سے) میں نے پہلے ہی عرض کیا تھا کہ ان محترمہ کے ساتھ جانے میں ہمیشہ انسلٹ ہوجاتی ہے۔ (ایک ڈبہ بیگم صاحبہ کو دیتے ہوئے) ملاحظہ فرمائیے کون سی گڑیا پسند فرمائی ہے جو ہاتھ لگاتے ہیں ان کی شکلیں بناتی ہیں جانے ان محترمہ کو ان کی شکلیں کیوں پسند ہیں۔ (بیگم صاحبہ خاموشی سے ڈبہ میز پر رکھ دیتی ہیں۔ انیس کبھی بیگم صاحبہ کو اور کبھی اشفاق کو دیکھتا ہے) بات کیا ہے آپ دونوں اس قدر خاموش کیوں ہیں۔ (بیگم صاحبہ سے) کیا مسٹر اشفاق نے آپ کا آفر قبول کرلیا۔ (بیگم صاحبہ خاموش رہتی ہیں اشفاق کی طرف دیکھ کر) اماں تم بھی عجیب واہیات انسان ہو چچی جان اس قدر خلوص فرما رہی ہیں اور آپ کے نخرے ہی نہیں مل رہے ہیں سچ کہتا ہوں بڑے ٹھاٹ میں رہو گے۔

اشفاق: میں بمبئی سے جو آفر آیا ہے اس کے متعلق غور کررہا ہوں۔

انیس: بمبئی والا آفر۔

اشفاق: ہاں۔۔۔ اسکول کے بچوں کا کرکٹ کوچ۔

انیس: مگر اس کے لیے تو تم انکار لکھ چکے ہو۔

اشفاق: مگر۔۔۔

انیس: کوئی آپ کے لیے وہ نوکری لیے بیٹھا نہیں ہے۔ (بیگم صاحبہ نے) چچی جان

اس نے آخر قبول کرلیا ہے۔

(بیگم صاحبہ اشفاق کو دیکھتی ہیں۔ اشفاق نظریں جھکا لیتا ہے مگر اس کی آنکھوں میں آنسو چھلک آتے ہیں)

بیگم صاحبہ: (خالدہ کی طرف دیکھ کر) یہ تحفہ دوسرے کمرے میں رکھ دو (خالدہ ڈبہ اٹھا کر چلی جاتی ہے)۔

انیس: آپ نے ملاحظہ تو فرمالیا ہوتا۔

بیگم صاحبہ: ٹھیک ہوگا۔ (کچھ دیر خاموش رہ کر اشفاق سے) ذرا نفیس صاحب کو فون کردو کہ آج شام مجھ سے خالدہ اور انیس کی شادی کے متعلق گفتگو کرلیں۔

اشفاق: (بیگم صاحبہ کو غور سے دیکھتا ہے پھر آہستہ سے) جی بہتر۔ (کمرے سے چلا جاتا ہے)۔

انیس: یہ کچھ پریشان نظر آرہا ہے۔

بیگم صاحبہ: ہاں — وہ خالدہ سے محبت کرتا ہے۔

(پردہ)

(مطبوعہ شاہراہ، دہلی، جولائی 1960)

مقابلے اور فیصلے

افرادِ تمثیل

(1) نجیب (ایک نوجوان) (2) نغمہ (نجیب کی بہن) (3) مجیب (نجیب کے والد)
(4) صوفیہ (نجیب کی خاتون دوست) (5) نسیم (صوفیہ کے والد)

منظر

مجیب کے دیہاتی مکان کا بالائی کمرہ، کمرہ صاف ستھرا ہے معمولی مگر نظر آنے والا پرانے فیشن کا فرنیچر ہے۔ دیواروں پر مختلف جانوروں کے سر لگے ہوئے ہیں۔ مغربی جانب ایک کھڑکی ہے جس میں بیٹھنے سے دور تک کا منظر نظر آتا ہے۔ جنگل اور جنگل کے بعد پہاڑ نظر آتا ہے۔ جنگلوں سے گھرا ہوا پہاڑ عجیب پراسرار معلوم ہوتا ہے۔

جس وقت پردہ اٹھتا ہے تو نجیب اور صوفیہ کھڑکی کے پاس بیٹھے ہوئے نظر آتے ہیں۔ دونوں خاموش ہیں اور کھوئے کھوئے انداز سے پہاڑ کو دیکھ رہے ہیں کبھی کبھی ایک دوسرے کو دیکھتے ہیں نظریں چار ہوتی ہیں تو پھر دونوں جھکا لیتے ہیں۔ جیسے ایک دوسرے سے نظریں ملانا نہیں چاہتے۔ دونوں انتہائی اداس نظر آ رہے ہیں کچھ دیر دونوں یوں ہی

خاموش بیٹھے رہتے ہیں پھر صوفیہ کچھ اس انداز سے جیسے وہ اس خاموشی کو توڑنا چاہتی ہو۔

صوفیہ: کبھی آپ اس پہاڑ پر چڑھے ہیں؟

نجیب: ہاں کئی بار۔

صوفیہ: (کچھ دیر خاموش رہ کر) یہ پہاڑ کس قدر پراسرار معلوم ہوتا ہے۔

نجیب: بچپن میں میں اسے بہت ہی پراسرار سمجھتا تھا۔

صوفیہ: یہاں سے تو کافی دور ہوگا۔

نجیب: کچھ زیادہ دور نہیں ہے۔ جنگلوں سے گزرنے والی پگڈنڈی کا راستہ نزدیک اور خوبصورت ہے۔ (پھر دونوں خاموش ہوجاتے ہیں اور خیالات میں کھوجاتے ہیں۔ صوفیہ پہاڑ کو دیکھتی رہتی ہے۔ پھر کچھ دیر بعد)۔

صوفیہ: قدرت کے ان عجائبات میں بھی کیا کیا اسرار ہوتے ہیں۔

نجیب: جی ہاں۔ بچپن میں میرا تصور تھا کہ ان پہاڑوں پر پریاں رہتی ہیں خواب میں وہ اکثر مجھے گاتی اور قہقہے لگاتی نظر آتی تھیں۔

(پھر دونوں خاموش ہوجاتے ہیں۔ صوفیہ کچھ دیر بعد۔

صوفیہ: آپ کا یہ گاؤں کس قدر خاموش ہے۔

نجیب: جی ہاں لوگ اکثر اس کی تعریف کرتے ہیں (خاموش ہوجاتا ہے کچھ دیر مکمل خاموشی رہتی ہے دونوں کھوئی کھوئی نظروں سے پہاڑ کو دیکھتے رہتے ہیں کچھ دیر بعد نجیب، صوفیہ کو دیکھ کر) اپنی والدہ سے میرا سلام عرض کردینا۔

(صوفیہ غور سے نجیب کو دیکھتی ہے پھر آہستہ سے)

صوفیہ: کیا آپ ہمارے یہاں کبھی نہیں آئیں گے؟

نجیب: کیوں نہیں — مگر —

(خاموش ہوجاتا ہے کچھ دیر بعد نغمہ چائے لے کر آتی ہے۔ اس کے چہرے سے اداسی جھلک رہی ہے۔ خاموشی سے کشتی لاکر میز پر رکھ دیتی ہے۔ نجیب اور صوفیہ دونوں اس کو کھوئی کھوئی نظروں سے دیکھتے رہتے ہیں۔ کچھ دیر بعد

18A

صوفیہ پھیکی مسکراہٹ سے)

صوفیہ: آؤ نغمہ۔۔ بیٹھو۔۔ (نغمہ خاموشی سے ایک کرسی پر بیٹھ جاتی ہے اور نظریں جھکا کر چائے بنانے لگتی ہے۔ صوفیہ کچھ دیر خاموش رہ کر) کیا بات ہے؟ اس قدر خاموش کیوں ہو۔ (نغمہ کی آنکھوں میں آنسو آجاتے ہیں) ارے تم تو رونے لگیں۔

نغمہ: دوپٹے کے پلو سے آنسو پونچھ کر) آپ جارہی ہیں صوفیہ آپا۔ اس کا مجھے بہت دکھ ہے۔

صوفیہ: تم ہمارے یہاں آنا۔ ہم تمھیں شہر گھمائیں گے۔

نغمہ: آپ نے تو ابھی تک دیہات اچھی طرح دیکھا بھی نہیں ہے۔

صوفیہ: تمھارا گاؤں بہت خوبصورت اور حسین ہے۔

نغمہ: ابھی تو آپ پہاڑ پر بھی نہیں چڑھیں۔ ابھی تو آپ نے وہ جگہ بھی نہیں دیکھی جہاں ندی کئی فٹ گہرے کھڈ میں گر کر غائب ہوجاتی ہے اور پھر ایک فرلانگ بعد زمین سے ابل پڑتی ہے۔

صوفیہ: میں نے کئی مرتبہ پہاڑ پر چڑھنے کا سوچا۔ سنا ہے اس پہاڑ پر پریاں رہتی ہیں۔

نغمہ: جی ہاں گاؤں والے ایسا ہی کہتے ہیں اور اب تو میلہ بھی لگنے والا ہے۔

صوفیہ: میلہ!

نغمہ: جی ہاں۔ آدی باسیوں کا میلہ۔ بڑے اچھے اچھے کھیل کود اور مقابلے ہوتے ہیں اور پھر آدی باسیوں کے ناچ تو دیکھنے سے تعلق رکھتے ہیں۔ آپ کچھ دن اور ٹھہر جاتیں تو وہ میلہ دیکھ لیتیں۔

(نغمہ چائے کی پیالی صوفیہ کو دیتی ہے۔ صوفیہ پیالی لیتے ہوئے)

صوفیہ: تمھاری محبت اور خلوص اور یہ خاطر ہمیشہ یاد رہے گی۔

نغمہ: میں تو کچھ بھی خاطر نہ کرسکی۔ یہ افسوس تو زندگی بھر رہے گا۔

صوفیہ: (مسکرا کر) اور خاطر کیا ہوتی ہے۔

نغمہ: (کچھ دیر خاموش رہ کر) میلے میں پہاڑ پر چڑھنے کا مقابلہ بھی ہوتا ہے۔ سب ہی اس میں حصہ لیتے ہیں۔ مردوں اور عورتوں کے مقابلے الگ الگ ہوتے ہیں۔

نجیب: اس مقابلے کا نام نہ لو نغمہ، مجھے اس سے نفرت ہے۔

نغمہ: مگر مجھے بہت اچھا لگتا ہے۔ اس مرتبہ تو میں اس میں حصہ لوں گی۔

نجیب: مگر مجھے نفرت ہے۔ انتہائی نفرت (نغمہ نجیب کا انداز دیکھ کر سہم سی جاتی ہے) گئے سال میں اس مقابلے میں ہار گیا تھا نا۔ جب ہی سے مجھے اس سے نفرت ہوگئی ہے۔

نغمہ: آپ نے پہلی بار حصہ لیا تھا۔ لوگ تو سالوں ہارتے ہیں مگر دل چھوٹا نہیں کرتے۔

نجیب: اور ابا جان یہ بات نہیں سوچتے (کچھ دیر خاموش رہ کر ٹھنڈی سانس بھر کر) اب تم بھی مقابلے میں حصہ لو اور ہار جاؤ۔ تاکہ ابا جان روز تمھیں بھی طعنے دیں اور پھر تمھارا دل توڑیں۔

(نغمہ خاموش ہوجاتی ہے۔ نجیب پھر کھڑکی میں سے باہر پہاڑ کو دیکھنے لگتا ہے۔ صوفیہ کچھ دیر بعد کھڑی ہوکر نغمہ کی طرف دیکھ کر)

صوفیہ: امی تو اپنے کمرے میں ہوں گی۔ میں اُن سے مل لوں۔

نغمہ: جی ہاں۔ اپنے کمرے میں ہیں۔ صبح سے وہ بھی اداس اداس سی ہیں (صوفیہ خاموشی سے کمرے سے چلی جاتی ہے۔ نغمہ خاموش ہوجاتی ہے۔ نجیب پھر کھڑکی سے باہر دیکھنے لگتا ہے کچھ دیر بعد نغمہ آہستہ سے) بھائی جان! آپ بھی بہت اداس ہیں (نجیب خاموش رہتا ہے۔ نغمہ پھر نجیب کو دیکھ کر) صوفیہ آپا کتنی اچھی ہیں۔ آپ انھیں کچھ دن کے لیے اور کیوں نہیں روک لیتے۔

نجیب: وہ اب نہیں رکے گی۔

نغمہ: کیوں؟ (نجیب خاموش رہتا ہے) میلے کے دنوں میں وہ یہاں رہتیں تو کتنا اچھا معلوم ہوتا (باہر سے آواز نجیب۔) ابا جان آگئے۔

(کھڑی ہوکر چائے کے برتن کشتی میں رکھنے لگتی ہے۔ مجیب کمرے میں آتے

ہیں۔ انھوں نے شکاری لباس پہن رکھا ہے۔ بڑی بڑی مونچھیں ہیں صحت مند ہیں۔ عمر پچاس سے زیادہ ہے مگر چال اور جسم کی ساخت سے اتنی عمر کے نہیں معلوم ہوتے۔ کمرے میں داخل ہوتے ہی نغمہ سے۔)

مجیب: صوفیہ کہاں ہے؟

نغمہ: امی کے ساتھ ہیں۔

مجیب: اس کے جانے کی تیاری مکمل ہوگئی۔

نغمہ: جی ہاں۔ وہ شاید آپ ہی کا انتظار کر رہی تھیں۔

مجیب: (ایک دم جیسے کچھ یاد آجانے پر نجیب کی طرف دیکھ کر) کل تم نے پھر ایک گولی مس کردی۔

نجیب: جی ہاں۔ میں نے بھاگتے ہوئے جانور پر گولی چلائی تھی۔

مجیب: جانور کا بھاگنا قدرتی ہے مگر شکاری کو نہیں بھاگنا چاہیے۔ مجھے معلوم ہوا ہے کہ تم اس کے پیچھے دوڑے اور پھر گولی چلائی۔

نجیب: میں نے صرف چند گز دوڑ کر اسے رینج میں لینے کی کوشش کی تھی۔

مجیب: اور اس بھاگ دوڑ میں تمھاری سانس پھول گئی اور تم نے گولی مس کردی۔ جب تک شکاری کو اپنے جسم پر قابو نہ ہو وہ شکار کو اپنے قابو میں نہیں کرسکتا۔ (نغمہ کی طرف دیکھ کر جو خاموش کھڑی ہے) تم کو کیا ہوگیا ہے جو تم یوں رونی شکل بنائے کھڑی ہو۔

نغمہ: کچھ نہیں ابا جان۔

(مجیب کچھ دیر خاموش رہتا ہے پھر ٹھنڈی سانس بھر کر)

مجیب: میں جانتا ہوں کہ تم کیوں اداس ہو (بندوق کاندھے سے اتار کر دیوار سے لگا دیتا ہے اور کھڑکی سے باہر پہاڑ کو دیکھنے لگتا ہے۔ پھر کچھ دیر بعد) تم صوفیہ کے جانے پر اداس ہو۔

نغمہ: (آنکھوں سے آنسو پونچھ کر) جی ہاں۔ وہ کس قدر اچھی ہیں۔

مجیب: بلاشبہ اچھی ہے۔ اس سے اچھی لڑکی میں نے کبھی نہیں دیکھی۔

نغمہ: تو پھر آپ انھیں روک کیوں نہیں لیتے۔ بھائی جان بھی کس قدر اداس ہیں اور وہ بھی کچھ کم غمگین نہیں۔

مجیب: (چند سیکنڈ رک کر) اسے میں نہیں روک سکتا (پھر چند سیکنڈ رک کر) اچھا تم اسے ذرا میرے پاس بھیج دو (نغمہ چائے کے برتن لے کر کمرے سے چلی جاتی ہے۔ مجیب کھڑکی کے پاس ایک کرسی پر بیٹھ جاتے ہیں اور پہاڑ کو دیکھنے لگتے ہیں۔ کچھ دیر خاموش رہ کر نجیب کی طرف دیکھ کر) تم پہاڑ کی چوٹی پر لہراتے ہوئے اس جھنڈے کو دیکھ رہے ہو؟

نجیب: جی ہاں۔

مجیب: اور یہ بھی جانتے ہوگے کہ وہ وہاں کیوں لہرا رہا ہے۔

نجیب: جی ہاں۔

مجیب: ہر نوجوان کی خواہش ہوتی ہے کہ وہ اسے جیتے اور وہ اس کے گھر پر لہرائے۔

نجیب: جی ہاں۔

مجیب: میں نے تمھاری صوفیہ سے شادی سے انکار کیا ہے جانتے ہو کیوں۔

نجیب: جی ہاں۔ اس لیے کہ گئے سال میں اس جھنڈے کو جیت نہ سکا تھا۔

مجیب: ہاں۔ اسی لیے۔

نجیب: (کسی قدر تند لہجے میں) مگر ہر نوجوان اسے نہیں جیت سکتا اور جو نہیں جیت سکتا کیا اس کی شادی نہیں ہوتی۔

مجیب: ہوتی ہے۔ مگر انسان کی کچھ تمنائیں اور خواہشیں ہوتی ہیں۔ اور میری یہ خواہش تھی کہ وہ جھنڈا میرے گھر پر لہرائے (ٹھنڈی سانس بھر کر) مگر گئے سال تم نے میری تمام تمناؤں پر پانی پھیر دیا۔

نجیب: مگر یہ تو اسپورٹ ہیں ہمیں اپنی ہار کو اسپورٹس مین اسپرٹ میں قبول کرلینا چاہیے۔ (مجیب طنزیہ مسکراتے ہیں اور آنکھیں بند کرکے سگار کے لمبے لمبے کش لیتے

ہیں۔ کچھ دیر بعد)

مجیب: تم مجھے اسپورٹس مین اسپرٹ کا سبق دے رہے ہو (آنکھیں کھول کر نجیب کو دیکھ کر) میں نے جس اسپورٹس مین اسپرٹ کا ثبوت دیا ہے تم اس کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔ (پھر آنکھیں بند کر کے خاموش ہوجاتے ہیں۔ نجیب خاموش کھڑا رہتا ہے کچھ دیر خاموشی رہتی ہے مجیب پھر آنکھیں کھول کر نجیب کو دیکھ کر) بیٹھ جاؤ (نجیب خاموشی سے بیٹھ جاتا ہے مجیب کچھ دیر خاموش رہ کر) تم صوفیہ سے محبت کرتے ہو۔ (نجیب نظریں جھکا لیتا ہے) میں جب تمھاری عمر کا تھا اس وقت ایک لڑکی سے محبت کرتا تھا۔

نجیب: (غور سے مجیب کا چہرہ دیکھ کر) آپ!

مجیب: ہاں۔ (مسکرا کر) تمھیں حیرت کیوں ہے نوجوانی میں سب ہی ایک نہ ایک سے محبت ضرور کرتے ہیں اور اسی لیے مجھے تمھاری محبت پر بھی کوئی اعتراض نہیں ہے۔

نجیب: مگر آپ—

مجیب: اس پر بھی تمھیں صوفیہ سے شادی کی اجازت نہیں دے سکتا۔

نجیب: مگر میں بھی صوفیہ کے علاوہ کسی اور سے شادی نہیں کرسکتا۔

مجیب: اس سے میری نسل ختم ہوجائے گی۔ ہوجائے۔ یہ میرا پکا ارادہ ہے یوں سمجھ لو کہ میری قسم ہے۔

نجیب: مگر ابا جان۔

مجیب: (بات کاٹ کر) گئے سال مجھے تم سے بڑی امیدیں تھیں مگر تم ہار گئے۔ مجھے ہار کا تو اتنا افسوس نہیں ہوا مگر جب اس جھنڈے کو میں کسی اور کے مکان پر لہراتا ہوا دیکھتا ہوں تو جی چاہتا ہے کہ اس جھنڈے کو گولی ماردوں۔ پچیس تیس سال سے میں اس ذہنی الجھن میں مبتلا ہوں اور اندر ہی اندر جلا جارہا ہوں۔

نجیب: لیکن یہ کوئی ضروری نہیں ہے کہ میں اس مقابلے میں حصہ لوں اور وہ جھنڈا جیت ہی لوں۔

(مجیب خاموش رہتے ہیں اور خاموشی سے پہاڑ پر لہراتے ہوئے جھنڈے کو دیکھتے رہتے ہیں۔ سگار کا کش لیتے ہیں پھر نجیب کو دیکھ کر جو گردن جھکائے بیٹھا ہے۔)

مجیب: میں آج تم کو وہ راز بتلائے دیتا ہوں جو کسی کو نہیں بتلایا۔ (خاموش ہو جاتے ہیں اور سگار کا کش لے کر) میرا ایک دوست تھا۔ بہت ہی گہرا دوست (آنکھیں بند کر کے بہت ہی آہستہ سے) (ہم دونوں ایک ہی لڑکی سے محبت کرتے تھے۔

نجیب: ایک ہی لڑکی سے!

مجیب: ہاں۔ مسئلہ یہ تھا کہ دونوں میں سے کون اس سے شادی کرے (آنکھیں کھول کر نجیب کو دیکھ کر) پھر جانتے ہو کیا ہوا۔

نجیب: جی نہیں۔

مجیب: ہم نے طے کیا کہ ہم دونوں اس مقابلے میں حصہ لیں اور جو جیت جائے وہی اس سے شادی کرلے اور دونوں ہار جائیں تو دونوں میں سے کوئی بھی اس سے شادی نہ کرے۔

نجیب: اور شاید آپ مقابلے میں ہار گئے۔

مجیب: شاید نہیں یقیناً ہار گیا۔ یہ سخت مقابلہ تھا۔ ہم نے طے کیا تھا کہ ہم دونوں اپنی اپنی بندوقیں ساتھ لیں گے اور اگر دونوں میں سے کوئی بھی جیت جائے تو دوسرا اپنی بندوق سے ہوائی فائر کر کے اس کی جیت اور اپنی ہار کا اعلان کر دے۔

نجیب: اچھا۔

مجیب: ہاں! مقابلہ شروع ہوا اور ہم دونوں نے ایک ہی راستے سے پہاڑ پر چڑھنا شروع کیا۔ ہم دونوں ایک دوسرے سے بازی لے جانے کے لیے جان توڑ کوشش کر رہے تھے۔ کبھی وہ آگے ہوتا اور کبھی میں۔ ہم دونوں اس چھوٹے سے مندر کے پاس پہنچ گئے جہاں ندی پہاڑ کی اس گہرائی میں گرتی ہے

جہاں کئی سوفٹ گہرا کھڈ ہے کہ اس کا پاؤں پھسل گیا میں نے اس کے گرنے کی آواز سنی اور پلٹ کر دیکھا اس کا رخ کھڈ کی طرف تھا اور وہ جان بچانے کے لیے کسی بھی سہارے کی تلاش کر رہا تھا۔

نجیب: اور پھر آپ نے سہارا نہیں دیا۔

مجیب: کیوں نہیں۔ وہ میرا کوئی دشمن تو نہیں تھا آخر دوست تھا۔ ایسے مقابلے تو دوستوں میں اکثر ہوا ہی کرتے ہیں۔

نجیب: پھر؟

مجیب: میں پلٹا اور اسے سہارا دیا وہ مسکرا کر کھڑا ہو گیا۔ ہم گلے ملے اور اپنی اپنی جیت کے لیے جدوجہد کرنے لگے اور کچھ دیر بعد ہم پہاڑ کی چوٹی پر پہنچ گئے۔ وہاں بیس پچیس گز چوڑا میدان ہے کھلے میدان میں ہم دونوں میں دوڑ شروع ہو گئی۔ لیکن اس دوڑ میں اس نے مجھے ہرا دیا۔ اب جھنڈا اس کے ہاتھ میں تھا۔ میں نے بندوق کاندھے سے اتار لی اور جانے کیوں اس کی نال میرے دوست کے سینے کی طرف ہو گئی۔

نجیب: (گھبرا کر) جی—

مجیب: یہ سچ ہے مگر وہ مرحوم بچے کی طرح اپنی کامیابی پر غیر معمولی خوشی سے میری طرف دوڑا چلا آ رہا تھا اسے خیال بھی نہیں تھا کہ میری بندوق اس کے سینے کا نشانہ لے چکی ہے۔

نجیب: اور آپ نے گولی چلا دی۔

مجیب: ہاں— (مسکرا کر) مگر اس کے سینے پر نہیں ہوا میں۔ میری گولی اس کے خوشیوں بھرے سینے کو نہ چھید سکی۔ وہ مجھ سے معصوم بچوں کی طرح خوشی سے لپٹ گیا۔ اتنے میں وہ آکوئی باسی نوجوان بھی آ گئے جو اس مقابلے میں حصہ لے رہے تھے۔ انھوں نے اپنے وہ مخصوص تیر جو ہوا میں چھوٹتے ہی جل اٹھتے ہیں چھوڑے اور پہاڑ کے نیچے ڈھول پٹنے لگے جو مقابلہ ختم ہونے کا اعلان

تھا۔ ہم بہت دیر تک پہاڑ پر گاتے اور ناچتے رہے پھر میں نے اپنے دوست کو اپنے کاندھے پر بٹھلایا اور ہم لوگ پہاڑ سے نیچے اتر آئے۔ رات پھر خوب جشن منایا گیا (چند سیکنڈ خاموش رہ کر) جانتے ہو۔ وہ میرا دوست کون تھا؟

نجیب: (غور سے مجیب کا چہرہ دیکھ کر) جی نہیں— کون تھا۔

مجیب: (آنکھیں بند کر کے) صوفیہ کا باپ نسیم اور وہ لڑکی تھی صوفیہ کی ماں سلمٰی۔

نجیب: (غصہ سے کھڑے ہو کر) اور آپ اپنی ہار کا بدلہ ان کی اولاد سے لے رہے ہیں۔ یہ کہاں کا انصاف ہے۔

مجیب: میں بدلہ نہیں لے رہا ہوں ویسا دوست تو مجھے آج تک نصیب ہی نہیں ہوا۔ جانتے ہو اس نے جیتے ہوئے جھنڈے کا کیا کیا۔

نجیب: جی نہیں۔ میں صرف اتنا جانتا ہوں کہ آپ بھی میری طرح مقابلے میں ہارے ہیں اور اپنی ہار پر ہماری خوشیاں چھین لینا چاہتے ہیں۔

مجیب: (بہت ہی سخت لہجے میں) نہیں۔ (کچھ دیر خاموش رہ کر) وہ جھنڈا نسیم نے کبھی اپنے گھر پر نہیں لگایا۔

نجیب: اپنے گھر پر نہیں لگایا!

مجیب: ہاں صرف میری خاطر۔

نجیب: مگر—

مجیب: (بات کاٹ کر) یہ گاؤں کی رسم کے خلاف تھا۔ گاؤں والے اس کو برداشت نہ کر سکے اور وہ گاؤں چھوڑ کر چلا گیا اور پھر کبھی اس گاؤں میں نہیں آیا۔

نجیب: وہ جھنڈا اپنے گھر پر کیوں نہیں لگایا۔

مجیب: اس لیے کہ وہ میری ہار کا نشان تھا۔ اسی وقت میں نے یہ عہد کرلیا تھا کہ میری اولاد میں صرف وہی اپنی مرضی کی شادی کرے گا جو اس مقابلے میں جیتے گا— تم یہ مقابلہ ہار چکے ہو۔

نجیب: یہ انصاف نہیں ہے کہ آپ کے فضول سے عہد پر میں اپنی زندگی تباہ کردوں۔

مجیب: میں بے انصاف سہی مگر اپنے فیصلے پر اٹل ہوں۔

نجیب: مگر آپ کا فیصلہ—

(صوفیہ کمرے میں داخل ہوتی ہے اور نجیب خاموش ہوجاتا ہے۔ صوفیہ بہت ادب سے جھک کر سلام کرتی ہے)۔

مجیب: جیتی رہو بیٹی!— آؤ— (اپنے سامنے والی کرسی کی طرف اشارہ کرکے) بیٹھو— (صوفیہ کرسی پر بیٹھ جاتی ہے) تمھارے جانے کی تیاری مکمل ہوگئی؟

صوفیہ: جی ہاں— میں آپ ہی کا انتظار کررہی تھی۔

مجیب: ادھر کچھ دنوں سے ایک مین ایٹر نے گاؤں والوں کی زندگی اجیرن کررکھی ہے اسی کی تلاش میں نکل گیا تھا ارادہ تو نجیب کو بھی ساتھ لے جانے کا تھا مگر سوچا کہ آج تم جارہی ہو اس لیے اس کا یہاں رہنا ضروری ہے (نجیب کی طرف دیکھ کر) دیکھو گھوڑے تیار ہوگئے۔ (نجیب جانے کے لیے مڑتا ہے) اور ہاں جنگل کے راستے سے نہ جانا۔

نجیب: مگر دوسرے راستے سے جانے کے لیے پورے سات میل کا چکر لگانا پڑے گا۔

مجیب: کوئی بات نہیں۔ پتا چلا ہے کہ وہ مین ایٹر ابھی جنگل ہی میں موجود ہے۔

نجیب: میں بندوق ساتھ لے جاؤں گا اور پھر کئی آدمی بھی ساتھ میں ہوں گے۔

مجیب: صوفیہ بیٹا کا ساتھ ہوگا کسی بھی قسم کا رسک لینا ٹھیک نہیں ہے۔ قطعی جنگل کے راستے سے جانے کی ضرورت نہیں واپسی میں تم یہ راستہ اختیار کرسکتے ہو۔

نجیب: بہت اچھا۔

(نجیب کمرے سے چلا جاتا ہے۔ کچھ دیر خاموشی رہتی ہے پھر مجیب صوفیہ کو دیکھ کر)

مجیب: بیٹی! تمھیں میرے فیصلے پر دکھ ہورہا ہے۔

صوفیہ: (نظریں جھکا کر) بزرگوں کے فیصلے پر مجھے دکھی ہونا نہیں سکھایا گیا۔

مجیب: مجھے تمھاری اس سعادت مندی سے خوشی ہوتی ہے مگر میری بھی کوئی مجبوری ہے۔

صوفیہ: میں نے بزرگوں کے فیصلے کو کبھی ان کی مجبوری نہیں سمجھا ہے ایک حکم سمجھا ہے جس کا ماننا ہر حالت میں فرض ہے۔

مجیب: (غور سے صوفیہ کو دیکھ کر) بیٹی! ایسی باتیں نہ کہو جن کے سننے سے مجھے خود سے نفرت ہوجائے (صوفیہ کے ہونٹ اس طرح ہلتے ہیں جیسے وہ کچھ کہنا چاہتی ہے مگر پھر خاموش رہتی ہے) نغمہ کی خواہش ہے کہ تم میلے تک یہاں رک جاتیں۔

صوفیہ: وہ میرے جانے پر بہت دکھی ہے مگر اب پندرہ دن ہوگئے ہیں پاپا اور ممی یاد کرتے ہوں گے۔

مجیب: مجھے بھی یہی خیال ہے ورنہ میں تم کو جانے کی ہرگز اجازت نہیں دیتا۔ (کچھ دیر رک کر) تمھارا اور نجیب کا کتنے سال کالج میں ساتھ رہا ہے۔

صوفیہ: ہم فرسٹ ایر سے ہی ساتھ رہے ہیں۔

(باہر گھوڑا دوڑنے کی آواز)

مجیب: شاید گھوڑے تیار ہوگئے (کھڑے ہوجاتے ہیں اور ان کے ساتھ صوفیہ بھی کھڑی ہوجاتی ہے) خدا حافظ اور دیکھو اپنے پاپا اور ممی سے میرا سلام کہنا اور ہاں—گھر پہنچتے ہی فوراً خط لکھنا۔

صوفیہ: جی۔ بہت اچھا۔

(محبت سے صوفیہ کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہیں۔ اسی وقت نجیب گھبرایا ہوا سا کمرے میں داخل ہوتا ہے اور جلدی سے)

نجیب: ابا جان!— نسیم صاحب۔

مجیب: نسیم صاحب!

نجیب: جی ہاں صوفیہ کے والد آئے ہیں۔

مجیب: (گھبرا کر) کہاں ہیں؟ (تیزی سے بندوق اٹھا کر دروازے کی طرف بڑھتے ہیں کہ نسیم کمرے میں داخل ہوتے ہیں ان کے کاندھے پر بھی بندوق لٹکی ہوئی ہے بہت وجیہ بارعب اور قد آور ہیں چال ڈھال سے فوجی معلوم

ہوتے ہیں۔ کچھ دیر تو دونوں ایک دوسرے کو دیکھتے رہتے ہیں پھر ایک دم دوڑ کر بغل گیر ہوتے ہیں اور دونوں کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگتے ہیں۔ پھر مجیب نسیم کے دونوں بازو پکڑ کر انھیں سر سے پیر تک دیکھ کر) تیری صحت اب پہلی جیسی نہیں رہی۔

نسیم: (اپنا ہاتھ مجیب کی طرف بڑھا کر) آ۔ پنجہ لڑا کر دیکھ لے کس کی صحت اچھی ہے۔ (دونوں قہقہہ مار کر ہنستے ہیں) میری بینائی تک میں فرق نہیں آیا ہے۔ ابھی بھی میں سوئی پر نشانہ لگا سکتا ہوں۔

مجیب: یہ بات ہے! ہوجائے مقابلہ۔

نسیم: ہوجائے۔ (دونوں اپنی اپنی بندوقیں کاندھے پر سے اتار کر کھڑکی کے پاس کھڑے ہوجاتے ہیں) بولو کہاں نشانہ لگاؤں۔

مجیب: (چند سیکنڈ سوچ کر) وہ میرے باغ کا پھاٹک نظر آرہا ہے اس پر دو گول گول لکڑی کے لٹو ہیں ایک تو اڑا ایک میں— منظور ہے؟

نسیم: منظور ہے (نسیم نشانہ باندھ کر گولی چلاتے ہیں اور پھر مسکرا کر مجیب کو دیکھتے ہیں۔ مجیب مسکرا کر ان کی پیٹھ تھپ تھپاتے ہیں اور پھر خود نشانہ باندھ کر گولی چلاتے ہیں اور مسکرا کر نسیم کو دیکھتے ہیں۔ اس کے بعد دونوں ایک دوسرے سے ہاتھ ملاتے ہیں۔ صوفیہ اور نجیب تالیاں بجانے لگتے ہیں— تم دونوں یہاں کیوں کھڑے ہو۔

نجیب: ہم دونوں آپ لوگوں کی نشانہ بازی دیکھ رہے تھے۔

نسیم: بھاگ جاؤ شریر بدمعاشو!

(صوفیہ اور نجیب مسکراتے ہوئے بھاگ جاتے ہیں جس پر نسیم اور مجیب قہقہہ لگاتے ہیں۔ مجیب نسیم کا ہاتھ پکڑ کر ایک کرسی پر بٹھلاتے ہوئے)۔

مجیب: بھلے آدمی اپنے آنے کی اطلاع تو دی ہوتی۔

نسیم: میں بلا اطلاع ہی آنا چاہتا تھا— گاؤں تو اب بالکل بدل گیا ہے۔

مجیب: تم گاؤں شاید تیس سال بعد آئے ہو۔

نسیم: ہاں اتنا ہی زمانہ ہوگیا ہوگا— کیا اب میلہ نہیں لگتا۔

مجیب: کیوں نہیں لگتا۔ ابھی آٹھ دن باقی ہیں۔ تیاریاں شروع ہو چکی ہیں۔

نسیم: میں تو یہ سوچ کر آیا تھا کہ میلہ لگ چکا ہوگا۔ (کچھ دیر خاموش رہ کر) تمھیں میری لڑکی پسند آئی؟

مجیب: بہت پسند آئی۔ ایسی سعادت مند، خوش سلیقہ اور سمجھ دار لڑکی میں نے اپنی زندگی میں نہیں دیکھی۔ میں تمھیں اس قدر اچھی لڑکی کا باپ ہونے پر مبارکباد دیتا ہوں۔

نسیم: شکریہ! مجھے نجیب بھی اس قدر پسند ہے جس قدر تمھیں میری لڑکی کس قدر مردانہ وجاہت ہے اور کھیلوں میں تو وہ اپنے کالج کا سب سے اچھا کھلاڑی تھا۔

مجیب: یہ بالکل غلط ہے۔ کل جانتے ہو کیا ہوا؟ (نسیم سوالیہ نظروں سے مجیب کو دیکھتے ہیں) ایک بارہ سنگھے پر گولی مس کردی۔

نسیم: اتفاق رہا ہوگا۔ ویسے دو ایک مرتبہ میرے ساتھ شکار پر بھی گیا ہے۔ میں نے اس کو اچوک نشانہ باز پایا ہے۔

مجیب: ممکن ہے تمھارا خیال درست ہو مگر وہ اچھا شکاری نہیں ہے جانور کے پیچھے دوڑ کر اس پر گولی چلانا انتہائی حماقت ہے اور یہ حماقت کرنے میں وہ نمبر ایک ہے۔

نسیم: خیر— (کچھ دیر خاموش رہ کر) تم نے دونوں کے بارے میں کیا فیصلہ کیا۔

مجیب: کن دونوں کے بارے میں؟

نسیم: نجیب اور صوفیہ کے بارے میں۔ (نسیم خاموش ہوجاتے ہیں۔ پھر کچھ دیر بعد) میں تمھارا یہی فیصلہ سننے آیا ہوں۔

مجیب: (ٹھنڈی سانس بھر کر) وہ گئے سال پہاڑ پر چڑھنے کے مقابلے میں ہار گیا تھا۔

نسیم: اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔

مجیب: میرا یہ عہد ہے کہ میرے خاندان کا وہی مرد اپنی پسند کی شادی کرے گا جو اس

مقابلے کو جیتے۔

(نسیم کچھ دیر خاموش رہتے ہیں اور پہاڑ کو دیکھتے رہتے ہیں۔ پھر مجیب کی طرف دیکھ کر)

نسیم: دنیا تیس چالیس سال آگے بڑھ گئی ہے بوڑھے کھونسٹ۔ آج کے نوجوان تمھارے ان احمقانہ فیصلوں اور عہدوں کو ٹھکرا کر آگے بڑھ جائیں گے۔

مجیب: تو میں صبر کرلوں گا۔ مگر اس کے ساتھ نجیب کو یہ گھر بھی چھوڑ دینا ہوگا۔

نسیم: میں نے تم سے زیادہ بڑی دنیا دیکھی ہے۔ جنگ کے دوران دوسرے ملکوں کو دیکھا ہے۔ ہر جگہ کے نوجوانوں سے ملا ہوں۔ ان کے خیالات کو سمجھا ہے اور ان کے جذبات کو پرکھا ہے۔ (کچھ دیر خاموش رہ کر) ورنہ اس قدر احمق نہیں تھا کہ اپنی نوجوان لڑکی کو یوں تمھارے لڑکے کے ساتھ تنہا بھیج دیتا۔

مجیب: کچھ بھی ہو مگر میں اپنے فیصلے پر اٹل ہوں۔

(نسیم کچھ دیر خاموش رہتے ہیں پھر جیسے کچھ یاد آجانے پر)

نسیم: تو پھر ہو جائے پہاڑ پر چڑھنے کا مقابلہ۔ جو جیت جائے فیصلہ اس کے ہاتھ میں ہو۔ کہو منظور ہے۔

مجیب: (چند سیکنڈ رک کر) منظور ہے۔

(دونوں مسکرا کر ہاتھ ملاتے ہیں)۔

نسیم: (بلند آواز سے) نجیب! صوفیہ! (خاموش ہو جاتے ہیں۔ مجیب پہاڑ کو دیکھنے لگتے ہیں۔ کچھ دیر بعد نجیب اور صوفیہ کمرے میں آتے ہیں۔ نسیم دونوں کو مسکرا کر دیکھ کر مجیب کی طرف اشارہ کرتے ہوئے) کل ہم دونوں میں پہاڑ پر چڑھنے کا مقابلہ ہوگا۔

نجیب: (حیرت سے) جی آپ دونوں میں۔

نسیم: اس بوڑھے کھونسٹ اور بے وقوف کو سبق پڑھانا ہے۔ ہم دونوں میں سے جو جیت جائے تم دونوں کی شادی کا فیصلہ اسی کے ہاتھ میں ہوگا (اپنی جیب سے

ایک بوسیدہ جھنڈا نکال کر نجیب کو دے کر) یہ لو اسے اپنے مکان پر چڑھا دو۔

مجیب: یہ جھنڈا!!

نسیم: ہاں — یہ میرا جیتا ہوا جھنڈا ہے۔

مجیب: مگر گاؤں میں دو جھنڈے ایک ساتھ نہیں لہرائے جا سکتے یہ گاؤں کی رسم کے خلاف ہے۔

نسیم: مگر یہ جھنڈا میں نے جیتا ہے اور آج تک بھی اپنے گھر پر نہیں لہرایا۔ مجھے ایک سال تک اسے اپنے گھر پر لہرانے کا حق ہے۔

مجیب: (غصہ سے) یہ نہیں ہو سکتا۔ تمھارا جیتا ہوا جھنڈا میرے گھر پر نہیں لہرا سکتا۔

نسیم: یہ ہوگا۔ میں اپنی بیٹی کو جہیز میں کوئی بھی چیز دے سکتا ہوں۔ جس دن میں نے یہ جھنڈا جیتا تھا یہ عہد کیا تھا کہ اپنی لڑکی کی شادی تیرے لڑکے کے ساتھ کروں گا اور یہ جھنڈا اسے جہیز میں دوں گا۔

مجیب: مگر تم ابھی مقابلہ نہیں جیتے ہو۔ تمھیں فیصلہ کرنے کا ابھی حق نہیں ہے۔

نسیم: اور وہ میں جیت کر رہوں گا۔ میں نے خدا سے دعا کی کہ میرے یہاں خوبصورت لڑکی پیدا ہو اور خدا نے وہ دعا منظور کی۔ میں نے اس کو اچھی تعلیم دلوائی اچھی تربیت دی کہ تم کوئی عذر نہ کر سکو مگر تم جہالت پر اتر آئے (کھڑے ہو کر اپنی بندوق کاندھے پر لاد کر) چلو ابھی مقابلہ ہو جائے۔

مجیب: (چند سیکنڈ رک کر) مقابلہ کل ہوگا۔ تم ابھی تھکے ہوئے ہو کہو گے تھکے ہوئے کو ہرا دیا۔ کل صبح آٹھ بجے۔ منظور ہے؟

نسیم: منظور ہے۔ (دونوں پھر مسکرا کر ہاتھ ملاتے ہیں۔ نسیم نجیب کی طرف دیکھ کر) جاؤ گھر پر یہ جھنڈا لہرا دو۔ جیت میری ہوگی۔

(پہاڑ کی طرف دیکھنے لگتے ہیں)

(پردہ)

(شاعر: بمبئی، اگست 1967)

مرکز کی طرف

افراد تمثیل

(1) عادل (ایک ناول نگار) (2) نادر (ایک شاعر) (3) شہریار (ایک شکاری)
(4) رخ روشن (شہریار کی لڑکی) (5) صمد خان (ملازم) (6) زہرہ (صمد کی بیوی)

منظر

جنگل کے اندر ایک جھونپڑی جس کی چھت اور دیواریں سب پھوس کی ہیں۔ آس پاس چاروں طرف جنگل ہے۔ شہریار نے یہ جھونپڑی یونہی بنوالی ہے کیونکہ وہ اکثر یہاں شکار کھیلنے آتا ہے اور کبھی کبھی تھوڑی دیر کے لیے اس میں آرام کرلیتا ہے۔ کچھ دن سے اس میں عادل اور نادر رہنے لگے ہیں۔ اس لیے اس میں کچھ کرسیاں ایک میز اور پلنگ ڈال دیے گئے ہیں۔

جھونپڑی دو کمروں میں بٹی ہوئی ہے۔ ایک کمرہ ڈرائنگ روم اور اسٹیڈی کا بیک وقت کام دیتا ہے اور دوسرا باورچی خانہ کا جھونپڑی سے کچھ دور فاصلے پر ایک پہاڑی ندی ہے جو درختوں میں چھپی ہوئی ہے اور جھونپڑی کے اطراف کھڑے ہونے پر نظر آتی ہے۔

جھونپڑی کے اطراف میں کچھ پگڈنڈیاں ہیں جو کچھ دور تک نظر آنے کے بعد جنگل میں غائب ہوجاتی ہیں۔ مقام پر فضا ہے۔ درختوں کا گھنا سایہ ہمیشہ جھونپڑی پر رہتا ہے۔اس وقت صبح کے آٹھ بجے ہیں کمرے میں صمد خاں اور اس کی بیوی ہے۔صمد کی بیوی کمرے کی صفائی کررہی ہے۔ کچھ دیر بعد)

زہرہ: تم مردوں کو کبھی صفائی سے رہنا آہی نہیں سکتا (صمد کھڑکی سے باہر دیکھتا رہتا ہے۔ زہرہ پھر اپنے کام میں مشغول ہوکر) کہیں کی چیز کہیں پڑی ہے۔ سگریٹوں کے ٹکڑے— خدا بچائے ان سے۔

صمد خاں: (پلٹ کر زہرہ سے) بس بس ہوچکا۔اب رہنے دے کہیں وہ دونوں آنہ جائیں۔

زہرہ: آجائیں تو آجائیں۔ بھلا یہ بھی کوئی رہنے کا ڈھنگ ہے میں اُن سے بھی سمجھ لوں گی۔

صمد خاں: بس بس اپنی کاریگری رہنے دے۔اگر انھوں نے تجھ کو یہاں دیکھ لیا تو—

زہرہ: (بات کاٹ کر) دیکھ لیا تو دیکھ لیں کہاں کا غضب ہوجائے گا۔

صمد خاں: تیرے لیے تو کچھ نہ ہوگا مگر میرا مفت کا روزگار مارا جائے گا۔ان سے شرط یہی ہے کہ یہاں کوئی عورت نہیں آئے گی بالکل سنکی ہیں دونوں۔ پھر پلٹ کر کھڑکی سے باہر دیکھتے ہوئے) اب جلدی سے صفائی کردے وہ دونوں آتے ہی ہوں گے۔ بہت دیر ہوگئی ہے انھیں گئے ہوئے— اور ہاں یہ تو اتنی رات گئے اکیلی کیوں چلی آئی تھی۔

زہرہ: کیوں نہ چلی آتی؟ آٹھ دن ہوگئے ہیں کہ تم نے گھر شکل نہیں دکھلائی۔(اپنے کام میں مشغول رہتے ہوئے) بچی تمھاری شکل کو ترس رہی ہے اور رو رو کر آدھی جان کردی ہے۔(صمد خاں کی شکل دیکھ کر) کتنے دن اور رہیں گے یہ لوگ۔

صمد خاں: جتنے دن اور رہیں اچھا ہی ہے۔ تین روپے روز اور بخشش الگ۔ ایسے گانٹھ کے پورے مشکل سے ہی ملتے ہیں۔

زہرہ: میری تو دُہائی اس کمائی سے۔بس پیچھا چھڑاؤ ان سے۔(صمد کھڑکی سے باہر

19/

دیکھتا ہے اور پھر ایک دم گھبرا کر)

صمد خاں: اچھا اچھا اب جا— وہ دونوں آرہے ہیں۔ (زہرہ کام چھوڑ کر دروازے کی طرف جاتی ہے۔ صمد خاں دوڑ کر اس کا ہاتھ پکڑ کر جس سے زہرہ کی ایک چوڑی ٹوٹ کر فرش پر گر جاتی ہے۔ صمد اس پر دھیان نہ دے کر) ادھر سے نہیں— (دوسرے دروازے کی طرف گھسیٹ کر باہر نکالتے ہوئے) ادھر سے— اور دیکھ سیدھی گاؤں چلی جانا۔

زہرہ: پر تم کب آؤ گے۔

صمد خاں (تیزی سے) رات کو۔

زہرہ: اور بچی کے لیے۔

صمد خاں: (بات کاٹ کر) سب کچھ لیتا آؤں گا۔ (دروازہ بند کر دیتا ہے اور گھبرائے انداز میں کمرے کے سامان کو برابر برابر جمانے لگتا ہے۔ عادل اور نادر داخل ہوتے ہیں۔ صمد خاں ان دونوں کو دیکھ کر) آداب عرض ہے سرکار۔

عادل: آداب۔ (مسکرا کر کمرے کو چاروں طرف سے دیکھ کر) آج تو بڑی صفائی کر ڈالی۔

صمد خاں: صبح سے لگا ہوا ہوں سرکار۔ کمرہ جو گندہ ہو گیا۔

عادل: اچھا اچھا شکریہ— (ایک آرام کرسی پر بیٹھ جاتا ہے اور نادر کھڑکی کے پاس جا کر کھڑا ہو جاتا ہے۔ عادل سگریٹ جلا کر) تم رات بھر کہاں رہے؟

صمد خاں: (اس غیر متوقع سوال سے گھبرا کر) سرکار! ذرا پاس کے گاؤں گیا تھا— وہاں—

عادل: (بات کاٹ کر) بس بس رہنے دو تم پھر عورتوں کی باتیں کرو گے۔ ہمیں ان باتوں سے چڑ ہے۔

صمد خاں: جی— بہت اچھا سرکار۔

نادر: (عادل کے پاس ایک کرسی پر بیٹھ کر) اماں صمد خاں چائے پلواؤ گے یا نہیں۔

صمد خاں: (دوسرے دروازے کی طرف جاتے ہوئے) ابھی لایا سرکار۔

(صمد خاں دوسرے کمرے میں چلا جاتا ہے۔ نادر سگریٹ جلا کر پینے لگتا ہے۔ کچھ دیر خاموشی رہتی ہے پھر نادر عادل کو مخاطب کر کے)۔

نادر: اقبال نے کہا ہے:

ہند کے شاعر و صورت گر و افسانہ نویس

آہ! بیچاروں کے اعصاب پہ عورت ہے سوار

اور میں کہتا ہوں کہ شاعر، صورت گر اور افسانہ نویس پر ہی کیا موقوف ہے دنیا کے ہر مرد کے اعصاب پر عورت ہے سوار مگر ہم یہاں تین مہینے سے اس غیر آباد جگہ پر ہیں بھلا ہماری زندگی میں کون سی کمی ہے۔

(عادل کوئی جواب نہیں دیتا خاموشی سے سگریٹ کے کش لیتا رہتا ہے اور خلا میں کھوئے ہوئے انداز میں گھورتا رہتا ہے۔ کچھ دیر بالکل خاموشی رہتی ہے۔ پھر عادل اپنی کرسی سے اٹھ کر تھکے تھکے قدموں سے کھڑکی کے پاس جا کر کھڑا ہو جاتا ہے کچھ دیر خاموشی سے باہر دیکھتا رہتا ہے۔ پھر پلٹ کر نادر سے)۔

عادل: نادر! (نادر جو اپنے خیالات میں کھویا ہوا ہے۔ نظریں اٹھا کر عادل کو دیکھتا ہے) میرا ناول ختم ہونے میں ابھی دو تین مہینے اور لگ جائیں گے۔

نادر: دو تین مہینے۔

عادل: ہاں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میں الجھ سا گیا ہوں۔ مضمون پورے طور پر گرفت میں نہیں آ رہا ہے۔ کوئی کمی کھٹکتی ہے جو سمجھ میں نہیں آ رہی ہے۔

نادر: (قہقہہ مار کر) میں بتلاؤں — عورت کی کمی۔ ابھی تم کہو گے کہ بلا عورت کے کردار کے ناول مکمل نہیں ہوتا — ناول خشک ہے۔ یہ — (ایک دم خاموش ہو کر فرش کو غور سے دیکھنے لگتا ہے اور اٹھ کر ایسے دبے قدموں آگے بڑھتا ہے جیسے اس نے کوئی سانپ دیکھ لیا ہو) عادل۔

عادل: (چونک کر اس کی طرف دیکھتے ہوئے) کیا ہے؟ خیریت تو ہے۔ عادل غور سے دیکھ کر اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے) عورت کی چوڑی۔

نادر: ہاں عورت کی چوڑی — مرد چوڑیاں نہیں پہنا کرتے۔

عادل: مگر یہ یہاں کیسے آئی؟ (غور سے آس پاس دیکھتا ہے ایک اور ٹکڑا اٹھا کر) یہ دیکھو ایک اور ٹکڑا ہے۔ (دونوں ٹکڑوں کو جوڑ کر) نازک کلائی معلوم ہوتی ہے (شاعرانہ انداز میں) کلائی وہ نازک سی ہیرا تراش۔

نادر: (عادل کے ہاتھ سے چوڑی کے ٹکڑے لیتے ہوئے) سیاہ رنگ کی ہے۔ یقینی کلائی کا رنگ گورا اور گورا نہیں تو گندمی ضرور ہوگا۔

عادل: چمپئی رنگ کی عورتیں بھی اکثر سیاہ چوڑیاں پہنتی ہیں۔

نادر: (پھر چوڑی کو غور سے دیکھ کر) اگر میں نے قسم نہ کھا رکھی ہوتی تو اس چوڑی پر ایک نظم کہتا۔ یہ چوڑی جو عورت کے سہاگ کی نشانی اور مرد کے لیے رومان کا ایک سمندر ہے (ٹھنڈی سانس بھر کر) میں نے عورت پر نظم نہ کہنے کی قسم کھا رکھی ہے۔ اور اس لیے عرصے سے کوئی نظم نہیں کہی۔

عادل: سوال یہ ہے کہ یہ چوڑی یہاں کیسے آئی۔ (بلند آواز سے) صمد خاں۔ صمد خاں۔ (صمد خاں کمرے میں آکر)

صمد خاں: جی سرکار — چائے تیار ہو رہی ہے ابھی لایا۔

عادل: ابھی چائے نہیں چاہیے — (نادر کے ہاتھ سے چوڑی لے کر صمد خاں کو دکھلاتے ہوئے۔) یہ کیا ہے۔

صمد خاں: (چوڑی کو غور سے دیکھ کر) چوڑی ہے سرکار۔

عادل: (غصہ سے) چوڑی ہم بھی پہچانتے ہیں اور یہ بھی جانتے ہیں کہ چوڑیاں عورتیں پہنتی ہیں۔ سوال یہ ہے کہ یہاں کیسے آئی؟

صمد خاں: یہاں — گھبرا کر) کہاں سرکار۔

عادل: اس کمرے میں — کوئی عورت آئی تھی یہاں؟

صمد خاں: عورت! نہیں سرکار یہاں تو کوئی عورت نہیں آئی۔

عادل: تو پھر یہ چوڑی کیسے پیدا ہوگئی۔ سچ سچ بتلاؤ۔

صمد خاں: سچ مانیے سرکار یہاں کوئی عورت نہیں آئی۔ (پھر ایک دم جیسے کوئی بات یاد آگئی ہو اپنی جیبیں ٹٹولتے ہوئے) سرکار— وہ میرا مطلب ہے کہ—

عادل: کیا مطلب ہے صاف صاف کہو۔

صمد خاں: شاید میری جیب سے گر گئی ہے۔

عادل: تمھاری جیب سے!

صمد خاں: میری بیوی نے دی تھی کہ اس کی ناپ کی چوڑیاں لیتا آؤں شاید کمرے کی صفائی کرنے میں جیب سے گر کر ٹوٹ گئی۔

عادل: (اطمینان کی سانس لے کر) اوہ یہ بات ہے۔ (مسکرا کر) چوڑی کے ٹکڑے اسے واپس کرتے ہوئے) خیر— مگر دیکھو یہاں عورتوں کی چیزیں بھی نہ لایا کرو۔

صمد خاں: (چوڑی کے ٹکڑے لیتے ہوئے) بہت اچھا سرکار (واپس دوسرے کمرے میں چلا جاتا ہے۔ عادل پھر اطمینان سے کرسی پر بیٹھ کر سگریٹ پینے لگتا ہے اور ٹکٹکی باندھے سامنے دیوار کو دیکھتا رہتا ہے جیسے کچھ سوچ رہا ہو— نادر کمرے میں ٹہلنے لگتا ہے۔ کچھ دیر بعد عادل سگریٹ کا ایک لمبا سا کش لے کر سگریٹ فرش پر پھینکتے ہوئے)

عادل: اس چوڑی کو دیکھ کر سلیم کی یاد جانے ذہن کے کس گوشے سے نکل آئی۔

نادر: سلیم۔

عادل: ہاں— (سوچتے ہوئے) تمھیں یاد ہوگا ہمارے ساتھ کالج میں ایک لڑکی پڑھا کرتی تھی۔ اچھے کھاتے پیتے گھرانے کی تھی۔

نادر: (دلچسپی لیتے ہوئے) وہی نا جو سبز رنگ کی کار میں اکثر کالج آیا کرتی تھی۔

عادل: ہاں ہاں— وہی۔

نادر: (قہقہہ مار کر) خوب یاد ہے وہی جس نے تم سے کسی اسٹور میں کہا تھا کہ اگر چوڑیاں پہننے کا شوق ہے تو پسند فرمالیجیے بلکہ ادائگی میں کردوں گی۔

عادل: (ہنس کر) ہاں وہی — اس کی شرارت آمیز شوخ مسکراہٹ جس وقت یاد آتی ہے تو دل پر ایک سانپ سا لوٹ جاتا ہے کیا لڑکی تھی۔

(صمد خاں دروازے میں آکر)

صمد خاں: حضور چائے تیار ہوگئی ہے — لے آؤں۔

نادر: ہاں بھئی اور کب تک انتظار کراؤ گے۔ (دروازہ بند کرکے صمد خاں دوسرے کمرے میں چلا جاتا ہے۔ نادر کچھ دیر خاموش رہ کر) عورتوں کی چوڑیوں میں بھی ایک رومان ہوتا ہے۔ مگر آج کل کی نئی فیشن ایبل لڑکیاں ان کو پسند نہیں کرتیں۔

عادل: اسی لیے تو میں کہتا ہوں ان میں عقل کم اور بے وقوفی زیادہ ہوتی ہے۔

نادر: وہ اپنا بوڑھا پروفیسر کہا کرتا تھا کہ عورتیں اپنی عقل جوڑے میں باندھ کر رکھتی ہیں (مسکرا کر کھڑکی سے باہر دیکھنے لگتا ہے) یہ لو آج تو اولڈ بچلر آرہا ہے۔

(شہریار داخل ہوتا ہے۔ شکاری لباس پہنے ہے اور کاندھے پر ایک بندوق لٹکی ہوئی ہے۔ انتہائی بے تکلفی سے کمرے میں داخل ہوتا ہے۔ عمر پچاس پچپن کے قریب ہے۔ بدن مضبوط اور صحت مند ہے۔ بندوق ایک کونے میں رکھتے ہوئے مسکرا کر)

شہریار: ہلو —

عادل: چچا — آج تو بہت سویرے نکل پڑے۔

شہریار: (مسکرا کر) کئی روز سے تم لوگوں سے ملاقات نہیں ہوئی تھی سوچا چل کر مل لوں (مسکرا کر) سوچا چل کر دیکھوں تم لوگوں نے زندگی کے کن اور حقائق کی تلاش کی ہے۔ (صمد خاں چائے لاتا ہے اور میز پر رکھتا ہے شہریار چائے دیکھ کر مسکرا کر) میں ٹھیک وقت پر آیا۔ (ایک کرسی پر بیٹھ جاتا ہے۔ صمد خاں چلا جاتا ہے)

نادر: اور کہیے آج کل کیا مشغلہ ہے؟

شہریار: مشغلہ تو صرف ایک ہے۔ شکار کھیلنا — ویسے میری لڑکی آج کل شہر سے آئی ہوئی ہے اکثر وقت اسی کے ساتھ گزرتا ہے۔

عادل: (چائے پیالی میں ڈالتے ہوئے) آپ کی لڑکی۔

شہریار: ہاں میری لڑکی (مسکرا کر) تمھیں میری لڑکی کا سن کر تعجب کیوں ہو رہا ہے۔

عادل: تعجب نہیں۔ ویسے کبھی آپ نے اس سے پہلے ان کا ذکر نہیں کیا۔

شہریار: میری لڑکی شہر کے ایک کالج میں پڑھتی ہے اور چھٹیاں میرے ساتھ دیہات میں گزارتی ہے۔

نادر: بہت خوب۔ کبھی آپ نے ذکر تو کیا ہوتا۔

شہریار: (مسکرا کر) تم لوگوں کو عورتوں کے ذکر سے چڑ ہے اور اُن سے پیچھا چھڑانے کے لیے تم نے یہ سنیاس لیا ہے اس لیے تمھاری اس تپسیا کو ختم کرنے کے لیے اس کا ذکر نہیں کیا۔

عادل: (چائے کی پیالی شہریار کی طرف بڑھا کر مسکراتے ہوئے) اوہ! یہ بات ہے شکریہ — ویسے کم از کم میں تو ابھی تک اپنے عقیدے پر قائم ہوں کہ عورت رحمت ہرگز نہیں ہے۔

شہریار: (پیالی اس کے ہاتھ سے لے کر مسکراتے ہوئے) مگر دیکھنا تو یہی ہے کہ کب تک اس عقیدے پر قائم رہتے ہو۔

عادل: ہمیشہ — اب تو میرا یہ عقیدہ پختہ ہوتا جا رہا ہے کہ عورت کو سماجی حیوان کہنا ہی غلط ہے۔

شہریار: گویا عقیدہ کی پختگی اس حد تک بڑھ گئی ہے۔

نادر: مرد کو دھوکا دینے کے لیے اس نے نئے نئے حربے ایجاد کیے ہیں۔ جیسے شرم و حیا جس کو اس کی فطرت کہہ دیا جاتا ہے مرد کے لیے ایک ناسور ہے جو اس کے ہر قطرۂ خون کو چوس لیتا ہے۔

شہریار: (چائے کا گھونٹ لے کر مسکراتے ہوئے) صرف دل والے مردوں کے لیے۔

نادر: اور کون سا مرد دل والا نہیں ہوتا — ہم یہاں تین مہینے سے ہیں۔ مگر ہماری زندگی میں کون سی کمی ہے۔ کیا ہم وقت پر کھانا نہیں کھاتے۔ وقت پر سوتے نہیں

وقت پر ٹہلنے نہیں جاتے۔ کیا ہماری راتوں کی نیند حرام ہوگئی ہے— اور کیا۔

شہریار: (مسکرا کر لقمہ دے کر) ہم دونوں دن رات عورتوں کی باتیں نہیں کرتے۔ (دونوں خاموش ہوجاتے ہیں شہریار کچھ دیر بعد سگریٹ جلاتے ہوئے)۔ کہو عادل تمھارا ناول کس منزل میں ہے؟

عادل: کچھ زیادہ ترقی نہیں کی۔ 15-20 صفحات سے زیادہ نہ لکھ سکا۔

شہریار: کیوں؟ کیا موڈ نہیں ہے۔ (عادل کوئی جواب نہیں دیتا۔ شہریار کرسی کی پشت سے پیٹھ لگا کر) کل میری لڑکی تمھارے ایک ناول کی تعریف کررہی تھی۔

عادل: اچھا— (مسکرا کر) میری طرف سے ان کا شکریہ ادا کردیجیے گا۔

نادر: کافی سمجھ دار ہیں آپ کی صاحبزادی۔ (مسکرا کر) عادل کو چھیڑنے کے انداز میں) پہلی خاتون ہیں۔ جنھوں نے عادل کے کسی ناول کی تعریف کی ہے۔

عادل: کیوں؟ کیا صرف مشاعروں میں پڑھی جانے والی غزلوں اور نظموں ہی کی تعریف ہوتی ہے۔

نادر: (مسکرا کر) تم لوگ ہم شاعروں سے جلتے ہو۔ بھئی ہمارا تو آرٹ ایسا ہے کہ اس ہاتھ دے اس ہاتھ لے۔

عادل: (مسکرا کر) جی ہاں۔ یہ تو صحیح ہے کہ آپ اس ہاتھ دیتے ہیں اور اس ہاتھ لیتے ہیں۔ آپ انھیں اس کان سناتے ہیں اور وہ اس کان سے اڑا دیتے ہیں۔ (شہریار قہقہہ مار کر ہنستا ہے۔ نادر بھی مسکراتا ہے)۔

شہریار: میری لڑکی تم لوگوں سے ملنا چاہتی تھی مگر جب میں نے کہا کہ تم لوگوں نے ایک سال تک عورتوں سے نہ ملنے کی قسم کھا رکھی ہے تو وہ مسکرا کر خاموش ہوگئی۔ (چند سیکنڈ خاموش رہ کر) کوئی تکلیف تو نہیں ہے تم لوگوں کو یہاں؟

نادر: تکلیف کیسی۔ بڑے آرام سے زندگی گزر رہی ہے۔

شہریار: پھر بھی اگر تکلیف ہو تو کہو۔

نادر: آپ نے اپنا شکاری مکان دے کر ایک بڑا مسئلہ حل کردیا ہے۔ اور صمد خاں

اگر آپ نہ دیتے تو یقیناً تکلیف ہوتی۔ اگر اس کے بعد بھی کوئی تکلیف ہوئی تو ضرور عرض کریں گے۔

شہریار: (کھڑے ہوکر) ضرور۔ ضرور۔ اچھا اب میں چلتا ہوں۔

عادل: کچھ دیر تو اور تشریف رکھیے پھر چلے جائیے گا۔

شہریار: (مسکرا کر) میری لڑکی انتظار کر رہی ہوگی۔

عادل: اس بار تو بہت دن میں درشن دیے۔ ذرا جلد جلد اِدھر کا رخ کر لیا کیجیے۔

شہریار: اچھا— اچھا۔

(بندوق کاندھے پر لٹکا چلا جاتا ہے)۔

نادر: بوڑھا ہے دلچسپ۔

عادل: آج کچھ اداس نظر آرہا تھا (کچھ دیر خاموش رہ کر) تعجب ہے اس سے پہلے کبھی اُس نے اپنی لڑکی کا ذکر نہیں کیا۔

نادر: مذاق کر رہا ہوگا ہمیں چڑانے کے لیے (سگریٹ کا کش لے کر) اچھا ٹھہرو— صمد خاں سے تصدیق کرنا چاہیے۔ (بلند آواز سے) صمد خاں صمد خاں— ہیں کہاں— گیا۔ (ذرا اونچی آواز میں) اماں صمد خاں (دروازے کے پاس جاکر) صمد خاں— (دروازہ کھول کر دیکھتا ہے) کہاں غائب ہوگیا۔ (دوسرے کمرے میں جاتا ہے اور زور سے چیخ کر) صا— مد— صا— مد— (کچھ دیر بعد واپس آکر) دور درختوں کے پاس کھڑا کسی عورت سے باتیں کر رہا ہے۔

عادل: عورت سے! کون عورت ہے۔

نادر: پتا نہیں۔

عادل: (کھڑے ہوکر) میں جاکر دیکھوں۔

نادر: تشریف رکھیے— میں بھی جاکر دیکھ سکتا ہوں۔

عادل: آخر یہ تو معلوم ہونا چاہیے کس قسم کی عورت ہے۔

نادر: دور سے تو دبلی پتلی معلوم ہوتی ہے۔

عادل: ارے بھئی رنگ کیسا ہے؟ کیا لباس پہنے ہے۔

نادر: عادل! حماقت کی باتیں نہ کرو۔ رنگ کا پتا اس قدر دور سے کیسے چل سکتا ہے (دروازے میں سے اس طرح جھانکتا ہے جیسے دور درختوں میں عورت کو دیکھنے کی کوشش کر رہا ہو مگر کچھ نظر نہیں آتا تو بے چینی سے کمرے میں ٹہلنے لگتا ہے۔ نادر جلا ہوا سگریٹ پھینک کر فوراً دوسرا جلا لیتا ہے اور عادل کی طرح بے چینی سے کمرے میں ٹہلنے لگتا ہے۔ کچھ دیر بعد صمد خاں کمرے میں آتا ہے)۔ کون عورت تھی یہ۔

صمد خاں: پتا نہیں سرکار— راستہ بھول کر ادھر آگئی تھی۔

نادر: تم سے کیا باتیں کر رہی تھی۔

صمد خاں: کچھ نہیں— صرف راستہ پوچھ رہی تھی۔

نادر: (غصہ سے) گویا عورتوں کی خدمت کرنا تم نے اپنا پیشہ بنا لیا ہے۔ اپنی بیوی کے لیے چوڑیاں خریدنا۔ بھولی ہوئی عورتوں کو راستہ بتلانا اور— اور—

صمد خاں: مگر سرکار! میں نے عورتوں سے ملنے اور بات نہ کرنے کی قسم تو نہیں کھا رکھی ہے۔

نادر: (شرمندہ سا ہو کر) اچھا اچھا— خیر زیادہ باتیں نہ بناؤ یہ بتلاؤ شہریار میاں کے کوئی لڑکی ہے۔

صمد خاں: جی ہاں ایک لڑکی ہے شہر میں رہتی ہے۔

نادر: کیسی لڑکی ہے۔

صمد خاں: جی— بہت اچھی ہیں۔ میرے ساتھ مہربانی سے پیش آتی ہیں اور میرے بچوں کے لیے کوئی نہ کوئی تحفہ ضرور لاتی ہیں۔

نادر: اچھا— اچھا— یہ سامان لے جاؤ— (صمد خاں چائے کے برتن اٹھا کر دوسرے کمرے میں چلا جاتا ہے۔ کچھ دیر خاموش رہ کر نفرت کے لہجے میں زمین آسمان کے قلابے ملانے لگا— میں کہتا ہوں قطعی بور ہوگی۔

عادل: آپ نے کیسے سمجھ لیا کہ بور ہوگی؟

نادر: میرا اندازہ ہے کہ کالج میں پڑھتی ہے اس لیے مغرور ہوگی اور شہریار نے اس قدر بے پروائی سے شہر میں چھوڑ رکھا ہے اس لیے شکل وصورت بھی واجبی ہوگی۔

عادل: آپ کوئی جوتشی تو ہیں نہیں کہ بلا دیکھے بھالے ملے جلے شکل وصورت اور کردار کے بارے میں اپنی رائے کا اظہار فرما دیا۔ (کچھ دیر خاموش رہ کر) میرا خیال ہے کہ لڑکی نہ تو بور ہوگی اور نہ شکل وصورت کے اعتبار سے واجبی۔

نادر: آپ تو بچپن ہی سے لڑکیوں کے بارے میں خوش فہم واقع ہوئے ہیں۔

عادل: نہیں۔ یہ بات نہیں ہے شہریار خوش مزاج اور زندہ دل ہے اس کا اثر لڑکی پر پڑا ہوگا رہا شکل وصورت کا سوال تو شہریار کی لڑکی کا حسین و خوبصورت ہونا یقینی ہے۔

نادر: جی بس رہنے دیجیے آپ کے حسن کا اسٹینڈرڈ ہمیں معلوم ہے ماہ جبیں آپ کے حسن کا معیار ہے۔

عادل: (مسکرا کر) ماہ جبیں میں کہاں کی برائی ہے۔

نادر: جی ہاں— بین الاقوامیت کا مکمل نمونہ— (سگریٹ کا کش لے کر) آنکھیں یورپین، بال ہندوستانی، ناک جاپانی، منہ نیپالی، ہونٹ افریقی ایک چوں چوں کا مربہ۔

عادل: بس بس رہنے دو۔ تمھیں تو بحث کرنے میں مزہ آتا ہے۔ نیلی آنکھیں جیسے گہرا سمندر اور سیاہ بال جیسے امنڈتی ہوئی گھٹائیں— آپ کی یاسمیں کی طرح ناک مجھے پسند نہیں جیسے کسی اناڑی نے پلاسٹک سرجری کے ذریعہ مصنوعی ناک چہرے سے علاحدہ فٹ کردی ہو اور پروفیسر نرملا کا قد آپ ہی کو پسند ہوگا جیسے زمین پر چلتا پھرتا تاڑ— اور موٹے ہونٹ جیسے۔

نادر: (بات کاٹ کر) بس بس رہنے دیجیے اپنے معیار حسن سے میرے ذوق شرعی کو تباہ نہ کیجیے۔

(عادل خاموش ہو جاتا ہے اور سگریٹ کے کش لیتا ہے نادر کچھ آہستہ آہستہ گنگناتا ہے مگر الفاظ سمجھ میں نہیں آتے۔ عادل کچھ دیر خاموش رہ کر مسکراتے ہوئے)

عادل: یاسمین کو میں ایسی لڑکی نہیں سمجھتا تھا کہ وہ تمھیں اس طرح دھوکا دے گی۔

نادر: ہائے یاسمین! ہزاروں یاسمنوں نے مجھے دھوکا دیا ہے نادرہ کو لیجیے میں بھولی بھالی اور معصوم سمجھتا تھا مگر پیٹ میں گز بھر کی داڑھی نکلی۔ شکیلہ اور مسرور قطعی فلرٹ، بلقیس اور نور جہاں میرے اشعار کی عاشق مگر میری صورت سے نفرت۔ سب سے بڑا چرکا تو جمال سحر نے دیا اسی دن سے مجھے عورتوں سے نفرت ہوگئی ہے۔

عادل: تم تو یہ چند نام گنا کر خاموش ہو سکتے ہو مگر میرے دل سے پوچھو جس پر لاتعداد گھاؤ ہیں۔ جن کی تعداد آسمان پر بکھرے ہوئے تاروں سے کم نہیں۔ سب سے بڑی مثال تو ماہ جبیں کی ہے جس کی دولت پرستی نے میرے دل کو داغدار کر دیا ہے۔ اسے کسی نے نہیں چاہا۔ میں نے رحم کھا کر اس سے محبت کی مگر—

(دروازے پر آواز)

آواز: کیا میں اندر آسکتی ہوں۔ (دونوں خاموش ہو کر آواز پر کان لگاتے ہیں) کیا میں اندر آسکتی ہوں۔

نادر: کوئی عورت ہے۔

عادل: (رازدارانہ لہجے میں) آواز شیریں ہے۔

آواز: کیا آپ مجھے اندر آنے کی اجازت نہ دیں گے؟

نادر: (بادل ونخواستہ) تشریف لائیے۔

(عادل برا منہ بناتا ہے۔ ایک نوجوان خوبصورت لڑکی داخل ہو کر مسکراتے ہوئے)۔

لڑکی: معاف کیجیے گا میں آپ کی تنہائی میں بلا وجہ مخل ہوئی۔ (دونوں خاموشی سے اسے دیکھتے رہتے ہیں) آپ لوگوں کو میرا آنا ناگوار گزرا؟ دونوں اب بھی خاموش رہتے ہیں اور لڑکی کو حیرت و تعجب سے گھورتے رہتے ہیں) میرا نام۔

(مسکرا کر) ذرا عجیب سا ہے۔ رُخِ روشن— میرے والد کو بہت پسند ہے۔
(دونوں اب بھی خاموش رہتے ہیں) اگر آپ اجازت دیں تو تھوڑی دیر بیٹھ کر
ستا لوں۔ جلد واپس چلی جاؤں گی زیادہ تھک گئی تھی اس لیے اِدھر چلی آئی۔

نادر: کوئی بات نہیں تشریف رکھیے۔
(ایک کرسی پر بیٹھ کر مسکراتے ہوئے جس میں عادل اور نادر کو بے حد دلکشی
محسوس ہوتی ہے)۔

رخِ روشن: مجھے معلوم ہے کہ آپ صاحبان کو ہم عورتوں کی صورت سے نفرت ہے اور اسی
لیے آپ نے یہ سنیاس لیا ہے (عادل اور نادر حیرت سے اُسے دیکھتے ہیں)
جی ہاں۔ مجھے میرے والد نے ایسا ہی بتلایا ہے۔

نادر: (تعجب سے) آپ کے والد—

رخِ روشن: جی ہاں— شہریار جنھیں شاید آپ لوگ چچا جان کہتے ہیں— مجھے آپ لوگوں
سے ملنے کی بڑی تمنا تھی خاص طور پر عادل صاحب سے— آپ دونوں میں
عادل صاحب۔

عادل: (جو ابھی تک خاموش کھڑا ہے) جی میرا نام عادل ہے اور نادر کی طرف
اشارہ کرکے) ان کا نام نادر ہے مشہور شاعر ہیں۔

رخِ روشن: جی مجھے معلوم ہے (مسکراتے ہوئے) آپ ناول نگار ہیں۔ ابھی چند دن
پہلے میں نے آپ کا ایک ناول پڑھا تھا۔

عادل: شکریہ۔

نادر: (مسکرا کر) جو آپ کو پسند آیا تھا اور آپ نے اس کی تعریف کی تھی۔

رخِ روشن: جی ہاں پسند تھا مگر— (عادل سوالیہ نگاہوں سے رخِ روشن کو دیکھتا ہے)
معاف کیجیے۔ مجھے ہیروئن کے کردار سے اتفاق نہیں۔ (عادل خاموش رہتا ہے)
ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کردار خود نہیں چل رہا ہے بلکہ آپ اس کو گھسیٹ رہے
ہیں۔ وہ خود مجبور ہے اور ہر ہر قدم پر اپنے صانع کے قلم اور تصور کا محتاج۔

عادل: شاید آپ کا مطلب 'آبلے' کی ہیروئن نوشابہ سے ہے۔

رُخ روشن: جی ہاں عجیب مجبور اور بے بس کردار ہے۔ حالانکہ وہ عہد حاضر کی عورت ہے جو کم از کم اپنا راستہ خود پیدا کرتی ہے۔

نادر: بالکل یہی اعتراض مجھے بھی ہے مگر عادل ناول کی اس کمزوری کو ماننے کے لیے تیار نہیں۔ نوشابہ کے کردار میں اپج نہیں ہے جس کی ہمیں آج کی عورت سے توقع ہے۔

رخ روشن: خیر یہ ہم لوگوں کا نظریہ ہے اگر کردار کا خالق ایسا محسوس کرتا ہے یا اس کا ایسا تجربہ ہے تو ہمیں اسے قبول کرلینا چاہیے۔ ویسے ناول خوب ہے۔

عادل: شکریہ۔ (بلند آواز سے) صمد خاں — (صمد خاں آتا ہے) چائے لاؤ۔

صمد خاں: بہت اچھا — (رُخ روشن کو دیکھ کر) روشن بی بی آپ ادھر کیسے آنکلیں۔ (حیرت سے عادل اور نادر کو دیکھتا ہے)۔

رخ روشن: ابھی تمھاری بیوی راستے میں مل گئی تھی اس نے کہا ابا جان یہاں ہیں اس لیے ادھر چلی آئی اور۔ ہاں یہ تم آٹھ دن سے گھر کیوں نہیں پہنچے۔

صمد خاں: یہاں سے فرصت کم ملتی ہے۔

رخ روشن: بچی دن رات تمھارے لیے رویا کرتی ہے تمھاری بیوی مجبور ہوکر رات یہاں آئی تھی (صمد خاں گھبرا کر اسے خاموش رہنے کا اشارہ کرتا ہے جس کو رُخ روشن نہیں سمجھتی) تمھاری ماں رات بھر بچی کو بہلاتی رہی۔

نادر: صمد خاں! تمھاری بیوی رات بھر یہاں رہی تھی۔

صمد خاں: (گھبرا کر) جی نہیں وہ —

رخ روشن: (بات کاٹ کر) نہیں کیوں سچ سچ، یہیں رہی ہے (نادر سے) اگر آپ لوگوں نے سنیاس لیا ہے تو اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں ہے کہ ہر مرد سنیاس لے لے گا (پھر صمد خاں کی طرف دیکھ کر) اگر بے چاری عورت مجھے راستے میں اس قدر پریشان حال نہ ملتی تو میں اس طرف ہرگز نہ آتی۔

عادل: جاؤ صمد خاں۔ چائے لے آؤ۔

رخ روشن: جی نہیں شکریہ میں چائے پی کر گھر سے چلی تھی اور پھر مجھے گھر جانے کی بھی جلدی ہے۔

عادل: تھوڑی دیر آرام کر لیجیے۔ چائے پی کر چلی جایئے گا۔

رخ روشن: معاف کیجیے۔ (مسکرا کر) جب آپ لوگوں کا سنیاس کا وقت گزر جائے گا۔ پھر آپ کے ساتھ ضرور چائے پیوں گی۔ (کھڑے ہوکر) اس وقت تو مجھے اجازت دیجیے ابا جان گھر پہنچ گئے ہوں گے اور میرا انتظار کر رہے ہوں گے۔

نادر: صمد خاں! (رخ روشن کی طرف اشارہ کر کے) آپ کو گھر تک پہنچا آؤ۔

رخ روشن: جی نہیں شکریہ۔ (مسکرا کر) ایسا کیا دور ہے۔ میں چلی جاؤں گی۔

عادل: جی نہیں جنگل کا معاملہ ہے۔ جاؤ صمد خاں (رخ روشن اور صمد خاں چلے جاتے ہیں۔ کچھ دیر خاموش رہ کر) عجیب صاحبزادی ہیں۔

نادر: میں کہتا نہ تھا کہ بور ہوں گی۔

عادل: اور میں نہ کہتا تھا حسین ہوگی (کچھ دیر خاموش رہ کر) مگر ہمیں نوکر کے ساتھ اسے نہیں بھیجنا چاہیے تھا۔

نادر: (طنزیہ) اس لیے کہ اس نے تمھاری ناول کی تعریف کی تھی۔

عادل: اس لیے کہ چچا شہریار کہیں گے کہ لڑکی کو جنگل میں نوکر کے ساتھ بھیج دیا ذرا اخلاق سے گری ہوئی اور اے ٹی کیٹ کے خلاف بات ہے (کھڑے ہوکر) میں اسے گاؤں تک چھوڑ کر ابھی واپس آتا ہوں۔ (جواب کا انتظار کیے بغیر چلا جاتا ہے۔ کچھ دیر نادر خاموش کمرے میں ٹہلتا رہتا ہے پھر ایک دم بلند آواز سے)

نادر: عادل! ٹھہرو میں بھی آرہا ہوں۔ ہم رخ روشن کے ساتھ بیٹھ کر چائے پئیں گے۔ (کمرے سے چلا جاتا ہے)

(پردہ)

(مطبوعہ پگڈنڈی، امرت سر، 1960)

چھ سال بعد

افرادِ تمثیل

(1) جمیل (ایک نوجوان) (2) شکیل (جمیل کا باپ) (3) طاہرہ (جمیل کی ماں)
(4) اسد (جمیل کا دوست) (5) ایک بچہ اور ایک ملازمہ

منظر

ایک سجا ہوا ڈرائنگ روم۔ جمیل ایک صوفے پر بیٹھا ہے جب پردہ اٹھتا ہے تو طاہرہ ڈرائنگ روم میں داخل ہوتی ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ کسی کو رخصت کر کے کمرے میں دوبارہ آئی ہیں۔ جمیل انھیں دیکھ کر۔

جمیل: کیا یہ دبیر ماموں کی صاحب زادی تھیں۔

طاہرہ: اور تو کیا سمجھ رہا تھا۔ بھول گیا بچپن میں تیرے ساتھ کھیلا کرتی تھی۔

جمیل: میں تو سمجھا تھا کہ کسی فلم کا چلتا پھرتا اشتہار ہیں وہ تو خیریت ہوئی میں تو فلم کے بارے میں اس سے سوالات کرنے والا تھا۔

طاہرہ: (مسکرا کر) بہت شریر ہے۔ دبیر میاں کا خیال اس لڑکی کا تیرے لیے ہے۔

جمیل: میرے لیے! یعنی جمیل احمد ولد شکیل احمد قوم پٹھان پیشہ معماری۔

طاہرہ: کیا بے ہودگی ہے۔ کبھی تو سنجیدگی سے کچھ سن لیا کر معمار ہوں تیرے دشمن۔

جمیل: اب انگریزی میں تم مجھے انجینئر کہہ کر خوش ہوتی ہوتو ہولو۔ ورنہ پیشہ وہی ہے۔

طاہرہ: اچھا بتا اس لڑکی کے متعلق تیرا کیا خیال ہے۔

جمیل: امی! اگر تم یہ چاہتی ہو کہ میں وقت سے پہلے احمق ترین نظر آنے لگوں تو پھر سب ٹھیک ہے۔

طاہرہ: وقت سے پہلے احمق ترین! کیا مطلب؟

جمیل: (بے حد سنجیدگی سے) امی! شادی کے بعد انسان احمق نظر آتا ہے اور ایک دو بچے ہوجانے پر احمق ترین اگر کبھی میری ان صاحبزادی سے میرا مطلب ہے محترمہ سے شادی ہوگئی تو میرا اسٹیج احمق ترین سے شروع ہوگا۔ آگے کی ڈگریز خدا کے علم میں ہیں۔

طاہرہ: (غصہ سے) تو پھر تجھے تیرا باپ احمق ترین سے بھی کچھ زیادہ نظر آتا ہوگا۔ چار بچے ہیں نا اس کے۔

جمیل: (کسی قدر گھبرا کر) باپوں کے متعلق میں نہیں کہہ رہا ہوں میں تو موجودہ نسل کے بارے میں بات کررہا ہوں۔

طاہرہ: (بلند آواز سے) ارے سنتے ہو جی۔ ذرا یہاں تو آؤ تمھارے صاحب زادے تمھاری شان میں قصیدہ ارشاد فرما رہے ہیں۔

جمیل: ارے امی آپ تو مذاق کی بات کو۔

طاہرہ: (بات کاٹ کر) ہاں تیرے نزدیک یہ مذاق کی بات ہے۔

شکیل: (دوسرے کمرے سے آتے ہوئے) کیا بات ہے!

طاہرہ: (جمیل کی طرف دیکھ کر) کیوں یہ۔ (شکیل کی طرف اشارہ کرکے) تجھے احمق ترین نظر آتے ہیں۔ (شکیل احمد سے مخاطب ہوکر) کہہ رہا تھا کہ آدمی شادی ہونے کے بعد احمق اور بچے ہونے کے بعد احمق ترین نظر آتا ہے۔

شکیل: (صوفے پر بیٹھ کر) آج کل کی سعادت مند اولاد سے یہی توقع کی جا سکتی ہے کہ وہ اپنے والدین کو احمق اور ہونق کے خطابوں سے نوازے گی۔

جمیل: (کسی قدر شرمندہ ہوکر) ڈیڈی! امی تو بس ذرا سی بات کا بتنگڑ بنا دیتی ہیں۔

شکیل: میں دیکھ رہا ہوں کہ تم ہمیشہ اپنی شادی کی بات کو یونہی مذاق میں اڑا دیتے ہو۔ آخر تمھارا ارادہ کیا ہے۔ ماں باپ کا ایک فرض یہ بھی ہوتا ہے کہ وہ اپنی اولاد کو تعلیم دلوانے کے بعد اس کی کسی مناسب جگہ شادی بھی کردے۔

جمیل: تو کیا اس شادی کے لیے دبیر ماموں کی صاحبزادی ہی مناسب ہیں جو چلتا پھرتا کسی فلم کا اشتہار معلوم ہوتی ہیں۔

شکیل: مگر تمھیں آج تک کوئی لڑکی ہی پسند نہیں آئی۔ کیا خدا کو تمھارے لیے کوئی خاص الخاص مخلوق پیدا کرنا پڑے گی۔ جو تمھیں پسند آئے۔

جمیل: نہیں ایسی بات نہیں ہے۔

شکیل: تو پھر اور کیا بات ہے۔ تم اپنے پیشے میں دلچسپی نہیں لیتے۔ تمھاری صحت دن بدن خراب ہوتی جا رہی ہے۔ تم اس طرف بھی دھیان نہیں دے رہے ہو۔

طاہرہ: پیشے میں دلچسپی کیسے لے۔ اس حرامی بچے سے فرصت ملے تو کوئی کام کی بات سوچے۔

جمیل: امی! آخر اس معصوم ننھے بچے کو حرامی کہنے سے آپ کے کون سے جذبہ کی تسکین ہو جاتی ہے۔ یہ جانتے ہوئے کہ مجھے اس سے تکلیف ہوتی ہے۔

طاہرہ: تمھیں اس سے تکلیف کیوں ہوتی ہے۔

جمیل: اس لیے کہ اس بچے کا کوئی قصور نہیں ہے قصور اس مرد کا ہے جو خود کو اس بچے کا باپ کہتے ہوئے ڈرتا ہے۔

طاہرہ: اور وہ بھی تمھارا دوست تھا۔ چھ سال ہوگئے کہ اس منحوس نے اپنی شکل نہیں دکھلائی ایک حرامی بچہ اور ایک آوارہ عورت ہمارے سروں پر مسلط کر کے جانے کہاں غائب ہوگیا۔

جمیل: امی! اگر میں وہیر ماموں کی صاحب زادی سے شادی کرنے سے انکار کر رہا ہوں تو اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ آپ میرے دوست کو منحوس اور ایک معصوم بچے کو حرامی کہیں۔

شکیل: آخر یہ کیسا دوست ہے کہ تمھیں اس کا علم نہیں کہ وہ کہاں ہے کیا کرتا ہے اس نے کبھی یہ نہیں سوچا کہ تم اس کے بچے کی پرورش کر رہے ہو۔

طاہرہ: وہ تو پہلے ہی صورت سے لفنگا معلوم ہوتا تھا۔ ہزار بار تو میں نے اس کو سمجھایا کہ اس سے میل جول بڑھانا ٹھیک نہیں ہے (جمیل کی طرف دیکھ کر) کچھ پتا بھی ہے آخر وہ ہے کہاں۔

جمیل: اگر وہ اس دنیا میں ہے تو کبھی نہ کبھی پتا بھی چل جائے گا۔

طاہرہ: اور اگر وہ اس دنیا میں نہیں ہے تو پھر اس کے گناہوں کا بوجھ ہمارے کاندھوں پر رکھا رہے گا۔

جمیل: کوئی کسی کے گناہوں کا بوجھ نہیں اٹھاتا سب اپنا بوجھ اٹھاتے ہیں۔

شکیل: بہرحال جمیل میاں۔ ہم آپ سے مطمئن نہیں ہیں مجھے ذاتی طور پر اس عورت اور اس بچے سے کوئی غرض اور عداوت نہیں ہے مگر تمھیں یوں کاہل رہنے کے لیے تعلیم نہیں دلوائی ہے۔

جمیل: ڈیڈی! میں خود اکثر اس پر غور کرتا ہوں مگر جانے کیوں میں محسوس کرتا ہوں کہ اس دنیا میں میرا وجود فضول ہے۔

شکیل: اس لیے کہ تم کوئی کام نہیں کرتے۔ فضول خیالات تمھیں گھیرے رہتے ہیں۔ تم کام کرو پھر دیکھو تمھیں یہ دنیا کس قدر حسین نظر آنے لگتی ہے۔ (جمیل کچھ دیر خاموش بیٹھا رہتا ہے پھر اٹھ کر چلا جاتا ہے اس کے چہرے پر غم اور پریشانی کے آثار ہیں۔ شکیل طاہرہ کی طرف دیکھ کر) تم بلا وجہ اس کے پیچھے نہ پڑی رہا کرو۔ دیکھتی نہیں ہو کہ وہ کس قدر اداس اداس رہتا ہے۔ اس کی صحت بگڑتی جارہی ہے اور پھر اس پر تمھارے طعنے۔

طاہرہ: میں کہاں کے طعنے دیتی ہوں آخر اس بدذات عورت اور اس کے بچے کے لیے ہی کہتی ہوں مگر وہ تو ایسا برا مانتا ہے جیسے وہ اس کی کوئی عزیز لگتی ہو۔

شکیل: اگر اسے یہ بات بری لگتی ہے تو ہمیں اس کا ذکر ہی نہیں کرنا چاہیے۔ اور ہم دیکھ رہے ہیں کہ عورت بھی بری نہیں ہے مگر تم دن رات اس کے بھی پیچھے پڑی رہتی ہو۔

طاہرہ: تمھیں تو کوئی بھی برا نہیں لگتا ایک حرامی بچے کی ماں ہونا بڑی نیکی ہے۔

شکیل: لاحول ولا قوۃ۔ پھر وہی تمھیں لاکھ سمجھاؤ مگر تمھاری سمجھ میں نہیں آتا۔

طاہرہ: مجھے تو اس کا اس گھر میں رہنا ہی ایک نظر نہیں بھاتا آخر اس گھر میں ایک جوان لڑکی اور لڑکا ہے۔

شکیل: چھ سال سے وہ اس گھر میں ہے مگر تمھیں آج تک اس پر بھروسہ پیدا نہیں ہوا۔ نا سمجھی میں انسان سے غلطی ہو ہی جاتی ہے۔

طاہرہ: وہ تو بچے کا پھندا گلے میں پڑا ہے نہیں تو جانے اب تک کب کے ہزاروں گل کھلا چکی ہوتی۔ (کچھ دیر خاموش رہ کر) ہم نے اس منحوس اسد کو اپنی طلعت کے لیے پسند کیا تھا اچھا ہی ہوا کہ وقت سے پہلے سارے گن ظاہر ہوگئے نہیں تو ساری زندگی رونا پڑتا۔

شکیل: مجھے تو اب بھی یقین نہیں ہے کہ یہ بچہ اسد کا ہے جانے کیوں اس نے یہ بات کہہ دی ہے۔

طاہرہ: تمھیں تو کسی بات پر یقین نہیں آتا اس نے اپنے منہ سے اقرار کیا اور پھر کالا منہ کرکے چلا گیا اور آج تک شکل نہیں دکھلائی اس سے بڑا اور کیا ثبوت چاہتے ہو۔

(شکیل ٹھنڈی سانس بھر اس طرح خاموش ہوجاتے ہیں۔ جیسے اب اس مسئلے پر بحث کرنا فضول ہے کچھ دیر خاموش رہ کر)

شکیل: طلعت کہاں ہے؟

طاہرہ: اپنے کمرے میں ہوگی اور جائے گی کہاں۔اس لونڈیا نے اور دیوانہ بنا رکھا ہے۔

شکیل: ذرا جا کر ایک کپ چائے بھجوا دو اور اخبار بھی میں اس کمرے میں بھول آیا ہوں۔ (طاہرہ اٹھ کر دوسرے کمرے میں چلی جاتی ہیں۔شکیل خاموشی سے اپنا پائپ پینے لگتے ہیں۔تھوڑی دیر بعد ایک پانچ چھ سال کا لڑکا اخبار لے کر کمرے میں داخل ہوتا ہے۔شکیل اسے دیکھ کر مسکراتے ہوئے) ہونا مسٹر گنگل۔

بچہ: اب میرا نام گنگل نہیں ہے چغد البخارا ہے۔

شکیل: (قہقہہ مار کر) چغد البخارا۔بھئی یہ نام تمھارا کس نے رکھا ہے؟

بچہ: جمیل احمد ولد شکیل احمد قوم پٹھان پیشہ معماری نے۔

شکیل: (مسکرا کر) بھئی چغد البخارا تم اب کافی سمجھ دار ہوتے جا رہے ہو۔

بچہ: جی ہاں۔میں نے سوچا ہے کہ میں بھی اب موٹی موٹی کتابیں پڑھا کروں گا۔ طلعت باجی کی طرح۔

شکیل: اچھا۔(ہنستے ہیں) بھئی خوب ہو تم چغد البخارا (دروازے پر دستک) ذرا جا کر دیکھنا کون ہے۔

بچہ: (بچہ دروازے سے باہر جاتا ہے پھر واپس آکر) ایک صاحب جمیل احمد صاحب سے ملنا چاہتے ہیں۔

شکیل: انھیں اندر بلا لاؤ"

بچہ: (دروازہ کھول کر) آیئے اندر آیئے۔

(پولس کی وردی پہنے ہوئے ایک نوجوان داخل ہوتا ہے۔شکیل احمد اسے غور سے دیکھتے ہیں۔نوجوان قریب آکر)

نوجوان: شاید آپ مجھے پہچانے نہیں۔میں اسد ہوں۔

شکیل: (ایک دم کھڑے ہوکر) ارے اسد میاں۔(پھر غور سے اسے دیکھتے ہیں) آؤ آؤ۔۔ (ہاتھ ملا کر) ارے بھئی بیٹھو۔

اسد: جمیل کہاں ہے؟

شکیل: گھر ہی میں ہے (بچے کی طرف دیکھ کر) جاؤ چندا ابخارا ذرا جمیل میاں کو تو بلا لاؤ۔ (بچہ جاتا ہے۔ اسد اسے غور سے دیکھتا ہے۔ شکیل اسد کو دیکھ کر) تم اس بچے کو پہچانے؟

اسد: جی ہاں۔ اگر میں غلطی نہیں کر رہا ہوں تو—

شکیل: ہاں یہ وہی بچہ ہے جسے دیکھنے تم شاید چھ سال بعد آئے ہو۔ جمیل سے بہت مانوس ہے۔ ہم لوگوں نے بالکل اولاد کی طرح اس کی پرورش کی ہے۔

اسد: شکریہ!

شکیل: اس قدر لمبے عرصے تک تم کہاں غائب رہے ہم لوگوں کو تو جیسے بھول ہی گئے تھے۔

اسد: جی نہیں بھولا تو نہیں تھا مگر اس سے پہلے میں آ بھی نہیں سکتا تھا۔

شکیل: (اسد کو غور سے دیکھ کر) کیوں؟ (صوفے کی طرف اشارہ کرکے) ارے بیٹھو نا۔

اسد: (صوفے پر بیٹھتے ہوئے) اس واقعہ کے بعد اس گھر میں میری کوئی عزت نہیں رہی تھی۔ اور میں نے عہد کرلیا تھا کہ میں اب کچھ بن کر ہی اس دلیز پر قدم رکھوں گا۔ میں نے آئی۔ پی۔ ایس کا امتحان پاس کرلیا ہے۔

شکیل: مجھے یہ سن کر خوشی ہوئی۔ ورنہ ایسی ٹھوکر کھا کر بہت کم لوگ سنبھلتے ہیں۔

اسد: اگر انسان جی میں ٹھان لے تو کیا کچھ نہیں کرسکتا۔

شکیل: میں آج تم کو یوں دیکھ کر بہت خوش ہوا۔ ہم لوگوں کو تمھارے چلے جانے کا بہت افسوس تھا۔ طاہرہ تو تمھیں اکثر یاد کیا کرتی تھی—

اسد: یہ سب آپ لوگوں کی محبت اور دعائیں ہیں کہ میں کسی قابل بن سکا۔

شکیل: یہ تمھاری سعادت مندی ہے کہ تم اس طرح سوچتے ہو (جمیل کمرے میں آتا ہے۔ شکیل اسے دیکھ کر) ارے جمیل اسد میاں آئے ہیں۔ ہم آج ہی تو ان کا ذکر کر رہے تھے۔

(اسد کھڑا ہو جاتا ہے اور جمیل کے پاس آتا ہے دونوں ایک دوسرے کو دیکھتے ہیں۔ اسد دونوں ہاتھ پھیلا کر)

اسد: کیا مجھ سے گلے نہیں ملو گے۔ (خود ہی جمیل کو اپنی باہوں میں لے لیتا ہے۔ پھر کچھ دیر بعد اسے چھوڑ کر کچھ بیمار ہو؟ کیا بات ہے؟

جمیل: (خود پر قابو پا کر) نہیں نہیں میں بالکل اچھا ہوں تندرست ہوں (صوفے کی طرف اشارہ کرکے) بیٹھو نا کھڑے کیوں ہو۔ (چہرے پر مصنوعی خوش مذاقی پیدا کرتے ہوئے۔ اسد کے لباس کی طرف اشارہ کرکے) تمھیں اس ہیئت میں دیکھ کر کچھ ڈر سا معلوم ہو رہا ہے۔

اسد: ہاں ابھی چچا میاں بھی حیرت زدہ رہ گئے تھے۔ چچی جان کہاں ہیں؟ ارے بھئی بیٹھو نا— تین چار دن کی چھٹی بڑی مشکل سے ملی اس لیے ادھر چلا آیا تم لوگوں کی یاد بہت ستا رہی تھی۔

جمیل: (بیٹھتے ہوئے چہرے پر مصنوعی مسکراہٹ پیدا کرتے ہوئے) بہت جلدی یاد ستانے لگی تھی۔

اسد: ارے بھئی انسان کی کچھ مجبوریاں ہوتی ہیں— خیر چھوڑو— میں ایک ضروری کام سے آیا ہوں—اماں چائے وائے کا پوچھو— (مسکرا کر) ان دنوں تم کافی بداخلاق نظر آرہے ہو۔

شکیل: (کھڑے ہوکر) میں تمھارے لیے چائے بھجواتا ہوں۔

اسد: آپ کیوں تکلیف کرتے ہیں۔ وہ تو میں جمیل احمد خان سے کہہ رہا تھا آپ دیکھیے نا کس قدر کنجوس ہو گیا ہے۔

شکیل: نہیں نہیں کوئی بات نہیں۔ تم بیٹھو۔ کھڑے کیوں ہو۔ (دروازے کی طرف جاتے ہوئے) ابھی تو کچھ دن ٹھہرو گے؟

اسد: جی نہیں۔ مجھے آج ہی واپس جانا ہے۔

شکیل: یہ کیسے ہوسکتا ہے۔ بھئی کچھ دن تو ٹھہرنا ہی ہوگا۔

اسد: آپ جانتے ہیں نوکری کا معاملہ ہے ورنہ میں آپ کا حکم کیسے ٹال سکتا تھا۔

شکیل: نہیں نہیں ہم نہیں جانے دیں گے۔

(کمرے سے چلے جاتے ہیں۔ اسد جمیل کو غور سے دیکھ کر جو کسی گہرے سوچ میں سر جھکائے بیٹھا ہے)

اسد: ارے بھئی کیا سوچ رہے ہو (جمیل نظر اٹھا کر دیکھتا ہے) تم تو کافی بدل گئے ہو۔ تمھاری وہ پہلی سی صحت کیا ہوئی۔

جمیل: صحت تو ٹھیک ہے مگر— (خاموش ہوجاتا ہے۔ اسد اسے سوالیہ نظروں سے دیکھتا ہے۔ جمیل کچھ دیر بعد) میری روح میں گھن لگ چکا ہے۔ مجھے خود سے نفرت ہوگئی ہے۔

اسد: ارے واہ یہ مہاتماؤں کی سی باتیں کب سے کرنے لگے۔

جمیل: مذاق نہ اڑاؤ اسد۔ میں جس اذیت میں مبتلا ہوں تم اس کا تصور بھی نہیں کرسکتے۔ میں اپنی بہن کی خوشیوں کا قاتل ہوں اپنے ماں باپ کی تمناؤں اور آرزوؤں کا قاتل ہوں۔

اسد: (کچھ دیر خاموش رہ کر) جمیل! اس بچے اور اس کی ماں کے یہاں رہنے سے تمھیں تکلیف ہے اور آج میں یہ ارادہ کرکے یہاں آیا ہوں کہ ان دونوں کو اپنے ساتھ لے جاؤں۔

جمیل: تاکہ ایک معصوم کی امید کا آخری سہارا بھی ٹوٹ جائے (اسد حیرت سے جمیل کو دیکھتا ہے) اسد! یہ مجھ سے پوشیدہ نہیں ہے کہ طلعت کیوں بار بار شادی سے انکار کررہی ہے اور فضول امتحانات پاس کرنے میں اپنا وقت ضائع کررہی ہے۔

اسد: (ایک صوفے پر بیٹھ کر سوچتے ہوئے) تو کیا ابھی طلعت کی شادی نہیں ہوئی؟

جمیل: (نفی میں سر ہلاتے ہوئے) نہیں— اور شاید وہ (خاموش ہوجاتا ہے پھر کچھ دیر بعد) آخر تم یوں روپوش کیوں ہوگئے تھے۔

اسد: پھر کھڑا ہوتا ہے اور کھڑکی کے پاس جاکر اس میں سے باہر دیکھتے ہوئے) اور اس کے علاوہ چارہ بھی کیا تھا۔ (پلٹ کر جمیل کو دیکھ کر) میں بدنام ہو چکا تھا کسی بھی شریف گھر کے دروازے میرے لیے کھلے نہیں رہ سکتے تھے۔

جمیل: گھر کے دروازے بند ہو جانے سے دل کے دروازے بند نہیں ہو جایا کرتے۔

اسد: میں تو یہ سوچ کر آیا تھا کہ اب تک طلعت کی شادی ہو گئی ہوگی وہ مجھے بھول بھی گئی ہوگی۔

جمیل: تو پھر اب یہاں کیوں آئے ہو۔

اسد: میں تو صرف اس بچے اور اس کی ماں کو۔۔۔

جمیل: اور تم انھیں نہیں لے جاسکتے۔

اسد: کیوں نہیں لے جاسکتا؟

جمیل: اس لیے کہ اب انھیں یہاں رہنا ہے۔

اسد: لیکن جمیل کہاں تک؟ جو ذمہ داری انسان وہ قبول کرتا ہے اُسے پوری بھی کرنا چاہیے۔

جمیل: یہ بہت آدرش وادی باتیں ہیں۔ لیکن اس انسان کا سوچو، جو روحانی اذیت میں مبتلا ہے جس کی راتوں کی نیند حرام ہو چکی ہے۔ چھ سال کی مسلسل اذیت نے مجھے اب بزدل نہیں رکھا ہے۔

(ملازمہ چائے لے کر داخل ہوتی ہے۔ اسد اسے دیکھتا ہے ملازمہ نظریں جھکا لیتی ہے اور چائے میز پر رکھ دیتی ہے اس کے پیچھے پیچھے طاہرہ داخل ہوتی ہے اور اسد کو دیکھ کر)

طاہرہ: ارے بیٹا کب آئے؟

جمیل: (سلام کر کے) ابھی حاضر ہوا ہوں۔ آپ کا مزاج کیسا ہے۔

طاہرہ: بس جی رہے ہیں بیٹا۔ یہ چھ سال بعد ادھر کیسے بھول پڑے۔

اسد: میں نے سوچا میری جو ذمہ داری آپ کے سر پڑی ہوئی ہے اسے کہاں تک

آپ کے سر پر ڈالے رکھوں۔ آپ کو بڑی تکلیف ہوئی ہوگی۔ (ملازمہ کی طرف اشارہ کرکے) میں ان دونوں ماں اور بیٹے کو لینے آیا ہوں۔

جمیل: مگر۔۔۔

اسد: میں اس وقت اس پوزیشن میں نہیں تھا مگر اب اس پوزیشن میں ہوں کہ ان کو لے جاسکوں۔

طاہرہ: ٹھیک ہے۔ چھ سال بعد خیال آیا مگر آیا تو۔

جمیل: امی یہ غلط ہے۔ یہ انھیں نہیں لے جاسکتا۔

طاہرہ: کیوں غلط ہے۔ کیوں نہیں لے جاسکتا۔

جمیل: اس لیے کہ۔۔۔ اس لیے کہ۔۔۔ مگر طلعت کا کیا ہوگا وہ اس سے محبت کرتی ہے اور اسی لیے وہ اب تک شادی سے انکار کرتی رہی ہے۔

اسد: اب وقت گزر چکا ہے جمیل۔ وقت کے ساتھ حالات اور خیالات بھی بدل جاتے ہیں اور پھر میں تو یہ سوچ کر آیا تھا کہ اب اس کی شادی ہوچکی ہوگی۔ وہ مجھے بھول چکی ہوگی۔ (ملازمہ کی طرف دیکھ کر) تم چلنے کی تیاری کرو۔ ہم آج ہی گاڑی سے لوٹ چلیں گے۔

جمیل: یہ نہیں ہوسکتا۔ تم اسے نہیں لے جاسکتے۔

طاہرہ: واہ واہ یہ بھی خوب زبردستی ہے۔

جمیل: ہاں زبردستی ہے۔ چھ سال کی روحانی اذیت نے مجھے بزدل نہیں رکھا ہے امی! یہ بچہ اس کا نہیں ہے یہ جب بھی جھوٹ بولا تھا اور اب بھی جھوٹ بول رہا ہے۔

طاہرہ: کیا کہہ رہا ہے تو۔

جمیل: یہ بچہ اس کا نہیں ہے۔ اب مجھ سے طلعت کا غم نہیں دیکھا جاتا۔

طاہرہ: مگر یہ خود اس کا اقبال کرچکا ہے۔

جمیل: ہاں ہاں یہ لاکھ بار اس کا اعتراف کرے مگر یہ بچہ اس کا نہیں ہے اس وقت

اس نے صرف میری خاطر یہ الزام اپنے سر لے لیا تھا کہ میری اور میرے خاندان کی بے عزتی نہ ہو— امی! خدا کی قسم یہ بچہ میرا ہے۔

اسد: جمیل خدا کے لیے—

جمیل: بس اسد بہت ہو چکا۔ اب بھی اگر میں چپ رہا تو پاگل ہو جاؤں گا۔

(طاہرہ حیرت سے دونوں کو دیکھتی ہے۔ دونوں خاموش کھڑے رہتے ہیں۔ ملازمہ کمرے سے چلی جاتی ہے اور باہر اس کی آواز سنائی دیتی ہے— طلعت بی بی اسد میاں آئے ہیں۔“)

(پردہ)

(مطبوعہ پگڈنڈی، امرت سر، اکتوبر 1966)

دم خم

افرادِ تمثیل

(1) ارشد (ایک مالدار) (2) نگار (ارشد کی بیٹی) (3) خالدہ (ارشد کی بیوی) (4) اسرار (نگار کا منگیتر) (5) رحمت بی (ایک بوڑھی عورت)

منظر

ایک دیہاتی مکان کا سجا ہوا کمرہ۔ جب پردہ اٹھتا ہے تو نگار اور ارشد بیٹھے ہوئے نظر آتے ہیں جو کسی مسئلے پر بہت دیر سے گفتگو کر رہے ہیں۔

نگار: مگر پاپا آپ کو اصغر کا قرض معاف کر دینا چاہیے۔

ارشد: لیکن کیوں؟

نگار: اگر آپ نے اس کا قرض معاف نہیں کیا تو اس کا مکان نیلام ہو جائے گا پھر وہ بے چارہ کہاں مارا مارا پھرے گا۔

ارشد: ہم نے ٹھیکا لیا ہے اس کے رہنے سہنے کا؟ اس نے قرض لیا ہے تو اسے ادا کرنا چاہیے۔

نگار: مگر اس کا ہم پر کس قدر بڑا احسان ہے اگر وہ اس دن اپنی جان خطرے میں نہ ڈالتا تو کیا میں آج اس دنیا میں موجود ہوتی۔

ارشد: میں نے اسی وقت اس کو پچیس روپے انعام دے دیا تھا۔

نگار: میری جان کی قیمت آپ کے نزدیک صرف پچیس روپے ہے۔

ارشد: اور میں نے تمھارے کہنے سے سارا سود بھی معاف کردیا ہے۔

نگار: مگر پاپا یہ بھی تو سوچیے کہ اس کا روپیہ مجھے بچانے ہی میں بہہ گیا۔

ارشد: یہ سب جھوٹ اور بکواس ہے۔ گڑھی ہوئی کہانی ہے۔ اگر اس کے پاس روپیہ تھا تو اسے ادا کردینا چاہیے تھا۔

نگار: پاپا! مجھے اچھی طرح معلوم ہے کہ اس نے تین سال میں پائی پائی کرکے یہ روپیہ جمع کیا تھا کہ آپ کا قرض ادا کردے اس نے خود کم کھایا اپنے بچوں کو کم کھلایا آپ اس پر ظلم کررہے ہیں۔

ارشد: اگر ہم اس طرح ہمدردی کرتے رہے تو ایک دن کوئی ہمارا مکان قرق کراکر نیلام کرادے گا۔

نگار: اچھا ہوتا کہ میں دریا میں بہہ گئی ہوتی۔ مجھے بچانے کے لیے اس بے چارے کا روپیہ تو ضائع نہ ہوتا۔ (ارشد خاموش رہتے ہیں نگار اٹھ کر ٹہلنے لگتی ہے پھر کچھ سوچ کر ارشد کے پاس آکر) پاپا! آپ میرا ایک سال کا جیب خرچ اس کے حساب میں لکھ لیجیے میں ایک سال تک جیب خرچ نہیں لوں گی۔ اس بے چارے پر رحم کیجیے۔

ارشد: (غصہ سے) زیادہ بحث نہ کرو، اپنے کمرے میں جاؤ میں اپنا ہی جوتا اپنے ہی سر کرنے کا عادی نہیں ہوں۔

نگار: جب تک میں اُس کا قرض معاف نہیں کرالوں گی ہرگز نہیں جاؤں گی۔

ارشد: (غصہ سے اٹھ کر دوسرے کمرے کی طرف جاتے ہوئے) تو لو۔ میں خود ہی چلا جاتا ہوں۔

(دوسرے کمرے میں چلے جاتے ہیں۔ نگار غصہ سے کمرے میں ٹہلنے لگتی ہے۔ کچھ دیر بعد اسرار کمرے میں آ کر)

اسرار: نصیب دشمناں سنا ہے آپ پانی میں گر گئی تھیں۔

نگار: جی ہاں۔

اسرار: مجھے تو آج صبح ہی پتا چلا فوراً دوڑا دوڑا چلا آ رہا ہوں۔ کیا کوئی بہت ہی سنجیدہ شکل تھی۔

نگار: (طنزیہ) جی نہیں ویسے ہی تقریباً دو چار غوطے کھا لیے تھے۔ دریا میں طغیانی آئی ہوئی تھی اور میں اس کی روانی دیکھنے کے لیے ذرا اس دھار تک چلی گئی تھی۔

اسرار: (غور سے نگار کا چہرہ دیکھ کر) آپ اس وقت کچھ زیادہ غصہ میں ہیں۔ میں تو آپ کی خیریت پوچھنے پچاس میل سے دوڑا چلا آ رہا ہوں۔

نگار: جب آپ کو معلوم ہو گیا تھا کہ میں سلامت ہوں تو آپ نے بلا وجہ تکلیف کی۔

اسرار: تکلیف! تکلیف کیسی؟ جونہی میں نے اس حادثہ کے متعلق سنا میرے پاؤں تلے کی زمین نکل گئی۔

نگار: یا پاپا کے ہاتھ آئی ہوئی دولت نکلی جا رہی تھی۔

اسرار: آج تو آپ جانے کیسی باتیں کر رہی ہیں۔ (مسکرا کر) اگر میں نہ آتا تو آپ ادھر شکایت کرتیں۔

نگار: میں کوئی شکایت نہیں کرتی۔ پاپا لائبریری میں ہوں گے۔ آپ اُن سے جا کر مل لیجیے اُنہیں آپ سے مل کر خوشی ہو گی۔

اسرار: لیکن اس سے پہلے تو آپ بھی خوش ہوا کرتی تھیں۔

نگار: ہوا کرتی ہوں گی مگر اب نہیں ہوں گی۔

اسرار: (ہنس کر) آپ تو جانے کس کا غصہ مجھ پر اتار رہی ہیں (دوسرے کمرے کی طرف جاتے ہوئے) لیجیے میں چلا جاتا ہوں۔

(اسرار دوسرے کمرے میں چلا جاتا ہے۔ نگار پھر کمرے میں ٹہلنے لگتی ہے۔ کچھ دیر بعد خالدہ کمرے میں آکر)

خالدہ: اسرار آیا ہے تم اس سے مل لیں۔

نگار: مل لی۔ کیا اب ان کے ہر راستے پر آنکھیں بچھاتی پھروں۔

خالدہ: (غصہ سے) تیرا دماغ تو خراب نہیں ہو گیا ہے۔ وہ شکایت کر رہا ہے کہ تو اس کے ساتھ انتہائی بد اخلاقی سے پیش آئی۔

نگار: اگر ان کو اس قدر اخلاق کا خیال ہے تو پھر نہ آیا کریں۔ میں ان کی خوشامد کرنے نہیں گئی تھی کہ وہ میری خیریت دریافت کرنے تشریف لائیں۔

خالدہ: وہ تیرا منگیتر ہے تجھے اس کے ساتھ اخلاق سے پیش آنا چاہیے۔

نگار: وہ میرے منگیتر نہیں پاپا کی دولت کے منگیتر ہیں۔

خالدہ: وہ ایسا ننگا بھوکا نہیں ہے کہ دولت کے لیے تجھے چاہتا ہو۔ خدا کا دیا اس کے یہاں سب کچھ ہے۔

نگار: اور وہ اسی خدا کے دیے سب کچھ میں بندوں کا دیا ہوا بھی جوڑ لینا چاہتے ہیں۔ میں ان سے شادی نہیں کروں گی۔

خالدہ: شادی نہیں کرے گی!

نگار: ہاں نہ ان سے اور نہ کسی اور سے (اسرار پھر کمرے میں آتا ہے۔ نگار اس کی آمد پر دھیان نہ دے کر اسی لہجہ میں) میں پاپا کی دولت شادی کے بے جا مصارف سے بچانا چاہتی ہوں۔

اسرار: اگر آپ کو مجھ سے شادی کرنا نہیں تھا تو یہ محبت کا ناٹک کیوں کھیلا جا رہا تھا۔

نگار: (اسرار کو غصہ سے دیکھ کر) اس لیے کہ آپ بھی ایسا ہی ڈھونگ رچا رہے تھے۔

اسرار: میری محبت ڈھونگ رچانا ہے؟

نگار: اگر میری محبت 'محبت کا ناٹک' ہے تو آپ کی محبت بھی ڈھونگ رچانا ہے۔

اسرار: اگر مجھے یہ معلوم ہوتا کہ تم میری محبت کو ڈھونگ سمجھتی ہو تو میں کبھی بھی تم سے

محبت نہیں کرتا۔

نگار: اگر میں یہ سمجھتی کہ تم میری محبت کو ناٹک سمجھتے ہو تو میں تمھاری طرف نظر اٹھا کر بھی نہیں دیکھتی۔

خالدہ: (اسرار سے) بیٹا! تو اپنے خالو کے پاس جا۔ اس لونڈیا کا تو آج صبح ہی سے دماغ خراب ہو رہا ہے۔

اسرار: مگر خالہ جان آپ دیکھ رہی ہیں کہ نگار نے میری کس قدر توہین کی ہے۔

نگار: اور آپ نے تو میری وہ عزت فرمائی ہے کہ میری سات پشتیں آپ کے بار احسان سے دبی رہیں گی۔

خالدہ: اب تو چپ بھی ہوگی یا نہیں (اسرار سے) اپنے خالو جان کے پاس جا اس کی بات کا برا نہ ماننا۔

اسرار: (کسی قدر نرم لہجے میں) آپ ہی سوچیے خالہ جان اگر مجھے نگار کا خیال نہ ہوتا تو میں یوں پچاس میل سے دوڑا دوڑا کیوں آتا۔ (پھر دوسرے کمرے کی طرف جاتے ہوئے) آپ کی بزرگی اور شفقت کا خیال آتا ہے۔ ورنہ—

نگار: ورنہ آپ میرے لیے توپ لگا دیتے۔

خالدہ: اب تو چپ بھی رہے گی یا میری جان کی خواہاں ہے (اسرار دوسرے کمرے میں چلا جاتا ہے۔ خالدہ نگار کی طرف دیکھ کر) آج کی تیری بدتمیزی نے میری زندگی آدھی کردی ہے۔

نگار: (بہت ہی افسردہ لہجہ میں) ممی! اس گھر میں کسی کی جان کی قیمت ہی کیا ہے اس گھر میں تو روپیہ ہی زندگی ہے اور روپیہ ہی خدا— یہاں تو پانچ چھ سو روپے بھی اکلوتی لڑکی کی جان سے زیادہ قیمتی ہیں۔

خالدہ: لیکن انھوں نے کب تیری کس خواہش کو پورا کرنے سے انکار کیا ہے۔

نگار: تو کیا وہ میری خاطر اصغر کے قرض کے پانچ چھ سو روپے معاف نہیں کرسکتے

جس نے میری جان بچانے کے لیے اپنی جان کی بازی لگا دی تھی۔

خالدہ: اس میں سوال پانچ چھ سو روپے کا نہیں ہے۔ اصول کا سوال ہے اور تو جانتی ہے کہ تیرے پاپا اپنے اصولوں کے کس قدر سختی سے پابند ہیں۔

نگار: (طنزیہ لہجہ میں) میں خوب جانتی ہوں پاپا کی اصول پرستی۔ ''میں کسی کے گھر خوشامد کرنے نہیں جاتا۔'' ابھی ایک مقدمہ آن پڑا تھا تو سرکاری حکام کے گھروں کے ہزاروں چکر لگائے تھے معمولی معمولی کلرکوں کو بھی جھک جھک کر سات سلام کرتے تھے (ٹھنڈی سانس بھر کر) مجھ سے اصغر کے بیوی بچوں اور اس کی بوڑھی ماں کی اداسی نہیں دیکھی جاتی نہ وہ مجھ کو بچانے کے لیے۔ دریا میں کودتا اور نہ اس پر یہ مصیبت پڑتی۔

خالدہ: یہ گڑھی ہوئی کہانی ہے کہ اس کی جیب میں نوٹ تھے جب وہ دریا میں کودا۔ دو دن فاقے کرتے ہوئے تو ہم نے اس کے گھر والوں کو اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔

نگار: اور یونہی فاقے کرکے اس نے پاپا کا قرض چکانے کے لیے روپیہ جمع کیا تھا۔ کاش میں ڈوب کر مر گئی ہوتی۔

خالدہ: مریں تیرے دشمن۔ ایسی منحوس بات زبان پر نہ لایا کر۔

نگار: آج مجھے اپنے آپ سے شرم آ رہی ہے۔ امی۔ مجھے اپنی زندگی سے نفرت ہوگئی ہے کاش کہ میں اس دنیا میں پیدا ہی نہیں ہوئی ہوتی۔

خالدہ: اچھا اب تو جا کر منہ ہاتھ دھولے صبح سے کچھ کھایا پیا نہیں ہے۔ جا کر کچھ کھا پی لے میں تیرے پاپا سے کہوں گی۔

نگار: (طنزیہ) تم بھی کہہ کر دیکھ لو۔ میں تو کہہ کر بے عزت ہوگئی اب تم کو شوق ہے تم بھی بے عزت ہولو۔

خالدہ: اچھا ابھی تو تو جا۔ (نگار خاموشی سے کمرے سے چلی جاتی ہے خالدہ کچھ دیر کھڑی سوچتی رہتی ہے پھر دوسرے کمرے کے دروازے کے پاس جا کر)

21

ارے سنتے ہو جی۔ ذرا ادھر آنا۔ (کچھ دیر بعد ارشد آتے ہیں اُن کے چہرے سے معلوم ہوتا ہے کہ غصہ میں ہیں۔ خالدہ ان کا چہرہ دیکھ کر) اسرار کہاں ہے؟

ارشد: لائبریری میں ہے اور شرمندہ ہے کہ وہ اس منحوس مکان میں کیوں آیا۔ آخر یہ صاحب زادی کے دماغ میں کون سا فتور پیدا ہوگیا ہے۔

خالدہ: بات دراصل یہ ہے کہ —

ارشد: (بات کاٹ کر) بس رہنے دیجیے اس کی وکالت میں سب کچھ سن چکا ہوں۔

خالدہ: پانچ چھ سو روپے کی بات ہی کیا ہے چھوڑیئے وہ بھی خوش ہوجائے گی۔

ارشد: میں اس کی خوشی کے لیے اپنا اصول نہیں چھوڑ سکتا جس کو روپیہ دیا ہے اس سے ضرور وصول کروں گا۔

خالدہ: ابھی آپ نے اس کے بچنے کی خوشی میں جشن کرڈالا اور روپیہ پانی کی طرح بہا دیا۔ سمجھ لیجیے گا کہ جہاں اتنا روپیہ خرچ ہوا وہاں پانچ چھ سو اور خرچ ہوگیا۔

ارشد: لین دین میں سمجھ لینا اور فرض کرلینا کچھ نہیں ہوتا اور اب تو سوال صاحب زادی کی ضد کا ہے اور میں ان کی ضد کے آگے جھکنے والا نہیں۔

خالدہ: ضد وہ نہیں کررہی ہے آپ کررہے ہیں۔ وہ حق پر ہے۔

ارشد: اور میں ناحق پر ہوں۔ نگار کی ماں! میں جو دل میں ٹھان لیتا ہوں اس کو پورا کرکے رہتا ہوں۔ میں یہ روپیہ ضرور وصول کرکے رہوں گا۔

خالدہ: چاہے لونڈیا گھٹ گھٹ کر جان دے دے؟

ارشد: ایک مرتبہ نہیں ہزار مرتبہ میں سمجھ لوں گا کہ میرے یہاں کوئی اولاد پیدا ہی نہیں ہوئی تھی۔

خالدہ: (غصہ سے) تو پھر تم کو اپنی اولاد سے نہیں روپیہ سے زیادہ پیار ہے۔

ارشد: یونہی سمجھ لو۔ اور تم جو اس کی وکالت کررہی ہو مجھے یہ بھی پسند نہیں ہے۔

خالدہ: تمھیں تو کچھ بھی پسند نہیں ہے اپنی اولاد پسند نہیں ہے اپنی بیوی پسند نہیں ہے۔

ارشد: ہاں اگر تم یونہی اس کی وکالت کرتی رہیں تو تم بھی پسند نہیں ہو۔

خالدہ: لیکن گاؤں میں تمھارے اس رویے سے بے چینی ہے اصغر سے سب کو ہمدردی ہے۔

ارشد: تو وہ مجھ سے نفرت کرنے لگیں۔ مجھے اس کی بھی پرواہ نہیں (دوسرے کمرے کی طرف جاتے ہوئے) روپیہ وصول ہوگا اور ہوکر رہے گا۔ آپ بھی کان کھول کر سن لیجیے۔

(دوسرے کمرے میں چلے جاتے ہیں۔ خالدہ خاموش کھڑی رہتی ہے پھر جانے کے لیے مڑتی ہے کہ اسرار کمرے میں داخل ہوتا ہے خالدہ اسے دیکھ کر)

خالدہ: کیوں بیٹا کہاں چل دیئے۔

اسرار: (غمگین لہجے میں) آپ سے اجازت لینے آیا ہوں۔

خالدہ: ایسی کیا جلدی ہے کل چلے جانا۔

اسرار: اس گھر کا جو ماحول ہے اس سے مجھے گھٹن ہونے لگی ہے اور نگار کا رویہ میرے لیے ناقابلِ برداشت رہا ہے۔

خالدہ: مگر بیٹا۔

اسرار: میں خود پر لعنت بھیج رہا ہوں کہ میں اس قدر خلوص سے نگار کے پاس کیوں آیا۔

خالدہ: غصہ میں اس کی زبان سے کچھ الٹی سیدھی باتیں نکل گئی ہیں غصہ کی بات کا برا نہیں مانتے۔

اسرار: خالہ جان! قسم ہے پاک پروردگار کی اگر کسی اور نے مجھ سے اس قسم کا برتاؤ کیا ہوتا تو اس کی جان لے لیتا اپنی جان دے دیتا۔

خالدہ: تم تو سمجھدار ہو پڑھے لکھے ہو۔ تمھارے خالو جان کے برتاؤ سے وہ چڑچڑی سی ہو رہی ہے اسے معاف کر دو۔

اسرار: میں نے تو اس کا کچھ نہیں بگاڑا تھا اور یہ عجیب منطق ہے کہ غصہ تھا کسی اور پر اور اتارا گیا مجھ پر — گویا میں صدقہ کا بکرا تھا کہ آؤ دیکھا نہ تاؤ بس رگید

دیا گیا۔ اب تو آپ مجھے اجازت دیجیے۔

خالدہ: نہیں میں تم کو ہرگز نہیں جانے دوں گی۔ (ایک بوڑھی عورت لکڑی ٹیکتے ہوئے کمرے میں داخل ہوتی ہے خالدہ اسے دیکھ کر) آیئے آیئے رحمت بی (رحمت بی کا ہاتھ پکڑ کر ایک صوفے پر بٹھلاتی ہے اور اسرار کی طرف دیکھ کر) بیٹا ماں جی کو سلام کرو ان کی دعاؤں میں بڑی برکت ہے۔ انھوں نے زندگی میں سات حج کیے ہیں۔ گاؤں بھر کی ماں جی ہیں بڑی عزت ہے ان کی گاؤں والوں کی نظر میں۔ سو سال سے زیادہ عمر ہے (اسرار جھک کر رحمت بی کو سلام کرتا ہے۔ رحمت بی چشمے میں سے اُسے غور سے دیکھتی ہیں۔) یہ اپنی نگار کا منگیتر ہے۔ میری بہن کا لڑکا۔

رحمت بی: جگ جگ جیو۔ (پھر چشمے میں سے اسے غور سے دیکھ کر) اب سوجھائی تو دیتا نہیں۔ (خالدہ اسرار کو اشارہ کرتی ہے کہ وہ رحمت بی کے پاس آجائے۔ اسرار رحمت بی کے پاس آجاتا ہے رحمت بی اس کے سر پر ہاتھ پھیر کر) خدا سلامت رکھے (ہاتھ پکڑ کر اپنے پاس بٹھلاتے ہوئے) جوڑا ہرا بھرا رہے۔

خالدہ: آج کیسے نکل پڑیں (رحمت بی اس کی طرف ایسے دیکھتی ہیں جیسے سنا نہ ہو خالدہ قریب آکر زور سے) آج کیسے نکل پڑیں (اسرار کی طرف دیکھ کر) برسوں ہی میں گھر سے نکلتی ہیں۔

رحمت بی: اب تو کانوں سے بھی اونچا سننے لگی ہوں۔ ارشد میاں کہاں ہیں ذرا ان سے ملنا تھا۔

خالدہ: گھر پر ہی ہیں (کانوں کے پاس منہ لے جا کر) بلاؤں ان کو رحمت بی اثبات میں سر ہلاتی ہیں۔ خالدہ دوسرے کمرے کے دروازے کے پاس جا کر) رحمت بی آپ سے ملنے آئی ہیں۔

رحمت بی: (پھر اسرار کے سر پر ہاتھ پھیر کر) اچھے تو ہو بیٹا۔

اسرار: (رحمت بی کے کان کے پاس منہ لے جا کر) آپ کی دعا ہے۔

رحمت بی: (کمرے میں چاروں طرف دیکھنے کی کوشش کرتے ہوئے) خالدہ بی بی کہاں چل دیں۔

خالدہ: (ان کے پاس آکر) یہ ہوں ماں جی۔

رحمت بی: بٹیا کہاں ہے۔

خالدہ: اپنے کمرے میں ہے (رحمت بی پھر اپنا کان اس کی طرف بڑھاتی ہیں۔ خالدہ کان کے پاس منہ لے جاکر) اپنے کمرے میں بلاؤں آپ کے پاس۔

رحمت بی: کئی سال سے نہیں دیکھا۔ اب تو ماشاء اللہ سیانی ہوگئی ہوگی۔

(ارشد کمرے میں آتے ہیں اور رحمت بی کے پاس جاکر)

ارشد: رحمت بی آداب (رحمت بی ان کی طرف دیکھتی ہیں اور کان بڑھاتی ہیں ارشد بلند آواز سے) میں سلام عرض کر رہا ہوں۔

رحمت بی: جگ جگ جیو ارشد میاں۔ (اپنا ہاتھ اونچا کرتی ہیں۔ ارشد سر نیچا کر لیتے ہیں۔ ان کے سر پر ہاتھ پھیر کر) اچھے تو ہو۔

ارشد: جی ہاں مہربانی ہے آپ کی۔ (سامنے ایک کرسی پر بیٹھ کر) کہیے کیسے تکلیف کی آپ نے۔ مجھے بلا لیا ہوتا اپنے گھر پر۔

رحمت بی: ایک کام سے آگئی تھی۔

ارشد: فرمایئے۔

رحمت بی: اصغر کو کچھ دن کی مہلت دے دو۔ خدا تمھیں اس کا اجر دے گا۔

ارشد: میں پانچ سال سے تو برابر مہلت دے رہا ہوں۔

رحمت بی: کچھ دن اور سہی۔ اب تمھیں تو اس کے گھر کا حال معلوم ہے اگر اس کا گھر نیلام پر چڑھ گیا تو بے چارہ کہاں مارا مارا پھرے گا۔ چھوٹے چھوٹے بچے ہیں۔

ارشد: اب آپ ہی سوچیے کہاں تک مہلت دی جائے۔ جب ادا نہیں کر سکتا تھا تو قرض ہی کیوں لیا تھا۔

رحمت بی: کنواری بہن کو کیسے گھر میں بٹھائے رکھ سکتا تھا۔

ارشد: اس سے کس نے کہا تھا کہ رئیسوں کی طرح شادی میں ٹھاٹ جمائے۔

رحمت بی: کہاں کے ٹھاٹ جمائے تھے بے چارے نے۔ فاقے کرکے اور ننگے رہ کے کوڑی کوڑی جمع کی تھی کہ تمھارا قرض ادا کردے مگر خدا کو منظور نہیں تھا۔

ارشد: ماں جی! آپ بھی اس کی باتوں میں آگئیں۔ ایک نمبر کا جھوٹا اور لفنگا ہے۔

رحمت بی: اب جھوٹا ہو یا لفنگا۔ میاں تم تو اسے کارِ خیر سمجھو۔

ارشد: اب کارِ خیر میں خود تو ننگا ہونا ہے نہیں۔ آخر میری بھی ضروریات ہیں۔

رحمت بی: خدا تمھاری ضروریات تو پوری کرتا ہی رہتا ہے۔ تم بندوں پر احسان کرو گے تو خدا تم پر مہربان ہوگا۔

ارشد: آپ کہتی ہیں کہ یہ روپیہ اس نے سالوں میں کوڑی کوڑی کرکے جمع کیا تھا۔ اب پھر مجھے کئی سال انتظار کرنا پڑے گا کہ وہ پھر کوڑی کوڑی کرکے جمع کرے۔

رحمت بی: اللہ واسطے کا سودا ہے۔

ارشد: جب دیا تھا تو یہی سوچ کر دیا تھا کہ اللہ واسطے کا سودا ہے مگر یہ کیا معلوم تھا کہ ایک دن یہ اللہ واسطے کا سودا مصیبت بن جائے گا۔

رحمت بی: کیسی باتیں کرتے ہو ارشد میاں۔ کچھ خدا کا خوف بھی دل میں پیدا کرو۔ ایسی بھی پیسے کی کیا محبت۔

ارشد: پیسے کی ضرورت سب کو ہی ہوتی ہے اور پیسے کی محبت بھی۔ اسے پیسے لوٹانا ہی پڑے گا۔

رحمت بی: وہ پیسے لوٹانے سے کب انکار کررہا ہے۔ کچھ مہلت ہی تو مانگ رہا ہے۔

ارشد: مگر اب میں مہلت نہیں دے سکتا۔ اگر اس نے پیسہ نہیں لوٹایا تو قانونی کارروائی ضرور کی جائے گی۔

رحمت بی: اس قدر سنگدل نہ بنو ارشد میاں۔ غریب کی مجبوری کو دیکھو۔

ارشد: نہ میں نے اس کو غریب کردیا ہے اور نہ مجبور۔

رحمت بی: تو تمھارے دل میں ذرا بھی رحم نہیں ہے۔

ارشد: اگر آپ نے اسی لیے تکلیف کی ہے تو میں مجبور ہوں۔

رحمت بی: (غصہ سے کھڑی ہوکر) سارا گاؤں جانتا ہے کہ اس نے اپنی جان کی پرواہ نہ کر کے تمھاری لڑکی کی جان بچائی۔ سارا گاؤں جانتا ہے کہ اسی میں اس کا روپیہ بہہ گیا۔

ارشد: تو پھر سارا گاؤں میرا روپیہ ادا کردے، میں نے تو نہیں کہا تھا اس سے دریا میں کود جانے کو۔

رحمت بی: (دروازے کی طرف جاتے ہوئے) تمھارا روپیہ رحمت بی ادا کرے گی۔ تین دن میں۔ تین دن میں۔

(لکڑی ٹیکتی ہوئی کمرے سے چلی جاتی ہے)

خالدہ: آپ نے رحمت بی کو ناراض کرکے اچھا نہیں کیا۔

ارشد: ایسی ڈھونگ رچانے والی عورتیں بہت سی دیکھی ہیں۔

(باہر لوگوں کا شور وغل۔ خالدہ کھڑکی میں سے جھانک کر دیکھتی ہے پھر گھبرا کر)

خالدہ: باہر سارا گاؤں جمع ہے۔

ارشد: (کھڑکی میں سے جھانک کر) دیکھیے بڑھیا کے کرتوت سارا گاؤں جمع کر کے لائی ہے میرے اوپر چڑھائی کرنے (لپک کر دوسرے کمرے میں جاتے ہیں اور بندوق لے کر آتے ہیں) میں لاشوں کے ڈھیر لگادوں گا۔ ان بدمعاشوں نے سمجھا ہے یوں جمع ہوکر مجھے ڈرا دھمکا لیں گے۔

اسرار: آپ ٹھہریے میں ان سے جاکر ملتا ہوں۔

(نگار کمرے میں آکر خاموش کھڑی ہوجاتی ہے)۔

خالدہ: (اسرار کا ہاتھ پکڑ کر) نہیں بیٹا تم نہ جاؤ۔ خدا جانے وہ لوگ کس ارادے سے آئے ہیں۔

اسرار: آپ ہاتھ چھوڑ دیئے خالہ جان۔ آخر معلوم تو ہو کہ وہ کیا چاہتے ہیں۔

ارشد: (بندوق میں کارتوس رکھتے ہوئے) چاہتے کیا ہیں یہ بڑھیا میرا گھر لٹوانا چاہتی ہے (کھڑکی سے باہر دیکھتے ہیں) میں خوب سمجھتا ہوں اس بڑھیا کو۔
(باہر شور وغل کسی قدر کم ہو جاتا ہے۔ رحمت بی کی آواز آتی ہے)۔

رحمت بی: کل سے میں مزدوری کر کے اصغر کا روپیہ ادا کروں گی۔ تین دن میں سارا روپیہ۔ کون کون میرے ساتھ ہے۔

آوازیں: ہم سب تمھارے ساتھ ہیں ماں جی۔ ہم سب تمھارے ساتھ ہیں۔ ہم سب اپنی تین تین دن کی مزدوری اصغر کے قرض میں دیں گے۔

رحمت بی: خدا تم سب کا بھلا کرے گا۔
(آوازیں آہستہ آہستہ غائب ہو جاتی ہیں۔ ارشد مسکرا کر)

ارشد: بس اتنا ہی دم خم تھا!

نگار: (اپنے باپ کو نفرت سے دیکھ کر) دم خم تھا نہیں۔ دم خم ہے۔

(پردہ)

(مطبوعہ افکار، کراچی، اپریل 1967)

ایک حمام میں

افرادِ تمثیل

(1) رمیش (ایک خودغرض انسان) (2) رادھا (رمیش کی بیوی) (3) کشور (رمیش کا بھائی) (4) سریش (ایک غنڈا) (5) لکشمی (ایک عورت)

پہلا سین

منظر

ایک کمرہ جس میں ایک ٹیلی فون، ریڈیو سیٹ، صوفہ سیٹ سلیقے سے رکھے ہوئے ہیں۔ کشور ایک صوفے پر بیٹھا سگریٹ پی رہا ہے۔ کشور ایک کتابوں کی الماری کے پاس کھڑا ہے۔ کشور رادھا کو دیکھ کر۔

کشور: بھابی! ذرا ایک تکلیف کرنا۔

رادھا: (مسکرا کر) تمھیں کون سی کتاب اٹھا دوں۔

کشور: آپ تو مجھے اس قدر سست سمجھتی ہیں کہ میں کتاب بھی نہیں اٹھا سکتا۔

رادھا: (مسکرا کر) نہیں نہیں۔ تمھارے بارے میں میری رائے اس قدر خراب نہیں ہے۔

کشور: سچ! زندگی میں اپنا پہلا قدردان آپ ہی کو پایا ہے۔

رادھا: اور تم پھر بھی مجھے بھابی کہہ کر مجھے اپنا بزرگ بنائے ہوئے ہو—

کشور: چھوٹا بننے میں کچھ فائدے ہیں نا۔

رادھا: زندگی کے ہر مسئلے کو کاروبار سمجھنا مجھے پسند نہیں ہے۔

کشور: اور یہ تو آپ جانتی ہیں کہ مجھے کاروبار سے کس قدر دلچسپی ہے۔

رادھا: (مسکرا کر) خربوزے کو دیکھ کر خربوزہ رنگ بدلتا ہے۔ تم بھی اپنے بھائی کے رنگ میں رنگتے جا رہے ہو۔

کشور: بھائی صاحب کی بات چھوڑیے وہ ٹھہرے لیڈر اور شوہر لیڈری کی کوئی ریکھا اپنے ہاتھ میں ہے نہیں اور شوہر بننا بھگوان نے اپنی قسمت میں لکھا نہیں۔

رادھا: لیڈر اور شوہر نہ بن کر تم شاعر بن گئے ہو۔

کشور: الفاظ کی الٹ پھیر سے مجھے نفرت ہے۔ ہاں خوبصورت چیزوں کو ضرور پسند کرتا ہوں۔ایک خوبصورت خیال، ایک خوبصورت تصور ایک بے اختیار قہقہہ یہی میری زندگی کی تمنائیں ہیں۔

رادھا: اور عورت؟

کشور: عورت ایک خوبصورت خیال ایک حسین تصور ایک دلکش اور بے اختیار قہقہے سے کیا کچھ زیادہ ہے۔

رادھا: (مسکرا کر) عورت کے متعلق تمھارا معیار بہت بلند ہے۔

کشور: بھائی صاحب کی طرح میں شوہر نہیں ہوں۔

(رادھا قہقہہ مار کر ہنستی ہے جس میں طنز اور تمسخر ہے پھر ایک دم سنجیدہ ہو کر)

رادھا: تمھارے بھائی جیسی لیڈری کرتے ہیں وہ کرتے رہیں مجھے کوئی اعتراض نہیں مگر جب وہ شوہر بننے کی کوشش کرتے ہیں اس وقت مجھے اپنے وجود سے نفرت ہو جاتی ہے۔

کشور: مگر بھابی—

رادھا: (بات کاٹ کر) پھر وہی بھابی۔ تم مجھ میں احساس بزرگی پیدا کر کے مجھے بوڑھی محسوس کرنے پر کیوں مجبور کر رہے ہو۔

کشور: بزرگی قدرت کا ایک عطیہ ہے۔

رادھا: مگر بڑھاپا قدرت کا سب سے اوچھا ہتھیار۔ مجھے اس زندگی سے نفرت ہے جس میں بڑھاپا آتا ہے۔

کشور: (کچھ دیر خاموش رہ کر) بڑھاپے کے تصور کو میں نا اُمیدی کی ایک قسم سمجھتا ہوں۔

رادھا: کشور! زندگی کے متعلق عورت کا تصور مرد کے تصور سے بہت مختلف ہے۔ (کشور سوالیہ نظروں سے رادھا کو دیکھتا ہے۔ رادھا کچھ دیر خاموش رہ کر) عورت زندگی سمجھتی ہے پھولوں کی نزاکت اور لطافت کو، ایک بھینی بھینی خوشگوار خوشبو کو وہ اپنے وجود کو ایک قہقہہ بنا دینا چاہتی ہے۔ ایک بے اختیار اور بے تکلف قہقہہ— مگر—

کشور: مگر—؟

رادھا: مگر جب اس کو اس سب کے بدلے میں آنسو ملیں۔ نا اُمیدی اور حسرت ملے۔ جب وہ محسوس کرے کہ وہ محبت چاہتی ہے مگر محبت روپیہ آنہ اور پائی میں تولی جا رہی ہے تو وہ زندگی کو فریب نہیں سمجھے گی تو اور کیا سمجھے گی۔

کشور: (مسکرا کر) ناپ تول کرنا اور محبت کو بھی کاروبار سمجھنا بھائی صاحب کی بڑی پرانی عادت ہے۔

رادھا: اور ان کی اس پرانی عادت نے میری زندگی کو ایک حسرت ایک آنسو بنا دیا ہے۔

کشور: کاش میں ہمدردی کے علاوہ بھی اور کچھ آپ کے لیے کر سکتا۔

رادھا: تم بہت کچھ کر سکتے ہو کشور۔

(ٹیلی فون کی گھنٹی بجتی ہے۔ رادھا خاموش ہو جاتی ہے۔ کشور رسیور اٹھا کر)

کشور: ہلو— یس کشور اسپیکنگ— کیا؟— اچھا میں خود ہی آ رہا ہوں۔

(ریسور رکھ کر اس قدر تیزی سے کمرے سے نکل جاتا ہے کہ رادھا اسے دیکھتی رہ جاتی ہے۔ کچھ دیر خاموش کھڑی رہتی ہے پھر کھڑکی سے باہر دیکھنے لگتی ہے۔ کچھ دیر بعد آہستہ آہستہ جیسے خود سے باتیں کر رہی ہو)

رادھا: کشور! تم اس قسم کی باتیں کرتے ہوئے مجھے بہت ہی پراسرار معلوم ہوتے ہو۔ (کچھ دیر خاموش رہتی ہے۔ رمیش داخل ہوتا ہے اور خاموش کھڑا ہو جاتا ہے۔ رادھا کو اس کے آنے کا علم نہیں ہوتا۔ پھر کچھ دیر بعد) بھگوان! تو نے اس قدر خوبصورت دنیا بنا کر روپے کا تصور کیوں پیدا کیا کہ انسان خوبصورتی، حسن اور نزاکت، خیال اور تصور کا بھی مول بھاؤ کرنے لگا۔

رمیش: تم بھگوان سے یہ سوال کرو کہ بھگوان نے تمھارا پیٹ کیوں پیدا کیا جس میں بھوک لگتی ہے (رادھا پلٹ کر رمیش کو دیکھتی ہے اور چہرے پر بیزاری کے آثار پیدا ہوتے ہیں۔ رمیش رادھا کی طرف بڑھتے ہوئے) تم بھگوان سے یہ سوال کرو کہ اس نے تم کو یہ جسم کیوں دیا جس کو سردی اور گرمی کا احساس ہوتا ہے اور تمھیں کپڑے اور مکان کی ضرورت ہوتی ہے— رادھا! تمھارے ان بے معنی تصورات اور تخیلات سے میں عاجز آ گیا ہوں۔

رادھا: زندگی کے حسین تصورات سیاست نہیں ہیں جس میں لوگوں کو اپنا ہم خیال بنایا جا سکے۔

رمیش: زندگی ایک حقیقت ہے، تصورات اور تخیلات وہم سے زیادہ کچھ نہیں۔

رادھا: حسین تصورات سے حسین زندگی جنم لیتی ہے اور

رمیش: (بات کاٹ کر) خاموش رہو مجھے اس فلسفے سے کوئی دلچسپی نہیں ہے (ایک کرسی پر بیٹھ کر) میرے لیے چائے یہیں لے آؤ۔

(رادھا انتہائی نفرت سے رمیش کو دیکھتی ہے اور خاموشی سے کمرے سے چلی جاتی ہے۔ رمیش اس کی نفرت کو محسوس کر لیتا ہے مگر اس طرح نظر انداز کر دیتا ہے جیسے اسے کسی نفرت یا محبت سے کوئی دلچسپی نہ ہو۔ سامنے میز پر پڑا ہوا

اخبار اٹھا کر دیکھنے لگتا ہے کہ سریش داخل ہوتا ہے اس کے چہرے پر کسی
کامیابی کی مسکراہٹ ہے۔ بے پروائی سے چلتا ہوا رمیش کے پاس آتا ہے۔
رمیش نظریں اٹھا کر سریش کو دیکھتا ہے سریش ایک کرسی پر بیٹھ کر)

سریش: مبارک ہو۔ ٹرک پکڑا گیا۔

رمیش: (اخبار ایک طرف ڈال کر) ٹرک پکڑا گیا! سچ؟ کہاں؟ کس نے پکڑا؟

سریش: (مسکرا کر) ایکسائز کے افسران نے اور کس نے (فاتحانہ مسکراتے ہوئے)
اور اس میں سے افیم برآمد ہوگئی ہے۔ ٹرک ضبط کرلیا گیا ہے۔

رمیش: (ہاتھ بڑھا کر سریش سے ملاتے ہوئے) تو کام بن گیا۔

سریش: سریش نے کچی گولیاں نہیں کھیلی ہیں رمیش بابو اب حضرت کو چھٹی کا دودھ یاد
آجائے گا۔

رمیش: بات تو جب ہے کہ حضرت کو سزا ہو جائے۔

سریش: وہ تو ہو کر رہے گی۔ ٹرک اس کا۔ سامان لوڈ کرنے والے اس کے آدمی اب
کیا کسر باقی رہ جاتی ہے۔

رمیش: مگر گواہیاں—

سریش: میرے حکم کے خلاف کوئی گواہی دے سکتا ہے اور ڈرائیور تو میرا بھگت ہے۔

رمیش: اب ساری لیڈری نکل جائے گی مہاشے جی کی (طنزیہ مسکرا کر) بڑی جنتا کی
سیوا کرنے چلے تھے۔

سریش: جانے کم بخت کے پاس کون سا جادو ہے جسے دیکھو گنیش مہاراج کے گن گاتا
ہے (طنزیہ ہنس کر) بڑے مہاراج بن بیٹھے ہیں (کچھ دیر خاموش رہ کر)
ہزار ڈیڑھ ہزار کی افیم کا ضرور نقصان ہوگیا۔

رمیش: ارے چودھری مجھے میونسپل چیئرمین تو ہوجانے دو ایسے سیکڑوں ہزار دو ہزار
کما لینا۔

(رادھا چائے لے کر آتی ہے سریش کو دیکھ کر چہرے پر غصے اور نفرت کے

ملے جلے تاثرات پیدا ہوتے ہیں مگر خاموشی سے چائے میز پر رکھ دیتی ہے۔
سریش رادھا کو دیکھ کر مسکراتے ہوئے)۔

سریش: بھابی! میں اکثر ایسے ہی وقت پر آنے کا عادی ہوں۔ (رادھا کوئی جواب نہیں دیتی واپس جانے کے لیے مڑتی ہے) ارے چائے تو پیتی جاؤ۔

(رادھا کوئی جواب نہیں دیتی دروازے کی طرف بڑھتی ہے رمیش رادھا کی طرف دیکھ کر)

رمیش: کہاں چلیں۔ (رادھا رکتی ہے۔ چائے بنا دو۔)

(رادھا واپس آتی ہے۔ بے حد بیزاری کے انداز میں ایک کرسی پر بیٹھ جاتی ہے اور چائے بنانے لگتی ہے)

سریش: آپ کو میرا آنا ہمیشہ ناگوار گزرتا ہے (طنزیہ) میں نے کبھی کوئی ایسی گستاخی تو نہیں کی جو آپ کو اس قدر ناگوار گزری ہو کہ مجھ سے بات نہ کرنے کی قسم کھالی ہو۔

رادھا: (روکھے پن سے) جی نہیں ایسا تو نہیں ہے۔

سریش: پھر کیا بات ہے جو آپ اس قدر ناراض رہتی ہیں۔

رادھا: میں کس مسئلے پر آپ سے گفتگو کروں۔ ظاہر ہے کہ ناجائز تجارت کا مجھے کوئی تجربہ نہیں ہے۔

رمیش: (غصہ سے) صرف فضول بکواس کرنے کا بہت تجربہ ہے۔

(رادھا خاموش رہتی ہے اور دونوں کی طرف چائے کی پیالیاں بڑھاتی ہے۔ سریش پیالی لے کر)

سریش: بس کشور بابو سے آپ کی گاڑھی چھنتی ہے۔

رمیش: اس لیے کہ وہ بھی ان کی طرح دن بھر بکواس کرنے کا عادی ہے میری سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ دونوں اس دور میں کس دنیا میں رہ رہے ہیں (رادھا خاموش رہتی ہے)۔ دنیا میں آج لوگوں کو موٹر کی ضرورت ہے۔ اچھے مکان

کی ضرورت ہے۔ عمدہ کھانے اور پینے کی ضرورت ہے مگر یہ ابھی تک——
(ٹیلی فون کی گھنٹی بجتی ہے۔ رمیش رادھا کی طرف دیکھتا ہے۔ رادھا رسیور اٹھا کر)

رادھا: ہلو—— کون صاحب ہیں—— (ماؤتھ پیس پر ہاتھ رکھ کر رمیش کی طرف دیکھ کر) گنیش مہاراج کا فون ہے آپ کے لیے۔

رمیش: (سریش کی طرف معنی خیز نظروں سے دیکھتا ہے پھر رادھا سے) کہہ دو میں گھر پر نہیں ہوں۔

(رسیور رکھ دیتی ہے۔ رمیش پھر معنی خیز نظروں سے سریش کو دیکھتا ہے سریش کھڑے ہوتے ہوئے)

سریش: اچھا اب میں چلتا ہوں۔

رمیش: اچھا—— حالات سے مجھے آگاہ کرتے رہنا۔ (سریش اثبات میں سر ہلاتا ہوا کمرے سے نکل جاتا ہے۔ رمیش چند منٹ خاموش رہ کر رادھا سے) میری سمجھ میں نہیں آتا کہ تم اس قدر غیر مہذب کیوں ہو کہ لوگوں سے دو میٹھے بول بولنے میں تمھیں تکلیف ہوتی ہے۔

رادھا: میں صرف انھی لوگوں سے گفتگو کرتی ہوں جن کو میں مہذب سمجھتی ہوں۔

رمیش: اور سریش تمھارے نزدیک مہذب نہیں ہے۔

رادھا: شراب، افیم، کوکین اور جانے کس کس چیز کی ناجائز تجارت کرنے والا میری ڈکشنری میں مہذب نہیں ہے۔

رمیش: (غصہ اور طنز سے) آپ کی ڈکشنری میرے متعلق کیا کہتی ہے؟

رادھا: کوئی اچھی رائے نہیں ہے۔

رمیش: نمک حرامی کی انتہا ہے۔

رادھا: (بے پروائی سے) ہوگی۔

رمیش: (غصہ سے) تم جب کیچڑ اور دلدل میں گر جانے والی تھیں میں نے تمھیں

سہارا دیا۔ تمھیں گھر دیا— تم—

رادھا: (بات کاٹ کر) مگر اس گھر کے کونے کونے میں مجھے مجھ جیسے ہزاروں شرنارتھیوں کا خون نظر آتا ہے۔ ان کے نام پر لوٹے ہوئے روپے کی بدبو آتی ہے۔ مجھے دھوکے اور فریب کے علاوہ یہاں کچھ نظر نہیں آتا۔

رمیش: رادھا! تم حد سے بڑھ جاتی ہو۔

رادھا: اس لیے کہ تم نے کیچڑ میں گر کر میری زندگی تباہ کردی ہے تم نے میرے قہقہے چھین کر اپنے اس مکان کی بنیادوں میں دفن کر دیئے ہیں۔ (غصہ سے چائے کا سامان اٹھا کر چلی جاتی ہے اور رمیش اسے غصہ سے دیکھتا رہتا ہے مگر خاموش رہتا ہے کچھ دیر بعد یکایک جیسے کوئی بات یاد آجانے پر ٹیلیفون کا ریسور اٹھا کر)

رمیش: ہلو— ہاں میں رمیش بول رہا ہوں— ہاں ہاں میں خود تو آہی رہا ہوں— سواگت کا انتظام مکمل ہوگیا ارے بھئی منسٹر کا سواگت ہے۔ شاندار ہونا چاہیے اچھا اچھا میں خود آرہا ہوں— ارے پیسے کی فکر نہ کرو۔
(ریسور رکھ کر کھڑا ہوتا ہے)۔

(پردہ)

دوسرا سین

منظر

وہی کمرہ۔ کچھ دن بعد کشور ایک صوفے پر بیٹھا اخبار دیکھ رہا ہے۔ رمیش خاموش بیٹھا کچھ سوچ رہا ہے۔ کشور اخبار ایک طرف رکھ کر۔

کشور: گنیش............کا کوئی ٹرک پکڑا گیا ہے جس میں سے افیم برآمد ہوئی ہے۔

رمیش: ہنہ— (بیزاری سے) پھر میں کیا کروں۔

کشور: گنیش مہاراج تو ایسے آدمی نہیں ہیں۔

22

رمیش: دیکھنے ہی کے بگلا بھگت ہیں اور پھر ہمیں کیا جو جیسا کرے گا ویسا بھرے گا۔

کشور: وہ تو بھرے گا ہی مگر مجھے شک ہے کہ گنیش مہاراج کے ساتھ کوئی دھوکا کیا گیا ہے۔

رمیش: سیاست میں سب کچھ ہوتا ہے۔

کشور: (غور سے رمیش کو دیکھ کر) وہ آپ کے دوست ہیں کم ازکم آپ کو ان سے ہمدردی کرنا چاہیے۔

رمیش: سیاست میں دوستی اور ہمدردی کچھ نہیں ہوتی (بات ٹالنے کے انداز میں) بھئی کشور اب تم کو بھی کاروبار کرنا چاہیے کہاں تک دو سو روپے کی نوکری کرتے رہو گے۔

کشور: (بے پروائی سے) بھائی صاحب! آپ تو جانتے ہی ہیں کہ مجھے کاروبار سے کس قدر دلچسپی ہے۔

رمیش: لیکن کہاں تک تم ان بے معنی تصورات اور تخیلات کی دنیا میں کھوئے رہو گے۔

کشور: میں بھی اکثر ان باتوں پر سوچتا ہوں مگر مجھے اس دنیا میں کچھ لطف سا آنے لگا ہے۔

(ٹیلی فون کی گھنٹی بجتی ہے رمیش رسیور اٹھا کر)

رمیش: ہلو۔۔۔ رمیش گپتا اسپیکنگ۔۔۔ جسٹ اے منٹ پلیز (ریسور لے کر) ہلو۔۔۔ کشور اسپیکنگ۔۔۔ اچھا۔ میں خود آرہا ہوں۔ ہاں ہاں بہت جلد (کھڑے ہوکر رمیش سے) میں ایک ضروری کام سے جارہا ہوں۔

(جواب کا انتظار کیے بغیر دروازے کی طرف جاتا ہے اسی وقت رادھا چائے لے کر داخل ہوتی ہے اور کشور کو جاتے ہوئے دیکھ کر)

رادھا: کہاں جارہے ہو چائے تو پیتے جاؤ۔

کشور: (دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے) مجھے ایک ضروری کام ہے آپ چائے پی جیے۔

(کمرے سے چلا جاتا ہے رادھا خاموشی سے ایک میز پر چائے کے برتن رکھ کر چائے بنانے لگتی ہے۔ رمیش خاموشی سے اسے دیکھتے رہتا ہے۔ رادھا اس کی طرف چائے کی پیالی بڑھاتی ہے۔ رمیش چائے کی پیالی لے کر)

رمیش: رادھا۔ تمھیں کشور کا بہت خیال رہتا ہے (رادھا خاموش رہتی ہے) اس گھر میں تمھیں سب کچھ دیا ہوا میرا ہے (رادھا اب بھی خاموش رہتی ہے اور چائے پینے لگتی ہے رمیش غصے سے)۔ تمھاری یہ خاموشی میرے لیے بہت تکلیف دہ ہوتی ہے۔

رادھا: انسان اپنی ہی تکلیف کو محسوس کرتا ہے۔ دوسروں کی ذات سے اسے کوئی دلچسپی نہیں ہوتی۔

رمیش: تمھاری تکلیف کا مجھے آج تک علم نہیں ہوا۔

رادھا: جو شخص اپنی ذات میں آپ کی طرح کھوئے جائے اس کو دوسروں کے وجود تک کا احساس نہیں ہوتا۔

رمیش: (مسکرا کر) مجھے تمھارا وجود تو کبھی ناگوار نہیں گزرا۔

رادھا: (طنزیہ مسکرا کر) شکریہ اس نوازش کا۔ مگر جانے کیوں مجھے اپنے وجود کے احساس سے نفرت ہونے لگی ہے۔

رمیش: (طنزیہ مسکرا کر) کیا اس لیے کہ میں نے کبھی تمھیں ایک خوبصورت خیال ایک حسین تصور اور ایک بے اختیار قہقہہ نہیں مانا۔ (کچھ دیر خاموش رہ کر) رادھا! میں نے زندگی کو ایک حقیقت سمجھا ہے اس کے اصل روپ میں دیکھا ہے۔ فضول تصورات سے مجھے ہمیشہ چڑ رہی ہے۔

رادھا: آپ نے زندگی کو جس قسم کی حقیقت سمجھا ہے وہ حقیقت بہت گندی اور بھیانک ہے۔

(رمیش غصہ سے رادھا کو دیکھتا ہے۔ رادھا خاموشی سے چائے کے برتن اٹھا کر چلی جاتی ہے۔ رمیش کچھ دیر خاموش بیٹھا رہتا ہے۔ پھر فون کا رسیور اٹھا

کر نمبر ڈائل کرتا ہے)۔

رمیش: ہلو— میں رمیش گپتا بول رہا ہوں۔ اچھا آداب عرض ہے۔ ارے بھئی آپ کا کام تقریباً ہوگیا ہے مگر دو تین ہزار کا صرفہ ضرور ہوگا۔ کیا کیا جائے کم بخت اس سے کم میں بات کرنے کو تیار نہیں— آپ اس قدر روپے کا انتظام کر لیجیے— ہاں ہاں ٹھیکا تو مل ہی جائے گا— اچھا اچھا— شام تک انتظام کر لیجیے۔ آداب عرض ہے۔ (ریسور رکھ دیتا ہے۔ پھر اٹھا کر دوسرا نمبر ڈائل کرتا ہے) ہلو۔ میں سریش بابو سے بات کرنا چاہتا ہوں— نہیں ہیں— اچھا خیر جب آئیں تو میرا سلام کہیے۔ (ریسور رکھتا ہے اسی وقت سریش کمرے میں داخل ہوتا ہے۔ سریش کو دیکھ کر) میں نے تمھیں فون کیا تھا۔

سریش: اچھا— بہت خوش قسمت ہوں میں۔
(ایک کرسی پر بیٹھ جاتا ہے۔)

رمیش: کل عدالت میں کیا ہوا؟

سریش: سب گواہیاں مہاراج کے خلاف ہوئی ہیں سزا یقینی ہے۔

رمیش: کم بخت کو سزا ہو جائے تو کام بنے۔ (مسکرا کر) کل اس کی بیوی آئی تھی۔

سریش: اچھا!— پھر؟

رمیش: کہہ رہی تھی کہ میں اپنے اثرات سے کام لے کر مقدمہ ختم کرانے کی کوشش کروں۔

سریش: (شرارت سے مسکرا کر) اور آپ فوراً مان گئے ہوں گے۔

رمیش: اب میں اس قدر گیا گزرا نہیں رہا— اپنی معذوری ظاہر کر دی۔

سریش: (شرارت سے) لیکن کب تک— ایک دن ہتھیار ڈال دو گے۔

رمیش: کیوں؟

سریش: (ہنس کر) بلیاں توبہ کر کے بھی چوہا کھا لیتی ہیں۔ (چند سیکنڈ خاموش رہ کر) کل منسٹر صاحب سے بات چیت ہوئی۔

رمیش: (سوچتے ہوئے) ہاں ہاں کیوں نہیں۔ وہ اس بات سے متفق ہوگئے ہیں کہ اس لائن پر بس چلانے کا پرمٹ تم کو ہی ملنا چاہیے۔

سریش: یہ آج کل اکسائز والے بڑی سختی پر اتر آئے ہیں۔

رمیش: ارے بھئی ان کی خدمت کرتے رہا کرو۔ ہزار دو ہزار میں کہاں کی دولت لٹی جاتی ہے۔

سریش: کوئی نئے افسر صاحب تشریف لے آئے ہیں خود کو رام کا اوتار ثابت کر رہے ہیں— منحوس کہیں کا۔

رمیش: کہو تو ایک دو دن نہ ٹکنے دیں ایک دو شکایتی درخواستیں بس کافی ہیں۔

سریش: اس کے بغیر کام چلتا نظر نہیں آتا۔

رمیش: اچھا بھئی اس کو بھی دیکھیں گے۔

سریش: ایسے کم بختوں سے کیسے نپٹا جائے سمجھ میں نہیں آتا۔ (کشور داخل ہوتا ہے۔ سریش کشور کو) اپنے کشور بابو بھی اسی جیسے لوگوں میں سے ہیں— (کشور ایک کرسی پر بیٹھ جاتا ہے)

رمیش: اپنی اپنی سمجھ کا فتور ہے۔

سریش: کشور بابو آخر تم کب تک یوں شاعری کرتے پھرو گے۔

کشور: (مسکرا کر) پھر میں کیا کروں۔

سریش: کشور بابو آپ جس محکمے میں ملازم ہیں اس کے ملازموں نے بڑی بڑی بلڈنگیں کھڑی کرلی ہیں۔ سڑکوں پر ان کے ٹرک دوڑ رہے ہیں۔

کشور: یہ تو اپنا اپنا مقدر ہے۔

رمیش: مقدر کو کیوں الزام دیتے ہو اپنی حماقت تسلیم کیوں نہیں کرتے۔

کشور: حماقت ہی سمجھ لیجیے۔

رمیش: سمجھ کیا لیجیے۔ یقینی حماقت ہے جو لوگ وقت سے فائدہ نہیں اٹھاتے وہ احمق نہیں تو اور کیا ہیں (کشور مسکرا کر خاموش ہوجاتا ہے) مسکرانے سے کام نہیں

چلتا۔ زندگی کو پھولوں کی مہک نہیں ایک حقیقت سمجھنا چاہیے۔ زندگی اسی وقت قہقہہ بنتی ہے جب تمھاری جیب میں پیسہ ہو (کھڑے ہوکر سریش سے) آؤ بھئی چلو۔ میٹنگ کا وقت ہوگیا ہے ہم لوگوں کی بات ان لوگوں کی سمجھ میں نہیں آئے گی۔

(دونوں کمرے سے چلے جاتے ہیں۔ کشور کچھ دیر خاموش رہتا ہے اس کے چہرے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ پریشان ہے۔ کچھ دیر بعد بلند آواز سے)

کشور: بھابی— بھابی—

(رادھا کمرے میں آکر مسکراتے ہوئے)

رادھا: پھر تم نے بھابی کہا۔ مجھے اس لفظ سے چڑ ہی نہیں نفرت ہے۔

کشور: میری سمجھ میں نہیں آتا کہ پھر میں آپ سے کیا کہا کروں۔

رادھا: میرا نام رادھا ہے اور میں عمر میں تم سے چھوٹی ہوں۔

کشور: مگر آپ کا نام لینا تو بہت بے تکلفی ہوگی۔

رادھا: اور تم مجھ سے بے تکلف ہونا نہیں چاہتے۔

کشور: مجھے آپ سے بے تکلف ہوکر کیا ملے گا— آپ—

(خاموش ہوجاتا ہے اور خلا میں اس طرح گھورنے لگتا ہے جیسے وہ کسی گہرے خیال میں کھوگیا ہو)

رادھا: تم اس طرح خیالات میں کھوئے ہوئے مجھے کسی دیوتا سے کم نہیں معلوم ہوتے۔

کشور: دیوتا— (اس طرح چونک کر کہتا ہے جیسے کسی نے اس کے بدن میں کرنٹ مار دیا ہو کچھ دیر خاموش رہ کر ٹھنڈی سانس بھر کر) انسان کی مجبوریاں اسے انسان سے دیوتا بن جانے پر مجبور کردیتی ہیں۔

رادھا: مگر مجھے دیوتا نہیں گوشت و پوست کا انسان زیادہ بھلا معلوم ہوتا ہے۔ (کشور کا چہرہ غور سے دیکھ کر) مگر تم آج کچھ پریشان نظر آرہے ہو کیا بات ہے۔

کشور: کوئی خاص بات نہیں۔ صرف موڈ کی بات ہے۔

رادھا: مگر ایک افسردہ دل ساری محفل کو افسردہ بنا دیتا ہے۔ مشہور کہاوت ہے کشور! میری جان ضیق میں ہے اس کو صرف تمھاری تھوڑی سی مسکراہٹ سے سکون ملتا ہے ورنہ یہ گھر میرے لیے جہنم بنا ہوا ہے۔ جانتے ہو میں کل سے کس عذاب میں مبتلا ہوں۔

کشور: عذاب!

رادھا: ہاں جہنم کا عذاب۔ کل گنیش مہاراج کی بیوی اپنی مصیبت لے کر آئی تھی اور تمھارے بھائی صاحب اس سے عشق جتلا رہے تھے۔

کشور: مصیبت زدہ لوگوں کی بے چارگی سے فائدہ اٹھانا بھائی صاحب کی پرانی عادت ہے۔

رادھا: ان کی پرانی عادتیں بہت تکلیف دہ ہیں اپنی خودغرضی کے لیے دوسروں کی عزتوں سے کھیلنا کون سی شرافت ہے۔

کشور: (مسکرا کر) لیڈری کی بساط پر شرافت کا کوئی خانہ نہیں ہوتا۔

رادھا: تم دونوں میں کس قدر فرق ہے کبھی کبھی تو مجھے تم دونوں کے بھائی ہونے پر بھی شک ہونے لگتا ہے۔

کشور: (مسکرا کر) میری ماں کو الزام نہ دیجیے وہ بہت نیک خاتون تھیں۔

رادھا: کیسی باتیں کرتے ہو ایسا گیا گزرا خیال بھی میرے دل میں نہیں آسکتا۔

کشور: بھائی صاحب پر جب سے لیڈری کا بھوت سوار ہوا ہے تب سے وہ بالکل بدل گئے ہیں ورنہ ایک زمانے میں تو ان کو دیکھ کر لوگ سوچ میں پڑ جاتے تھے۔

رادھا: (طنزیہ مسکرا کر) اچھا!

کشور: جی ہاں ماں باپ کی سیوا کو دھرم سمجھتے تھے بھگوان کی بھگتی میں ڈوبے رہتے تھے۔

رادھا: (طنزیہ ہنس کر) تو دیش بھگتی پر سب اچھائیاں بھینٹ چڑھا دیں—

کشور: (مسکرا کر) لیڈر بننے کے لیے ایسا تو کرنا ہی پڑتا ہے۔

(گنیش مہاراج کی بیوی لکشمی داخل ہوتی ہے رادھا اسے دیکھ کر)

رادھا: آؤ لکشمی بہن۔ (ایک کرسی کی طرف اشارہ کرکے) بیٹھو بہت دن میں درشن دیے۔

لکشمی: میں کل ہی تو آئی تھی۔ کرسی پر بیٹھ کر) رمیش بابو کہاں ہیں۔

کشور: کسی میٹنگ میں گئے ہیں— یہ اسمگلنگ کا کیا جھگڑا ہوگیا ہے۔

لکشمی: (طنزیہ) یہ تو آپ کے بھائی صاحب ہی خوب جانتے ہیں۔

کشور: بھائی صاحب!

لکشمی: جی ہاں— سریش اور آپ کے بھائی صاحب کو میں الگ الگ نہیں سمجھتی۔

کشور: آپ کا خیال ہے کہ اس میں بھائی صاحب کا ہاتھ ہے۔

لکشمی: خیال نہیں یقین ہے۔ کشور بابو! کیا دنیا سے شرافت بالکل ختم ہوگئی ہے۔

کشور: (مسکرا کر) آپ تو مجھ سے اس طرح سوال کررہی ہیں جیسے اس سب کا ذمہ دار میں ہوں۔

لکشمی: (طنزیہ) کشور بابو! آپ کی نیکی شرافت اور معصومیت کی قائل یہ رادھا تو ہوسکتی ہیں میں نہیں— آپ دنیا کی نظروں میں دھول نہیں جھونک سکتے۔

کشور: (قہقہہ مار کر) گویا آپ مجھ کو ڈرانے دھمکانے آئی ہیں۔ (طنزیہ) ویسے میں اگر بھائی صاحب سے آپ کی سفارش کردوں تو وہ میری سننے والے نہیں ہیں۔ آپ خود ہی سوچیے جب انھوں نے آپ کی بات نہیں مانی تو میری بات کیا مان لیں گے۔

لکشمی: وہ میری بات کیوں ماننے لگے۔

کشور: آپ کو اپنی بات ان سے منوانے کا کچھ نہ کچھ حق تو ضرور ہے۔

لکشمی: (غور سے کشور کو دیکھ کر) کیا مطلب ہے تمھارا۔

کشور: (طنزیہ مسکرا کر) مطلب تو آپ کو بھی معلوم ہے لوگ تو یہی کہتے ہیں کہ— معاف کیجیے گا آپ کا لڑکا گنیش بھائی صاحب کی اولاد ہے۔

— —

لکشمی: (ایک دم غصہ سے کھڑی ہوکر) جی چاہتا ہے کہ تمھارے منہ پر ایسا طمانچہ رسید کروں کہ— (آواز غصہ سے کانپ جاتی ہے کچھ دیر اپنے غصے پر قابو پاتی رہتی ہے پھر حقارت اور طنز سے) اگر تمھاری ماں زندہ ہوتی تو میں تم دونوں بھائیوں کے باپوں کا نام ان سے ضرور معلوم کرتی۔)

(غصہ میں بھری ہوئی کمرے سے چلی جاتی ہے۔ رادھا اور کشور دم بخود اسے جاتے دیکھتے ہیں۔ کشور کی پیشانی پر پسینہ آجاتا ہے)۔

(پردہ)

تیسرا سین

منظر

وہی کمرہ تقریباً دو تین مہینے بعد۔ رادھا ایک کرسی پر بیٹھی ہے کشور کھڑکی کے پاس کھڑا ہے۔ کچھ دیر بعد پلٹ کر رادھا کو دیکھ کر)

کشور: گندی کیچڑ میں اترنے سے کوئی فائدہ نہیں ہوتا۔

رادھا: جو کنول کا پھول حاصل کرنا چاہتے ہیں انھیں کیچڑ میں اترنا ہی پڑتا ہے۔

کشور: مگر آپ جو کھیل کھیلنا چاہتی ہیں وہ گندہ ہی نہیں خطرناک بھی ہے۔

رادھا: مجھے تمھارے بھائی سے نفرت ہے میں ہزار بار کہہ چکی ہوں۔

کشور: لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ میں ایسے حالات پیدا کرلوں کہ وہ مجھ سے نفرت کرنے لگیں۔

رادھا: (قہقہہ مار کر ہنستے ہوئے) وہ تم سے نفرت نہیں کرسکتے۔ یہ مجھے یقین ہے۔

کشور: یہ سب جانتے ہوئے کہ میں اور آپ—

رادھا: ہاں سب کچھ جانتے ہوئے۔ (کھڑے ہوکر کشور کے پاس آکر) میں نے ان کو اس قدر سمجھ لیا ہے کہ تم تمام زندگی بھی نہیں سمجھ سکتے۔

کشور: لیکن—

رادھا: (بات کاٹ کر) کشور! جب تک تمھارے نام بینک میں تیس چالیس ہزار روپیہ ہے وہ تم سے نفرت نہیں کر سکتے۔

کشور: (گھبرا کر تعجب سے) تیس چالیس ہزار روپیہ۔

رادھا: ہاں۔ مجھے سب کچھ معلوم ہے۔ مجھ سے اڑنے کی کوشش نہ کرو۔

کشور: (گھبرا کر) یعنی کہ آپ —

رادھا: (بالکل اس کے قریب آکر) ہاں۔ مجھے کل معلوم ہوا کہ یہ سب تم نے رشوت سے کمایا ہے اور تم معطل کر دیے گئے ہو۔ اب تمھارے اوپر مقدمہ چلے گا۔ ممکن ہے تم کو سزا بھی ہو جائے۔

کشور: لیکن بات دراصل یہ ہے کہ —

رادھا: (بات کاٹ کر) اب زیادہ جھوٹ بولنے کی کوشش نہ کرو تم نے مجھ سے بہت جھوٹ بولا ہے مگر پھر بھی تم مجھے پسند ہو۔

کشور: لیکن آپ کے مجھے پسند کرنے سے میری مصیبت تو نہیں ٹل سکتی۔

رادھا: (ہنس کر) کل سے میں نے اسی مسئلے پر غور کیا ہے اور ایک حل بھی ڈھونڈ نکالا ہے جس سے تم بچ سکتے ہو (مسکرا کر) کہو اب بھی تم مجھ کو پسند کرتے ہو یا نہیں۔

کشور: مگر بھابی — (سوچتے ہوئے) سوچیے تو —

رادھا: (مسکرا کر) بہت ضدی ہو۔ (دروازے کی طرف جاتے ہوئے) مجھے دیکھنا ہے کہ تم کب تک اپنی ضد پر قائم رہتے ہو۔

(دروازے تک پہنچ جاتی ہے۔ کشور کچھ بے چین سا ہو کر)

کشور: مگر سنیے تو — (رادھا رک جاتی ہے) وہ حل کیا ہے؟

رادھا: (پلٹ کر مسکراتے ہوئے) اب تم راہ پر آرہے ہو (رادھا کشور کے پاس آکر) کہو —؟

کشور: مجھے بھائی صاحب —

رادھا: (لقمہ دے کر) بھائی صاحب کا خیال ہے۔ (ہنستی ہے) وہ اخلاقی اعتبار سے بہت پست اور گرے ہوئے ہیں ان کی فکر نہ کرو۔ (رمیش کمرے میں داخل ہوتے ہوئے)

رمیش: کس کی فکر نہ کرو۔

رادھا: (واپس جاتے ہوئے) تمھاری۔

(کمرے سے نکل جاتی ہے۔ رمیش کرسی پر بیٹھ کر)

رمیش: کشور! ابھی مجھے تمھارے متعلق ایک انتہائی افسوسناک خبر ملی ہے۔

کشور: کیا خبر؟

رمیش: کہ تم رشوت لینے کے الزام میں معطل کر دیے گئے ہو۔

کشور: ہاں معطل تو کر دیا گیا ہوں۔

رمیش: اور اس سے پہلے تمھارے خلاف ڈپارٹمنٹل انکوائری بھی ہوتی رہی ہے۔

کشور: ہاں وہ بھی ہوئی تھی۔

رمیش: اور تم نے مجھ سے کہا تک نہیں۔

کشور: اور اگر کہہ بھی دیتا تو کیا وہ نہ ہوتی۔ یا میں معطل نہ ہوتا۔

رمیش: ارے بھئی کچھ انتظام کیا جاتا۔

کشور: کیا انتظام کیا جاتا۔ (طنزیہ) آپ یہی کہتے کہ اس معاملے کو دبانے کے لیے چار چھ ہزار روپیہ صرف ہوگا اور اس کے لیے میں تیار نہیں تھا۔

رمیش: تمھیں اپنے بھائی پر بھی اعتبار نہیں۔

کشور: آپ ہی نے سکھایا ہے کہ روپے پیسے کے معاملے میں بھائی اور باپ کسی کا اعتبار نہیں کرنا چاہیے۔

رمیش: تم بالکل گدھے ہو۔ اب بھی ایسے اطمینان سے ہو جیسے تمھیں کچھ پرواہ نہیں۔

کشور: اور پرواہ کر کے بھی کیا کرلوں گا۔ جو ہونا ہے وہ ہو کر رہے گا۔

رمیش: اور اگر تمھیں سزا ہوگئی تو میری ساری آبرو خاک میں مل جائے گی—

کشور: آبرو پیسے سے ہوتی ہے سزا اور جزا سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔ میں نے بہت سے قاتلوں کو بھی یوں سینہ پھلا کر چلتے دیکھا ہے جیسے ان سے زیادہ عزت دار اور کوئی ہے ہی نہیں— دور کیوں جایئے۔ اپنے سریش صاحب کی مثال موجود ہے۔

رمیش: سریش کی عزت منتشر کرتے ہیں۔ اس نے اپنی ایک پوزیشن بنالی ہے۔

کشور: (طنزیہ مسکرا کر) اس لیے کہ وہ اپنی غنڈہ گردی سے لیڈروں کی لیڈری کی حفاظت کرتا ہے اور معاف کیجیے گا۔ بھائی صاحب اپنے پاؤں میں خود کلھاڑی مار کر رویا نہیں کرتے۔

رمیش: (کشور کو معنی خیز نظروں سے دیکھ کر) کیا مطلب!

کشور: آپ نے گنیش مہاراج سے جو بلا وجہ کی دشمنی مول لی ہے اس کی سزا مجھے بھگتنا پڑ رہی ہے۔

رمیش: گنیش مہاراج کی دشمنی؟

کشور: جی ہاں— میرے افسران بالا سب جانتے ہیں کہ گنیش مہاراج بے قصور ہیں اور یہ ساری سازش آپ کی رچی ہوئی ہے۔ انھیں مجھ سے کوئی ہم دردی نہیں ہے۔ سزا مجھے بھگتنا پڑے گی۔

رمیش: اس سے تو معاملہ کی سنگینی اور بڑھ گئی ہے۔

کشور: اسے چھوڑیئے (کھڑے ہوکر) اگر مجھے سزا بھی ہوگئی تو کیا ہوتا ہے۔ کم از کم آپ میونسپل چیئرمین تو ہو ہی جائیں گے۔

(کشور دروازے کی طرف بڑھتا ہے کہ اسی وقت سریش بہت گھبرائے ہوئے انداز میں داخل ہوکر)

سریش: رمیش بابو غضب ہوگیا۔

رمیش: کیوں— خیریت تو ہے۔

سریش: پولیس نے اپنے گودام پر چھاپہ مار کر سارا مال برآمد کرلیا ہے۔ میں جانے

کیسے جان بچا کر یہاں آیا ہوں۔

رمیش: (گھبرا کر کھڑے ہوتے ہوئے) آخر یہ سب کیسے ہوا؟

سریش: ہوا کیسے؟ یہ بعد کی باتیں ہیں اس وقت پولیس میرے پیچھے ہے—
(رمیش کمرے میں ٹہلنے لگتا ہے۔ پھر ایک دم پلٹ کر سریش سے)

رمیش: تمھیں اس وقت یہاں نہیں آنا چاہیے تھا۔

سریش: کیوں نہیں آنا چاہیے تھا۔ (غصہ سے) صرف فائدے ہی فائدے کے ساتھی ہیں۔

رمیش: حماقت کی باتیں نہ کرو اگر تم یہاں سے گرفتار ہوئے تو میری پوزیشن خراب ہو جائے گی۔

سریش: (غصہ سے) کیا پوزیشن پوزیشن لیے پھرتے ہو۔ تمھاری جو کچھ پوزیشن ہے وہ میری وجہ سے ہے۔ لوگ مجھ سے ڈرتے ہیں اور تم میرے دوست ہو۔ اس لیے تمھاری بھی عزت کرنے لگے ہیں۔

رمیش: یہ فضول باتوں کا وقت نہیں ہے۔ تمھیں روپوش ہونے کی کوشش کرنا چاہیے۔

سریش: اور میں روپوش ہونے کے لیے ہی یہاں آیا ہوں۔

رمیش: میرا گھر مفروروں کے روپوش ہونے کے لیے نہیں ہے۔

سریش: (طنزیہ) صرف اسمگلنگ کی کمائی جمع کرنے کے لیے ہے رمیش بابو میں یہاں سے نہیں جا سکتا۔

رمیش: تو پھر مجھے پولیس کو فون کر کے تمھیں گرفتار کرا دینا پڑے گا۔

سریش: (رمیش کا گریبان پکڑ کر) اس وقت پولیس یہاں سے ایک اسمگلر کو ہی نہیں ایک قاتل کو بھی گرفتار کرے گی۔
(رمیش ڈر سا جاتا ہے۔ پھر گریبان چھڑا کر)

رمیش: ہوش میں آؤ سریش چودھری— تم جیسا آدمی پولیس سے اس قدر خوفزدہ ہے۔ تعجب کی بات ہے۔

سریش: میں پولیس سے نہیں ڈرتا۔ تم جیسے بزدلوں سے ڈرتا ہوں جو دوستی کے پردے

میں پیچھے سے چھرا گھونپتے ہیں۔

رمیش: مگر پولیس کو اس کا علم ہوا کیسے؟

سریش: سب گنیش مہاراج کے لوگوں کی حرکت ہے۔

رمیش: خیر گنیش مہاراج کا انتظام ہوا جاتا ہے۔

سریش: اب گنیش مہاراج کا کچھ نہیں بگڑ سکتا۔

رمیش: کیوں؟

سریش: پولیس نے افیم کے جو پیکٹ اپنے یہاں سے برآمد کیے ہیں ان پر وہی نشانات ہیں جو گنیش مہاراج کے ٹرک سے برآمد کیے گئے پیکٹوں پر تھے۔

رمیش: یہ سب تمھاری غفلت کا نتیجہ ہے جب اس سے اس قدر دشمنی تھی تو تمھیں احتیاط برتنا چاہیے تھی۔

سریش: گنیش مہاراج سے مخالفت مول لینا ہی حماقت تھی مگر تم میونسپل چیرمین بننے کے ایسے خواب دیکھ رہے تھے کہ آگا پیچھا دیکھنا ہی بھول گئے۔

رمیش: دشمن کو ہر طرح ذلیل کرنا ہی چاہیے۔

سریش: مجھے تم سے اسی وقت نفرت ہوگئی تھی جب تم نے گنیش مہاراج کی بیوی کو بلیک میل کرنے کی کوشش کی تھی۔ اس نے مجھے سب کچھ بتلا دیا ہے کہ تم کس قدر ذلیل ہو۔

رمیش: اس کی شرافت کو ہم اپنا اوڑھنا۔ بچھونا نہیں بنا سکتے۔

سریش: ہاں اس لیے کہ تم نے جو لبادہ اوڑھ رکھا ہے اس میں شرافت کا گزر نہیں ہے۔ دوسرے کی شرافت اور پاکیزگی کو مجروح کرنا تم اپنی کامیابی سمجھتے ہو۔

(رادھا کمرے میں داخل ہوتے ہوئے طنزیہ مسکرا کر)

رادھا: یہ ان کی پرانی عادت ہے۔

رمیش: (غصہ سے) رادھا! تمھیں یہاں آنے کو کس نے کہا تھا۔

رادھا: تو اب میں پردے میں بیٹھ جاؤں۔ جس کو تم نے سڑکوں پر ننگا کر دیا ہے۔

اب اس سے تم پردے میں بیٹھنے کی امید رکھتے ہو۔

رمیش: رادھا بکواس بند کرو میں اس وقت بہت پریشان ہوں۔

رادھا: (نفرت اور غصہ سے) تم اس وقت پریشان نہیں ہوئے جب تم نے اپنے نفع کی خاطر میری آتما کا خون کیا اور مجھے ایک طوائف سے بدتر بنا کر اپنا ہر جائز فائدہ اٹھاتے رہے۔

رمیش: (غصہ سے) رادھا! اگر تم نے زیادہ بکواس کی تو میں تمھارا گلا گھونٹ دوں گا۔

رادھا: جس کی آتما کا گلا گھونٹ دیا گیا ہو اگر گلا بھی گھونٹ دیا جائے تو اسے کیا تکلیف ہوگی۔ تم آج تک دنیا کو یہ دھوکا دیتے رہے ہو کہ میں تمھاری پتنی ہوں۔

رمیش: (زور سے چیخ کر) رادھا— (غصہ سے دونوں مٹھیاں بند کر لیتا ہے۔ پھر رادھا کا گلا پکڑ کر) میں تیری جان لے لوں گا۔

(کشور رادھا کو چھڑا کر علاحدہ کرتے ہوئے)

کشور: بھائی صاحب۔ کیا پاگل ہو گئے ہو۔

رادھا: کشور۔ انھیں میرا گلا گھونٹنے دو۔ یہ میرا گلا نہیں گھونٹ سکتے میں تو ان کے ہاتھ میں ایک درشنی ہنڈی ہوں۔

سریش: رمیش بابو! تم کس قدر نیچ اور ذلیل ہو کبھی تم نے اس پر کبھی غور کیا ہے۔ (ہنس کر) میں تو ایک غنڈہ ہوں مگر میں نے آج تک کسی عورت پر ہاتھ نہیں اٹھایا۔

رمیش: سریش! تم خاموش رہو یہ میری بیوی ہے۔

رادھا: بیوی! (قہقہہ مار کر ہنستی ہے) ان میں خودداری ہے ہی کہاں (رمیش کی طرف دیکھ کر) تم نے کس روز مجھے اپنی بیوی بنایا، کس روز پوتر اشلوک پڑھے گئے۔ کس دن تم نے مجھے اپنی پتنی کے روپ میں قبول کیا۔

رمیش: رادھا— میں تم کو—

رادھا: (بات کاٹ کر) بس زیادہ نہ بولو۔ میں اس کے ساتھ ہوں جس کے پاس پیسہ ہے۔ آؤ کشور اس جہنم سے نکل چلیں۔

دھوئیں کے آنچل

دھوئیں کے آنچل

ایک عرض

اردو ڈراما عجیب عجیب افواہوں کا شکار ہے۔ یہ کہ اردو میں ڈراما ہے ہی نہیں جو کچھ ہے بھی تو وہ معیاری نہیں۔ اردو ڈرامے پر اس تنقید اور تبصرہ کرنے والے وہ حضرات ہیں جن کو ڈرامے سے کوئی دلچسپی نہیں اور جب دلچسپی نہیں تو کیا ضرورت ہے کہ اس پر تحقیق اور جستجو کی جائے جن حضرات کو اردو ڈراما غیر معیاری نظر آتا ہے وہ بدقسمتی سے رہتے ہندستان میں ہیں بولتے اردو ہیں مگر غور و فکر یورپین فضا میں کرتے ہیں۔ اگر کوئی چیز یورپین معیار پر پوری نہیں اترتی تو وہ ان کے نزدیک غیر معیاری ہوجاتی ہے۔ کچھ حضرات کو یہ شکایت ہے کہ ہمارا ڈراما یورپین ڈرامے کے مقابلہ میں نوٹنکی معلوم ہوتا ہے۔ گویا نوٹنکی کوئی گالی ہے جس کو برداشت نہیں کیا جاسکتا حالانکہ نوٹنکی ہماری تہذیبی روایت ہے اور ہر تہذیبی روایت قابل احترام ہوتی ہے اگر اردو ڈرامے پر نوٹنکی کے اثرات ہیں تو یہ قابلِ ستائش ہیں نہ کہ قابل لعنت، اگرچہ یہ نوٹنکی والی بات بھی ایک افواہ ہی ہے۔ ایک افواہ یہ بھی ہے کہ اردو کے ابتدائی ڈراما نگار کم پڑھے لکھے بلکہ جاہل لوگ تھے ان کو یورپین ڈرامے کے بارے میں علم نہیں تھا۔ اردو کے پڑھے لکھے اور شہرت یافتہ ادیبوں نے جن کو یورپین ڈرامے کا بھی علم تھا ڈرامے کو منہ کیوں نہیں لگایا؟ اسی لیے نا کہ ان کے نزدیک ڈرامے لکھنا غیر مہذب حرکت تھی اور غیر شریفانہ عمل؟ جس صنف کے بارے میں اس قدر تعصب پھیلا ہوا ہو اس کے متعلق ہر افواہ پر لوگ خواہ مخواہ یقین کر لیتے ہیں۔

خدا بھلا کرے ڈاکٹر نامی اور پروفیسر فصیح احمد صدیقی کا کہ انھوں نے اپنی تحقیق اور جستجو سے اس افواہ کی تردید کردی کہ اردو میں ڈراما ہے ہی نہیں۔ اردو ڈراما ہے ہی نہیں عجیب پیچیدہ جملہ ہے اس کا ایک مطلب تو بڑا سیدھا سادھا ہے کہ اردو زبان کا وہ ورق بالکل سادہ ہے جس پر ڈراما لکھا ہوا ہے اس کا دوسرا مطلب یہ ہے کہ اردو ڈراما اس معیار کا نہیں جو معیار دوسری اصناف کا ہے، میں ایک سوال کرتا ہوں۔ اردو میں کتنے ایسے ناول ہیں جن کو عالمی معیار کے مقابلہ میں پیش کیا جاسکے۔ آپ دو چار نام پیش کردیں گے۔ چلیے صاحب میں آٹھ دس مان لیتا ہوں اب اگر ڈرامے کے ساتھ بھی ایسا ہی کچھ ہے تو اس پر یہ عتاب کیوں؟

حقیقت یہ ہے کہ اس یتیم کی طرف دھیان ہی نہیں دیا گیا اردو میں ہر سال جتنے تحقیقی مقالے لکھے جاتے ہیں ان میں کتنے ڈرامے پر ہوتے ہیں۔ اردو میں جتنی ڈاکٹریٹ کی ڈگریاں دی گئی ہیں ان میں کتنی ڈرامے پر ہیں۔ ہماری یونیورسٹیوں میں کیا اردو ڈرامے کو علاحدہ صنف کے طور پر پڑھایا جاتا ہے کیا آج تک 'اندرسبھا'، 'امانت' یا 'انارکلی' کے علاوہ کسی اور ڈرامے کا علم ہی نہیں ہے۔ اگر ہے تو پھر ان کو کیوں نظرانداز کیا جاتا ہے۔ سچ بات تو یہ ہے کہ ڈرامے کے بارے میں ابتدا میں جو تعصب پیدا ہوگیا تھا وہ آج تک قائم ہے اور جب تک یہ تعصب دور نہ ہوگا، اردو ڈراما ترقی نہیں کرے گا۔ کہا جاتا ہے کہ اردو کے پاس اسٹیج نہیں ہے اس لیے ڈرامے کی طرف دھیان نہیں دیا جاتا۔ میں کہتا ہوں اچھے ڈرامے لکھے جائیں اسٹیج خود بخود مل جائے گا۔ آج بھی اردو کے ڈرامے ہندی کے نام سے اسٹیج ہوتے رہتے ہیں اور اردو تلفظ کا دل کھول کر قتل عام کیا جاتا ہے اور اسی طرح اردو کے سرمائے پر دوسرے لیبل چسپاں ہوتے رہتے ہیں۔

یہ چند مسائل ہیں جن پر غور کرنے کی ضرورت ہے۔ میری ناقدین اور محققین سے بھی عرض ہے کہ وہ ڈرامے پر بھی سنجیدگی سے غور فرمائیں ڈراما اگر تحقیق کا موضوع ہو تو ایمان داری سے اس پر کام کریں صرف ڈگری حاصل کرنے کے لیے کسی تعصب اور ادبی سیاست کا شکار نہ ہوں۔ یہ ڈرامے کی بڑی خدمت ہوگی۔

ابراہیم یوسف

16 نیم روڈ، امامی گیٹ، بھوپال

15 اکتوبر 1975

وقت کے کراہتے رنگ

افرادِ تمثیل

(1) عاصم (2) خدیجہ بیگم (عاصم صاحب کی بیوی) (3) عظمت خالا (گھر کی ملازمہ جس کی سب عزت کرتے ہیں) (4) عالیہ (عاصم صاحب کی بیوہ بہو) (5) شارق (عاصم صاحب کا بھتیجا) (6) شریف (عالیہ کے والد)

پہلا سین

منظر

ایک درمیانی طبقہ کا ڈرائنگ روم جس میں دائیں جانب ایک دروازہ ہے جو مکان سے باہر آنے جانے کا کام دیتا ہے۔ اس پر نیلے رنگ کا پردہ پڑا ہوا ہے اس میں ایک کھڑکی ہے جس میں لوہے کی سلاخیں لگی ہیں اور اس میں سے باہر کی جانب ایک اور دروازہ ہے جس پر پردہ تو ہے مگر اس وقت اٹھا ہوا ہے جس میں سے ایک کوریڈور نظر آرہا ہے۔ اس کوریڈور کے دونوں جانب کمرے ہیں جن کے دروازوں پر پردے پڑے ہیں جو اس وقت ہوا سے ہل رہے ہیں یہ کوریڈور اسٹیج ہی کا حصہ معلوم ہوتا ہے کیونکہ اس میں چلنے

پھرنے والے لوگ اسٹیج پر سے نظر آتے ہیں اسی دیوار سے لگا ہوا ایک پرانے طرز کا صوفہ سیٹ رکھا ہے اور اس کے سامنے ایک چھوٹی سی میز ہے دیواروں پر چند تصاویر آویزاں ہیں۔

صبح کا وقت اور سردی کا موسم ہے۔ خدیجہ بیگم ایک شال میں لپٹی ہوئی بیٹھی ہیں۔ چہرے پر اداسی چھائی ہوئی ہے اور نظریں جہاں جم جاتی ہیں وہیں جمی رہتی ہیں۔ کچھ دیر بعد عظمت خالا کوریڈور میں سے گزر کر کمرے میں آتی ہیں عمر ساٹھ سال کے قریب ہوگی مگر صحت اچھی ہے۔ کچھ دیر خاموشی سے خدیجہ بیگم کے پاس خاموش کھڑی رہتی ہیں پھر آہستہ سے۔

عظمت خالا: بہو بیگم! آخر کب تک یوں ہی بیٹھی رہوگی۔ کچھ پتا بھی ہے کیا بج رہا ہے۔ (خدیجہ بیگم نظریں اٹھا کر دیکھتی ہیں) سارا ناشتہ ٹھنڈا مٹی ہوگیا (خدیجہ بیگم کی آنکھوں میں آنسو آجاتے ہیں) جو خدا کو منظور تھا وہ ہوگیا۔ اب رونے پیٹنے سے کیا ہوگا (خود عظمت خالا کی آنکھوں میں آنسو آجاتے ہیں وہ دوسری طرف منہ پھیر کر دوپٹے کے پلو سے انھیں پونچھتی ہیں) ادھر عاصم میاں ہیں کہ دروازہ بند کیے پڑے ہیں۔ دوبار دروازہ کھٹکھٹا چکی ہوں بس ہوں ہاں کرکے رہ جاتے ہیں (بزرگانہ انداز اور پرخلوص لہجے میں) ایسا سوگ مناتے تو ہم نے کسی کو نہیں دیکھا۔

خدیجہ بیگم: جوان بیٹے کی لاش پر تو رو پیٹ کر چپ ہوگئی تھی خالا (آنسو آجاتے ہیں انھیں پلو سے پونچھ کر) کل عالیہ کی زندہ لاش نہیں دیکھی گئی۔ کلیجہ پھٹ گیا۔

عظمت خالا: بی بی ہوش کی دوا کرو۔ میرے منہ میں خاک زندہ لاش اٹھے دشمنوں کی دو چار دن باپ کے گھر رہ کر لوٹ آئیں گی۔ کوئی غیر ملک تو چلی نہیں گئی ہیں۔

خدیجہ بیگم: بہو بیٹے سے ہوتی ہے عظمت خالا جب بیٹا ہی نہ رہا تو (کچھ دیر رک کر) رات بھر کلیجے پر آرے چلتے رہے۔

عظمت خالا: خدا کی مرضی میں کس کو دخل ہے بہو بیگم (عقبی دروازے کی طرف جاتے

ہوئے) میں عاصم میاں کو بلاتی ہوں زندہ رہنے کے لیے کچھ تو پیٹ میں پڑے رات سے ایک نوالا منہ میں نہیں گیا۔ کوریڈور میں جاکر دائیں جانب کا دروازہ کھٹکھٹاتی ہیں اور پھر مڑکر بائیں جانب کے کمرے میں چلی جاتی ہیں۔ کچھ دیر بعد عاصم اپنے کمرے سے نکلتے ہیں۔ کمرے میں آکر دیوار پر لگی ہوئی عالیہ کی تصویر کو دیکھتے ہیں۔ چند سیکنڈ اس کے پاس رکتے ہیں۔ ایک چور نظر خدیجہ بیگم پر ڈالتے ہیں پھر خدیجہ بیگم کے قریب آتے ہوئے)

عاصم: آپ نے ناشتہ کرلیا (خدیجہ بیگم خاموش رہتی ہیں ان کے پاس صوفے پر بیٹھ کر بلند آواز سے) عظمت خالا۔ عظمت خالا۔

آواز: آئی عاصم میاں۔ ناشتہ وہیں لا رہی ہوں۔

خدیجہ بیگم: (عاصم کی طرف دیکھ کر) اب کہاں جانے کی تیاری کرلی۔

عاصم: میں نے سوچا کہ (کچھ دیر خاموش رہ کر ٹھنڈی سانس بھر کر) میں بھلا کہاں جاؤں گا۔ (اپنے لباس کی طرف دیکھ کر) وہ تو میں نے یونہی — میرا مطلب ہے ذرا گھومنے جانے کا ارادہ تھا مگر اب وقت زیادہ ہوگیا ہے۔

خدیجہ بیگم: گھومنے جارہے تھے (انھیں ایسی نظروں سے دیکھتی ہیں جیسے ان کا جھوٹ پکڑلیا ہو) آپ ضرور۔

عاصم: نہیں نہیں خدیجہ — (بلند آواز سے بات ٹالنے کے انداز میں) عظمت خالا — عظمت خالا۔

خدیجہ بیگم: (تھوڑی دیر خاموش رہ کر) میں منع تو نہیں کررہی ہوں (آنکھوں میں آنسو بھر کر) دیکھ آیئے کل جاتے وقت وہ بھی بدحال ہوگئی تھی۔ اب جانے کس حال میں ہے۔

عاصم: (سوچتے ہوئے) مگر خدیجہ کہیں وہ لوگ — میرا مطلب ہے اب تو ہم اس کے لیے غیر ہیں۔

خدیجہ بیگم: غیر! نہیں نہیں ایسا نہ کہیے۔ کہیں ایک رات میں بھی کوئی غیر ہوجاتا ہے۔

عاصم: ہاں ہونا تو نہیں چاہیے اور پھر ہم نے اسے بہو کب سمجھا۔ بیٹی سمجھا ہے۔
(عظمت خالا ناشتہ لے کر آتی ہیں دونوں انہیں دیکھ کر خاموش ہوجاتے ہیں۔ عظمت خالا ناشتہ سامنے کی میز پر رکھ کر پرخلوص لہجے میں)

عظمت خالا: آخر تم لوگوں کو ہو کیا گیا ہے۔ کھاؤ گے نہیں تو زندہ کیسے رہو گے۔ بھئی خدا گواہ۔ اولاد کس کی نہیں مرتی مگر ایسا سوگ مناتے کسی کو نہیں دیکھا (عاصم کی طرف دیکھ کر) اب کہاں کی تیاری ہے۔

عاصم: (کچھ دیر خاموش رہ کر سوچتے ہوئے) میں نے سوچا ذرا عالیہ کو دیکھ آؤں مگر کہیں وہ لوگ— اب تو وہ ہمارے لیے غیر ہے۔

عظمت خالا: کیسی غیر! عاصم میاں بوڑھے ہونے کو آئے پر عقل نہ پائی، کہیں بہو بھی غیر ہوتی ہے۔

عاصم: (ایسے لہجے میں جیسے اب ان میں خوداعتمادی پیدا ہوگئی ہو) اچھا تو چلا ہی جاتا ہوں (خدیجہ بیگم کی طرف دیکھ کر) تم بھی چلتی ہو تو چلو گھڑی دو گھڑی ٹھہر کر آجائیں گے۔

(خدیجہ بیگم عظمت خالا کو اس طرح دیکھتی ہیں جیسے ان کی رائے لے رہی ہوں۔ عظمت خالا خاموش رہتی ہیں کچھ دیر بعد خدیجہ بیگم ایسے لہجے میں جس میں مایوسی ہے)۔

خدیجہ بیگم: اس وقت آپ ہی چلے جایئے۔ میں پھر کسی وقت چلی جاؤں گی۔

عاصم: (پیالی میز پر رکھ کر کھڑے ہوتے ہوئے) اچھا تو میں چلتا ہوں۔

خدیجہ بیگم: جلدی لوٹ آیئے گا (عاصم دروازے کی طرف بڑھتے ہیں) اور ہاں سنیے تو (عاصم مڑ کر دیکھتے ہیں خدیجہ بیگم ملتجیانہ لہجے میں) اگر ہوسکے تو اسے ساتھ لے آیئے گا۔ شام واپس چلی جائیں گی۔ یہ سونا سونا گھر مجھے کھانے کو دوڑ رہا ہے۔

عظمت خالا: بہو بیگم ایک دو دن تو صبر کرو۔ بھئی تم لوگوں کی وحشت مجھے باولی کردے گی۔

(عاصم کی طرف دیکھ کر) عاصم میاں ابھی ان سے ایسی کوئی بات نہ کرنا دو چار دن تو بے چاری باپ کے ساتھ رہے (خدیجہ بیگم نظریں اٹھا کر عظمت خالا کو دیکھتی ہیں مگر خاموش رہتی ہیں۔ عاصم کمرے سے چلے جاتے ہیں۔ عظمت خالا خدیجہ بیگم کی طرف دیکھ کر) اب چائے ٹھنڈی ہو رہی ہے اسے تو پی لو۔

خدیجہ بیگم: (پیالی اٹھا کر) پی تو رہی ہوں۔

عظمت خالا: خاک پی رہی ہو اب یونہی گھل گھل کر جان دینا ہے تو پہلے مجھے گھر سے نکال باہر کرو۔ (آنکھوں میں آنسو بھر کر) جسے اپنے ہاتھوں سے دلہن بنا کر لائی تھی اسے یوں جان کھوتے نہیں دیکھ سکتی۔ بی بی مرے ہوئے کو بھی اس سے دکھ ہوتا ہے۔

خدیجہ بیگم خاموش رہ کر چائے پینے لگتی ہیں کہ دروازے پر دستک ہوتی ہے۔ عظمت خالا اور خدیجہ بیگم دونوں دروازے کی طرف دیکھتی ہیں پھر دستک)

خدیجہ بیگم: دیکھنا عظمت خالا کون ہے۔

عظمت خالا: اچھا۔۔ کون ہے؟ (باہر چلی جاتی ہیں پھر باہر سے آواز) ارے شارق میاں کب آئے۔ آؤ آؤ باہر کیوں کھڑے ہو (دروازے کا پردہ ایک طرف کرکے) بہو بیگم شارق میاں آئے ہیں۔۔ آؤ آؤ اندر آجاؤ۔

(شارق کمرے میں آتا ہے۔ دو چار قدم آگے بڑھ کر کھڑا ہو جاتا ہے اور خدیجہ بیگم کو دیکھتا ہے عظمت خالا پھر باہر چلی جاتی ہیں۔۔

(خدیجہ بیگم کھڑی ہو کر)

خدیجہ بیگم: آؤ نہ شارق میاں وہاں کیوں کھڑے ہو گئے۔

(شارق آگے بڑھ کر خدیجہ بیگم سے لپٹ کر روتے ہوئے گلے سے)

شارق: چچی جان۔

خدیجہ بیگم: (آنکھوں میں آنسو بھر کر) صبر کرو شارق میاں صبر کرو خدا کی مرضی یونہی تھی۔ (اپنے آنسو پونچھ کر) بیٹھو۔۔ (شارق اسی طرح لپٹا رہتا ہے۔ خدیجہ بیگم

محبت سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرتی ہیں پھر... اس کے بازو پکڑ کر صوفے پر بٹھلاتے ہوئے) بیٹھو۔

شارق: (صوفے پر بیٹھتے ہوئے) مجھے تو پرسوں ہی اس حادثے کا علم ہوا۔

خدیجہ بیگم: (اس کے پاس بیٹھ کر) پرسوں! میں نے تو دوسرے ہی دن تم کو خط لکھ دیا تھا۔

شارق: چار مہینے بعد ٹور سے لوٹا تو امی نے آپ کا خط دیا۔ آخر یہ سب کچھ ہوا کیسے۔

خدیجہ بیگم: اب کیا بتلاؤں۔ سب قسمت کے کھیل ہیں۔ تقدیر کے آگے کس کی پیش گئی ہے۔

شارق: پھر بھی— خط میں آپ نے کچھ تفصیل نہیں دی تھی۔ ان دنوں امی بے حد پریشان ہیں۔

خدیجہ بیگم: کیا لکھتی۔ جو ہونا تھا سو ہوگیا۔ دفتر جارہا تھا کہ ایکسیڈنٹ ہوگیا اور پھر (ٹھنڈی سانس بھر کر) لاش ہی گھر میں آئی۔

شارق: (کچھ دیر خاموش رہ کر) سوچا تھا کہ ٹور سے واپس آؤں گا تو سیدھا ادھر ہی آؤں گا۔ بھائی صاحب کی شادی پر امی کی بیماری کی وجہ سے نہ آسکا تھا (کچھ دیر خاموش رہ کر) بھابی کہاں ہیں۔

خدیجہ بیگم: عدت کے دن پورے کرنے اپنے میکے گئی ہیں (کچھ دیر خاموش رہ کر) تمھاری امی نہیں آئیں۔

شارق: چار مہینے تک تو اسپتال میں داخل رہیں۔ آنے کا تو کہہ رہی تھیں مگر اس قدر کمزور ہوگئی ہیں کہ ان کے لیے سفر کرنا ممکن نہیں ہے۔ چچا جان کہاں ہیں۔

خدیجہ بیگم: عالیہ سے ملنے اس کے گھر گئے ہیں آتے ہی ہوں گے۔ میں تو روز ہی تمھاری راہ دیکھتی رہی مجھے یقین تھا کہ تم ضرور آؤ گے۔

شارق: کیا بتلاؤں چچی جان ٹورنگ ایجنٹ ہونا دنیا کا سب سے بڑا گناہ ہے۔ ایک مرتبہ کھانے کے بعد پتا نہیں ہوتا کہ دوسرا کب اور کہاں ملے گا۔

خدیجہ بیگم: اب تم منہ ہاتھ دھو ڈالو— عظمت خالا (مڑ کر دروازے کی طرف دیکھ کر) تم بیٹھو میں تمھارے لیے چائے لاتی ہوں۔

(خدیجہ بیگم میز پر سے کیتلی اٹھا کر کوریڈور میں چلی جاتی ہیں۔ شارق کمرے کا جائزہ لینے لگتا ہے کھڑا ہو کر عالیہ کی تصویر کے پاس جاتا ہے اسے غور سے دیکھنے لگتا ہے کہ عظمت خالا ایک ہولڈال اٹھائے ہانپتی کانپتی کمرے میں آتی ہیں شارق مڑ کر انھیں دیکھ کر—)

شارق: ارے عظمت خالا آپ کیوں اٹھا لائیں۔ لاحول ولا قوۃ میں تو بھول ہی گیا تھا۔

عظمت خالا: اٹھا لائی تو کہاں کا غضب ہو گیا۔

شارق: غضب کیوں نہیں ہو گیا سوٹ کیس باہر ہی ہے؟ (کمرے سے باہر جاتا ہے کچھ دیر بعد سوٹ کیس لے کر واپس آتا ہے اسے زمین پر رکھ کر) ایک نوکر بھی تو تھا عظمت خالا۔

عظمت خالا: (کچھ پس و پیش کے انداز میں) وہ تو کب کا نوکری چھوڑ کر چلا گیا۔

شارق: (عظمت خالا کا چہرہ دیکھ کر) کیوں؟

عظمت خالا: کام چور تھا اور عاصم میاں کہنے لگے گھر بیٹھے بیٹھے دل گھبراتا ہے ایک آدھ چکر بازار ہی کا لگا آیا کروں گا۔

شارق: (سوچتے ہوئے) اب گھر کا سودا سلف چچا جان کرنے لگے ہیں۔

عظمت خالا: کہاں شارق میاں۔ وہ بھی میں ہی کرتی ہوں۔ (مسکرا کر) کبھی کبھار چلے جاتے ہیں تو دوکاندار سے لڑ جھگڑ آتے ہیں۔

شارق: مگر اس سے پہلے تو— (خدیجہ بیگم کیتلی ہاتھ میں لیے ہوئے آتی ہیں شارق انھیں دیکھ کر) ارے چچی جان آپ نے کیوں تکلیف کی۔

خدیجہ بیگم: کیسی تکلیف (عظمت خالا کی طرف دیکھ کر) عظمت خالا پانی گرم کر دو۔ نہا لیں گے تھکے ہوئے آئے ہیں (عظمت خالا کوریڈور میں چلی جاتی ہیں خدیجہ بیگم چائے کی پیالی شارق کو دے کر) ایک پیالی پی کر نہالو۔ جب تک میں ناشتہ تیار کرتی ہوں۔

شارق: اب کیا ضرورت ہے (پلیٹ میں سے ایک بسکٹ اٹھا کر منہ میں رکھتے

ہوئے) یہ اتنا تو موجود ہے (کچھ دیر خاموشی سے ناشتہ کرتا رہتا ہے پھر خدیجہ بیگم کی طرف دیکھ کر) اب بھابی شاید میکے ہی میں رہیں گی۔

خدیجہ بیگم: (ٹھنڈی سانس بھر کر) اس کی مرضی ہے چاہے جہاں رہے (شارق پھر خاموشی سے ناشتہ کرنے لگتا ہے۔ کچھ دیر بعد عظمت خالا کمرے میں آ کر)

عظمت خالا: شارق میاں پانی گرم ہو گیا ہے غسل خانے میں رکھ دوں۔

شارق: میں خود رکھ لوں گا (آپ کیوں تکلیف کرتی ہیں (کھڑے ہو کر) چلیے۔

خدیجہ بیگم: اور عظمت خالا شارق میاں کا سامان ان کے چچا کے کمرے میں رکھ دو۔ (کسی قدر شرمندگی کے لہجے میں) بھئی شارق میاں معاف کرنا تمھیں تکلیف تو ہوگی ہم نے آدھا مکان کرائے پر اٹھا دیا ہے۔

شارق: اس میں تکلیف کی کیا بات ہے۔ کچھ چچا جان کی خدمت ہی کا موقع مل جائے گا (عظمت خالا کے ساتھ کوریڈور میں... چلا جاتا ہے خدیجہ بیگم کچھ دیر یونہی بے مقصد بیٹھی رہتی ہیں پھر چائے کے برتن کشتی میں رکھتی ہیں کہ عالیہ کمرے میں آتی ہے (خدیجہ بیگم اسے حیرت سے دیکھ کر)

خدیجہ بیگم: ارے عالیہ بیٹی— تم—

عالیہ: (ایک دم خدیجہ بیگم سے لپٹ کر ہچکیوں سے روتے ہوئے) امی میں وہاں نہیں رہ سکتی۔ وہ گھر مجھے کھانے کو دوڑ رہا ہے۔ میں وہاں نہیں رہ سکتی۔

خدیجہ بیگم: (محبت سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے) تم سے وہاں رہنے کو کون کہتا ہے یہ تمھارا گھر ہے (اپنے پلو سے اس کے آنسو پونچھ کر) بیٹھ جاؤ۔ (صوفے پر بٹھلاتی ہیں) تم اس قدر پریشان کیوں ہو؟ تمھارے ابا حضور کہاں ہیں؟

عالیہ: ابا حضور!

خدیجہ بیگم: وہ تو تم سے ہی ملنے گئے ہیں کیا تم ان کے ساتھ نہیں آئیں۔

عالیہ: میں خود چلی آئی مجھے وہاں رات کاٹنا دوبھر ہو گیا تھا۔

خدیجہ بیگم: خود چلی آئی! اکیلی!! مگر بیٹی۔

عالیہ: مگر کیا امی؟

خدیجہ بیگم: تجھے اکیلی نہیں آنا چاہیے تھا کسی کو ساتھ لے لیا ہوتا۔ یہاں خبر پہنچا دی ہوتی میں عظمت خالا کو بھیج دیتی۔

عالیہ: (حسرت بھرے لہجے میں) اب میرا کیا ہے امی۔ ایک بیوہ جو ٹھہری (خدیجہ بیگم خاموش رہتی ہیں عالیہ ان کا چہرہ دیکھتے ہوئے آنسو پونچھ کر) کیا اس گھر کا دروازہ آپ میرے لیے بند کر رہی ہیں۔

خدیجہ بیگم: نہیں بیٹی گھر تیرا ہے۔ (عالیہ کا سر اپنے سینے سے لگا کر) اب میں تجھے یہاں سے جانے ہی نہیں دوں گی (بلند آواز سے) عظمت خالا عظمت خالا ادھر تو آؤ (عالیہ کی طرف دیکھ کر) بیٹی برقع اتار کر منہ ہاتھ دھو لے (عظمت خالا کمرے میں آتی ہیں عالیہ کو دیکھ کر چہرے پر حیرت کے آثار پیدا ہوتے ہیں۔ (خدیجہ بیگم مسرت آمیز لہجے میں) عالیہ آگئی ہے۔ اب یہ ہمارے ہی ساتھ رہے گی۔

عظمت خالا: (نظروں سے کمرے کا جائزہ لیتے ہوئے) عاصم میاں کہاں ہیں۔

خدیجہ بیگم: ان کا کیا ہے جانے کہاں رک گئے۔ ابھی وہاں پہنچے ہی کہاں ہیں۔ یہ تو خود چلی آئی ہے۔

عظمت خالا: خود چلی آئی ہیں!

خدیجہ بیگم: تو کہاں کا پہاڑ ٹوٹ پڑا (عالیہ سے) جا بیٹی تو منہ ہاتھ دھو لے (عظمت خالا سے) تم ذرا ناشتہ تیار کرلو ہائے بے چاری نے کچھ کھایا بھی ہے یا نہیں (عالیہ کے سر پر ہاتھ پھیر کر) جا بیٹی منہ ہاتھ دھو لے۔

(عالیہ برقع اتار کر صوفے پر ڈال دیتی ہے اور کوریڈور کی طرف بڑھتی ہے کہ عاصم صاحب کمرے میں آتے ہیں اور عالیہ کو دیکھ کر)

عاصم: عالیہ

(عالیہ مڑ کر عاصم صاحب کو دیکھتی ہے اور سلام کرتی ہے۔ خدیجہ بیگم دونوں کے بولنے سے پہلے)

خدیجہ بیگم: بیٹی تو جا کر منہ ہاتھ دھو لے (عالیہ ہچکچاتی ہے) جا بیٹی زندگی پڑی ہے بات چیت کرنے کو۔

(عالیہ اور عظمت خالا دونوں کوریڈور میں جاتی ہیں۔ عاصم بے چینی سے کمرے میں ٹہلتے ہیں پھر خدیجہ بیگم سے)

عاصم: عالیہ کب آئی۔

خدیجہ بیگم: ابھی آئی ہے (عاصم کا چہرہ دیکھ کر) کیوں کیا بات ہے۔

عاصم: (سوچتے ہوئے) کوئی بات نہیں۔

خدیجہ بیگم: یہ اس کا گھر ہے یہاں نہیں آئے گی تو اور کہاں جائے گی۔

عاصم: وہ تو سب ٹھیک ہے مگر اس کے باپ نے—

(خاموش ہو جاتے ہیں۔ خدیجہ بیگم سوالیہ نظروں سے انھیں دیکھ کر آہستہ سے)

خدیجہ بیگم: کیا انھوں نے کوئی ایسی ویسی بات کہی۔

عاصم: نہیں زبان سے تو کچھ نہ کہا مگر چہرے پر اچھے تاثرات نہیں تھے۔ آخر دو چار دن وہاں رہ لینے میں کون سی برائی تھی (پھر فکرمندی سے کمرے میں ٹہلنے لگتے ہیں کہ شارق کے سامان پر نظر پڑتی ہے) یہ کس کا سامان ہے۔

خدیجہ بیگم: شارق میاں کا۔ وہ ابھی ابھی آئے ہیں۔

عاصم: شارق کا۔ (طنزیہ) بھائی کی موت کا انھیں آج علم ہوا۔

خدیجہ بیگم: کہہ رہے تھے کہ وہ گھر پر نہیں تھے۔ پرسوں آئے اور پھر سیدھے ادھر آگئے۔

عاصم: اور ہماری بھاوج صاحبہ؟ وہ کہاں کے ٹور پر گئی ہوئی تھیں؟

خدیجہ بیگم: وہ تین چار مہینے سے سخت بیمار ہیں۔ اسپتال میں داخل تھیں۔

عاصم: سب جھوٹ اور مکاری ہے میں ان لوگوں کو اچھی طرح سمجھتا ہوں۔

خدیجہ بیگم: آپ تو بلاوجہ ان لوگوں کی طرف سے۔

عاصم: (بات کاٹ کر) تم ان لوگوں کی وکالت نہ کیا کرو بھائی جان کو ان لوگوں نے جو دکھ دیے ہیں وہ میں نہیں بھول سکتا۔

خدیجہ بیگم: اب بھلا گزری ہوئی باتوں کو اکھاڑنے سے کیا ملے گا۔

عاصم: میرا بھائی کسمپرسی کی موت مرگیا اور میں اسے گزری ہوئی بات سمجھ لوں۔ جانتی ہو وہ اب یہاں کیوں آیا ہے (خدیجہ بیگم سوالیہ نظروں سے عاصم کو دیکھتی ہیں) چچا کا واحد وارث بن کر (غصے سے کمرے میں ٹہلتے ہیں پھر جیسے خود سے کہہ رہے ہوں) زندگی بھر خوب کھایا اڑایا اور بڑھاپے میں جائداد پر قبضہ کرلیا اور صاحبزادے بھی ماں کے ہمدرد نکلے یہ انسان نہیں گدھ ہیں گدھ۔

خدیجہ بیگم: خدا کے لیے خاموش رہو۔ وہ محبت سے آئے ہیں ایسی باتیں کرنے سے کیا ملے گا۔

عاصم: کچھ نہیں ملے گا؟ میرے دل کو تو سکون ہوجائے گا۔

خدیجہ بیگم: ہاں تو پھر گھر کو پانی پت بنالو (طنزیہ) بہو یہ سب کچھ دیکھ کر بہت خوش ہوگی۔ (عاصم خاموش ہوجاتے ہیں اور کمرے میں ٹہلنے لگتے ہیں کہ شارق تولیہ سے سر پونچھتا ہوا کمرے میں آتا ہے۔ عاصم کو دیکھ کر بے حد ادب سے)

شارق: چچا جان۔ آداب عرض ہے (عاصم گردن ہلا کر جواب دیتے ہیں شارق چند سیکنڈ رک کر) مجھے تو پرسوں ہی اس حادثے کا علم ہوا۔ سیدھا ادھر ہی چلا آیا۔

عاصم: تمھاری ماں کو تو معلوم ہوگیا تھا۔ ہمدردی کے دو لفظ تو لکھ سکتی تھیں۔

شارق: وہ ان دنوں سخت بیمار ہیں اسپتال میں داخل تھیں۔

عاصم: اب ایسا بھی نہ ہوگا کہ دو لفظ کسی اور سے بھی نہ لکھوا سکتیں۔ تمھاری ماں کی ایک ایک بے اعتنائی میرے دل پر نقش ہے۔
(تیزی سے دوسرے کمرے میں چلے جاتے ہیں۔ شارق خاموش کھڑا رہ جاتا ہے)۔

خدیجہ بیگم: شارق میاں تم ان کی بات کا برا نہ ماننا۔ تمھارے بھائی کی موت کے بعد وہ

بالکل باؤلے سے ہو گئے ہیں۔

شارق: نہیں چچی جان بزرگوں کی بات کا کون برا مانتا ہے (چند سیکنڈ خاموش رہ کر) بھابی آگئیں۔

خدیجہ بیگم: ہاں ابھی ابھی چلی آئی ہے منہ ہاتھ دھو رہی ہے۔ دیکھو میں بلاتی ہوں (بلند آواز سے) عالیہ بیٹی۔ عالیہ بیٹی۔

(پردہ)

دوسرا سین

منظر

(کچھ دن بعد وہی کمرہ۔ شارق صوفے پر بیٹھا سگریٹ پی رہا ہے۔ عظمت خالا اس کے سامنے رکھی ہوئی میز پر سے چائے کے برتن کشتی میں رکھ رہی ہیں۔ شارق سگریٹ کا دھواں چھوڑ کر)

شارق: عظمت خالا بیٹھیے نا۔ آپ کو تو بات کرنے کی بھی فرصت نہیں۔

عظمت خالا: اب دیکھ تو رہے ہو بیٹا دن بھر کوئی نہ کوئی کام لگا ہی رہتا ہے۔

شارق: اس بڑھاپے میں آپ ہی کا دل گردہ ہے جو اتنا کام کرلیتی ہیں (کچھ دیر خاموش رہ کر) آپ کے لڑکوں سے تو ملاقات ہی نہیں ہوئی۔

عظمت خالا: اپنے اپنے دھندوں سے کہاں فرصت ہے بڑا ہے کپڑا مل میں کام کرتا ہے۔ بیوی بچوں میں پھنسا رہتا ہے۔

شارق: اب آپ کی عمر محنت کرنے کی نہیں ہے۔ اسی کے ساتھ رہا کیجیے نا۔

عظمت خالا: اس کے بھی بال بچے ہیں (حسرت بھرے لہجے میں) انھی سے کہاں فرصت ہے جو ماں کا خیال رکھے۔ (طنزیہ) جب بال بچہ ہونے والا ہوتا ہے مجھے دو چار دن کے لیے ضرور اپنے گھر بلا لیتا ہے۔

شارق: یہ تو اس کی بڑی زیادتی ہے۔ اسے آپ کا خیال رکھنا چاہیے۔

عظمت خالا: اس زمانے میں اپنے پیٹ ہی سے کہاں بچتا ہے شارق میاں جو دوسروں کا خیال رکھا جائے۔

شارق: یہ تو سب ٹھیک ہے مگر— اور ہاں چھوٹے صاحبزادے کیا کرتے ہیں؟

عظمت خالا: ایک ٹرک پر نوکر ہے دو چار آٹھ دن میں گھر آتا ہے تو وہ بھی مجھے لوٹنے کھسوٹنے۔

شارق: آپ کو لوٹنے کھسوٹنے۔

عظمت خالا: اور کیا پتا چل گیا ہے کہ بڑھیا نے چار پیسے بچا رکھے ہیں، بس انھی کی فکر میں لگا رہتا ہے۔ لاکھ بار کہہ چکی ہوں کہ وہ میری موت مٹی کے لیے ہیں پر سنتا کہاں ہے۔ خود کیا کماتا ہے مجھے آج تک پتا نہیں دیا (شارق خاموش رہتا ہے) ہزار بار کہتی ہوں کہ بیٹا اپنا گھر بسا لے مگر اس کان سنتا ہے اور اس کان اڑا دیتا ہے (ٹھنڈی سانس بھر کر) بڑا خراب زمانہ آگیا ہے ماں باپ کو تو کچھ سمجھتے ہی نہیں۔

شارق: (بے حد ہمدردی کے لہجے میں) دونوں بے حد نالائق ہیں یہ نہیں سوچتے کہ اب آپ کو آرام کی ضرورت ہے۔

عظمت خالا: ساری زندگی تو کام کرتے گزر گئی اب کیا خاک آرام کروں گی۔" کچھ گزر گئی جو باقی ہے وہ بھی گزر جائے گی۔ اب تو خدا سے یہی دعا ہے کہ ایمان پر خاتمہ ہو جائے۔

شارق: ای تو برابر کہتی رہتی ہیں کہ عظمت خالا کو یہیں بلا لے۔ گھر پر ایسا کوئی کام تو ہے نہیں بس پڑی رہیں گی۔

عظمت خالا: (غور سے شارق کو دیکھ کر) چالیس سال سے تو اسی گھر میں ہوں اب بڑھاپے میں چھوڑ کر کہاں جاؤں اب تو لاش ہی اس گھر سے نکلے گی۔

شارق: ای تو آپ کو اس قدر یاد کرتی ہیں کہ دن میں دو چار مرتبہ آپ کا ضرور ذکر آتا ہے۔

عظمت خالا: (فخریہ لہجے میں) انھیں بھی میں ہی دلہن بنا کر لائی تھی (ہنس کر) بھئی شارق میاں برا نہ ماننا تمھاری امی ہمیشہ کی ضدی اور غصے کی تیز ہیں (مسکرا کر) بات بات پر تمھاری پٹائی کر دیتی تھیں اور تم دوڑ کر میرے کلیجے سے لگ جاتے تھے۔

شارق: امی لیے تو چاہتا ہوں کہ اب کچھ آپ کی خدمت کروں۔

عالیہ: (کوریڈور میں سے) عظمت خالا۔عظمت خالا (کمرے میں آکر) آپ کو ابا حضور بلا رہے ہیں۔

عظمت خالا: اے لو۔ میں بھی کیسی باؤلی ہوں (برتن اٹھا کر) دو مرتبہ تو آواز دے چکے ہیں (کمرے سے چلی جاتی ہیں عالیہ بھی جانے کے لیے مڑتی ہے شارق اسے جاتے ہوئے دیکھ کر)

شارق: کہاں چلیں۔ بیٹھیے نا۔

عالیہ: (مڑ کر شارق کو دیکھ کر) کچھ کام پڑے ہیں انھیں دیکھ لوں۔ آپ نے ناشتہ کیا۔

شارق: جی ہاں۔ کرلیا۔ (صوفے کی طرف اشارہ کر کے) تشریف رکھیے۔ چچا جان ناشتہ پر نہیں آئے۔

عالیہ: انھوں نے کئی مہینوں سے ناشتہ کرنا چھوڑ دیا ہے۔ بس ایک پیالی چائے پی لیتے ہیں۔

شارق: کیوں۔

عالیہ: کچھ پیٹ میں خرابی رہتی ہے کھانا ہضم نہیں ہوتا۔

شارق: بڑھاپے میں اکثر ایسی شکایتیں پیدا ہوجاتی ہیں (عالیہ خاموش رہتی ہے۔ شارق کچھ دیر رک کر) آپ کو یہاں کوئی تکلیف تو نہیں ہے۔

عالیہ: تکلیف کیوں ہونے لگی (شارق کا چہرہ دیکھ کر) جو ناز برداریاں یہاں ہوتی ہیں وہ کبھی ماں باپ کے گھر پر نہیں ہوئیں۔

شارق: اب چچا چچی کا بیٹا ہی کون ہے جو کچھ ہیں آپ ہی ہیں۔

عالیہ: میں نے تو پہلے بھی انھیں ساس سسر نہیں ماں باپ ہی سمجھا تھا۔

شارق: اس سے بڑھ کر آپ کی نیکی اور کیا ہو سکتی ہے (سوچتے ہوئے کچھ دیر خاموش رہ کر) کبھی کبھی خدا بھی کسی کو زندگی دے کر یہ بھول جاتا ہے کہ اسے بھی زندہ رہنے کا حق ہے۔

عالیہ: (غور سے شارق کا چہرہ دیکھ کر) مگر مجھے خدا سے کوئی شکایت نہیں ہے۔

شارق: اگر شکایت ہو بھی تو ہم کر بھی کیا سکتے ہیں۔ آپ کو یوں غمگین دیکھ کر بخدا مجھے بڑا دکھ ہوتا ہے۔

عالیہ: شکریہ۔ اس ہمدردی کا (ٹالنے کے انداز میں) سنا تھا آپ کی شادی ہونے والی ہے۔

شارق: ماؤں کو شادی بیاہ کے علاوہ اور سوجھتا بھی کیا ہے۔

عالیہ: تنہا رہتی ہیں آپ کی شادی ہو جائے تو ان کی تنہائی دور ہو جائے گی۔

شارق: تنہائی کا واحد علاج شادی ہی تو نہیں ہے (عالیہ خاموش رہتی ہے شارق کچھ دیر خاموش رہ کر) میں ایک ٹورنگ ایجنٹ ہوں (مسکرا کر) ماں کی تنہائی ضرور دور ہو جائے گی مگر بیوی کی تنہائی کا مسئلہ پیدا ہو جائے گا۔ (پھر کچھ دیر خاموش رہ کر کھڑکی کی طرف جاتے ہوئے) آپ اپنے متعلق سوچیے آپ کی تنہائی۔

عالیہ: (بات کاٹ کر) میں اپنی تنہائی سے مطمئن ہوں۔
(واپس جانے کے لیے مڑتی ہے طارق اسے جاتا ہوا دیکھ کر)

شارق: ارے۔ شاید آپ نے میری بات کا۔۔۔

عالیہ: (بات کاٹ کر) ایک بیوہ اپنا مقام خوب پہچانتی ہے شارق صاحب۔

شارق: بیوگی کو آپ نے اپنا مقدر سمجھ لیا ہے (ہاتھ پر بندھی ہوئی گھڑی دیکھ کر) ارے نو بجنے والے ہیں جانے اب بس ملے گی بھی یا نہیں (تیزی سے دروازے کی طرف جاتے ہوئے(معاف کیجیے گا مجھے ایک ضروری کام ہے

(جواب کا انتظار کیے بغیر کمرے سے چلا جاتا ہے۔ عالیہ کچھ دیر خاموش کھڑی رہتی ہے اپنی تصویر کے پاس جاکر اسے دیکھتی ہے آنکھوں میں آنسو آجاتے ہیں۔ انھیں پونچھ کر کھڑکی کے پاس جاکر کھڑی ہوجاتی ہے جیسے اپنے جذبات پر قابو پانے کی کوشش کررہی ہو۔ (کچھ دیر بعد خدیجہ بیگم کوریڈور میں آکر)۔

خدیجہ بیگم: عالیہ (عالیہ مڑکر کوریڈور کی طرف دیکھتی ہے خدیجہ بیگم کمرے میں آتے ہوئے) اکیلی یہاں کیا کررہی ہے۔

عالیہ: (چند سیکنڈ رک کر) شارق صاحب کی ہمدردی قبول کررہی تھی۔

خدیجہ بیگم: شارق کی ہمدردی (سوچتے ہوئے) وہ کہاں چلا گیا۔

عالیہ: کسی ضروری کام سے چلے گئے ہیں۔

خدیجہ بیگم: تجھ سے کیا کہہ رہا تھا۔

عالیہ: (طنزیہ) میری بیوگی پر اظہار افسوس کررہے تھے۔

عاصم: (کوریڈور سے کمرے میں آتے ہوئے جنھوں نے عالیہ کا جملہ سن لیا ہے) وہ تجھے یاد دلائے رکھنا چاہتا ہے کہ تو بیوہ ہے (عالیہ اور خدیجہ بیگم خاموش رہتی ہیں۔ خدیجہ بیگم کی طرف دیکھ کر) تین دن سے یہ میرا قمیص پڑا ہوا ہے مگر تم سے اتنا نہیں ہوا کہ دو تین بٹن ٹانک دیتیں۔

عالیہ: (عاصم کے ہاتھوں سے قمیص لے کر کوریڈور کی طرف جاتے ہوئے) لایئے میں ٹانکے دیتی ہوں ایسا کہاں کا بڑا کام ہے۔

عاصم: ان کے لیے تو جوئے شیر لانے کے برابر ہے (عالیہ کمرے سے چلی جاتی ہے عاصم خدیجہ بیگم کی طرف دیکھ کر) میں کہتا ہوں یہ شارق صاحب اب تشریف کیوں نہیں لے جاتے۔ بس پندرہ دن تک تعزیت ہوگئی۔

خدیجہ بیگم: آپ بھی کیسی باتیں کرتے ہیں۔ کیا ان سے کہا جائے کہ اب چلے جائیں۔

عاصم: تم ان سے صرف اس قدر کہہ دو کہ جائداد عالیہ کے نام لکھی جارہی ہے وہ

خود چلے جائیں گے۔

خدیجہ بیگم: آپ کو تو جانے کیا ہو گیا ہے اب محبت سے آگئے ہیں تو—

عاصم: (بات کاٹ کر) محبت سے! (طنزیہ) یا اپنے بزنس کے سلسلے میں (چند سیکنڈ خاموش رہ کر) وہ جس کمپنی کے ایجنٹ ہیں اس کے یہ آرڈر بک کرتے پھر رہے ہیں اور ہم پر یہ احسان کہ محبت سے آئے ہیں تعزیت کے لیے آئے ہیں۔

خدیجہ بیگم: چار پیسے کما رہے ہیں تو ہمارا کون سا نقصان ہو رہا ہے آپ کو تو ان سے بغض للّہی ہے۔

عاصم: مجھے اس سے للّہی نفرت ہے۔

خدیجہ بیگم: مگر وہ آپ کے بھائی کی اولاد ہیں آپ کا خون ہیں۔

عاصم: خون جائے جہنم میں۔ جو اپنے باپ کا نہ ہوا وہ چچا کا کیا ہوگا، بخدا اگر وہ میری اولاد ہوتا تو گولی مار دیتا۔ عالیہ کا اس سے پردہ کرا دیجیے۔

خدیجہ بیگم: آپ کو جانے کیا ہو گیا ہے پہلے تو اچھے خاصے بھلے تھے مگر اب—

عاصم: (غصے سے بات کاٹ کر) پاگل ہو گیا ہوں۔

خدیجہ بیگم: (آنکھوں میں آنسو بھر کر) اے پاک پروردگار اب تو میری مٹی پاک کر دے۔ یہ روز روز کی دانتا کل کل برداشت نہیں ہوتی۔

عاصم: (خدیجہ بیگم کی طرف دیکھ کر) ہاں اب رو رو کر زمین آسمان ایک کر دو جانتی ہو کہ— (دروازے پر دستک— عاصم خاموش ہو کر دروازے کی طرف دیکھتے ہیں) کون صاحب ہیں (دروازے کے پاس جاکر پردہ ہٹا کر باہر دیکھتے ہیں) ارے شریف صاحب آیئے (خدیجہ بیگم چلی جاتی ہیں۔ عاصم دروازہ کا پردہ ہٹا کر) آیئے تشریف لایئے۔ شریف کمرے میں آتے ہیں عاصم صوفے کی طرف اشارہ کر کے) تشریف رکھیے مزاج کیسا ہے۔

شریف: آپ کی دعا ہے۔

عاصم: بہت دن میں تشریف لائے، عالیہ آپ کو بہت یاد کرتی رہی۔

شریف: (صوفے پر بیٹھ کر) کچھ مصروفیتیں ایسی ہی رہیں۔ عالیہ کہاں ہے۔

عاصم: اپنے کمرے میں ہوگی آپ تشریف رکھیے میں بلاتا ہوں۔ (کوریڈور کی طرف جاتے ہوئے) عالیہ —

(کوریڈور سے ایک کمرے میں چلے جاتے ہیں۔ شریف نظروں سے کمرے کا جائزہ لینے لگتے ہیں عالیہ کمرے میں آتے ہوئے۔

عالیہ: ابا جان آداب عرض ہے۔

شریف: خوش رہو آؤ صوفے پر ایک طرف بیٹھتے ہوئے) کیا بات ہے تمھاری طبیعت کیا ٹھیک نہیں ہے۔

عالیہ: (اپنے جسم کا جائزہ لیتے ہوئے) کیوں؟ اچھی خاصی ہوں۔

شریف: جس دن سے تم یہاں آئی ہو ہم برابر تمھاری راہ دیکھ رہے ہیں مگر جب تم نہیں پہنچیں تو سوچا شاید طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔

عالیہ: میری طبیعت بالکل ٹھیک ہے۔

شریف: پھر کیوں نہیں آئیں۔

عالیہ: بس یونہی۔ امی اور ابا حضور تنہائی میں گھبراتے ہیں۔

شریف: مگر تم پر ہمارا بھی تو کچھ حق ہے۔

عالیہ: جی کیوں نہیں۔ مگر وہ دونوں بہت خاموش اور اداس رہتے ہیں۔ (چند سیکنڈ رک کر) بھائی صاحب ایک مرتبہ بھی نہیں آئے۔

شریف: اس کے مزاج کو تو تم جانتی ہو اور آج کل تو جانے کن چکروں میں پھنسا رہتا ہے۔

عالیہ: وہ تو میں جانتی ہوں کہ انھوں نے مجھے آج تک معاف نہیں کیا ہے۔

شریف: نہیں نہیں ایسی بات نہیں ہے وہ بھلا تمھیں کیوں معاف نہیں کرے گا۔

عالیہ: (خفیف سے نفرت آمیز لہجے میں) وہ کس قدر کینہ پرور ہیں یہ میں خوب جانتی ہوں۔

شریف: (عالیہ کی طرف دیکھ کر) تمھارے انداز ے سے معلوم ہوتا ہے کہ تمھارا دل

اس کی طرف سے صاف نہیں ہے۔

عالیہ: میں بیوہ ہوگئی مجھے اس کی اتنی تکلیف نہیں ہے جتنی کہ نصرت سے شادی کرکے ہوتی (غصہ سے) جب بھائی صاحب جانتے تھے کہ میں اس سے نفرت کرتی ہوں تو وہ اس روزاسے اپنے ساتھ کیوں لائے تھے۔ مجھے چڑھانے کے لیے، میرا مذاق اڑانے کے لیے۔

شریف: بیٹھ جاؤ عالیہ وہ خود چلا آیا تھا۔ اسے گھر سے نکالا کیسے جاسکتا تھا۔

عالیہ: اگر مجھ سے تھوڑی بھی محبت ہوتی تو اسے نکالا بھی جاسکتا تھا۔

شریف: (عالیہ کا چہرہ غور سے دیکھ کر) اب تمھیں ہماری محبت پر بھی شک ہونے لگا ہے۔ مگر—

عالیہ: (بات کاٹ کر) میں تو ہمیشہ کی پاگل ہوں۔ اس قدر پاگل کہ— کہ— (آواز حلق میں اٹک جاتی ہے۔ کچھ دیر خاموش رہ کر فیصلہ کن لہجے میں) اب میں اس گھر میں قدم نہیں رکھوں گی جہاں میرے جذبات کا خیال نہیں رکھا گیا۔

شریف: (کسی قدر غصہ سے) یہ تمھاری مرضی ہے کہ تم آؤ یا نہ آؤ۔ اگر پانچ چھ مہینے میں باپ پرایا ہوگیا تو تمھاری مرضی۔

عالیہ: آپ اچھی طرح جانتے تھے کہ نصرت مجھ سے شادی کیوں کرنا چاہتا تھا اور بھائی صاحب بھی اس کی سازش میں شریک تھے۔

شریف: سازش!

عالیہ: جی ہاں۔ وہ دونوں مل کر آپ کی جائداد پر قبضہ کرنا چاہتے تھے۔ فضول اسکیمیں بنا کر اسے تباہ کرنا چاہتے تھے اور پھر ایک دن میں بھکارن بن کر رہ جاتی۔

شریف: اور اس کا بدلہ تم نے ہم سے یہ لیا کہ اپنی مرضی سے شادی کرلی۔ خیر۔ اس پر ہم خوش رہے۔ مگر ماں باپ کی اس سے بڑھ کر اور کیا بے عزتی ہوسکتی ہے کہ اولاد اسے غیر سمجھنے لگے۔ (ٹھنڈی سانس بھر کر کھڑے ہوتے ہوئے)

اس دور میں بزرگوں کا احترام ہی اٹھ گیا ہے۔ (عالیہ کھڑکی کے پاس جاکر کھڑی ہوجاتی ہے۔ شریف چند سیکنڈ رک کر ٹھنڈی سانس بھر کر) اچھا عالیہ خدا حافظ (عالیہ مڑ کر انھیں دیکھتی ہے شریف دروازے کی طرف بڑھتے ہیں۔ عالیہ چند سیکنڈ بعد جذبات سے مغلوب ہوکر)

عالیہ: ابا جان (چند سیکنڈ انھیں دیکھتی رہتی ہے پھر ایک دم دوڑ کر ان سے لپٹ کر ہچکیوں سے رونے لگتی ہے۔ شریف محبت سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے رہتے ہیں۔ عالیہ ہچکیوں پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے) مجھے معاف کردیجیے میں تو ہمیشہ کی پاگل ہوں۔

شریف: (اس کے سر پر اسی طرح محبت سے ہاتھ پھیرتے ہوئے) روتے نہیں بیٹی۔ روتے نہیں ہیں۔

عالیہ: (کچھ دیر بعد شریف سے الگ ہوکر) ابا جان (پلو سے آنسو پونچھ کر) مجھے نفرت سے نفرت ہے۔ وہ میری بے عزتی کرنا چاہتا ہے وہ جب تک اس گھر میں آتا رہے گا۔ میں وہاں قدم نہیں رکھوں گی۔ مجھے اس سے نفرت ہے۔
(شریف کچھ کہنے ہی والے ہوتے ہیں کہ عاصم کمرے میں آکر عالیہ سے)

عاصم: یہ عظمت خالا کہاں ہیں؟ (عالیہ کے قریب آتے ہوئے) جاکر دیکھنا کیا کررہی ہیں۔ چائے کا کہہ دینا۔ (عالیہ کمرے سے چلی جاتی ہے۔ عاصم شریف صاحب کی طرف دیکھ کر) تشریف رکھیے نا۔ (شریف صاحب کے چہرے پر فکرمندی کے آثار دیکھ کر) کیا بات ہے۔ آپ کچھ فکرمند نظر آرہے ہیں۔

شریف: زندگی میں فکرمند ہونا ہی باقی رہ گیا ہے۔ (عاصم سوالیہ نظروں سے شریف کو دیکھتے ہیں شریف ٹھنڈی سانس بھر کر) سمجھ میں نہیں آتا اب عالیہ کا کیا ہوگا۔

عاصم: جی۔ کیا مطلب (ذرا جذباتی انداز میں) عالیہ اب ہماری بیٹی ہے آپ اس کے لیے فکرمند کیوں ہیں۔

شریف: یہ تو آپ کی بلند حوصلگی ہے کہ آپ ایسا سوچتے ہیں مگر میں سوچتا ہوں کہ—

عاصم: (بات کاٹ کر) آپ کو اس کے بارے میں قطعی کچھ سوچنے کی ضرورت نہیں ہے۔

شریف: (عاصم کے پاس آکر) عاصم صاحب میری بیوی مرچکی ہیں۔ صاحبزادے نے سب کچھ ہتھیا لیا ہے۔ بھائی بہن میں ایک منٹ نہیں بنتی میری زندگی کس قدر ویران ہے۔ آپ خود اندازہ لگا سکتے ہیں۔

عاصم: صاحبزادے نے سب کچھ ہتھیا لیا ہے۔ ہتھیا لینے دیجیے عالیہ کو کسی چیز کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ گھر بار اسی کا ہے۔ یہ جائداد اسی کی ہے۔

شریف: مگر سوال میری تنہائی کا ہے۔ صاحبزادے سے کوئی امید نہیں۔

عاصم: (کچھ دیر خاموش رہ کر سوچتے ہوئے) لیکن عالیہ کی زندگی یوں تو نہیں گزر سکتی۔ ہم خود اس کے مستقبل کے بارے میں سوچ رہے ہیں۔

شریف: مستقبل کے بارے میں! آپ کا مطلب ہے کہ۔

عاصم: ہاں ہاں صاحب کیا جوان لڑکی یوں گھر میں بٹھلائی جاسکتی ہے۔

شریف: لیکن دنیا کیا کہے گی اور۔

عاصم: (بات کاٹ کر) دنیا کو ماریئے گولی۔ اسے میرے اور آپ کے معاملات سے کیا دلچسپی ہوسکتی ہے۔ رہا سوال آپ کی تنہائی کا آپ چاہیں جب عالیہ کو اپنے گھر بلوالیا کیجیے۔

(عالیہ چائے لے کر آتی ہے اور عاصم سے)

عالیہ: ابا حضور چائے۔

عاصم: (عالیہ کو دیکھ کر) تم نے کیوں تکلیف کی۔ عظمت خالا کہاں ہیں؟

عالیہ: بازار گئی ہیں۔

عاصم: (شریف سے) آیئے۔

(عاصم اور شریف دونوں صوفے پر بیٹھ جاتے ہیں عالیہ دونوں کو چائے دیتی ہے)

شریف: (چائے کی چسکی لے کر) کیوں بیٹی ہمارے یہاں کب آرہی ہو۔

عالیہ: (نظریں جھکا کر) دیکھیے ابھی تو کوئی وعدہ نہیں کرسکتی۔

شریف: اپنے بھائی کو تو تم جانتی ہو اوّل درجہ کا مکار اور خودسر ہے۔ کیا اس کی وجہ سے تم اپنے باپ کو تنہا چھوڑ دوگی۔

عالیہ: بھائی صاحب کی شادی کردیجیے ان کی بیوی آجانے پر آپ کی تنہائی دور ہوجائے گی۔

شریف: لیکن بہو، بیٹی کا نعم البدل تو نہیں ہوسکتی۔

عاصم: کیوں نہیں۔ (مسکرا کر) ہماری بہو، بیٹی کا نعم البدل ہے۔

شریف: (پیالی میز پر رکھ کر عاصم سے) اب مجھے اجازت دیجیے۔

عاصم: (کھڑے ہوکر ہاتھ ملاتے ہوئے) خدا حافظ۔

شریف: (عالیہ کی طرف دیکھ کر) کب آرہی ہو بیٹی؟

(عالیہ خاموش رہتی ہے)

عاصم: آپ جب بھی یاد فرمائیں گے آجائے گی۔

(شریف صاحب آہستہ آہستہ کمرے سے چلے جاتے ہیں۔ عاصم ان کے ساتھ دروازے تک جاتے ہیں۔ خدیجہ بیگم دروازے تک آکر)

خدیجہ بیگم: آخر تمھیں ہوگیا ہے۔ ان سے پانی تک کا نہیں پوچھا۔

عاصم: (خدیجہ بیگم کے قریب آتے ہوئے) بھئی میں تو بھول ہی گیا تم ہی نے بھیج دیا ہوتا۔

خدیجہ بیگم: ہاں اب میں ان سے پردہ بھی توڑ دیتی۔

عاصم: مجھے یا عالیہ کو آواز دے لی ہوتی (مڑ کر عالیہ کو دیکھتے ہیں جو اپنے پلو سے آنسو پونچھ رہی ہے) ارے تجھے کیا ہوگیا ہے۔

عالیہ: کچھ نہیں ابا حضور۔

عاصم: تیرا جب جی چاہے جاسکتی ہے۔ تجھے روکتا کون ہے۔

عالیہ: نہیں۔ اب میں وہاں کبھی نہ جاؤں گی۔

خدیجہ بیگم: نہ جانا نہ جانا (کسی قدر گھبرا کر) تو اس قدر پریشان کیوں ہے۔

عالیہ: وہ۔ وہ (خاموش ہو جاتی ہے کچھ دیر بعد) اب اگر ابا جان نے چلنے کے لیے کہا تو میں جان دے دوں گی۔

خدیجہ بیگم: جان دیں تیرے دشمن تو ہماری بہو اور —

عاصم: (بات کاٹ کر) بہو نہیں بیٹی۔ (عالیہ کے پاس آ کر) اب اگر تو اس گھر سے جائے گی تو بیٹی کی طرح۔ بیوہ بہو کی طرح نہیں۔

(پردہ)

تیسرا سین

منظر

(وہی کمرہ تقریباً دو مہینے بعد — عاصم غصے سے کمرے میں ٹہل رہے ہیں۔ خدیجہ بیگم کھڑکی کے پاس کھڑی ہیں۔ عاصم ایک دم تیزی سے ان کے پاس آ کر)

عاصم: اس نے اور اس کی ماں نے ہماری سات پشتوں کی بنی بنائی عزت خاک میں ملا دی کیا تم سمجھتی ہو کہ میں اسے معاف کر دوں گا۔

خدیجہ بیگم: مگر یہ بھی تو سوچیے کہ —

عاصم: (بات کاٹ کر) اجی بس ہو چکا۔ عدالت میں جو گھٹیا ڈراما ان لوگوں نے کھیلا تھا وہ کسی شریف انسان کو زیب دیتا ہے؟

خدیجہ بیگم: آپ ابھی تک اسے ڈراما ہی سمجھ رہے ہیں۔ اس میں کوئی حقیقت نہیں تھی؟ — خود آپ کے بھائی کے لچھن کہاں کے۔

عاصم: (بات کاٹ کر) میرے مرحوم بھائی کا نام نہ لو۔ وہ لاکھ برے سہی مگر عدالتوں میں ایسی باتیں کرنا مناسب تھیں۔

خدیجہ بیگم: تمھیں تو یہ اچھا معلوم ہوتا ہے کہ وہ سب جھاڑ پھونک کر بیٹھ جاتے اور یہ کوڑی کوڑی کو محتاج ہوکر دربدر کی ٹھوکریں کھاتے پھرتے۔

عاصم: پیسے کی ایسی ہی محبت تھی تو مجھ سے کہا ہوتا میں اپنا گھر بار بیچ کر ان کا منہ بند کر دیتا۔ ان کا پیٹ بھر دیتا۔ خاندانی عزت و شرافت تو عدالت میں ٹھوکریں نہ کھاتی پھرتی۔ (ٹھنڈی سانس بھر کر) میرا بھائی اس بے عزتی کے غم میں مرگیا۔

خدیجہ بیگم: یہ سب کہنے کی باتیں ہیں انھیں خود سوچنا چاہیے تھا۔

عاصم: جی ہاں۔ فرمایئے۔ فرمایئے اور کیا فرمانا ہے آپ کو۔

خدیجہ بیگم: جب تم نے چاروں طرف سے آنکھیں بند کر لی ہیں تو کچھ کہنے سننے سے بھی کیا ہوگا۔ تمھیں لڑنے جھگڑنے کا بہانہ چاہیے۔

عاصم: (ایک دم پلٹ کر غصے سے) جس طرح اس نے عدالت میں چیخ چیخ کر کہا تھا کہ میرا باپ آوارہ ہے، بدچلن ہے، بدمعاش ہے آپ بھی ڈھول پیٹیے کہ میرا شوہر ظالم ہے۔ درندہ ہے، وحشی ہے۔ کوئی آپ کی زبان نہیں پکڑے گا۔

خدیجہ بیگم: (آنکھوں میں آنسو بھر کر) اے پاک پروردگار یہ گھر اب میرے لیے جہنم بن گیا ہے کیا تیری اتنی بڑی دنیا میں میرے لیے دو گز زمین بھی نہیں۔

عاصم: اپنے لیے کیوں۔ میرے لیے مانگو۔ جھولی پھیلا کر مانگو۔ تیس بتیس سال کا ساتھ بہت ہوگیا آخر اکتا گئی ہوگی۔

خدیجہ بیگم: (مشتعل ہوکر) دیکھو جی بہت ہو چکا۔ میں سب کچھ برداشت کر لیتی ہوں مگر — یاد رکھنا جو ایسی بات زبان پر لائے۔

(عاصم خدیجہ بیگم کو دیکھتے ہیں۔ جو آنسو پونچھ رہی ہیں ان کی حالت سے جیسے متاثر ہوکر نرم لہجے میں)

عاصم: مگر خدیجہ۔ میرا جی جانے کیوں —

خدیجہ بیگم: بس بس رہنے دو مجھے تمھاری کوئی بات نہیں سننا۔ تمھاری تو آنکھوں پر پٹی

بندھی ہے جوان لونڈیا کا بھی خیال نہیں جو گھر میں بیٹھی ہے—

عاصم: ہاں ہاں۔ میں تو بے وقوف ہوں، اندھا ہوں (دوسرے کمرے میں جاتے ہوئے) بس تم ہی ایک آنکھوں والی رہ گئی ہو۔

(دوسرے کمرے میں چلے جاتے ہیں۔ خدیجہ بیگم خاموش کھڑی رہتی ہیں۔ ان کے چہرے پر فکرمندی کے آثار ہیں۔ کچھ دیر بعد ذرا بلند آواز سے)

خدیجہ بیگم: عظمت خالا۔ عظمت خالا۔

عالیہ: (کمرے میں آکر) جی کیا ہے امی۔

خدیجہ بیگم: عظمت خالا کہاں ہیں۔

عالیہ: وہ تو کل شام اپنے لڑکے کے گھر چلی گئی تھیں۔ اس کے یہاں۔

خدیجہ بیگم: اے ہاں۔ میں تو بھول ہی گئی تھی (چند سیکنڈ رک کر) تیرے ابا حضور کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے ان کے لیے نرم غذا پکا دینا۔

عالیہ: (واپس جانے کے لیے مڑتے ہوئے) بہت اچھا۔

خدیجہ بیگم: (کچھ سوچ کر) مگر ٹھہرو تو سہی میں خود ہی پکا دوں گی۔

عالیہ: (مسکرا کر) ایسا کہاں کا مشکل کام ہے ابھی پکائے دیتی ہوں۔

خدیجہ بیگم: مشکل کیوں ہونے لگا پر ان کی طبیعت کو تو جانتی ہے ہزار نخرے کریں گے تو تیرے دل کو دکھ ہوگا (دوسرے کمرے کی طرف جاتے ہوئے) ایسے بوڑھے تو ابھی ہوئے نہیں ہیں مگر جانے کیوں سٹھیا سے گئے ہیں۔

(خدیجہ بیگم دوسرے کمرے میں چلی جاتی ہیں۔ عالیہ زمین پر پڑا ہوا اخبار اٹھا کر میز پر رکھتی ہے پھر صوفے کے گدوں کو جھٹکتی ہے۔ کہ بیرونی دروازے سے شارق کمرے میں آتا ہے اور عالیہ کو مصروف دیکھ کر)

شارق: آج تو آپ بہت مصروف ہیں۔

عالیہ: (مڑ کر شارق کو دیکھ کر) آ گئے آپ۔ دن بھر کہاں غائب رہے۔

شارق: (مسکرا کر) پاؤں میں سنیچر اور قسمت میں چکر ہے۔ اس کے علاوہ اور کیا کہا

جاسکتا ہے۔

عالیہ: کھانے پر امی آپ کا انتظار کرتی رہیں۔

شارق: میں نے ہوٹل میں کھالیا تھا۔

عالیہ: ہوٹل میں! کیا گھر نہیں تھا۔

شارق: عالیہ بیگم! میرے لیے گھر اور ہوٹل سب برابر ہے (ہنس کر) اب تو ہوٹل ہی کو گھر سمجھنے لگا ہوں اور سچ پوچھیے تو ـــ (مسکرا کر چند سیکنڈ خاموش رہ کر) اب تو مجھے گھر کا کھانا ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے عام آدمی کو ہوٹل کا۔

عالیہ: آپ نے چائے پی؟ (شارق خاموش رہتا ہے) ٹھہریے میں آپ کے لیے چائے لاتی ہوں (دوسرے کمرے میں چلی جاتی ہے۔ شارق صوفے پر بیٹھ کر اپنے بیگ سے کچھ کاغذات نکال کر انھیں دیکھنے لگتا ہے کہ خدیجہ بیگم کمرے میں آکر)

خدیجہ بیگم: بھئی شارق میاں یہ غیر ذمہ داری ہمیں ایک آنکھ نہیں بھاتی۔ دن بھر کہاں رہے۔

شارق: (کھڑے ہوکر) چچی جان ذرا میں ـــ

خدیجہ بیگم: (بات کاٹ کر) اب پھر کوئی بہانہ بنا دو گے۔ عالیہ نے بتلایا کہ تم نے آج پھر ہوٹل میں کھانا کھایا۔ جانے یہ ہوٹل کا موا کھانا تمھیں ہضم کیسے ہوتا ہے۔

شارق: عادت ہوگئی ہے (ہنس کر) اب تو میں گھر کے کھانے کا مزہ ہی بھول گیا ہوں۔

خدیجہ بیگم: میں دن بھر کھانا لیے بیٹھی رہی (دوسرے کمرے سے عاصم کی آواز) ''خدیجہ! ارے خدیجہ'' ہاں اب خدیجہ کا اچار ڈال لو (بلند آواز سے) آرہی ہوں۔ (شارق کی طرف دیکھ کر) تم نے چائے پی؟

شارق: پی لوں گا چچی جان (خدیجہ بیگم چلی جاتی ہیں شارق پھر صوفہ پر بیٹھ کر اپنا حساب دیکھنے لگتا ہے۔ عالیہ چائے لے کر آتی ہے۔ شارق اسے دیکھ کر) آپ نے کیوں تکلیف کی۔ عظمت خالاؔ کہاں ہیں ـــ؟

عالیہ: اپنے بیٹے کے گھر گئی ہیں۔

شارق: (مسکرا کر) کیا پھر بہو کے بچہ ہونے والا ہے۔

عالیہ: چائے پی لیجیے ٹھنڈی ہو رہی ہے اور کھانے کے وقت ضرور آجایا کیجیے۔ بلا وجہ فکر ہوتی ہے (شارق نظریں اٹھا کر عالیہ کو دیکھتا ہے۔ عالیہ نظریں جھکا کر) چائے پی لیجیے حساب کتاب پھر بھی ہوسکتا ہے۔

شارق: (ہنس کر) آج کا انسان حساب کتاب زیادہ کرتا ہے اور کھاتا کم ہے (چائے کی پیالی اٹھا کر) آج میں نے اسی میل کا سفر کیا ہے اور مشکل سے پچیس روپے کمائے ہیں۔

(شارق چائے کی پیالی منہ سے لگاتا ہے کہ عظمت خالا آتی ہیں عالیہ انھیں دیکھ کر)

عالیہ: ارے عظمت خالا بہت جلدی لوٹ آئیں۔ کیا ہوا۔

(عظمت خالا کی آنکھوں میں آنسو آجاتے ہیں انھیں اپنے پلو سے پونچھ کر)

عظمت خالا: مرا ہوا لڑکا۔

عالیہ: مرا ہوا لڑکا!

عظمت خالا: ہاں دلھن بیگم۔ وہ تو خدا کو زندگی منظور تھی نہیں تو بہو کی جان کے لالے پڑ گئے تھے۔

عالیہ: کیا اسپتال لے گئی تھیں۔

عظمت خالا: دلہن بیگم۔ کیا وہ قصائی خانے غریبوں کے لیے ہیں۔

عالیہ: آپ نے اطلاع یہاں نہیں دی۔ ابا حضور سنیں گے تو کس قدر ناراض ہوں گے۔

عظمت خالا: ہوش کس کے ٹھکانے تھے دلھن بیگم جو اطلاع دیتی۔

(عالیہ خاموش رہتی ہے۔ اور چائے کے برتن اٹھا کر دوسرے کمرے میں چلی جاتی ہے۔ شارق عظمت خالا کی طرف دیکھ کر)

شارق: آپ نے دو چار دن تو اس بے چاری کا ساتھ دیا ہوتا۔

عظمت خالا: وہ تو چھوٹے چھوٹے بچوں کا خیال آجاتا ہے نہیں تو اس گھر پر تھوکوں بھی نہیں۔ میری شکل سے تو بہو کو چڑھ ہے، جانے مردار کی میں نے کون سی جاگیر ہضم کرلی ہے (ٹھنڈی سانس بھر کر) سچ پوچھو تو خود بیٹا بھی اس کی للو پتو میں لگا رہتا ہے (کچھ دیر خاموش رہ کر) پرسوں تو دلھن بیگم کے بھائی بھی آئے تھے۔

شارق: اچھا! کیوں؟

عظمت خالا: دلھن بیگم کو لے جانا چاہتے تھے مگر انھوں نے انکار کردیا۔ کچھ پیسے کوڑی کا جھگڑا تھا۔

شارق: پیسے کوڑی کا!

عظمت خالا: ہاں۔ میں کچھ ٹھیک سے سن نہیں پائی۔ شاید اپنے باپ سے بھی جھگڑ آئے تھے۔

شارق: زرمہر کا جھگڑا اٹھایا ہوگا۔

عظمت خالا: نہیں کچھ انھیں کی جائداد کا جھگڑا تھا۔

شارق: میں نے تو سنا ہے کہ وہ زرمہر کے لیے عالیہ بیگم کو مجبور کررہا ہے۔

عظمت خالا: مہر کا روپیہ تو پہلے ہی دلھن بیگم کے نام سے بینک میں جمع کیا جاچکا ہے (کچھ دیر خاموش رہ کر) اور اب تو ساری جائداد ہی ان کے نام لکھی جارہی ہے۔

شارق: اچھا۔ آپ کو کیسے معلوم ہوا۔

عظمت خالا: اے لو شارق میاں۔ اب کیا وہ مجھ سے بھی یہ بات چھپائیں گے۔

شارق: مگر مہر کا روپیہ دینے کے بعد ان کا کیا حق رہتا ہے۔

عظمت خالا: میں نے اور بہو بیگم نے کہا کہ سب کا حق ہو مگر عاصم میاں سنتے کس کی ہیں۔

شارق: مگر عظمت خالا یہ تو بڑی زیادتی ہے کہ حق دار محروم رہیں۔

(عظمت خالا خاموش رہتی ہیں کچھ دیر بعد عاصم کمرے میں آتے ہیں اور شارق کو دیکھ کر)

2

عاصم: کب آئے؟ (جواب کا انتظار کیے بغیر عظمت خالا سے) عظمت خالا آپ بھی آگئیں۔

عظمت خالا: (حسرت بھرے لہجے میں) میں وہاں ٹھہر کر بھی کیا کرتی۔

عاصم: کیوں، کیا پھر بہو سے جھگڑا ہوگیا۔

عظمت خالا: نہیں عاصم میاں۔ مردہ بچے کی دیکھ بھال کون کرتا ہے۔

عاصم: مردہ بچہ— مجھے افسوس ہے عظمت خالا آپ کے یہاں—

عظمت خالا: (بات کاٹ کر) افسوس کیسا عاصم میاں۔ پانچ ہی کیا کم ہیں کہ چھٹے کی تمنا کی جائے۔

عاصم: بہو تو خیریت سے ہے۔ (دروازے پر دستک) دیکھنا عظمت خالا کون ہے (عظمت خالا کمرے سے چلی جاتی ہیں۔ عاصم اس انداز سے شارق کو دیکھتے ہیں جیسے اس کی موجودگی انھیں ناگوار— شارق اسے محسوس کرکے)

شارق: چچا جان۔ شاید آپ کی ناراضگی دور نہیں ہوئی میں دو مہینے سے کوشش کر رہا ہوں کہ (عظمت خالا کمرے میں آتی ہیں۔ عاصم شارق کی بات پر دھیان نہ دے کر)

عاصم: کون ہے؟

عظمت خالا: دلھن بیگم کے والد۔

عاصم: عالیہ کے؟ شریف صاحب؟ (دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے) انھیں اندر کیوں نہیں لائیں (دروازے کا پردہ ہٹا کر باہر دیکھتے ہوئے) آیئے باہر کیوں کھڑے ہیں (شریف تھکے تھکے قدموں سے اندر آتے ہیں کچھ پریشان معلوم ہوتے ہیں عاصم انھیں دیکھ کر) آپ پریشان نظر آرہے ہیں۔ خیریت تو ہے۔

شریف: جی ہاں۔ خیریت ہی سمجھیے۔

عاصم: لیکن آپ— میرا مطلب ہے کہ—

شریف: جی ہاں۔ کچھ بیمار ہوں۔

عاصم: پرسوں آپ کے صاحبزادے آئے تھے انھوں نے آپ کی بیماری کا ذکر نہیں کیا۔

شریف: (طنزیہ) اسے میری بیماری کا علم ہی نہیں ہوگا (چند سیکنڈ رک کر) عالیہ کہاں ہے۔

عاصم: اپنے کمرے میں ہوگی۔ (عظمت خالا کی طرف دیکھ کر) عالیہ کو بلانا۔ (عظمت خالا چلی جاتی ہیں۔ شریف شارق کی طرف دیکھتے ہیں) یہ میرے بھتیجے ہیں شارق— شارق علی آپ تشریف رکھیے نا؟ (شارق سے) اپنی چچی سے کہو چائے بھیج دیں۔

شریف: اس وقت چائے کی کیا ضرورت ہے— میں۔

عاصم: ہے کیوں نہیں (شارق سے) جاؤ (شارق دوسرے کمرے میں جاتا ہے) آپ تشریف تو رکھیے (شریف صوفے پر بیٹھ جاتے ہیں) آپ نے اپنی بیماری کی اطلاع تو دی ہوتی بخدا آپ تو غیریت برتتے ہیں۔

شریف: ایسی کوئی بیماری بھی ہو (مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے) بعض اوقات انسان محض تفریح کے لیے بیمار بن جاتا ہے (عالیہ کمرے میں آکر شریف کو سلام کرتی ہے) آؤ اچھی تو ہو۔

عالیہ: جی ہاں۔ دعا ہے آپ کی (شریف کو غور سے دیکھ کر) مگر آپ—

شریف: میں بھی اچھا ہوں۔ (اس طرح خاموش ہوجاتے ہیں جیسے کچھ کہتے ہوئے ہچکچا رہے ہوں۔ عاصم یہ محسوس کرکے دروازے کی طرف جاتے ہیں) آپ کہاں تشریف لیے جارہے ہیں۔

عاصم: ابھی حاضر ہوتا ہوں۔

(عاصم دوسرے کمرے میں چلے جاتے ہیں عالیہ کچھ دیر خاموش رہ کر)

عالیہ: آپ بہت دن میں تشریف لائے مجھے تو آپ نے بھلا ہی دیا۔

شریف: آج کل اولاد ماں باپ کو بھلا دیتی ہے (ٹھنڈی سانس بھر کر) پہلے ماں

باپ اولاد کو عاق کرتے تھے اب اولاد ماں باپ کو کرنے لگی ہے (عالیہ برابر ان کا چہرہ دیکھتی رہتی ہے کچھ دیر رک کر حسرت بھرے لہجے میں) ہمارے صاحبزادے نے ہم کو عاق کردیا ہے۔

عالیہ: جی کیا مطلب؟

شریف: (طنزیہ) بظاہر وہ مکان میں نے چھوڑ دیا ہے مگر سچ تو یہ ہے انھوں نے مجھے گھر سے نکال دیا ہے۔

عالیہ: (حیرت سے) گھر سے نکال دیا ہے! کیوں؟—

شریف: میں ان کے کاروبار میں مداخلت بے جا کا مرتکب ہوا تھا (کچھ دیر رک کر) پرسوں وہ یہاں تشریف لائے تھے کیا فرما رہے تھے۔

عالیہ: (آہستہ آہستہ کھڑکی کے پاس جاتی ہے پھر مڑ کر) یہی کہ اب جائیداد میں میرا کوئی حق نہیں ہے۔

شریف: کیوں نہیں ہے۔ یہ نہیں بتلایا۔

عالیہ: میرا جو حق تھا وہ میری شادی میں خرچ کیا جا چکا ہے (برہمی کے انداز میں) مگر میں اپنے حق کی ایک کوڑی چھوڑنے والی نہیں۔ میں نے ان سے صاف کہہ دیا ہے میرا ایک پیسہ بھی۔ نصرت جیسے لفنگوں کی اسکیموں پر صرف نہیں ہوسکتا۔

شریف: (ٹھنڈی سانس بھر کر) اصل فتنے کی جڑ تو وہی ہے۔

عالیہ: (غصے سے) اس کمینے کا نام میرے سامنے نہ لیجیے۔ اس نے اپنے دوست کی بہن کی (غصے سے کانپتے ہوئے خاموش ہو جاتی ہے۔ شریف عالیہ کے پاس آکر حسرت آمیز لہجے میں)

شریف: میں نے اس کی چکنی چپڑی باتوں اور لمبی چوڑی اسکیموں میں پھنس کر سب کچھ لٹا دیا اور آج—

عالیہ: میں نے پہلے ہی کہا تھا کہ وہ کس قدر کمینہ ہے مگر آپ۔

شریف: انسان سے غلطی بھی تو ہوتی ہے۔ (ٹھنڈی سانس بھر کر) تین دن سے خیرات کے ٹکڑوں پر زندگی گزار رہا ہوں۔

عالیہ: جی! کیا مطلب۔

شریف: مطلب کیا ہوگا بیٹی رزاق صاحب کے گھر پر پڑا ہوں اپنے ہی گھر کے دروازے مجھ پر بند ہیں۔

(عالیہ شریف کو دیکھتی ہے پھر آنکھوں میں آنسو آجاتے ہیں جنھیں اپنے پلو سے پونچھتی ہے۔ کچھ دیر خاموش رہتی ہے پھر ایک دم جیسے اس پر جنون طاری ہوگیا ہو)

عالیہ: ان کی یہ ہمت میں انھیں چین سے نہیں رہنے دوں گی۔

شریف: (گھبرا کر) عالیہ آہستہ یہ تمھاری سسرال ہے۔

عالیہ: وہ سمجھتے ہیں کہ عالیہ کچھ نہیں کرسکتی (پھر غصے میں بلند آواز سے) عالیہ اپنی مرضی سے جہاں چاہے شادی کرسکتی ہے۔ اپنی مرضی سے جہاں چاہے رہ سکتی ہے نصرت جیسے لفنگوں کا منہ نوچ سکتی ہے۔ میں ان کا جینا حرام کردوں گی۔

شریف: عالیہ۔ ذرا سوچو۔

عالیہ: (دانت پیس کر بلند آواز سے) اب میں جب تک انھیں کوڑی کوڑی کو محتاج نہیں کردوں گی چین سے نہیں بیٹھوں گی۔ اب میں ان کی بہن نہیں دشمن ہوں۔

(شارق تیزی سے کمرے میں آتا ہے اور عالیہ کو دیکھ کر)

شارق: کیا بات ہے عالیہ بیگم (عالیہ خاموش رہتی ہے مگر غصے میں تیز تیز قدموں سے کمرے میں ٹہلتی رہتی ہے۔ شارق شریف کی طرف دیکھ کر) کیا بات ہے صاحب۔

شریف: (ٹھنڈی سانس بھر کر) کچھ نہیں شارق میاں (چند سیکنڈ کھڑے رہتے ہیں پھر تیزی سے دروازے کی طرف جاتے ہیں)

شارق: (گھبرا کر) آپ کہاں تشریف لیے جارہے ہیں — سنیے تو —

عالیہ: (شریف کو جاتا ہوا دیکھ کر) ابا جان (تقریباً دوڑتی ہوئی ان کے پیچھے جاتی

ہے مگر وہ کمرے سے نکل جاتے ہیں۔ عالیہ دروازے کے پاس جاکر رک جاتی ہے۔ شارق دروازے کے باہر جانا چاہتا ہے عالیہ اس کا راستہ روک کر) شارق صاحب اب وہ واپس نہیں آئیں گے جانے دیجیے۔

شارق: مگر عالیہ بیگم (عالیہ ایک دم ہچکیوں سے رونے لگتی ہے شارق گھبرا کر) آخر بات کیا ہے کچھ کہیے تو (عالیہ صوفے پر بیٹھ جاتی ہے اپنے چہرے پر دونوں ہاتھ رکھ کر ہچکیوں سے روتی ہے شارق اس کے پاس آکر) عالیہ بیگم آخر آپ کو کیا ہوگیا ہے۔۔ کچھ کہیے تو۔۔ (عالیہ برابر روتی رہتی ہے۔۔ شارق کوریڈور کے پاس جاکر) چچی جان ذرا ادھر آئیے۔۔ (ذرا جلدی۔ (پھر عالیہ کے پاس آکر) عالیہ بیگم۔۔ آخر۔۔

خدیجہ بیگم: ۔۔ (کمرے میں آتے ہوئے) کیا بات ہے شارق میاں۔عالیہ کو روتا ہوا دیکھ کر تیزی سے اس کے پاس جاکر) کیا بات ہے بیٹی (عالیہ برابر روتی رہتی ہے شارق کی طرف دیکھ کر) شارق میاں آخر ہوا کیا (شارق اس طرح کندھے اٹھا کر منہ بناتا ہے جیسے اسے کچھ معلوم نہیں۔ آخر کچھ بول تو بیٹی کیا بات ہے (تیز تیز قدموں سے کوریڈور کے پاس جاکر) اجی سنتے ہو یہاں تو آؤ (پھر عالیہ کے پاس آکر) آخر بیٹی ایسی کون سی بات ہوگئی۔

عاصم: (کمرے میں آتے ہوئے) کیا بات ہے (عالیہ پر نظر پڑتی ہے اسے روتا دیکھ کر گھبرا کر) ارے۔ (تیز تیز قدموں سے اس کے پاس جاکر) کیا بات ہے عالیہ (شارق سے) شریف صاحب کہاں گئے۔

شارق: پتا نہیں۔۔ بہت تیزی سے کہیں چلے گئے۔

عاصم: چلے گئے! کہاں چلے گئے۔ (شارق خاموش رہتا ہے۔ عاصم عالیہ سے) بیٹی کچھ کہو تو آخر بات کیا ہے؟

عالیہ: (ہچکیوں کے درمیان) بھائی صاحب نے انھیں گھر سے نکال دیا ہے۔

عاصم: شریف صاحب کو؟ (عالیہ ایک دم کھڑی ہوکر کوریڈور میں بھاگ جاتی ہے۔

کچھ دیر خاموشی رہتی ہے ۔ خدیجہ بیگم عالیہ کے پیچھے پیچھے چلی جاتی ہیں۔ عاصم غصے اور پریشانی میں کمرے میں ٹہلتے ہیں پھر ٹھنڈی سانس بھر کر) آج کل کی اولاد سے اور کیا توقع کی جاسکتی ہے ایک نے باپ کو گھر سے نکال دیا اور دوسرے نے وہ غم دیے کہ باپ اللہ کو پیارا ہوگیا۔

شارق: چچا جان آپ تو۔۔۔

عاصم: (بات کاٹ کر) بس چپ رہو میاں صاحبزادے میں نے زمانہ دیکھا ہے۔

شارق: مگر وہ کس طرح بدل رہا ہے یہ آپ نے محسوس نہیں کیا آج کا نوجوان۔۔۔

عاصم: (بات کاٹ کر) ہاں آج کا نوجوان کس طرح بدل رہا ہے یہ ضرور دیکھا ہے۔ آپ ہیں، شریف صاحب کے صاحبزادے ہیں۔

شارق: (چند سیکنڈ رک کر) چچا جان میں دو مہینے سے کوشش کر رہا ہوں کہ آپ کی غلط فہمی دور ہو جائے مگر شاید میرا مقدر ساتھ نہیں دے گا۔

عاصم: (ایک دم مڑ کر غصہ سے) جی ہاں بزرگوں کو تو غلط فہمیاں ہی ہوتی ہیں وہ قصوروار ہیں اور آپ لوگ تو دودھ کے دھلے ہیں۔

شارق: دودھ کے دھلے نہ سہی مگر یہ بخوبی جانتے ہیں کہ کھنڈروں کی بکھری ہوئی اینٹوں کو چننے سے کچھ نہ ہوگا۔

عاصم: یوں کہیے کہ ہماری تہذیب، باپ دادا کا نام اور عزت خاندانی روایات اور شہرت سب کھنڈروں کی بکھری ہوئی اینٹیں ہیں (شارق کچھ کہنا چاہتا ہے مگر عاصم اس کے بولنے سے پہلے) کیا تم سمجھتے ہو کہ تمھارا یوں مارا پھرنا خاندانی نام روشن کررہا ہے۔ میرے دل کو جو اذیت پہنچ رہی ہے وہ میں بیان نہیں کرسکتا۔

شارق: (کسی قدر تند لہجے میں) چچا جان میں کسی سے بھیک مانگنے نہیں جاتا۔ اگر میں پرانی روایات کی قصیدہ خوانی کرتا رہتا تو آج بھیک ہی مانگ رہا ہوتا۔ (تیزی سے کمرے سے چلا جاتا ہے عاصم پہلے تو غصہ سے کمرے میں ٹہلتے

رہتے ہیں پھر کوریڈور کے پاس جا کر بلند آواز سے)

عاصم: عظمت خالا۔ (چیخ کر) عظمت خالا۔

(عظمت خالا کمرے میں آتی ہیں پہلے تو عاصم کو غصے میں دیکھ کر سہم جاتی ہیں پھر آہستہ سے)

عظمت خالا: کیا بات ہے عاصم میاں۔

عاصم: (عظمت خالا نے پاس آ کر) اب اس سے کہہ دو کہ وہ آج ہی یہ مکان خالی کر دے۔

عظمت خالا: کس سے؟

عاصم: شارق سے اور کس سے میں اس مردود کا منہ دیکھنا نہیں چاہتا۔ منہ۔ ہماری خاندانی عزت اور شرافت اس کے نزدیک جھوٹی قصیدہ گوئی ہے۔ (پھر ٹہلنے لگتے ہیں۔۔۔ عظمت خالا خاموش کھڑی رہتی ہیں انھیں دیکھ کر) اب جاتی کیوں نہیں ہو۔

عظمت خالا: مگر۔

عاصم: مگر کیا۔۔۔ جب وہ میرے منہ پر جوتے مارے گا تب تمھیں اور خدیجہ کو چین آئے گا۔

عظمت خالا: ذرا دلھن بیگم کا تو سوچیے۔۔۔ شاید وہ۔۔۔

عاصم: (ایک مڑ کر) شاید وہ۔۔۔ شاید وہ کیا؟

عظمت خالا: شاید یہ کہ دلھن بیگم ان کے قریب آ گئی ہیں۔

عاصم: (غصہ سے بے قابو ہو کر) قریب آ گئی ہیں تم اور خدیجہ یہ ڈراما دیکھتی رہیں مجھے گولی کیوں نہ مار دی کہ میں یہ خبر سننے کے لیے زندہ نہ رہتا (پاگلوں کی طرح کمرے میں ٹہلتے ہیں پھر عظمت خالا کے پاس آ کر ان کے دونوں بازو پکڑ کر) میں نے ماں کی جگہ تم کو سمجھا۔ تمھاری ویسی ہی عزت کی مگر مجھے یہ نہیں معلوم تھا کہ ایک دن تم میری عزت کو جھنڈے پر چڑھتی دیکھو گی اور

خاموش رہ کر خوش ہوگی۔

عظمت خالا: (جھٹکا دے کر بازو چھڑاتے ہوئے) میں نے بھی تمہیں غیر نہیں سمجھا۔ اپنی جوانی تم پر نچھاور کردی اور اب بڑھاپے میں بھی تمھارے ساتھ گھسٹ رہی ہوں۔ مجھے بھی نہیں معلوم تھا کہ ایک دن تم مجھ پر غداری اور نمک حرامی کا الزام لگا دو گے۔

عاصم: (غصہ سے کوریڈور کی طرف جاتے ہیں عاصم ان کے سامنے آکر) عظمت خالا آپ ناراض ہوگئیں (چند سیکنڈ رک کر ٹھنڈی سانس بھر کر) میں کیا کروں کہ شارق کو اپنے دل میں جگہ نہیں دے سکتا۔

عظمت خالا: اگر تم اپنے دل میں جگہ نہیں دے سکتے تو کسی کے دل سے نکال بھی نہیں سکتے۔

عاصم: مگر عظمت خالا —

(خاموش ہو کر ٹہلنے لگتے ہیں عظمت خالا کچھ دیر خاموش رہ کر ان کے پاس آکر)

عظمت خالا: عاصم میاں میری ان بوڑھی آنکھوں میں روشنی ضرور کم ہوگئی ہے مگر میں نے یہ ضرور دیکھا ہے کہ دلھن بیگم نے ہمارے بچے سے اپنی مرضی سے شادی کی اور ان کے باپ بھائی بھی انھیں روک نہ سکے (عاصم خاموش رہتے ہیں پھر آہستہ آہستہ ہارے ہوئے سے دوسرے کمرے میں چلے جاتے ہیں کچھ دیر عظمت خالا خاموش کھڑی رہتی ہیں پھر کوریڈور کی طرف بڑھتی ہیں کہ پھر شارق سوٹ کیس ہاتھ میں لیے کمرے میں آتا ہے عظمت خالا اسے دیکھ کر) کہاں جارہے ہو شارق میاں۔

شارق: ٹورنگ ایجنٹ جدھر چلا جائے ادھر ہی اس کی منزل ہے۔

عظمت خالا: یہ گھر بار چھوڑ کر۔ دلھن بیگم کو چھوڑ کر۔

شارق: گھر بار! یہ گھر بار کس کا ہے — میرا؟ (چند سیکنڈ رک کر)
جس گھر میں میں دو مہینوں سے طعنوں کا شکار بنا ہوا ہوں اور آپ کی دلھن

بیگم (طنزیہ) جو بیوگی کو اپنا زیور سمجھے ہوئے ہو۔

عظمت خالا: تمھاری چچی تمھارے ساتھ ہیں اور دلھن بیگم۔

شارق: دلھن بیگم! انھیں زندگی میں اب اور ضرورت ہی کیا ہے— چچا جان کی وارث جو بن بیٹھی اور چچا جان— جو میرا جائز حق مارنے پر تلے ہوئے ہیں۔

عظمت خالا: مگر میں— (شارق تیز تیز قدموں سے دروازے کی طرف بڑھتا ہے) شارق میاں پہلے میری بات تو سنو (شارق دروازے کے پاس پہنچ کر مڑتا ہے اور عظمت خالا کو دیکھتا ہے۔ عظمت خالا اس کی طرف بڑھتی ہیں) شارق میاں نہ جاؤ مری بات سنو (شارق چند سیکنڈ رکتا ہے پھر تیزی سے کمرے کے باہر چلا جاتا ہے عظمت خالا چیخ کر) شارق میاں۔

(عظمت خالا تیزی سے دروازے کی طرف بڑھتی ہیں کہ عاصم کمرے میں آ کر)

عاصم: کیا بات ہے عظمت خالا۔

عظمت خالا: (حسرت بھرے لہجے میں) شارق میاں چلے گئے۔

عاصم: چلا گیا— (بالکل ہارے ہوئے لہجے میں) آپ کے روکنے پر بھی چلا گیا۔ آپ کی بزرگی کا بھی خیال نہیں کیا۔ کس قدر نالائق ہے دیکھا آپ نے۔

(پردہ)

(مطبوعہ ماہنامہ 'شاعر' بمبئی، سالنامہ 1972)

دھوئیں کے آنچل

افراد تمثیل

(1) قاسم (ایک نوجوان ڈاکٹر) (2) سجاد (قاسم کا بڑا بھائی) (3) ساجدہ (سجاد کی بیوی) (4) معصومہ (قاسم کی دوست۔ پی ایچ ڈی کی طالب علم) (5) منظور (ملازم) (6) نفیس (ڈاکٹر)

پہلا سین

منظر

(درمیانی طبقہ کا ایک کمرہ جس میں شمالی دیوار سے لگا ایک پلنگ بچھا ہے جس پر صاف ستھرا بستر ہے، اس کے پاس ایک ٹیبل پر چند کتابیں۔ سگریٹ کا پیکٹ ماچس ایش ٹرے اور ٹیبل لیمپ رکھا ہے جس پر ہلکے نیلے رنگ کا شیڈ ہے۔ کمرے میں دائیں بائیں ایک ایک دروازہ ہے۔ دروازوں پر ہلکے نیلے رنگ کے دبیز پردے پڑے ہیں کمرے کا فرنیچر موجودہ فیشن کے مطابق ہے کمرے میں دری کا فرش ہے۔ رات کے تقریباً آٹھ بجے ہیں۔ قاسم پلنگ سے ٹیک لگائے فرش پر بیٹھا ہے اس کے سامنے انگیٹھی رکھی ہے جس پر

وہ ہاتھ سینک رہا ہے۔ ٹیبل لیمپ میں سے ہلکی نیلی روشنی چھن چھن کر باہر نکل رہی ہے۔
کچھ دیر بعد معصومہ دائیں جانب کے دروازے سے داخل ہو کر۔

معصومہ: کیسے کیا ہو رہا ہے۔

قاسم: (نظریں اٹھا کر معصومہ کو دیکھ کر) جبرئیل سے باتیں کر رہا ہوں۔

معصومہ: ہائے اللہ ابھی سے۔

قاسم: میری سمجھ میں نہیں آتا کہ لوگ اس قدر احمقانہ سوال کیوں کرتے ہیں اچھا خاصا دکھ رہا ہے کہ ہاتھ تاپ رہا ہوں۔

معصومہ: (ہنس کر) سچ مچ میں تو ڈر گئی تھی کہ آپ کچھ کچھ پیغمبر ہوتے جا رہے ہیں کہ جبرئیل سے باتیں کرتے ہیں۔ پھر یہ سوچ کر اطمینان ہوا کہ ابھی آپ کی عمر کم ہے پیغمبر نہیں ہو سکتے۔

قاسم: اگر مجھ کو پیغمبری بھی مل جائے تو تم یقین نہیں کرو گی۔

معصومہ: (مسکرا کر) یہ تو پیغمبری ملنے پر دیکھا جائے گا۔ ساجدہ باجی کہاں ہیں—

قاسم: ٹور پر گئی ہیں۔

معصومہ: اور بھائی جان۔

قاسم: وہ بھی ابھی ٹور سے نہیں لوٹے۔

معصومہ: (مسکرا کر) تو پھر اس گھر پر آپ کی خالص حکومت ہے۔

قاسم: فی الحال تو یہی بات ہے۔

معصومہ: اور ساجدہ باجی کے آنے کے بعد؟

قاسم: حکومت تو وہ نہیں کرتیں بزرگی ضرور قائم رکھتی ہیں۔

معصومہ: کیا زندگی ہے ان دونوں کی بھی کبھی یہ ٹور پر کبھی وہ (ہنس کر) عید عید پر ہی ملاقات ہوتی ہوگی دونوں کی۔

قاسم: (غور سے معصومہ کو دیکھ کر) جب بھی ملاقات ہوتی ہے۔ اس میں بڑا خلوص اور پیار ہوتا ہے۔ تم اس کا اندازہ نہیں لگا سکتیں۔

معصومہ: وہ تو ٹھیک ہے مگر اس میں فیملی لائف کا کیا چارم ہے۔

قاسم: مگر بھوکے پیٹ اور پھٹے کپڑوں میں زندگی کا کون سا چارم ہوتا ہے۔

معصومہ: اب بھائی جان ایسے گئے گزرے بھی نہیں ہیں کہ اگر ساجدہ باجی نوکری نہ کریں تو ننگے اور بھوکے رہنا پڑے۔

قاسم: (معصومہ کو سر سے پیر تک دیکھ کر) معصومہ بیگم۔ بھابی جان کی نوکری سے تمھیں جانے کیوں چڑ ہے۔

معصومہ: اس لیے کہ ان کی نوکری قطعی غیرضروری ہے اگر وہ کسی اور کو مل جائے تو کم ازکم ایک خاندان کا اور پیٹ بھرنے لگے۔

قاسم: اگر دنیا کے سارے بوڑھے مرجائیں تو نوجوانوں کا ونش بڑھ جائے مگر بوڑھے زندہ رہتے ہیں اور اپنے حصے کا راشن حاصل کرتے ہیں اس کا کیا کیا جائے۔

معصومہ: (مسکرا کر) آپ تو ایسے بگڑ گئے جیسے میں ان کی نوکری چھینے لے رہی ہوں۔ اچھا خیر چھوڑیے۔ یہ بتلایئے آپ نوکری کب کررہے ہیں۔

قاسم: یہ تو نوکری مل جانے پر ہے جب بھی مل جائے۔

معصومہ: (مسکرا کر) آپ نے نوکری کا جو معیار قائم کیا ہے ویسی نہ ملے پھر؟

قاسم: پھر کا سوال پھر سوچوں گا۔ ابھی تو میں ناامید نہیں ہوں۔

معصومہ: آپ ڈاکٹر ہیں اگر سرکاری نوکری نہیں ملتی تو اسے گولی ماریے۔ پرائیویٹ پریکٹس شروع کردیجیے۔

قاسم: سرکاری نوکری میں جو عزت ہے وہ پرائیویٹ پریکٹس میں کہاں ہے۔

معصومہ: عزت تو کام سے ہوتی ہے۔ ڈاکٹر نفیس کی کیا کم عزت ہے۔

قاسم: ارے ہاں مس نفیس کس عالم میں ہیں۔ آج کل نظر نہیں آرہی ہیں۔

معصومہ: (ہنس کر) آج کل انھیں پڑھنے کا مرض ہوگیا ہے۔

قاسم: (قہقہہ مار کر) اور اس کا علاج ڈاکٹر نفیس کے پاس بھی نہیں۔

سجاد: (کمرے میں آتے ہوئے) ارے بھئی یہ قہقہے کیوں لگائے جا رہے ہیں۔

قاسم: (کھڑے ہوتے ہوئے) ارے بھائی جان آپ کب تشریف لے آئے۔

سجاد: بس چلا ہی آ رہا ہوں۔ (معصومہ کی طرف دیکھتے ہوئے) اور۔ معصومہ بیگم بھی موجود ہیں۔ کہو بھئی اچھی تو ہو۔

معصومہ: جی ہاں نوازش ہے آپ کی۔

سجاد: اب مولوی صاحب کی طبیعت کیسی ہے۔

معصومہ: کھانسی میں تو کسی قدر افاقہ ہے مگر سانس کی تکلیف ابھی موجود ہے۔

سجاد: علاج کس کا ہو رہا ہے۔

معصومہ: وہی ڈاکٹر نفیس کا۔

سجاد: وہ تو کئی روز سے گھر پر نہیں ہیں۔

معصومہ: جی ہاں۔ انھوں نے کچھ دوائیں لکھ دی ہیں انھیں کا استعمال ہو رہا ہے اور کسی حد تک تکلیف میں بھی کمی ہوئی ہے۔

سجاد: ہاں میں کریم گنج گیا تھا وہاں ڈاکٹر نفیس سے ملاقات ہوئی تھی انھوں نے بھی کہا تھا کہ تشویش کی کوئی بات نہیں ہے۔

قاسم: ڈاکٹر نفیس کریم گنج کے بہت چکر لگاتے ہیں۔

سجاد: (پلنگ پر بیٹھتے ہوئے) وہاں ان کے ایک پرانے دوست رہتے ہیں۔ مولوی علی بخش ان کا نام ہے بہت زندہ دل بزرگ ہیں انھیں سے ملاقات کرنے جاتے ہیں اور پھر ڈاکٹر کو شکار کا بھی شوق ہے۔

قاسم: وہی مولوی علی بخش تو نہیں جو گئے سال ڈاکٹر صاحب کے یہاں مہمان آئے تھے۔ شطرنج اچھی کھیلتے ہیں۔

سجاد: ہاں ہاں وہی۔

قاسم: (ہنس کر) مگر شکل وصورت لباس حلیہ یعنی کسی اینگل سے وہ مولوی نظر نہیں آتے۔

سجاد: (ہنس کر) ہاں مگر جانے کیوں لوگوں نے ان کے نام کے ساتھ مولوی جوڑ رکھا ہے (ہنس کر) وہ بھی اس سے بے حد خوش ہوتے ہیں (کچھ دیر رک کر) تمھارے بارے میں بھی ان سے بات چیت ہوئی تھی۔

قاسم: میرے بارے میں!

سجاد: ان کا خیال ہے کہ تم ان کے ساتھ پریکٹس کرو۔

قاسم: مگر بھائی جان—

سجاد: (بات کاٹ کر) اتنی بڑی ڈسپنسری کی دیکھ بھال تنہا ان کے بس کی بات نہیں (کچھ دیر خاموش رہ کر) یہ تجویز انھوں نے ہی دیا تھا۔

قاسم: مگر بھائی جان میں سرکاری نوکری کو پریفر کرتا ہوں۔

سجاد: جب سرکاری نوکری مل جائے تو وہ کر لینا۔ کون روکتا ہے۔ ڈاکٹر نفیس کے تجربات سے فائدہ اٹھا لینا کہاں کی برائی ہے۔

قاسم: بھائی جان وہ بات یہ ہے کہ—

سجاد: (بات کاٹ کر) درحقیقت ڈاکٹر نفیس عمر کے جس دور میں ہیں ان سے اب زیادہ محنت کی امید نہیں کی جاتی۔ اگر تم ان کے ساتھ جی لگا کر کام کرو تو ایک اعلیٰ ڈسپنسری چلانے کا تجربہ ہو جائے گا۔ ڈاکٹر نفیس نے خود کہا ہے کہ اب ان کو ڈسپنسری کے کاموں سے کوئی دلچسپی نہیں ہے (کچھ دیر خاموش رہ کر) تمھاری جارج کا پتا ہے کب واپس آ رہی ہیں۔

قاسم: کہہ کر تو آج ہی کا گئی تھیں مگر ابھی تک تو پتا نہیں۔

سجاد: (گھڑی دیکھ کر) ممکن ہے ساڑھے آٹھ کی گاڑی سے آجائیں اور ہاں تم بھوپال ہو آئے۔

قاسم: جی نہیں۔ آپ کے جانے کے بعد دوسرے ہی دن بھابی جان چلی گئیں۔ میں نے گھر نوکر کے حوالے کرنا مناسب نہیں سمجھا، اب کل چلا جاؤں گا۔

سجاد: ہاں بھئی کل چلے ہی جاؤ دیکھو تو جا کر صاحبزادے وہاں کیا گل کھلا رہے

ہیں۔ کہیں اس سال بھی فیل نہ ہو جائیں۔

قاسم: بھائی جان سچ پوچھیے تو اسے پڑھنے لکھنے سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ اسٹرائکوں میں حصہ لینا اور ہلڑ مچانا اس نے پیشہ بنا لیا ہے۔ ہم آپ بلا وجہ اپنا روپیہ اور اس کا وقت ضائع کر رہے ہیں۔

سجاد: (سوچتے ہوئے) مگر قاسم سوال یہ ہے کہ کیا کیا جائے۔ آج کل قدم قدم پر اس قدر مقابلہ ہے کہ اچھے اچھے پڑھے لکھے مارے مارے پھر رہے ہیں بھلا بلا پڑھے لکھے کو کون پوچھے گا۔

قاسم: یہی سوچ کہ میں خاموش ہو جاتا ہوں ابھی اور چلنے دیجیے بہرحال اس کے لیے کوئی راستہ تلاش کرنا ہوگا۔

سجاد: (ہاتھ سینکتے ہوئے) غضب کی سردی ہے۔ منظور چلا گیا؟

قاسم: سردی سے کانپ رہا تھا میں نے چھٹی دے دی۔

سجاد: اگر وہ ہوتا تو چائے ہی پی جاتی۔

قاسم: لایئے میں چائے بنائے لاتا ہوں۔

معصومہ: (مسکرا کر) یہ کام آپ میرے سپرد کر دیں تو کوئی حرج ہے۔

سجاد: (ہنس کر) چائے تو عورتوں کے ہاتھ کی ہی اچھی معلوم ہوتی ہے۔

معصومہ: (مسکرا کر) اچھا تو آج میرے ہاتھ کی چائے پی کر دیکھیے۔

قاسم: آپ کیوں تکلیف کرتی ہیں۔ کم از کم چائے بنانا مردوں کو بھی آنا چاہیے۔
(دروازے کی طرف بڑھتا ہے۔ سجاد اسے دیکھ کر)

سجاد: چائے کا سامان یہیں اٹھا لاؤ۔ (انگیٹھی کی طرف اشارہ کر کے) اس پر ہی بن جائے گی۔ اس وقت چولھا جلانا بھی مشکل ہوگا۔

قاسم: بہت اچھا۔

(قاسم کمرے سے چلا جاتا ہے۔ معصومہ کرسی پر بیٹھ جاتی ہے سجاد اسے دیکھ کر)

26A

سجاد: کہیے معصومہ بیگم ریسرچ کیسی چل رہی ہے۔

معصومہ: کام تو ہو رہا ہے مگر لائبریری کام کی نہیں ایک بھی ڈھنگ کی کتاب نصیب نہیں ہوتی۔

سجاد: یہ ایک چھوٹی جگہ ہے۔ تم کیسے امید کرتی ہو کہ یہاں اچھا ذخیرہ ہوگا۔

معصومہ: کتابوں کی خریداری کے لیے ہر سال اچھا خاصا بجٹ ہوتا ہے۔ مگر خریداری جن کتابوں کی ہوتی ہے اس پر پرچیز کمیٹی کے ارکان کی عقلوں پر ماتم کرنے کو جی چاہتا ہے۔

سجاد: (ہنس کر) جو لوگ اس کمیٹی کے ممبر بنائے جاتے ہیں وہ سیاسی اکھاڑے کے مرد ہوتے ہیں نہ کہ ادب کے اکھاڑے کے اور پھر ان کو تو اپنا سکہ چلانا ہوتا ہے (ہنس کر) اب وہ محمد تغلق کا سکہ ہی کیوں نہ ہو (چند سیکنڈ رک کر) پھر اس مشکل کا کیا حل نکالا ہے۔

معصومہ: مہینے دو مہینے علی گڑھ جا کر رہنے کا ارادہ ہے۔

سجاد: یہ اچھا رہے گا — وہاں تمہارے بھائی صاحب بھی ہیں۔

معصومہ: جی ہاں۔ وہ کئی بار لکھ بھی چکے ہیں کہ میں وہاں آجاؤں۔

(قاسم چائے کا سامان لے کر آتا ہے اور اسے انگیٹھی کے پاس رکھ کر)

قاسم: غضب کی سردی ہے (ہاتھ سینکتے ہوئے) خون رگوں میں جم رہا ہے۔

سجاد: ایسی سردی برسوں بعد ہی پڑی ہے۔

قاسم: شملے میں برف باری ہوئی ہے۔ کل کی رپورٹ تھی۔ دلی میں کئی آدمی سردی کی وجہ سے مر گئے۔

سجاد: غربت کی موت کا کیا۔ وہ تو زندہ رہتے ہوئے بھی مرا ہوا ہوتا ہے (معصومہ کی طرف دیکھ کر) کہو علی گڑھ جانے کا کب تک ارادہ ہے۔

(قاسم پہلے معصومہ کو پھر سجاد کو دیکھتا ہے سجاد قاسم کو دیکھ کر) معصومہ اپنی ریسرچ کے سلسلے میں علی گڑھ جا رہی ہیں۔

قاسم: (چائے کا پانی انگیٹھی پر رکھتے ہوئے) خیال تو اچھا ہے (معصومہ کی طرف دیکھ کر) کب تک جانے کا ارادہ ہے۔

معصومہ: مہینے دو مہینے تو لگ ہی جائیں گے۔ کالج کی لائبریری میں کچھ کتابیں ہیں پہلے انھیں دیکھ لوں۔ پبلک لائبریری میں تو کچھ بھی نہیں ہے۔

قاسم: میں نے آپ سے پہلے ہی کہا تھا (ہنس کر) کباڑ خانے میں نیا مال نہیں ملتا۔ خیر علی گڑھ ٹھیک رہے گا۔ وہاں آپ کے بھائی صاحب بھی ہیں (مسکرا کر) حضرت جب سے گئے ہیں مجھے تو کوئی خط ہی نہیں لکھا۔

معصومہ: ابا جان کو بھی یہی شکایت ہے خط لکھنے میں بے حد کاہل اور بے پروا ہیں۔

قاسم: (گرم پانی کیتلی میں ڈالتے ہوئے) کاہل اور بے پروا ہی تو کیا۔ نامعقولیت ہے۔ ہمیشہ کے نامعقول رہے ہیں۔ عجیب حضرت ہیں (دودھ کا برتن انگیٹھی پر رکھتا ہے سجاد گھڑی دیکھ کر)

سجاد: ابھی تو سوا آٹھ بجے ہیں گاڑی شاید نو بجے آتی ہے۔

قاسم: ساڑھے آٹھ بجے (ہنس کر) سردی نے بھائی جان کا نام پوچھ لیا ہوگا۔

سجاد: (مسکرا کر) عورتوں کو سردی کا احساس کم ہوتا ہے۔

قاسم: جی ہاں۔ عورتوں کے بدن پر چربی زیادہ ہوتی ہے۔ (سجاد زوردار قہقہہ مارتا ہے۔ معصومہ مسکراتی ہے۔ قاسم دودھ کا برتن انگیٹھی پر سے اتار کر معصومہ سے) لیجیے اب آپ کی ڈیوٹی شروع ہوئی۔

معصومہ: (مسکرا کر) بہت اچھا۔ شکریہ کم از کم آپ نے مجھے اس قابل تو سمجھا۔

(معصومہ اٹھ کر سامان گول میز پر رکھتی ہے اور چائے پیالیوں میں بنانے لگتی ہے قاسم انگیٹھی پر ہاتھ سینکتے ہوئے)۔

قاسم: اس مرتبہ تو آپ کا ٹور کافی لمبے عرصے کا رہا۔

سجاد: بھئی یہ محکمۂ جنگلات بھی عجیب محکمہ ہے ایسی ایسی الجھنیں پیدا ہوتی ہیں کہ دماغ ماؤف ہوجاتا ہے۔ ماتحتوں کی نالائقی ایک الگ مسئلہ ہے۔ کم بخت

مسئلے کو سلجھانے کے بجائے اور الجھا دیتے ہیں۔

قاسم: (ہنس کر) مسئلہ سلجھانے سے رشوت کا راستہ جو بند ہوجاتا ہے۔

(معصومہ چائے بنا کر سجاد اور قاسم کو دیتی ہے اور خود ایک پیالی لے کر پینے لگتی ہے۔ کچھ دیر بعد سجاد معصومہ کو دیکھ کر)

سجاد: تمھارے بھائی صاحب کچھ مالی مدد بھی کرتے ہیں۔

معصومہ: نئی نئی نوکری ملی ہے۔ پہلے خود کو تو اسٹیبلش کرلیں پھر ہم لوگوں کی بھی مدد کریں گے۔

سجاد: کئی مہینے تو ہوگئے انھیں نوکری کیے ہوئے۔

معصومہ: چار پانچ مہینے ہی تو ہوئے ہیں اور پھر سروس کا معاملہ ہے وہاں اپنی پوزیشن بنانے کے لیے بھی کچھ کرنا ہی ہوگا۔

سجاد: (کچھ دیر خاموش رہ کر) مولوی صاحب کی پنشن ہوجانے پر تو یقینی تکلیف ہوگی۔

معصومہ: خدا پھر کوئی تدبیر کردے گا۔

سجاد: تم نے اچھی خاصی تعلیم حاصل کی ہے۔ کسی کالج میں ٹرائی کیوں نہیں کرتیں—

معصومہ: ابا جان میری نوکری کے خلاف ہیں (مسکرا کر) تعلیم کا مقصد نوکری حاصل کرنا ہی تو نہیں ہے۔

سجاد: یہ دور معاشی بحران کا ہے پرانے نظریات اب چھوڑنا پڑیں گے۔

معصومہ: جی ہاں معاشی بحران تو ہے مگر سیاسی بحران کا نتیجہ ہے جس نے ایک غیر یقینی فضا قائم کر رکھی ہے جس کے باعث انسان اپنے مستقبل سے ناامید ہوکر بوکھلا گیا ہے (قاسم اور سجاد معصومہ کو غور سے دیکھتے ہیں، معصومہ کچھ دیر خاموش رہ کر کھڑی ہوکر) اچھا اب مجھے اجازت دیجیے۔

سجاد: بیٹھو۔ ایسی جلدی بھی کیا ہے۔

معصومہ: ابا جان کی دوا کا وقت ہوگیا ہے۔ میں تو ساجدہ باجی سے ملنے آئی تھی۔

سجاد: وہ شاید آتی ہی ہوں گی۔

معصومہ: اب صبح ہی مل لوں گی۔

(سجاد کو سلام کر کے کمرے سے چلی جاتی ہے۔ سجاد گھڑی دیکھ کر)

سجاد: اب تو نو بجنے کو ہیں۔ تمھاری بھاوج کو آجانا چاہیے۔

قاسم: کہہ کر وہ آج ہی کا گئی تھیں ممکن ہے کسی وجہ سے رک گئی ہوں۔ (کچھ دیر خاموش رہ کر) یہ معصومہ بیگم بھی عجیب ہیں (سجاد نظریں اٹھا کر قاسم کو دیکھتا ہے اور ہاتھ سینکتا ہے) ایک طرف تو پی ایچ ڈی کر رہی ہیں اور دوسری طرف نوکری کی مخالف ہیں (ہنس کر) انھیں تو بھابی جان کی نوکری پر بھی اعتراض ہے۔

سجاد: اس پر مولوی صاحب کے خیالات کی گہری چھاپ ہے وہ ذرا پرانے خیال کے بزرگ ہیں— تم نے مولوی صاحب کا معائنہ کیا۔

قاسم: میں تو روز ہی دیکھ آتا ہوں انھیں دمے کی شکایت ہے لیکن ابتدائی اسٹیج ہے تشویش کی کوئی بات نہیں۔

سجاد: ان کے صاحبزادے انتہائی نالائق نکلے بوڑھے باپ کی ذرا پروانہیں۔

قاسم: ہیں بڑے دل گردے کے آدمی آج تک کوئی شکایت نہیں کی۔

سجاد: پرانے وضع دار آدمی ہیں اور پھر جانتے ہیں شکایت سے کیا ملے گا۔

قاسم: ایک طرح سے مالی پریشانیوں میں بھی مبتلا ہیں۔

سجاد: مگر حوصلہ دیکھو— بچوں کو اعلیٰ سے اعلیٰ تعلیم دلوا دی۔

(قاسم خاموش ہو کر آگ تاپنے لگتا ہے، تھوڑی دیر بعد ساجدہ کمرے میں آتی ہے قاسم اسے دیکھ کر)

قاسم: ارے بھابی جان آپ تشریف لے آئیں۔ ہم تو ناامید ہو چکے تھے۔

ساجدہ: بھئی غضب کی سردی ہے آج تو نام پوچھ لیا (انگیٹھی کے پاس بیٹھ کر) ارے منظور میاں۔

قاسم: وہ تو نہیں ہے گھر چلا گیا۔

ساجدہ: بھئی قاسم میاں میرا سامان باہر تانگے پر رکھا ہے اور تم ہی ذرا تکلیف کرو۔

قاسم: بہت اچھا۔

(اٹھ کر کمرے سے چلا جاتا ہے۔ ساجدہ سجاد کی طرف دیکھ کر)

ساجدہ: آپ کب آئے۔

سجاد: بس ابھی آیا ہوں۔ کپڑے تک نہیں بدلے۔ میں تو سوچ رہا تھا شاید تم آج نہ آؤ۔

ساجدہ: سردی تو جان لیے لے رہی ہے میں تو ادھورا کام چھوڑ کر ہی چلی آئی غضب کی سردی ہے اس سال۔

سجاد: خون جما دینے والی (کچھ دیر خاموش رہ کر) میں جب گیا تھا۔ اس وقت تو تمھارا ٹور کا کوئی پروگرام نہ تھا۔

ساجدہ: یہ ایجوکیشن ڈپارٹمنٹ ہے (مسکرا کر) اس کی ہر بات نرالی ہے اور لیڈی انسپکٹر ہونا سب سے بڑا گناہ۔ ماسٹرنیوں کے جھگڑے نپٹانے میں لیڈی انسپکٹر کی زندگی ہی نپٹ جاتی ہے۔ (سجاد ہنستا ہے۔ ساجدہ ہاتھ تاپتے ہوئے) کم بختوں کو لڑائی جھگڑے کے علاوہ کچھ آتا ہی نہیں اور ہماری ہیڈ مسٹریس بالکل اللہ کی نیک بندیاں ہیں بجائے ان جھگڑوں کو ختم کرنے کے خود پارٹی بن بیٹھتی ہیں۔

سجاد: (ہنس کر) جہاں عورتوں کی حکومت ہوگی وہاں یہ نہیں تو اور کیا ہوگا۔

ساجدہ: (ہنس کر) لڑکیوں کا بیان تھا کہ وہ گھمسان کا رن پڑا کہ مہابھارت کی یاد تازہ ہوگئی۔

سجاد: اچھا عورتوں کی مہابھارت دیکھنے کی چیز ہوگی۔

ساجدہ: ہیڈ مسٹریس نے رو رو کر بیان دیا کہ بیچ بچاؤ میں ان کی ساڑی پھٹ گئی۔ چہرے پر خراشیں آگئیں اور (ہنس کر) انھیں غم اس کا تھا کہ ان کا ایک ابر رنگ

کھل گیا اور ستیاناس ہوگیا (مسکرا کر) بے چاری بار بار اس کا ذکر کررہی تھیں۔

قاسم: (ہاتھ میں ایک اٹیچی کیس لیے ہوئے آتا ہے اور ساجدہ سے) بھابی جان تانگا والے کو پیسے تو دے دیے نا۔

ساجدہ: ہاں۔ وہ تو میں نے دے دیے تھے۔ (قاسم انگیٹھی کے پاس بیٹھ جاتا ہے اور ہاتھ تاپتا ہے) کہو اچھے تو رہے۔

قاسم: جی ہاں (ہنس کر) خاصا ہٹا کٹا رہا۔

ساجدہ: (اٹیچی کی طرف دیکھ کر) ارے میرا ہولڈال۔ وہ بھی تانگے میں تھا۔

قاسم: وہ آپ کے کمرے میں رکھ دیا ہے (مسکرا کر) آپ تو ایسی گھبرا گئیں جیسے وہ میں نے تانگے والے کو بخشش میں دے دیا ہوں۔

ساجدہ: (ہنس کر) یہ تانگے والے کوئی انھیں بخشش دے یا نہ دے موقع ملنے پر خود ہی قبول کر لیتے ہیں۔

(قاسم کچھ دیر خاموش رہتا ہے پھر کھڑے ہو کر)

قاسم: (سجاد کی طرف دیکھ کر) اب میں کل بھوپال چلا جاؤں گا۔

ساجدہ: ابھی تم بھوپال نہیں گئے۔

قاسم: آپ دونوں گھر پر نہیں تھے منظور میاں ایک نمبر کے بے پروا ہیں اس لیے گھر ان پر چھوڑنا مناسب نہیں سمجھا۔

ساجدہ: (ہنس کر) اب تو ماشاء اللہ تم بھی کافی سمجھ دار ہوتے جارہے ہو۔ (قاسم ہنستا ہوا کمرے سے چلا جاتا ہے سجاد کیتلی میں چائے دیکھتے ہوئے)

سجاد: ایک پیالی چائے پی لو (پیالی میں چائے بنا کر ساجدہ کو دیتے ہوئے) ابھی معصومہ تم سے ملنے آئی تھی۔

ساجدہ: اچھا۔ مولوی صاحب کی طبیعت اب کیسی ہے۔

سجاد: کہہ رہی تھی اب تو کچھ افاقہ ہے۔ ڈاکٹر نفیس سے کریم گنج میں ملاقات ہوئی تھی وہ کہہ رہے تھے تشویش کی کوئی بات نہیں ہے۔ (کچھ دیر رک کر) انھوں

نے ایک بجے ٹن دیا ہے اور مجھے پسند ہے— (ساجدہ سوالیہ نظروں سے دیکھتی ہے) ان کا خیال ہے کہ قاسم ان کے ساتھ ان کی ڈسپنسری میں کام کرنے لگے۔

ساجدہ: (سوچتے ہوئے) بجے ٹن تو برا نہیں ہے— مگر— (خاموش ہو جاتی ہے سجاد اسے سوالیہ نظروں سے دیکھتا ہے) وہاں قاسم کا اور صنوبر کا ساتھ ہوگا۔

سجاد: تو کہاں کی برائی ہے۔ صنوبر ایک پڑھی لکھی لڑکی ہے اور پھر اپنے باپ کی اکلوتی ہے۔ ڈاکٹر نفیس کے پاس کچھ کم پیسہ نہیں ہے۔

ساجدہ: یہ تو سب ٹھیک ہے مگر ان سب باتوں نے اس کو حد سے زیادہ مغرور کر دیا ہے اور معصومہ—

سجاد: (بات کاٹ کر) معصومہ بھی بہت اچھی لڑکی ہے۔ بلکہ بہت ہی اچھی ہے۔ (کچھ دیر خاموش رہ کر) ممکن ہے ڈاکٹر کا ارادہ صنوبر کے لیے قاسم کا ہو اور اسی لیے یہ آفیشن دیا ہو— میرا خیال ہے ہم کو یہ آفیشن مان لینا چاہیے۔

ساجدہ: ہاں بے کار رہنے سے تو یہ اچھا ہے۔ آپ نے قاسم سے بات کی۔

سجاد: ہاں مگر وہ خاموش ہو گیا۔ میرا خیال ہے وہ قبول کر لے گا۔ ذرا تم اس سے بات کر کے دیکھنا (مسکرا کر) تمھاری بات ذرا اس کی سمجھ میں جلدی آجاتی ہے۔

ساجدہ: ہاں دیکھیے میں بات کروں گی (کچھ دیر خاموش رہ کر) مگر معصومہ کے مقابلے میں صنوبر کو پسند نہیں کرتی۔

سجاد: ابھی اس پر سوچنا ہی فضول ہے ابھی تو تم قاسم سے بات کر کے دیکھو میں نے معصومہ کی موجودگی میں بات کی تھی ممکن ہے معصومہ کی وجہ سے اس نے خاموشی اختیار کر لی ہو۔

ساجدہ: ممکن ہے یہی بات ہو وہ دونوں ایک دوسرے کا بہت خیال رکھتے ہیں۔

سجاد: (کچھ دیر خاموش رہ کر) تم نے ماسٹرنیوں کے جھگڑے کا کیا فیصلہ کیا—

ساجدہ: کیا فیصلہ کیا جاتا بیان لے لیے ہیں (کھڑی ہو کر) اب تو لیٹنا چاہیے۔ ان

فضول کاموں میں ایسی تھکاوٹ ہوتی ہے کہ خدا کی پناہ۔

(پردہ)

دوسرا اسین

منظر

(وہی کمرہ۔ کچھ دن بعد ساجدہ ایک صوفے پر بیٹھی اخبار دیکھ رہی ہے کہ سجاد کمرے میں آتا ہے ساجدہ نظریں اٹھا کر اسے دیکھ کر)

ساجدہ: کیسے دیکھ آئے۔ مولوی صاحب کی طبیعت اب کیسی ہے۔

سجاد: ٹھیک ہے۔ سردیوں میں دمے کی تکلیف میں ویسے ہی اضافہ ہو جاتا ہے۔

ساجدہ: مگر کمزور بے حد ہو گئے ہیں۔

سجاد: بڑھاپا۔ بیماری اور پھر معصومہ کی فکر۔ (ٹھنڈی سانس بھر کر) بے چارے کی ساری زندگی جدوجہد ہی میں گزری۔

ساجدہ: اور صاحبزادے ایک نمبر کے نالائق نکلے بوڑھے باپ اور بہن کی ذرا فکر نہیں۔

سجاد: باپ نے کس تکلیف میں رہ کر کس حوصلے سے تعلیم دلوائی۔ یہ اس کا دل جانتا ہوگا۔ معمولی معاش کے آدمی کا یہ حوصلہ قابل قدر ہے۔ معمولی نوکری اور بچوں کو قرآن پڑھا کر گزر کرتے رہے۔

ساجدہ: اور لڑکی کو بھی اعلیٰ تعلیم دلوا دی۔

سجاد: ہم نے تو ایسا حوصلہ اچھے اچھوں کا نہیں دیکھا (ٹھنڈی سانس بھر کر) بیٹے کی طرف سے وہ بالکل ناامید ہیں۔

ساجدہ: مگر کبھی حرف شکایت زبان پر نہیں لاتے۔ میں نے تو کہا تھا کہ معصومہ کو کہیں نوکر رکھا دیجیے۔

سجاد: پھر کیا بولے۔

ساجدہ: مسکرا کر خاموش ہو گئے۔

سجاد: اپنی اولاد سے بے پناہ محبت کرتے ہیں(چند سیکنڈ رک کر) تم نے قاسم سے بات کی۔

ساجدہ: کس سلسلے میں۔

سجاد: وہی ڈاکٹر نفیس کے ساتھ کام کرنے کی۔

ساجدہ: اس دن تو وہ صبح ہی بھوپال چلے گئے تھے اب آئے ہیں دیکھو بات کروں گی۔

سجاد: ڈاکٹر نفیس نے کل پھر مجھ سے کہا تھا (کچھ دیر خاموش رہ کر) تم نے جو چھٹی کی درخواست دی تھی اس کا کیا ہوا۔

ساجدہ: ابھی تو کوئی فیصلہ نہیں ہوا مگر شاید چھٹی نہ مل سکے۔

سجاد: (حیرت سے) کیوں۔

ساجدہ: محکمے والوں کا خیال ہے کہ میں اپنا ٹرانسفر اوائڈ کرنے کے لیے اس قدر طویل چھٹی لے رہی ہوں۔

سجاد: ٹرانسفر! کیسا ٹرانسفر؟

ساجدہ: خبر گرم ہے کہ میرا ٹرانسفر ہو رہا ہے۔

سجاد: تم نے یہ ایک نیا مسئلہ پیدا کر دیا۔

ساجدہ: اب ایسے مسئلے تو پیدا ہوتے ہی رہتے ہیں۔ دیکھیے کیا ہوتا ہے۔ ایسی بے پر کی تو ہمارے محکمے میں ہر روز اڑا کرتی ہیں (ہنس کر) بابو لوگوں کی لیلا ہی نرالی ہے (بلند آواز سے) منظور میاں۔ منظور میاں۔

سجاد: (ہنس کر) یہ منظور میاں کی یاد کیسے آ گئی۔

ساجدہ: ایک پیالی پی جائے۔ اس سردی نے تو اوسان خطا کر رکھے ہیں۔

سجاد: واقعی ایسی سردی تو زندگی میں نہیں دیکھی۔

ساجدہ: (ہنس کر) خدا نے جانے کیا سوچ کر دوزخ میں آگ کا انتظام کیا ہے۔ ہم گنہگار بندوں کے لیے تو برف ہی کافی تھی۔

سجاد: (ہنس کر) ہاں خدا تم سے رائے لینا بھول گیا تھا۔

ساجدہ: دیکھیے نا بس بے غیرت ہیں کہ اس سردی میں زندہ ہیں (منظور کمرے میں آتا ہے) منظور میاں ایک پیالی چائے ہی پلا دو (منظور خاموشی سے واپس چلا جاتا ہے ساجدہ مسکرا کر) ان کی قلندری میں بھی کوئی کلام نہیں۔

سجاد: (ہنس کر) ارے ہاں تم کو ایک تازہ خبر سنانا تو بھول ہی گیا (ساجدہ سوالیہ نظروں سے دیکھتی ہے) حضرت کو اس عمر میں شادی کا شوق چرایا ہے۔

ساجدہ: (حیرت سے) سچ مچ۔

سجاد: میں تو سمجھا تھا تمھیں یہ خبر مل گئی ہوگی۔ حضرت نے جگن چچی کو پچیس روپے رشوت بھی دیے ہیں کہ وہ ان کی کہیں شادی کرا دیں۔

ساجدہ: (ہنس کر) بالکل پاگل ہے۔ شادی کے بعد بوڑھی گھوڑی لال لگام والی مثل سچ ہو جائے گی (کچھ دیر خاموش رہ کر) آج آپ دفتر نہیں جائیں گے۔

سجاد: جاؤں گا کیوں نہیں چائے پی لوں سردی کے مارے تو ہاتھ پاؤں جواب دے رہے ہیں (گھڑی دیکھ کر) ارے یہ تو گیارہ بجنے والے ہیں ابھی تک کس قدر کہرہ ہے (بلند آواز سے) منظور میاں ذرا چائے جلدی لے آؤ (قاسم کمرے میں آتا ہے سجاد قاسم کو دیکھ کر) ارے بھئی ایسی سردی میں کہاں گئے تھے۔

قاسم: (ایک کرسی پر بیٹھ کر) اپنے ایک دوست سے ملنے گیا تھا۔ راستے میں ڈاکٹر نفیس مل گئے اپنے گھر لے گئے تھے۔

سجاد: اچھا۔ کیا باتیں ہوتی رہیں۔

قاسم: اپنا پیشکش دوہرایا کہ میں ان کے ساتھ ان کی ڈسپنسری کی دیکھ بھال کروں۔

سجاد: پھر تم نے کیا جواب دیا۔

قاسم: فی الحال تو کچھ فائنل نہیں کیا۔ (ساجدہ کی طرف دیکھ کر) مجھے بھائی صاحب کی رائے لینا ضروری تھی۔

(منظور آتا ہے اور چائے کی کشتی ساجدہ کے سامنے رکھ کر جانے کے لیے

مڑتا ہے۔ ساجدہ مسکرا کر)

ساجدہ: منظور میاں سنا ہے تم دولہا بننے والے ہو۔

منظور: (مڑ کر ساجدہ کو دیکھ کر) جگن چچی نے کہا۔ موت مٹی کرنے والا کوئی ہونا چاہیے اس لیے۔

ساجدہ: (ہنس کر) پھر کوئی لڑکی پسند کی۔

منظور: لڑکی! بی بی کسی بڑھیا کو گھر میں ڈال لوں گا۔ بیماری دکھی میں کام آئے گی۔ جگن چچی کی کوئی بہن ہیں۔ 45 سال کی عمر ہے۔

ساجدہ: اچھا۔۔ (خاموش ہو جاتی ہے۔ منظور کمرے سے چلا جاتا ہے ساجدہ چائے پیالی میں ڈالتے ہوئے) تو جگن چچی نے اس کے مکان پر داؤ لگایا ہے۔

سجاد: بھئی غضب کی چالاک ہیں یہ جگن چچی بھی۔ سوچا ہوگا کہ منظور کے آگے پیچھے تو کوئی ہے نہیں یوں گھر پر قبضہ ہو جائے گا (چائے کی پیالی ہاتھ سے لے کر) خیر اچھا ہے تنہائی میں مرتا رہتا ہے اس بڑھاپے میں دیکھ بھال کرنے والا مل جائے گا۔

ساجدہ: (ہنس کر) اس تنہائی نے تو اسے قلندر بنا دیا ہے۔ اس بار تو اجمیر جانے کا کہہ رہا تھا (ہنس کر) کہہ رہا تھا زندگی میں حج تو نصیب ہوا نہیں اجمیر شریف ہی کی زیارت کرلوں۔

سجاد: (چائے کی پیالی میز پر رکھ کر) اچھا بھئی میں تو دفتر چلا۔ کچھ وہاں کا کام دیکھ لوں پھر ٹور پر جانا ہے۔

(سجاد کمرے سے چلا جاتا ہے۔ ساجدہ قاسم کو دیکھ کر)

ساجدہ: ہاں قاسم میاں کیا فیصلہ کیا۔

قاسم: آپ کی رائے کیا ہے؟

ساجدہ: بھئی میرا تو خیال ہے اس آفر کو قبول کرلو۔ سرکاری نوکری کی امید میں وقت ضائع کرنا فضول ہے۔

قاسم: بھابی جان۔ (سوچتے ہوئے) ڈاکٹر نفیس بہت سخت مزاج آدمی ہیں۔

ساجدہ: ارے بھئی تم کوئی ان کے نوکر تو ہو گے نہیں جو ان کی سخت مزاجی کا خیال کیا جائے۔ تمہیں تو تجربہ حاصل کرنا ہے اور پھر ڈاکٹر کو اب ڈسپنسری کے کاموں سے دلچسپی بھی نہیں رہی ہے۔

قاسم: (ہنس کر) ڈسپنسری تو وہ مجھے بخشش میں دینے سے رہے۔

ساجدہ: (مسکرا کر) ممکن ہے ڈسپنسری تم ہی کو مل جائے۔

(قاسم خاموش ہو جاتا ہے۔ ساجدہ اس انداز سے اسے دیکھتی ہے جیسے اس کے خیالات معلوم کرنے کی کوشش کر رہی ہو۔ قاسم کچھ دیر خاموش رہ کر)

قاسم: ڈاکٹر نفیس حساب کتاب کے معاملے میں بہت ہوشیار ہیں کوڑی کوڑی کا حساب رکھتے ہیں۔

ساجدہ: یہ تو کوئی برائی نہیں ہے ویسے ان کو کبھی کنجوس نہیں پایا (مسکرا کر) غریب مریضوں کو اپنی ڈسپنسری سے مفت دوا بھی تو دیتے ہیں۔

قاسم: اب پروپگنڈے کے لیے ایسے ہزاروں روپ بھرے جاتے ہیں —

ساجدہ: (مسکرا کر) مگر وہ بہروپیے تو نہیں ہیں۔ خیر میرا خیال ہے کہ تم ان کا آفر قبول کر لو۔

قاسم: (چند سیکنڈ رک کر مسکراتے ہوئے) مجھے دو چار دن کا موقع تو ملنا چاہیے کہ میں اور سوچ لوں۔

ساجدہ: خوب سوچ لو۔ پھر بیچ میں چھوڑ دینا بڑا بھدا معلوم ہوگا (قاسم خاموش رہتا ہے پھر نظریں اٹھا کر چائے دانی کی طرف دیکھتا ہے ساجدہ ایک دم کسی قدر شرمندگی سے) بھئی میں تو باتوں میں ایسی لگی کہ تم کو چائے دینا ہی بھول گئی (پیالی میں چائے بنا کر قاسم کو دیتے ہوئے) میری یادداشت بھی کچھ یوں ہی سی ہو جا رہی ہے (کچھ دیر خاموش رہ کر) صاحبزادے کا پھر اس سال فیل ہونے کا ارادہ ہے۔

قاسم: بھابی جان وہ فضول حرکتوں میں پڑ گیا ہے۔ پڑھنے لکھنے سے اسے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔

ساجدہ: یہ مرض تو طالب علموں میں عام ہے میں تو دیکھ رہی ہوں لڑکیاں بھی لڑکوں کے نقش قدم پر چل رہی ہیں۔ اسٹرائکوں اور ایجی ٹیشنوں میں انھیں بھی اسی قدر دلچسپی ہے جتنی لڑکوں کو (ٹھنڈی سانس بھر کر) یہ نسل کدھر جارہی ہے کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔

قاسم: ایجی ٹیشن بھی ہوں تو کسی معقول کاز کے لیے ہوں یہ کیا کہ کسی بس کنڈکٹر سے لڑ لیے اور ایجی ٹیشن شروع (معصومہ کمرے میں آتی ہے قاسم اسے دیکھ کر) ارے مولوی صاحب کی طبیعت اب کیسی ہے۔

معصومہ: اب تو بڑی حد تک افاقہ ہے۔ آج تو آپ کو پوچھ رہے تھے۔

قاسم: کل ہی رات بھوپال سے لوٹا ہوں۔ صبح صبح ایک کام سے چلا گیا تھا۔ شام تک ضرور آتا۔

ساجدہ: ارے بیٹھو بھئی۔ (معصومہ بیٹھ جاتی ہے) میں تو تمھارے گھر گئی تھی۔ مولوی صاحب نے بتلایا تم کالج گئی ہو۔

معصومہ: جی ہاں میرے گائڈ نے مجھے ہفتے میں آج ہی کا دن دیا ہے۔ ان سے کچھ ڈسکشن کرنا تھا۔

ساجدہ: پھر اس قدر جلدی کیسے لوٹ آئیں۔

معصومہ: آج وہ کالج ہی نہیں آئے تھے۔

قاسم: انھیں بھی سردی لگ گئی ہوگی (ہنس کر) پروفیسر کمار ویسے ہی دھان پان آدمی ہیں۔

منظور: (کمرے میں آکر) قاسم میاں کوئی صاحب آپ سے ملنے آئے ہیں۔

قاسم: کون صاحب ہیں۔ اچھا چلو میں آرہا ہوں (منظور کمرے سے چلا جاتا ہے قاسم کھڑے ہوکر ساجدہ سے) جاکر دیکھوں اس سردی میں کون صاحب

تشریف لے آئے۔ (جاتے ہوئے) آپ آفس نہیں جائیں گی۔

ساجدہ: ایک اسکول انسپکشن کرنا ہے سیدھی وہیں چلی جاؤں گی (قاسم کمرے سے چلا جاتا ہے۔ ساجدہ پیالی میں چائے بنا کر معصومہ کو دیتے ہوئے) قاسم میاں کہہ رہے تھے تم علی گڑھ جارہی ہو۔

معصومہ: جی ہاں ارادہ تو ہے مگر مہینے دو مہینے بعد ہی جانا ہوگا اور وہ بھی اگر— (خاموش ہوجاتی ہے۔ ساجدہ سوالیہ نظروں سے دیکھتی ہے۔ معصومہ چائے کا گھونٹ دے کر) اگر ابا جان کی طبیعت ٹھیک ہوگئی۔

ساجدہ: مولوی صاحب کو آرام کی سخت ضرورت ہے۔ تمھارے بھائی صاحب کو چاہیے کہ انھیں اپنے ساتھ رکھیں۔

معصومہ: ابا جان کبھی اس کے لیے تیار نہ ہوں گے۔

ساجدہ: کیوں۔

معصومہ: (چند سیکنڈ رک کر) وہ اس جگہ کو چھوڑنا نہیں چاہتے اور پھر مکانوں کی دیکھ بھال کا بھی مسئلہ ہے۔

ساجدہ: تمھارے کرائے دار ویسے بھی معقول لوگ ہیں اور سال میں ایک آدھ چکر لگا کر انھیں دیکھا جاسکتا ہے۔

(معصومہ خاموش رہتی ہے پھر جیسے اس موضوع کو ٹالنے کے انداز میں)

معصومہ: قاسم صاحب کی نوکری کا کیا ہوا۔

ساجدہ: سرکاری نوکری کی فی الحال کوئی امید نہیں ہے۔

معصومہ: بلا وجہ سرکاری نوکری کے چکر میں پڑے ہیں، پرائیویٹ پریکٹس کیوں نہیں کرتے۔

ساجدہ: بھئی یہ تو پسند کی بات ہے (معصومہ کا چہرہ دیکھتے ہوئے) اب ڈاکٹر نفیس ہی زور دے رہے ہیں کہ ان کی ڈسپنسری میں کام کریں (معصومہ خاموش رہتی ہے ساجدہ اس کا چہرہ گھورتے ہوئے) تمھارا کیا خیال ہے۔

معصومہ: (کچھ دیر خاموش رہتی ہے پھر سوچتے ہوئے) قاسم صاحب کو کیا اعتراض ہے۔

ساجدہ: اعتراض تو اس نے کچھ نہیں کیا مگر جانے کیوں وہ اس مسئلے کو ٹالنا چاہتا ہے۔ تمھارے آنے سے پہلے یہی بات ہو رہی تھی۔

معصومہ: پھر کیا کہا انھوں نے۔

ساجدہ: (ہنس کر) فیصلہ کرنے کے لیے مہلت مانگی ہے (قاسم کمرے میں آتا ہے) کون تھا۔

قاسم: جانے کون صاحب تھے بھائی جان سے ملنے آئے تھے۔

ساجدہ: نام نہیں پوچھا۔ کیا کام تھا۔

قاسم: (کچھ دیر رک کر) جانے کیا اونٹ پٹانگ اور فضول سا مسئلہ تھا میری تو سمجھ میں آیا نہیں۔ خود کو جنگل کا ٹھیکیدار کہہ رہے تھے۔

ساجدہ: تم نے کم از کم نام تو پوچھ لیا ہوتا۔

قاسم: مسئلہ کوئی خاص نوعیت کا تھا وہ خود دوبارہ آئے گا۔

ساجدہ: اچھا (کھڑی ہوکر) بھئی میں تو چل دی۔ ذرا اسکول جاکر انسپکشن کرلوں بعض وقت تو نوکری سے بھی طبیعت اچاٹ ہوجاتی ہے (ہنس کر) اس قدر سخت سردی میں گھر سے نکلنا قیامت ہے۔

قاسم: آپ منظور کو بھیج کر تانگا بلوا لیجیے۔

ساجدہ: اب میں خود راستہ سے کوئی تانگا پکڑ لوں گی۔ سردی میں منظور کا بھی برا حال ہوگا (معصومہ کی طرف دیکھ کر) اچھا بھئی شام کو ملاقات ہوگی۔ گھر پر ہی رہو گی نا۔

معصومہ: جی ہاں میں اور کہاں جاؤں گی۔

(ساجدہ کمرے سے چلی جاتی ہے۔ قاسم ایک کرسی پر بیٹھ کر)

قاسم: اور سنایئے کیا حال چال ہے۔

معصومہ: حال چال تو سب ٹھیک ہے، آپ بھوپال سے بہت دن بعد لوٹے۔

قاسم: (مسکرا کر) بہت دن! تیسرے دن ہی تو واپس آگیا۔

معصومہ: (سوچتے ہوئے) آپ ڈاکٹر نفیس کا آفر کیوں قبول نہیں کر لیتے۔

قاسم: (غور سے معصومہ کا چہرہ دیکھ کر) معصومہ بیگم یہ مسئلہ اس قدر آسان نہیں ہے جس قدر آپ لوگ سمجھ رہے ہیں۔

معصومہ: ایسی کیا الجھنیں ہیں۔ آخر آپ یوں کب تک بے کار رہیں گے۔

قاسم: الجھنیں تو کافی ہیں رہا بے کاری کا مسئلہ تو میرے نزدیک یہ کوئی اہم مسئلہ نہیں ہے۔

(معصومہ کچھ دیر خاموش رہتی ہے پھر آہستہ سے)

معصومہ: میں آپ کی الجھنوں کو خوب سمجھتی ہوں مگر خود اعتمادی بھی کوئی چیز ہے۔ (قاسم غور سے معصومہ کو دیکھتا رہتا ہے۔ معصومہ چند سیکنڈ خاموش رہ کر) اور پھر یہ دور ایسا تو نہیں ہے کہ انسان بے روزگار رہ کر ایک باعزت زندگی گزار سکے۔

قاسم: (ہنس کر۔ جیسے اس مسئلہ کو ٹالنا چاہتا ہو) پھر تم کوئی نوکری کیوں نہیں کرتیں۔

معصومہ: میں نوکری کرنے کے خلاف نہیں ہوں مگر ابا جان کا دل دکھانا نہیں چاہتی۔

قاسم: دل دُکھانا۔۔۔ شاید ان کو تو اس سے خوشی ہوگی۔

معصومہ: اگر انھوں نے ایسا سوچا کہ میں ان کا ہاتھ بٹا کر ان پر احسان کر رہی ہوں تو کیا ان کا دل نہیں دکھے گا۔

قاسم: شاید عورتوں کا نوکری کرنا انھیں پسند نہیں۔

معصومہ: (مسکرا کر) نہ عورتوں کی نوکری کے وہ خلاف ہیں اور نہ میں، اس سلسلے میں ہم دونوں کے درمیان ایک عجیب سی بیگانگی ہے جس کو ہم دونوں ختم کرنا نہیں چاہتے ہیں (قاسم خاموش رہتا ہے۔ معصومہ کچھ دیر خاموش رہ کر) آپ ڈاکٹر نفیس کی ڈسپنسری میں کام کیجیے اس میں کوئی نقصان نہیں ہے۔

(قاسم خاموش رہتا ہے پہلے تو خلا میں گھورتا رہتا ہے پھر اٹھ کر کمرے میں ٹہلنے لگتا ہے پھر کچھ دیر بعد معصومہ کے پاس آ کر)

قاسم: تم نہیں سمجھتیں معصومہ کہ ڈاکٹر نفیس مجھے کیوں اپنی ڈسپنسری میں کام کرنے

کے لیے مجبور کر رہے ہیں انھیں میری بے روزگاری سے کوئی ہمدردی نہیں ہے۔

معصومہ: میں جانتی ہوں (کھڑی ہوکر) صنوبر کوئی آدم خور نہیں ہے کہ آپ کو نگل جائے گی۔ اچھا اب مجھے اجازت دیجیے (دروازے کی طرف جاتی ہے پھر پلٹ کر قاسم کو دیکھ کر) ابا جان آپ کو یاد کر رہے تھے اگر شام تک فرصت ہو تو ان سے مل لیجیے گا۔

قاسم: میں ضرور آؤں گا۔ مگر سنو تو— (معصومہ بلا جواب دیے کمرے سے چلی جاتی ہے۔ قاسم چند سیکنڈ خاموش رہ کر) اور اگر اس نے نگل لیا تو معصومہ بیگم آپ کی خوداعتمادی کا کیا ہوگا (اسی وقت سجاد کمرے میں آتا ہے) ارے بھائی جان! دفتر نہیں گئے۔

سجاد: کوئی میرا پوچھتا ہوا تو نہیں آیا تھا۔

قاسم: (غور سے سجاد کو دیکھ کر) ایک شخص آیا تو تھا اپنے آپ کو جنگل کا ٹھیکیدار کہہ رہا تھا پھر آنے کا کہہ گیا ہے (سجاد کسی قدر پریشانی سے کمرے میں ٹہلنے لگتا ہے قاسم تھوڑی دیر بعد) کیا بات ہے بھائی جان آپ کچھ پریشان نظر آرہے ہیں۔

سجاد: نہیں کوئی بات نہیں ہے کتنی دیر ہوگئی اسے گئے ہوئے۔

قاسم: یہی کوئی پندرہ بیس منٹ ہوئے ہوں گے (پھر سجاد کو دیکھ کر) عجیب پراسرار آدمی معلوم ہوتا تھا۔

سجاد: جنگلوں میں کام کرنے والے ایسے ہی پراسرار نظر آتے ہیں۔ تمھاری بھاوج گئیں۔

قاسم: جی ہاں۔ ابھی گئی ہیں۔

سجاد: معصومہ یہاں کس وقت سے تھی۔

قاسم: ابھی ابھی آئی تھی کہہ رہی تھی۔ مجھے ڈاکٹر نفیس کا آفر قبول کرلینا چاہیے۔

سجاد: وہ ٹھیک کہہ رہی تھی۔ ڈاکٹر نفیس اچھی خاصی جائداد کے مالک ہیں اور

ڈسپنسری کی ریپوٹیشن بھی اچھی خاصی ہے (کچھ دیر خاموش رہ کر) معصومہ بہت اچھی لڑکی ہے مگر صنوبر بھی بری نہیں (قاسم خاموش رہتا ہے۔ سجاد کچھ دیر خاموش رہ کر) وہ شخص تم سے کچھ کہہ تو نہیں رہا تھا۔

قاسم: جی نہیں۔ مجھ سے تو کوئی خاص بات نہیں کہی۔ بس یہ کہہ کر چلا گیا کہ آپ سے کام ہے پھر کسی وقت آئے گا۔ آپ آفس نہیں گئے۔

سجاد: مجھے راستے ہی میں اس کا خیال آ گیا تھا اس سے ملنا ضروری تھا۔

قاسم: مگر وہ صورت سے خاصا بدمعاش معلوم ہوتا تھا، ٹھیکیدار تو نظر نہیں آتا تھا۔

سجاد: ہمارے کوپ اور رینجیز ڈکوآئٹی ایریا میں ہیں۔ وہاں اسی قسم کے لوگ کام کرسکتے ہیں۔

قاسم: اس ترقی یافتہ دور میں ڈاکوؤں کا مسئلہ حیران کن ہے۔

سجاد: ڈاکوؤں کا کوئی مسئلہ نہیں ہے ابھی ملک میں ایک ایسا طبقہ موجود ہے جو اپنے اقتدار کو قائم رکھنے کے لیے ڈاکوؤں کا سہارا لیتا ہے۔

قاسم: (کچھ دیر خاموش رہ کر) بھابی جان اپنے ٹرانسفر کی بات کررہی تھیں۔ اس میں کہاں تک سچائی ہے۔

سجاد: سچائی کیا وہ تو حقیقت ہے میں ان کے ڈپارٹمنٹ کے اعلیٰ افسروں سے ملا تھا۔ انھوں نے اس کی تصدیق کردی ہے۔

قاسم: یہ تو بڑا پرابلم ہے اس کا کوئی حل نہیں ہے؟

سجاد: بھئی ملک کچھ ایسے راستے پر چل رہا ہے جہاں ہر چیز کی ترازو سیاست ہے ان کا محکمہ اندرونی سیاست کا بری طرح شکار ہے اور کچھ بیرونی اثرات بھی ہیں۔

قاسم: (سوچتے ہوئے) اب مجھے ڈاکٹر قیس کا آفر قبول کرنا ہی ہوگا۔ سجاد غور سے قاسم کا چہرہ دیکھتا ہے) پھر بھابی جان کو نوکری کی ضرورت نہیں رہے گی۔

سجاد: وہ پندرہ سال کی سروس چھوڑنے کو تیار نہیں ہوں گی۔ میں نے۔

قاسم: لیکن ان کا یوں مارے مارے پھرنا بھی تو برا معلوم ہوتا ہے۔

سجاد: کیا کیا جائے اس دور میں زندگی کے لیے ہر قسم کی جدوجہد کرنا پڑتی ہے۔ ایک دم پانچ سو ساڑھے پانچ سو آمدنی کا کم ہوجانا ناقابل برداشت ہوگا۔ (کچھ دیر رک کر) کم از کم صاحبزادے کی تعلیم ہی کا انتظام ہوجاتا ہے۔ (سجاد پھر بے چینی سے کمرے میں ٹہلنے لگتا ہے۔ قاسم اسے غور سے دیکھ کر)

قاسم: بھائی جان آپ کچھ پریشان ہیں آخر بات کیا ہے۔

سجاد: کوئی بات نہیں ہے (مسکرا کر) اس سردی نے نام پوچھ رکھا ہے۔ (کچھ دیر خاموش رہ کر) پاس میں کہیں کے فون سے دفتر میں یہ اطلاع دے دو کہ میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے میں دفتر نہیں آؤں گا۔

قاسم: بہت اچھا۔

(دروازے کی طرف مڑتا ہے)

(پردہ)

تیسرا سین

منظر

(وہی کمرہ۔ تین چار دن بعد۔ ساجدہ اور سجاد کمرے میں بیٹھے ہوئے کسی مسئلے پر گفتگو کر رہے ہیں۔

ساجدہ: لیکن یہ دو ہزار روپیہ۔

سجاد: اگر میں یہ قبول نہ بھی کروں تو ہوگا وہی جو یہ لوگ چاہتے ہیں۔ یہ روپیہ کون شخص دے کر گیا تھا۔

ساجدہ: میں کوئی ایسے واہیات لوگوں کو پہچانتی ہوں وہ تو صرف چند منٹ رکا اور یہ کہہ کر چلا گیا کہ یہ روپیہ ڈی۔ ایف۔ او صاحب کو دے دینا (سجاد خاموش رہتے ہیں اور کمرے میں ٹہلتے ہیں ساجدہ کچھ دیر خاموش رہ کر) آخر یہ چکر بازی کیا ہے۔

سجاد: میرے علاقے میں جنگلات کے ٹھیکے ہی ڈاکو لیتے ہیں۔

ساجدہ: (خوف زدہ لہجے میں) وہ ڈاکو تھا۔ (چند سیکنڈ رک کر) ڈاکوؤں سے ایسا ربط ضبط بے حد خطرناک ہے۔

سجاد: (مسکرا کر) وہ کوئی ڈاکو نہیں ہوگا اس کا کوئی ایجنٹ ہوگا۔ تمھیں خوف زدہ ہونے کی ضرورت نہیں۔

ساجدہ: نگران سے روپیہ لینا خطرناک ہے یہ کھیل۔

سجاد: (بات کاٹ کر) اگر یہ روپیہ قبول نہ بھی کیا جائے تب بھی ٹھیکا تو انھی کو ملے گا۔ دوسرے یہ ٹھیکا نہیں لے سکتے اور اگر لے بھی لیں تو کام نہیں کر سکتے (کچھ دیر خاموش رہ کر) یہ روپیہ میری خوشنودی کے لیے نہیں ہے بلکہ ان کی اپنی خوشنودی کے لیے ہے (کمرے میں ٹہلتے ہوئے) میرے لیے تو یہ ایک معمولی نذرانہ ہے اصلی رشوت تو سب آر ڈی نیٹ اسٹاف لے گا (ہنس کر) جب میں جانتا ہوں کہ کیا ہونے والا ہے تو اپنا نذرانہ کیوں چھوڑوں۔

ساجدہ: مجھے مجھے تو ـــ

منظور: (کمرے میں آکر) ڈاکٹر نفیس تشریف لائے ہیں۔

سجاد: ڈاکٹر نفیس۔ انھیں یہیں کیوں نہیں لائے (کمرے سے باہر جاتے ہوئے) کہاں ہیں۔

منظور: بیٹھک میں تشریف رکھتے ہیں۔

(سجاد کمرے سے باہر چلا جاتا ہے ساجدہ منظور سے)

ساجدہ: منظور میاں ذرا چائے تو تیار کرلو۔

منظور: بہت اچھا۔

(منظور کمرے سے چلا جاتا ہے ساجدہ صوفے پر پڑے ہوئے بے ترتیب اخبار برابر کرتی ہے کہ آگے آگے سجاد اور ان کے پیچھے ڈاکٹر نفیس کمرے میں آتے ہیں ساجدہ ڈاکٹر نفیس کو دیکھ کر)

ساجدہ: ڈاکٹر صاحب آداب عرض ہے۔
نفیس: (مسکرا کر) آداب ساجدہ باجی۔
ساجدہ: (کسی قدر شرمندگی کے لہجے میں مسکرا کر) ڈاکٹر صاحب آپ ہمیشہ شرمندہ کرتے ہیں۔
نفیس: (ہنس کر) بھئی کبھی تو تم کو ساجدہ باجی کہتے ہیں پھر اگر میں تم کو۔
ساجدہ: (بات کاٹ کر) مگر ڈاکٹر صاحب آپ میرے بزرگ ہیں۔
نفیس: (ہنس کر) مجھے بھی سب ڈاکٹر صاحب ہی کہتے ہیں چاہے میرا بزرگ ہی کیوں نہ ہو۔
سجاد: (مسکرا کر) ڈاکٹر صاحب آپ تشریف تو رکھیے۔
نفیس: (ایک صوفے پر بیٹھ کر) سجاد میاں سنا تھا آپ ٹور پر گئے ہوئے ہیں—
سجاد: جی ہاں جانے والا تھا مگر ٹھیکوں کا نیلام ہونے والا تھا اس لیے رک جانا پڑا۔ میری موجودگی ضروری تھی (ایک کرسی پر بیٹھتے ہوئے) اس مرتبہ تو آپ نے کریم گنج میں کافی قیام کیا۔
نفیس: وہ میرا دوست ہے نا مولا بخش۔
سجاد: (حیرت سے) مولا بخش!
نفیس: ارے وہی علی بخش (ہنس کر) میں بچپن ہی سے اس کو مولا بخش کہتا ہوں۔ شیر پٹوانے کے جھانسے دیتا رہا مگر شیر تو شیر، شیر کا سایہ بھی نظر نہ آیا۔
سجاد: اچھا ڈاکٹر صاحب۔ شیر پٹوانے کا وعدہ میرا رہا۔
نفیس: (ہنس کر) بھئی تمھارے علاقے سے مجھے ڈر معلوم ہوتا ہے اگر بے چارے ڈاکٹر نفیس کا اغوا ہوگیا تو دن میں تارے نظر آجائیں گے۔
سجاد: (ہنس کر) ارے ڈاکٹر صاحب کیا اغوا سب کا ہوتا ہے۔ تو پھر کہیے کب پروگرام بن رہا ہے۔
نفیس: سجاد ان پندرہ دنوں میں ڈسپنسری تباہ ہوکر رہ گئی ہے۔ اس قدر غیر ذمہ داری

سے کام کیا گیا ہے کہ خدا کی پناہ۔ ذرا اس کی دیکھ بھال کرلوں پھر پروگرام بناؤں گا۔

سجاد: مگر آپ کے یہاں جو لوگ ہیں وہ تو پرانے اور ذمہ دار ہیں۔

نفیس: کہاں کے ذمہ دار ہیں۔ مریضوں نے ایک ہزار شکایتیں کی ہیں (کچھ دیر رک کر) اس لیے چاہتا ہوں کہ ڈاکٹر قاسم اس کی دیکھ بھال کریں۔ تم نے ڈاکٹر قاسم سے بات کی۔

سجاد: جی ہاں وہ تقریباً تیار ہیں۔

نفیس: میں نے سنا ہے کہ وہ سرکاری نوکری کو پسند کرتے ہیں مگر میرا تجربہ یہ ہے کہ وہ کوئی نفع بخش نہیں ہے۔

ساجدہ: میرا بھی یہی خیال ہے (مسکرا کر) سرکاری نوکری تو عذاب ہے۔

(منظور چائے لاتا ہے اور ساجدہ کے سامنے رکھ کر چلا جاتا ہے)

نفیس: مجھے درحقیقت اس ڈسپنسری سے کوئی دلچسپی نہیں رہی ہے۔ ڈاکٹر قاسم دیکھ بھال کرنے لگیں تو بقایا زندگی سکون سے گزار دوں۔ زندگی میں بہت محنت کرلی اب سکون ملنا چاہیے (کچھ دیر خاموش رہ کر) ڈاکٹر قاسم ہیں کہاں۔

ساجدہ: شاید مولوی صاحب کو دیکھنے گئے ہیں۔

نفیس: اب تو مولوی صاحب ٹھیک ہیں بس ذرا احتیاط کی ضرورت ہے (مسکرا کر) مگر غضب کے بے پروا ہیں (ہنس کر) پرہیز میں یقین نہیں رکھتے۔

ساجدہ: خدا پر زیادہ بھروسہ کرتے ہیں۔

نفیس: خدا پر بھروسہ کرنا اچھا ہے یہ ایک نفسیاتی علاج ہے مگر دوا کے ساتھ پرہیز اور ڈاکٹر کی ایڈوائز کو بھی دھیان میں رکھنا چاہیے۔ مگر ہیں بڑے وضع دار۔ ایسے لوگ کم ہی دیکھنے میں آتے ہیں۔

ساجدہ: ہر مصیبت اور پریشانی کو اس قدر سکون سے برداشت کرتے ہیں کہ حیرت ہوتی ہے اور ان کی ہی چھاپ معصومہ پر بھی ہے۔

نفیس: بھئی معصومہ بڑی پیاری لڑکی ہے۔ چہرے سے کس قدر سکون ظاہر ہوتا ہے۔ باپ کی بیماری میں بھی اس کے چہرے پر کبھی بے اطمینانی یا گھبراٹ پیدا نہیں ہوئی۔

ساجدہ: زندگی کے اہم سے اہم واقعے کو کچھ اس قدر سرسری نظر سے دیکھتی ہے جیسے کچھ ہوا نہ ہو۔ (چائے ڈاکٹر نفیس کو دیتے ہوئے) صنوبر خاتون کئی دن سے نظر نہیں آئیں۔

نفیس: (طنزیہ) آج کل نوجوانوں میں عجیب سا مرض پھیل رہا ہے کہ پلک جھپکتے ہی لکھ پتی بن جائیں۔ (مسکرا کر) معمے حل کرتی ہیں (ہنس کر) اور ہمیشہ غلط کتابوں کا انتخاب ہوجاتا ہے (قاسم کمرے میں آتا ہے قاسم کو دیکھ کر) آؤ ڈاکٹر—

قاسم: (ڈاکٹر نفیس کو دیکھ کر) آداب عرض ہے ڈاکٹر صاحب۔ مزاج گرامی!

نفیس: (ہنس کر) بس گرامی ہی سمجھو۔ (ایک کرسی کی طرف بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے) کہو کہاں سے آرہے ہو۔

قاسم: (کرسی پر بیٹھ کر) اپنے ایک دوست کے یہاں گیا تھا اس کی بیوی کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔

نفیس: کیوں کیا بات ہے۔

قاسم: دو تین مہینے کا کن سپشن ہے، کوئی خاص بات تو نہیں ہے مگر جانے کیوں نفسیاتی طور پر ڈسٹرب ہیں۔

نفیس: پہلا کن سپشن تو نہیں ہے۔

قاسم: پہلا ہی ہے۔

نفیس: تو یہ صرف نفسیاتی خوف ہوگا۔ پلس کی حالت کیا ہے۔

قاسم: بالکل نارمل۔

نفیس: پہلے اشو سے پہلے کچھ عورتیں نفسیاتی خوف کا شکار ہوجاتی ہیں، اس سے

گھبرانے کی ضرورت نہیں (کچھ دیر خاموش رہ کر) بھئی تم نے میرا آفر قبول کرلیا اس سے بڑی خوشی ہوئی۔

قاسم: ڈاکٹر صاحب۔ آپ حکم دیں اور میں تعمیل نہ کروں یہ ممکن ہے؟

نفیس: پھر کب سے کام شروع کر رہے ہو۔

قاسم: جب سے آپ حکم فرمائیں۔

نفیس: کل ہی سے شروع کردو۔

قاسم: مولوی صاحب کا خیال ہے کہ جمعہ کے دن سے کام شروع کرنا چاہیے۔

نفیس: (ہنس کر) اچھا اچھا جمعہ سے سہی۔ مولوی صاحب بزرگ ہیں ان کا حکم ماننا ہی چاہیے۔ تم نوجوان ہو محنت کر کے ڈسپنسری کی حالت سنبھال سکتے ہو۔

قاسم: آپ کی بزرگانہ رہنمائی میں شاید میں کچھ کرسکوں۔

نفیس: محنت، لگن۔ ایمان داری اور ہمدردی یہی ایک ڈاکٹر کی کامیابی کی ضامن ہیں۔

قاسم: کوشش تو کروں گا کہ آپ کا ایک اچھا شاگرد ثابت ہوں اور کسی شکایت کا موقع نہ دوں۔

نفیس: تیس چالیس سال کی جدوجہد کے بعد اب کچھ سکون ملے گا۔

سجاد: (ہنس کر) تو ڈاکٹر صاحب اسی خوشی میں شیر مارنے کا پروگرام بن جائے۔

نفیس: ضرور۔ ضرور۔ مگر ڈاکٹر قاسم کو کاروبار سمجھنے میں کچھ دن تو لگیں گے۔

سجاد: بہرحال پروگرام طے ہے۔ تاریخ مقرر کرنا آپ کا کام ہے۔

نفیس: بالکل طے رہا (ڈاکٹر کھڑے ہو کر) اب میں چلتا ہوں (مسکرا کر) صنوبر کو بھی یہ خوشخبری سنا دوں وہ بھی خوش ہو جائے گی۔

(ڈاکٹر نفیس آگے آگے اور قاسم ان کے پیچھے کمرے سے نکل جاتے ہیں کچھ دیر خاموشی رہتی ہے ساجدہ کچھ دیر بعد)

ساجدہ: ڈاکٹر صاحب کو ڈسپنسری کی اتنی فکر نہیں ہے جتنی صنوبر کی ہے۔

سجاد: بے ماں کی بچی ہے۔ ڈاکٹر نے بڑی محنت سے پالا ہے۔ اب اس کے

بارے میں سبکدوش ہوجانا چاہتا ہے۔

ساجدہ: یہ تو ہر ماں باپ کی خواہش ہوتی ہے (کچھ دیر خاموش رہ کر) ڈاکٹر سوچتا ہوگا کہ اس کے بعد اس کی ڈسپنسری کا صحیح استعمال ہوتا رہے گا۔

سجاد: اب یہ تو قاسم پر ہے کہ وہ ڈسپنسری کو کس طرح چلاتا ہے (قاسم واپس کمرے میں آتا ہے) کہو ڈاکٹر صاحب کو رخصت کر آئے۔

قاسم: جی ہاں۔ ڈاکٹر صاحب اس عمر میں بھی زندہ دل ہیں۔

سجاد: یہی ان کی کامیابی کا راز ہے، کبھی کسی کو ان سے شکایت پیدا نہیں ہوتی۔ (مسکرا کر) مریض تو ان کی شکل دیکھ کر ہی خود کو تندرست محسوس کرنے لگتا ہے (کچھ دیر خاموش رہ کر) مولوی صاحب سے تمھاری اس سلسلے میں گفتگو ہوئی تھی؟

قاسم: جی ہاں انھوں نے بھی اس خیال کو پسند فرمایا ہے۔

سجاد: معصومہ کا کیا خیال ہے۔

قاسم: وہ بھی خوش ہے بلکہ اسی نے مجھ پر زور دیا ہے کہ میں اس آفر کو قبول کرلوں۔ (سجاد اور ساجدہ دونوں مشکوک نظروں سے قاسم کو دیکھتے ہیں کہ منظور ایک تار لاکر قاسم کو دیتا ہے۔ قاسم تار لیتے ہوئے) یہ کیا ہے۔

منظور: ابھی ابھی پوسٹ مین دے کر چلا گیا ہے۔
(قاسم تار پڑھنے لگتا ہے۔ منظور چائے کے برتن اٹھا کر کمرے سے چلا جاتا ہے۔ قاسم تار پڑھنے کے بعد خاموش رہتا ہے)

ساجدہ: (قاسم کا چہرہ دیکھتے ہوئے) کس کا تار ہے؟
(قاسم کوئی جواب نہیں دیتا خاموشی سے تار ساجدہ کی طرف بڑھا دیتا ہے۔ ساجدہ تار پڑھتی ہے اس کے چہرے پر پریشانی کے آثار پیدا ہوتے ہیں۔ ساجدہ کو دیکھ کر)

سجاد: کیا بات ہے؟

ساجدہ: یہ تو ایک دن ہونا ہی تھا (تار سجاد کی طرف بڑھاتے ہوئے) صاحبزادے پولیس کی لاٹھی سے گھائل ہو گئے ہیں پرنسپل کا تار ہے۔

سجاد: (تار لے کر پڑھتے ہوئے) صاحبزادے ایک مصیبت بنے ہوئے ہیں۔ ارے صاحب ان کا پڑھانا لکھانا سب فضول ہے یہ کچھ پڑھ لکھ کر دینے والے نہیں ہیں۔

قاسم: خیر یہ تو بعد کی باتیں ہیں اس وقت تو کسی کو جا کر ان کی خبر لینا ہی چاہیے جانے کس حالت میں ہیں۔

سجاد: قاسم میاں۔ آپ ہی تشریف لے جایئے مجھے ان کی حرکتوں سے نفرت ہے ان کی شکل دیکھ کر میرا خون کھولنے لگتا ہے۔

قاسم: آپ کہتے ہیں تو میں چلا جاتا ہوں مگر بہتر یہ تھا کہ آپ یا بھابی جان جائیں میرا ان پر کوئی اثر نہیں ہے۔

سجاد: اور وہ اثر کس کا قبول کرتے ہیں۔ اگر ایسا ہی ہوتا تو پھر رونا کس بات کا ہوتا۔ جب سمجھا بجھا کر عاجز آ گئے تو ان کو ان کے حال پر چھوڑ دیا کہ ایک دن خود راہ راست پر آجائیں گے۔

قاسم: (ساجدہ کی طرف دیکھ کر) بھابی جان بہتر ہے کہ آپ تشریف لے جائیں آپ کے جانے کا کچھ نہ کچھ اثر تو ضرور ہوگا۔

ساجدہ: (آنکھوں میں آنسو بھر کر) شاید اس دور میں ماں کے دودھ میں بھی وہ اثر نہیں رہا ہے جس سے اولاد فرماں بردار اور سعادت مند بنتی ہے۔ (آنسو پونچھتے ہوئے ٹھنڈی سانس بھر کر) اس لڑکے سے بڑی امیدیں وابستہ کر رکھی تھیں مگر معلوم ہوتا ہے کہ سارے خواب ادھورے ہی رہ جائیں گے۔

قاسم: بھابی جان۔ ناامید ہونے کی بات نہیں ہے کوئی نہ کوئی راستہ ڈھونڈ نکالیں گے۔ بارہ بجے بس جاتی ہے آپ چلی جایئے۔

ساجدہ: جی تو نہیں چاہتا مگر تم کہتے ہو تو چلی جاتی ہوں۔

قاسم: منظور کو بھی ساتھ لے جایئے ورنہ آپ کو تکلیف ہوگی (بلند آواز سے) منظور میاں۔ منظور میاں! (کچھ دیر بعد منظور آتا ہے قاسم اسے دیکھ کر) منظور میاں بھابی جان کے ساتھ ابھی تمھیں بھوپال جانا ہے۔

منظور: کیوں خیریت تو ہے۔

قاسم: امجد کے چوٹ آگئی ہے بھابی جان اسے دیکھنے جارہی ہیں۔

منظور: کہیں خدانخواستہ —

قاسم: نہیں گھبرانے کی بات نہیں ہے۔ تم جاکر فوراً تیاری کرلو بارہ بجے بس جاتی ہے۔

منظور: بہت اچھا۔

(کمرے سے چلا جاتا ہے۔ قاسم کچھ دیر خاموش رہ کر)

قاسم: بھابی جان۔ آپ بھی جاکر تیاری کرلیجیے۔

ساجدہ: میرا کیا ہے ایک دو کپڑے رکھ کر چل دوں گی (آنکھوں میں آنسو بھر کر) جانے کہاں چوٹ آئی ہے۔

قاسم: کوئی سیریس بات نہیں معلوم ہوتی تار کی زبان سے تو یہی پتا چلتا ہے۔ (کچھ دیر خاموش رہ کر) اگر کوئی خاص بات ہو تو تار دیجیے گا۔ ہم لوگ آجائیں گے۔

(معصومہ کمرے میں آتی ہے اور سنجیدہ ماحول کو دیکھ کر ہر ایک کا چہرہ غور سے دیکھتی ہے پھر ساجدہ کی طرف دیکھ کر)

معصومہ: ساجدہ باجی کیا بات ہے۔

ساجدہ: (آنسو پونچھ کر) کوئی بات نہیں معصومہ۔

(معصومہ سوالیہ نظروں سے قاسم کو دیکھتی ہے)

قاسم: امجد کے چوٹ آگئی ہے ابھی ابھی تار آیا ہے۔

معصومہ: کیسے آگئی۔

قاسم: پولیس کے لاٹھی چارج سے۔ کسی ایجی ٹیشن میں حصہ لے رہے تھے۔

سجاد: کم بختوں کو پڑھنا لکھنا تو ہے نہیں سال بھر ایجی ٹیشن کرتے رہتے ہیں۔

معصومہ: اس میں طالب علموں کا کیا قصور ہے وہ بیمار ہے۔

سجاد: (بات کاٹ کر ٹھنڈی سانس بھر کر) ہاں ان بے چاروں کا کیا قصور قصور تو ماں باپ کا ہے کہ انھوں نے ان سرکشوں کو پیدا کیا ہے۔

معصومہ: (مسکرا کر) نہیں اولاد پیدا کرنا تو کوئی جرم نہیں ہے مگر ان کے مستقبل کے لیے کون سی راہیں ہیں۔

سجاد: تو یہ میرا کام ہے (چند سیکنڈ رک کر) ماں باپ تو یہی کر سکتے ہیں کہ ان کی تعلیم کا اچھا انتظام کر دیں۔

معصومہ: ہاں انفرادی طور پر تو ماں باپ یہی کر سکتے ہیں مگر اچھی تعلیم کے بعد ان کو کیا ملتا ہے۔ آج کتنے ڈاکٹر اور انجینئر بے روزگاری کا شکار ہیں۔

سجاد: جب کسی ملک میں تعلیم عام ہوتی ہے تو ایسے حالات پیدا ہونا ناگزیر ہیں۔

معصومہ: جی نہیں یہ ایک ان پلانڈ اکونامی کا قصور ہے یہ سیاسی افراتفری جس نے ملک میں ایک ایسا طبقہ پیدا کر دیا ہے جو فیسٹ راستے پر چل کر اپنا مطلب حاصل کرنا چاہتا ہے۔

سجاد: تو گویا ——

معصومہ: (بات کاٹ کر) یہ رجحان نوجوانوں میں تیزی سے پھیل رہا ہے اور اگر جلد ہی ان کو ایک اچھا اقتصادی نظام اور مضبوط سیاسی ڈھانچہ نہیں دیا گیا تو یہ ملک کے لیے خطرناک ہوگا۔

سجاد: جی نہیں۔ یہ ہر امجد کے باپ کو سوچنا ہوگا کہ لوٹ کھسوٹ رشوت خوری سماجی افراتفری کو کس طرح ختم کیا جائے۔ ایک امجد کا باپ دوسرے امجد کے باپ پر یہ ذمہ داری نہیں ڈال سکتا۔

قاسم: (گھڑی دیکھ کر) بھابی اب جلدی تیار ہو لیجیے سوا گیارہ بج رہے ہیں۔

(ساجدہ کمرے سے چلی جاتی ہے۔ سجاد کچھ دیر خاموش رہ کر)

سجاد: قاسم میرا خیال ہے کہ صاحبزادے بہادر کو واپس بلا لیا جائے اور پھر ان کے لیے کوئی دوسرا راستہ ڈھونڈا جائے پڑھنا لکھنا ان کے بس کا نہیں۔

قاسم: ابھی تو بھابی جان کو جانے دیجیے ان کی واپسی پر کچھ سوچیں گے۔ (دروازے کی طرف بڑھ کر) میں جا کر ان کی تیاری میں ہاتھ بٹا لوں۔

سجاد: تم ٹھہرو۔ میں جاتا ہوں۔ انھیں بس میں بھی سوار کرادوں گا۔

(سجاد دروازے کی طرف جاتے ہوئے)

قاسم: ان سے کہیے گا کہ پہنچتے ہی فوراً تار دیں۔ اگر کوئی خاص بات ہو تو مجھے بلا لیں۔

(سجاد سر ہلاتا ہوا کمرے سے چلا جاتا ہے کچھ دیر خاموشی رہتی ہے پھر معصومہ قاسم کی طرف دیکھ کر)

معصومہ: تار کب آیا تھا۔

قاسم: ابھی ابھی آیا ہے (کچھ دیر رک کر) بے چاری بھابی جان کے لیے یہ عظیم حادثہ ہے وہ امجد سے بہت محبت کرتی ہیں بے چاری رو پڑیں۔

معصومہ: یہ امجد کریں بھی کیا ان کے سامنے ایک تاریک مستقبل کے سوا اور ہے بھی کیا۔

قاسم: روشنی حاصل کرنے کا یہ راستہ تو نہیں ہے۔

معصومہ: جب انسان اپنے سامنے لوٹ کھسوٹ بے انصافی اور بے ایمانی دیکھتا ہے تو مشتعل ہو ہی جاتا ہے جس سماج میں انسان کو اپنی مرضی اور خواہشات کے برخلاف کام کرنا پڑے وہاں ایسے حالات پیدا ہونا یقینی ہیں۔

قاسم: مگر معصومہ۔

معصومہ: (بات کاٹ کر) آپ اپنی ہی مثال لیجیے آپ سرکاری نوکری کو پسند کرتے ہیں مگر وہ آپ کو نہیں ملتی۔ آپ کا دل کیا کہتا ہوگا۔ کیا آپ دل ہی دل میں کسی بغاوت کے لیے تیار نہیں ہوتے ہوں گے۔

قاسم: (مسکرا کر) میں نے تو اب سرکاری نوکری کا خیال ہی ترک کر دیا ہے۔

معصومہ: (قاسم کا چہرہ دیکھ کر) تو پھر ڈاکٹر نفیس کا آفر قبول کر لیا۔

قاسم: (مجرمانہ لہجے میں) ہاں (ٹھنڈی سانس بھر کر) مجبوری میں۔ میں اپنی بے روزگاری سے عاجز آ گیا تھا۔

معصومہ: میں نے تو پہلے ہی کہا تھا آپ نے اتنا وقت بلا وجہ ضائع کیا۔

قاسم: میں نے صرف وقت گزاری اور تجربہ حاصل کرنے کے لیے ان کا آفر قبول کیا ہے۔

معصومہ: (ہنس کر) تو پھر تجربہ حاصل ہونے سے رہا پورے اعتماد سے کام کیجیے۔

قاسم: مگر معصومہ بیگم۔ میں ڈاکٹر نفیس کے مقصد کو اچھی طرح سمجھتا ہوں۔

معصومہ: (مسکرا کر) اگر ایسا ہے تو آپ دھوکا نہیں کھائیں گے۔

قاسم: مگر معصومہ تم۔

معصومہ: چھوڑیے ان باتوں کو مجھے اپنے اوپر اعتماد ہے۔

قاسم: صنوبر کی چھچھوری باتیں مجھے ایک آنکھ نہیں بھاتیں وہاں اس کا ساتھ ہوگا۔

معصومہ: ہونے دیجیے اپنے میں خود اعتمادی پیدا کیجیے۔

قاسم: خود اعتمادی! ہزاروں لالچیں جب انسان کے سامنے ہوں تو انسان کہاں تک اپنی خود اعتمادی پر بھروسہ کر سکتا ہے۔

(معصومہ قاسم کو دیکھتی ہے اور اس کے چہرے پر ایک خفیف سا خوف ظاہر ہوتا ہے مگر فوراً ہی بات ٹالنے کے انداز میں۔

معصومہ: آپ بھی ساجدہ باجی کے ساتھ چلے جاتے تو اچھا تھا وہاں جانے کیا حالت ہو۔

قاسم: جاتا تو میں ہی مگر۔۔۔ (کچھ دیر خاموش رہ کر) مولوی صاحب نے مجھ سے کہا ہے کہ مجھے جمعہ کے دن سے کام شروع کرنا چاہیے اور پرسوں جمعہ ہے انھوں نے یہ دن بڑے خلوص سے بتلایا تھا۔

(ساجدہ کمرے میں آ کر)

ساجدہ: قاسم میاں اگر ضرورت ہوئی تو تمھیں تار دے کر بلا لوں گی۔

قاسم: ضرور۔۔۔ جاتے ہی تار دیجیے گا۔ میں بس اسٹینڈ تک چلوں۔

ساجدہ: تمھارے بھائی جان جارہے ہیں اب کیا ضرورت ہے۔ خدا حافظ (جانے کے لیے... وہ مڑتی ہے معصومہ اسے دیکھ کر)

معصومہ: ساجدہ باجی میں بھی چل رہی ہوں۔

(معصومہ جانے کے لیے مڑتی ہے کہ منظور کمرے میں آ کر)

منظور: قاسم میاں آپ کو کوئی مسٹر کلارک بلا رہے ہیں۔

قاسم: انھیں یہیں بھیج دو۔

(منظور ساجدہ اور معصومہ کمرے سے چلے جاتے ہیں قاسم کمرے میں ٹہلتا ہے کچھ دیر بعد کلارک کمرے میں آ کر)

کلارک: ہلو ڈاکٹر۔

قاسم: ہلو مسٹر کلارک (ایک صوفے کی طرف اشارہ کرکے) تشریف رکھیے۔ (کلارک ایک صوفے پر بیٹھ جاتا ہے)، فرمایئے—

کلارک: میں اسی سلسلے میں حاضر ہوا تھا۔

قاسم: مسٹر کلارک میں ایسے غیر قانونی کام کرنا نہیں چاہتا۔

کلارک: ایک دن حکومت کو اسے قانونی قرار دینا پڑے گا۔

قاسم: مگر ابھی تو غیر قانونی ہی ہے۔

کلارک: مگر اس کا علم کسی کو بھی نہ ہوگا۔

قاسم: (مسکرا کر) فی الحال میں ایک ایمان دار اچھا ڈاکٹر بننا چاہتا ہوں۔

کلارک: ڈاکٹر! اگر آپ نے ہماری مدد نہیں کی تو ہم دونوں کو جان دینا پڑے گی۔ یہ ہماری عزت کا سوال ہے۔

قاسم: اور پھر یہ پہلے اشوکا کا معاملہ ہے ابارشن میں ذرا بھی کوئی کامپلی کیشن ہوگیا تو زندگی خطرے میں پڑ جائے گی۔

کلارک: ہم نے یہ سب کچھ پہلے ہی سوچ لیا ہے۔ بے عزتی کی زندگی سے موت بہتر ہے۔

قاسم: (سوچتے ہوئے) مجھے ایک دو دن کامپلی کیشن پر غور کر لینے دیجیے پھر میں کوئی

فیصلہ کرسکوں گا۔

کلارک: (کھڑے ہوکر) لیکن اب زیادہ عرصہ تک کیس کو ٹالا بھی نہیں جاسکتا (جیب سے کچھ نوٹ نکال کر میز پر رکھتے ہوئے) فی الحال دو سو پیشگی ہیں۔ امید ہے کہ آپ خصوصی توجہ دیں گے۔

(قاسم خاموش رہتا ہے۔ کلارک کمرے سے چلا جاتا ہے)

(پردہ)

چوتھا سین

منظر

(وہی کمرہ۔ دو چار دن بعد قاسم اور ساجدہ بیٹھے باتیں کررہے ہیں)

قاسم: بھائی جان اس کے علاوہ کوئی چارہ نہیں ہے کہ ابھی اس کو وہیں رکھا جائے۔

ساجدہ: مگر قاسم میاں سوچو تو وہ کس راستے پر چل رہا ہے۔

قاسم: (ہنس کر) خاندان میں ایک لیڈر بھی ہونا چاہیے۔ آج کل تو لیڈری بھی ایک پیشہ ہے۔

ساجدہ: اس وقت تو ایک معمولی چوٹ ہی میں بات آگئی گئی ہوگی مگر کسی وقت یہ خطرناک بھی ہوسکتی ہے۔

قاسم: پھر آپ ہی بتلایئے کیا کیا جائے۔

ساجدہ: یہی تو میرا دماغ کام نہیں کررہا ہے۔

قاسم: ممکن ہے اس چوٹ سے اس پر اثر پڑا ہو اور وہ راہ راست پر آجائے۔

ساجدہ: مجھے تو ایسے کوئی آثار نظر نہیں آتے، میں نے لاکھ سمجھانے کی کوشش کی مگر اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔

قاسم: (مسکرا کر) جب لیڈری کا نشہ چڑھ جاتا ہے تو مشکل ہی سے اترتا ہے (کچھ دیر خاموش رہ کر) صحیح پتا چلا کہ پولیس سے جھگڑا کس بات پر شروع ہوا تھا۔

28

ساجدہ: (لڑکوں کا خیال تھا کہ اسٹ گیمٹیڈ فنڈ میں کچھ گڑبڑ ہے اس کا حساب پرنسپل سے مانگنے گروپ کی شکل میں جارہے تھے اور واکیٹ تھے جب پولیس نے روکنا چاہا تو یدھ شروع ہوگیا۔

قاسم: (ہنس کر) اور اس کی لیڈری کررہے تھے امجد بہادر۔

ساجدہ: اور کیا (کچھ دیر خاموش رہ کر) عجیب پریشانی ہے ادھر مجھے ٹرانسفر آرڈر مل گیا۔ ادھر صاحبزادے کی فکر سمجھ میں نہیں آتا کیا کروں۔

قاسم: پریشانی کی کوئی بات نہیں ہے آپ فکر نہ کیجیے ماحول ہی ایسا ہے اور یہ تو طلبہ کا روز کا مشغلہ ہوگیا ہے (ہنس کر) ہاکی فٹ بال میچ نہیں کھیلا۔ پولیس سے دو دو ہاتھ کر لیے۔ اگر کوئی پریشانی ہو تو لمبی چھٹی لے لیجیے۔

ساجدہ: میں نے تو پہلے ہی چھٹی کی درخواست دے رکھی ہے اس پر حکم ہوا ہے کہ پہلے اپنی نئی ڈیوٹی جوائن کرو بعد میں غور کیا جائے گا گورنمنٹ کسی کی پریشانی کو کب سمجھتی ہے۔

قاسم: ایک کربٹ سماج میں کسی کی سچائی پر کون یقین کرتا ہے۔ میں نے تو بھائی جان کو مشورہ دیا تھا کہ اب آپ کو نوکری نہیں کرنا چاہیے۔

ساجدہ: آدمی پریشانی میں ایسا ہی سوچتا ہے مگر زندگی بھی تو گزارنا پڑتی ہے۔

قاسم: اور اب تو میں نے کام شروع کردیا ہے یہ ڈفسٹ پورا ہوجائے گا۔

ساجدہ: وہ تو سب ٹھیک ہے مگر پندرہ سال کی نوکری کیسے چھوڑ دوں، اس کمبخت سرکاری نوکری میں یہی تو مصیبت ہے کہ انسان غلاموں کی طرح مجبور ہوجاتا ہے (سجاد کمرے میں آتے ہیں ان کے چہرے پر پریشانی کے آثار ہیں ساجدہ انھیں دیکھ کر) کیا بات ہے آپ کچھ—

سجاد: نہیں کوئی بات نہیں ہے۔ (قاسم کو دیکھ کر) تمھیں مسٹر کلارک بلا رہے ہیں۔ باہر بیٹھک میں ہیں۔ کیا منظور نہیں ہے۔

قاسم: جی ہاں۔ میں نے بازار بھیجا ہے (کھڑا ہوکر) میں مسٹر کلارک سے مل لوں۔

(قاسم کمرے سے چلا جاتا ہے۔ کچھ دیر خاموشی رہتی ہے۔ سجاد کچھ پریشان سا کمرے میں ٹہلتا ہے۔ ساجدہ سجاد کو دیکھ کر)

ساجدہ: کیا بات ہے آپ کی پریشانی سے مجھے ہول ہونے لگتا ہے۔

سجاد: (کچھ دیر خاموش رہ کر سوچتے ہوئے) مجھ پر محکمے نے چارج لگایا ہے کہ میں ڈاکوؤں سے ملا ہوا ہوں۔

ساجدہ: —جی— کیا سچ مچ۔

سجاد: آج کل سبارڈینیٹ اسٹاف اس قدر چالاک اور خودسر ہے کہ سمجھ ہی میں نہیں آتا کہ اس سے کس طرح نپٹا جائے۔ کم بختوں نے خوب جی بھر کر کھایا ہے کچھ تو ڈاکوؤں کے خوف سے اور کچھ پیسے کی لالچ میں۔

ساجدہ: مگر وہ دو ہزار۔

سجاد: تم دو ہزار کی بات کرتی ہو جانے کتنے دو ہزار کھا گئے اور ایسا جنگل کٹوا دیا جو نہیں کٹنا چاہیے تھا۔

ساجدہ: لیکن اس کی ساری ذمہ داری آپ پر تو نہیں ہے آخر اس میں دوسرے لوگوں کا ہاتھ ہے۔

سجاد: آخری ذمہ داری تو میری ہے۔ قصور وار کون ہے یہ تو بعد میں ثابت ہوگا۔ خود ڈاکوؤں کے دو گروہوں کی آپس کی رقابت بھی ہے (کچھ دیر خاموش رہ کر) تم چارج کب دے رہی ہو۔

ساجدہ: ارادہ تو آج ہی کا تھا مگر اب—

سجاد: تم تو چارج دے دو۔ تمھاری چھٹی کا کیا ہوا۔

ساجدہ: اس پر نئی ڈیوٹی جوائن کرنے کے بعد غور ہوگا۔

سجاد: تم منظور کو ساتھ لے جانا۔

ساجدہ: ارادہ تو یہی ہے مگر وہ اجمیر اجمیر کی رٹ لگا رہا ہے۔

سجاد: ابھی تو اجمیر کے عرس میں ایک مہینہ ہے۔

ساجدہ: (طنزیہ) اور اس سے پہلے وہ دولھا بننے کے خواب دیکھ رہا ہے روز جگن چچی کی خدمت کی جا رہی ہے۔

سجاد: مگر تمھارے لیے وہ بالکل نئی جگہ ہے کسی نہ کسی کا ساتھ ہونا ضروری ہے۔

ساجدہ: کچھ دن کے لیے تو منظور کو لے ہی جانا پڑے گا لیکن وہ ہفتے عشرہ سے زیادہ نہیں ٹھہرے گا۔

سجاد: ان دنوں میں کوشش کی جائے گی کہ تمھاری چھٹی منظور ہو جائے۔

ساجدہ: (طنزیہ مسکرا کر) ان دنوں میں تو کاغذ ایک میز سے دوسری میز پر پہنچے گا۔ چھٹی منظور ہونے کی بات تو الگ رہی (کچھ دیر خاموش رہ کر) ڈاکٹر نفیس سے ملاقات ہوئی۔

سجاد: ہاں کل ہی ہوئی تھی۔

ساجدہ: قاسم میاں کے تعلق ان کا خیال ہے۔

سجاد: ان کی ذہانت کی تو تعریف کر رہے تھے مگر کام میں بے پروائی کی شکایت تھی۔

ساجدہ: ابھی نیا نیا کام شروع کیا ہے جب پیسہ ہاتھ میں آئے گا تو خود بخود ذمہ دار ہو جائیں گے (کچھ دیر خاموش رہ کر) کل تو صنوبر کے ساتھ پکچر دیکھنے بھی گئے تھے۔

سجاد: (ایک دم جیسے یاد آ جانے پر) ارے ہاں معصومہ کئی روز سے نہیں آئی۔

ساجدہ: ہاں تین چار دن ہو گئے۔ میں کل مولوی صاحب سے ملنے گئی تھی مگر وہ گھر پر نہیں تھی کالج گئی ہوئی تھی۔

سجاد: معصومہ کا ری ایکشن کیا ہے۔

ساجدہ: کس سلسلے میں۔

سجاد: یہی قاسم کے وہاں کام کرنے کے سلسلے میں۔

ساجدہ: اس نے اپنا کوئی ری ایکشن ظاہر ہی نہیں ہونے دیا۔ اس کے رویے میں ذرا

بھی فرق نہیں ہے قاسم میاں ضرور کچھ ڈسٹرب ہیں۔

سجاد: قاسم معصومہ کو چاہتا ضرور ہے مگر اس کا اظہار نہیں کرتا۔

ساجدہ: یہی بات معصومہ کے ساتھ ہے (ہنس کر) دونوں عجیب غیر متعلق سی محبت کرتے ہیں۔

سجاد: (مسکرا کر) یہ غیر متعلق سی محبت خالص تمھاری ایجاد ہے۔ دونوں سمجھ دار ہیں پڑھے لکھے ہیں۔ لیلیٰ مجنوں بننے سے تو رہے۔

ساجدہ: میں نے ایک دو مرتبہ قاسم میاں سے اس سلسلے میں بات کی مگر وہ ٹال گئے۔

سجاد: بھئی اس دور میں تو انسان کو اپنے مستقبل کے بارے میں سوچنا چاہیے۔ خالی خولی محبت سے کچھ نہیں ہوتا (قاسم کمرے میں آتا ہے سجاد اسے دیکھ کر) کہو مسٹر کلارک سے مل لیے۔

قاسم: جی ہاں۔

سجاد: آج کل یہ گھر کے بہت چکر لگا رہے ہیں۔ کیا بات ہے۔

قاسم: یونہی کوئی خاص بات نہیں ہے۔

سجاد: سنا ہے ان کی چچیری بہن پوا کچھ بیمار ہے۔

قاسم: جی ہاں اسی سلسلے میں مشورہ کرنے آجاتے ہیں۔

سجاد: علاج کس کا ہے۔

قاسم: میرا ہی سمجھ لیجیے (ساجدہ کی طرف دیکھ کر) آپ چارج کب دے رہی ہیں۔

ساجدہ: — ارادہ تو آج ہی کا ہے۔

قاسم: منظور کو ساتھ لے جائیے گا۔

ساجدہ: لے جانے کا تو ارادہ ہے مگر تم لوگوں کو تکلیف نہ ہو۔

قاسم: تکلیف کی کیا بات ہے۔ (سجاد کی طرف دیکھ کر) کچھ دن کے لیے دفتر کے کسی چپراسی کی ڈیوٹی گھر پر لگا لیجیے گا۔

سجاد: لگا لوں گا۔ دس پندرہ دن کی ایسی کوئی بات نہیں ہے پھر تو منظور آ ہی جائے گا۔

قاسم: کیا منظور مستقل طور پر بھابی جان کے ساتھ نہیں رہے گا۔

ساجدہ: (ہنس کر) ارے بھئی اسے دولھا بننا ہے اور پھر اجمیر شریف جانا ہے ان دونوں کاموں کے لیے وہ بہت بے چین ہے۔

قاسم: (مسکرا کر) یہ دولھا بننے کا شوق اسے جانے کیوں چرایا ہے۔ (ہنس کر) بڑھاپے میں اس کی عقل ماری گئی ہے۔

سجاد: اچھا بھئی میں تو چلتا ہوں کچھ ضروری کام ہیں (ساجدہ کی طرف دیکھ کر) تم آج چارج دے دو بلا وجہ ڈلے کرنے سے کوئی فائدہ نہیں۔

ساجدہ: ہاں میں بھی یہی سوچتی ہوں (سجاد کمرے سے چلا جاتا ہے کچھ دیر خاموشی رہتی ہے۔ ساجدہ قاسم کو دیکھ کر مسکراتے ہوئے) کل تو تم صنوبر کے ساتھ پکچر دیکھنے گئے تھے۔

قاسم: جی ہاں مجھے تو کوئی شوق نہیں ڈاکٹر صاحب نے زور دیا اور صنوبر بھی بچوں کی طرح ضد کرنے لگی اس لیے چلا گیا۔

ساجدہ: اس میں کہاں کی برائی ہوئی (مسکرا کر) مگر تم معصومہ کے ساتھ کبھی پکچر نہیں گئے۔

قاسم: وہ ایسی چھچھوری باتوں سے خود پرہیز کرتی ہے۔

ساجدہ: (کچھ دیر خاموش رہ کر مسکراتے ہوئے) اچھا قاسم میاں ایک بات بتلاؤ۔ (قاسم سوالیہ نظروں سے ساجدہ کو دیکھتا ہے ساجدہ کچھ دیر خاموش رہ کر) اگر تمھیں ان دونوں میں سے کسی ایک کا انتخاب کرنا پڑے تو کس کا انتخاب کرو گے۔

(قاسم ایک دم سنجیدہ ہو جاتا ہے اور خاموش رہتا ہے ساجدہ سوالیہ نظروں سے اسے دیکھتی رہتی ہے۔ قاسم کچھ دیر بعد)

قاسم: ابھی میں نے اس مسئلے پر سوچا ہی نہیں ہے۔

ساجدہ: کسی نہ کسی دن تو اس پر سوچنا پڑے گا۔

قاسم: جب وقت آئے گا تو سوچ لوں گا (ہنس کر بات ٹالنے کے انداز میں)

فی الحال تو کسی انتخاب کے چکر میں پڑنے کا ارادہ نہیں ہے۔

ساجدہ: (مسکرا کر) ویسے تم معصومہ کو پسند کرتے ہو۔

قاسم: بے روزگار کو پسند کرنے کی فرصت ہی کہاں ہوتی ہے (سوچتے ہوئے) معصومہ تو آپ کی ملازمت ہی کے سخت خلاف ہے۔

ساجدہ: (ہنس کر) تو کہاں کا فرق پڑ گیا۔

قاسم: میں سمجھتا ہوں اس سے فیملی لائف پر اثر پڑے گا۔ بعض اوقات معمولی معمولی اختلاف بڑے دور رس اثرات پیدا کر دیتے ہیں۔

ساجدہ: معصومہ اس قدر سمجھ دار لڑکی ہے کہ وہ خود ان اختلافات کو ابھرنے نہیں دے گی۔

قاسم: (ہنس کر) شادی کے بعد عورتوں کی نفسیات بدل جاتی ہیں۔

ساجدہ: (ہنس کر) اگر مرد تھوڑا بھی کمانے لگے تو اس کی نفسیات بھی کچھ کم نہیں بدلتیں۔ (مسکرا کر) شاید تمھاری نفسیات بھی بدل گئی ہیں کہ آج تم معصومہ پر اعتراض کر رہے ہو۔

قاسم: (کچھ دیر خاموش رہ کر) بھابی جان آپ معصومہ کو پسند کرتی ہیں اور بھائی جان صنوبر کو (ہنس کر) پہلے آپ دونوں فیصلہ کر لیجیے ورنہ کاسٹنگ ووٹ میں دے دوں گا۔

ساجدہ: (کچھ دیر خاموش رہ کر) آج تم ڈسپنسری نہیں گئے ڈاکٹر نفیس کو تمھاری اس بے پروائی پر اعتراض ہے۔

قاسم: ڈاکٹر صاحب تو چاہتے ہیں کہ انسان کولہو کا بیل بنا رہے۔ میرے پرسکرپشن دیکھتے ہیں اور ان میں کانٹ چھانٹ کر دیتے ہیں مجھے بڑا دکھ ہوتا ہے۔

ساجدہ: اس میں دکھ کی کوئی بات نہیں ہے ان کا تجربہ تم سے بہت زیادہ ہے۔

قاسم: اس سے مریضوں پر میرا کوئی اچھا اثر نہیں پڑتا اور پھر آدھا وقت تو صنوبر خاتون برباد کر دیتی ہیں۔ ان کے بھی عجیب عجیب واہیات شوق ہیں (مسکرا

کر) معمے حل کرتا۔۔۔ بھلا مجھے اس سے کیا دلچسپی ہوسکتی ہے اور جب میں ٹالنے کے لیے ان کی ہاں میں ہاں ملاتا ہوں تو ناراض ہوجاتی ہے۔

ساجدہ: (ہنس کر) اور تم ان کے معموں سے ڈر کر ہی ڈسپنسری نہیں گئے۔

قاسم: جی نہیں۔ مجھے ایک ضروری کام تھا۔ میں ڈاکٹر صاحب سے کہہ آیا تھا۔

ساجدہ: (کچھ دیر خاموش رہ کر) تم نے ایک خبر سنی۔

قاسم: کون سی خبر۔

ساجدہ: تمھارے بھائی جان پر چارج لگایا گیا ہے کہ وہ ڈاکوؤں سے ملے ہوئے ہیں۔

قاسم: جی۔ کیا سچ مچ۔

ساجدہ: تمھارے بھائی جان ہی کہہ رہے تھے۔

قاسم: (ٹھنڈی سانس بھر کر) یہ تو اس علاقے میں معمولی بات ہے جب دو افسروں میں کھٹ پھٹ ہوجاتی ہے تو ایک دوسرے پر یہی الزام لگاتا ہے۔

ساجدہ: تمھارے بھائی جان بے حد پریشان ہیں کہہ رہے تھے کہ کہیں میں سسپنڈ نہ کردیا جاؤں۔

قاسم: یہ تو بہت بری خبر ہے (سوچتے ہوئے) مگر یہ ثابت کرنا بہت مشکل ہوگا۔۔۔

ساجدہ: لیکن اپنی صفائی دینا بھی اسی قدر مشکل ہے۔ ڈاکو ٹھیکیداروں نے ایسا جنگل کاٹ لیا ہے جو نہیں کٹنا چاہیے تھا۔ معاملہ کچھ سیریس ہوگیا ہے۔

قاسم: مگر اس میں دوسرے لوگوں کا ہاتھ ہوگا۔ اب سارے جنگل کی حفاظت خود بھائی جان تو کرتے نہیں پھرتے۔

ساجدہ: لیکن آخری ذمہ داری تو انھیں کی ہے اور وہ اس سے بہت پریشان ہیں۔ (قاسم خاموش رہتا ہے ساجدہ کچھ دیر بعد) منظور کو تم نے کہاں بھیجا ہے۔

قاسم: بازار بھیجا تھا کم بخت ابھی تک نہیں لوٹا۔

ساجدہ: جگن چچی کی خوشامد کررہا ہوگا۔ عجیب پاگل پن سوار ہوا ہے۔ اس بڈھے پر (کھڑی ہوکر) ذرا باورچی خانہ کی خبر لوں۔ منظور اب تو خاصا غیر ذمہ دار ہوتا

جاتا ہے (دروازے کی طرف بڑھتی ہے کہ معصومہ کمرے میں آتی ہے ساجدہ معصومہ کو دیکھ کر) ارے آؤ معصومہ کہاں رہیں اتنے دنوں۔

معصومہ: میں تو ایک مرتبہ آئی تھی آپ گھر پر نہیں تھیں۔

ساجدہ: میں کل ہی تمھارے گھر گئی تھی۔ مولوی صاحب نے بتلایا تم کالج گئی ہوئی ہو۔

معصومہ: جی ہاں۔ ابا جان کہہ رہے تھے کہ آپ آئی تھیں۔ اب کہاں جارہی ہیں۔

ساجدہ: تم بیٹھو میں ابھی آتی ہوں منظور گھر پر نہیں ہے ذرا باورچی خانہ دیکھوں جا کر۔

معصومہ: (مسکرا کر) وہ تو ابا جان کے پاس بیٹھا ہے اور اجمیر کے متعلق معلومات حاصل کر رہا ہے۔

ساجدہ: بالکل پاگل ہوگیا ہے (دروازے کی طرف جاتے ہوئے) تم بیٹھو میں ابھی آتی ہوں۔

(ساجدہ کمرے سے چلی جاتی ہے۔ معصومہ صوفے پر بیٹھ جاتی ہے قاسم کمرے میں ٹہلنے لگتا ہے معصومہ مسکرا کر)

معصومہ: کہیے کیا سوچا جارہا ہے۔

قاسم: کوئی خاص بات نہیں۔

معصومہ: مگر آپ کافی سنجیدہ نظر آرہے ہیں۔ (قاسم خاموش رہتا ہے معصومہ ہنس کر) اور یہ کل آپ اکیلے ہی اکیلے پکچر دیکھ آئے۔

قاسم: اکیلا تو نہیں تھا۔ صنوبر ساتھ تھی۔ تم کو کوئی اعتراض ہے۔

معصومہ: مجھے کیوں اعتراض ہونے لگا (مسکرا کر) یہ تو اپنی اپنی پسند ہے۔

(قاسم کچھ دیر خاموش رہتا ہے پھر معصومہ کا چہرہ غور سے دیکھ کر)

قاسم: معصومہ! تم ہی نے مجھے مجبور کیا کہ میں وہاں کام کروں اور تم ہی مجھ پر طنز کے نشتر چلانے لگیں۔

معصومہ: (سنجیدہ ہوکر) بخدا میرا ایسا کوئی مقصد نہیں تھا اگر آپ کو میری بات سے کوئی تکلیف پہنچی ہو تو مجھے اس کا افسوس ہے میں نے تو یونہی ایک بات کہہ دی تھی۔

قاسم: میں جانتا تھا کہ ایک روز مجھے یہ تیر برداشت کرنا پڑیں گے۔ مگر میری بھی کچھ مجبوریاں تھیں ورنہ معصومہ بیگم آپ کو اس قسم کے طنز کا موقع نہیں ملتا۔

معصومہ: اب میں آپ کو کیسے یقین دلاؤں ایک معمولی بات کو آپ نے طنز سمجھ لیا۔

قاسم: دل کی بات زبان پر آ ہی جاتی ہے آخر آپ نے مجھے مجبور ہی کیوں کیا تھا کہ میں ڈاکٹر نفیس کی ڈسپنسری میں کام کروں۔

معصومہ: اس لیے کہ میرے اختلاف سے کوئی فائدہ ہونے والا نہیں تھا۔ ساجدہ باجی اور بھائی جان طے کر چکے تھے کہ آپ کو وہاں کام کرنا ہے۔

قاسم: پھر تو آپ نے ان الجھنوں کے بارے میں بھی سوچا ہوگا۔

معصومہ: میں نے سب کچھ سوچ لیا تھا۔

قاسم: اس لیے اب یہ سب کچھ آپ کو برداشت کرنا چاہیے۔

معصومہ: (ہنس کر) کیا آپ سمجھتے ہیں کہ میں ہمت ہار دوں گی۔

قاسم: مگر معصومہ بیگم—

معصومہ: (بات کاٹ کر مسکراتے ہوئے) ناکامی میں کیا لذت ہوتی ہے اس کا بھی تو مزہ چکھنا چاہیے۔

قاسم: یہ صرف دل بہلانے کی باتیں ہیں۔ ناکامی کا تصور ہی بھیانک ہوتا ہے۔

معصومہ: تصور ہی سے انسان خوف زدہ ہوجاتا ہے جب سر پر پڑتی ہے تو اسے برداشت کرنا ہی پڑتا ہے (ساجدہ چائے لے کر آتی ہے معصومہ اسے دیکھ کر) ارے ساجدہ باجی اس وقت چائے۔

ساجدہ: (ہنس کر) چائے ہی ایک ایسی چیز ہے جس کے لیے کوئی وقت مقرر نہیں ہے (چائے کے برتن میز پر رکھتے ہوئے) کہو علی گڑھ جانے کا طے ہوا۔

معصومہ: اگر کام پورا کرنا ہے تو بے غیرت بن کر جانا ہی پڑے گا۔ بھائی جان کو خط لکھا ہے مگر ابھی تک کوئی جواب نہیں آیا۔ انھی کے جواب کا انتظار ہے۔

قاسم: (طنزیہ) پھر تو تمھیں تمام زندگی انتظار کرنا ہوگا۔ بس پہنچ جاؤ ایسے آدمی کا بھی

علاج ہے (معصومہ قاسم کا چہرہ دیکھتی ہے قاسم کچھ دیر رک کر) بہتر یہ ہے کہ مولوی صاحب کو ساتھ لے جاؤ۔ آب و ہوا تبدیل ہوجائے گی۔

معصومہ: وہ تو ہرگز تیار نہیں ہیں۔ اگر تیار ہوجاتے تو بڑا مسئلہ حل ہوجاتا (ٹھنڈی سانس بھر کر) ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کام ادھورا ہی رہ جائے گا۔

ساجدہ: بھئی مولوی صاحب کو ایسی ضد نہیں کرنا چاہیے۔ میں نے ان سے بات کی تھی مگر وہ ٹال گئے۔

معصومہ: (کچھ دیر خاموش رہ کر) جانے کیوں انھیں بھائی جان پر اعتماد نہیں رہا ہے جب بھی بھائی جان کی بات ہوتی ہے تو ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے انھیں دکھ ہورہا ہو (ساجدہ چائے کی پیالی معصومہ کو دیتی ہے معصومہ پیالی لیتے ہوئے) ایک دو مرتبہ ابا جان نے ان کو شادی کے بارے میں لکھا مگر انھوں نے کوئی جواب نہیں دیا تو ابا جان نے انھیں خط لکھنا ہی چھوڑ دیا۔ میرے بھی دو چار خطوں کا ایک آدھ جواب آیا ہے اور وہ بھی رواداری میں۔

ساجدہ: یہ امید تو ان سے نہیں تھی کہ وہ اس قدر نالایقی کا ثبوت دیں گے (ٹھنڈی سانس بھر کر) عجیب زمانہ آگیا ہے۔ بیٹا باپ کا نہیں رہا۔ (منظور کمرے میں آتا ہے ساجدہ اسے دیکھ کر) بھئی منظور میاں کمال ہے کہاں رہ گئے تھے۔

منظور: فوراً مولوی صاحب کی خدمت میں تھا۔

ساجدہ: یہ تو سوچا ہوتا کہ مجھے دفتر جانا ہے گھر کا سارا کام پڑا ہوا ہے۔

منظور: مولوی صاحب کی باتوں میں بڑا سکون ملتا ہے وقت کا دھیان ہی نہیں رہتا۔

قاسم: میرا سامان لے آئے۔

منظور: جی ہاں۔ آپ کے کمرے میں رکھ دیا ہے۔

ساجدہ: اچھا اب جا کر ذرا چولھا دیکھ لو۔

منظور: بہت اچھا (قاسم کی طرف دیکھ کر) آپ کو ڈاکٹر صاحب نے یاد فرمایا ہے۔

قاسم: تو آپ ڈاکٹر صاحب کے یہاں بھی چکر مار آئے۔

منظور: جی نہیں۔ راستے میں ان کا نوکر مل گیا تھا۔ وہ یہیں آ رہا تھا۔

قاسم: اس وقت ایسا کون سا ضروری کام آ گیا۔

منظور: یہ تو مجھے نہیں معلوم مگر انھوں نے ضروری میں بلایا ہے۔

ساجدہ: (ہنس کر) صنوبر خاتون کو معمے کے کسی اشارے پر تمھاری رائے لینا ہوگی (مسکرا کر) جلدی چلے جاؤ (منظور کمرے سے چلا جاتا ہے قاسم خاموش رہتا ہے ساجدہ کچھ دیر خاموش رہ کر) ارے بھئی چلے جاؤ کیا معلوم ڈاکٹر صاحب کو کوئی ضروری کام ہو۔

قاسم: حساب کتاب کی جانچ پڑتال کرنا ہے اور یہ کام میرے بس کا نہیں میں نے کل ہی معذرت کر لی تھی۔

ساجدہ: جا کر تو دیکھو اور کوئی کام ہو۔ کوئی اہم کیس ہو۔ پانچ منٹ کا تو راستہ ہے۔

قاسم: (دروازے کی طرف جاتے ہوئے) بس مجھے یہ نوکری جیسی پابندی سے بڑی الجھن ہوتی ہے۔

(کمرے سے چلا جاتا ہے۔ ساجدہ کچھ دیر خاموش رہ کر)

ساجدہ: قاسم میاں کا وہاں کام میں دل نہیں لگ رہا ہے۔

معصومہ: جلد ہی لگ جائے گا۔ (مسکرا کر) دو چار معمے تو حل کر لیں۔

ساجدہ: (غور سے معصومہ کو دیکھ کر) یہی تو اس کی سب سے بڑی الجھن ہے۔

معصومہ: بلا وجہ گھبرا رہے ہیں (کچھ دیر خاموش رہ کر) صنوبر تو بہت خوش ہے۔ مجھ سے کہہ رہی تھی (چائے کی پیالی میز پر رکھ کر) ڈاکٹر صاحب خوش اور مطمئن ہیں پرسوں ابا جان کی مزاج پرسی کو آئے تھے تو اپنی خوشی کا اظہار کر رہے تھے۔

ساجدہ: (کچھ دیر رک کر معصومہ کا چہرہ دیکھ کر) معصومہ بیگم زندگی سے کھیلا نہیں جاتا جو لوگ ایسا کرتے ہیں وہ گھاٹے میں رہتے ہیں۔

معصومہ: (مسکرا کر جس میں خفیف سا طنز بھی ہے) مگر مسٹر قاسم گھاٹے میں نہیں رہیں گے آخر ڈاکٹر صاحب کے پاس کسی چیز کی کمی ہے۔

ساجدہ: زندگی کے اس قدر اہم مسائل پر یوں نہیں سوچا جاتا۔

معصومہ: اور اگر سنجیدگی سے کوئی فائدہ نہ ہو پھر۔

ساجدہ: ایسا سوچنا فرار کا راستہ اختیار کرنا ہے جو ایک جرم ہے ایک گناہ ہے (کچھ دیر خاموش رہ کر) معصومہ میں تو جانے کیا کیا خواب دیکھتی رہی ہوں۔

معصومہ: (مسکرا کر) ساجدہ باجی یہی تو انسان کی سب سے بڑی کمزوری ہے نہ وہ اس حقیقت کی دنیا میں خواب دیکھے اور نہ اسے ناامیدی ہو ــــ اور ــــ (خاموش ہوجاتی ہے۔ ساجدہ سوالیہ نظروں سے اسے دیکھتی ہے کچھ دیر بعد معصومہ مسکرا کر) کچھ باتیں انسان کو قسمت پر چھوڑ دینا چاہیے۔

ساجدہ: قسمت کی بات کرنے والے عام طور پر احساس کمتری کا شکار ہوتے ہیں۔

معصومہ: دوسرے کی مجبوری کو ہم اس کا احساس کمتری کہتے ہیں (ایک دم بات پلٹ کر) تو آج آپ چارج دے رہی ہیں۔

ساجدہ: (غور سے معصومہ کا چہرہ دیکھ کر) ہاں۔ مگر۔

معصومہ: (بات کاٹ کر) آپ کے جانے کے بعد کس قدر سونا سونا لگے گا کچھ وقت آپ کے پاس ہی گزر جاتا تھا۔

ساجدہ: میں تو چاہتی ہوں تمھاری زندگی ہی میرے ساتھ گزرے۔

معصومہ: ساجدہ باجی ــــ (چہرے پر خفیف سے غم کے آثار پیدا ہوتے ہیں جن کو چھپانے کی کوشش کرتے ہوئے) جانے آپ سے اب کب ملاقات ہوگی۔

ساجدہ: (مسکرا کر) میں آج تو نہیں جارہی ہوں اور میں نے لمبی چھٹی کے لیے درخواست بھی دے دی ہے۔

معصومہ: بہرحال کچھ دن تو چھٹی منظور ہونے میں لگ ہی جائیں گے۔

ساجدہ: ہاں کچھ دن تو ضرور لگ جائیں گے۔

معصومہ: (کھڑی ہوکر) اب مجھے اجازت دیجیے انشاء اللہ کل ملاقات ہوگی (جانے کے لیے مڑتی ہے کہ سجاد کمرے میں آتے ہیں)۔

سجاد: کہو معصومہ کہاں چل دیں۔

معصومہ: گھر جا رہی ہوں بہت دیر سے بیٹھی تھی۔

(معصومہ کمرے سے چلی جاتی ہے۔ سجاد ساجدہ کے پاس آ کر)

سجاد: یہ معصومہ بڑی تیزی سے چلی گئی۔

ساجدہ: (سوچتے ہوئے) شاید قاسم میاں کا صنوبر کے ساتھ پکچر جانا اسے برا لگا ہے۔

سجاد: کیا وہ ایسا کہہ رہی تھی۔

ساجدہ: کہہ تو نہیں رہی تھی مگر انسان کی باتوں سے کچھ نہ کچھ اندازہ ہو ہی جاتا ہے۔

سجاد: قاسم نے تو کوئی خاص بات نہیں کہی۔

ساجدہ: نہیں مگر وہ بھی ڈسٹرب معلوم ہوتے ہیں۔

سجاد: یہ اس کی حماقت ہے۔ آج کل انسان اوپر کی طرف دیکھتا ہے صنوبر میں کوئی برائی نہیں ہے تم اسے سمجھاؤ۔ (ساجدہ غور سے سجاد کو دیکھتی ہے مگر خاموش رہتی ہے) منظور کہاں ہے۔

ساجدہ: باورچی خانے میں۔

سجاد: بھئی اس سے کہو کھانا جلدی تیار کرے۔ مجھے دفتر جلدی جانا ہے۔

ساجدہ: اچھا۔

(کھڑی ہوتی ہے)

(پردہ)

پانچواں سین

منظر

(وہی کمرہ۔ تقریباً ایک مہینے بعد۔ سجاد ایک کرسی پر بیٹھا ہے ساجدہ پلنگ پر بچھی چادر برابر کر رہی ہے۔ سجاد ساجدہ کی طرف دیکھ کر)

سجاد: کل تو قاسم معصومہ سے بڑی اکھڑی اکھڑی باتیں کر رہا تھا۔

ساجدہ: (اپنے کام میں مشغول رہتے ہوئے) ہاں مجھے خود حیرت تھی۔

سجاد: (سوچتے ہوئے) شاید اسے احساس ہوگیا ہے کہ صنوبر سے شادی کرنے میں ہی فائدہ ہے۔

ساجدہ: یہ جھنجھلاہٹ شاید محبت اور مستقبل کے ٹکراؤ سے پیدا ہوئی ہے۔ ایک طرف معصومہ کی محبت ہے اور دوسری طرف صنوبر کے ساتھ ایک روشن مستقبل۔

سجاد: اب معصومہ تو علی گڑھ جارہی ہے اس کی عدم موجودگی میں وہ اسے بھول جائے گا۔ (کچھ دیر خاموش رہ کر) کل تو ڈاکٹر نفیس نے صاف طور پر کہہ دیا کہ اگر قاسم کی شادی صنوبر سے ہوجائے تو وہ ڈسپنسری قاسم کے حوالے کرکے گوشہ نشین ہوجائیں۔ ذرا تم قاسم سے بات تو کرو۔

ساجدہ: شاید یہی بات ڈاکٹر صاحب نے اس سے بھی کہی ہوگی جب ہی وہ جھلایا ہوا ہے۔

سجاد: احمق ہے۔ اس قدر بڑی جائداد کو یوں ہاتھ سے گنوا دینا کون سی عقل مندی ہے اسے اونچ نیچ سمجھاؤ۔

ساجدہ: میں ان سے بات کرچکی ہوں مگر وہ ٹال گئے، بلا وجہ ان پر زور دینا ٹھیک نہیں ہے۔

سجاد: تم خود معصومہ کو پسند کرتی ہو۔ اس لیے تمھیں اس مسئلے میں کوئی دلچسپی نہیں ہے دیکھ رہی ہو میں بس پنڈ پڑا ہوں گھر کی حالت کیا ہورہی ہے۔

ساجدہ: مولوی صاحب نے ایک وظیفہ بتلایا ہے میں نے اسے شروع کردیا ہے خدا کی ذات سے امید ہے کہ آپ——

سجاد: وہ تو ٹھیک ہے مگر وظیفوں سے روٹی نہیں ملتی—— تم——

(معصومہ کمرے میں آتی ہے۔ ساجدہ اسے دیکھ کر)

ساجدہ: ارے آؤ معصومہ۔ کہو تیاری ہوگئی۔

معصومہ: (مسکرا کر) اب تو تانگا گھر پر کھڑا ہے میں تو سلام کرنے حاضر ہوئی ہوں۔

سجاد: ارے تو کیا آج ہی جارہی ہو۔

معصومہ: جی ہاں ابھی جا رہی ہوں۔

سجاد: اگر مولوی صاحب بھی تمھارے ساتھ چلے جاتے تو اچھا تھا۔

معصومہ: وہ بھائی جان سے بہت ناراض ہیں۔ میرے ہی جانے کے خلاف تھے۔

سجاد: پھر اجازت کیسے دے دی۔

معصومہ: ساجدہ باجی نے سمجھا بجھا کر اجازت دلوائی ہے۔ اگر ساجدہ باجی اس قدر زور نہ دیتیں تو وہ مجھے ہرگز اجازت نہ دیتے۔

ساجدہ: خط ضرور لکھتی رہنا۔ کتنے دن رہو گی علی گڑھ۔

معصومہ: تین چار مہینے تو لگ ہی جائیں گے۔ کوشش کروں گی کہ کام جلد ختم ہو جائے ورنہ ابا جان کو تنہائی میں بڑی تکلیف ہوگی۔

ساجدہ: ایک آدھ مرتبہ بیچ میں چکر لگا جانا۔

معصومہ: دیکھیے یہ تو حالات پر منحصر ہے اچھا اب اجازت دیجیے۔

سجاد: خدا حافظ۔

ساجدہ: (اس کے پاس آکر) جاتے ہی خط لکھنا (معصومہ کی آنکھوں میں آنسو آجاتے ہیں۔ ارے اس میں رونے کی کیا بات ہے (خود بھی منہ پھیر کر اپنے آنسو پونچھتی ہے) خدا حافظ۔

معصومہ: ابا جان کا خیال رکھیے گا وہ بالکل اکیلے ہیں۔

ساجدہ: تم اطمینان رکھو انھیں کوئی تکلیف نہ ہوگی۔

(معصومہ آنسو پونچھتی ہوئی کمرے سے چلی جاتی ہے اس کے ساتھ ساتھ ساجدہ بھی جاتی ہے۔ سجاد کمرے میں ٹہلنے لگتے ہیں۔ کچھ دیر بعد ساجدہ پھر کمرے میں آتی ہے اور اداس اداس سی ایک صوفے پر بیٹھ جاتی ہے)

سجاد: کہو رخصت کر آئیں۔

ساجدہ: جی ہاں۔ باہر جا کر تو وہ ہچکیوں سے رو پڑتی تھی بار بار مولوی صاحب کا ذکر کرتی رہی۔

سجاد: اور یہ قاسم کہاں چلا گیا ہے۔

ساجدہ: صبح ہی سے غائب ہیں شاید رات بھر سوئے بھی نہیں۔

سجاد: رات بھر نہیں سویا۔

ساجدہ: ہاں رات بھر ان کے کمرے سے چلنے پھرنے کی آوازیں آتی رہیں اور پھر صبح ہی سے بلا ناشتہ کیے غائب ہوگئے۔

سجاد: شاید مولوی صاحب کے یہاں گیا ہوگا (بلند آواز سے) منظور میاں ارے بھئی منظور میاں (کچھ دیر بعد منظور کمرے میں آتا ہے) تم صبح مولوی صاحب کے یہاں گئے تھے (منظور اثبات میں سر ہلاتا ہے) وہاں قاسم میاں تھے—

منظور: نہیں مولوی صاحب شکایت کر رہے تھے کہ وہ کئی دن سے وہاں نہیں گئے۔ معصومہ بی بی بار بار ان کا پوچھ رہی تھیں۔

(سجاد سوچنے لگتا ہے چہرے سے پریشانی کے آثار ظاہر ہوتے ہیں)

سجاد: تم جا کر ڈسپنسری میں تو دیکھ آؤ۔ وہاں تو نہیں ہے۔

منظور: بہت اچھا۔

(منظور کمرے سے چلا جاتا ہے کمرے پر ایک اداس خاموشی طاری ہوجاتی ہے۔ سجاد سوچتے ہوئے)

سجاد: آخر وہ جا کہاں سکتا ہے؟

ساجدہ: ممکن ہے ڈسپنسری چلے گئے ہوں۔

سجاد: بلا ناشتہ کیے۔ ایسا تو اس نے پہلے کبھی نہیں کیا۔

ساجدہ: ہاں بات تو غیر معمولی ہے شاید معصومہ کی جدائی کا اسے شدید احساس ہے۔

سجاد: لیکن اسے سوچنا چاہیے کہ یہ معصومہ کے مستقبل کا سوال ہے۔ یوں مجنوں بن جانے سے کیا فائدہ ہوگا۔

ساجدہ: (کچھ دیر خاموش رہ کر ٹھنڈی سانس بھر کر) جب انسان پر مصیبت آتی ہے تو اس کا حملہ چاروں طرف سے ہوتا ہے میں نے بلا وجہ چھٹی لے لی۔

29

سجاد: پھر آخر اس میں حرج کیا ہوا۔

ساجدہ: میری رخصت بلا تنخواہ اور آپ کا سسپنشن۔ آخر گزارہ کیسے ہوگا۔

سجاد: بہر حال زندگی تو گزارنا ہوگی۔

ساجدہ: صاحبزادے کے برابر خطوط آرہے ہیں کہ انھیں زیادہ روپے کی ضرورت ہے امتحان کی فیس ادا کرنا ہے میرا تو دماغ کام نہیں کررہا ہے (کچھ دیر خاموش رہ کر) سوچتی ہوں اپنی رخصت منسوخ کرادوں اور ڈیوٹی جوائن کرلوں۔ (سجاد خاموش رہتا ہے) آپ کے کیس کا کیا ہورہا ہے۔

سجاد: میں نے چارج شیٹ کا تو جواب دے دیا ہے کارروائی ہورہی ہے مگر جلد کوئی نتیجہ نکلتا نظر نہیں آتا۔

ساجدہ: کیوں۔

سجاد: میں نے کہا نہیں اس میں ڈاکوؤں کے دو گروہ دلچسپی لے رہے ہیں ایک میرے حق میں ہے اور دوسرا میرے خلاف۔

ساجدہ: لیکن ڈاکوؤں کا سرکاری معاملات سے کیا واسطہ۔

سجاد: اس علاقے میں ڈاکوؤں کے اثرات سیاست پر ہیں تم سرکاری معاملات کی بات کرتی ہو ان مگرمچھوں سے کون بیر لے سکتا ہے۔

(منظور کمرے میں آتا ہے۔ ساجدہ اور سجاد اسے سوالیہ نظروں سے دیکھتے ہیں)۔

منظور: قاسم میاں وہاں نہیں ہیں۔

سجاد: تم نے ڈاکٹر صاحب سے پوچھا تھا۔

منظور: جی ہاں وہ بہت ناراض تھے مجھ سے سیدھے منہ بات بھی نہیں کی۔

سجاد: ناراض! آخر کیوں۔

منظور: مجھے کیا معلوم۔ مجھ سے تو صرف اس قدر کہا کہ یہاں نہیں ہیں مگر ان کے کہنے کا انداز بہت غیر مناسب تھا (سجاد خاموش رہتا ہے) اب میں ان کے گھر کبھی نہیں جاؤں گا۔ اگر مالدار ہوں گے تو اپنے گھر خوش رہیں۔

سجاد: (مسکرا کر) اچھا اچھا تم جا کر اپنا کام دیکھو۔

منظور: یہ بھی کوئی بات کرنے کا طریقہ ہے اگر قاسم میاں سے ناراض تھے تو رہا کریں میں نے ان کا کیا بگاڑا تھا جو مجھ پر اس طرح بگڑ پڑے (کمرے سے چلا جاتا ہے۔ ساجدہ مسکرا کر)

ساجدہ: ان منظور میاں کا ٹائپ بھی الگ ہی ہے اول تو بولتے ہی نہیں اور جب بولتے ہیں تو کفن پھاڑ کر۔

سجاد: لیکن ڈاکٹر صاحب کس بات پر ناراض ہو گئے ہیں۔

ساجدہ: قاسم میاں کی غیر ذمہ داری کے وہ شاکی ہیں ابھی تک ڈسپنسری نہیں پہنچے ہیں۔ اسی پر چڑے ہوئے بیٹھے ہوں گے کہ منظور میاں پہنچ گئے اور انھوں نے غصہ ان پر اتار دیا۔

(دونوں خاموش ہو جاتے ہیں کہ قاسم تھکے تھکے قدموں سے کمرے میں آتا ہے۔ چہرے سے غمگین نظر آ رہا ہے سجاد اسے دیکھ کر)

سجاد: قاسم میاں۔ صبح صبح سے کہاں غائب ہو گئے تھے۔

قاسم: ذرا اسٹیشن چلا گیا تھا۔

سجاد: معصومہ کو سی آف کرنے۔

قاسم: جی ہاں۔

سجاد: مگر گاڑی تو ساڑھے نو بجے کے قریب جاتی ہے۔

قاسم: جی ہاں مگر میں صبح ہی سے اسٹیشن چلا گیا تھا۔ یونہی چہل قدمی کرتے ہوئے۔

سجاد: مولوی صاحب تو اسٹیشن گئے ہوں گے۔

قاسم: جی نہیں۔ مولوی صاحب نہیں گئے سی آف کرنے والوں میں بس میں ہی تھا۔

سجاد: گاڑی میں جگہ تو اچھی مل گئی تھی۔

قاسم: جی ہاں۔ وہاں کچھ لوگ میرے ملنے والے ہیں ان کے ذریعہ اچھی جگہ مل گئی تھی۔

سجاد: اچھا اب تم چائے پی لو (دروازے کی طرف جاتے ہوئے) میں نہا لوں۔
(سجاد کمرے سے چلے جاتے ہیں کچھ دیر خاموشی رہتی ہے قاسم گردن جھکائے بیٹھا رہتا ہے کچھ دیر بعد نظریں اٹھا کر ساجدہ کو دیکھ کر)

قاسم: بھابی جان معصومہ چلی گئی۔ جاتے وقت بہت اداس تھی۔

ساجدہ: (غور سے قاسم کو دیکھتی ہے پھر آہستہ سے) اسے مولوی صاحب کی تنہائی کا بہت خیال ہے اسی وجہ سے اداس ہوگی۔

قاسم: پھر وہ مجھ سے نظریں ملاتے ہوئے کیوں شرما رہی تھی اسٹیشن پر اس نے مجھ سے بہت کم باتیں کیں۔

ساجدہ: کچھ لوگوں پر سفر سوار ہو جاتا ہے اور وہ بلا وجہ یونہی کچھ خاموش خاموش اور اداس اداس ہو جاتے ہیں۔

قاسم: لیکن بھابی جان۔
(قاسم خاموش ہو جاتا ہے اور کھوئی کھوئی نظروں سے سامنے دیوار کو تاکنے لگتا ہے ساجدہ کچھ دیر اسے خاموشی سے دیکھتی رہتی ہے پھر قاسم کے پاس آکر)

ساجدہ: تم چائے پی لو (بلند آواز سے) منظور میاں۔ منظور میاں (پھر قاسم کی طرف دیکھ کر) وہ دو تین مہینے بعد آجائیں گی۔ ان دنوں تم ڈسپنسری میں جی لگا کر کام کرو۔

قاسم: جب سے اس کے جانے کا سنا تھا میرا جی کام میں بالکل نہیں لگا۔
(منظور کمرے میں آتا ہے ساجدہ اسے دیکھ کر)

ساجدہ: قاسم میاں کے لیے چائے لاؤ (منظور چلا جاتا ہے ساجدہ قاسم کی طرف دیکھ کر) کچھ دیر صنوبر سے ہنس بول لیا کرو جی بہل جائے گا۔

قاسم: مجھے صنوبر کی باتیں اچھی نہیں لگتیں چڑ سی ہونے لگتی ہے۔

ساجدہ: لاڈ پیار سے پلی ہوئی لڑکی ہے اس لیے کچھ ضدی ہے، ایسی لڑکیاں شادی کے بعد سدھر جاتی ہیں۔

قاسم: مگر اس کی باتوں میں کچھ تک نہیں ہوتی۔ عجیب اوٹ پٹانگ باتیں کرتی ہے اور پھر چاہتی ہے انھیں مان لیا جائے۔

(سجاد کمرے میں آتے ہیں۔ ساجدہ انھیں دیکھ کر)

ساجدہ: ارے آپ نہائے نہیں۔

سجاد: منظور میاں سے گرم پانی کرنے کو کہا تھا مگر وہ بھول گئے اب گرم کرنا شروع کیا ہے (منظور چائے لے کر آتا ہے اور میز پر رکھ دیتا ہے) بھئی منظور میاں پانی ذرا جلد گرم کر دو مجھے ایک ضروری کام سے جانا ہے (منظور خاموشی سے کمرے سے چلا جاتا ہے) واہ رے قلندر آواز کی فضول خرچی نہ کرنا بچا کر رکھنا اللہ میاں کے یہاں کام آئے گی۔

ساجدہ: (چائے بنا کر قاسم کو دیتے ہوئے) قاسم میاں معصومہ کے جانے سے بہت اداس ہو گئے ہیں۔

سجاد: (قاسم کو دیکھ کر) قاسم! ہمیں بعض وقت حالات سے سمجھوتا کر لینا پڑتا ہے۔ معصومہ ہی تو اس دنیا میں اکیلی لڑکی نہیں ہے۔ (قاسم اس طرح نظر اٹھا کر سجاد کو دیکھتا ہے جیسے اسے سجاد کی بات سے بہت دکھ ہوا ہو۔ کچھ دیر خاموش رہتا ہے پھر آہستہ سے)

قاسم: جی ہاں دنیا میں لڑکیوں کی کیا کمی ہے۔

سجاد: جانے تمھیں صنوبر کیوں پسند نہیں۔ پڑھی لکھی ہے، خوبصورت ہے اور پھر اس کے ساتھ ایک روشن مستقبل ہے، اس دور میں انسان یہی باتیں دیکھتا ہے۔

قاسم: مگر بھائی جان۔

سجاد: (بات کاٹ کر) میں دیکھ رہا ہوں کہ تم کام میں دل نہیں لگا رہے ہو۔ ڈاکٹر صاحب کو تم سے شکایت ہے۔ بھئی اس دور میں بلا کام کیے کیسے گزارہ ہو سکتا ہے۔

قاسم: مجھے کام کرنے سے کب انکار ہے۔

سجاد: مگر کام کرنے کا یہ طریقہ تو نہیں ہے جو تم نے اختیار کیا ہے۔ کبھی گئے کبھی نہیں گئے۔

قاسم: میں دل لگا کر کام کرنا چاہتا ہوں مگر —

سجاد: (بات کاٹ کر) اب تم خود ہی دیکھ رہے ہو کہ میں کس پنڈ ہوں تمھاری بھاوج رخصت بلا تنخواہ پر ہیں آخر اس گھر کا کام کیسے چلے گا۔ تم کو یہ بھی تو سوچنا چاہیے۔

قاسم: مجھے اس کا پورا احساس ہے کہ اب میں آپ پر بار بنتا جا رہا ہوں اور —

سجاد: نہیں قاسم ایسا نہ سوچو۔ یہ سوچو کہ تمھاری بھلائی کس بات میں ہے اگر تم صنوبر کو قبول کر لو تو کتنی بڑی جائداد کے مالک بن سکتے ہو۔

منظور: (کمرے میں آکر) گرم پانی غسل خانے میں رکھ دیا ہے۔

سجاد: اچھا۔

(سجاد کمرے سے چلے جاتے ہیں۔ منظور بھی ان کے پیچھے پیچھے کمرے سے چلا جاتا ہے ساجدہ کچھ دیر بعد)

ساجدہ: قاسم میاں! تم ان کی باتوں کا برا نہ ماننا وہ آج کل بہت پریشان ہیں۔

قاسم: (کھڑے ہو کر غمگیں لہجے میں) میں جانتا تھا کہ ایک روز مجھے یہ باتیں سننا پڑیں گی۔ (ٹھنڈی سانس بھر کر) آخر بھائی بھائی ہی ہوتا ہے باپ کی محبت کیسے دے سکتا ہے اگر میرا باپ زندہ ہوتا تو وہ مجھ سے ایسی باتیں نہ کرتا۔

ساجدہ: ایسا نہ سوچو قاسم میاں وہ تم سے بہت محبت کرتے ہیں، تمھاری بھلائی کے لیے کہتے ہیں۔

قاسم: (ٹھنڈی سانس بھر کر) اگر بھائی جان مجھے ورثی ہنڈی سمجھ کر بھنانا چاہتے ہیں تو مجھے صنوبر سے شادی کرنے میں کوئی اعتراض نہیں۔

(دروازے کی طرف جاتا ہے۔ ساجدہ اسے جاتا ہوا دیکھ کر)

ساجدہ: ارے کہاں جا رہے ہو چائے تو پی لو۔

قاسم: بھابی جان۔ آج میرا کسی کام میں جی نہیں لگ رہا ہے۔

ساجدہ: چائے پی لو۔ پھر کہیں چلے جانا (قاسم صوفے پر بیٹھ جاتا ہے ساجدہ چائے کی پیالی دیتے ہوئے) اگر صنوبر تم کو پسند نہیں تو کوئی تم کو مجبور نہیں کر رہا۔

قاسم: بھابی جان۔ آپ اس قدر محبت کا اظہار کر کے میرا حوصلہ پست کر دیتی ہیں۔ (چائے کا گھونٹ لے کر) اگر آپ کو بھی صنوبر پسند ہے تو پھر ٹھیک ہے میں مطمئن ہوں۔

ساجدہ: میں نے یہ کب کہا۔ صنوبر کے ساتھ ایک روشن مستقبل ہے مگر ــــ

قاسم: (بات کاٹ کر) اب کوئی شرط نہ لگایئے میں آپ کو خوش دیکھنا چاہتا ہوں۔ (خاموش ہوکر چائے پینے لگتا ہے، ساجدہ بھی خاموش ہوجاتی ہے تھوڑی دیر بعد سجاد کمرے میں آتا ہے ساجدہ اسے دیکھ کر)

ساجدہ: آپ اتنی جلدی نہا لیے۔

سجاد: نہیں ابھی نہیں۔ ڈاکٹر صاحب آئے ہیں (مڑ کر دروازے کی طرف دیکھ کر) آیئے ڈاکٹر صاحب۔ (ڈاکٹر نفیس کمرے میں آتے ہیں چہرے پر غیر معمولی سنجیدگی ہے ساجدہ اور قاسم کھڑے ہوکر ان کو سلام کرتے ہیں جس کا وہ بالکل رسمی انداز میں جواب دیتے ہیں۔ ساجدہ صوفے کی طرف اشارہ کر کے۔

ساجدہ: تشریف رکھیے (ڈاکٹر نفیس بیٹھ جاتے ہیں۔ ساجدہ بلند آواز سے) منظور میاں ایک پیالی اور لانا۔

نفیس: نہیں نہیں شکریہ میں اس وقت چائے پینے نہیں آیا ہوں۔ (سجاد اور ساجدہ حیرت سے انھیں دیکھتے ہیں۔ ڈاکٹر نفیس قاسم کو دیکھ کر) ڈاکٹر آج تم ڈسپنسری نہیں آئے۔

قاسم: مس معصومہ کو سی آف کرنے کے لیے اسٹیشن گیا تھا۔

نفیس: (کچھ دیر خاموش رہ کر) مجھے افسوس ہے ڈاکٹر کہ میں نے تمھارا غلط انتخاب کیا۔

قاسم: (حیرت سے) جی— کیا مطلب ہے آپ کا۔

نفیس: غلط آدمی کا جو مطلب ہوتا ہے وہی میرا مطلب ہے۔ مجھے تم سے یہ امید ہرگز نہیں تھی۔

قاسم: میں آپ کا مطلب اب بھی نہیں سمجھا۔

نفیس: تم نے میری ڈسپنسری کی ریپوٹیشن خاک میں ملا دی اور وہ بھی چند پیسوں کے لیے۔

قاسم: (کسی قدر بگڑ کر) آپ کہنا کیا چاہتے ہیں۔

نفیس: میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ تم نے میری ڈسپنسری میں غیر اخلاقی اور غیر قانونی کام کیا ہے۔

قاسم: یعنی آپ کا مطلب ہے میں نے کوئی بددیانتی کی ہے۔ کوئی غبن کیا ہے کوئی چوری کی ہے۔

نفیس: نہیں تم نے یہ کچھ نہیں کیا ہے مگر تم نے ایوا کا ابارشن کرایا ہے، صرف پانچ سو روپے کی لالچ میں تم نے قتل کیا ہے۔

قاسم: لیکن ڈاکٹر صاحب۔

نفیس: میں اس میں دلیلیں سننا نہیں چاہتا۔ اگر تم کو اس سے انکار ہو تو کہو۔

قاسم: لیکن آپ کی ڈسپنسری میں کام کرنے سے پہلے ہی وہ کیس میرے ہاتھ میں تھا۔

نفیس: ڈاکٹر کا کام جان بچانا ہے جان لینا نہیں اور پھر تم یہ کیس مجھ سے چھپاتے رہے آج ریوا کی زندگی خطرے میں پڑی ہوئی ہے۔ (کھڑے ہوکر) مجھے تم سے یہ امید ہرگز نہیں تھی۔

(دروازے کی طرف جاتے ہیں)

سجاد: لیکن ڈاکٹر صاحب۔

نفیس: (مڑ کر قاسم کو دیکھ کر) اب تم کو میری ڈسپنسری میں آنے کی ضرورت نہیں ہے۔

(تیز تیز قدموں سے کمرے سے چلے جاتے ہیں ان کے پیچھے پیچھے سجاد بھی جاتا ہے کمرے میں کچھ دیر خاموشی رہتی ہے پھر ساجدہ قاسم کی طرف دیکھ کر)

ساجدہ: قاسم میاں کیا یہ سچ ہے۔

قاسم: (بہت اطمینان سے صوفے پر بیٹھ کر) بھابی جان معصومہ کب تک واپس آنے کا کہہ گئی ہے۔

(پردہ)

(مطبوعہ ماہنامہ پگڈنڈی امرتسر مارچ اپریل 69ء)

کاغذ کی دھجی

افرادِ تمثیل

(1) عاصم (ایک بزرگ) (2) خدیجہ بیگم (عاصم کی بیوی) (3) عظمت خالا (گھر کی ملازمہ) (4) عالیہ (عاصم کی بہو جس نے اب دوسری شادی کر لی ہے) (5) مسلم (عالیہ کا شوہر) (6) شارق (عاصم کا بھتیجا)

پہلا سین

منظر

ایک کھاتے پیتے درمیانی طبقہ کا ڈرائنگ روم۔ دائیں جانب ایک دروازہ ہے جو بیرونی مکان جانے کا کام دیتا ہے اور جس پر نیلا پردہ پڑا ہوا ہے۔ اس دروازہ کے بائیں جانب ایک کھڑکی ہے اس پر بھی ویسا ہی پردہ پڑا ہے جو اس وقت اٹھا ہوا ہے۔ کمرے میں سے کھڑکی میں لگی لوہے کی سلاخیں اور پھر اس کے سامنے ایک برآمدہ کا حصہ نظر آتا ہے۔ کھڑکی کے پاس ایک تخت بچھا ہے جس پر سفید فرش ہے۔ اس تخت پر بیٹھ کر باہر سڑک کا منظر دیکھا جاسکتا ہے۔ کمرے کی عقبی دیوار دائیں جانب ایک اور دروازہ ہے جس پر پردہ تو

ہے مگر وہ اٹھا ہوا ہے اس دروازے میں سے ایک کوریڈور نظر آتا ہے جس کے دائیں بائیں کمرے ہیں۔ اگر کوئی شخص کوریڈور میں ہوتا ہے تو وہ اسٹیج پر سے نظر آتا ہے اس طرح یہ کوریڈور اسٹیج ہی کا ایک حصہ ہے اس عقبی دیوار سے لگا ہوا ایک صوفہ سیٹ رکھا ہے جو پرانے طرز کا ہے سامنے ایک ٹیبل رکھی ہے۔ دروازے سے لگی ہوئی ایک میز اور بلا ہتھے کی کرسی رکھی ہے اگر کوئی اس کرسی پر بیٹھتا ہے تو اس کی پشت اسٹیج کی طرف ہو جاتی ہے۔ میز پر فریم کی ہوئی ایک تصویر رکھی ہے جو دور سے صاف سمجھ میں نہیں آتی۔ شام کا وقت اور سردی کا موسم ہے۔ کمرے میں خدیجہ بیگم عاصم اور عظمت خالا موجود ہیں۔ ماحول سے اندازہ ہوتا ہے کہ کسی مسئلہ پر بحث ہو رہی ہے۔ عاصم کے چہرے پر غصے کے آثار ہیں۔ خدیجہ بیگم بھی غصہ میں معلوم ہوتی ہیں۔ عاصم کمرے میں ٹہل رہے ہیں۔

خدیجہ بیگم: عظمت خالا ان سے کچھ کہنا سننا فضول ہے ان کی وہی مرغے کی ایک ٹانگ رہتی ہے۔

عاصم: (غصہ سے) ہاں رہتی ہے (تیز تیز قدموں سے کوریڈور کی طرف جاتے ہیں دروازے کے پاس رک کر مڑ کر) جب صاحبزادے ایک مرتبہ ناراض ہو کر چلے گئے تھے تو اب تشریف لانے کی کیا ضرورت تھی۔

خدیجہ بیگم: تمھاری بیماری کا سنا تو چلا آیا۔ کوئی گناہ کیا؟

عاصم: (غصہ سے) (اب ایسی بیماری بھی نہیں تھی کہ میری میت کو ان کے کاندھے کی ضرورت ہو۔

عظمت خالا: عاصم میاں۔ خدا کے لیے نیک زبان منہ سے نکالو میت کو کاندھا دیا جائے تمھارے دشمنوں کی۔

عاصم: اور میں ان کا دشمن ہی ہوں جو ان کے حق مار رہا ہے۔

(تیزی سے کوریڈور میں جاتے ہیں اور بائیں جانب کے ایک کمرے میں چلے جاتے ہیں زور سے دروازہ بند ہونے کی آواز آتی ہے کچھ دیر خاموش رہتی ہے پھر خدیجہ بیگم عظمت خالا کی طرف دیکھ کر۔

خدیجہ بیگم: اول تو بڑھاپا دوسرے بیماری دونوں نے مل کر بالکل دماغ الٹ دیا ہے۔ (عظمت خالا خاموش رہتی ہیں خدیجہ بیگم کچھ دیر خاموش رہ کر افسردہ لہجے میں) اب تم ہی کہو عظمت خالا۔ گھر آئے مہمان سے کیسے کوئی کہہ دے کہ وہ چلا جائے۔

عظمت خالا: ان کے دل میں یہ بات بیٹھ گئی ہے کہ شارق میاں اس جائداد پر نظر لگائے بیٹھے ہیں۔ بس اسی سے اور چڑچڑے ہوگئے ہیں۔

خدیجہ بیگم: جائداد ان کی ہے جسے چاہیں دے دیں کوئی ہاتھ تو نہیں پکڑ رہا ہے پھر ایسی باتوں سے کیا فائدہ جس سے دوسرے کے دل کو صدمہ پہنچے۔

عظمت خالا: مسلم میاں کے مزاج کو دلہن بیگم خوب سمجھتی ہیں، ان باتوں سے وہ بھی پریشان ہیں غیروں کے سامنے اس چھیچھا لےدے سے کیا فائدہ۔

خدیجہ بیگم: (حیرت سے) عالیہ اور غیر— کیسی باتیں کرتی ہو عظمت خالا وہ بہو بن کر اس گھر میں ضرور آئی تھی مگر بیٹی بن کر گئی ہے وہ کیسے غیر ہوسکتی ہے— (آنکھوں میں آنسو بھر کر) اگر ہماری قسمت بری نہ ہوتی تو وہ کیوں اس گھر سے نکلتی— (عظمت خالا کچھ کہنے ہی والی ہوتی ہیں کہ عالیہ اور مسلم بیرونی دروازہ سے کمرے میں آتے ہیں۔ مسلم پرکشش شخصیت کا مالک ہے۔ عمر چالیس سال سے زیادہ ہے مگر صحت قابل رشک ہے، چال ڈھال میں رکھ رکھاؤ اور وقار ہے آنکھوں سے غور وفکر کا عادی معلوم ہوتا ہے۔ (خدیجہ بیگم انھیں دیکھ کر) آؤ مسلم میاں۔ کہو گھوم پھر آئے۔

مسلم: جی ہاں۔ بہت خوب جگہ ہے (مسکرا کر) جی چاہتا ہے یہیں رہ پڑوں۔

خدیجہ بیگم: اس سے بڑھ کر اور کیا بات ہوگی (ٹھنڈی سانس بھر کر) اس گھر کی ویرانی کھانے کو دوڑتی ہے (مسلم خاموش رہتا ہے خدیجہ بیگم عظمت خالا کی طرف دیکھ کر) عظمت خالا چائے تو بنا لاؤ۔

مسلم: اس وقت چائے کی—

خدیجہ بیگم: (بات کاٹ کر) دیکھو مسلم میاں (مسکرا کر) تم ہمارے معاملات میں دخل نہ دو (مسلم مسکرا کر خاموش ہو جاتا ہے عظمت خالا کوریڈور کی طرف جاتی ہیں) اور ہاں شمع دان بھی روشن کر کے دے جانا۔

(عظمت خالا کمرے سے چلی جاتی ہیں مسلم چھت میں لگے برقی قمقمے کی طرف دیکھ کر)

مسلم: کیوں کیا آج... سڑک پر تو بلب روشن تھے۔

خدیجہ بیگم: (مسکرا کر) بجلی میں کوئی خرابی نہیں ہے (مسلم حیرت اور سوالیہ نظروں سے خدیجہ بیگم کو دیکھتا ہے خدیجہ بیگم عالیہ کی طرف اشارہ کر کے) عالیہ کہہ رہی تھی کہ تمھیں موم بتی کی روشنی پسند ہے۔

(مسلم قہقہہ مار کر ہنستا ہے پھر خاموش ہو کر مسکراتے ہوئے۔

مسلم: تو گویا یہ بھی مہمان نوازی کا ایک حصہ ہے۔

خدیجہ بیگم: مہمان نوازی! واہ بھئی تم بھی کمال کرتے ہو (ہنستی ہیں) اولاد بھی کہیں مہمان ہوتی ہے جو مہمان نوازی کی جائے۔

عالیہ: (خدیجہ کی طرف دیکھ کر) ابا حضور کہاں ہیں)۔

خدیجہ بیگم: اپنے کمرے میں ہیں (مسکرا کر) بیماری نے تو بالکل دماغ الٹ کر رکھ دیا ہے اب شارق میاں کیا آگئے ہیں کہ بس آپے سے باہر ہیں۔

عالیہ: (ہنس کر) چلیے میں منائے لاتی ہوں۔

(عالیہ کوریڈور کی طرف جاتی ہے)

خدیجہ بیگم: ارے تو کہاں چلی (عالیہ رک جاتی ہے اور مڑ کر خدیجہ بیگم کو دیکھتی ہے خدیجہ بیگم مسکراتے ہوئے) 35 سال سے میں ہی منا رہی ہوں، تو یہیں ٹھہر میں منا لوں گی۔

عالیہ: مگر امی۔۔۔

خدیجہ بیگم: (دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے) تو بیٹھ باہر سے تھکی ہاری آئی ہے

(کوریڈور میں چلی جاتی ہیں اور عاصم صاحب کے کمرے کا دروازہ تھپ تھپا کر) اب یہ دروازہ کیوں بند کرلیا ہے۔

عاصم: (کمرے کے اندر سے) اب مجھے تھوڑی دیر آرام بھی کرنے دو گی یا نہیں۔ بس آ کر سر پر سوار ہو گئیں۔

خدیجہ بیگم: یہ بھی کوئی آرام کرنے کا وقت ہے۔ دروازہ تو کھولو۔

(کچھ دیر بعد دروازہ کھلتا ہے اور خدیجہ بیگم کمرے میں چلی جاتی ہیں۔ عالیہ مسلم کی طرف دیکھ کر جو سگریٹ جلا رہا ہے)۔

عالیہ: بڑھاپے میں دونوں بچوں کی طرح ہو گئے ہیں (مسلم خاموش رہتا ہے مگر چہرے پر سنجیدگی کے آثار کچھ گہرے ہو جاتے ہیں عالیہ اس کا چہرہ دیکھ کر) کیا بات ہے آپ کچھ زیادہ سنجیدہ نظر آ رہے ہیں۔

(مسلم کچھ دیر خاموش کھڑا رہتا ہے پھر آہستہ آہستہ کھڑکی کے پاس جاتا ہے جس میں سے سرد ہوا آ رہی ہے۔ کچھ دیر کھڑا رہتا ہے پھر کھڑکی بند کر دیتا ہے جس سے کمرے میں تاریکی کچھ زیادہ ہو جاتی ہے پھر آہستہ آہستہ عالیہ کے پاس آ کر)

مسلم: بھئی اب کب تک یہاں کا پروگرام ہے۔

عالیہ: (حیرت سے) کیوں! ایسی جلدی بھی کیا ہے ابھی تو آپ کی چھٹیاں باقی ہیں۔

مسلم: ہاں ہیں تو (سگریٹ کا لمبا کش لے کر) ان لوگوں کو اپنی وجہ سے کافی پریشانی ہے اور — جانے کیوں میں غیر لوگوں میں خود کو ایڈجسٹ نہیں کر سکتا۔

عالیہ: غیر لوگ! خدا کی قسم وہ تو ہم لوگوں کو اپنی ہی اولاد سمجھتے ہیں۔

مسلم: یہ تو ٹھیک ہے مگر میں سوچتا ہوں کہ آخر ہمارا ان سے کیا تعلق ہے کون سا رشتہ ہے۔

عالیہ: ایسا نہ کہیے۔ خدا گواہ ہے کہ یہ دونوں مجھے جو پیار دے رہے ہیں وہ مجھے اپنے سگے ماں باپ سے نہیں ملا۔

مسلم: یہ تو میں بھی محسوس کرتا ہوں مگر ان کی غیر معمولی محبت اور خلوص دیکھ کر میں خود کو چھوٹا چھوٹا سا محسوس کرنے لگا ہوں۔

عالیہ: (حیرت سے) چھوٹا چھوٹا۔

مسلم: دونوں اس قدر نیک دل ہیں کہ ان سے بے اختیار محبت کرنے کو جی چاہتا ہے (سوچتا ہوا میز کے پاس جاتا ہے پھر مڑ کر عالیہ کو دیکھتا ہے میز سے ٹک کر کھڑا ہو جاتا ہے کچھ دیر خاموش رہ کر) عالیہ! یہ نیک لوگ میری شخصیت اور روح کو ہپناٹائز کرتے چلے جا رہے ہیں۔ میں خود کچھ نہیں رہا ہوں اور اگر ہوں بھی تو ان کا معمول یا تمھارا سایہ!

عالیہ: میرا سایہ!

مسلم: ہاں میری عزت، مجھ سے محبت اور خلوص سب تمھاری وجہ سے ہے ورنہ حقیقت تو یہ ہے کہ میں ان کے لیے غیر ہوں۔

عالیہ: یہ آپ کا وہم ہے (کچھ دیر خاموش رہتی ہے پھر میز پر رکھی ہوئی تصویر کی طرف اشارہ کر کے) آپ جانتے ہیں کہ پہلے یہاں کس کی تصویر تھی (مسلم خاموش رہتا ہے) ان کے مرحوم بیٹے کی اور اب اس کی جگہ آپ کی تصویر ہے یہ ان کی آپ سے محبت ہے (آنکھوں میں آنسو بھر کر) ان کے بوڑھے دلوں کی اس محبت کو مجروح نہ کیجیے کہیں وہ بالکل نہ ٹوٹ جائیں۔

(مسلم خاموش ہو کر سوچنے لگتا ہے کہ خدیجہ بیگم کمرے سے نکل کر کوریڈور میں آکر اس کمرے کی طرف دیکھتی ہیں۔ سوئچ دبا کر کوریڈور میں روشنی کرتی ہیں اور بلند آواز سے)

خدیجہ بیگم: ارے عظمت خالا۔ شمع دان نہیں رکھا۔ دیکھو تو کمرے میں کتنا اندھیرا ہے اور عالیہ تجھے بھی خیال نہیں کہ مسلم میاں اندھیرے میں کھڑے ہیں (مڑ کر اور دوسرے کمرے میں جاتے ہوئے) غضب کی بے پرواہ ہیں دونوں۔

(کمرے میں چلی جاتی ہیں کہ شارق اسی کمرے سے شمع دان لیے نکلتا ہے

اور کمرے میں آ کر میز پر رکھ دیتا ہے جس سے کمرے میں دلکش مگر پراسرار روشنی پھیل جاتی ہے)۔

مسلم: آپ نے بلا وجہ تکلیف کی۔

شارق: تکلیف کی کیا بات ہے عظمت خالا دوسرے کاموں میں لگی ہوئی تھیں۔

مسلم: بھئی شارق صاحب کچھ بھی کہا جائے اس روشنی میں جو نرماہٹ ہے وہ بجلی کی روشنی میں کہاں۔

شارق: جی ہاں۔ اس میں شاعرانہ تصور زیادہ ہے مگر آج کی دنیا جگمگاہٹ کے پیچھے ہی دوڑ رہی ہے کیا یہ حقیقت نہیں ہے۔

(مسلم اس انداز سے شارق کو دیکھتا ہے جیسے اندازہ کر رہا ہو کہ کہیں وہ کسی طویل بحث کی تمہید تو شروع نہیں کر رہا ہے۔ پھر مسکرا کر)

مسلم: بھئی حقیقتوں کی بات چھوڑو کہ وہ کڑوی ہوتی ہے۔

(پہلے شارق قہقہہ مار کر ہنستا ہے پھر مسکرا کر)

شارق: اور یہ کڑوی گولیاں ہم کو نگلنا پڑتی ہیں ان سے مفر نہیں۔

مسلم: (ہنس کر) جی ہاں۔ جی ہاں۔

خدیجہ بیگم: (کوریڈور میں آ کر) ارے عالیہ بیٹی ذرا ادھر تو آنا۔

عالیہ: بہت اچھا۔ حاضر ہوئی۔

(خدیجہ بیگم پھر واپس کمرے میں چلی جاتی ہیں۔ عالیہ بھی کوریڈور سے گزر کر اسی کمرے میں چلی جاتی ہے۔ مسلم بھی کوریڈور کی طرف جاتا ہے)

شارق: آپ کدھر چل دیے۔

مسلم: بھئی سردی زیادہ ہے اوور کوٹ پہن لوں۔ آپ بھی گرم کوٹ پہن لیجیے یہ سردی صرف سوئٹر کے بس کی نہیں۔

شارق: میں تو ایسی سردیوں کا عادی ہوں۔ ٹورنگ ایجنٹ جو ٹھہرا (مسکرا کر) کوئی یونیورسٹی کا پروفیسر نہیں (مسلم اس انداز سے شارق کو دیکھتا ہے جیسے شارق

کے اس طنز سے اسے دکھ ہوا ہو شارق چند سیکنڈ رک کر اس کے خیالات کا اندازہ کر کے) شاید آپ نے غلط سمجھا میرا مقصد کچھ اور نہیں تھا (آگے بڑھتے ہوئے) چلیے میں بھی کوٹ پہنے لیتا ہوں۔ (آگے آگے مسلم اور اس کے پیچھے شارق کوریڈور میں جاتے ہیں کہ عالیہ چائے کی ٹرے لیے ہوئے کمرے سے نکلتی ہے اور مسلم کو دیکھ کر)

عالیہ: کہاں چل دیے آپ۔ میں تو چائے لے کر آرہی تھی۔

مسلم: تم چلو میں آرہا ہوں۔

(عالیہ آگے بڑھتی ہے اور شارق اسی کمرے میں چلا جاتا ہے۔ عالیہ کوریڈور سے کمرے میں آتی ہے کہ خدیجہ بیگم دروازے سے جھانک کر۔

خدیجہ بیگم: عالیہ بیٹی (عالیہ مڑ کر کوریڈور کی طرف دیکھتی ہے) ارے مسلم میاں کہاں چلے گئے۔

مسلم: (اپنے کمرے سے نکلتے ہوئے) یہ ہوں۔ آیئے نا آپ چائے نہیں پئیں گی۔

خدیجہ بیگم: تم پیو۔ میں یہیں ایک پیالہ پی لوں گی۔

(پھر کمرے کے اندر چلی جاتی ہیں۔ مسلم آہستہ آہستہ کمرے میں عالیہ کے پاس آتا ہے۔ عالیہ صوفے پر بیٹھ کر چائے بنانے لگتی ہے)

مسلم: شارق صاحب کا تو انتظار کر لو۔

عالیہ: (بے اتفاقی سے) اگر انھیں آنا ہوگا تو آجائیں گے۔

(مسلم غور سے عالیہ کا چہرہ دیکھتا ہے جو نظریں جھکائے چائے بنا رہی ہے کچھ دیر بعد چائے کی پیالی مسلم کی طرف بڑھاتی ہے۔ مسلم پیالی لے کر میز کے پاس جاتا ہے اور اس سے ٹک کر کھڑا ہو جاتا ہے۔ عالیہ بھی اپنی پیالی لے کر آہستہ آہستہ اس کے پاس جاتی ہے مسلم چائے کا گھونٹ لے کر)

مسلم: معلوم ہوتا ہے کہ شارق صاحب کی پوزیشن اس گھر میں ان انوائٹڈ گیسٹ کی سی ہے۔

30f

عالیہ: جی نہیں ایسی بات تو نہیں ہے امی تو ان کا بہت خیال رکھتی ہیں صرف ابا حضور ان سے کچھ ناراض رہتے ہیں۔

مسلم: (سوالیہ نظروں سے عالیہ کو دیکھتے ہوئے) کیوں (عالیہ کوئی جواب نہیں دیتی۔ مسلم چائے کا گھونٹ لے کر) تم تو پہلے ہی سے ان کو جانتی ہوگی۔

عالیہ: جی نہیں۔ کچھ زیادہ نہیں جانتی وہ "ان کی" موت کے بعد چند دن کے لیے آئے تھے۔

(مسلم سوچتا ہوا صوفے کے پاس جاتا ہے۔ خالی پیالی میز پر رکھ کر سگریٹ جلاتا ہے پھر عالیہ کے پاس جاتے ہوئے)

مسلم: مجھے بھی یہ کوئی نیک دل انسان معلوم نہیں ہوتے۔

عالیہ: (حیرت سے) کیوں آپ نے کیسے اندازہ لگایا۔

مسلم: (طنزیہ مسکرا کر) بعض وقت انسان کا ایک جملہ ہی اس کی ساری شخصیت کو ظاہر کر دیتا ہے (عالیہ ایسے انداز سے مسلم کو دیکھتی ہے جیسے وہ کچھ اور کہے گا مگر وہ خاموش رہتا ہے۔ سگریٹ کا کش لے کر سوچتے ہوئے) اب ہمیں اجازت لے ہی لینا چاہیے۔

عالیہ: کیسی اجازت۔

مسلم: واپس چلنے کی۔ کل صبح کی گاڑی ٹھیک رہے گی۔

عالیہ: ابھی شاید یہ لوگ اجازت نہ دیں (مسلم سوالیہ نظروں سے اسے دیکھتا رہتا ہے عالیہ کچھ دیر خاموش رہ کر) شاید کچھ دن اور ٹھہرنا پڑے۔ میں نے امی سے ذکر کیا تھا مگر وہ سن کر ناراض ہوگئیں اور پھر مجھے خاموش ہوجانا پڑا۔

مسلم: اور کبھی ابا حضور ناراض ہوجائیں گے اور تمھیں خاموش ہوجانا پڑے گا۔ سچ پوچھو تو اب میں عجیب سی الجھن محسوس کر رہا ہوں۔

عالیہ: الجھن— الجھن کی کیا بات ہے۔

(خدیجہ بیگم کوریڈور سے گزر کر کمرے میں آتے ہوئے)

خدیجہ بیگم: مسلم میاں کھانا تیار ہے اگر کہو تو میز پر لگا دیا جائے۔

مسلم: جیسی آپ کی مرضی (کلائی پر گھڑی دیکھ کر) ابھی تو ساڑھے سات ہی بجے ہیں۔

خدیجہ بیگم: جب بھوک لگے تب کھالینا (عالیہ کی طرف دیکھ کر) بیٹی ذرا دیکھنا جاگ رہے ہوں۔ تو کھانے کا پوچھ لے (مسکرا کر) مجھ سے تو سیدھے منہ بات بھی نہیں کریں گے۔

عالیہ: بہت اچھا (کوریڈور کی طرف جاتے ہوئے) میں پوچھے لیتی ہوں (کوریڈور میں جاکر پہلے تو عاصم کے کمرے کا دروازہ تھپتھپاتی ہے پھر جھانکتی ہے اور کمرے کے اندر چلی جاتی ہے خدیجہ بیگم مسکرا کر مسلم سے)

خدیجہ بیگم: بالکل سٹھیا گئے ہیں۔ بات بات میں الجھتے ہیں اب شارق سگا بھتیجا ہے مگر اس کی صورت سے بیزار ہیں۔ اگر میں کچھ بولتی ہوں تو مجھ پر بگڑتے ہیں جب سے تم آئے ہو دماغ کچھ سکون پر ہے دو بول ہنس کر بول لیتے ہیں۔ عالیہ کے نکاح کے بعد تو ایسی چپ لگی تھی جیسے بولنا ہی بھول گئے ہوں۔

مسلم: عالیہ سے اولاد کی طرح محبت کرتے ہیں اس کے بچھڑنے کا صدمہ ہونا ہی چاہیے۔ بیماری اور پھر عمر کا تقاضا ہے کہ انھیں مکمل آرام ملے۔

خدیجہ: تو کہاں کے پہاڑ توڑتے پھرتے ہیں سب اِدھر اُدھر کرتے ہیں بس ایک بات مرضی کے خلاف ہوجائے کہ دن بھر کے لیے چڑچڑے چل جائے گا۔

مسلم: (کچھ دیر خاموش رہ کر آہستہ سے) اب ہمیں بھی اجازت دیجیے۔

خدیجہ بیگم: (مسلم کو غور سے دیکھ کر) ابھی سے! ایسی بھی کیا جلدی ہے عالیہ تو کہہ رہی تھی ابھی بہت چھٹیاں باقی ہیں۔

مسلم: جی ہاں چھٹیاں تو باقی ہیں مگر آپ لوگوں کو بلا وجہ تکلیف ہورہی ہے۔

خدیجہ بیگم: تکلیف کیسی؟ ہمیں غیر سمجھتے ہو؟

مسلم: جی نہیں ایسی بات نہیں۔ مجھے ان چھٹیوں میں کچھ لیکچر بھی تیار کرنا ہیں۔

خدیجہ بیگم: اب لیکچر تو تیار ہوتے رہیں گے وہ تو کہہ رہے تھے کہ تمھیں پوری چھٹیاں

یہیں رو کے رکھیں گے۔

مسلم: آپ کا خلوص و پیار دیکھ کر تو یہی جی چاہتا ہے کہ نہ جاؤں مگر کچھ ضروری کام ہیں جن کی وجہ سے جانا ضروری ہے۔۔۔ ورنہ۔۔۔

خدیجہ بیگم: تو پھر ان سے اجازت لے لو مگر شاید ابھی کاغذات تیار نہیں ہوئے ہیں ان کی تیاری کا تو انتظار کرنا ہی پڑے گا۔

مسلم: (حیرت سے) کیسے کاغذات۔

خدیجہ بیگم: تمھیں عالیہ نے نہیں بتلایا۔

مسلم: جی نہیں۔ مجھ سے تو کسی قسم کے کاغذات کی بات چیت نہیں ہوئی۔

خدیجہ بیگم: اب ہم دونوں تو قبر میں پاؤں لٹکائے بیٹھے ہیں جانے کب بلاوا آجائے اس لیے سوچا کہ جائداد کا فیصلہ اپنی ہی زندگی میں کر جائیں۔

مسلم: (حیرت سے) جائداد کا فیصلہ۔

خدیجہ بیگم: ہاں ہمارے آگے پیچھے تو کوئی ہے نہیں۔ عالیہ ہے بہو بن کر اس گھر میں آئی تھی بیٹی بن کر اس گھر سے گئی۔ اس لیے وکیل سے کہا ہے کہ وہ اس کے نام جائداد کے کاغذات مرتب کرا دیں۔

مسلم: جی تو کیا اور کوئی وارث۔ میرا مطلب ہے شارق صاحب تو اس کے جائز وارث ہیں۔

خدیجہ بیگم: مگر وہ نہیں چاہتے کہ انھیں ایک کوڑی بھی ملے۔

مسلم: مگر یہ تو ان کے ساتھ۔

خدیجہ بیگم: (بات کاٹ کر) میں نے تو کہا تھا ان کا حصہ نکال کر باقی عالیہ کے نام کر دو مگر وہ یہ سننے کو بھی تیار نہیں۔ (مسلم کمرے میں ٹہلنے لگتا ہے جیسے وہ کسی گہری سوچ میں ہو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ دل ہی دل میں کچھ فیصلے کر رہا ہے اور پھر خود ہی انھیں رد کر رہا ہے خدیجہ بیگم خاموشی سے اسے دیکھتی رہتی ہیں مسلم سگریٹ جلا کر دو چار لمبے کش لیتا ہے اور پھر کمرے میں ٹہلنے لگتا ہے

کہ عالیہ کمرے میں آتی ہے اور خدیجہ بیگم کو دیکھ کر)

عالیہ: ابا حضور اپنی دوا کی گولیاں مانگ رہے تھے میں نے بہت تلاش کیں مگر ملی نہیں آپ نے کہیں رکھ دی ہیں۔

خدیجہ بیگم: ان کے سرہانے جو میز ہے اس کی دراز میں ہیں (کوریڈور کی طرف جاتے ہوئے) میں جاکر دیتی ہوں۔

(کوریڈور سے گزر کر عاصم صاحب کے کمرے میں جاتی ہیں مسلم اسی طرح غور وفکر کے انداز میں کمرے میں ٹہلتا رہتا ہے عالیہ کچھ دیر اسے خاموشی سے دیکھتی رہتی ہے پھر آہستہ سے)

عالیہ: کیا بات ہے۔آپ کچھ۔۔۔

مسلم: (عالیہ کے قریب آتے ہوئے) عالیہ یہ جائداد کی منتقلی کا کیا قصہ ہے۔

عالیہ: کیسی جائداد کی منتقلی۔

مسلم: ابھی امی کہہ رہی تھیں کہ یہ جائداد تمھارے نام منتقل کی جارہی ہے۔

عالیہ: جی ہاں۔

مسلم: اور تم نے مجھ سے کہا تک نہیں۔

عالیہ: میں نے سوچا کہ جب منتقل ہو جائے گی تو آپ کو خود بخود معلوم ہو جائے گا۔

مسلم: (کسی قدر تلخ لہجے میں) گویا یہ بات تم مجھ سے چھپانا چاہتی تھیں۔

عالیہ: اس میں چھپانے کی کون سی بات تھی۔کبھی ایسا موقع ہی نہیں ملا کہ آپ سے کہا جاتا (مسلم پھر کمرے میں ٹہلنے لگتا ہے اس کے انداز سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ سخت ذہنی الجھن میں مبتلا ہے عالیہ سہمے ہوئے لہجے میں) آخر اس میں پریشان ہونے کی کیا بات ہے۔

مسلم: (کچھ دیر کھوئے کھوئے انداز میں اپنی نظریں عالیہ کے چہرے پر گاڑے رہتا ہے پھر آہستہ سے) عالیہ! کیا تم چاہتی ہو کہ لوگ میرا مذاق اڑائیں۔

عالیہ: (حیرت سے) مذاق!

مسلم: لوگ یہی کہیں گے کہ چالیس سال کی عمر میں اس نے جائداد کے لیے شادی کی ہے۔

عالیہ: لیکن نکاح سے پہلے تو یہ جائداد میری نہیں تھی اب اگر مل رہی ہے تو۔

مسلم: لوگ حقیقت کم دیکھتے ہیں تضحیک کا پہلو نکالنے کی کوشش زیادہ کرتے ہیں میں دوسروں کے طعنے برداشت نہیں کرسکتا۔

عالیہ: طعنے— بھلا اس میں طعنے۔

مسلم: (بات کاٹ کر) ابھی شارق صاحب مجھے یونیورسٹی کی پروفیسرشپ کا طعنہ دے گئے ہیں، اب غاصب کا خطاب عطا فرمائیں گے (فیصلہ کن لہجے میں) تمھیں اس جائداد کے قبول کرنے سے انکار کرنا ہوگا۔

عالیہ: لیکن ان دونوں کا تو سوچیے جو مجھ ہی کو اپنا سب کچھ سمجھتے ہیں۔ ان کے دلوں کو کس قدر صدمہ پہنچے گا۔

مسلم: عالیہ! تمھارا جذباتی لگاؤ ان لوگوں سے ہے خدا گواہ تمھارے اس جذبے کی میں قدر کرتا ہوں۔

عالیہ: مگر

مسلم: (اپنی ہی رو میں اس کی بات کاٹ کر) یہ دونوں کس قدر نیک اور مخلص ہیں میں بیان نہیں کرسکتا، میرے دل میں ان کی کس قدر عزت ہے تم محسوس بھی نہیں کرسکتیں مگر پھر بھی میں ان کے اس احسان کو قبول نہیں کرسکتا جس سے میری خودداری کو ٹھیس پہنچے۔

عالیہ: لیکن یہ احسان آپ پر تو نہیں۔

مسلم: اگر ڈائریکٹ نہیں تو ان ڈائرکٹ ضرور ہے۔ تمھیں انکار کرنا ہوگا (عالیہ کے جواب کا انتظار کیے بغیر تیز تیز قدموں سے کوریڈور میں جاتا ہے کہ خدیجہ بیگم عاصم صاحب کے کمرے سے نکلتی ہیں اور مسلم کو دیکھ کر)

خدیجہ بیگم: مسلم میاں چائے پی۔

مسلم: جی ہاں پی لی۔

خدیجہ بیگم: جب بھوک لگے کہہ دینا تکلف کی ضرورت نہیں کھانا تیار ہے۔

مسلم: جی۔ بہت اچھا۔ (اپنے کمرے میں چلا جاتا ہے خدیجہ بیگم سامنے والے کمرے کی طرف بڑھتے ہوئے)

خدیجہ بیگم: عظمت خالا یہ چائے کے برتن تو اٹھا لو اب وہ دو دن کے لیے آئی ہے تو کیا برتن دھوتی پھرے (کمرے کے اندر چلی جاتی ہیں۔ عالیہ میز پر رکھے ہوئے برتن اٹھا کر کشتی میں رکھتی ہے پھر صوفے پر بیٹھ کر خلا میں گھورنے لگتی ہے کہ عظمت خالا کمرے میں آتی ہیں پہلے تو کشتی اٹھاتی ہیں پھر عالیہ کو خاموش دیکھ کر)

عظمت خالا: کیا بات ہے دلھن بیگم یوں خاموش کیوں بیٹھی ہو۔

عالیہ: (پژمردہ لہجے میں) کچھ نہیں عظمت خالا۔ (عظمت خالا کچھ دیر خاموشی سے عالیہ کے چہرے کو دیکھتی رہتی ہیں پھر اٹھائی کشتی میز پر رکھ کر)

عظمت خالا: مسلم میاں کہاں ہیں۔

عالیہ: (مردہ سی آواز میں) اپنے کمرے میں۔

عظمت خالا: سچ بتاؤ دلھن بیگم کیا بات ہے۔

عالیہ: کوئی بات نہیں کہہ تو دیا۔

عظمت خالا: کوئی بات تو ضرور ہے۔ مسلم میاں نے کچھ کہا (عالیہ نفی میں سر ہلاتی ہے مگر آنکھوں میں آنسو آجاتے ہیں) شارق میاں نے کچھ ایسی ویسی بات کہی۔

عالیہ: نہیں عظمت خالا۔ میں تو ان سے بات بھی نہیں کرتی (آنسو پونچھتے ہوئے) میں نے دوسرا نکاح اس لیے نہیں کیا ہے کہ امی اور ابا حضور کا دل دکھاؤں۔ میں نے تو صرف ان کی خواہش پوری کی ہے۔

(پھر آنکھوں میں آنسو آجاتے ہیں عظمت خالا اس کے پاس بیٹھ کر)

عظمت خالا: آخر ہوا کیا دلھن بیگم۔ مسلم میاں کے ساتھ خوش نہیں ہو۔

عالیہ: نہیں عظمت خالا مجھے کوئی تکلیف نہیں ہے مگر— (خاموش ہوجاتی ہے۔ عظمت خالا اس کا چہرہ دیکھتی رہتی ہیں) ابا حضور جائداد میرے نام کرنا چاہتے ہیں اور یہ ان کو پسند نہیں۔

عظمت خالا: (کھڑی ہوکر) پتا نہیں۔ اگر میں نے انکار کیا تو ان کو دکھ ہوگا (ٹھنڈی سانس بھر کر) وہ سمجھیں گے میں نے ان کو غیر سمجھا (میز کے پاس جاتی ہے اور کرسی پر اس طرح بیٹھتی ہے کہ اس کا چہرہ اسٹیج کی جانب رہتا ہے) کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا کروں۔

(عظمت خالا کچھ دیر خاموش بیٹھی رہتی ہیں پھر عالیہ کے پاس جاکر)

عظمت خالا: تم انھیں سمجھانے کی کوشش کرو۔ آتی لکشمی کو کون ٹھکراتا ہے۔

عالیہ: ان کا ہر فیصلہ آخری فیصلہ ہوتا ہے۔ (خلا میں گھورتے ہوئے) میں ابا حضور کی خاطر طلاق۔

عظمت خالا: (تیزی سے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ کر) دلھن بیگم بدشگونی کے لفظ زبان پر نہ لانا (ایسے لہجے میں جس میں غصہ کی بھی جھلک ہے) کیا تم چاہتی ہو کہ زندگی سے یہ دونوں جو زندگی سے اکتائے ہوئے ہیں، زندگی سے بیزار ہوجائیں انھوں نے کس چاؤ سے تمھارا نکاح کرایا ہے کبھی اس پر بھی سوچا ہے۔

عالیہ: میں ان سے کیسے کہوں کہ مجھے یہ جائداد نہیں چاہیے۔ مجھے اس کی ضرورت نہیں۔

عظمت خالا: اگر تم نے انکار کیا تو جائداد شارق میاں کو مل جائے گی اور عاصم میاں اس کو برداشت نہ کرسکیں گے۔

(عالیہ خاموش رہتی ہے اور اپنے پلو سے آنسو پونچھتی ہے کہ عاصم صاحب اپنے کمرے سے نکل کر اس کمرے میں آتے ہیں۔ عالیہ انھیں دیکھ کر تیزی سے کھڑی ہوجاتی ہے اور اپنے سر پر دوپٹا برابر کرتی ہے عاصم آکر صوفے پر بیٹھ جاتے ہیں کچھ دیر اس طرح خاموش رہتے ہیں جیسے اپنی سانسوں پر قابو پانے کی کوشش کررہے ہوں پھر عالیہ کی طرف دیکھ کر)

عاصم: عالیہ

عالیہ: (عاصم کے پاس آتے ہوئے) جی ابا حضور

عاصم: مسلم میاں کہاں ہیں۔ کھانا کھالیا۔

عالیہ: ابھی تو نہیں کھایا۔ اپنے کمرے میں ہیں۔

عاصم: (عظمت خالا کی طرف دیکھ کر) یہ برتن اٹھا کر لے جاؤ (عظمت خالا برتن اٹھا کر کوریڈور کی طرف جاتی ہیں) ذرا مسلم سے کہہ دینا کہ میں بلا رہا ہوں۔

عظمت خالا: اچھا (کوریڈور میں جا کر مسلم کمرے کا دروازہ تھپتھپا کر) مسلم میاں آپ کو عاصم میاں بلا رہے ہیں۔

مسلم: (کمرے کے اندر سے) بہت اچھا۔ ابھی حاضر ہوا۔

(عظمت خالا دوسرے کمرے میں چلی جاتی ہیں۔ عالیہ عاصم کی طرف دیکھ کر)

عالیہ: ابا حضور آپ نے دوا پی لی؟

عاصم: (تھکے تھکے لہجے میں) ہاں بیٹی مگر یہ زندگی کہاں تک دواؤں کے سہارے چلے گی آخر کو ایک دن دوائیں بھی ہار تھک کر ساتھ چھوڑ دیں گی۔ (آنکھوں میں آنسو بھر کر) ابا حضور ایسا نہ کہیے۔ خدا کے لیے ایسا نہ کہیے۔

عاصم: (طنزیہ مسکرا کر) تم کہتی ہو تو نہیں کہتا بیٹی۔۔۔ مگر بڑھاپا موت کا نقیب ہوتا ہے اس کی آواز پر کان نہ دھرنا بے وقوفی ہے۔ موت ایک سچائی ہے (ٹھنڈی سانس بھر کر) اگر خاموش رہنے سے یہ سچائی یہ حقیقت جھٹلائی جا سکتی ہے تو میں خاموش ہوا جاتا ہوں۔

عالیہ: ابا حضور۔

عاصم: (کھڑے ہو کر محبت سے اس کے سر پر ہاتھ پھیر کر) نہیں بیٹی روتے نہیں بخدا بوڑھا ہو چکا ہوں عزم و ارادہ شکست ہو چکا ہے ورنہ تیرے ان آنسوؤں کے لیے میں موت سے بھی پنجہ لڑا لیتا۔

(مسلم کمرے میں آتا ہے۔ عالیہ کی آنکھوں میں آنسو دیکھ کر)

مسلم: کیابات ہے۔

عاصم: (محبت سے عالیہ کو صوفے پر بٹھلا کر طنزیہ مسکرا کر) ایک بوڑھے سے کہہ رہی ہے کہ وہ موت سے ٹکرا جائے (ٹھنڈی سانس بھر کر) بوڑھا ہو چکا ہوں ورنہ موت کے منہ پر وہ طمانچہ مارتا کہ خدا کو موت کا بھی روپ بدلنا پڑتا۔

مسلم: آپ تشریف رکھیے (عاصم کو صوفے پر بٹھلا کر عالیہ کی طرف دیکھ کر) نہیں کوئی ایسی بات نہیں کہنا چاہیے جس سے ان کے اعصاب پر برا اثر پڑے صحت پہلے ہی اچھی نہیں ہے۔

(کچھ دیر خاموشی رہتی ہے شارق کوریڈور سے گزر کر دروازے میں آتا ہے پھر ان تینوں کو دیکھ کر دروازے ہی میں کھڑا ہو جاتا ہے اس نے لباس تبدیل کرلیا ہے جیسے وہ کہیں باہر جانے کا ارادہ رکھتا ہو کچھ دیر بعد عاصم مسلم کو دیکھ کر)

عاصم: ابھی خدیجہ نے بتلایا کہ تم واپس جانے کا ارادہ رکھتے ہو۔

مسلم: جی ہاں۔ کچھ ضروری کام ہیں ورنہ۔

عاصم: کوئی بات نہیں تمہارا ہی گھر ہے جب جی چاہے آ جانا (کچھ دیر خاموش رہ کر) مسلم میاں میں بیمار ہوں، بوڑھا ہوں، موت جانے کب دروازہ کھٹکھٹانے لگے۔ اس کے آنے سے پہلے ایک فرض سے سبکدوش ہو جانا چاہتا ہوں۔

مسلم: فرض سے! کس فرض سے؟

عاصم: (کچھ دیر خاموش رہتے ہیں پھر کھڑے ہو کر) مسلم میاں۔

مسلم: آپ تشریف رکھیے۔

عاصم: ٹھیک ہے۔ یوں بھی ٹھیک ہوں عالیہ کو بہو بنا کر اس گھر میں لایا تھا۔ مگر خدا کی کچھ اور ہی مرضی تھی۔ خیر خدا کا شکر ادا کیا اور اسے بیٹی کی طرح تمہارے سپرد کر دیا اب سوچتا ہوں کہ جو کچھ اور ہے وہ عالیہ کو سپرد کر کے

خود سبکدوش ہو جاؤں۔

مسلم: آپ کی محبت اور خلوص ہمارے لیے سب سے بڑی دولت ہے۔

عاصم: یہ تمھاری سیر چشمی ہے مسلم میاں (بلند آواز سے) عظمت خالا عظمت خالا (عظمت خالا کوریڈور میں آتی ہیں عاصم انھیں دیکھ کر) میرے سرہانے ایک بڑا سا لفافہ رکھا ہے وہ اٹھا لاؤ (عظمت خالا عاصم صاحب کے کمرے میں چلی جاتی ہیں) عالیہ میرے بعد عظمت خالا کا خیال رکھنا میں نے انھیں نوکرانی کبھی نہیں سمجھا۔ ماں کی طرح عزت کی ہے۔

عالیہ: ابا حضور (کھڑی ہو کر) یہ آج آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں۔

عاصم: ایک تھکا ہوا مسافر اپنا بوجھ جلد از جلد اتار دینا چاہتا ہے۔ (عظمت خالا ایک لفافہ لاکر عاصم کو دیتی ہیں) اچھا لے آئیں (مسلم کی طرف دیکھ کر) میں نے کاغذات وکیل سے تیار کروا دیے ہیں۔ عدالتی کارروائی بھی مکمل ہے۔

مسلم: ایسی جلدی بھی کیا ہے— ابھی آپ—

عاصم: مسلم میاں۔ موت کا کوئی وقت مقرر نہیں۔ جانے کب—

عالیہ: (جذباتی انداز میں) موت، موت، موت۔ آخر ابا حضور آپ کو ہو کیا گیا ہے نہیں چاہیے مجھے ایسی جائداد جس کا تعلق آپ کی۔

عاصم: (پھیکی مسکراہٹ سے بات کاٹ کر) موت سے کس کو رستگاری ہے تمھارے انکار سے مجھے دکھ ہوگا عالیہ۔

عالیہ: خدا کے لیے ابا حضور آپ مجھے—

عاصم: (بات کاٹ کر) تو پھر تم ہمیں غیر سمجھتے ہو (ٹھنڈی سانس بھر کر) بخدا ہم تمھیں اپنی بیٹی سمجھتے ہیں۔

عالیہ: ابا حضور—

(صوفہ پر بیٹھ جاتی ہے۔ آنکھوں میں آنسو آجاتے ہیں کچھ بے کسی سے کبھی

مسلم اور کبھی عاصم کو دیکھتی ہے چہرے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ کسی بڑی کشمکش میں مبتلا ہے۔ کچھ دیر مکمل خاموشی رہتی ہے پھر مسلم عاصم صاحب کے پاس جاکر)

مسلم: دیکھیے بات دراصل یہ ہے کہ اس کے جائز حقدار۔

عاصم: (کسی قدر ناگواری کے لہجے میں مسلم کا قطع کلام کرکے) یہ میری جائداد ہے جسے دے دوں وہی جائز حقدار ہے (کچھ دیر خاموش رہ کر شکست خوردہ لہجے میں) میں جانتا ہوں یہ تحفہ تمھارے لیے بہت حقیر ہے مگر—

(عالیہ ہچکیوں سے رونے لگتی ہے عاصم ایک دم خاموش ہوجاتے ہیں عظمت خالا عاصم کے پاس جاکر)

عظمت خالا: عاصم میاں ایسی جلدی بھی کیا ہے۔ اس وقت دلھن بیگم کا جی قابو میں نہیں ہے۔ ابھی اس بات کو چھوڑ دو۔ پھر کبھی—

(شارق آگے بڑھ کر ان کے قریب آتے ہوئے)

شارق: اس کاغذ کی دھجی کو قبول کر لینے میں کون سی برائی ہے۔

عاصم: (مڑ کر شارق کو دیکھ کر) کاغذ کی دھجی— مردود میری وصیت کو کاغذ کی دھجی کہتے شرم نہیں آتی۔

شارق: کسی کا حق مار کر کوئی وصیت کی جائے تو اس کی اہمیت کاغذ کی دھجی سے زیادہ نہیں ہوتی۔

عاصم: (غصے سے کانپتے ہوئے) نکل جا میرے گھر سے مردود۔ کاغذ کی دھجی—

(غصہ سے کانپتے ہوئے لڑکھڑاتے ہوئے صوفے کی طرف بڑھتے ہیں مسلم تیزی سے بڑھ کر انھیں سنبھالنے کی کوشش کرتا ہے مگر عاصم صوفے پر گر جاتے ہیں مسلم ان کی نبض پر ہاتھ رکھ کر شارق سے)

مسلم: جلدی سے کسی ڈاکٹر کو بلایئے ان کی حالت ٹھیک نہیں ہے (شارق بے تعلق سا کھڑا رہتا ہے مسلم اس کا چہرہ دیکھ کر نفرت سے) آپ کو اتنی بھی تمیز

نہیں کہ کس وقت کس سے کون سی بات کرنا چاہیے (عظمت خالا کی طرف دیکھ کر) پاس میں کوئی ڈاکٹر ملے گا۔

عظمت خالا: (گھبرائے ہوئے انداز میں) ہاں میاں یہ سڑک جہاں سیدھے ہاتھ کو مڑتی ہے وہیں ایک ڈاکٹر کا دواخانہ ہے (مسلم تیزی سے کمرے سے چلا جاتا ہے۔ عظمت خالا بلند آواز سے) بہو بیگم۔ بہو بیگم۔ ذرا جلدی سے ادھر آؤ۔۔۔

(پردہ)

دوسرا سین

منظر

(وہی کمرہ چند مہینے بعد۔۔۔ خدیجہ بیگم اداس اور غمگین بیٹھی کوریڈور کی طرف دیکھ رہی ہیں کہ عظمت خالا کوریڈور سے گزر کر کمرے میں آتی ہیں ان کی چال سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ تھکی ہوئی ہیں آہستہ آہستہ چل کر خدیجہ بیگم کے پاس آتی ہیں اور کھڑی ہو جاتی ہیں۔ خدیجہ بیگم نظریں اٹھا کر انھیں دیکھتی ہیں پھر نظریں اس طرح جھکا لیتی ہیں جیسے شرمندہ ہوں۔۔۔ عظمت خالا کچھ دیر خاموش کھڑی رہتی ہیں اور آنکھوں میں آنسو آجاتے ہیں۔

عظمت خالا: بہو بیگم (خدیجہ بیگم نظریں اٹھا کر دیکھتی ہیں۔ آنکھوں میں آنسو ہیں۔ عظمت خالا کچھ دیر رک کر) خدا کو سونپا۔

(خدیجہ بیگم ایک دم کھڑی ہو کر عظمت خالا سے لپٹ جاتی ہیں اور ہچکیوں سے رونے لگتی ہیں۔ دونوں کی ہچکیاں بندھ جاتی ہیں کچھ دیر بعد اپنی ہچکیوں پر قابو پا کر)

خدیجہ بیگم: عظمت خالا تم مجھے دلھن بنا کر لائی تھیں۔ مجھے دلھنوں کا جوڑا پہنایا تھا کفن بھی اپنے ہاتھ سے دے جاتیں تو اچھا تھا۔ مگر تم۔۔۔

(آواز بھرا جاتی ہے اور خاموش ہو جاتی ہیں۔ عظمت خالا کچھ دیر خاموش رہتی ہیں پھر دوپٹے کے پلو سے آنسو پونچھ کر)

عظمت خالا: بہو بیگم کیسی باتیں کرتی ہو کفن پہننے کے تو میرے دن ہیں (روپیوں کی ایک گڈی ان کی طرف بڑھا کر) انھیں اپنے پاس رکھ لو میری موت میت کے ہیں۔

خدیجہ بیگم: نہیں عظمت خالا۔ جانے کب موت کا بلاوا آجائے اور شارق میاں کو تو تم جانتی ہو ان کی نیت بگڑنے میں دیر نہیں لگتی (کچھ دیر خاموش رہ کر) تمھارے جانے کے بعد سچ مچ بیوہ ہو جاؤں گی۔

عظمت خالا: خدا پر بھروسہ رکھو بہو بیگم (ٹھنڈی سانس بھر کر) شارق میاں اس قدر کٹھور ہیں یہ تو سوچا بھی نہیں تھا۔

خدیجہ بیگم: تم نے خود دیکھا ہے کہ میں نے ان کے ساتھ کبھی کوئی برائی نہیں کی ان کے لیے ان کے چچا سے بھی الجھ جاتی تھی مجھے بے سہارا جان کر ان کا جو برتاؤ ہے وہ تم دیکھ رہی ہو۔

عظمت خالا: خدا سب سے بڑا سہارا ہے بہو بیگم۔ میرا کہنا مانو اور دلھن بیگم کے ساتھ چلی جاؤ۔ نہیں تو یہاں گھٹ گھٹ کر جان دے دوگی۔

خدیجہ بیگم: (ٹھنڈی سانس بھر کر) کیسے چلی جاؤں آخر کو غیر ہے۔

عظمت خالا: غیر! جس کو تم بہو بنا کر لائی تھیں جس کو تم نے بیٹی کی طرح رخصت کیا وہ کیسے غیر ہو سکتی ہے کل تمھارے انکار کرنے پر وہ کیسے رو پڑی تھیں کہ تم نے نہیں دیکھا (خدیجہ بیگم خاموش رہتی ہیں۔ عظمت خالا روپوں کی گڈی ان کے ہاتھ پر رکھ کر) خدا کو سونپا۔ دو چار دن بعد آکر اپنے کپڑے لتے لے جاؤں گی۔

(عظمت خالا آہستہ آہستہ کمرے سے چلی جاتی ہیں خدیجہ بیگم کچھ دیر خاموش کھڑی رہتی ہیں پھر کھڑکی کے پاس جا کر اس طرح باہر دیکھنے لگتی ہیں جیسے عظمت خالا کے آخری دیدار کر رہی ہوں پھر وہیں کرسی پر بیٹھ جاتی ہیں اور

نہیں کہ کس وقت کس سے کون سی بات کرنا چاہیے (عظمت خالا کی طرف دیکھ کر) پاس میں کوئی ڈاکٹر ملے گا۔

عظمت خالا: (گھبرائے ہوئے انداز میں) ہاں میاں یہ سڑک جہاں سیدھے ہاتھ کو مڑتی ہے وہیں ایک ڈاکٹر کا دواخانہ ہے (مسلم تیزی سے کمرے سے چلا جاتا ہے۔ عظمت خالا بلند آواز سے) بہو بیگم۔ بہو بیگم۔ ذرا جلدی سے ادھر آؤ۔۔۔

(پردہ)

دوسرا سین

منظر

(وہی کمرہ چند مہینے بعد۔۔۔ خدیجہ بیگم اداس اور غمگین بیٹھی کوریڈور کی طرف دیکھ رہی ہیں کہ عظمت خالا کوریڈور سے گزر کر کمرے میں آتی ہیں ان کی چال سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ تھکی ہوئی ہیں آہستہ آہستہ چل کر خدیجہ بیگم کے پاس آتی ہیں اور کھڑی ہو جاتی ہیں۔ خدیجہ بیگم نظریں اٹھا کر انھیں دیکھتی ہیں پھر نظریں اس طرح جھکا لیتی ہیں جیسے شرمندہ ہوں۔۔۔ عظمت خالا کچھ دیر خاموش کھڑی رہتی ہیں اور آنکھوں میں آنسو آجاتے ہیں۔

عظمت خالا: بہو بیگم (خدیجہ بیگم نظریں اٹھا کر دیکھتی ہیں۔ آنکھوں میں آنسو ہیں۔ عظمت خالا کچھ دیر رک کر) خدا کو سونپا۔

(خدیجہ بیگم ایک دم کھڑی ہو کر عظمت خالا سے لپٹ جاتی ہیں اور ہچکیوں سے رونے لگتی ہیں۔ دونوں کی ہچکیاں بندھ جاتی ہیں کچھ دیر بعد اپنی ہچکیوں پر قابو پاکر)

خدیجہ بیگم: عظمت خالا تم مجھے دلھن بنا کر لائی تھیں۔ مجھے دلھنوں کا جوڑا پہنایا تھا کفن بھی اپنے ہاتھ سے دے جاتیں تو اچھا تھا۔ مگر تم۔۔۔

(آواز بھرا جاتی ہے اور خاموش ہو جاتی ہیں۔ عظمت خالا کچھ دیر خاموش رہتی ہیں پھر دوپٹے کے پلو سے آنسو پونچھ کر)

عظمت خالا: بہو بیگم کیسی باتیں کرتی ہو کفن پہننے کے تو میرے دن ہیں (روپیوں کی ایک گڈی ان کی طرف بڑھا کر) انھیں اپنے پاس رکھ لو میری موت میت کے ہیں۔

خدیجہ بیگم: نہیں عظمت خالا۔ جانے کب موت کا بلاوا آجائے اور شارق میاں کو تو تم جانتی ہو ان کی نیت بگڑنے میں دیر نہیں لگتی (کچھ دیر خاموش رہ کر) تمھارے جانے کے بعد سچ مچ بیوہ ہو جاؤں گی۔

عظمت خالا: خدا پر بھروسہ رکھو بہو بیگم (ٹھنڈی سانس بھر کر) شارق میاں اس قدر کٹھور ہیں یہ تو سوچا بھی نہیں تھا۔

خدیجہ بیگم: تم نے خود دیکھا ہے کہ میں نے ان کے ساتھ کبھی کوئی برائی نہیں کی ان کے لیے ان کے چچا سے بھی الجھ جاتی تھی مجھے بے سہارا جان کر ان کا جو برتاؤ ہے وہ تم دیکھ رہی ہو۔

عظمت خالا: خدا سب سے بڑا سہارا ہے بہو بیگم۔ میرا کہنا مانو اور دلھن بیگم کے ساتھ چلی جاؤ۔ نہیں تو یہاں گھٹ گھٹ کر جان دے دوگی۔

خدیجہ بیگم: (ٹھنڈی سانس بھر کر) کیسے چلی جاؤں آخر کو غیر ہے۔

عظمت خالا: غیر! جس کو تم بہو بنا کر لائی تھیں جس کو تم نے بیٹی کی طرح رخصت کیا وہ کیسے غیر ہو سکتی ہے کل تمھارے انکار کرنے پر وہ کیسے رو پڑی تھیں کہ تم نے نہیں دیکھا (خدیجہ بیگم خاموش رہتی ہیں۔ عظمت خالا روپوں کی گڈی ان کے ہاتھ پر رکھ کر) خدا کو سونپا۔ دو چار دن بعد آکر اپنے کپڑے لتے لے جاؤں گی۔

(عظمت خالا آہستہ آہستہ کمرے سے چلی جاتی ہیں خدیجہ بیگم کچھ دیر خاموش کھڑی رہتی ہیں پھر کھڑکی کے پاس جا کر اس طرح باہر دیکھنے لگتی ہیں جیسے عظمت خالا کے آخری دیدار کر رہی ہوں پھر وہیں کرسی پر بیٹھ جاتی ہیں اور

آنکھیں بند کرلیتی ہیں۔ تھوڑی دیر بعد شارق کی آواز ـــــ 'عظمت خالا عظمت خالا' خدیجہ بیگم خاموش رہتی ہیں جیسے انھوں نے یہ آواز سنی ہی نہ ہو۔ شارق کمرے میں آکر)

شارق: چچی جان۔ عظمت خالا کہاں ہیں (خدیجہ بیگم آنکھیں بند کیے خاموش بیٹھی رہتی ہیں شارق ان کے پاس آکر) چچی جان۔ (خدیجہ بیگم آنکھیں کھول اسے اس طرح دیکھتی ہیں جیسے پہچاننے کی کوشش کر رہی ہوں۔ شارق آہستہ سے) عظمت خالا کہاں ہیں۔

خدیجہ بیگم: عظمت خالا (ایسے لہجے میں جیسے انھیں اپنی بات پر یقین نہ ہو) چلی گئیں۔

شارق: (خدیجہ بیگم کی گود میں پڑی روپے کی گڈی کو دیکھتے ہوئے) کہاں چلی گئیں۔

خدیجہ بیگم: (اس انداز سے جیسے انھوں نے خود پر قابو پالیا ہو) تم ہی نے تو چلے جانے کو کہا تھا اب وہ ایسی بے غیرت بھی نہیں تھیں کہ پڑی رہتیں۔ خدا کے فضل سے ان کے بھی دو جوان بیٹے ہیں۔

شارق: (طنزیہ) تو وہ اپنے جوان بیٹوں کے پاس چلی گئیں۔ چلیے یہ بھی اچھا ہوا۔

خدیجہ بیگم: تمھارے چچا کی وصیت تھی کہ انھیں ماں کی جگہ سمجھنا مگر تم نے ـــــ

شارق: (بات کاٹ کر) چچا جان کی تو جانے کیا کیا وصیتیں تھیں (لہجے میں تلخی پیدا کرتے ہوئے طنزیہ) چچا جان کا جواب نہیں تھا وصیتیں کرنے میں۔

خدیجہ بیگم: (ایک دم کھڑی ہوکر) شارق میاں مرے ہوئے کی تو عزت کرلو۔ اب اس کی مٹی پلید کرنے سے کیا فائدہ۔

شارق: (اسی لہجے میں) سمجھ میں نہیں آتا کہ لوگ مرتے وقت وصیتیں کیوں کرتے ہیں (خدیجہ بیگم خاموش رہتی ہیں شارق ان کا چہرہ دیکھ کر) اور پھر چچا جان نے کون سے احسان کیے ہیں مجھ پر کہ ان کی وصیتوں کا پاس کرتا پھروں۔

خدیجہ بیگم: (غصہ اور طنز سے) تمھارے اوپر تو تمھارے باپ نے بھی احسان نہیں کیے چچا کس گنتی شمار میں ہے۔

(شارق اس طرح انھیں دیکھتا ہے جیسے اسے ایسے جواب کی امید نہیں تھی۔ کھڑکی سے باہر دیکھتے ہوئے)

شارق: عظمت خالا کوئی ایسا فرشتہ تو ہیں نہیں کہ ان کی موجودگی خیر و برکت کا باعث ہو اور پھر چچی جان میں تو اپنی جیب دیکھ کر کام کرتا ہوں۔

خدیجہ بیگم: تمھاری جیب اتنی دبلی بھی نہیں ہے کہ ایک بڑھیا کا بوجھ نہ اٹھا سکے اور پھر وہ مفت میں ٹکڑے تو نہیں توڑتی تھیں۔ تم جانتے ہو کہ وہ میرے لیے بڑا سہارا تھیں۔

شارق: (برہمی کے انداز میں) چچی جان! عدالت نے صرف آپ کی ذمہ داری مجھے سونپی ہے پوری ایک فوج کی نہیں۔

خدیجہ بیگم: اور میری ذمہ داری بھی کیوں نبھا رہے ہو۔ زہر دے دو قصہ پاک ہو جائے گا۔ (کچھ دیر خاموش رہ کر) شارق میاں یاد رکھو کہ میں تمھارے ٹکڑوں کی محتاج نہیں ہوں۔

شارق: میں جانتا ہوں کہ عالیہ بیگم آپ کو یہ سبق پڑھا گئی ہیں (مڑ کر کوریڈور کی طرف جاتے ہوئے) آپ کی ذمہ داری مجھ پر اسی وقت تک ہے جب تک آپ اس گھر میں ہیں۔ یہاں سے نکل جانے کے بعد مجھ پر کوئی ذمہ داری نہ ہوگی۔ کوریڈور میں چلا جاتا ہے پھر واپس خدیجہ بیگم کے پاس آ کر روپے کی طرف اشارہ کرکے) اور یہ روپیہ کیسا ہے۔

خدیجہ بیگم: عظمت خالا کا ہے امانت رکھ گئی ہیں۔

شارق: عظمت خالا کا! (طنزیہ مسکرا کر) یا عالیہ بیگم کو نذر کرنے کے لیے۔

خدیجہ بیگم: بخدا شارق میاں عظمت خالا کا ہے دو چار دن کے بعد آ کر لے جائیں گی۔ (شارق خاموش ہو کر سوچنے لگتا ہے۔ خدیجہ بیگم آہستہ آہستہ الماری کے پاس جاتی ہیں اس میں روپیہ رکھ کر تالا ڈالتی ہیں اور کوریڈور کی طرف جاتی ہیں شارق انھیں جاتا ہوا دیکھتا ہے)

شارق: چچی جان! (خدیجہ بیگم مڑ کر اسے دیکھتی ہیں۔ شارق ان کے قریب جا کر) عظمت خالا کل بلا وجہ الجھ پڑی تھیں اور پھر میرے کہنے کا مقصد یہ ہرگز نہیں تھا کہ وہ سچ مچ ہی گھر چھوڑ کر چلی جائیں۔

خدیجہ بیگم: (کوریڈور کی طرف بڑھتے ہوئے) اور کیا مطلب تھا۔ تمھارا ایسی سخت باتیں تو تمھارے چچا نے بھی ان سے نہیں کہی تھیں۔

طارق: مگر چچی جان! (خدیجہ بیگم مڑ کر دیکھتی ہیں) آپ خود دیکھ رہی ہیں کہ میں آج کل کس قدر پریشان ہوں۔ بزنس میں برابر گھاٹا ہو رہا ہے ایسے موقع پر کہیں دماغ ٹھیک سے کام کرتا ہے (خدیجہ بیگم خاموش رہتی ہیں) دن رات ایک کر رہا ہوں مگر کوئی راستہ دکھائی نہیں دیتا۔

خدیجہ بیگم: کہا کس نے تھا کہ اپنا کام چھوڑ کر دوسرا شروع کر دو— رہا روپے کا سوال تو تمھاری ماں کے پاس بہت ہے ان سے لے لو۔

شارق: (ہنس کر) وہ تو روپے کو ہوا بھی لگنے نہیں دیتیں بھلا مجھے دے دیں گی۔ (خدیجہ بیگم خاموش رہتی ہیں) ایک مہاجن کے پاس جا رہا ہوں شاید کوئی سبیل نکل آئے (دروازے کی طرف جاتا ہے پھر مڑ کر خدیجہ بیگم کی طرف دیکھ کر) اگر عظمت خالا آجائیں تو میری طرف سے معافی مانگ لیجیے گا۔

(کمرے سے باہر چلا جاتا ہے۔ خدیجہ بیگم پھر دروازے کی طرف آتی ہیں اور کواڑ بند کر کے کنڈی چڑھا دیتی ہیں کچھ دیر خاموش کھڑی رہتی ہیں پھر کوریڈور کی طرف بڑھتی ہیں کہ دروازے پر دستک سے ٹھہر جاتی ہیں اور مڑ کر دروازے کو دیکھتی ہیں پھر دستک کے ساتھ آواز— "عظمت خالا—" تیزی سے دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے)

خدیجہ بیگم: کون عالیہ؟ آرہی ہوں بیٹی۔ کنڈی کھول دیتی ہیں۔ عالیہ کمرے میں آکر جھک کر سلام کرتی ہے) جیتی رہو۔ تم گئی نہیں۔ مسلم میاں کہاں ہیں۔

عالیہ: ایک کتابوں کی دکان پر رک گئے تھے آرہے ہیں۔

31A

خدیجہ بیگم: مگر کل تو کہہ رہی تھی آج چلی جائے گی۔
عالیہ: گاڑی دو بجے جاتی ہے وہ کہنے لگے چل کر امی سے رخصت ہولیں۔
خدیجہ بیگم: بیٹھ نا۔ کھڑی کیوں ہے۔
عالیہ: (کمرے کے درمیان میں آتے ہوئے) یہ عظمت خالا پیپل کے نیچے بیٹھی کیا کررہی ہیں۔
خدیجہ بیگم: پیپل کے نیچے! (ٹھنڈی سانس بھر کر) شارق میاں نے انھیں گھر سے نکال دیا ہے۔
عالیہ: گھر سے نکال دیا ہے! کیوں۔
خدیجہ بیگم: (طنزیہ) ان کی جیب عظمت خالا کا بوجھ برادشت نہیں کرسکتی تھی۔
عالیہ: میں تو سمجھتی تھی کسی کام سے گئی ہیں تھک کر بیٹھ گئی ہوں گی (کچھ دیر خاموش رہ کر) ایک دن ان کی جیب آپ کا بوجھ بھی برداشت نہیں کرسکے گی (سوچتے ہوئے کھڑکی کے پاس جاتی ہے پھر مڑ کر خدیجہ بیگم کو دیکھ کر) امی شارق صاحب سے کسی قسم کی امید رکھنا فضول ہے۔ (خدیجہ بیگم خاموش رہتی ہیں اور قریب کے صوفے پر بیٹھ جاتی ہے۔ کچھ دیر ان کا چہرہ دیکھتی رہتی ہے پھر آہستہ سے) امی! کیا آپ خود کو تنہا محسوس نہیں کرتیں۔
خدیجہ بیگم: تنہا سی تنہا۔ (ٹھنڈی سانس بھر کر) عظمت خالا تو سچ مچ مجھے بیوہ کرکے چلی گئیں (عالیہ بھی کھڑی ہوجاتی ہے) بیٹھو بیٹی میں تمھارے لیے چائے بنا لاؤں۔
عالیہ: امی! چائے تو میں ابھی ہوٹل سے پی کر آرہی ہوں۔
خدیجہ بیگم: (آنکھوں میں آنسو بھر کر) خدا کو یہ بھی منظور تھا کہ گھر کی بیٹی ہوٹلوں میں کھاتی پیتی پھرے۔
عالیہ: آپ فکر نہ کیجیے، امی وہاں کوئی تکلیف نہیں ہے (کچھ دیر خاموش رہ کر) امی! آج انھوں نے عظمت خالا کو گھر سے نکالا ہے کل آپ سے چولھا پھنکوائیں گے

اور پرسوں آپ کو بھی رخصت کردیں گے۔

خدیجہ بیگم: (ٹھنڈی سانس بھر کر) قسمت میں جو لکھا ہے وہ پورا ہو کر رہے گا بیٹی۔

عالیہ: قسمت میں جو لکھا ہے وہ بعد میں دیکھا جائے گا یہ گھر آپ کے لیے جہنم بن گیا ہے خدا کے لیے میرا کہا مان لیجیے۔

خدیجہ بیگم: (کچھ دیر خاموش رہ کر) مجھ سے خود یہ گھر نہیں چھوڑا جائے گا (ٹھنڈی سانس بھر کر) اب شارق میاں ہی گھر سے نکال دیں تو دوسری بات ہے۔ ساری زندگی اسی گھر میں گزر گئی۔ رنج اٹھائے، خوشیاں دیکھیں (آنکھوں میں آنسو بھر کر) تیرے ابا حضور مجھے تو ابھی بھی اس گھر میں چلتے پھرتے نظر آتے ہیں۔

عالیہ: (کچھ دیر خاموش رہ کر) امی ایک دن انسان اتنی بڑی دنیا چھوڑ کر چلا جاتا ہے یہ تو گھر۔

خدیجہ بیگم: (کچھ دیر خاموش رہ کر) اب تو یہ دنیا ہی چھٹ جائے تو اچھا ہے، جانے کتنی لمبی زندگی ہے کہ ختم ہونے کا نام ہی نہیں لیتی۔

عالیہ: مگر امی۔

خدیجہ بیگم: (پھر بات کاٹ کر ٹھنڈی سانس بھر کر) شارق میاں کا کہنا ہے کہ ان کی ذمہ داری اسی وقت تک ہے جب تک میں اس گھر میں ہوں۔

عالیہ: (غصہ سے) اور اس طرح وہ آپ کو مجبور اور بے بس کر دینا چاہتے ہیں لات مارے امی ان چند ٹکڑوں پر۔ آپ کو مجبور دیکھ کر۔

خدیجہ بیگم: مجبوری۔ (کوریڈور کی طرف جاتے ہوئے) بیٹی تو بیٹھ۔ میں چائے لے آؤں۔ (آہستہ آہستہ بڑبڑاتی ہیں) عظمت خالا۔ عظمت خالا۔

عالیہ: اچھا آپ بیٹھیے میں بنا لاؤں گی۔

خدیجہ بیگم: نہیں (ٹھنڈی سانس بھر کر) عظمت خالا نہ سہی میں سہی۔ گھر کا کام کاج تو ہوگا ہی۔

عالیہ: آپ ٹھہریے تو (خدیجہ بیگم سنی ان سنی کرتی ہوئی کوریڈور میں پھر ایک دوسرے کمرے میں چلی جاتی ہیں۔ عالیہ تھوڑی دیر تو خاموش کھڑی رہتی ہے پھر کوریڈور کی طرف بڑھتی ہے کہ باہر ہچکیوں کی آواز عالیہ کچھ دیر کان لگا کر سنتی ہے۔ ہچکیوں سے رونے کی آواز برابر آتی رہتی ہے عالیہ دروازے کے پاس جاتی ہے اور باہر جھانکتی ہے پھر اک دم) ارے عظمت خالا۔ آیئے آیئے آپ باہر کیوں کھڑی ہیں آیئے نا (عظمت خالا اندر آتی ہیں اور عالیہ سے لپٹ کر رونے لگتی ہیں عالیہ گھبرا کر) کچھ کہیے تو کیا بات ہے۔

عظمت خالا: دلھن بیگم، میں بہو بیگم کو نہیں چھوڑ سکتی۔۔۔ میں۔۔۔ میں (آواز رندھ جاتی ہے کچھ دیر خاموش رہ کر) میرے بھی لڑکے ہیں بہو ہے اس کے بچے ہیں مگر وہ سب میرے لیے اجنبی ہیں غیر ہیں۔ میں ان میں زندہ نہ رہ سکوں گی۔

عالیہ: آپ بیٹھ جایئے (ہاتھ پکڑ کر صوفے پر بٹھلاتی ہے پھر خود ان کے پاس بیٹھ کر) آپ ان کے پاس نہ جایئے۔ کون کہتا ہے ان کے پاس جانے کو۔

عظمت خالا: شارق میاں نے تو مجھے گھر سے نکال دیا ہے۔

عالیہ: آپ میرے ساتھ چلیے وہاں آپ کو کوئی تکلیف نہ ہوگی۔

عظمت خالا: تکلیف! اب میرے لڑکے بھی ایسے گئے گزرے نہیں ہیں کہ مجھے تکلیف پہنچائیں، بہو زبان کی ضرور تیز ہے مگر دل کی بری نہیں (ٹھنڈی سانس بھر کر) مگر وہاں بہو بیگم کہاں ہوں گی۔ میں ان کو کیسے چھوڑ دوں سمجھ میں نہیں آتا۔

عالیہ: مگر عظمت خالا۔

عظمت خالا: (بات کاٹ کر) دلھن بیگم مجھے تو یاد بھی نہیں کہ اس گھر میں کب آئی تھی۔ (جذباتی انداز میں) یہاں مجھ سے ماؤں کی طرح محبت کی گئی۔ دلھن بیگم ماؤں کی طرح (حسرت سے) اب تو میری اولاد بھی میرے لیے اجنبی ہوگئی ہے۔

(ایک دم پھوٹ پھوٹ کر رونے لگتی ہیں۔ عالیہ کچھ اس طرح خاموش رہتی ہے جیسے اس کی سمجھ میں نہیں آرہا ہو کہ کیا کرے کچھ دیر بعد آہستہ سے)

عالیہ: عظمت خالا کسی کو گھر سے نکالا جاسکتا ہے مگر دلوں سے نہیں۔ آپ (خدیجہ بیگم چائے کی کشتی لیے ہوئے آتی ہیں۔ عالیہ انھیں دیکھ کر خاموش ہوجاتی ہے۔ عظمت خالا خدیجہ بیگم کو دیکھ کر)

عظمت خالا: ارے بہو بیگم (اٹھ کر تیزی سے ان کی طرف جاتے ہوئے) مجھے دو یہ کشتی بہو بیگم۔ مجھے یہ دن بھی دیکھنا تھا۔ (خدیجہ بیگم کے ہاتھ سے کشتی لینے کی کوشش کرتے ہوئے) لاؤ مجھے دو۔

خدیجہ بیگم: نہیں عظمت خالا اب یہ سب کچھ تو مجھ ہی کو کرنا ہوگا (کشتی عظمت خالا کو نہیں دیتی لاکر میز پر رکھ دیتی ہیں پھر عظمت خالا کو اس طرح دیکھتی ہیں جیسے وہ ان کے لیے اجنبی ہوں) عظمت خالا۔ تم۔ تم۔ تم تو ج—

عظمت خالا: بہو بیگم میں تمھیں اپنے ساتھ لے جانے کو آئی ہوں۔

خدیجہ بیگم: (ٹھنڈی سانس بھر کر) میری زندگی اور موت تو اسی گھر میں لکھی ہے، میں اسے چھوڑ کر کہاں جاؤں گی عظمت خالا۔

عظمت خالا: جہاں بھی میں جاؤں گی۔ ابھی تمھارے دو جیتے کتنے جوان بیٹے موجود ہیں۔ خدا کی قسم اگر انھوں نے تمھاری خدمت نہیں کی تو میں ان کا دودھ نہیں بخشوں گی۔

عالیہ: آپ دونوں میرے ساتھ کیوں نہیں چلتیں۔ کیا میں آپ دونوں کی خدمت نہیں کرسکتی۔

عظمت خالا: دلھن بیگم۔ بیٹی کے گھر کون جاکر پڑتا ہے۔ دنیا کیا کہے گی (شارق کمرے میں آتا ہے اس کے انداز سے معلوم ہوتا ہے کہ اس نے عظمت خالا کا آخری جملہ سن لیا ہے)

شارق: یہی کہے گی کہ میں نے چچی جان پر ظلم کیے تو وہ غیروں کے ٹکڑوں پر جاکر

پڑ گئیں اور کیا کہے گی۔

عالیہ: غیر! مسٹر شارق میں نے انھیں کبھی غیر نہیں سمجھا ماں سمجھا ہے۔

شارق: (طنزیہ) عالیہ بیگم اب تو چچا جان بھی نہیں رہے کہ جائداد پھر آپ کے نام منتقل کردیں عدالت اس پر میرا جائز حق تسلیم کرچکی ہے اور چچی جان کی کفالت میرے ذمے کی ہے اس لیے اب یہ ناٹک ختم ہی کر دیجیے۔

عالیہ: نہ جائداد کی مجھے پہلے ضرورت تھی اور نہ اب ہے وہ آپ ہی کو مبارک ہو۔ مجھے صرف امی کی ذات سے دلچسپی ہے۔

شارق: اب چچی جان کے پاس کوئی روپیہ نہیں ہے اور اگر ہے بھی تو میری مرضی کے خلاف اس گھر سے باہر نہیں جاسکتا جس دن چچی جان نے یہ گھر چھوڑ دیا میں ان کی ذمہ داری سے بری ہوجاؤں گا۔

عالیہ: (غصہ اور طنز سے) آپ بڑی ذمہ داری نبھا رہے ہیں عظمت خالا کو گھر سے نکال کر اس بڑھاپے میں انھیں نوکرانیوں سے بدتر بنا دیا ہے۔

شارق: یہ میرے گھر کا انتظام ہے آپ کو اس میں دخل دینے کی ضرورت نہیں۔

خدیجہ بیگم: تو چپ رہ بیٹی۔ قسمت میں جو لکھا ہے وہ پورا ہوگا۔

عالیہ: قسمت میں کچھ نہیں لکھا ہے امی۔ مسٹر شارق الٹا سیدھا لکھنے کی کوشش کررہے ہیں (خدیجہ بیگم کے پاس جاکر خوشامدانہ لہجے میں) امی! خدا کے لیے اس جہنم سے نکل چلیے آپ یہاں زندہ نہ رہ سکیں گی۔

خدیجہ بیگم: نہیں بیٹی۔ میری میت ہی اس گھر سے نکلے گی۔ دلھن بن کر کہاروں کے کاندھوں پر آئی تھی۔ چار مسلمانوں کے کاندھوں پر اس گھر سے نکلوں گی۔

شارق: (طنزیہ) سن لیا عالیہ بیگم۔ میرا خیال ہے کہ اب اس کے بعد اور کچھ کہنے کو نہیں رہا۔

عالیہ: (جذباتی انداز میں) پھر مجھے اس گھر سے کیوں نکال دیا امی! اس لیے کہ میں غیر ہوجاؤں۔ میں بھی چار مسلمانوں کے کاندھوں پر ہی نکلتی (عالیہ بیگم محبت

سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرتی ہیں مگر خاموش رہتی ہیں۔ آنکھوں میں آنسو آتے ہیں۔ شارق کچھ دیر خاموش رہ کر)

شارق: عالیہ بیگم یہ میرا گھر ہے عزاخانہ نہیں ایکٹنگ بہت ہوچکی اب اسے ختم کیجیے۔
(عالیہ شارق کی بات پر دھیان نہ دے کر برابر روتی رہتی ہے کہ مسلم کمرے میں آتا ہے اس کے ہاتھ میں دوچار کتابیں ہیں۔ پہلے اس ماحول کو سمجھنے کی کوشش کرتا ہے پھر عظمت خالا سے)

مسلم: عظمت خالا کیا بات ہے۔ (عظمت خالا خاموش رہتی ہیں مسلم کبھی عظمت خالا کو اور کبھی شارق کو دیکھتا ہے مسلم کچھ پریشان سا ہوکر) عالیہ کیا بات ہے۔

شارق: عالیہ بیگم چچی جان کو لے جانا چاہتی ہیں مگر وہ ان کے ساتھ جانے کو تیار نہیں۔

مسلم: (شارق کو سر سے پیر تک دیکھ کر) یا آپ انھیں اجازت نہیں دے رہے ہیں۔

شارق: یونہی سمجھ لیجیے۔ یہ تو آپ کو معلوم ہے کہ عدالت نے ان کی کفالت کی ذمہ داری میرے سپرد کی ہے۔

مسلم: لیکن عدالت نے یہ نہیں کہا ہے کہ وہ آپ کی قیدی ہیں ان کے کہیں آنے جانے پر پابندی ہے۔

شارق: میں نے ان پر کوئی پابندی نہیں لگائی ہے مگر غیروں کے یہاں آنا جانا کیا ضروری ہے۔ میں اسے پسند نہیں کرتا۔
(خدیجہ بیگم عالیہ کو چھوڑ کر مڑتی ہیں اور شارق کو دیکھ کر)

خدیجہ بیگم: عالیہ اور مسلم میاں میرے لیے غیر نہیں ہیں۔

شارق: آپ کے لیے نہ ہوں گے میرے لیے غیر ہیں۔ عالیہ بیگم نے دوسرا نکاح کرلیا ہے۔ اب اس گھر سے ان کا تعلق ختم ہو چکا ہے۔

خدیجہ بیگم: اس کا دوسرا نکاح ہم نے کرایا ہے (طنزیہ) اور پھر ان لوگوں نے میرے ساتھ یہ برتاؤ نہیں کیا کہ عظمت خالا کو گھر سے نکال کر مجھے نوکرانیوں سے بدتر کردیتے۔

مسلم: عظمت خالا کو گھر سے نکال دیا!

شارق: جی ہاں نکال دیا۔ میرا خیال ہے کہ آپ کو اس پر اعتراض کا حق نہیں۔

مسلم: جی ہاں قطعی نہیں (غصہ سے) مگر میرا یہ فرض ضرور ہے کہ آپ کو یاد دلاؤں کہ امی نے ابھی اپنا مہر معاف نہیں کیا ہے۔

شارق: (کسی قدر گھبرا کر) یہ آپ کیسے کہہ سکتے ہیں۔

مسلم: یہ مجھے معلوم ہے اور اگر ایسا نہ ہوتا تو آپ عظمت خالا کے ساتھ امی کو بھی گھر سے نکال چکے ہوتے (خدیجہ بیگم کی طرف دیکھ کر) آیئے امی چلیے خدا کی قسم آپ مجھ کو فرماں بردار پائیں گی۔ عظمت خالا بھی ساتھ چلیں گی۔

شارق: یہ چال چل کر آپ مجھ سے مہر وصول نہیں کرسکتے۔

مسلم: یہ امی کی نیکی ہے کہ آج تک وہ مہر کے معاملے میں خاموش ہیں اور جب تک وہ ہمارے ساتھ رہیں گی انھیں اس کی ضرورت بھی نہ ہوگی۔

شارق: لیکن چچی جان کہہ چکی ہیں کہ وہ اس گھر کو چھوڑنا نہیں چاہتیں۔

(مسلم خدیجہ بیگم کی طرف دیکھتا ہے مگر وہ خاموش رہتی ہیں ان کے چہرے سے معلوم ہوتا کہ وہ کشمکش میں مبتلا ہیں کہ کیا فیصلہ کریں)

عالیہ: امی شاید آپ ہمیں غیر سمجھتی ہیں (خدیجہ بیگم اب بھی خاموش رہتی ہیں پھر عظمت خالا کی طرف دیکھ کر) عظمت خالا آپ ہی سمجھایئے نا۔ (عظمت خالا بھی خاموش رہتی ہیں۔ عالیہ کبھی خدیجہ بیگم اور کبھی عظمت خالا کو دیکھتی ہے۔ کچھ دیر مکمل خاموشی رہتی ہے۔ مسلم عالیہ سے)

مسلم: آؤ عالیہ چلو (کچھ دیر عالیہ کھڑی رہتی ہے پھر آہستہ آہستہ دروازے کی طرف بڑھتی ہے۔ خدیجہ بیگم پہلے تو عالیہ کو دیکھتی ہیں پھر ایک دم پھوٹ کر رونے لگتی ہیں۔ عالیہ پلٹ کر ان سے لپٹ جاتی ہے اور اس کی ہچکیاں بندھ جاتی ہیں سب خاموش کھڑے رہتے ہیں کچھ دیر بعد مسلم عالیہ کے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر) آؤ عالیہ چلو۔

(عالیہ خدیجہ بیگم سے الگ ہوکر آہستہ آہستہ دروازے کی طرف بڑھتی ہے
خدیجہ بیگم چند سیکنڈ رک کر)

خدیجہ بیگم: —عالیہ (عالیہ ٹھہر جاتی ہے) تم عظمت خالا کو اپنے ساتھ لے جاؤ—
(عالیہ عظمت خالا کی طرف دیکھتی ہے مگر وہ خاموش کھڑی رہتی ہیں خدیجہ بیگم آہستہ آہستہ الماری کے پاس جاکر اس میں سے روپیہ نکالتی ہیں اور عظمت خالا کو دیتے ہوئے) اپنا روپیہ اپنے پاس رکھو میں اس کی حفاظت نہیں کرسکتی۔

شارق: (طنزیہ) عظمت خالا کو کیوں دے رہی ہو عالیہ بیگم کو ہی دے دونا۔ جن کی خاطر یہ سارا پلاٹ رچا جارہا ہے۔

خدیجہ بیگم: بخدا شارق میاں یہ روپیہ عظمت خالا کا ہے۔

شارق: کسی کا بھی ہو میرے گھر سے باہر نہیں جاسکتا۔

عظمت خالا: (نفرت آمیز لہجے میں) شارق میاں میں نے کوڑی کوڑی کرکے اپنی موت میت کے لیے جمع کیا ہے اگر تمھاری نیت بگڑ رہی ہے تو ضرور رکھ لو مگر خدا کے لیے بہو بیگم کی نیت پر شک کرکے انھیں ذلیل نہ کرو۔

شارق: عظمت خالا۔ میں ایسا بھولا نہیں ہوں کہ ان چالوں کو نہ سمجھتا ہوں۔

عالیہ: (طنز اور حقارت سے) جو اپنے اچھے خاصے چچا کو عدالت میں پاگل ثابت کرکے اس کی وصیت کی دھجیاں اڑا سکتا ہے، جو اپنے باپ کو عدالت میں کھڑے ہوکر آوارہ کہہ سکتا ہے، سچ مچ وہ بھولا بھالا نہیں ہوسکتا۔

شارق: (غصہ سے) عالیہ بیگم آپ میری چھت کے نیچے ہیں ورنہ—

مسلم: (بات کاٹ کر) ہم آپ کی چھت کے نیچے ہیں اسی لیے اپنی توہین کا جواب نہیں دے رہے ہیں (عالیہ ہاتھ پکڑ کر دروازے کی طرف جاتے ہوئے) آؤ عالیہ شرافت کی بھی ایک حد ہوتی ہے۔

(عالیہ کا ہاتھ پکڑے ہوئے کمرے سے چلا جاتا ہے۔ سب خاموش رہتے ہیں صرف خدیجہ بیگم کی ہچکیوں کی آواز آتی رہتی ہے۔ کچھ دیر بعد شارق تلخ

لہجے میں)

شارق: بس یہ رونا دھونا بند کیجیے مجھے یہ پسند نہیں۔

عظمت خالا: تمھیں تو کسی کا جینا بھی پسند نہیں (غصہ سے خدیجہ بیگم کے ہاتھ سے روپیوں کی گڈی لے کر شارق کی طرف بڑھاتے ہوئے) اگر میرے کفن کی ان دھجیوں سے تمھارا تن ڈھکتا ہو تو ڈھانک لو۔

شارق: (غصہ سے) عظمت خالا۔ میں آپ کی عزت کرتا ہوں۔

عظمت خالا: گھر سے نکال کر بڑی عزت بڑھائی ہے (آنکھوں میں آنسو بھر کر) خدا کی قسم کبھی عاصم میاں نے بھی مجھے الٹ کر جواب نہیں دیا۔

خدیجہ بیگم: (عظمت خالا کے ہاتھ سے روپیہ لینے کی کوشش کرتے ہوئے) مگر عظمت خالا یہ روپیہ تمھارا ہے۔تم۔

عظمت خالا: بہو بیگم زندگی بھر محنت کر کے کمایا ہے جو کچھ باقی ہے اس میں بھی محنت کرلوں گی کم از کم کوئی تمھیں مکار اور جھوٹی تو نہیں کہے گا۔

(غصہ سے روپیہ فرش پر پھینک کر دروازے کی طرف جاتی ہیں خدیجہ بیگم تیز تیز چل کر انھیں پکڑ لیتی ہیں)

خدیجہ بیگم: کہاں چلیں۔عظمت خالا خدا کی قسم میں زندہ نہیں رہوں گی۔

عظمت خالا: تم بھی میرے ساتھ چلو۔ بہو بیگم اگر اصیل ہوں تو تمھیں تکلیف نہ ہونے دوں گی زندگی بھر تمھاری خدمت کروں گی۔

خدیجہ بیگم: نہیں نہیں عظمت خالا۔تم اس گھر کو نہ چھوڑو۔ یہ تمھارا گھر ہے مجھ سے پہلے تم اس گھر میں تھیں یہ تمھارا گھر ہے۔

عظمت خالا: بہو بیگم میں نے تو یہی سوچا تھا کہ جنازہ ہی اس گھر سے نکلے گا مگر جہاں زندوں کی عزت نہ ہو وہاں مردوں کو کون پوچھے گا (کمرے سے چلی جاتی ہیں خدیجہ بیگم کے چہرے پر عجیب قسم کے تاثرات پیدا ہوتے ہیں کچھ دیر خاموش کھڑی رہتی ہیں پھر روپیوں کی گڈی اٹھا کر اسے اس طرح غور سے

دیکھتی ہیں جیسے اسے پہچاننے کی کوشش کررہی ہوں ایک دم اس گڈی کو شارق پر پھینکتی ہیں اور دوڑتی ہوئی کمرے سے باہر چلی جاتی ہیں۔ باہر سے عظمت خالا کی گھبرائی ہوئی آواز) بہو بیگم — آپ کا برقع۔

(پردہ)

تیسرا سین

منظر

(عالیہ اور مسلم کی مشترکہ خوابگاہ — دو مسہریاں جن کے درمیان ایک چھوٹی میز رکھی ہے جس پر ٹیبل لیمپ رکھا ہے دائیں جانب کی مسہری کے پاس دیوار سے لگی ایک چھوٹی سی ٹیبل ہے جس پر کچھ کتابیں بے ترتیب سی پڑی ہیں ان کے نیچے ایک دو فائلیں دبی ہوئی نظر آرہی ہیں۔ بائیں جانب کی مسہری کے پاس ایک سنگھار میز ہے جس پر سنگھار کا مختصر سامان بکھرا ہوا ہے اس میز سے تھوڑے ہٹ کر ایک دروازہ ہے جو دوسرے دروازے میں کھلتا ہے اس پر ہلکے سبز رنگ کا دبیز پردا پڑا ہے اس دروازے کے بالمقابل ایک اور دروازہ ہے جو ایک برآمدے میں کھلتا ہے اس پر بھی ویسا ہی پردہ پڑا ہے اس دروازے سے ذرا ہٹ کر ایک صوفہ سیٹ رکھا ہے۔ سائڈ ٹیبل پر ایش ٹرے اور ماچس پڑی ہے اور گل دان میں تازہ پھول سجے ہوئے ہیں صبح کا وقت اور سردی کا موسم ہے۔

عالیہ صوفے پر بیٹھی سوئٹر بن رہی ہے کہ خدیجہ بیگم کمرے میں آتی ہیں ان کی چال اور چہرے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ رات بھر جاگتی رہیں اور تھکی ہوئی ہیں۔ عالیہ کو پہلے تو ان کے آنے کا علم نہیں ہوتا مگر جب بالکل قریب آجاتی ہیں تو وہ نظریں اٹھا کر انھیں دیکھتی ہے۔ خدیجہ بیگم پہلے تو اسے غور سے دیکھتی ہیں پھر کسی قدر معاندانہ لہجے میں۔

خدیجہ بیگم: تم نے امجد کی تصویر کہاں رکھ دی میں صبح سے ڈھونڈتی پھر رہی ہوں۔

عالیہ: (حیرت سے ان کا چہرہ دیکھ کر) ان کی تو یہاں کوئی تصویر ہے ہی نہیں آپ بلاوجہ —

خدیجہ بیگم: (بات کاٹ کر) کیوں نہیں ہے۔ مسلم میاں نے تو کہا تھا کہ وہ تصویر لادیں گے۔

عالیہ: وہ شارق صاحب سے۔

خدیجہ بیگم: اس کا نام میرے سامنے نہ لو اس نے عظمت خالا کے روپے ہضم کر لیے۔ مجھے گھر سے نکال دیا وہ امجد کی تصویر کیوں دینے لگا تجھے اس کی تصویر اپنے پاس رکھنا چاہیے تھی۔

عالیہ: (اون اور سوئٹر صوفے پر ایک طرف رکھ کر) امی! مجھے—؟ (ٹھنڈی سانس بھر کر) اب میں رکھ کر بھی کیا کرتی (آہستہ آہستہ برآمدے کے دروازے کی طرف جاتی ہے۔ خدیجہ بیگم سوئٹر اٹھا کر اسے غور سے دیکھنے لگتی ہیں۔ عالیہ دروازے پر پڑا ہوا پردہ برابر کرتی ہے پھر مڑ کر خدیجہ بیگم کو دیکھ کر) شوہر مرنے کے بعد غیر ہو جاتا ہے۔

خدیجہ بیگم: بیٹا تو غیر نہیں ہو جاتا۔

عالیہ: (خدیجہ کی طرف آتے ہوئے) انھوں نے کہا تو ہے کہ وہ شارق صاحب سے ایک تصویر حاصل کرنے کی کوشش کریں گے۔

خدیجہ بیگم: مگر مسلم خود تین دن سے غائب ہیں (ٹھنڈی سانس بھر کر) اپنے پھر اپنے ہوتے ہیں۔

عالیہ: وہ پروفیسر کرمانی سے ملنے گئے ہیں واپسی میں شارق صاحب سے ملتے ہوئے آئیں گے آپ تو بلا وجہ— (کچھ دیر رک کر) وہ آپ کو ماں کی جگہ پر سمجھتے ہیں۔

خدیجہ بیگم: اگر وہ مجھے ماں سمجھتے ہیں تو امجد کی تصویر کیوں نہیں لا دیتے۔

عالیہ: وہ شارق صاحب سے ضرور ملیں گے اگر انھوں نے تصویر دے دی تو لے آئیں گے تصویر ان کے پاس تو ہے نہیں۔

خدیجہ بیگم: (ٹھنڈی سانس بھر کر) جانے کب آئیں گے۔ تم سمجھتی ہو کہ شارق تصویر

دے دے گا۔

عالیہ: کیوں نہیں۔ تصویر ان کے کس کام کی ہوگی۔

خدیجہ بیگم: اگر نہیں بھی ہوگی تو وہ بنا لے گا۔ (دروازے کی طرف جاتے ہوئے) ایک بے سہارا بیوہ کی کس کو فکر ہوتی ہے۔

عالیہ: امی — یہ سوئٹر۔

خدیجہ بیگم: ہاں — (ٹھہر جاتی ہیں اور مڑ کر عالیہ کو دیکھ کر) یہ رنگ امجد کو بے حد پسند تھا۔ یہ سوئٹر تو کس کے لیے بُن رہی ہے۔ عالیہ خاموش رہتی ہے خدیجہ بیگم بے حد جذباتی انداز میں) میں تجھے یہ سوئٹر نہیں بننے دوں گی۔

(خدیجہ بیگم اون اور سوئٹر لیے ہوئے دوسرے کمرے میں چلی جاتی ہیں عالیہ خاموش کھڑی انھیں دیکھتی رہتی ہے اس کے چہرے سے الجھن اور مایوسی کا اظہار ہوتا ہے کچھ دیر بعد عظمت خالا کمرے میں آتی ہیں۔ ان کے ہاتھ میں الجھا ہوا اون اور ادھڑا ہوا سوئٹر ہے اون اور سوئٹر عالیہ کی نظروں کے سامنے کرتے ہوئے)

عظمت خالا: دلھن بیگم تمھیں بار بار سمجھایا کہ چیزوں کو یوں اِدھر اُدھر نہ ڈال دیا کرو دیکھو تو انھوں نے کیا گت بنا دی۔

عالیہ: میں نے اِدھر اُدھر نہیں ڈالا تھا عظمت خالا (شکست خوردہ لہجے میں) وہ یہیں سے اٹھا کر لے گئی تھیں۔

عظمت خالا: اور تم نے لے جانے دیا جانتے ہوئے کہ ان کا دماغ ٹھیک نہیں ہے (عالیہ خاموش رہتی ہے عظمت خالا سوالیہ نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے) کیوں لے گئی تھیں۔

عالیہ: وہ نہیں چاہتیں کہ یہ سوئٹر بُنا جائے۔ (کچھ دیر خاموش رہ کر) اب میرا دل بھی اس کی طرف سے پھیکا پڑ گیا ہے۔

عظمت خالا: (حیرت سے) کیوں؟ اس قدر چاؤ سے تو تم مسلم میاں کے لیے بن رہی

تمھیں اب کیوں کیڑے پڑ گئے۔

عالیہ: میں اور اون لے آؤں گی۔ کوئی دوسرا شیڈ (حسرت سے الجھے ہوئے اون کو عظمت خالا کے ہاتھ میں دیکھتے ہوئے) امی نہیں چاہتیں کہ اس شیڈ کا بنایا جائے (عظمت خالا سوالیہ نظروں سے دیکھتی ہیں۔ عالیہ کچھ دیر خاموش رہ کر ٹھنڈی سانس بھر کر) یہ شیڈ امجد کو پسند تھا۔

عظمت خالا: دلھن بیگم، ان کے دماغ کو تو جانے کیا ہوگیا ہے۔ تم کہاں تک ان کی ہاں میں ہاں ملاتی رہو گی۔ (عالیہ خاموش رہتی ہے) مسلم میاں اس رنگ کو پسند کر چکے ہیں وہ کیا کہیں گے۔ (عالیہ اب بھی خاموش رہتی ہے۔ عظمت خالا کچھ دیر خاموش رہ کر) مسلم میاں کب تک آنے کا کہہ گئے تھے۔

عالیہ: آج آجائیں گے۔ واپسی پر شارق صاحب سے بھی ملنا ہے (عظمت خالا سوالیہ نظروں سے عالیہ کو دیکھتی ہیں) امی نے کہا تھا کہ وہ شارق صاحب سے امجد کی تصویر لادیں۔

عظمت خالا: وہ تو دے چکے (عظمت خالا سوچتے ہوئے) جب تک اللہ بخشے عاصم میاں زندہ رہے وہ امجد میاں کو بھول سی گئی تھیں۔ مگر اب تو بار بار انھی کو یاد کرتی ہیں اور پھر جیسے ان پر دورہ سا پڑ جاتا ہے۔ (کچھ دیر خاموش رہ کر) دلھن بیگم اسی رنگ کا تم اور اون لے آؤ یہ تو انھوں نے برباد کردیا۔

عالیہ: (ٹھنڈی سانس بھر کر) نہیں عظمت خالا اب میں اس شیڈ کا سوئٹر نہیں بنوں گی۔ (کچھ دیر خاموش رہ کر) امی کیا کر رہی ہیں۔

عظمت خالا: رونے کے علاوہ اور انھیں کام ہی کیا ہے۔

عالیہ: (ٹھنڈی سانس بھر کر) بے چاری امی کتنی دکھی ہیں۔ دیکھتے دیکھتے ان کی ساری دنیا مٹ گئی۔

عظمت خالا: دلھن بیگم تم ان کے لیے بڑا سہارا ہو۔ نہیں تو وہ ـــــ

(خدیجہ بیگم پاگلوں کی طرح کمرے میں آتی ہیں۔ عظمت خالا انھیں دیکھ کر

خاموش ہوجاتی ہیں عظمت خالا کے ہاتھ سے اون اور سوئٹر چھین کر اسے اور الجھاتے ہوئے)

خدیجہ بیگم: نہیں۔ میں یہ سوئٹر نہیں بننے دوں گی۔

عظمت خالا: — بہو بیگم— تم—

خدیجہ بیگم: (بات کاٹ کر) تم چپ رہو جی— شارق میاں نے تمہاری امانت چھین لی تو کیا میں تمہاری قرض دار ہوگئی۔

عظمت خالا: بہو بیگم تم بھی کہاں کا رونا لے بیٹھیں۔ خدا گواہ ہے کہ—

خدیجہ بیگم: (بات کاٹ کر) بس بس میں سب کچھ سمجھتی ہوں میرے پاس کچھ نہیں ہے (پھوٹ پھوٹ کر رونے لگتی ہیں) شاید زندگی میں کچھ نیکیاں کی ہوں وہ ساری کی ساری لے لو مگر مجھے سکون سے مرجانے دو۔

عالیہ: مگر امی عظمت خالا تو۔

خدیجہ بیگم: (عالیہ کی طرف مڑ کر بات کاٹتے ہوئے) ارے بس تم بھی چپ رہو۔ گھر میں گھستے ہی میرے بیٹے کو چٹ کر گئیں (عالیہ چند سیکنڈ ان کے چہرے کو حیرت سے دیکھتی اور پھر ایک دم ہچکیوں سے رونے لگتی ہے) ارے اب رونے کیا لگیں سچ تو کہہ رہی ہوں تم اتنی—

عظمت خالا: (غصہ سے) بس خاموش رہو۔ تمہیں تو—

(عالیہ عظمت خالا کے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر انھیں خاموش کر دیتی ہے اور اپنی ہچکیوں پر قابو پانے کی کوشش کرتی ہے۔ خدیجہ بیگم پھر اون الجھانے میں مشغول ہوجاتی ہیں کچھ دیر بعد اون صوفے پر پھینک کر عالیہ کو دیکھتی ہیں جو اپنے آنسو پونچھ رہی ہے۔ چند سیکنڈ اسے دیکھتی رہتی ہیں پھر ایک دم خود بھی پھوٹ پھوٹ کر رونے لگتی ہیں۔ عالیہ ان کے پاس جاکر)

عالیہ: آپ بیٹھ جایئے امی۔ میں یہ سوئٹر اب نہیں بنوں گی (خدیجہ بیگم برابر روتی رہتی ہیں) امی آپ کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے (ہاتھ پکڑ کر دوسرے کمرے میں

لے جاتے ہوئے) آیئے آپ آرام کیجیے۔

(عالیہ سہارا دے کر انھیں دوسرے کمرے میں لے جاتی ہے۔ عظمت خالا کمرے میں تنہا رہ جاتی ہیں کاندھے پر پڑے ہوئے کپڑے سے صوفے کو صاف کرتی ہیں کہ باہر موٹر کا ہارن بجتا ہے۔ برآمدہ والے دروازے کے پاس جاکر اس کا پردہ اٹھاتی ہیں کہ کچھ دیر بعد مسلم کمرے میں آتا ہے اور عظمت خالا کو دیکھ کر)

مسلم: عظمت خالا آداب۔

عظمت خالا: جیتے رہو۔ خیریت سے تو رہے۔

مسلم: خدا کا شکر ہے۔ عالیہ کہاں ہے۔

عظمت خالہ: بہو بیگم کے پاس۔ ابھی ابھی ان کو دورا پڑ گیا تھا۔ (غیر اختیاری طور پر صوفے پر پڑے ہوئے اون کی طرف دیکھتی ہیں۔ مسلم کی نظر بھی اس پر پڑتی ہے مگر وہ خاموش رہتا ہے عظمت خالا اس کا دھیان دوسری طرف ہٹانے کے انداز میں) دلھن بیگم تو کہہ رہی تھیں آپ شام تک آئیں گے۔

مسلم: جی ہاں— کہہ تو شام ہی کا گیا تھا کام ہوگیا تو جلدی چلا آیا— امی کی طبیعت—

عظمت خالا: اب تو ٹھیک ہے (کچھ دیر خاموش رہ کر) بیٹے اور شوہر کے غم کو تو کسی طرح برداشت کرلیا مگر شارق میاں کے برتاؤ نے ان کا دماغ بالکل الٹ دیا ہے (طنزیہ مسکرا کر) مجھ سے کہہ رہی تھیں اپنی امانت کے بدلے میری ساری نیکیاں لے لو۔

مسلم: اچھا۔ (طنزیہ انداز میں) شارق صاحب جیسا لالچی اور کینہ پرور میں نے آج تک نہیں دیکھا (سوچتے ہوئے) امی کی اس حالت نے عالیہ کی نفسیات پر بھی گہرا اثر ڈالا ہے۔ (کچھ دیر خاموش رہ کر) آپ کا کتنا روپیہ تھا جو شارق صاحب نے ہضم کرلیا۔

عظمت خالا: (ٹھنڈی سانس بھر کر) گنتی حساب تو مجھے آتا نہیں پر سو بیسی تھے—

مسلم: سو بیسی— (عظمت خالا خاموش رہتی ہیں۔ مسلم سوچتے ہوئے) دو ہزار

عظمت خالا: ہزاروں کی بات تو میں جانتی نہیں پر تھے سو بیسی (پر امید لہجے میں) کیا آپ شارق میاں سے ملے تھے (مسلم اثبات میں سر ہلاتا ہے عظمت خالا مسلم کا چہرہ دیکھتے ہوئے) کیا روپے کی بات چیت ہوئی تھی۔

مسلم: نہیں عظمت خالا کوئی بات نہیں ہوئی ان جیسے آدمی سے معقول بات کرنا اور معقول بات کی امید رکھنا فضول ہے (عظمت خالا کے چہرے پر مایوسی چھا جاتی ہے مگر خاموش رہتی ہیں مسلم ان کے چہرے کو غور سے دیکھتا ہے پھر جیسے ان کی دلی کیفیات کا اندازہ کر کے بات ٹالنے کے انداز میں) ذرا عالیہ کو تو بلا دیجیے۔

(عظمت خالا خاموشی سے دوسرے کمرے میں چلی جاتی ہیں۔ مسلم صوفے کے پاس والی میز پر سے ماچس اٹھا کر سگریٹ جلاتا ہے اور آہستہ آہستہ اس کے کش لیتا ہے پھر الجھے ہوئے اون کو اٹھا کر دیکھنے لگتا ہے کہ عالیہ کمرے میں آتی ہے مسلم کے ہاتھ میں اون دیکھ کر پہلے تو ٹھٹھکتی ہے پھر مصنوعی مسکراہٹ چہرے پر پیدا کر کے)

عالیہ: میں تو شام تک آپ کو ایکسپیکٹ کر رہی تھی۔

مسلم: (مسکرا کر) اور میں بلائے بے درماں کی طرح پہلے ہی نازل ہو گیا (اون کی طرف اشارہ کر کے مسکراتے ہوئے) آپ نے یہ کوئی نیا نمونہ ایجاد فرمایا ہے۔

عالیہ: (مایوسی سے) میں نے نہیں۔ امی نے۔

مسلم: امی نے!

عالیہ: جی ہاں (مسلم سوالیہ نظروں سے عالیہ کا چہرہ دیکھنے لگتا ہے عالیہ کچھ دیر خاموش کھڑی رہتی ہے پھر آہستہ آہستہ کمرے کے دروازے کے پاس جاتی ہے اس میں اندر جھانکتی ہے دروازے کا پردہ برابر کرتی ہے پھر مسلم کے پاس

آ کر) امی نہیں چاہتیں کہ یہ سوئٹر بنا جائے۔

مسلم: کیوں کیا ہوا۔

عالیہ: (ٹھنڈی سانس بھر کر) یہ شیڈ امجد کو پسند تھا اب کسی اور کو اس کے استعمال کا حق نہیں (مسلم اون صوفے پر ڈال کر آہستہ آہستہ کمرے میں ٹہلنے لگتا ہے کچھ دیر بعد عالیہ مسلم کو دیکھ کر) امی بار بار آپ کا پوچھ رہی تھیں (مسلم سگریٹ کا گہرا کش لے کر کھڑا ہو جاتا ہے اور عالیہ کا چہرہ دیکھنے لگتا ہے) آپ شارق صاحب سے ملے تھے۔

مسلم: اوہ ہاں (برآمدے والے دروازے سے باہر چلا جاتا ہے کچھ دیر بعد واپس آ کر ایک فریم کی ہوئی تصویر عالیہ کی طرف بڑھاتے ہوئے) انھوں نے یہ تصویر دے دی ہے۔

عالیہ: (تصویر پر نظر ڈال کر) نہیں نہیں (جذباتی انداز میں) آپ یہ تصویر کیوں لائے کیا اور کوئی تصویر نہیں تھی۔

مسلم: انھوں نے جو تصویر دی میں لے آیا۔

عالیہ: کیا آپ پسند کریں گے یہ تصویر آپ کے ڈرائنگ روم میں سجائی جائے۔

مسلم: عالیہ میں جذباتی انسان نہیں ہوں— میں

عالیہ: (بات کاٹ کر) مگر میں تو جذباتی انسان ہوں— اس کی موجودگی

مسلم: عالیہ یہ تمھاری شادی کی تصویر ہے ظاہر ہے کہ اس سے بہت سی یادیں وابستہ ہوں گی مگر دوسری شادی کرنا نہ تو جرم ہے اور نہ مرے ہوئے شوہر سے محبت گناہ۔

عالیہ: مگر

مسلم: (بات کاٹ کر) تم جب امجد کو یاد کرتی ہو اس کی روح کو سکون ملتا ہوگا (عالیہ مشکوک نظروں سے مسلم کو دیکھتی ہے) یقین کرو عالیہ مجھے اس سے کوئی شکایت نہیں۔ مردوں کو ہماری محبت اور دعاؤں کی ضرورت ہوتی ہے، دشمنی

اور رقابت کی نہیں۔

عالیہ: بہت زیادہ حقیقت پسندی زندگی نہیں ہے۔

مسلم: (ہنس کر) فلسفہ بگھارتی ہوئی عورتوں کو دیکھ کر جانے کیوں مجھے اپنی دادی اماں یاد آجاتی ہیں (تصویر اس کے ہاتھ میں دے کر) جاؤ امی کو دے آؤ (پھر کچھ سوچ کر) اچھا لاؤ میں ہی۔

(خدیجہ بیگم کمرے میں آتی ہیں مسلم انھیں دیکھ کر خاموش ہوجاتا ہے اور ادب سے جھک کر سلام کرتا ہے۔ خدیجہ بیگم اس کے سلام پر دھیان نہ دے کر)

خدیجہ بیگم: مسلم میاں بڑی راہ دکھلائی۔ کہاں رہ پڑے تھے۔

مسلم: (مسکرا کر) امی تیسرے ہی دن تو لوٹ آیا۔

خدیجہ بیگم: اور تین دن کیا کم ہوتے ہیں (عالیہ کی طرف دیکھ کر) چائے لانا۔ تھکے ہارے آئے ہیں (عالیہ خاموشی سے دوسرے کمرے میں چلی جاتی ہے) تین راتوں سے جاگ رہی ہوں۔

مسلم: (مسکرا کر) تین دن کا کہہ کر گیا تھا تین دن میں لوٹ آیا (ایک دم جیسے کچھ یاد آجانے پر بلند آواز سے) عالیہ۔ ارے عالیہ (عالیہ کمرے میں آتی ہے) تصویر کہاں ہے (خدیجہ بیگم کی طرف دیکھ کر) امی شارق صاحب نے تصویر دے دی ہے۔

خدیجہ بیگم: اچھا میں تو سمجھی تھی، نہیں دیں گے (عالیہ کی طرف دیکھ کر) لا بیٹی تو بتا کہاں ہے وہ تصویر۔

(عالیہ کے چہرے پر ہچکچاہٹ ظاہر ہوتی ہے مسلم عالیہ کی طرف دیکھ کر)

مسلم: کہاں ہے وہ تصویر جاؤ لے آؤ۔

(عالیہ پھر واپس دوسرے کمرے میں چلی جاتی ہے۔ خدیجہ بیگم صوفے پر بیٹھ جاتی ہیں کہ ان کی نظر الجھے ہوئے اون پر پڑتی ہے کچھ دیر خاموش رہتی ہیں اور آنکھوں میں آنسو آجاتے ہیں۔ کچھ دیر خلا میں گھورتی رہتی ہیں

پھر آنسو پونچھ کر)

خدیجہ بیگم: یہ رنگ امجد کو بے حد پسند تھا (سوچتے ہوئے) جانے اس کی یاد اب مجھے کیوں ستانے لگی ہے (مسلم خاموش رہتا ہے خدیجہ بیگم شرمندگی کے لہجے میں) جانے مجھے کیا ہو جاتا ہے (اس طرح مسکرا کر جیسے خود پر طنز کر رہی ہوں) میں بھی کیا پاگل ہوئی ہوں اب کیا کسی کو یہ رنگ پسند کرنے کا حق نہیں۔ بلا وجہ کا نقصان کر دیا۔

مسلم: امی مجھے خود یہ شیڈ (عالیہ کمرے میں آتی ہے مسلم عالیہ کی طرف دیکھ کر) لے آئیں (عالیہ کے ہاتھ سے تصویر لے کر خدیجہ بیگم کے پاس جاتا ہے اور تصویر ان کی طرف بڑھا کر) یہ لیجیے امی—

(خدیجہ بیگم تصویر مسلم کے ہاتھ سے لیتی ہیں اسے بڑے پیار اور محبت سے دیکھتی رہتی ہیں پھر کھڑی ہو کر دونوں مسہریوں کے درمیان رکھی میز پر لے جا کر رکھ دیتی ہیں کچھ دیر یوں خاموش کھڑی رہتی ہیں جیسے پرانی یادوں میں کھو گئی ہوں پھر مڑ کر مسلم اور عالیہ کو دیکھتی ہیں اور مسکراتی ہیں۔ ایک دم جیسے کچھ یاد آ جانے پر عالیہ سے)

خدیجہ بیگم: ارے میں تو بھی تھی کہ تو چائے بنانے گئی ہے اچھا ٹھہر میں بنائے لاتی ہوں۔
(دروازے کی طرف جاتی ہیں)

مسلم: آپ رہنے دیجیے مجھے ابھی لباس تبدیل کرنا ہے۔
(دوسرے کمرے میں چلا جاتا ہے خدیجہ بیگم کچھ دیر بعد سوچتے ہوئے)

خدیجہ بیگم: میں تو سمجھتی تھی کہ شارق میاں تصویر نہیں دیں گے (عالیہ خاموش رہتی ہے۔ خدیجہ بیگم نظریں اٹھا کر عالیہ کو دیکھتی ہیں جس کی آنکھوں میں آنسو ہیں) ارے تو رونے کیوں لگی۔

عالیہ: اس تصویر کو آپ اپنے کمرے میں ہی رکھ لیجیے۔

(خدیجہ بیگم کچھ کہنے ہی والی ہوتی ہیں کہ عظمت خالا چائے کی کشتی لیے داخل

ہوتی ہیں اور خدیجہ بیگم کی طرف دیکھ کر)

عظمت خالا: مسلم میاں کہاں گئے۔ میں تو ان کے لیے چائے لائی تھی۔ (عالیہ کی طرف دیکھتی ہیں جو آنسو پونچھ رہی ہیں) اب کیا ہوگا (عالیہ کی نظریں میز پر رکھی ہوئی تصویر کی طرف اٹھ جاتی ہیں عظمت خالا بھی تصویر کی طرف دیکھتی ہیں۔ کشتی صوفے کے پاس میز پر رکھ دیتی ہیں اور عالیہ کی طرف دیکھ کر) یہ تصویر دی ہے شارق میاں نے؟

خدیجہ بیگم: ارے جو تصویر تھی دے دی۔ اب تم اس میں بھی کیڑے نکالنے لگیں۔

عظمت خالا: اور یہ تصویر یہاں سجائی جائے گی۔

خدیجہ بیگم: تو کون سا پہاڑ ٹوٹ پڑے گا۔ تصویر سجانے کے لیے ہی ہوتی ہے۔

عظمت خالا: بہو بیگم آخر تمھیں ہو کیا گیا ہے۔ تمھارے بیٹے کی تصویر ہے اپنے کمرے میں لے جا کر سجا لو۔ اس کمرے میں۔

خدیجہ بیگم: (بات کاٹ کر) اچھا بس اب چپ رہو۔ اب تم سے دبنے والی نہیں ہوں۔ میں نے تمھاری امانت کا بدلہ چکا دیا ہے (غصہ سے) یہ تصویر یہیں رہے گی اور ضرور رہے گی۔

عظمت خالا: چاہے اس سے۔

عالیہ: (بات کاٹ کر) رہنے دیجیے عظمت خالا۔ اگر امی بضد ہیں تو اسے یہیں رہنے دیجیے۔ (اس کے انداز سے معلوم ہوتا ہے کہ اب وہ دھاڑیں مار کر رو دے گی مگر ضبط کرنے کی کوشش کر رہی ہے پھر آنسو پونچھتی ہوئی تیزی سے دوسرے کمرے میں جاتے ہوئے) اسے یہیں رہنے دیجیے۔ عظمت خالا یہیں رہنے دیجیے۔

(دوسرے کمرے میں چلی جاتی ہے۔ کچھ دیر خاموش رہتی ہے پھر عظمت خالا میز پر سے تصویر اٹھا کر دوسرے کمرے کی طرف جاتی ہیں)

خدیجہ بیگم: کہاں لے چلیں تصویر۔ (تصویر ان کے ہاتھ سے لینے کی کوشش کرتے ہوئے)

لاؤ تصویر مجھے دو—

عظمت خالا: میں تمھارے کمرے میں رکھنے جارہی ہوں (رک کر خدیجہ بیگم کے چہرے کو دیکھ کر) بچی نہ بنو۔ تم نے دلھن بیگم کی دوسری شادی اس لیے نہیں کی ہے کہ وہ سہاگن ہوتے ہوئے رنڈاپا محسوس کرتی رہیں۔

خدیجہ بیگم: رنڈاپا کیوں محسوس کرنے لگی۔ خدا اس کا سہاگ قائم رکھے۔

عظمت خالا: اور اس کی تصویر دن رات دیکھ کر نہال ہوتی رہیں گی۔ مسلم میاں آخر مرد ہیں ایک نہ ایک دن—

(عظمت خالا خاموش ہوجاتی ہیں۔ خدیجہ بیگم یوں بے حس و حرکت ہوجاتی ہیں جیسے ان پر بجلی گر پڑی ہو۔ کچھ دیر دونوں خاموش رہتی ہیں خدیجہ بیگم کی آنکھوں میں آنسو آجاتے ہیں کچھ دیر بعد آنسو پونچھ کر)

خدیجہ بیگم: عظمت خالا۔ یہ تصویر مجھے دے دو خدا کی قسم میں اسے سینے سے لگائے لگائے مرجاؤں گی مگر—

(ایک دم ہچکیوں سے رونے لگتی اسی وقت مسلم لباس تبدیل کرکے کمرے میں آتا ہے اور خدیجہ بیگم کو روتے دیکھ کر)

مسلم: کیا بات ہے امی (خدیجہ بیگم برابر روتی رہتی ہیں۔ مسلم عظمت خالا کی طرف دیکھ کر) کیا ہوا عظمت خالا (عظمت خالا خاموشی سے تصویر اس کے سامنے کردیتی ہیں) یہ تصویر آپ نے میز پر سے کیوں اٹھالی۔

خدیجہ بیگم: یہ تصویر یہاں نہیں رہے گی (مسلم سوالیہ نظروں سے کبھی خدیجہ بیگم اور کبھی عظمت خالا کو دیکھتا ہے) عظمت خالا یہ تصویر مجھے دے دو (بڑھ کر عظمت خالا کے ہاتھ سے تصویر لے لیتی ہیں۔ کچھ دیر بڑی محبت سے اسے دیکھتی رہتی ہیں پھر ایک دم جیسے ان پر دورا پڑ گیا ہو) نہیں نہیں یہ تصویر گھر میں بھی نہیں رہے گی۔

(پاگلوں کی طرح دروازہ کے پاس جاتی ہیں پردہ ہٹاتی ہیں اور تصویر

برآمدے میں پھینک دیتی ہیں۔ شیشہ ٹوٹنے کی آواز آتی ہے پھر ہچکیوں سے رونے لگتی ہیں۔ مسلم آگے بڑھ کر انھیں سہارا دیتے ہوئے)

مسلم: آیئے امی آپ بیٹھ جایئے آپ کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے (انھیں سہارا دے کر صوفے پر لاکر بٹھلا دیتا ہے اور عظمت خالا کی طرف دیکھ کر) وہ تصویر اٹھا لایئے اس میں دوسرا فریم لگوا دیا جائے گا۔

خدیجہ بیگم: نہیں نہیں— (پرسکون ہوکر خلا میں گھورتے ہوئے) میں دنیا سے خالی ہاتھ جانا چاہتی ہوں (ٹھنڈی سانس بھر کر) اپنی نیکیاں میں نے پہلے ہی عظمت خالا کو دے دی ہیں۔ اب دل میں کسی کی محبت رکھ کر بھی کیا کروں گی۔

مسلم: (عظمت خالا کی طرف دیکھ کر) نیکیاں! کیسی نیکیاں؟

عظمت خالا: یہ تو سٹھیا گئی ہیں (خدیجہ بیگم کا ہاتھ پکڑ کر) آؤ چلو۔

(خدیجہ بیگم اس طرح کھڑی ہوتی ہیں جیسے ان کے جسم میں طاقت نہ ہو عظمت خالا کا سہارا لے کر دوسرے کمرے میں چلی جاتی ہیں مسلم خاموش کھڑا رہتا ہے۔ سگریٹ جلا کر اس کے دو چار کش لیتا ہے پھر میز پر رکھی کیتلی کو دیکھ کر)

مسلم: عالیہ (ذرا اور بلند آواز سے) ارے عالیہ— (کچھ دیر بعد عالیہ کمرے میں آتی ہے مسلم اسے دیکھ کر) ارے بھائی ایک پیالہ چائے تو دو— (عالیہ خاموشی سے صوفے پر بیٹھ کر چائے بنانے لگتی ہے مسلم کچھ دیر خاموش رہ کر) یہ نیکیاں دینے کا کیا قصہ ہے (عالیہ نظریں اٹھا کر مسلم کو دیکھتی ہے) امی ابھی کچھ ایسی ہی بات کہہ رہی تھیں۔

عالیہ: (پھیکی اور غمگین مسکراہٹ سے) انھوں نے اپنی نیکیاں عظمت خالا کی امانت کے بدلے انھیں دے دی ہیں۔

مسلم: کیا انھوں نے اس کا مطالبہ کیا تھا۔

عالیہ: (نفی میں سر ہلاتے ہوئے) نہیں۔

مسلم: (غمگین مسکراہٹ سے) اور اب انھوں نے وہ تصویر بھی باہر پھینک دی ہے (عالیہ نظریں اٹھا کر پھر مسلم کو دیکھتی ہے جس میں غم کی جھلک اور نمایاں ہوگئی ہے مسلم ایک اچٹتی نظر عالیہ پر ڈالتا ہے۔ عالیہ نظریں جھکا لیتی ہے۔ مسلم آہستہ آہستہ برآمدے میں جاتا ہے اور پھوٹی ہوئی تصویر لے کر واپس آتا ہے۔ عالیہ کے پاس کھڑا ہوجاتا ہے۔ عالیہ چائے کی پیالی اس کی طرف بڑھاتی ہے مگر نظریں جھکائے رکھتی ہے۔ مسلم چائے کی پیالی عالیہ کے ہاتھ سے لے کر) عالیہ! (عالیہ نظریں اٹھا کر اسے دیکھتی ہے مسلم آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر) کیا تم کو مجھ پر بھروسہ نہیں ہے۔ (عالیہ کھڑی ہوجاتی ہے) اپنے لیے بھی تو ایک پیالی بنا لو (عالیہ خاموش رہتی ہے) بخدا مجھے اس تصویر سے کوئی شکایت نہیں ہے۔

عالیہ: (ایک دم ایسے لہجے میں جیسے اس کے ضبط کا بند ٹوٹ گیا ہو) مگر مجھے تو ہے (جذباتی انداز میں) کیا آپ چاہتے ہیں کہ ایک روح ہمیشہ میرے گرد منڈلاتی رہے— کیا یہ روح۔

مسلم: (بات کاٹ کر) مگر عالیہ امی کا تو سوچو جن کی زندگی میں کچھ نہیں ہے کسی کو اپنی نیکیاں دے دینا ناامیدی کی انتہا ہے۔

عالیہ: اور میری زندگی میں جو تھوڑا بہت رس ہے وہ اسے بھی نچوڑ لینا چاہتی ہیں (صوفے پر پڑے ہوئے اون کی طرف اشارہ کرکے) یہ کیا ہے میری خوشیوں کا قبرستان اور (تصویر کی طرف اشارہ کرکے) میرے سلگتے ہوئے ارمانوں کا جنازہ میں کب تک یوں جنازہ بردوش رہوں گی۔ مجھے بھی خوشیوں کی ضرورت ہے۔ مجھے بھی مسکرانے کا ارمان ہے۔

مسلم: پھر ایک ناامید زندگی کا کیا ہوگا۔ (ایک دم خاموش ہوکر کسی گہری سوچ میں پڑجاتا ہے عالیہ اس کا چہرہ دیکھنے لگتی ہے مسلم کچھ دیر خاموش رہ کر سوچتے ہوئے) امی پہلے تو ایسی نہیں تھیں اب انھیں کیا ہوگیا ہے۔ عالیہ میرے خیال

میں ان کے دماغ میں صرف ایک بات رہ گئی ہے کہ شارق صاحب نے عظمت خالا کا روپیہ ہضم کرلیا ہے (دوسرے کمرے کی طرف جاتے ہوئے) عظمت خالا۔ عظمت خالا۔ (عظمت خالا کمرے میں آتی ہیں) امی کیا کررہی ہیں۔

عظمت خالا: انھیں کام ہی اور کیا ہے۔ بس رونا۔ (ٹھنڈی سانس بھر کر) سچ مچ انھوں نے تم دونوں کی زندگی اجیرن کردی ہے۔

مسلم: (مسکرا کر) نہیں عظمت خالا ایسی بات نہیں ہے۔

عظمت خالا: سوچتی ہوں انھیں لے کر اپنے لڑکوں کے پاس جاپڑوں۔

مسلم: کیوں۔ (مسکرا کر) آپ دونوں یہیں رہیں گی۔

(مسلم سوچتا ہوا دوسرے کمرے میں چلا جاتا ہے۔ کچھ دیر عالیہ اور عظمت خالا خاموش کھڑی رہتی ہیں پھر عالیہ صوفے پر بیٹھ کر سوچتے ہوئے)

عالیہ: عظمت خالہ میں سوچتی ہوں کہ اب کوئی نوکری کرلوں (عظمت خالا حیرت سے اس کا چہرہ دیکھتی ہیں) ہاں عظمت خالا (ٹھنڈی سانس بھر کر) ایک نہ ایک دن تو مجھے نوکری کرنا ہی ہے۔

عظمت خالا: دلھن بیگم کیوں پاگلوں کی سی باتیں کرتی ہو۔ آخر تم پر کون سے ایسے پہاڑ ٹوٹ پڑے ہیں کہ نوکری کرتی پھرو۔

عالیہ: امی کی دماغی کیفیت ہمیں چین نہ لینے دے گی اور ایک دن خدا وہ دن نہ لائے۔

عظمت خالا: تمھارا بھی دماغ الٹ گیا ہے۔ ارے ان پر کچھ دورہ سا پڑتا ہے اور جب وہ پرسکون ہوتی ہیں تو خود شرمندہ ہوتی ہیں (ہنس کر) اب تم ہی دیکھو اپنی نیکیاں مجھے دے رہی ہیں بھلا یہ کیا بات ہوئی کیا مسلم میاں ان باتوں کو نہیں سمجھتے۔

عالیہ: ابھی تو سمجھتے ہیں اگر کبھی انھوں نے سمجھنا چھوڑ دیا تو پھر کیا ہوگا۔ ظاہر ہے میں امی کو نہ چھوڑ سکوں گی اور مجھے یہ گھر چھوڑنا پڑے گا۔

عظمت خالا: گھر چھوڑیں تمہارے دشمن۔ بہو بیگم دل کی بری نہیں مسلسل صدموں نے انھیں نڈھال کردیا ہے۔

عالیہ: مگر عظمت خالا۔

عظمت خالا: (پرعزم لہجے میں) جس دن ذرا بھی ان کی نظریں بدلی ہوئی دیکھوں گی انھیں لے کر چلی جاؤں گی۔

عالیہ: اور میں انھیں لے جانے نہیں دوں گی میں انھیں اس لیے تو ساتھ نہیں لائی ہوں کہ لاوارثوں کی طرح دربدر کی ٹھوکریں کھانے کو چھوڑ دوں۔

عظمت خالا: میں نے تمام زندگی ان کا نمک کھایا ہے۔ انھوں نے ماں کی طرح سمجھا ہے اور...

عالیہ: وہ تمھاری امانت کی حفاظت بھی نہ کرسکیں۔

عظمت خالا: میں نے انھی کے گھر سے کمایا تھا انھی پر نچھاور کردیا۔ خدا گواہ ہے مجھے اس کی کوڑی برابر پرواہ نہیں۔

عالیہ: مگر یہ بھی سچ ہے کہ ان کا دماغ اسی کی وجہ سے الٹا ہے (ٹھنڈی سانس بھر کر) ایک دن وہ اس غم میں دنیا سے سدھار جائیں گی (کچھ دیر خاموش رہ کر) میں نوکری کرکے تمھارا پیسہ پیسہ ادا کردوں گی پھر ان کو سکون مل جائے گا۔

عظمت خالا: دلھن بیگم۔ مجھے اس روپے کی نہ اس دنیا میں ضرورت ہے اور نہ دوسری دنیا میں کسی کی نیکیوں کی— میں—

(مسلم، خدیجہ، بیگم کو سہارا دیے ہوئے کمرے میں آتا ہے خدیجہ بیگم کے ہاتھ میں روپیوں کی گڈی ہے اس وقت ان کے چہرے پر غیر معمولی سکون ہے۔ عظمت خالا انھیں دیکھ کر خاموش ہوجاتی ہیں۔ خدیجہ بیگم عظمت خالا کے پاس جاکر)

خدیجہ بیگم: میں نہ کہتی تھی شارق میاں لاکھ برے سہی پھر بھی اتنے برے نہیں انھوں نے تمھارا روپیہ لوٹا دیا ہے۔

عظمت خالا: روپیہ لوٹا دیا ہے (مسلم کی طرف دیکھ کر) آپ تو کہہ رہے تھے کہ—

مسلم: انھوں نے روپیہ دیا میں لے آیا (آنکھ سے عظمت خالا کو اشارہ کرتا ہے کہ وہ روپیہ لے لیں) دو ہزار تھا نا—

عظمت خالا: مگر مسلم میاں—

خدیجہ بیگم: (بات کاٹ کر) گن لو اپنا روپیہ (روپیہ عظمت خالا کے ہاتھ پر رکھ کر) اب سکون سے مر سکوں گی (عالیہ حیرت سے کبھی مسلم اور کبھی خدیجہ بیگم کو دیکھتی ہے۔ خدیجہ بیگم صوفے پر بیٹھ جاتی ہیں اب ان کے چہرے سے سکون ظاہر ہو رہا ہو مسلم کے ہاتھ میں تصویر دیکھ کر) مسلم میاں یہ تصویر مجھے دے دو۔

مسلم: میں اس کا فریم بدلوا دوں گا پھر آپ۔

خدیجہ بیگم: ارے اس کی کیا ضرورت ہے۔

(مسلم کے ہاتھ سے تصویر لے کر اس طرح گود میں رکھ لیتی ہیں۔ جیسے کوئی ماں اپنے بچے کو دودھ پلانے کے لیے گود میں لیے بیٹھی ہو۔ چہرے پر سکون اور تقدس اور گہرا ہو جاتا ہے۔

(پردہ)

(مطبوعہ ماہنامہ 'شاعر' بمبئی، سالنامہ 1972)

زبیدہ

افرادِ تمثیل

(1) دلاور (2) رحمت (3) نور (4) شرافت (چاروں غنڈے) (5) زبیدہ (شرافت کی بیوی) (6) خلیل (ایک نوجوان پڑوسی) (7) ہیڈ کانسٹبل

پہلا ایکٹ

منظر

(ایک معمولی سا دالان جس کی عقبی دیوار میں ایک دروازہ ہے— یہ دروازہ ایک گلی میں کھلتا ہے اگر یہ دروازہ کھلا ہو تو گلی سے گزرنے والے لوگ نظر آتے ہیں۔ اگر بند ہو تو لوگوں کے قدموں کی آوازیں اور کتوں کے بھونکنے کی آوازیں آتی ہیں۔ دالان ہی میں ایک گھڑونچی رکھی ہے جس پر دو پرانے مٹکے رکھے ہیں اور گھڑونچی کے نیچے ایک بالٹی رکھی ہے۔ دالان میں دروازے سے لگی ہوئی ایک چارپائی بچھی ہے جس پر ایک معمولی بستر ہے جو بے ترتیب حالت میں ہے دالان میں مغرب کی جانب ایک دروازہ ہے جو ایک کوٹھری میں کھلتا ہے یہ دروازہ بند ہے دروازے سے ذرا ہٹ کر ایک کونے میں چولھا رکھا

ہے جس کے دھوئیں کی وجہ سے ساری دیوار سیاہ ہوگئی ہے چولھے کے اوپر ایک طاق ہے جس میں بہت سے پرانے ڈبے رکھے ہیں جو سب دھوئیں کی وجہ سے کالے ہورہے ہیں چولھے کے پاس کھانا پکانے کے برتن رکھے ہیں۔ چارپائی کے پاس ایک چٹائی بچھی ہے جس پر دلاور اور رحمت بیٹھے ہیں۔ نور کسی گہری سوچ میں ڈوبا ہوا ہے دالان میں ٹہل رہا ہے۔ اس کے چہرے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ کوئی فیصلہ کرتا ہے اور پھر خود ہی گردن ہلا کر اس کی نفی کرتا ہے۔ دلاور اور رحمت خاموشی سے اسے دیکھ رہے ہیں۔ ٹہلنے کے دوران میں نوردالان میں پڑی ہوئی جلی ہوئی بیڑیوں کے ٹکڑوں کو پاؤں سے مسلتا جاتا ہے۔ کچھ دیر بعد دلاور بیڑی نور کی طرف بڑھا کر)۔

دلاور: نور بھائی (نور اس کے ہاتھ سے بیڑی لے کر جلاتا ہے۔ دلاور اسے غور سے دیکھ کر) تو کیا سوچا۔

نور: (سوچتے ہوئے) مگر اب میں برے کاموں سے توبہ کر چکا ہوں۔

رحمت: پھر ہمارا کیا بنے گا۔ جہاں تمھارا پسینہ گرے ہم اپنا خون بہا دیں۔

دلاور: اور دلاری الگ دیوانی سی ہورہی ہے۔

نور: دلاری! تو وہ ابھی تک۔

دلاور: جائے گی کہاں (مسکرا کر) تمھارا جادو کہیں اتر سکتا ہے۔

نور: اسے چلتا کرو اگر کسی کو پتا چل گیا تو چھٹی کا دودھ یاد آجائے گا۔

رحمت: وہ تو دن رات تمھیں یاد کرتی رہی ہے (آنکھ مار کر آہستہ سے) ایک دن آجانے میں کیا حرج ہے (نور پھر ٹہلنے لگتا ہے۔ دلاور اور رحمت اسے امید اور ناامیدی کے انداز میں دیکھتے ہیں نور کے چہرے سے تذبذب کی حالت نمایاں ہے۔ رحمت بیڑی کا کش لے کر دھواں چھوڑ کر) نور بھائی اب بس ہاں کہہ دو (نور اب بھی خاموش رہتا ہے) اس دن تو ہم سب جان کی بازی لگائے ہوئے تھے تم خود ہی تو سامنے آگئے تھے۔

نور: اگر میں سامنے نہ آتا تو تم سب دھر لیے جاتے۔

دلاور: تم سے کس نے کہا تھا۔ ہم دھر لیے جاتے تو کیا بگڑ جاتا۔

نور: سارا بیڑا غرق ہو جاتا۔

رحمت: اب تو ہم پولیس کی بھی خدمت کرتے رہتے ہیں۔

نور: سانپ کی دوستی اچھی نہیں ہوتی (کچھ سوچ کر) اگر میں تمھاری بات مان بھی لوں تو—

رحمت: (بات کاٹ کر) پوبارے ہیں۔ دیسی شراب، مٹی کا سونا بنا رہی ہے۔

نور: (سوچتے ہوئے) مٹی سونا۔

رحمت: ہاں نور بھائی۔ اور ایک دو لونڈیوں کو ادھر سے ادھر کر دینے میں ہزاروں ہاتھ آتے ہیں۔

نور: یہ تو سب ٹھیک ہے مگر میں سوچتا ہوں کہ۔

رحمت: سوچنا کیا اور بھائی— جوانی ہے جو کچھ ہاتھ آ گیا وہی اپنا ہے پھر کون پوچھے گا۔

نور: (غصہ سے) کوئی نہیں پوچھے گا۔ مرد سدا جوان رہتا ہے۔

رحمت: اور مرد یوں ہتھیار نہیں ڈال دیتا۔

نور: (غصہ سے) رحمت دیکھ میری مردانگی کو مت للکارو۔

رحمت: تو پھر آ جاؤ میدان میں (نور خاموش رہتا ہے اور سوچتا ہے) اب سوچنے کا وقت نہیں۔ کچھ کرنے کا وقت ہے۔

نور: اچھا کچھ دن اور سوچ لوں۔

دلاور: سوچنا کیسا (چٹکی لینے کے انداز میں) سب ساتھی کہتے ہیں کہ نور بھائی کو زبیدہ نے بزدل بنا دیا ہے۔

نور: بزدل (غصہ سے) تم دونوں چلے جاؤ۔ اور پھر میرے گھر نہ آنا— (آہستہ سے) زبیدہ— نے— بزدل بنا دیا ہے (غصہ سے چیخ کر) نکل جاؤ میرے گھر سے۔ رحمت دلاور کو آنکھ سے چلنے کا اشارہ کرتا ہے، دونوں اٹھ کر

دروازے کی طرف جاتے ہیں پھر پلٹ کر نور کو دیکھتے ہیں نور کے لب اس طرح ہلتے ہیں جیسے وہ ان دونوں سے کچھ کہنا چاہتا ہے مگر خاموش رہتا ہے اور نفی میں سر ہلاتا ہے۔ پھر دونوں کی طرف دیکھ کر) جاؤ تم دونوں جاؤ۔

دلاور: اچھا نور بھائی۔ ہم کل پھر آئیں گے تم سوچ لینا۔

نور: نہیں اب تم نہ آنا میں نے سوچ لیا ہے۔

دلاور: مگر نور بھائی۔

نور: (اکتائے ہوئے لہجے میں) اچھا بابا آجانا۔

رحمت: تو سوچ گے۔

نور: ہاں ہاں بابا سوچوں گا۔ ابھی تو میرا پیچھا چھوڑو (دونوں مسکراتے ہوئے چلے جاتے ہیں۔ نور دالان میں ٹہلتا رہتا ہے پھر جیسے خود سے کہہ رہا ہو) ہونہہ — زبیدہ نے بزدل بنا دیا ہے (دروازے پر دستک) کون ہے؟

آواز: نور خاں گھر میں ہے۔

نور: ہاں ہاں میں ہی بول رہا ہوں۔ کون ہے اندر آجا — (پولیس ہیڈ کانسٹبل داخل ہوتا ہے نور اسے دیکھ کر) آؤ داروغہ جی — آؤ۔ چارپائی کی طرف اشارہ کرکے) بیٹھو۔ کیسے بھول پڑے۔

ہیڈ کانسٹبل: (طنزیہ) تمھارے درشنوں کو آنا ہی پڑتا ہے (چارپائی پر بیٹھتے ہوئے) ابھی دلاور اور رحمت سے دوستی ختم نہیں ہوئی۔

نور: پرانے دوست ہیں (مسکرا کر) کبھی کبھی آجاتے ہیں۔

ہیڈ کانسٹبل: کبھی کبھی آجاتے ہیں۔ اس بار تو چار ہی مہینوں میں ٹل گئی اب کے سالوں کے لیے جائے گا — اور ہاں یہ عورت کون ہے جو تیرے ساتھ رہتی ہے۔

نور: کون سی عورت! وہ زبیدہ؟

ہیڈ کانسٹبل: زبیدہ نام ہے اس کا۔ کون ہے تیری۔

نور: میری؟ (مسکرا کر) کون لگتی ہے۔ داروغہ جی وہ تو —

ہیڈ کانسٹبل: تیری کوئی نہیں لگتی اور تو نے اسے رکھ چھوڑا ہے۔

نور: ارے واہ داروغہ جی — (نظریں جھکا کر) وہ — وہ — داروغہ جی میں نے اس سے نکاح کرلیا ہے۔

ہیڈ کانسٹبل: نکاح کرلیا ہے۔ جھوٹ تو نہیں بول رہا ہے۔ یاد رکھنا اگر جھوٹ بولا تو چھٹی کا دودھ یاد آجائے گا۔

نور: داروغہ جی تم سے جھوٹ بولوں گا۔

ہیڈ کانسٹبل: اچھا — (کھڑے ہوکر) یاد رکھنا اگر ایسی ویسی بات ہوئی تو —

نور: نہیں داروغہ جی۔ ایسی کوئی بات نہیں (ہیڈ کانسٹبل دروازے کی طرف جاتا ہے) بیڑی تو پیتے جاؤ داروغہ جی۔

ہیڈ کانسٹیبل: ابے رہنے دے۔

نور: نہیں داروغہ جی۔ بیڑی تو پینا ہوگی۔

(بیڑی دیتا ہے۔ ہیڈ کانسٹبل بیڑی جلا کر)

ہیڈ کانسٹیبل: اور رات تو کہاں گیا تھا۔ جب میں نے آواز دی تھی۔

نور: سوگیا تھا داروغہ جی — اب تو میں نے گھر سے نکلنا ہی چھوڑ دیا ہے۔ (ہیڈ کانسٹبل ہنستا ہوا چلا جاتا ہے اس کے جانے کے بعد) ہونہہ — آجاتے ہیں حرام خور (سوچنے لگتا ہے کچھ دیر بعد زبیدہ سر پر ایک گٹھری رکھے داخل ہوتی ہے۔ بدن سڈول ہے۔ چہرہ گندمی آنکھیں پرکشش ہیں سادہ اور معمولی لباس پہنے ہے۔ نور زبیدہ کی طرف دیکھتا ہے۔ زبیدہ جیسے اس کی موجودگی سے لاعلم کپڑوں کی گٹھری سر سے اتار کر چارپائی پر رکھتی ہے۔ دوپٹے کے پلو سے چہرے کا پسینہ پونچھتی ہے۔ نور آہستہ سے کھانستا ہے زبیدہ اس کی طرف دیکھتی ہے) آج بہت دیر سے آئی (زبیدہ کوئی جواب نہیں دیتی خاموشی سے پانی کے مٹکوں کے پاس جاتی ہے) آج بکری کی کیا حالت رہی (زبیدہ اب بھی خاموش رہتی ہے اور پانی کے مٹکے کھول کر دیکھتی ہے پھر نور پر ایک نظر

ڈال کر بالٹی اٹھا کر دروازے کی طرف جاتی ہے) اب کہاں چل دی (زبیدہ اب بھی کوئی جواب نہیں دیتی نور (مسکرا کر) معلوم ہوتا ہے آج گھاٹا ہوگیا۔ لا میں پانی لادوں (زبیدہ کے ہاتھ سے بالٹی لے کر مسکرا کر دروازے کی طرف جاتے ہوئے) تھکی ہاری آئی ہے تھوڑی دیر آرام کر لے۔

(نور کمرے سے چلا جاتا ہے۔ زبیدہ کچھ دیر تھکی تھکی سی کھڑی رہتی ہے پھر چارپائی پر بیٹھ کر اپنے سر پر ہاتھ پھیرتی ہے اور بالوں کو برابر کرتی ہے اسی دوران میں پورے کمرے کا جائزہ بھی لیتی رہتی ہے جس پر ہر چیز بے ترتیب ہے۔ جلی ہوئی بیڑیوں کے بے شمار ٹکڑے ادھر ادھر پڑے ہیں کچھ دیر خاموش بیٹھی رہتی ہے پھر جھاڑو اٹھا کر دالان کی صفائی کرنے لگتی ہے اور بکھری چیزوں کو بھی ترتیب سے رکھتی جاتی ہے کہ خلیل داخل ہوتا ہے لاپروا سا نوجوان ہے عمر بیس بائیس کے قریب ہے۔ ایک میلا سا پھٹا قمیص اور پاجامہ پہنے ہے۔ تیل سے بے نیاز بال چہرے پر بکھرے ہوئے ہیں زبیدہ نظریں اٹھا کر خلیل کو دیکھتی ہے۔ خلیل دیوار سے ٹیک لگا کر کھڑا ہوجاتا ہے اور مسکراتے ہوئے زبیدہ کو دیکھتا ہے زبیدہ جھاڑتے ہوئے اس کے پاس پہنچ جاتی ہے پھر نظریں اٹھا کر خلیل کو دیکھ کر)

زبیدہ: بیٹھ کیوں نہیں جاتا سر پر کب تک کھڑا رہے گا۔

خلیل: (مسکرا کر) کیا نور بھائی نے ساری کمائی چھین لی جو اکڑی اکڑی ہے۔

زبیدہ: (خلیل کو سر سے پیر تک دیکھ کر) وہ عورتوں کی کمائی نہیں کھاتا سمجھا (چارپائی کی طرف اشارہ کرکے) چل ہٹ مجھے جھاڑو لگانے دے (خلیل مسکرا کر چارپائی پر بیٹھ جاتا ہے زبیدہ جھاڑو لگانے میں مشغول ہوکر) آج ٹھیلا لے کر نہیں گیا۔

خلیل: گیا کیوں نہیں۔

زبیدہ: بہت جلدی لوٹ آیا۔

33/ خلیل: کام جلدی بن گیا جلدی لوٹ آیا۔ (مسکرا کر) تیری طرح لالچ تھوڑا ہی کرتا ہوں۔

زبیدہ: اور میں تیری طرح کنجوس نہیں ہوں۔ دیکھ تو کیسی شکل بنا رکھی ہے برسوں سے نہایا نہیں ہے۔

خلیل: کنجوس! روز آٹھ آنے پولس والے کو دینا پڑتے ہیں تب کہیں ایک جگہ ٹھیلا جمنے دیتا ہے کوئی تیری طرح کھرا روزگار ہے۔

(نور بالٹی میں پانی لے کر آتا ہے۔ خلیل کو چارپائی پر بیٹھا دیکھ کر چہرے کا رنگ بدل جاتا ہے بالٹی کا پانی گھڑے میں ڈال کر خلیل کی طرف دیکھ کر)

نور: کیوں رے خلیل تو پھر گھر آیا۔

خلیل: (مسکرا کر) نور بھائی۔ میں تیرے گھر نہیں زبیدہ کے گھر آیا ہوں۔

نور: میں ذرا میں ساری دیکلی نکال دوں گا یاد رکھ تیرے باپ کا خیال کرتا ہوں۔

خلیل: بس بس رہنے دو (مسکرا کر) ایسے ہی بہادر ہو (طنزیہ) وہ دن گئے ـــــ

نور: دیکھ خلیل میرے منہ مت لگ، میں دوسرے قسم کا آدمی ہوں (زبیدہ سے) زبیدہ! تو بھی اسے سمجھا دے نہیں تو مجھ سے برا کوئی نہ ہوگا (زبیدہ کوئی جواب نہیں دیتی لوٹے میں پانی لے کر منہ دھونے لگتی ہے۔ زبیدہ کو اپنی جانب متوجہ نہ پا کر خلیل سے) بس چل دے یہاں سے۔ نہیں تو ـــــ

خلیل: نہیں تو؟ بولو کہ میرا سر پھوڑ دو گے۔ (طنزیہ مسکرا کر) اب وہ زمانہ گیا جب تم سے سارا محلہ ڈرتا تھا۔

نور: دیکھ دیکھ خلیل۔ (غصہ سے چہرہ سرخ ہوجاتا ہے اور دونوں مٹھیاں بند ہوجاتی ہیں پھر اپنے دونوں ہاتھ غصہ سے اپنی ہی رانوں پر مار کر) خلیل تو چلا جا یہاں سے نہیں تو میں کچھ اور کر بیٹھوں گا۔

(نور غصہ سے دالان میں ٹہلنے لگتا ہے خلیل پلنگ پر بیٹھا نور کی حالت دیکھتا ہے اور مسکراتا ہے زبیدہ منہ دھو کر آتی ہے دوپٹے سے منہ پونچھتی ہے اور

جیب سے پیسے نکال کر خلیل کو دیکھ کر)

زبیدہ: جا۔ ذرا جا کر دو آنے کی سبزی لا دے۔ جلدی آنا۔

(خلیل پیسے لے کر چلا جاتا ہے نور اسی طرح غصہ سے دالان میں ٹہلتا رہتا ہے بار بار مٹھیاں بند کرتا ہے اور پھر کھول دیتا ہے اس دوران میں زبیدہ اپنے کپڑوں کی گٹھری کھول کر کچھ کپڑے اِدھر اُدھر کرتی ہے پھر ایک نیلا کپڑا سب کے اوپر رکھ کر گٹھری باندھتی ہے نور ایک دم جیسے غصہ پر قابو نہ پا کر)

نور: مجھے خلیل کا یہاں آنا جانا بالکل پسند نہیں (زبیدہ خاموشی سے اپنے کام میں مشغول رہتی ہے نور زبیدہ کی خاموشی سے مشتعل ہوکر) تو اسے روک دے نہیں تو اس کا سر پھوڑ دوں گا۔

زبیدہ: (مڑ کر نور کو دیکھ کر) تیری اور اس کی تو جان میں کون ہوتی ہوں۔ روک دینے والی۔

نور: مگر وہ تیرے پاس آتا ہے۔

زبیدہ: اور جو تیرے پاس آتے ہیں— میں تو نہیں کہتی کہ تو انھیں آنے سے روک دے۔

نور: (ہٹ دھرمی کے انداز میں) پر تجھے اسے روکنا ہی پڑے گا— نہیں تو—

زبیدہ: نہیں تو مجھے بھی مار ڈالے گا— ہونہہ— (ایسے انداز میں جیسے خود سے کہہ رہی ہو) ایسے حکم چلاتا ہے جیسے میرا خصم ہو—

نور: خصم نہیں تو اور کیا۔ آج تو میں نے پولیس والے کی کتاب میں بھی لکھوا دیا ہے کہ تو میری بیوی ہے۔

زبیدہ: (غصہ سے) کیوں لکھوا دیا ہے؟ (طنزیہ) بڑا آیا بیوی بنانے والا کس نے کہا تھا تجھ سے؟ میں نے کتنی بار سمجھایا کہ مجھے یہ باتیں پسند نہیں—

نور: تجھے پسند ہوں یا نہیں۔ میں تو سچ کہہ رہا ہوں۔ مجھے روز روز کا پریشان ہونا پسند نہیں تھا۔

زبیدہ: روز روز کا پریشان ہونا۔

نور: اور نہیں تو کیا۔ ہر روز پولس کا سپاہی پوچھتا تھا کہ یہ عورت کون ہے کہاں سے آئی ہے۔ میرے ساتھ کیوں رہتی ہے پریشان ہوگیا تھا۔ روز روز تھانے جانے سے (مسکرا کر) اور پھر ایک دن تو تجھے میری بیوی بننا ہی ہے۔

زبیدہ: دیکھ میں کہہ رہی ہوں کہ مجھے یہ اچھا نہیں لگتا۔

نور: تجھے اچھا لگے یا نہ لگے سارے محلے والے یہی سمجھتے ہیں کہ تو میری بیوی ہے— میں زبردستی نہیں کرتا۔ مگر

زبیدہ: محلے والے— مگر کیا۔

نور: (غصہ سے) مگر یہ کہ اگر زبردستی کرنا پڑا تو زبردستی بھی کروں گا۔

زبیدہ: بڑا آیا زبردستی کرنے والا چل لا ایک آنہ نکال۔ دو آنے کی سبزی منگوائی ہے۔

(نور غصہ سے دیکھتا ہے اور ایک آنہ جیب سے نکال کر زبیدہ کی طرف پھینکتے ہوئے)

نور: یہ لے (چولھے کے پاس رکھے ہوئے پیپے کی طرف اشارہ کرکے) اس میں آٹا پسوا کے رکھ دیا ہے۔ میرے لیے چار روٹی کا لے لینا۔

(نور پھر کمرے میں ٹہلنے لگتا ہے مگر چہرے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ابھی تک غصہ میں ہے۔ زبیدہ پیپے میں سے آٹا نکال کر گوندھنے لگتی ہے نور بیچ دالان میں جوتا اتار کر چارپائی پر بیٹھ جاتا ہے۔ کچھ دیر خاموشی رہتی ہے زبیدہ کی نظر جوتے پر پڑتی ہے پھر جوتے کی طرف اشارہ کرکے)

زبیدہ: پھر بیچ دالان میں جوتا اتارا کوئی تیری جورو ہوں جو دن رات تیری خدمت کروں۔

(نور پہلے تو غصہ سے زبیدہ کو دیکھتا ہے پھر ایک دم مسکرا کر چارپائی سے اٹھتا ہے اور جوتا اٹھا کر ایک کونے میں رکھتا ہے کہ خلیل سبزی لے کر داخل ہوتا ہے اور زبیدہ کے سامنے رکھتا ہے)

زبیدہ: (اپنے کام میں مشغول رہتے ہوئے) گٹھری میں نیلے رنگ کا کپڑا رکھا ہے وہ لے جا اور قمیص سلوا لے۔

نور: (پھر غصہ سے خلیل کو دیکھتا ہے اور زبیدہ سے مخاطب ہوکر) اگر یہی دان پان رہا تو ایک دن گٹھری خالی ہو جائے گی۔

زبیدہ: تیری بلا سے۔ تیری کمائی کا دان پن تو نہیں کرتی۔ تجھے فکر کیوں ہے (غصہ سے زبیدہ کو دیکھتا ہے مگر غصہ کو دبا کر جوتا پہنتا ہے اور دروازے کی طرف جاتا ہے زبیدہ اسے جاتا دیکھ کر) اب کہاں چلا کھانا نہیں کھائے گا۔

نور: تیری بلا سے۔

زبیدہ: تیری خوشی۔ پر جب آئے تو مجھے پریشان نہ کرنا روٹی اور سبزی رکھ کر سو جاؤں گی۔ نکال کر کھالینا میری کوٹھری کا دروازہ مت کھٹکھٹانا۔

(نور کوئی جواب نہیں دیتا اور باہر چلا جاتا— خلیل مسکرا کر زبیدہ کو دیکھتا ہے۔ کچھ دیر خاموشی رہتی ہے زبیدہ آٹا گوندھنے میں مشغول رہتی ہے۔ پھر کچھ دیر بعد نظریں اٹھا کر خلیل کو دیکھ کر) کپڑا لینا ہے تو لے نہیں تو چل یہاں سے— اور ہاں یہ صبح نل پر کھڑا کھڑا مجھے کیوں گھور رہا تھا۔

خلیل: تو مجھے اچھی لگتی ہے۔

زبیدہ: (طنزیہ) اچھا— محلے والے کیا کہتے ہوں گے۔ میں تیری بڑی بہن سے بھی بڑی ہوں۔ اکیلے میں میرے گھر نہ آیا کر— سمجھا۔ (خلیل زبیدہ کو دیکھتا ہے۔ کچھ دیر کھڑا رہتا ہے پھر دروازے کی طرف جاتا ہے زبیدہ اسے جاتا ہوا دیکھ کر) کپڑا نہیں لے جائے گا (خلیل مڑ کر نہیں دیکھتا) تیری مرضی (غصہ سے) جسے دیکھو وہی نخرے کرتا ہے (خلیل باہر چلا جاتا ہے زبیدہ پھر آٹا گوندھنے لگتی ہے۔

(پردہ)

دوسرا ایکٹ

منظر

(وہی دالان۔ تقریباً ایک مہینے بعد۔ دالان میں کسی قسم کی کوئی تبدیلی نظر نہیں آتی۔ رحمت اور دلاور چٹائی پر بیٹھے ہیں نور کمرے میں ٹہل رہا ہے۔ کچھ دیر کی خاموشی کے بعد رحمت کھڑے ہوتے ہوئے)

رحمت: بس چل دلاور۔ اب نور بھائی پہلا سا نور بھائی نہیں رہا دو دن کی جیل نے سب کس بل نکال دیے۔

دلاور: ارے کیوں طعنے دیتا ہے اور سوچ لینے دے دو چار دن۔

رحمت: کیا سوچ لینے دے یہاں تو سارا کاروبار چوپٹ ہو رہا ہے اور اسے زبیدہ کی گود سے فرصت نہیں ملتی۔

نور: (ایک دم پلٹ کر رحمت کا گریبان پکڑ کر) دیکھو رحمت زیادہ زبان چلانا اچھا نہیں ہوتا۔ (رحمت اور دلاور دونوں سمجھاتے ہیں نور رحمت کو دھکا دے کر) بس چلا جا یہاں سے۔

رحمت: (ہمت کر کے) کیا چلا جاؤں۔ چوڑیاں پہن کر بیٹھ جاؤں۔ دن بھر خلیل گھر میں گھسا رہتا ہے اور تم مونچھوں پر تاؤ دیتے رہتے ہو۔

نور: دیکھ رحمت منہ مت لگ۔ کون زبیدہ مری جورو ہے جو سارے جہاں سے جھگڑا کرتا پھروں۔

رحمت: گھر میں تو رکھ چھوڑا ہے۔ گھر میں رکھی عورت جورو سے بڑھ کر ہوتی ہے (طعنے کے انداز میں) کیا بہن بنا کر پوجا کرتا ہے۔

نور: پوجا کرتا ہوں یا جوتیاں چاٹتا ہوں۔ تیرے گھر روٹی مانگنے نہیں آتا۔

رحمت: ایک دن یہ بھی ہو رہے گا پھر سلام کریں گے عورت کی ایسی محبت اچھی نہیں ہوتی۔

نور: اچھا تو تو مجھے سبق پڑھانے آیا ہے۔

دلاور: چھوڑو نور بھائی (خوشامدانہ انداز میں) تمہاری وجہ سے دو پیسے ہم بھی کما لیں گے (نور خاموش رہتا ہے اور کمرے میں ٹہلتا ہے نور پر امید ہو کر) تمھاری وجہ سے ہم نے لاکھوں کمائے اور لاکھوں گنوائے اب تو کوڑی کوڑی کو ترستے ہیں۔

نور: مگر اب میرا دل اس کمائی کو نہیں چاہتا۔

دلاور: ایسی کمائی کس کو اچھی لگتی ہے مگر دنیا ہم کو مجبور جو کرتی ہے۔

نور: دنیا مجبور کرتی ہے۔

دلاور: اور کیا۔ ہم فرشتے ہی کیوں نہ بن جائیں۔ وہ ہم کو غنڈہ ہی کہتی رہے گی۔

نور: غنڈہ بھی انسان ہوتا ہے دلاور۔ اگر وہ چاہے تو۔۔۔

رحمت: (لقمہ دے کر) فرشتہ بن جائے۔ چل دلاور ہم ساتھیوں سے کہہ دیں گے کہ اپنا نور بھائی مرگیا۔ اب وہ فرشتہ ہوگیا ہے۔ (طنزیہ ہنس کر) ہنہ فرشتہ۔

نور: (شکست خوردہ لہجے میں) مگر رحمت۔

رحمت: بس رہنے دو (طنزیہ لہجے میں) خود کو مرد بچہ کہتے ہو اور عورت کے آنچل میں چھپے بیٹھے ہو۔

نور: (غصہ سے) رحمت۔

رحمت: کیا چیختے ہو۔ دو دن کا چھوکرا تمھاری آنکھوں میں دھول جھونک رہا ہے اور تم نے آنکھوں پر پٹی باندھ رکھی ہے۔

(رحمت دلاور کا ہاتھ پکڑ کر گھسیٹتا ہوا چلا جاتا ہے۔ نور کچھ دیر بے حس و حرکت کھڑا رہتا ہے پھر مٹکوں کے پاس جا کر انھیں کھول کر دیکھتا ہے اور پھر غصہ سے انھیں اٹھا کر پھینک دیتا ہے جس سے وہ چور چور ہو جاتا ہے پھر دالان میں ٹہلتا ہے اور جو چیز سامنے آتی ہے اسے غصہ سے ٹھوکر مارتا ہے کچھ دیر ایسی ہی پاگلوں کی سی حرکتیں کرتا رہتا ہے پھر سر پکڑ کر چارپائی پر بیٹھ جاتا

ہے۔ کچھ دیر بعد خلیل ہاتھ میں ایک شیشی لے کر داخل ہوتا ہے۔ چند سیکنڈ دالان کا جائزہ لیتا ہے پھر مسکرا کر)

خلیل: نور بھائی (نور نظریں اٹھا کر غصہ سے خلیل کو دیکھتا ہے پہلے تو خلیل سہم جاتا ہے (پھر مسکرا کر) زبیدہ کہاں ہے۔

نور: (غصہ سے) جہنم میں۔

خلیل: (مسکرا کر) کیا اتنی گنہ گار ہے۔

نور: (خلیل کے مسکرانے سے چڑ کر) اب کیوں آیا ہے چل بھاگ یہاں سے۔

خلیل: زبیدہ نے سر میں ڈالنے کا تیل لانے کو کہا تھا وہی لے کر آیا ہوں۔

(نور غصہ سے اٹھ کر ایک ہاتھ تیل کی شیشی پر مارتا ہے جو خلیل کے ہاتھ سے گر کر پھوٹ جاتی ہے۔ خلیل ایک دم مشتعل ہوجاتا ہے اور نور کا گریبان پکڑ کر) نور بھائی میرے بازوؤں میں بھی بڑی طاقت ہے۔

(نور غصہ سے اپنے دونوں ہاتھ خلیل کے ہاتھ پر مارتا ہے جس سے خود نور کا قمیص پھٹ جاتا ہے نور اپنا پھٹا ہوا قمیص دیکھ کر)

نور: بڑا آیا ہے بازوؤں کی طاقت والا دو دن کا چھوکرا منہ کو آرہا ہے ماں لگتی ہے تیری جو ایسی خدمت کر رہا ہے۔

خلیل: ماں لگتی ہوگی تمہاری جب ہی اس کے تیل پھلیل کرنے سے چڑتے ہو۔

نور: اپنی عزت پیاری ہے تو چلا جا یہاں سے۔

خلیل: نہیں تو مار ڈالو گے نا۔ بہت دیکھے ہیں ایسے گرجنے والے معلوم ہے، پولیس نے چار مہینے میں سارے کس بل نکال دیے ہیں۔

نور: پولس، پولس، پولس، یا خدا میں مر کیوں نہیں جاتا۔

خلیل: غیرت بھی ہو مرنے کی۔ جوئے شراب اور عورتوں کے کاروبار نے غیرت رہنے ہی کہاں دی ہے (نور غصہ سے خلیل کے منہ پر ایک مکا جما دیتا ہے جس سے خلیل چکرا جاتا ہے سنبھل کر جوابی حملے کے لیے تیار ہوتا ہے مگر اس

دوران میں نور شرمندگی اور افسوس کے انداز میں ایک دیوار سے ٹک کر کھڑا ہو جاتا ہے خلیل مکا تانے ہوئے اس کے پاس جاتا ہے مگر نور گردن جھکائے کھڑا رہتا ہے۔ خلیل نور کے پاس پہنچ کر رکتا ہے مگر نور کو یوں کھڑا دیکھ کر ہاتھ نیچے گرا لیتا ہے چہرے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ دل ہی دل میں پیچ و تاب کھا کر رہ گیا ہو چند سیکنڈ رک کر) نور بھائی جانے کیا خیال آ گیا نہیں تو۔

(نور آہستہ آہستہ نظریں اٹھا کر خلیل کو دیکھتا ہے پھر آہستہ سے)

نور: خلیل تو جا اس وقت میں آپے میں نہیں ہوں۔ خلیل جا خدا کے لیے جا۔

خلیل: مجھ پر ہاتھ اٹھا کر اچھا نہیں کیا نور بھائی۔

نور: میں پاگل ہو رہا ہوں خلیل۔ بالکل پاگل مجھے اندھے کی طرح کچھ بھائی نہیں دے رہا۔

(نور کے چہرے سے ایسے کرب کے آثار ظاہر ہوتے ہیں جیسے وہ رو دے گا۔ خلیل اس کی یہ حالت دیکھ کر)

خلیل: تمھاری پہلی محبت کا خیال آ گیا۔ نہیں تو — خیر —

(دروازے کی طرف جاتا ہے نور اسے جاتا ہوا دیکھ کر کچھ بولنا چاہتا ہے چہرے سے معلوم ہوتا ہے جیسے وہ بڑی اذیت میں مبتلا ہو خلیل دروازے کے پاس پہنچ جاتا ہے۔

نور: خلیل — (خلیل مڑ کر نور کو دیکھتا ہے پھر تیزی سے باہر چلا جاتا ہے)

خلیل: خلیل (نور دروازے تک جاتا ہے پھر رک جاتا ہے اور پھر واپس آتا ہے جیسے بہت شرمندہ ہو کچھ دیر بعد زبیدہ داخل ہوتی ہے۔ اس کے سر پر کپڑوں کی گٹھری ہے جسے وہ بائیں ہاتھ سے سنبھالے ہوئے دوسرے ہاتھ سے ایک مرد کو سہارا دیے ہوئے ہے جو بیساکھی کے سہارے چل رہا ہے جس کا ایک ہاتھ اور پیر بے کار ہے نور اسے سر سے پیر تک دیکھ کر زبیدہ سے) یہ مردہ کہاں سے اٹھا لائی (زبیدہ نور کے سوال کا جواب نہیں دیتی مرد کو سہارا دے

کر چارپائی پر بٹھلاتی ہے اور سر سے گٹھری اتار کر چارپائی پر رکھتی ہے ڈوپٹے کے پلو سے پسینہ پونچھتی ہے اور دیوار میں لگے آئینے میں اپنا چہرہ دیکھ کر منہ پر بکھرے ہوئے بال برابر کرتی ہے نور تیز تیز قدموں سے زبیدہ کے پاس جاتا ہے اس کے دونوں بازو پکڑ کر منہ اپنی جانب کرتے ہوئے) میں پوچھتا ہوں یہ مردہ کہاں سے اٹھا لائی۔

زبیدہ: (جھٹکے سے بازو چھڑا کر) تیری بلا سے تجھے کیوں فکر پڑی ہے۔

نور: یہ میرا گھر ہے یا سرائے۔

زبیدہ: آدھا تیرا ہے آدھا میرا۔ پھر کیوں چیخ رہا ہے (نور غصہ سے دونوں مٹھیاں بند کرتا ہے زبیدہ اس کے غصہ کا خیال نہ کرکے پانی کے مٹکوں کے پاس جاتی ہے۔ مٹکا کھول کر دیکھتی ہے پھر فرش پر پڑے ٹوٹے ہوئے مٹکے کو دیکھتی ہے ایک اچٹتی نظر نور پر ڈالتی ہے اور بالٹی اٹھا کر نور کی طرف بڑھا کر) جا ایک بالٹی پانی لے آ۔ (نور غصہ سے بالٹی اس کے ہاتھ سے لے کر باہر چلا جاتا ہے زبیدہ کچھ دیر کھڑی دالان کا جائزہ لیتی رہتی ہے۔ شرافت خاموش چارپائی پر بیٹھا زبیدہ کو دیکھتا رہتا ہے زبیدہ کچھ دیر بعد جھاڑو اٹھا کر دالان صاف کرنے لگتی ہے اور بکھرا ہوا سامان بھی برابر جماتی جاتی ہے۔ کچھ دیر مکمل خاموشی رہتی ہے پھر شرافت اس خاموشی کو توڑ کر)

شرافت: تو تو نے اس سے شادی کرلی ہے۔

زبیدہ: (اپنے کام میں مشغول رہتے ہوئے) کس سے۔

شرافت: (نور سے)۔

زبیدہ: (نظریں اٹھا کر شرافت کو دیکھ کر) تو تم اسے جانتے ہو۔

شرافت: کیوں نہیں (آہستہ سے) بڑے معرکے رہے ہیں۔ خیر— (خاموش ہوجاتا ہے کچھ دیر گردن جھکائے بیٹھا رہتا ہے پھر آہستہ سے) مجھے یہاں لاکر اچھا نہیں کیا تو نے۔

زبیدہ: (اپنے کام میں مشغول رہتے ہوئے) کیوں۔

شرافت: اس لیے کہ اب تو دوسرے کی جورو ہے۔

زبیدہ: نور کی۔۔۔ (نظریں اٹھا کر شرافت کو دیکھتی ہے پھر اپنے کام میں مشغول ہوکر) میں نے اس سے شادی نہیں کی ہے۔

شرافت: شادی نہیں کی! (بیساکھی کے سہارے کھڑے ہوکر) اور اس کے ساتھ رہتی ہے (غصہ سے) پھر مجھے ذلیل کرنے یہاں کیوں لائی ہے۔

زبیدہ: (کام چھوڑ کر کھڑی ہوکر) جسے دیکھو وہی غصہ کرتا ہے (شرافت کو پھر چارپائی پر بٹھلاتی ہے اور بیساکھی اس کے ہاتھ سے لے کر ایک کونے میں رکھ کر) میں اس مکان میں رہتی ہوں اپنا کھاتی ہوں آدھے مکان کا کرایہ دیتی ہوں میں اس کے ساتھ ضرور رہتی ہوں مگر اس کے پاس نہیں۔ سمجھے۔

شرافت: مگر ایک عورت مرد کے ساتھ رہے۔ آگ پانی کا رشتہ ہے۔

زبیدہ: مجھے اپنی حفاظت کرنا آتا ہے۔

(نور بالٹی میں پانی لے کر آتا ہے اور اسے گھڑے کے پاس رکھ کر)

نور: یہ لے پانی اور منہ دھولے (زبیدہ بالٹی کے پاس جاتی ہے نور کی نظر پھر شرافت پر پڑتی ہے چہرے سے غصہ ظاہر ہوتا ہے مگر غصہ ضبط کرتے ہوئے اسے غور سے دیکھتا ہے چہرے کے تاثرات اس طرح تبدیل ہوتے ہیں جیسے اسے پہچان رہا ہو اس کے لب ہلتے ہیں پھر آہستہ سے) شرافت۔ (شرافت نظریں اٹھا کر نور کو دیکھتا ہے۔ نور ذرا اونچی آواز میں) شرافت تم یہاں؟ (شرافت کی طرف بڑھتا ہے اور چہرے کا غصہ تعجب میں تبدیل ہوجاتا ہے شرافت بیساکھی کی طرف ہاتھ بڑھاتا ہے اور اٹھنے کی کوشش کرتا ہے مگر چارپائی پر گرجاتا ہے پھر اٹھنے کی کوشش کرتا ہے۔ نور چند سیکنڈ اسے دیکھتا ہے پھر بیساکھی اٹھا کر اسے دیتا ہے اور مسکرا کر) کیا اب بھی لڑنے کا ارادہ ہے۔

شرافت: (بیساکھی کو مضبوط پکڑ کر) ہاں اگر ضرورت پڑی تو ضرور لڑوں گا۔
(نور قہقہہ مار کر ہنستا ہے جس سے شرافت کے چہرے پر غم و غصے کے ملے جلے جذبات و تاثرات پیدا ہوتے ہیں مگر نور کے چہرے کے تاثرات ہمدردی میں تبدیل ہو جاتے ہیں)۔ نور—

نور: شرافت بھائی تیری یہ حالت (شرافت بیساکھی کے سہارے اٹھنے کی کوشش کرتا ہے مگر نور اس کے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر بٹھلاتے ہوئے) یہ کیا حالت ہے شرافت بھائی۔
(شرافت کی آنکھوں میں آنسو آجاتے ہیں چند سیکنڈ خاموش رہ کر اپنے جذبات پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے۔ بھرائی آواز میں)

شرافت: سب قسمت کے کھیل ہیں۔

نور: قسمت کے کھیل! پر تو اس حالت میں۔

شرافت: ہاں۔ یہ سب کچھ ایک ریل کے حادثہ میں ہوا۔

نور: کیسا ریل کا حادثہ۔

شرافت: زبیدہ کو لے کر بمبئی جا رہا تھا کہ حادثہ ہوا اور—

نور: (تعجب سے) زبیدہ کو لے کر۔ زبیدہ تمھاری—

شرافت: (نظریں جھکا کر) میری بیوی ہے۔

نور: بیوی۔

شرافت: ہاں جب حادثہ ہوا تو وہ میرے ساتھ تھی۔ پر جب مجھے ہوش آیا تو میں اسپتال میں تھا اور زبیدہ— پھر مجھے اس کی کہانی معلوم نہیں۔ (شرافت خاموش ہو جاتا ہے۔ نور اس کو دیکھتا رہتا ہے۔ زبیدہ منہ دھو کر آتی ہے اور آئینہ کے سامنے کھڑی ہو کر بال برابر کرنے لگتی ہے۔ دونوں خاموشی سے) اسے دیکھتے رہتے ہیں زبیدہ بال برابر کر کے پلٹتی ہے اور دروازے کی طرف جاتے ہوئے)

زبیدہ: میں بازار سے سودا سلف لے آؤں۔

(زبیدہ باہر چلی جاتی ہے۔ دونوں کچھ دیر خاموش رہتے ہیں۔ کچھ دیر کی خاموشی کے بعد)

نور: کرایہ کا مکان ڈھونڈ رہی تھی کہ مجھے مل گئی (کچھ دیر خاموش رہ کر) مجھے کیا معلوم تھا کہ وہ تمھاری بیوی ہے۔

شرافت: اور اس نے تمھیں بتلایا بھی نہیں۔

نور: نہیں۔ (ٹھنڈی سانس بھر کر) یہ تک نہیں بتلایا کہ وہ شادی شدہ ہے شرافت بھائی میں (خاموش ہو جاتا ہے۔ شرافت سوالیہ نظروں سے اسے دیکھتا ہے مگر نور خاموش رہتا ہے کچھ دیر بعد آہستہ سے) اب مجھے یہ گھر چھوڑ دینا پڑے گا۔

شرافت: (غور سے نور کا چہرہ دیکھ کر) کیوں (نور کوئی جواب نہیں دیتا اپنے ہی خیالات میں کھویا رہتا ہے شرافت کچھ دیر خاموش رہ کر) نور— (نور نظریں اٹھا کر شرافت کو دیکھتا ہے) تم زبیدہ سے محبت کرنے لگے ہو۔

نور: پتا نہیں۔ (کچھ دیر خاموش رہ کر سوچتے ہوئے) کبھی کبھی سوچتا تھا کہ کیوں نہ اس سے شادی کرلوں (ٹھنڈی سانس بھر کر) اب تو سارا کھیل ہی ختم ہو گیا ہے۔

شرافت: (پھیکی مسکراہٹ سے) کھیل تو اب شروع ہوا ہے— مجھے زبیدہ کو طلاق دینا ہوگی۔

نور: طلاق! (شرافت کو تعجب سے دیکھتا ہے جو اپنا کٹا ہوا ہاتھ بیساکھی پر رکھے غور سے زمین دیکھ رہا ہے) شرافت بھائی۔

(شرافت نظریں اٹھا کر نور کو دیکھتا ہے۔ شرافت کی آنکھوں میں مایوسی اور ناامیدی ہے) کیا تم اسے طلاق دو گے۔ (شرافت (اثبات میں سر ہلاتا ہے) کیا وہ طلاق لینے کو تیار ہو جائے گی۔

شرافت: کیوں نہیں (پھیکی مسکراہٹ سے) وہ بے وقوف نہیں ہے جو انکار کرے۔
(کچھ دیر بعد زبیدہ آتی ہے دونوں کو بہت غور سے دیکھتی ہے جیسے ان کے دلی خیالات معلوم کرنا چاہتی ہو پھر لالٹین روشن کرتی ہے اور انتہائی خفیف مسکراہٹ سے)

زبیدہ: روشنی کا بھی دھیان نہیں۔ اندھیرا برا نہیں لگتا۔ (دونوں خاموش رہتے ہیں۔ زبیدہ چولہے کے پاس جاکر بیٹھ جاتی ہے اور گوندھنے کے لیے آٹا پیپے سے نکالتی ہے پھر نور کی طرف دیکھ کر) اندر کا پلنگ باہر لاکر رکھ دے (نور حیرت سے زبیدہ کی طرف دیکھتا ہے) ہاں ہاں ان کے لیے۔ میں زمین پر ہی سو جاؤں گی وہاں گرمی ہوتی ہے۔

نور: شرافت بھائی اگر۔

زبیدہ: کہہ تو رہی ہوں وہاں گرمی بہت ہوتی ہے اور مچھر بھی ہیں (نور پہلے شرافت کو پھر زبیدہ کو دیکھتا ہے۔ نور کوٹھری کا دروازہ کھول کر اندر چلا جاتا ہے۔
زبیدہ ذرا اونچی آواز سے) بستر بھی اٹھالانا۔ دری وہیں چھوڑ آنا۔
(نور پہلے چارپائی پھر بستر لاتا ہے اسے پلنگ پر بچھاتا ہے شرافت دونوں کو خاموشی سے دیکھتا رہتا ہے۔ نور اسے سہارا دے کر دوسرے پلنگ پر بٹھلاتا ہے پھر زبیدہ کو دیکھ کر مسکراتے ہوئے)

نور: آج تو اتنی خوش ہے کہ سبزی کے پیسے مانگنا ہی بھول گئی۔

زبیدہ: (آٹا گوندھنے میں مشغول رہتے ہوئے) آج تو بھی میرا مہمان ہے (مسکرا کر نظریں اٹھا کر) آج کے پیسے معاف۔

نور: (حیرت سے زبیدہ کو دیکھتا ہے پھر ٹھنڈی سانس بھر کر) شرافت بھائی آج زبیدہ بہت خوش ہے پہلی بار مسکرائی ہے (مایوسی کے لہجے میں) وہ تم سے بہت محبت کرتی ہے۔

(پردہ)

تیسرا ایکٹ

منظر

(وہی دالان۔ شرافت چار پائی پر بیٹھا خلا میں گھور رہا ہے۔ کبھی کبھی اس کی نظر پانی کے مٹکے کی طرف جاتی ہے۔ کچھ دیر بعد بیسا کھی کے سہارے اٹھ کر مٹکے کے پاس جاتا ہے اور اسے کھول کر دیکھتا ہے اور پھر مایوسی سے چارپائی پر آ کر بیٹھ جاتا ہے جیب سے بیڑی نکالتا ہے ایک پاؤں کا سہارا لے کر ماچس جلاتا ہے اور بیڑی جلا کر اس کا دھواں خلا میں چھوڑ کر اسے غور سے دیکھنے لگتا ہے اس کے چہرے سے پتا چلتا ہے کہ وہ پریشان ہے اور کھویا کھویا سا ہے کچھ دیر بعد زبیدہ کمرے میں آتی ہے چہرے پر تھکاوٹ کے آثار ہیں چہرے کا پسینہ پونچھتی ہے اور دوسری چارپائی پر بیٹھ کر سوچنے لگتی ہے شرافت خاموشی سے اس کا چہرہ دیکھتا رہتا ہے پھر آہستہ سے)

شرافت: کچھ پتا چلا۔ (زبیدہ خاموش رہتی ہے مگر نفی میں سر ہلاتی ہے شرافت سوچتے ہوئے) آخر چلا کہاں گیا اور پھر کچھ کہے سنے بغیر۔

زبیدہ: (بیزاری سے) بھاڑ میں جائے تین دن سے پریشان ہو رہی ہوں۔ سارا کاروبار چوپٹ ہو رہا ہے۔

شرافت: مگر اسے کچھ کہہ کر تو جانا چاہیے تھا۔

زبیدہ: کیا کہہ کر جاتا (غصے اور رنج کے لہجے میں) تم نے جانے کیا الٹی سیدھی باتیں کہہ دی ہوں گی۔

شرافت: الٹی سیدھی (زبیدہ کا چہرہ دیکھتا ہے پھر نظریں جھکا کر مجرمانہ لہجے میں) میں نے تو ایسی کوئی بات نہیں کہی۔

زبیدہ: تم نے کوئی بات نہیں کہی۔ وہ پاگل ہو گیا تھا کہ یوں چلا گیا۔ (شرافت خاموش رہتا ہے۔ زبیدہ غصہ اور رنج کے عالم میں چارپائی پر بیٹھی رہتی ہے۔ شرافت اس کے چہرے کے اُتار چڑھاؤ کو غور سے دیکھتا ہے کچھ دیر خاموشی

رہتی ہے شرافت کچھ سوچ کر آہستہ سے)

شرافت: زبیدہ۔ (زبیدہ اپنے خیالات میں کھوئی رہتی ہے) زبیدہ۔۔۔ (نظریں اٹھا کر شرافت کو دیکھتی ہے) کیا تو اس سے محبت کرتی ہے۔

زبیدہ: (غصہ سے) میں اس سے محبت کرتی ہوں یا نفرت جو کچھ بھی ہو مگر کیا میں اس کے اس احسان کو بھول جاؤں کہ ان دو سالوں میں اس نے نہ تو میرے ساتھ بدتمیزی کی اور نہ غنڈہ گردی۔

شرافت: تجھ سے زیادہ میں اس کا احسان مند ہوں (آنکھوں میں آنسو آجاتے ہیں کچھ دیر خاموش رہ کر) اب میں نے طے کرلیا ہے کہ میں تجھے طلاق دے دوں گا تا کہ۔۔۔

زبیدہ: اس سے شادی کرلوں۔ (طنزیہ لہجے میں) کیا بڑی بات سوچی ہے کیسا بڑا تیر مارا ہے اپنی وہ غیرت کہاں بیچ ڈالی؟ (نفرت سے) شرم نہیں آتی ایسی بات کرتے ہوئے۔

شرافت: شرم بھی آتی ہے اور غیرت بھی مگر۔۔۔ (خاموش ہوجاتا ہے اور اپنے کٹے ہوئے ہاتھ کی طرف دیکھ کر ٹھنڈی سانس بھر کر) زبیدہ! تو جوان ہے تجھے مرد کی حفاظت کی ضرورت ہے(نظریں جھکا کر تکلیف دہ مجرمانہ لہجے میں) نور ہی اب تیری حفاظت کرسکتا ہے۔

زبیدہ: نور ہی حفاظت کرسکتا ہے (پرعزم لہجے میں) میں اپنی حفاظت خود کرسکتی ہوں (کچھ دیر خاموش رہ کر) جانے کہاں پریشان ہورہا ہوگا۔

شرافت: جب تجھے اس کا اس قدر خیال ہے تو مجھے یہاں کیوں لائی تھی۔

زبیدہ: (غصہ سے) اس لیے کہ تم دونوں مل کر میرا سکون ختم کردو۔

(دونوں خاموش ہوجاتے ہیں کچھ دیر بعد خلیل اندر آکر)

خلیل: نور بھائی آیا۔ (زبیدہ نظریں اٹھا کر خلیل کو دیکھتی ہے پھر نفی میں سر ہلا کر نظریں جھکا لیتی ہے) مگر میں نے ابھی اسے گلی میں آتے دیکھا تھا۔

زبیدہ: گلی میں آتے دیکھا تھا۔ (پھر نظریں اٹھا کر خلیل کو دیکھتی ہے اور نفرت سے) گیا ہوگا رحمت کے گھر دلاری کے پاس (غصہ سے) مرنے دے جیسا کرے گا ویسا بھرے گا ہمیں فکر کیوں ہو (کچھ دیر خاموش رہ کر) تیری بہن اب کیسی ہے۔

خلیل: ویسی ہی ہے۔ ڈاکٹر نے رات سونے کی دوا دی تھی۔ ساری رات پڑی سوتی رہی۔

زبیدہ: صبح ڈاکٹر نے کوئی نئی دوا لکھی۔

خلیل: لکھی تو ہے مگر —

زبیدہ: (طنز سے) تو دوا نہیں لایا۔

خلیل: ہاں۔ اس کی دیکھ بھال میں ایسا لگا رہا کہ ٹھیلا لے کر جانے کی فرصت ہی نہیں ملی — اب دیکھو۔

زبیدہ: (بات کاٹ کر) ماں اس کی دیکھ بھال نہیں کر سکتی تھی کہ تو ٹھیلا لے کر چلا جاتا (جیب سے کچھ پیسے نکال کر خلیل کو دیتے ہوئے) جا اس کے لیے دوا لے آ — لے لے۔ جب ٹھیلا لے کر جائے تو مجھے واپس کر دینا۔ (خلیل پیسے لیتے ہوئے جھجکتا ہے)
ارے لے لے شرما کیوں رہا ہے۔
(خلیل پیسے لے لیتا ہے) جا دوڑ کر دوا لے آ۔ میں تیرے ہی گھر جا رہی ہوں جلدی آنا۔ (خلیل چلا جاتا ہے کہ کچھ دیر بعد زبیدہ اٹھ کر دروازے کی طرف جاتی ہے پھر مڑ کر شرافت سے) میں ابھی ابھی لوٹے آتی ہوں — اور ہاں — نور آجائے تو اسے جانے نہ دینا۔

شرافت: مگر نور۔

زبیدہ: جب آس پاس ہی چکر کاٹ رہا ہے تو یہاں بھی آئے گا (آگے بڑھتی ہے پھر رک کر) اس سے کوئی الٹی سیدھی بات نہ کہہ دینا۔

شرافت: (آہستہ سے) مجھے تھوڑا سا پانی پلاتی جا۔

34/

(زبیدہ واپس مٹکوں کے پاس جاتی ہے۔ اسے کھول کر دیکھتی ہے۔ پھر بالٹی اٹھا کر دروازے کی طرف جاتی ہے کہ نور داخل ہوتا ہے زبیدہ کے ہاتھ میں بالٹی دیکھ کر اسے لینے کی کوشش کرتے ہوئے)

نور: لا مجھے دے۔ پانی میں لادوں۔

زبیدہ: بس رہنے دے میں خود لے آؤں گی مجھے اپنا کام کرنا خود آتا ہے (نور خاموش رہتا ہے۔ زبیدہ باہر چلی جاتی ہے نور آہستہ آہستہ آ کر دوسری چارپائی پر بیٹھ جاتا ہے۔ شرافت پہلے تو اسے خاموشی سے دیکھتا ہے پھر آہستہ سے)

شرافت: کہاں غائب ہوگئے تھے۔ زبیدہ تین دن سے پریشان ہے جانے کہاں کہاں تمہیں ڈھونڈتی پھری ہے (نور خاموش رہتا ہے شرافت سوالیہ نگاہوں سے اسے دیکھتا رہتا ہے۔ نور گردن جھکائے برابر زمین کو دیکھتا رہتا ہے) (ان تین دنوں میں وہ پھیری لگانے بھی نہیں گئی۔ (نور اب بھی خاموش رہتا ہے شرافت اس کی خاموشی سے اکتا کر) ارے بابا کچھ تو بول۔ کہاں غائب ہوگیا تھا۔ کچھ تو بول۔

نور: کہیں نہیں شرافت بھائی۔

شرافت: پھر غائب کہاں رہا۔

نور: میں کہیں چلا جانا چاہتا تھا مگر جا نہ سکا (سوچتے ہوئے) جانے کیوں بار بار قدم اس گھر کی طرف اٹھ جاتے تھے کئی مرتبہ میں دروازے تک آیا مگر پھر ہمت کر کے واپس لوٹ گیا (اپنے دونوں ہاتھ اپنے سر پر پھیر کر) جانے کیوں یہ گھر چھوڑنے کو جی نہیں چاہتا۔ جانے کیوں۔

(نور خاموش ہوجاتا ہے۔ شرافت کسی گہری سوچ میں پڑ کر نور کو دیکھنے لگتا ہے اس کے چہرے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ کسی گہری سوچ میں کچھ فیصلے کرتا ہے پھر خود ہی ان کو رد کرتا ہے کچھ دیر خاموشی کے بعد)

شرافت: نور — یہ دلاری کون ہے؟

نور: دلاری؟ (نظریں اٹھا کر شرافت کو دیکھتا ہے پھر نظریں جھکا کر) ایک آوارہ اور بدچلن عورت ہے۔

شرافت: آوارہ اور بدچلن — جب زبیدہ تمھیں ڈھونڈتے ڈھونڈتے تھک گئی تو کہنے لگی کہ تم دلاری کے پاس گئے ہوگے۔

نور: میں اس کے پاس چلا جاتا مگر گیا نہیں (خاموش ہوجاتا ہے اور کھڑا ہوکر دالان میں ٹہلنے لگتا ہے اس کے چہرے پر پریشانی، اکتاہٹ بے چینی اور ناامیدی کے ملے جلے تاثرات ہیں۔ شرافت برابر سوالیہ نظروں سے نور کو دیکھتا رہتا ہے نور کچھ دیر خاموش رہ کر) شرافت بھائی۔ مجھے دلاری سے اب جانے کیوں نفرت ہوگئی ہے۔

(شرافت خاموش رہتا ہے اور اس کی آنکھوں میں آنسو چھلک آتے ہیں اپنے آنسو پونچھ کر)

شرافت: میں نے آکر تم دونوں کی خوشیوں کو لوٹ لیا ہے۔ وہ تم سے محبت کرنے لگی ہے اور تم — خیر میں۔

نور: مجھ سے محبت — ہنہ — (اس طرح مسکراتا ہے جیسے خود پر طنز کر رہا ہو) اور آج تک اس نے مجھ سے سیدھے منہ بات نہیں کی میری کسی چیز کو ہاتھ نہیں لگایا۔ (خاموش ہوجاتا ہے پھر کچھ دیر بعد) میں نے کبھی اس کے چہرے پر مسکراہٹ نہیں دیکھی جس روز تم آئے اس کے چہرے پر پہلی بار مسکراہٹ آئی۔ (خاموش ہوکر کچھ سوچتا ہے پھر شرافت کے پاس آکر) اب تم دونوں مل گئے ہو تو مجھے ہٹ جانا چاہیے اسی لیے میں چلا گیا تھا مگر —

شرافت: مجھے تو اسے چھوڑنا ہی پڑے گا آج نہیں تو کل وہ جوان ہے اور میں مجبور۔ بے بس۔ بے کار (آنکھوں میں آنسو آجاتے ہیں) مجھے چھوڑنا ہی پڑے گا۔

نور: وہ مجھ سے محبت نہیں کرتی (سوچتے ہوئے) شرافت بھائی وہ مجھ سے نفرت کرتی ہے (کچھ دیر خاموش رہ کر) وہ خلیل سے محبت کرتی ہے اس کا خیال

رکھتی ہے۔ اس کے دکھ درد میں شریک ہوتی ہے اس کی ہر طرح مدد کرتی ہے اسے مجھ سے کوئی لگاؤ نہیں۔ کوئی خیال نہیں۔

(شرافت کوئی جواب نہیں دیتا خاموشی سے سامنے تاکے جاتا ہے کچھ دیر بعد خلیل پھر آتا ہے اور نور کو دیکھ کر)

خلیل: ارے نور بھائی تم آگئے! کہاں چلے گئے تھے تمھیں سارے جہان میں ڈھونڈ ڈالا مگر تم نہیں ملے اور زبیدہ تو بے حد پریشان تھی (شرافت اور نور دونوں خاموش رہتے ہیں خلیل دونوں کو اس طرح خاموش دیکھ کر پریشان ہوجاتا ہے۔ کبھی نور اور کبھی شرافت کو دیکھتا ہے) آخر بات کیا ہے آپ دونوں یوں خاموش کیوں ہیں (اب بھی دونوں خاموش رہتے ہیں) زبیدہ کہاں ہے— نور بھائی کچھ تو کہو۔

شرافت: (نظریں اٹھا کر خلیل کو دیکھتا ہے) خلیل۔ (خلیل مڑ کر شرافت کو دیکھتا ہے شرافت کچھ دیر خاموش رہ کر) تم زبیدہ کو چاہتے ہو۔

خلیل: (گھبرا کر) میں!— نہیں۔

شرافت: نہیں۔ (ٹھنڈی سانس بھر کر) مگر وہ تم کو چاہتی ہے۔

خلیل: مجھ کو چاہتی ہے۔ یہ کیسے ہوسکتا ہے۔

شرافت: اس دنیا میں سب کچھ ہوتا ہے (ٹھنڈی سانس بھر کر) میں اسے طلاق دے رہا ہوں۔

خلیل: (حیرت سے) طلاق۔

شرافت: ہاں طلاق (قمیض کی آستین سے آنسو پونچھ کر) جانے کس بے گناہ کی بدعا لگی ہے کہ آج شرافت بھائی— خیر چھوڑو (بیساکھی کے سہارے کھڑا ہوجاتا ہے اور خلیل کے پاس جاکر) کسی پڑھے لکھے کو بلا لا میں طلاق نامہ لکھ دوں اور پھر یہاں سے چلا جاؤں— دور کہیں اپنی زندگی کے دن گزارنے کے لیے (اپنا کٹا ہوا ہاتھ اس کے کاندھے پر رکھ کر)

جا خلیل بلا لا — (ٹھنڈی سانس بھر کر) پھر وہ تجھے مل جائے گی۔

خلیل: مجھے مل جائے گی۔ (مایوسی کے لہجے میں) نہیں شرافت بھائی وہ مجھ سے ویسی محبت نہیں کرتی — (سوچتے ہوئے) وہ تو مجھے بچہ سمجھتی ہے بالکل بچہ — میرے لیے اس کی نگاہوں میں ممتا ہوتی ہے — (خاموش ہو جاتا ہے تھوڑی دیر بعد) وہ نور بھائی کو چاہتی ہے۔

شرافت: مگر اب میں یہاں ایک منٹ رہنا نہیں چاہتا — (پھر آکر چارپائی پر بیٹھ جاتا ہے) جا خلیل جا — جلدی جا — میرے سینے پر ایک بوجھ ہے طلاق دینے کے بعد وہ ہلکا ہو جائے (پھر کھڑا ہونے کی کوشش کرتا ہے مگر چارپائی پر اس طرح بیٹھ جاتا ہے جیسے تھک گیا ہو) جا خلیل مسجد کے امام صاحب کو ہی بلا لا — جا میرے بھائی۔

(خلیل دروازے کی طرف بڑھتا ہے — نور چیخ کر)

نور: نہیں نہیں — شرافت بھائی سوچ نہیں رہا ہے۔

شرافت: میں سوچ رہا ہوں نور — (بیساکھی کے سہارے کھڑا ہو کر خلیل کے پاس جا کر) جا خلیل۔ خلیل کھڑا رہتا ہے) ارے بھائی جا۔ (اپنے کٹے ہوئے ہاتھ سے خلیل کو دروازے کی طرف ڈھکیلتا ہے۔ خلیل باہر چلا جاتا ہے — شرافت پھر چارپائی پر بیٹھ جاتا ہے اور خلا میں گھورنے لگتا ہے — پھر نور کی طرف دیکھ کر ٹھنڈی سانس بھر کر) آج میرے پاپوں کی سزا مجھے مل رہی ہے — (طنزیہ مسکراتا ہے — آنسو آستین سے پونچھ کر) شاید خدا میرے گناہ معاف کر دے۔

(نور پہلے تو خیالات میں کھویا ہوا دالان میں ٹہلتا ہے اس کے چہرے کے اتار چڑھاؤ سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ کسی بڑی ذہنی اذیت میں مبتلا ہے — کچھ دیر خاموشی سے ٹہلتا رہتا ہے پھر شرافت کے پاس آکر)

نور: شرافت بھائی — (شرافت اپنے خیال میں کھوئے ہوئے نظریں اٹھا کر نور کو

دیکھتا ہے) شرافت بھائی زبیدہ کو طلاق نہ دو وہ تم سے بہت محبت کرتی ہے۔

شرافت: (کھوئے ہوئے انداز میں) مگر نور۔

نور: (بات کاٹ کر) نہیں شرافت بھائی طلاق نہ دو نہیں تو وہ خلیل سے نکاح کر لے گی اور میں اپنی پرانی زندگی کی طرف لوٹ جاؤں گا۔

شرافت: مگر اسے دینے کے لیے میرے پاس کیا رکھا ہے۔ سوائے طلاق کے۔

نور: اگر شرافت بھائی تم نے اسے طلاق دے دی تو میں (خاموش ہو جاتا ہے— شرافت سوالیہ نظروں سے اسے دیکھتا ہے نور کچھ دیر خاموش رہتا ہے پھر ایک دم جیسے جوش میں آکر) میں خلیل کو مار ڈالوں گا۔

شرافت: نور کیا کہہ رہے ہو۔

نور: سچ کہہ رہا ہوں نور بھائی کہ میں اسے جان سے مار ڈالوں گا۔ میں زبیدہ کو اس سے شادی کرتے نہیں دیکھ سکتا۔ (زبیدہ پانی کی بالٹی لیے ہوئے آتی ہے (نور اسے دیکھ کر) زبیدہ شرافت بھائی تجھے طلاق دے رہا ہے— (زبیدہ اس انکشاف پر دھیان نہ دے کر بالٹی مٹکوں کے پاس رکھتی ہے— نور جیسے اس کی بے التفاتی سے چڑ کر اونچی آواز سے) زبیدہ!

زبیدہ: (مڑ کر نور کو دیکھتے ہوئے) کیوں چیخ رہا ہے۔

نور: (زبیدہ کے پاس جا کر اس کے دونوں بازو پکڑ کر) شرافت بھائی تجھے طلاق دے رہا ہے زبیدہ طلاق۔

زبیدہ: (جھٹکے سے اپنے دونوں بازو چھڑا کر) چھوڑ میرے ہاتھ شرم نہیں آتی غیر عورت کے ہاتھ پکڑتے ہوئے۔

نور: غیر عورت! (پاگلوں کی طرح قہقہے لگا کر) غیر عورت شرافت بھائی تجھے طلاق دے رہا اور میں تجھے اپنی بیوی بناؤں گا۔

زبیدہ: اچھا— بڑا آیا بیوی بنانے والا۔

نور: ہاں— اگر گھی سیدھی انگلی سے نہیں نکلا تو ٹیڑھی ں سے نکال لوں گا— میں

خلیل کو جان سے مار ڈالوں گا۔

(زبیدہ خاموشی سے پانی کا گلاس شرافت کو دیتی ہے۔ نور غصے سے دالان میں ٹہلنے لگتا ہے۔۔ کچھ دیر بعد خلیل داخل ہوتا ہے نور اسے دیکھ کر) خلیل! میں تجھے جان سے مار ڈالوں گا۔ سمجھا جان سے۔

خلیل: (حیرت سے نور کو دیکھ کر) نور بھائی۔

نور بھائی: ہاں۔۔ جان سے مار ڈالوں گا۔۔ تو زبیدہ سے شادی کرنا چاہتا ہے نا۔۔

زبیدہ: بنیا تو لتا ہی نہیں اور تو جھکتا تو لنے پر جھگڑا کر رہا ہے۔

نور: مگر شرافت بھائی تجھے طلاق دے رہا ہے۔

زبیدہ: (غصہ سے) اور میں طلاق نہیں لے رہی ہوں۔ (شرافت کی طرف دیکھ کر) تم نے یہ کیا جھگڑا مچا رکھا ہے۔

شرافت: مگر زبیدہ۔۔ (اپنے کٹے ہوئے ہاتھ پاؤں کی طرف دیکھ کر) میں فضول، بے کس، اور بے کار انسان ہوں زبیدہ میں تیرے۔۔

زبیدہ: (غصہ سے بات کاٹ کر) میں نے تیرے ہاتھ پاؤں سے شادی نہیں کی تھی۔ (گلاس شرافت کے ہاتھ سے لے کر وہیں زمین پر رکھ کر) چلو یہاں سے اس گھر میں پھر غنڈہ گھس آیا ہے اب یہ گھر رہنے کے قابل نہیں۔۔ (شرافت کو جبراً سہارا دے کر کھڑا کرتی ہے اور دروازے کی طرف لے جاتی ہے دروازے کے پاس پہنچ کر مڑتی ہے اور خلیل کو دیکھ کر) تیری بہن کی حالت ٹھیک نہیں ہے اس کی جا کر خبر لے۔

نور: مگر زبیدہ۔

(زبیدہ مڑ کر نہیں دیکھتی۔۔ (شرافت کو سہارا دیے ہوئے باہر چلی جاتی ہے۔۔ نور اور خلیل خاموش کھڑے رہ جاتے ہیں۔۔

(پردہ)

(مطبوعہ 'افکار' کراچی، ستمبر 62)

مغلوبُ غالب

افرادِ تمثیل

(1) مرزا غالب (2) امراؤ بیگم (مرزا غالب کی بیوی) (3) کلو (مرزا غالب کا نوکر) (4) وفادار (مرزا غالب کی نوکرانی) (5) کلیانی (مرزا غالب کا ملازم) (6) دو گورے اور ایک دو ہندوستانی سپاہی (7) دو چار پڑوسی

منظر

(مرزا غالب دالان میں ایک گاؤ تکیہ سے ٹیک لگائے بیٹھے ہیں سامنے پیچوان رکھا ہے، چہرے سے پریشانی اور فکر مندی ظاہر ہو رہی ہے، کبھی کبھی پیچوان سے کش لیتے ہیں کچھ دیر بعد امراؤ بیگم دالان میں آتی ہیں ان کے چہرے پر پریشانی کے ساتھ غصہ بھی ہے۔ مرزا غالب نظر اٹھا کر امراؤ بیگم کو دیکھتے ہیں۔ امراؤ بیگم جھنجھلاہٹ سے)۔

امراؤ بیگم: ان صاحبزادوں نے تو ناک میں دم کر رکھا ہے ایسی ضد کرتے ہیں کہ۔۔۔

مرزا غالب: (بات کاٹ کر) کیا مقدمہ درپیش ہے بیگم جو یوں آپے سے باہر ہوئی جا رہی ہو۔

امراؤ بیگم: کیا مقدمہ درپیش ہوگا بس بضد ہیں کہ میٹھا پانی پییں گے کل بارش کا بدقت تمام ایک گھڑا پانی جمع کیا تھا سو وہ آپ کے لیے رکھ چھوڑا ہے۔ لاکھ سمجھایا کہ تمھارے دادا جان کے لیے ہے مگر سمجھتے ہی نہیں۔

مرزا غالب: (مسکرا کر) بیگم! وہ بارش ہی کا تو پانی ہے آب زمزم تو نہیں جو آپ اس کی یوں حفاظت کر رہی ہیں۔

امراؤ بیگم: لیکن کھاری پانی آپ کے مزاج کو موافق نہیں آتا۔ بچے بالے ہیں کھاری پانی ہی پی لیں گے۔

مرزا غالب: کھاری پانی کسے خوش آتا ہے بیگم۔ پانی انھیں پلا دیجیے (بلند آواز سے) وفادار۔ ارے بی وفا دار (ملازمہ وفادار اسی جانب سے آتی ہے جدھر سے امراؤ بیگم آئی تھیں اور مرزا غالب کے سامنے مؤدب کھڑی ہوجاتی ہے) صاحبزادوں کو بارش کا جمع کیا ہوا پانی پلا دو۔ کل پانی کیا برسا گویا آب رحمت برسا کہ ہم گنہگاروں کے حلق تر کر گیا۔

(وفادار خاموشی سے اسی طرف چلی جاتی ہے جدھر سے آئی تھی۔ امراؤ بیگم اس کے جانے کے بعد)

امراؤ بیگم: بس آپ کی انھیں ناز برداریوں نے تو انھیں ضدی بنا دیا ہے۔

مرزا غالب: بیگم! اب وہ ہم سے ضد نہیں کریں گے تو اور کس سے کریں گے آپ خود ہی دیکھتی ہیں کہ وہ مجھے کس کس طرح دق کرتے ہیں۔ ننگے پیر میری چادر پر چڑھ آتے ہیں، دن بھر پیسوں کا مطالبہ کرتے رہتے ہیں (مسکرا کر) آج تو چھوٹے صاحبزادے ایک روپیہ مجھ سے قرض حسنہ مانگ رہے تھے۔

امراؤ بیگم: لیکن ضد کی بھی ایک حد ہوتی ہے۔ اس طرح تو بچے ستیاناس ہوکر رہ جائیں گے۔

مرزا غالب: (بات ٹالنے کے انداز میں) ارے ہاں بیگم نواب ضیاء الدین احمد خاں نے آپ کے وظیفے کے روپے بھیجے یا نہیں۔

امراؤ بیگم: جی ابھی تک تو نہیں۔
مرزا غالب: ویسے تو وہ ہمیشہ روپیہ مقرر وقت پر بھیجتے رہتے ہیں۔
امراؤ بیگم: جی ہاں۔ اس بار جانے کیوں تاخیر ہوگئی۔
مرزا غالب: وہ خود مجبور ہوں گے۔ شہر تو دوزخ کا نمونہ بنا ہوا ہے۔ اگر ایک دو روز میں روپیہ نہیں آیا تو بس اللہ ہی اللہ ہے۔
امراؤ بیگم: توشہ خانے میں اب کچھ بھی نہیں ہے۔ شام کی فکر الگ کھائے جارہی ہے۔
مرزا غالب: (مسکرا کر) بیگم آپ تو نفلی روزے ہی شروع کردیں گی مگر میرا کیا ہوگا۔ اور پھر صاحب زادے ہیں ابھی تو ان پر روزے بھی فرض نہیں ہوئے ہیں۔
امراؤ بیگم: خدا کے لیے اس سخت وقت میں تو یوں تمسخر نہ کیجیے۔
مرزا غالب: (اللہ بیگم سچ کہتا ہوں۔ خیر مجھے بھی جانے دیجیے آخر گھر میں کلو ہے کلیان ہے نیاز علی اور ایاز ہیں۔ اور وفادار ہیں یہ کس پاداش میں بھوکے رہیں گے اور اگر بھوکے رہیں گے بھی تو دل میں یہی کہیں گے کہ مہاجن سخاوت کرتا ہے تو جنس پوری تول دیتا ہے مگر یہ کم بخت تو ایسا مہاجن ہے کہ ڈنڈی مارنا تو کجا تولنے کے بھی لائق نہیں۔
امراؤ بیگم: اب یہ لوگ بچے تو ہیں نہیں کہ حالات کو نہ دیکھ رہے ہوں (کلو داروغہ آتا ہے امراؤ بیگم اسے دیکھ کر) یہ لیجیے وہ کلو آ گیا۔
مرزا غالب: (کلو کی طرف دیکھ کر) کیوں میاں کلو کیا خبر لائے شہر کا کیا حال ہے۔
کلو: دھائیں دھائیں گولیاں چل رہی ہیں سرکار کیا گناہگار کیا بے گناہ جو بھی سامنے آتا ہے گولی کا نشانہ بن جاتا ہے۔
مرزا غالب: کچھ مرزا یوسف کی بھی خبر پائی؟
کلو: سرکار! شہر میں تو ایک قیامت صغریٰ بپا ہے۔ میں نے بہت کوشش کی مگر مہاراجہ پٹیالہ کے آدمیوں نے دیوار کی دوسری جانب جانے ہی نہیں دیا۔
مرزا غالب: مجھے اس کی فکر کھائے جارہی ہے وہ دیوانہ محض ہے جانے کس وقت کیا کر بیٹھے۔

کلو: ویسے ماما اور ملازم وہاں موجود ہیں جونہی حالات سازگار ہوں گے میں ان کی خبر لینے جاؤں گا۔

(مرزا غالب خاموش رہتے ہیں اور کچھ سوچنے لگتے ہیں۔ پھر ایک دم کلو کی طرف دیکھ کر)

مرزا غالب: ارے ہاں میاں کلو۔ کچھ کلیان کا بھی پتا ہے۔

کلو: وہ تو صبح ہی سے لاپتا ہے سرکار۔ خدا جانے زندہ بھی ہے یا کسی گورے کی گولی کا نشانہ بن گیا۔

مرزا غالب: خدا اسے اپنے حفظ و امان میں رکھے، میں نے اسے ایک ولایتی چغہ اور ایک شالی رومال ڈھائی گز کا دیا تھا کہ دلال کو دے کر روپیہ لے آئے کہ شکم پری کا سامان فراہم ہو۔

کلو: سارے بازار چوپٹ پڑے ہیں، سرکار دام بھی گرہ میں ہوں تو کس کی ہمت ہے کہ مہاجن کی دوکان تک جائے اور کون مہاجن ایسا ہے کہ دوکان کھول کر سودا سلف دے۔

مرزا غالب: (ٹھنڈی سانس بھر کر) بس تو اب توکل پر ہی گزارہ سہی (خاموش ہو جاتے ہیں پھر کچھ دیر بعد) کاش کلیان ہی کچھ مرزا یوسف کی خبر لے آئے، واللہ اس کا خیال آتا ہے تو دم سینے میں گھٹنے لگتا ہے۔

امراؤ بیگم: جانے بے چارے کس حال میں ہیں ایسے وقت میں ان کی بیوی اور لڑکی کا انھیں چھوڑ کر جے پور چلا جانا کچھ مناسب نہ تھا۔

مرزا غالب: آخر وہ نیک بخت بھی کیا کرتی۔ مرزا یوسف دیوانہ محض اور شہر موتہ کربلا آخر کس کے سہارے پڑی رہتی۔

امراؤ بیگم: کچھ روز کے لیے یہاں اٹھ آتیں لشتم پشتم ان کا گزارہ بھی ہو ہی جاتا اب ایسا بھی نہیں تھا کہ دو چار جانیں ہم پر بار ہوتیں۔

مرزا غالب: یہ کسے خبر تھی بیگم کہ ہوا کا رخ یوں پلٹے گا ورنہ کیا یہ ممکن تھا کہ میں

مرزا یوسف کو وہاں تنہا چھوڑ دیتا (مسکرا کر) بیگم واللہ اب تو روز قیامت پر بھی یقین کرنے کو جی چاہنے لگا۔

امراؤ بیگم: دیکھیے آپ نے پھر—

مرزا غالب: (بات کاٹ کر) سچ کہتا ہوں بیگم۔ جب یہاں یہ نفسی نفسی ہے تو وہاں کیا عالم ہوگا مگر پھر سوچتا ہوں کہ وہاں بھی کچھ نیک نفس ایسے ضرور مل جائیں گے جو مجھ جیسے انسان کی دست گیری کر سکیں (باہر شور وغل اور چیخ پکار مرزا غالب گھبرا کر) میاں کلو! جا کر خبر لاؤ آخر ماجرا کیا ہے۔

(کلو تیز تیز قدموں سے چلا جاتا ہے۔ مرزا غالب کھڑے ہوکر پریشانی کے عالم میں ٹہلنے لگتے ہیں۔ کچھ دیر بعد کلو آ کر)

کلو: سرکار! کچھ گورے دیوار پھاند کر اندر گھس آئے ہیں اور مہاراجہ پٹیالہ کے سپاہیوں سے تکرار کر رہے ہیں۔ وہ گھر میں گھسا ہی چاہتے ہیں۔

مرزا غالب: لاحول ولا قوۃ الا باللہ (امراؤ بیگم سے) آپ اندر جائیے۔ جانے کم بخت کیا فساد پیدا کریں۔

(امراؤ بیگم تیز تیز قدموں سے جدھر سے آئی تھیں اسی طرف چلی جاتی ہیں مرزا غالب برابر دالان میں ٹہلتے رہتے ہیں کچھ دیر بعد دو تین گورے اور دو تین ہندوستانی سپاہی اندر آتے ہیں۔ ایک گورا مرزا غالب کو دیکھ کر)

پہلا گورا: ول تم ہی مرزا نوشہ ہے۔

مرزا غالب: ہاں میں ہی مرزا نوشہ ہوں۔

پہلا گورا: تم ہی بادشاہ کی غزلیں بناتا تھا۔

مرزا غالب: ہاں میں ہی یہ مزدوری کرتا تھا۔

دوسرا گورا: مزدوری کرتا تھا یا اس کا نوکر تھا۔

مرزا غالب: اسے مزدوری سمجھو یا نوکری مگر اس فتنہ آشوب میں میں نے کسی مصلحت میں دخل نہیں دیا۔

دوسرا گورا: ہم کیسے جانیں کہ تم بادشاہ دہلی کا وفادار نہیں۔

مرزا غالب: نہ میں کالوں کے زمانہ میں کہیں گیا اور نہ گوروں کے زمانے میں گھر سے نکلا کرنل برون صاحب کے زبانی حکم پر میری یہاں اقامت کا مدار ہے اور اب تک کسی حاکم نے وہ حکم نہیں بدلا۔

پہلا گورا: پھر تم کو کرنل برون کے سامنے اپنی صفائی دینا ہوگی (مرزا غالب کچھ سوچتے ہیں) کیا سوچتا ہے۔ تمھیں ضرور کرنل برون کے سامنے چلنا ہوگا۔

مرزا غالب: خیر بھائی چلتا ہوں (آگے بڑھتے ہیں) چلیے۔

(آگے آگے مرزا غالب اور پیچھے پیچھے گورے اور کالے سپاہی جاتے ہیں وفادار تیز تیز قدموں سے آکر کلو سے)

وفادار: بیگم صاحبہ فرماتی ہیں کہ تم بھی سرکار کے ساتھ چلے جاؤ ان کی خبر گیری کرنا۔

(کلو بھی تیز تیز قدموں سے ان لوگوں کے پیچھے پیچھے مکان سے چلا جاتا ہے وفادار وہیں کھڑی رہ جاتی ہے کہ امراؤ بیگم آتی ہیں چہرے پر فکرمندی ہے اور ٹکٹکی باندھے اس طرف دیکھتی رہتی ہیں جس طرف مرزا غالب گئے ہیں وفادار کچھ دیر انھیں دیکھتی رہتی ہے آنکھوں میں آنسو آتے ہیں اور پھر ایک دم ہچکیوں سے رونے لگتی ہے۔ امراؤ بیگم وفادار کو دیکھ کر)

امراؤ بیگم: بھئی وفادار خدا کے لیے اس وقت یہ رونے دھونے کی نحوست نہ پھیلاؤ۔ خدا گواہ مجھے بڑی وحشت ہوتی ہے، جانے کیوں بدشگونی نظر آتی ہے (وفادار برابر روتی رہتی ہے۔ امراؤ بیگم اس کے رونے سے متاثر ہوکر اس کے سر پر محبت سے ہاتھ پھیر کر اپنے آنسو ضبط کرتے ہوئے) بیٹی خدا سے لو لگا۔ وہی مشکل کشا ہے ہر مشکل آسان کرتا ہے۔

وفادار: (آنسو پونچھ کر ہچکیوں پر قابو پاکر) خدا ان گوروں کا ستیاناس کرے کم بختوں نے شریر اور شریف کا فرق ہی مٹا دیا ہے۔

امراؤ بیگم: وبا اور وبال نے نیک اور بد میں کبھی فرق کیا ہے بس خدا ہی ان سے محفوظ رکھے۔

وفادار: لیکن بیگم صاحبہ سرکار کو بھی اس ہنگامے سے واسطہ نہیں رہا کبھی کبھی قلعے جاتے تھے سو وہ بھی مجبوری میں کہ بادشاہ سلامت کا حکم تھا۔

امراؤ بیگم: خدا پر نظر رکھ بیٹی اور دعا کر کہ خدا ان کو اپنے حفظ و امان میں رکھے اور سلامتی سے واپس لائے۔

وفادار: گورے کیا ہیں قہر الٰہی ہیں۔ سنتی ہوں سارے شہر کو ملیامیٹ کردیا ہے۔

(کلیان داخل ہوتا ہے سر پر ایک بڑی سی چوٹی ہے اور دھوتی باندھے ہے بغل میں کپڑے میں لپٹی ایک بوتل اور کاندھے پر ایک وزنی تھیلا ہے، تھیلا زمین پر رکھ کر کپڑے میں لپٹی بوتل اس پر رکھتا ہے اور امراؤ بیگم کو دیکھ کر آنکھوں میں آنسو بھر کر)

کلیان: بیگم صاحبہ! ابھی میں نے دیکھا کہ سرکار کچھ گورے سپاہیوں کے ساتھ —

(آواز رندھ جاتی ہے۔ وہ خاموش ہوکر آستین سے آنسو پونچھتا ہے۔ امراؤ بیگم اس کی طرف دیکھ کر پریشانی کے لہجے میں)

امراؤ بیگم: بھئی تم لوگ مجھے دیوانی بنا کر دم لو گے۔ (چند سیکنڈ خاموش رہ کر) کدھر جارہے تھے وہ لوگ۔

کلیان: حاجی قطب الدین سوداگر کے مکان کی طرف وہیں کچھ گوروں کا کیمپ ہے۔

امراؤ بیگم: تیری ان سے بات ہوئی۔

کلیان: جی نہیں۔ میں خود نظر بچا کر چلا آیا کہ دیکھوں کیا بات ہے۔ کچھ تدبیر کروں (امراؤ بیگم خاموش رہتی ہیں کلیان کچھ سوچ کر) اگر بیگم صاحبہ آپ حکم دیں تو میں پنڈت شیو جی رام یا منشی ہیرا سنگھ جی کی خدمت میں جاؤں شاید وہ کوئی تدبیر کرسکیں۔

امراؤ بیگم: (سوچتے ہوئے) وہ بھی ایسے وقت میں گھر سے کیوں نکلنے لگے۔

کلیان: بیگم صاحبہ! مسلمان کی شکل دیکھ گورے گولی مار دیتے ہیں مگر ہندو سے کچھ زیادہ باز پرس نہیں ہے اسی لیے ننگے سر پھرتا ہوں کہ چوٹی نظر آتی رہے اور

ہاں بیگم صاحبہ ان گوروں نے میاں کالے صاحب کی حویلی میں تو ایسی جھاڑو پھیری ہے کہ ایک تار بھی نہ بچا ہوگا۔

امراؤ بیگم: (گھبرا کر) کیا کہتا ہے کلیان وہ تو مذہبی آدمی ہیں ان کی اس ہنگامے سے کیا نسبت—

کلیان: سچ کہہ رہا ہوں بیگم صاحبہ۔ میں ادھر ہی سے آ رہا ہوں ساری حویلی کھنڈر بنی ہوئی ہے۔

امراؤ بیگم: الحمدللہ علی کل حال (ٹھنڈی سانس بھر کر) جانے کون سے گناہ کیے ہیں جس کی سزا مجھے یوں مل رہی ہے۔

کلیان: بیگم صاحبہ! ایک کالے صاحب کا کیا رونا سارا شہر کھنڈر بن چکا ہے (امراؤ بیگم خاموش رہتی ہیں۔ تھوڑی دیر بعد مرزا غالب چہرے پر پریشانی مگر ہونٹوں پر مسکراہٹ لیے داخل ہوتے ہیں۔ مرزا کو دیکھ کر امراؤ بیگم کی آنکھوں میں آنسو آ جاتے ہیں اور بے اختیار زبان سے نکلتا ہے)

امراؤ بیگم: خدا تیرا لاکھ لاکھ شکر و احسان ہے (مرزا کی طرف دیکھ کر) آپ کو کوئی صدمہ تو نہیں پہنچا۔

(مرزا غالب گاؤ تکیہ سے لگ کر بیٹھ جاتے ہیں اور مسکراتے ہوئے)

مرزا غالب:
تھی خبر گرم کہ غالب کے اڑیں گے پرزے
دیکھنے ہم بھی گئے تھے پہ تماشا نہ ہوا

بیگم: واللہ آج تو میرے آدھے مسلمان ہونے نے میری جان بچالی۔

امراؤ بیگم: خدا را تمسخر کسی اور وقت کے لیے اٹھا رکھیے اس وقت تو یہ کلمات کفر زبان پر نہ لائیے۔

مرزا غالب: علیؑ کا بندہ ہوں۔ سچ بیگم جھوٹ نہیں بولتا۔ اگر پورا مسلمان ہوتا تو آج نواب احمد بخش کی بھتیجی اور الٰہی بخش خاں معروف کی بیٹی بیوہ ہوگئی ہوتی۔ انا للہ وانا الیہ راجعون (امراؤ بیگم جانے کے لیے مڑتی ہیں)) واللہ بیگم

کہاں تشریف لے چلیں امر واقعہ تو سنتی جایئے۔

امراؤ بیگم: میں پہلے شکرانے کا دوگانہ ادا کرلوں پھر حاضر ہوتی ہوں۔

مرزا غالب: دوگانہ بھی ادا کر لیجیے گا۔ اب سنیے۔ جب میں کرنل برون کے سامنے پیش ہوا تو اس نے میرے سر پر کلاہ پپاخ۔ ایک بر کا پاجامہ سفید ململ کا انگرکھا اور اس پر یہ قبا دیکھ کر کہا— ''ول تم مسلمان ہے'' میں نے کہا، آدھا— اس پر وہ حیران ہوا اور کہا آدھا کیسا؟ میں نے کہا شراب پیتا ہوں سور نہیں کھاتا وہ مسکرایا اور باعزت رہائی کا حکم دے دیا۔ اب فرمایئے کیا پورے مسلمان کو یہ سعادت نصیب ہوتی۔ (امراؤ بیگم مسکراتی ہیں اور جانے کے لیے مڑتی ہیں۔ مرزا غالب انھیں جاتا ہوا دیکھ کر) بیگم! ایک بات تو بتلایئے۔

امراؤ بیگم: (مڑ کر مرزا غالب کو دیکھ کر) جی فرمایئے۔

مرزا غالب: (مسکرا کر) بیگم! کیا ایسا نہیں ہوسکتا کہ آپ نے تمام زندگی جو نمازیں پڑھی ہیں انھی میں سے دو رکعت میری رہائی کے نام پر منہا کرادیں۔

امراؤ بیگم: (مسکرا کر) آپ بھی کیسی باتیں فرماتے ہیں۔

(مرزا غالب کی نظر بورے پر رکھی ہوئی بوتل پر پڑتی ہے۔ بہت تیزی سے اٹھ کر بوتل اٹھاتے ہیں کپڑے میں بوتل نکال کر)

مرزا غالب: واللہ بیگم خدا مانگنے پر موت نہیں دیتا مگر بے مانگے شراب ضرور دیتا ہے۔ (بوتل کو اوپر اٹھا کر غور سے دیکھ کر) اولڈ ٹام۔ (کلیان کی طرف دیکھ کر) کیوں بھئی کلیان۔ اس سب کی کیا تفسیر ہے۔

کلیان: میں سامان لے کر دلال کے پاس گیا تھا اس نے سامان رکھ لیا ہے اور کہا ہے رقم ملنے پر پہنچا دی جائے گی۔

مرزا غالب: اب دلال جائے بھاڑ میں (بوتل کلیان کی طرف کرکے) میں اس کی تفسیر پوچھ رہا ہوں۔

کلیان: واپسی پر راستے میں لالہ مہیش داس مل گئے تھے۔ انھوں نے آپ کو تحفے میں

بھیجی ہے (بورے کی طرف اشارہ کرکے) اور پنڈت شیو جی رام نے کچھ غلہ ساتھ کردیا ہے کہ آپ کو تکلیف نہ ہو۔

مرزا غالب: (امراؤ بیگم کی طرف دیکھ کر) قسم ذات پاک کی بیگم اب سفر مفر نہیں بہشت جاودانی میرے نصیب میں ہے سمجھیں آپ کیسے؟

امراؤ بیگم: (مسکرا کر) فرمایئے۔

مرزا غالب: عاصی ہوں، گنہگار ہوں۔ زندگی میں کوئی نیکی کا کام نہیں کیا مگر اچھے دوست بنانے کا۔ جو دنیا میں میری بیکسی پر یوں ترس کھا کر کھانے کو غلہ اور پینے کو شراب دیتے ہوں کیا روز حشر وہ اپنی کچھ نیکیاں میری جھولی میں نہ ڈال دیں گے کہ میں میزان عدالت میں رکھ سکوں اور خدا سے عرض کروں کہ میں ہوں روسیاہ نجات کا طالب غالب۔

(امراؤ بیگم کچھ دیر خاموش رہ کر)

امراؤ بیگم: کلیان خبر لایا ہے کہ میاں کالے صاحب کی حویلی کو گوروں نے ڈھا ڈالا۔

(مرزا غالب کلیان کی طرف دیکھتے ہیں)

کلیان: جی ہاں۔ میں ادھر ہی سے ہو کر آرہا ہوں۔ ساری حویلی اینٹوں اور پتھروں کا ڈھیر بنی ہوئی ہے۔

مرزا غالب: (ٹھنڈی سانس بھر کر) ایک میاں کالے صاحب کی حویلی کا کیا رونا بیگم سارا شہر کھنڈر ہے از راہ احتیاط زبان نہیں ہلاسکتا۔ ورنہ "دلی جو ایک شہر تھا عالم میں انتخاب—" اب کیا ہے یا تو اینٹوں کا ڈھیر یا پتھروں کا انبار ایک ہو کا عالم۔

امراؤ بیگم: مگر میاں کالے صاحب کی حویلی۔

مرزا غالب: (بات کاٹ کر) ایک میاں کالے صاحب کی حویلی کس گنتی میں ہے بیگم— (ٹھنڈی سانس بھر کر) اگر کوئی سیاح آئے تو دریبہ، چاوڑی، اجمیری دروازہ کا بازار، اردو بازار، بلاقی بیگم کا کوچہ، خاں دوراں کی حویلی ان سب کے

35

کھنڈر گنتا پھرے اور کہے کہ اس شہر کو دلی والے عالم میں انتخاب کہتے تھے۔

امراؤ بیگم: مگر میاں کالے کی حویلی میں میں نے اپنے زیورات اور قیمتی پوشاکیں منتقل کردی تھیں۔

مرزا غالب: (امراؤ بیگم کا چہرہ غور سے دیکھ کر پریشانی کے لہجے میں) اور واللہ بیگم آپ نے اس امر کی ہمیں اطلاع تک نہیں دی۔

امراؤ بیگم: میں نے سوچا تھا کہ میاں کالے صاحب مذہبی آدمی ہیں نہ ان سے بازپرس ہوگی اور نہ کسی قسم کی داروگیر۔ فسادی بھی ان کے تقدس کی بنا پر ان کا احترام کریں گے اور قیمتی اشیاء وہاں محفوظ رہیں گی۔

مرزا غالب: میرا داروگیر سے بچ نکلنا کرامت اسداللٰہی ہے مگر یہ نقصان قہر الٰہی— (ٹھنڈی سانس بھر کر) "نہ لٹتا دن کو تو کب رات کو میں بے خبر سوتا رہا کھٹکا نہ چوری کا دعا دیتا ہوں رہزن کو" (مرزا غالب پریشان اور فکر مند بیٹھ جاتے ہیں امراؤ بیگم اور وفادار آہستہ آہستہ چلی جاتی ہیں۔ کلیان بھی غلہ کا بورا اٹھا کر چلا جاتا ہے کچھ دیر بعد کلو داروغہ آتا ہے مرزا غالب کلو کو دیکھ کر) بھئی میاں کلو مجھ بوڑھے کو یوں ستانا کیا واجب ہے میں اپنی فکر میں پریشان تھا جو پلٹ کر دیکھتا ہوں تو میاں کلو غائب واللہ کیا دہشت ہوئی ہے کہ الامان والحفیظ۔

کلو: بندہ پرور— میں نے سوچا فراش خانے کی طرف سے سرس گلی ہوتا چلوں۔

مرزا غالب: (بے چینی سے) پھر مرزا یوسف کی کچھ خبر لائے۔

کلو: ماما اور ملازم کو پریشان کر رکھا ہے۔ جب گولیوں کی آواز سنتے ہیں گھر سے باہر تشریف لے آتے ہیں کل رات کچھ گورے گھر میں گھس آئے تھے۔

مرزا غالب: خدا اس دیوانے کے حال پر رحم فرمائے۔ کوئی ناخوشگوار واقعہ تو پیش نہیں آیا۔

کلو: ماما اور ملازم کے گڑگڑانے پر اور تو کچھ نہیں کیا مگر کچھ سامان ضرور اٹھا لے گئے۔

مرزا غالب: الحمدللہ علیٰ احسانہ اس لوٹ کھسوٹ میں نہ بڑا بھائی بچا نہ چھوٹا (چند سیکنڈ

خاموش رہ کر) بھئی ماما اور ملازم کو سمجھا دیا ہوتا کہ احتیاط برتیں کہیں خدا نخواستہ کوئی ناخوشگوار واقعہ نہ ہوجائے۔

کلو: وہ دونوں خود ان کے لیے پریشان ہیں۔ دونوں نے ڈیوڑھی میں بستر ڈال رکھے ہیں مگر وہ برابر ان سے باہر جانے کے لیے جھگڑا کرتے رہتے ہیں ابھی ابھی بھی جھگڑا کر رہے تھے۔

مرزا غالب: پھر؟

کلو: بہزار دقت انھیں اندر کیا۔ گورے ہیں کہ آس پاس منڈلا رہے ہیں آس پاس کے کئی مکانوں کو لوٹ چکے ہیں۔

مرزا غالب: میاں کلو کیا یہ ممکن نہیں اسے کسی طرح یہاں لایا جاسکے۔

کلو: سرکار! کوئی سیانا آدمی ہوتو احتیاط برتے اور چلا آئے— مگر

مرزا غالب: مہاراجہ پٹیالہ کے آدمیوں سے گفتگو کرو شاید وہ کچھ تدبیر کرسکیں۔

کلو: وہ کیونکر جائیں گے— انھیں حکم ہے کہ وہ صرف اس علاقہ کی نگرانی کرتے رہیں۔

مرزا غالب: علاقے کی نگرانی بھی کیا خاک کرتے ہیں ان میں اتنی جرأت تو ہے نہیں کہ باہر جاکر پانی لاسکیں۔ بہرحال ہوسکتا ہے کہ وہ کچھ دستگیری کریں اور دیوانہ جان سے نہ جائے۔

کلو: آپ حکم فرماتے ہیں تو میں ان سے بات کرتا ہوں بہت ممکن ہے کوئی تدبیر نکل آئے۔

مرزا غالب: ہاں میاں مجھ پر یہ احسان کرو۔ واللہ یہ احسان خاص میری ذات پر ہوگا۔

کلو: سرکار احسان کیسا۔ زندگی بھر آپ کا نمک کھایا ہے اگر یہ جان بھی آپ کے کام آئے تو سمجھوں جان کی قیمت پائی۔

مرزا غالب: کیا کہوں کہ جی اس کے دیکھنے کو کس قدر بے چین ہے مگر از راہ احتیاط گھر سے قدم باہر نہیں نکال سکتا۔

کلو: ان گوروں کے لشکر نے تو فتنۂ دجال کو بھی شرما دیا ہے۔ وہ قیامت ڈھائی

ہے کہ ہر شخص نفسی نفسی چلا رہا ہے۔

مرزا غالب: (ٹھنڈی سانس بھر کر) نہ یہ گوروں کا فتنہ ہے نہ کالوں کا عذاب۔ یوم الحساب ہے کہ ہر ایک اپنے اپنے گناہوں کا حساب چکا رہا ہے۔

(مرزا یوسف کا نوکر گھبرایا ہوا آتا ہے اس کے چہرے سے پریشانی اور وحشت ظاہر ہو رہی ہے۔ مرزا غالب کو دیکھ کر)

نوکر: حضور۔ سرکار۔

(خاموش ہو جاتا ہے اور آنکھوں میں آنسو آجاتے ہیں مرزا غالب گھبرا کر کھڑے ہو جاتے ہیں اور نوکر کی طرف دیکھ کر)

مرزا غالب: میاں کچھ تو بولو مجھ ستم رسیدہ کی زندگی یوں وبال نہ کرو۔

نوکر: حضور — سرکار ایک گورے کی گولی سے۔

مرزا غالب: (ٹھنڈی سانس بھر کر) شہید ہوگئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

(کچھ دیر بالکل خاموش کھڑے رہتے ہیں پھر نوکر کی طرف دیکھ کر) میاں! یہ واقعہ کیونکر ہوا۔

نوکر: چند گورے گلی میں گھس آئے تھے۔ دھنا دھن گولیاں چلا رہے تھے۔ سرکار باہر جانے لگے میں نے ہر چند روکا مگر مجھ بڈھے سے بے قابو ہو کر باہر نکل ہی گئے اور پھر ان کمبخت گوروں نے یہ نہ سوچا کہ دیوانے آدمی ہیں دھائیں دھائیں گولیاں چلا دیں۔

(مرزا غالب بے حد پریشانی کے عالم میں دالان میں ٹہلنے لگتے ہیں کلو کچھ دیر خاموشی کے بعد)

کلو: میں جا کر کچھ محلے والوں کو جمع کرتا ہوں کہ۔

مرزا غالب: (ٹھنڈی سانس بھر کر) ہے کون جو آئے گا گھر کے گھر بے چراغ پڑے ہیں۔

ملازم: میں نے پٹیالے والے سپاہیوں سے کہا تھا ان میں سے ایک کچھ لوگوں کو جمع کرنے گیا ہے۔

مرزا غالب: مگر آئے گا کون۔ واقعہ سخت ہے اور جان عزیز۔

کلو: اگر کوئی نہ بھی آیا تو حضور کے نمک خوار کیا کم ہیں۔

مرزا غالب: غسال کہاں سے آئے گا۔ گورکن کہاں نصیب ہوں گے کفن کے لیے کون سا بزاز اپنی جان ہتھیلی پر رکھے گا (ٹھنڈی سانس بھر کر) لوگ اپنی بے رونقی اور تباہی کے غم میں مرتے ہیں اس وقت جو غم مجھ کو ہے اس کو بیان بھی نہیں کرسکتا۔ زندہ ہوں مگر زندگی وبال ہے۔

(ایک سپاہی اور چند لوگ آتے ہیں)

پہلا شخص: مرزا صاحب! ہمیں افسوس ہے کہ — خدا اس شہید کو جنت الفردوس عطا فرمائے۔

مرزا غالب: میاں! آپ حضرات تشریف لائے میری عزت بڑھائی یہ بہت ہے مگر۔

دوسرا شخص: آپ فکر نہ فرمائیں ہم سے جو کچھ بن سکے گا حتی المقدور اس میں کوتاہی نہ کریں گے۔ ہم فراش خانے کی طرف جاتے ہیں جو بھی تدبیر بن پڑے گی وہ ضرور کریں گے۔

مرزا غالب: خدا آپ کو اس کا اجر دے گا۔ مرزا یوسف تو دیوانہ تھا مگر میں تو ہوش و حواس میں ہوں یہ کیونکر ممکن ہے کہ میں آپ کے ساتھ نہ چلوں۔

دوسرا شخص: آپ کا گھر سے نکلنا مصلحت وقت نہیں ہے آپ تشریف رکھیے اور ہمیں اجازت دیجیے۔

مرزا غالب: مگر میاں اس وقت غسال اور گورکن کا کہاں سے انتظام ہوگا۔

پہلا شخص: یہ فرائض تو ہم خود ہی انجام دے لیں گے مگر بزاز کا اس وقت ملنا واقعی امر محال ہے۔

مرزا غالب: (کلو کی طرف دیکھ کر) میاں کلو بیگم سے کہو گھر سے سفید چادریں دے دیں۔ (آنکھوں میں آنسو بھر کر) نیا کفن نہ سہی پرانی چادریں ہی سہی (کلو گھر کے اندر چلا جاتا ہے۔ مرزا غالب سب کی طرف دیکھ کر) واللہ حضرات آپ مجھ پر وہ احسان عظیم فرما رہے ہیں کہ تا زندگی میں فراموش نہ کرسکوں گا۔

پہلا شخص: حضرت آپ کیا فرما رہے ہیں کیا ہم آپ کے مرتبے سے واقف نہیں اور پھر حق ہمسائیگی بھی کوئی چیز ہے ہم آپ کے ان احسانوں کو کیونکر فراموش کرسکتے ہیں جو آپ ہم پر فرماتے رہے ہیں۔

(کلو چادریں لے کر آتا ہے مرزا غالب چادروں کو دیکھ کر)

مرزا غالب: مرزا یوسف یہ نہ کہنا کہ تیرا بھی کوئی بھائی تھا جب موت آئے گی تو تیرے پاس آرہوں گا اپنی بے کسی اور مجبوری کی تجھ سے داد چاہوں گا (سب کی طرف دیکھ کر) حضرات خدا حافظ (سب لوگ آہستہ آہستہ گردن جھکائے چلے جاتے ہیں مرزا غالب تنہا کھڑے رہ جاتے ہیں کچھ دیر بعد امراؤ بیگم آہستہ آہستہ آتی ہیں ان کی آنکھوں میں آنسو ہیں مرزا غالب انھیں دیکھ کر) آپ کی آنکھوں میں آنسو! بیگم نہ یہ شکر کا مقام ہے نہ شکایت کا۔ غالب رحمۃ اللہ علیہ کا یہ شعر کس قدر حسب حال ہے:

ہوچکیں غالب بلائیں سب تمام
ایک مرگ ناگہانی اور ہے

(گاؤ تکیہ سے لگ کر بیٹھ جاتے ہیں اور خلا میں گھورتے ہوئے)

"اے مرگ ناگہاں تجھے کیا انتظار ہے"

(پردہ)

(مطبوعہ ماہنامہ 'شاعر' بمبئی غالب نمبر فروری مارچ 69)

نقلی خوشیاں اصلی چہرے

افرادِ تمثیل

(1) پرویز (ایک خوش حال نوجوان) (2) قدسیہ (پرویز کی بیوی) (3) منصوری (پرویز کا دوست) (4) رقیہ (منصوری کی بیوی) (5) فاطمہ (ایک اجنبی عورت)

منظر

(ایک خوش حال کھاتے پیتے گھرانے کا ڈرائنگ روم جس میں ہر چیز سلیقہ سے سجی ہوئی ہے ابتدائی سردیوں کے دن اور صبح کا وقت ہے موسم خوش گوار ہے قدسیہ میز کے پاس کھڑی ہوئی ایک دعوت نامہ دیکھ رہی ہے کچھ دیر خاموشی سے دعوت نامہ دیکھتی رہتی ہے پھر اسے میز پر ڈال کر کلنڈر دیکھتی ہے چند سیکنڈ اسے دیکھتی رہتی ہے پھر آہستہ آہستہ کونے میں رکھے گل دان کے پاس جاتی ہے جس میں تازہ پھول سجے ہوئے ہیں۔ پھولوں کو بلا ضرورت برابر کرتی ہے پھر پاس والی کھڑکی کا پردہ ہٹاتی ہے جس سے دھوپ کمرے میں آنے لگتی ہے کھڑکی کے پاس کھڑی رہتی ہے کہ پرویز کمرے میں آتا ہے اس کے لباس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ کہیں باہر جانے کے لیے تیار ہے۔ قدسیہ مڑ کر اسے دیکھتی ہے مگر

خاموش رہتی ہے۔ پرویز قدسیہ کے پاس آتے ہوئے۔)

پرویز: قدسیہ، میں امجد سے ملنے جارہا ہوں— ایک آدھ گھنٹے میں واپس آجاؤں گا۔

(قدسیہ خاموش رہتی ہے۔ پرویز دروازے کی طرف بڑھتا ہے۔ قدسیہ ایک دم جیسے کچھ یاد آجانے پر)

قدسیہ: کل ایک عورت آئی تھی۔ آپ کا پوچھ رہی تھی۔

پرویز: (مڑ کر قدسیہ کو دیکھ کر) کون عورت تھی۔

قدسیہ: جانے کون تھی اس نے نام نہیں بتلایا۔ اس کے ساتھ ایک بچہ بھی تھا۔

پرویز: بچہ!

قدسیہ: جی ہاں۔ کہہ رہی تھی کل اس کی ساتویں سال گرہ ہے۔

پرویز: یعنی آج— (قدسیہ اثبات میں سر ہلاتی ہے) ساتویں سالگرہ؟

(واپس آہستہ آہستہ میز کے پاس جاتا ہے اور کلنڈر کو غور سے دیکھتا ہے پھر میز پر پڑے ہوئے دعوت نامے کو اٹھاتا ہے اور اسے سرسری طور پر دیکھ کر) اچھا تو کل منصوری کے بچہ کی بھی سال گرہ ہے (قدسیہ پھر اثبات میں سر ہلاتی ہے پرویز کچھ دیر رک کر) آپ نے کوئی تحفہ پسند کیا۔

قدسیہ: ابھی نہیں۔ (پرویز برابر اسے دیکھتا رہتا ہے) وہ بھی ہوجائے گا۔

پرویز: وہ عورت کیا کہہ رہی تھی۔

قدسیہ: مجھ سے کچھ نہیں کہا آپ ہی سے ملنا چاہتی تھی (پرویز خاموش رہتا ہے قدسیہ کچھ دیر خاموش رہ کر) اس سال تو آپ مسٹر منصوری کے بچے کی سال گرہ میں شرکت کریں گے؟

پرویز: مجھے آج امجد کے ساتھ باہر جانا ہے شاید کل تک نہ آسکوں۔

قدسیہ: آپ نے آج تک ان کے بچے کی سالگرہ میں شرکت نہیں کی۔ وہ ہمیشہ شکایت کرتے ہیں۔

پرویز: (سوچتے ہوئے) کیا بتلاؤں ہمیشہ کوئی نہ کوئی ایسا اتفاق ہوجاتا ہے کہ—

قدسیہ: اتفاق۔ مگر۔

پرویز: (بات کاٹ کر) میں خود منصوری کے سامنے شرمندہ ہوتا ہوں مگر ہر سال کوئی نہ کوئی الجھن پیدا ہو جاتی ہے۔

قدسیہ: الجھن کیسی— آپ یہ پروگرام دو دن بعد بھی رکھ سکتے ہیں۔

پرویز: خیال ہی نہ رہا ورنہ یہ پروگرام بناتا ہی نہیں۔

قدسیہ: (کچھ دیر رک کر) مسٹر امجد کوئی غیر تو ہیں نہیں پروگرام ملتوی کر دیجیے۔ اور انھیں بھی تو سال گرہ میں شرکت کرنا ہوگی۔

پرویز: (کچھ خاموش رہ کر) اس عورت نے اپنے بارے میں بتلایا تھا کہ وہ کون ہے۔

قدسیہ: جی نہیں وہ صرف آپ کا پوچھ رہی تھی اور پھر چلی گئی آج آنے کا کہہ گئی تھی۔

(پرویز خاموش رہتا ہے اور آہستہ آہستہ دروازے کی طرف بڑھتا ہے قدسیہ چند سیکنڈ خاموش رہ کر) بہتر تو یہی ہے کہ آپ یہ پروگرام ملتوی کر دیں۔

پرویز: مگر قدسیہ۔

قدسیہ: (کچھ دیر اسے سوالیہ نظروں سے دیکھتی رہتی ہے مگر پرویز خاموش رہتا ہے) ہمارا کوئی بچہ ہوتا اور وہ شرکت نہ کرتے تو ہمیں کتنا دکھ ہوتا۔

پرویز: ہمارا بچہ— مگر

(خاموش ہو جاتا ہے واپس آ کر پھر کلنڈر کو غور سے دیکھتا ہے قدسیہ اس کو خاموشی سے دیکھتی رہتی ہے پھر ٹھنڈی سانس بھر کر)

قدسیہ: کاش ہمارا بھی کوئی بچہ ہوتا اور ہم اس کی سالگرہ منایا کرتے۔

پرویز: قدسیہ

قدسیہ: (بات کاٹ کر) جب میں کسی بچہ کی سال گرہ میں جاتی ہوں تو مجھے عجیب کمتری کا احساس ہوتا ہے (پرویز خاموش رہتا ہے قدسیہ سوچتے ہوئے) ہماری شادی کو پانچ سال ہو گئے ہیں (آہستہ سے) اب ہمیں بچہ پیدا کر لینا چاہیے۔

پرویز: (غور سے قدسیہ کو دیکھ کر) ایسی جلدی بھی کیا ہے (پھیکی مسکراہٹ سے)

— — —

ابھی ہم بوڑھے تو نہیں ہوئے جا رہے ہیں۔

قدسیہ: خود کو جوان سمجھتے سمجھتے ایک دن ہم بوڑھے بھی ہو جائیں گے۔ (طنزیہ) پھر ہم اپنے بچوں کے ماں باپ نہیں دادا دادی معلوم ہوں گے۔

پرویز: (تلخ لہجے میں) جانے یہ بچے کا بھوت تم پر کیوں سوار ہو گیا ہے۔

قدسیہ: اس لیے کہ اب میں۔

پرویز: (بات کاٹ کر) یہ تمھاری تجویز تھی کہ ابھی چند سال ہمیں بچہ پیدا نہیں کرنا چاہیے۔

قدسیہ: مگر اس کا مقصد یہ تو نہیں تھا کہ میں کبھی بچے پیدا ہی نہ کروں اور اپنی ہم چشموں میں بانجھ کہی جانے لگوں۔

پرویز: پھر اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔

قدسیہ: فرق کیوں نہیں پڑتا جب سب اپنے اپنے بچوں کو ساتھ لے کر آتی ہیں تو میں خود کو سبک محسوس کرتی ہوں (چند سیکنڈ رک کر پرعزم لہجے میں) اب میں نے فیصلہ کرلیا ہے کہ میں ماں بن کر رہوں گی آخر یہ بھی تو میرا حق ہے۔

پرویز: یہ حق آپ سے کون چھین رہا ہے اگر کچھ دن اور سکون کی زندگی گزار لیں تو کہاں کی برائی ہے۔

قدسیہ: اور ایک بچے کی پیدائش سے کہاں کی بے سکونی پیدا ہو جائے گی بچے سب ہی پیدا کرتے ہیں۔

پرویز: لیکن قدسیہ—

قدسیہ: (بات کاٹ کر) اب میں کچھ اور سننا نہیں چاہتی۔ اگر میں نے چند سال بچہ نہ پیدا کرنے کی تجویز رکھی تھی تو اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں تھا کہ میں تمام زندگی سزا بھگتوں اور اپنے حق سے محروم رہوں۔

پرویز: پھر وہی حق کی بات (تلخ لہجے میں) میری سمجھ میں نہیں آتا کہ آج یہ حق کا سوال کیوں پیدا ہو گیا۔

قدسیہ: اور میری سمجھ میں نہیں آتا کہ حق کا نام سن کر آپ برہم کیوں ہو جاتے ہیں۔

پرویز: اس لیے کہ حق، حق ہی رہتا ہے بار بار اس کا ذکر کرنے سے اس کی اہمیت نہیں بڑھ جاتی (چند سیکنڈ رک کر ٹھنڈے لہجے میں) قدسیہ! میں نہیں چاہتا کہ ہم ابھی سے آپس میں بچھڑ جائیں ایک دوسرے کے لیے اجنبی بن جائیں۔

قدسیہ: بچھڑ جائیں! اجنبی بن جائیں۔

پرویز: ہاں قدسیہ (ٹھنڈی سانس بھر کر) کبھی کبھی بچے راستے میں کھڑے ہو کر میاں بیوی کو اجنبی بنا دیتے ہیں۔

قدسیہ: یہ جھوٹ ہے۔ غلط ہے (آہستہ سے) پرویز! مجھے سچ سچ بتلاؤ تم اب بچہ پیدا کرنا کیوں نہیں چاہتے۔ (پرویز خاموش رہتا ہے قدسیہ کچھ دیر خاموش رہ کر حسرت بھرے لہجے میں) میں نے زندگی بھر بے اولاد رہنے کی تجویز تو نہیں رکھی تھی۔

پرویز: تم جذباتی بن کر سوچ رہی ہو قدسیہ۔۔۔ ہماری زندگی میں کوئی کمی ہے؟

قدسیہ: ہاں کمی ہے درمیان میں ایک خلا ہے ابھی تک ہم ایک دوسرے کے لیے اجنبی ہیں (کچھ دیر خاموش رہ کر) اب میں بچہ ضرور پیدا کروں گی کہ یہ خلا پر ہو جائے۔

پرویز: مگر میں بچہ وچہ نہیں چاہتا (تیز تیز قدموں سے دروازے کے قریب جاتا ہے پھر مڑ کر قدسیہ کو دیکھ کر) اگر وہ عورت پھر آئے تو اسے روک لینا کہ میرا انتظار کرے۔

(جواب کا انتظار کیے بغیر کمرے سے چلا جاتا ہے قدسیہ خاموش کھڑی رہتی ہے پھر آئینے کے سامنے جا کر اپنا چہرہ دیکھتی ہے جیسے یقین کرنا چاہتی ہو کہیں بوڑھی تو نہیں ہوگئی ہے میز کے پاس جا کر دعوت نامہ اٹھاتی ہے اور اسے دیکھتی ہے کہ باہر موٹر کا ہارن بجتا ہے قدسیہ آہستہ آہستہ کھڑکی کے پاس جاتی ہے اور باہر دیکھتی ہے پھر ایک دم پیچھے ہٹ کر اپنے کپڑوں پر نظر ڈالتی ہے اور پھر آئینے میں اپنے جسم کا جائزہ لیتی ہے کہ رقیہ کمرے میں آکر)

رقیہ: ہلو قدسیہ۔

قدسیہ: (انتہائی سرد لہجے میں) ہلو۔

رقیہ: (غور سے قدسیہ کو دیکھ کر) کیا بات ہے کچھ بیمار ہو۔

قدسیہ: نہیں۔نہیں۔آؤ— مسز منصوری بھی تو تمھارے ساتھ تھے۔

رقیہ: ہاں ذرا اگر جیش کے گھر گئے ہیں ابھی آتے ہیں (پھر قدسیہ کا چہرہ دیکھ کر) سچ بتاؤ قدسیہ کیا بات ہے۔تم اداس کیوں ہو۔

قدسیہ: (پھیکی مسکراہٹ سے) سچ کوئی بات نہیں ہے۔

رقیہ: مگر تم بے شک اداس ہو (قدسیہ کی آنکھوں میں آنسو آجاتے ہیں رقیہ کچھ دیر خاموش رہ کر) کیا بات ہے؟

قدسیہ: (آنسو پونچھ کر کچھ دیر خاموش رہ کر) کل سے میں ایک عجیب سی کشمکش میں مبتلا ہوں۔

رقیہ: کشمکش— کیسی کشمکش؟

(قدسیہ آہستہ آہستہ کھڑکی ے پاس جاکر کھڑی ہوجاتی ہے اور باہر دیکھنے لگتی ہے۔ رقیہ بھی اس کے پاس جاکر کھڑی ہوجاتی ہے مگر خاموش رہتی ہے کچھ دیر بعد قدسیہ مڑ کر رقیہ کو دیکھ کر)

قدسیہ: اب میں ماں بننا چاہتی ہوں۔

رقیہ: (مسکرا کر) تو پھر اس میں اداس ہونے کی کون سی بات ہے۔ میں تو تم سے دو سال سے کہہ رہی ہوں۔

قدسیہ: (کچھ دیر خاموش رہ کر آہستہ سے) مگر ابھی پرویز اس سے متفق نہیں۔

رقیہ: کیوں!تم نے ان سے بات کی تھی۔

قدسیہ: ہاں مگر (خاموش ہوجاتی ہے رقیہ سوالیہ نظروں سے دیکھتی رہتی ہے قدسیہ کچھ دیر بعد) پہلے تو ٹال مٹول کرتے رہے اور اس وقت برہم ہوگئے۔

رقیہ: کیوں۔

قدسیہ: پتا نہیں (سوچتے ہوئے) کل سے ایک اور الجھن نے مجھے گھیر رکھا ہے۔

رقیہ: کس الجھن نے۔

قدسیہ: (کچھ دیر خاموش رہ کر) کل میرے پاس ایک عورت آئی تھی۔

رقیہ: کون عورت تھی— پھر؟

قدسیہ: میں اسے نہیں جانتی اس کے ساتھ ایک خوبصورت بچہ بھی تھا کل اس بچے کی بھی سال گرہ ہے۔

رقیہ: خوبصورت بچہ— کل سال گرہ۔ پھر؟ ہونے دو۔

قدسیہ: نہیں رقیہ— مجھے ایسا محسوس ہو رہا ہے کہ وہ بچہ میرے اور پرویز کے بیچ میں حائل ہو رہا ہے۔

رقیہ: (غور سے قدسیہ کو دیکھ کر) تمھارے درمیان حائل ہو رہا ہے—! کیوں؟ (مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے) تمھیں یہ خوف کیونکر پیدا ہو گیا۔ کیا اس عورت نے۔

قدسیہ: نہیں— اس نے ایسی کوئی بات نہیں کہی مگر وہ پرویز کو کیوں تلاش کر رہی تھی۔

رقیہ: (ایک دم قہقہہ مار کر) بھئی کمال ہے قدسیہ۔ سچ مچ تم نے تو مجھے ڈرا دیا میں سمجھی تھی کہ تم کوئی بہت بڑا بم چھوڑنے والی ہو۔

قدسیہ: مگر وہ پرویز ہی سے کیوں ملنا چاہتی تھی۔

رقیہ: مارو گولی۔ ارے ہوگا کوئی کام۔ ممکن ہے بچہ ہی سے متعلق ہو ممکن ہے کوئی مدد چاہتی ہو پھر اس میں ڈرنے اور گھبرانے کی کیا بات ہے۔

قدسیہ: مگر وہ عورت بہت پراسرار معلوم ہوتی تھی۔ میں نے اس سے بہت کچھ معلوم کرنا چاہا مگر وہ آخر تک پراسرار بنی رہی۔

رقیہ: چھوڑو بھی۔ تم بلاوجہ شک میں مبتلا ہو گئی ہو۔

قدسیہ: جانے کیوں عجیب سا خوف محسوس ہو رہا ہے (سوچتے ہوئے) کل اس کی

سال گرہ ہے اور اس تاریخ کو پرویز کبھی گھر پر نہیں رہتے۔ یہ تو کئی سال سے تم بھی دیکھ رہی ہو۔

رقیہ: محض اتفاق ہے اسے عورت سے جوڑنا۔

قدسیہ: (بات کاٹ کر) اتفاق ایک سال ہو سکتا ہے دو سال ہو سکتا ہے پانچ سال تو نہیں اور پھر تمھارے اصرار اور میری خوشامد کے باوجود وہ گھر پر نہیں رہتے۔ اس سال بھی کوئی پروگرام بنا لیا ہے (رقیہ سوچنے لگتی ہے۔ قدسیہ کچھ دیر خاموش رہ کر) اب کوئی ایسی ترکیب نکالو کہ وہ بچہ پیدا کرنے پر تیار ہو جائیں۔

رقیہ: اچھا میں موقع ملنے پر ان سے بات کروں گی۔

قدسیہ: (پر عزم لہجے میں) اور انھوں نے اتفاق نہیں کیا تو میں خود بچہ پیدا کرنے کا فیصلہ کرلوں گی چاہے گھر میں کتنا بڑا طوفان ہی کیوں نہ آجائے۔

رقیہ: (کچھ دیر خاموش رہ کر) وہ عورت کس قماش کی تھی۔

قدسیہ: خاصی پڑھی لکھی تھی۔ آج پھر آنے کا کہہ گئی ہے۔

رقیہ: تم اس سے معلوم کرنا کہ وہ چاہتی کیا ہے (کچھ دیر خاموش رہ کر) گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔

قدسیہ: مگر رقیہ میرے دل میں جانے کیوں خوف گھر کر گیا ہے۔ مجھے اس بچے سے ڈر معلوم ہونے لگا ہے حالانکہ بڑا پیارا اور خوبصورت بچہ ہے۔

رقیہ: تم بلا وجہ — (باہر موٹر کا ہارن — رقیہ کھڑکی سے باہر دیکھتی ہے) ارے یہ تو بڑی جلدی واپس آگئے (خاموش ہو جاتی ہے۔ کچھ دیر بعد منصوری اور پرویز کمرے میں آتے ہیں۔ رقیہ منصوری کی طرف دیکھ کر) گرمجوشی سے مل لیے۔

منصوری: وہ کم بخت کبھی گھر پر ملا ہے (مسکرا کر) مگر میں نے ایک دوسرے مہاپرش کو راستے میں گرفتار کرلیا (پرویز کی طرف اشارہ کرکے) آپ جانے کہاں بھاگے جا رہے تھے کہ پکڑے گئے (قدسیہ کی طرف دیکھ کر) مسز پرویز آج سے یہ حضرت آپ کی حراست میں رہیں گے کہ فرار نہ ہو جائیں۔

رقیہ: (مسکرا کر) اور وہ فرار ہونے کا منصوبہ پہلے ہی بنا چکے ہیں۔

منصوری: (پرویز کی طرف دیکھ کر) دیکھیے حضرت اب کوئی بہانہ نہیں چلے گا آپ ہر سال بدمذاقی پر اتر آتے ہیں (پرویز خاموش رہتا ہے) اب کونسا پروگرام ہے۔ (پرویز اب بھی خاموش رہتا ہے۔ قدسیہ دروازے کی طرف جاتی ہے) آپ کہاں چل دیں؟

قدسیہ: ابھی آتی ہوں۔

منصوری: دیکھیے اس وقت کوئی تکلیف نہ کیجیے ہمیں ذرا جلدی ہے۔

قدسیہ: چائے میں نہ کوئی تکلف ہے اور نہ کوئی تکلیف۔

منصوری: لیکن سنیے تو۔

قدسیہ: پانچ منٹ میں تیار ہو جائے گی۔

(کمرے میں چلی جاتی ہے۔ منصوری پرویز کی طرف دیکھ کر)

منصوری: ہاں حضور۔ اب کون سا اہم کام درپیش ہے۔

(پرویز خاموش رہتا ہے آہستہ آہستہ کھڑکی کے پاس جاتا ہے سگریٹ جلاتا ہے پھر مڑ کر رقیہ اور منصوری کو دیکھتا ہے۔ دونوں خاموشی سے اُسے دیکھتے رہتے ہیں۔ پرویز کھوئی کھوئی نظروں سے انھیں دیکھتا ہے پھر آہستہ سے)

پرویز: مجھے احساس ہے منصوری کہ میرے نہ آنے پر تمھیں دکھ ہوتا ہوگا مگر کیا کروں کہ اس تاریخ کو میں کسی خوشی کی تقریب میں شرکت نہیں کرسکتا۔

منصوری: (حیرت سے) کیوں۔

پرویز: (سوچتے ہوئے) یہ تاریخ میرے لیے منحوس ہے۔

منصوری: لاحول ولا قوۃ (ہنس کر) کمال ہے ایک پڑھا لکھا ماڈرن انسان تاریخوں دنوں اور مہینوں کی نحوست کا قائل ہے (مسکرا کر) کل تم سال گرہ میں شرکت کرو اور دیکھو کہ نحوست ختم ہوگئی ہے۔

پرویز: نہیں منصوری میں اپنی نحوست کے ساتھ کسی تقریب میں شرکت نہیں کرسکتا۔

منصوری: چھوڑو ان واہیات باتوں کو (کچھ دیر خاموش رہ کر) آخر وہ کون سی نحوست ہے جو اس تاریخ کو تمھیں گھیر لیتی ہے۔

پرویز: سات سال پرانی بات ہے (آہستہ آہستہ میز کے پاس جاتا ہے اس سے ٹیک لگا کر کھڑا ہوجاتا ہے۔ کچھ دیر خاموش رہتا ہے پھر آہستہ سے) اس تاریخ کو ناظمہ بچہ دیتے ہوئے اس دنیا سے ہمیشہ کے لیے روٹھ گئی تھی۔

منصوری: کون ناظمہ؟ (پرویز خاموش رہتا ہے مگر چہرے پر غم کے نمایاں اثرات ظاہر ہوتے ہیں۔ منصوری سوچتے ہوئے) کیا وہ بچہ — میرا مطلب ہے کہ کیا وہ بچہ — اب وہ بچہ کہاں ہے۔

پرویز: پتا نہیں کہ وہ زندہ بھی ہے یا نہیں۔ ناظمہ کی موت نے مجھے بالکل پاگل کردیا تھا اسی دن سے اس تاریخ کو میں اپنے لیے منحوس سمجھنے لگا ہوں۔

(ماحول ایک دم سنجیدہ ہوجاتا ہے۔ پرویز پھر آہستہ آہستہ کھڑکی کے پاس جاتا ہے اور باہر دیکھنے لگتا ہے رقیہ کچھ دیر بعد پرویز کے پاس جاکر)

رقیہ: مسٹر پرویز کیا آپ میرا ایک مشورہ قبول کریں گے۔ (پرویز مڑکر رقیہ کو دیکھتا ہے مگر خاموش رہتا ہے۔ رقیہ سوچتے ہوئے) اب آپ بھی ایک بچہ پیدا کرلیجیے۔

منصوری: (سگریٹ جلا کر پرویز کے قریب جاتے ہوئے) ہاں پرویز بچے کی پیدائش سے تمھیں سکون ملے گا۔

پرویز: (کچھ دیر خاموش رہتا ہے پھر سگریٹ کا لمبا کش لے کر) میں نے شادی کے بعد ہی ایسا چاہا تھا اس کی قدسیہ نے مخالفت کی تھی۔ اب میرا دل نہیں چاہتا۔

رقیہ: لیکن ماں بننے کی اب ان کی زبردست خواہش ہے آپ کو ان کی خواہش کا احترام کرنا چاہیے۔

پرویز: جی ہاں یہ خواہش اب کچھ زیادہ ہی تیز معلوم ہوتی ہے۔

منصوری: عورتوں کی زندگی میں ایک وقت ایسا بھی آتا ہے کہ اس کی یہ خواہش یونہی تیز

ہوجاتی ہے۔

پرویز: (سوچتے ہوئے) لیکن منصوری میں فی الحال بچہ پیدا کرنا نہیں چاہتا۔
(منصوری سوالیہ نظروں سے اسے دیکھتا ہے۔ پرویز سوچتے ہوئے) میں ایک مرتبہ یہ یقین کر لینا چاہتا ہوں کہ اب وہ بچہ زندہ نہیں ہے۔

منصوری: سات سال کا عرصہ بہت طویل ہوتا ہے اب اس آواز بازگشت کی سمت کا تعین کرنے کے لیے نہ دوڑو اس سے مسز پرویز کے اعتماد کو ٹھیس پہنچے گی وہ تم سے بہت محبت کرتی ہیں۔

پرویز: (کچھ دیر رک کر) قدسیہ کی ضد نے میرے دل میں ہی خواہش اور تیز کر دی ہے کہ ایک مرتبہ اسے ضرور تلاش کروں۔ (سوچتے ہوئے) آج ایک امید کی کرن بھی نظر آئی ہے اگر ناکام ہوگیا تو مجھے سکون مل جائے گا۔

منصوری: بچہ کی پیدائش سے تمھیں سکون مل جائے گا اور اس تاریخ کی نحوست ختم ہوجائے گی (قدسیہ چائے لے کر آتی ہے منصوری اسے دیکھ کر) آپ تکلف سے باز نہیں آئیں۔

قدسیہ: (چائے کا سامان تپائی پر رکھ کر) آپ تو بلا وجہ شرمندہ کر رہے ہیں۔
(صوفہ پر بیٹھ کر چائے بنانے لگتی ہے منصوری قدسیہ کی طرف دیکھ کر)

منصوری: مسز پرویز اب ہم نے طے کیا ہے کہ آپ کی شادی کی سال گرہ میں شرکت نہیں کریں گے (قدسیہ حیرت اور سوالیہ نظروں سے منصوری کو دیکھتی ہے مسکرا کر) ہم اب آپ کے بچے کی سال گرہ میں شرکت کریں گے (قدسیہ خاموش رہتی ہے اور سب کو چائے کی پیالیاں دیتی ہے۔ منصوری پیالی لے کر پرویز سے) تو حضور سمجھ لیجیے کہ اب اس تاریخ کی نحوست ختم ہوگئی۔ آپ کل سال گرہ میں آئیں گے اور ابھی میرے ساتھ شاپنگ کے لیے چلیں گے۔

پرویز: مگر منصوری۔

منصوری: (بات کاٹ کر) میں اب کچھ سننا نہیں چاہتا۔ مان لیا کہ یہ تاریخ آپ کے

لیے منحوس ہے اگر اس کی نحوست پڑے گی تو میرے بچہ پر اور میں اوہام کا قائل نہیں۔

قدسیہ: مسٹر منصوری خدا کے لیے ایسی بات زبان پر نہ لائیے۔

منصوری: آخر کوئی بات بھی ہو مسز پرویز۔ یہ تاریخ میرے لیے منحوس ہے اس لیے شرکت نہیں کروں گا۔ (خالی پیالی میز پر رکھ کر) آؤ پرویز چلو بازار سے کچھ سامان خریدنا ہے۔

پرویز: مگر منصوری۔

منصوری: (پرویز کا ہاتھ پکڑ کر بات کاٹتے ہوئے) اب اگر تم نے شرکت نہیں کی تو میں تمھاری محبت اور خلوص پر شک کرنے لگوں گا۔ (پرویز خاموش رہتا ہے منصوری رقیہ کی طرف دیکھ کر) آپ ٹیکسی لے کر گرجیش کے گھر چلی جائیے گا اور اس کی بیوی سے مل لیجیے گا (قدسیہ کی طرف دیکھ کر) اور مسز پرویز آپ صبح ہی آجائیے گا (مسکرا کر رقیہ کی طرف اشارہ کرکے) کچھ ان کا ہاتھ بٹا لیجیے گا ورنہ گھر میں صبح ہی سے مارشل لا لگ جائے گا اور ہر شخص کورٹ مارشل کے خوف سے ایسا اپ سیٹ ہوگا کہ جی بھر کر کام بگاڑے گا اور ہاں آپ دونوں صبح کا کھانا بھی ہمارے ہی ساتھ کھا رہے ہیں۔

(پرویز کا ہاتھ پکڑ کر کمرے سے چلا جاتا ہے رقیہ اور قدسیہ کچھ دیر خاموش رہتی ہیں اور ایک دوسرے کو اس طرح دیکھتی ہیں کہ کون پہلے گفتگو کا آغاز کرے اور کس مسئلے پر۔ کچھ دیر بعد رقیہ)

رقیہ: مسٹر پرویز کل کی تاریخ کو اپنے لیے منحوس سمجھتے ہیں۔

قدسیہ: (حیرت سے) کیوں؟ پہلے تو کبھی انھوں نے نہیں کہا۔

رقیہ: اور آج بھی اتفاق سے کہہ دیا۔ (قدسیہ سوالیہ نظروں سے رقیہ کو دیکھتی ہے۔ رقیہ کچھ دیر خاموش رہ کر) آج سے سات سال پہلے کوئی لڑکی ان کی زندگی میں تھی اور اس تاریخ کو وہ زندگی سے روٹھ گئی تھی۔

(قدسیہ کے چہرے پر حیرت کے آثار پیدا ہوتے ہیں جیسے اسے اس انکشا
پر یقین نہ ہو پھر آہستہ سے)

قدسیہ: کون لڑکی۔

رقیہ: کوئی لڑکی تھی ناظمہ۔ تم اسے جانتی ہو۔

قدسیہ: نہیں میں اس نام کی کسی لڑکی کو نہیں جانتی۔

رقیہ: (سوچتے ہوئے) کل جو عورت آئی تھی اس نے اپنا نام بتلایا تھا۔

قدسیہ: کیوں۔ (سوچتے ہوئے) نام تو بتلایا تھا مگر یاد نہیں رہا مگر وہ ناظمہ نہیں تھی۔

رقیہ: ناظمہ تو نہیں ہوگی (کچھ دیر خاموش رہ کر) اس نے بچے کے متعلق بتلایا تھا
کہ وہ کل سات سال کا ہو جائے گا۔

قدسیہ: (اثبات میں سر ہلاتے ہوئے) ہاں۔ مگر وہ بچہ۔ کیا وہ بچہ (چند سیکنڈ خاموش
رہ کر جذباتی انداز میں) رقیہ سچ سچ بتاؤ اس بچہ سے پرویز کا کیا رشتہ ہے۔

رقیہ: رشتہ مجھے معلوم نہیں (سوچتے ہوئے) مگر ایک عجیب اتفاق ہے (قدسیہ سوالیہ
اور خوف زدہ نظروں سے رقیہ کو دیکھتی ہے۔ کچھ دیر رقیہ خاموش رہ کر) سات
سال پہلے اسی تاریخ کو ناظمہ نے بچہ کو جنم دیتے ہوئے انتقال کیا تھا۔

قدسیہ: پھر تو وہ بچہ — وہ بچہ — (آنکھوں میں آنسو آجاتے ہیں۔ کچھ دیر خاموش رہ
کر آنسو پونچھتے ہوئے) اب کیا ہوگا رقیہ۔

رقیہ: کچھ نہیں۔ کیا معلوم وہ عورت کون ہے کیا چاہتی ہے تم بلا وجہ پریشان
ہو رہی ہو۔

قدسیہ: کل سے میرے دل میں جانے کیوں برے برے خیالات آرہے ہیں۔
(رقیہ خاموش رہتی ہے قدسیہ کچھ سوچتی رہتی پھر آہستہ سے) اگر وہ بچہ ناظمہ
ہی کا ہے تو یہ کس قدر ظلم ہے کہ وہ ابھی تک باپ کی شفقت سے محروم ہے۔
آج تک کسی کو اپنا باپ نہیں سمجھتا۔

رقیہ: مگر قدسیہ۔

قدسیہ: (بات کاٹ کر) وہ بہت خوبصورت اور معصوم ہے پہلی نظر میں وہ مجھے بڑا پیارا لگا تھا۔

رقیہ: (سوچتے ہوئے) اگر وہ ناظمہ کا ہی ہے تو پھر اسے اپنا لو اسے ماں کا پیار دو——

قدسیہ: کیا میں اسے ماں کا پیار دے سکوں گی۔ کیا مجھے زندگی بھر اپنے بچے سے محروم رہنا پڑے گا وہ میرے اور پرویز کے درمیان دیوار تو نہیں بن جائے گا۔

رقیہ: اگر عورت چاہے تو کسی بچہ کو بھی ماں کا پیار دے سکتی ہے۔

قدسیہ: (ایک دم جوش میں آکر) مگر نہیں۔ میں اس کے لیے یہ سب کچھ نہیں کر سکتی۔ میں اسے ماں کا پیار نہیں دے سکتی۔ میں اپنے بچے سے محروم رہنا نہیں چاہتی میں پرویز کے لیے اجنبی بننا نہیں چاہتی۔

(قدسیہ ہچکیوں سے رونے لگتی ہے۔ رقیہ گھبرا جاتی ہے آہستہ آہستہ قدسیہ کے پاس آکر)

رقیہ: قدسیہ تم بہت جذباتی ہوگئی ہو—— تم——

قدسیہ: (اپنی ہچکیوں پر قابو پاتے ہوئے) اب میں کیا کروں رقیہ میری سمجھ میں کچھ نہیں آرہا ہے۔

رقیہ: تم بلاوجہ گھبرا رہی ہو۔ ابھی تو اس بچہ کے متعلق کچھ بھی طے نہیں اور پھر اسے ناظمہ کا ثابت کرنا بہت مشکل ہے بہت سی عورتیں ایسے ڈھونگ رچا لیتی ہیں۔

قدسیہ: مگر میرا دل کہہ رہا ہے کہ کوئی بہت بڑا طوفان آنے والا ہے۔ میری خوشیاں اس طوفان میں بہہ جائیں گی۔ کاش میں نے بچہ پہلے ہی پیدا کرلیا ہوتا۔

رقیہ: چھوڑو اس ذکر کو آؤ میرے ساتھ چلو ہم اس مسئلے پر سکون سے غور کریں گے۔

قدسیہ: اس وقت مجھے معاف کردو رقیہ میں شام تک خود آجاؤں گی۔

رقیہ: مگر دیکھو بھولنا نہیں ضرور آنا اس وقت تک میں بھی اس بارے میں سوچ لوں گی۔

قدسیہ: ضرور آؤں گی۔ مگر اس وقت۔

رقیہ: کوئی بات نہیں (کچھ دیر رک کر) اچھا تو میں چلتی ہوں مگر دیکھو اس قدر جذباتی بن کر اس مسئلے پر غور نہ کرنا۔

(قدسیہ خاموش رہتی ہے۔ رقیہ کچھ دیر خاموش کھڑی رہتی ہے پھر آہستہ آہستہ کمرے سے چلی جاتی ہے۔ قدسیہ کچھ دیر کھڑکی کے پاس جاتی ہے اس میں سے باہر دیکھتی ہے پھر واپس میز کے پاس آتی ہے اور چائے کے برتن ٹرے میں رکھتی ہے اور ٹرے اٹھاتی ہے کہ فاطمہ کمرے میں آتی ہے۔ صاف ستھرے کپڑے پہنے ہے عمر تیس سال کے آس پاس ہے قدسیہ اسے دیکھ کر پھر ٹرے میز پر رکھ کر)

قدسیہ: آپ!

فاطمہ: (بڑے ٹھنڈے لہجے میں) آج بھی مسٹر پرویز گھر پر نہیں ہیں؟ (قدسیہ انکار میں سر ہلاتی ہے) آپ نے میرے بارے میں ان سے کہہ دیا تھا؟

قدسیہ: جی ہاں۔ مگر مجھے آپ کا نام معلوم نہیں تھا۔

فاطمہ: مجھے فاطمہ کہتے ہیں فاطمہ عنایت اللہ۔ ناظمہ کی بہن۔

قدسیہ: (چہرے پر خوف کے آثار پیدا ہوتے ہیں۔ چند سیکنڈ رک کر) کون ناظمہ۔

فاطمہ: آپ ناظمہ کو نہیں جانتیں؟ تھی ایک لڑکی اور میں سات سال سے اس کی امانت کو اپنا گناہ بنائے پھر رہی ہوں (چند سیکنڈ رک کر) آپ کے کوئی بچہ نہیں ہے۔

قدسیہ: (سہمے ہوئے لہجے میں) جی ہاں ابھی تو کوئی بچہ نہیں ہے۔

فاطمہ: آپ کی شادی کو تو پانچ سال ہو گئے ہیں۔

قدسیہ: جی ہاں (کچھ دیر رک کر) آپ بچے کو ساتھ کیوں نہیں لائیں۔ بڑا پیارا بچہ ہے۔

فاطمہ: (قدسیہ کے سوال پر دھیان نہ دے کر) آپ کے بچہ کیوں پیدا نہیں ہوا۔ کسی ڈاکٹر سے مشورہ کیا؟ ممکن ہے بانجھ پن کا۔۔۔

قدسیہ: (بات کاٹ کر تلخ لہجے میں) میں بانجھ نہیں ہوں (بات ٹالنے کے انداز میں) آپ بچے کو بھی لے آتیں۔

فاطمہ: (کچھ دیر خاموش رہ کر) معاف کیجیے گا میں بانجھ اور ایسی عورتوں سے جن کے اولاد نہ ہو بچہ کو دور رکھتی ہوں ایسی عورتوں کی نظریں اچھی نہیں ہوتیں (قدسیہ ایسے خاموش رہتی ہے جیسے اسے سکتہ ہوگیا ہو فاطمہ کچھ دیر خاموش رہ کر) کیا آج بھی مسٹر پرویز سے ملاقات نہیں ہوسکتی۔

قدسیہ: لیکن آپ ان سے کیوں ملنا چاہتی ہیں۔

فاطمہ: میں ملنا نہیں چاہتی مجھے صرف بچے کو ملانا ہے۔

قدسیہ: (سوالیہ نظروں سے فاطمہ کو دیکھتے ہوئے) بچہ کو ملانا ہے! کیوں؟

فاطمہ: وہ سات سال کا ہوگیا ہے اسکول بھی جانے لگا ہے کم ازکم اپنے باپ کو پہچان ہی لے نہیں تو بلا وجہ احساس کمتری کا شکار رہے گا۔

قدسیہ: پرویز اور باپ!

فاطمہ: جی ہاں۔ مسٹر پرویز نے آپ کو نہیں بتلایا۔

قدسیہ: جی نہیں۔ اگر ایسا ہے تو آپ بچے کو لے آتیں میں اسے ماں کا پیار دیتی۔

فاطمہ: کیا ابھی اسے ماں کا پیار نہیں مل رہا ہے۔

قدسیہ: کیا آپ اس کی ماں—

فاطمہ: میں نے اسے جنم نہیں دیا ہے مگر ماں بن کر ضرور پالا ہے اس نے میری ہی گود میں پرورش پائی ہے۔ میں نے سات سال تک دل سے لگا کر آنکھوں میں رکھا ہے میں نے آج تک اس کی خاطر شادی نہیں کی پھر میں اس کی ماں کیوں نہیں ہوں۔

قدسیہ: آپ نے شادی نہیں کی۔ آپ آج تک کنواری ہیں۔

فاطمہ: جی ہاں کنواری ہوں (پھیکی مسکراہٹ سے) میں ایسی بوڑھی تو نہیں ہوگئی ہوں کہ میرے کنوارے پن پر شک کیا جائے۔

قدسیہ: میں شک نہیں کر رہی ہوں (کچھ دیر خاموش رہ کر) آپ بچے کو لے آئیں تو شاید میں—

فاطمہ: (بات کاٹ کر تلخ لہجے میں) کیوں لے آتی میں نے سات سال تک کڑی تپسیا اس لیے تو نہیں کی ہے کہ پکا ہوا پھل تمھاری گودی میں ڈال دوں، میں نے سات سال تک بدنامی اس لیے برداشت نہیں کی— کہ میری گود سونی ہو جائے۔

قدسیہ: بدنامی۔ کیسی بدنامی؟

فاطمہ: جی ہاں بدنامی۔ لوگ آج تک یہی سمجھ رہے ہیں کہ میں اپنے گناہوں کو اپنے سینے سے لگائے پھر رہی ہوں (ایک دم جوش میں آکر) کیا میں اپنی کنواری گود سونی کر کے تمھاری گود بھر دوں جسے بچوں سے کوئی پیار نہیں۔ جو شادی شدہ ہوتے ہوئے بھی سونی گود بھٹکی پھر رہی ہے۔

قدسیہ: (جھنجھلا کر) آپ کیسی باتیں کر رہی ہیں اگر آپ کو بچہ سے ایسا ہی پیار تھا تو پھر اسے لے کر کیوں آئی تھیں— (طنزیہ) اور کون جانے وہ بچہ تمھارا ہی ناجائز بچہ ہو اور تم ناطمہ کا بتلا کر پرویز کے سر تھوپ رہی ہو۔

فاطمہ: (کسی قدر سہم کر) میرا ناجائز بچہ۔

قدسیہ: اور کیا۔ اگر وہ پرویز کا بچہ ہے تو اس پر تمھارا کوئی حق نہیں۔ تمھیں اسے یہاں چھوڑ کر جانا پڑے گا۔ بتاؤ وہ بچہ کہاں ہے۔

فاطمہ: کہیں بھی ہو۔ میں تمھیں وہ بچہ نہیں دے سکتی۔ (طنزیہ) میں تمھیں وہ بچہ دے دوں تاکہ تم دنیا کو بتلاؤ کہ تم کس قدر نیک دل ہو تاکہ تم اس کی اس طرح پرورش کرو جیسے کوئی یتیم اور لاوارث کی پرورش کرتا ہے۔

قدسیہ: ٹھیک ہے فاطمہ بیگم۔ (آنکھوں میں آنسو بھر کر) میں اسی قابل ہوں کہ دنیا مجھ پر لعن طعن کرے مجھے بانجھ سمجھ بدنظر کہے۔ میرے خلوص پر شک کرے۔

فاطمہ: مگر مسز پرویز آپ خود سوچیے کہ—

قدسیہ: (بات کاٹ کر ٹھنڈی سانس بھر کر) جب میں نے فیصلہ کیا کہ میں بھی ماں بنوں گی۔ بچہ پیدا کروں گی تو تم اچانک دیوار بن کر سامنے آ گئیں۔

فاطمہ: (کسی قدر ٹھنڈی سانس بھر کر) میں دیوار بن گئی۔

قدسیہ: ہاں (کچھ دیر خاموش رہ کر حسرت بھرے لہجے میں) جب پرویز کو یہ معلوم ہوگا کہ بچہ زندہ ہے تو کیا وہ دوسرا بچہ پیدا کرنے کو تیار ہوں گے؟ (کچھ دیر خاموش رہ کر) کیا اب میں ہمیشہ کے لیے ماں بننے کے خواب سے محروم نہ ہو جاؤں گی۔

فاطمہ: (کچھ دیر خاموش رہ کر شکست خوردہ لہجے میں) مسز پرویز! آپ بچہ ضرور پیدا کیجیے۔ ضرور ماں بنیے میں بچہ لے کر واپس چلی جاؤں گی۔

قدسیہ: نہیں فاطمہ بیگم۔ میں یہ نہیں چاہتی کہ ایک معصوم بچہ باپ کی شفقت سے محروم رہے۔ تمام زندگی سوچتا رہے کہ اس کا باپ نہیں ہے۔ یہ تو باپ کے لیے بدشگونی اور بچے کے لیے ظلم ہوگا۔ آپ بچہ مجھے دے دیجیے میں اسے ماں کا پیار دوں گی اپنا بچہ بھی پیدا نہیں کروں گی۔

فاطمہ: مجھے افسوس ہے مسز پرویز کہ میں یہ بچہ آپ کو نہیں دے سکتی۔ لوگ مجھے گنہگار سمجھتے ہیں اب میری شادی نہیں ہو سکتی۔ میں بچہ پیدا نہیں کر سکتی۔ آپ خود ہی سوچیے کہ میں زندگی کا طویل سفر کن راہوں میں بھٹکتی ہوئی پورا کروں گی۔ آخر مجھے بھی تو کوئی سہارا چاہیے۔

قدسیہ: لیکن فاطمہ بیگم۔

فاطمہ: (بات کاٹ کر) آپ نے بچہ پیدا کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے آپ بچہ پیدا کر لیں گی مگر میں ۔۔۔؟ ۔۔۔ میں جو کنواری رہ کر ماں کی لذتوں سے آشنا ہو چکی ہوں ان لذتوں کو پھر کہاں تلاش کروں گی۔ میری زندگی کیسی ویران اور سنسان ہوگی۔

قدسیہ: پھر آپ بچے کو لے کر کیوں آئی تھیں اس لیے کہ ہماری زندگی میں طوفان آ جائے۔

فاطمہ: طوفان تو میری زندگی میں بھی آ گیا ہے مگر۔

قدسیہ: (بات کاٹ کر حسرت بھرے لہجے میں) میں ناظمہ کے راستے میں کبھی نہیں آئی میں نے اس کی خوشیوں پر کبھی ڈاکا تو نہیں ڈالا۔ مجھے تو آج تک پتا ہی نہیں تھا کہ پرویز کی زندگی میں کوئی اور بھی رہ چکا ہے پھر مجھے یہ سزا کیوں مل رہی ہے میرا کون سا قصور ہے۔

فاطمہ: قصور تو پرویز کا بھی نہیں ہے۔ میں نے ہی بچہ چرا لیا تھا کہ ناظمہ کی موت کے بعد لوگ اسے بری لڑکی نہ سمجھیں۔ پرویز کو تو یہ بھی نہیں معلوم کہ بچہ زندہ بھی ہے یا نہیں (کچھ دیر خاموش رہ کر) مسز پرویز میری سمجھ میں نہیں آ رہا ہے کہ میں کیا کروں۔

قدسیہ: (کچھ دیر خاموش رہ کر) آپ بچہ مجھے دے دیجیے۔

فاطمہ: (آنکھوں میں آنسو بھر کر) نہیں۔ نہیں۔ نہیں میں بچہ کسی کو نہیں دے سکتی۔

قدسیہ: (سوچتے ہوئے) اگر پرویز کو شک بھی ہو گیا کہ بچہ زندہ ہے تو وہ آپ سے چھین لیں گے جس میں آپ کی اور میری خوشیاں بہہ جائیں گی (کچھ دیر خاموش رہ کے) آپ مجھے پہلے ایک بچہ پیدا کر لینے دیجیے پھر شاید وہ اس بچے کو آپ کے پاس چھوڑنے پر تیار ہو جائیں۔

فاطمہ: مگر مسز پرویز—

قدسیہ: (بات کاٹ کر) ابھی آپ اس کی پرورش کیجیے اس کے سارے مصارف کی ذمہ دار میں ہوں۔

فاطمہ: جی ہاں (کچھ دیر خاموش رہ کر ٹھنڈی سانس بھر کر) سات سال تک اسے سینے سے میں اسی لیے تو لگائے رہی کہ ایک دن میں اس کی ماں نہیں آیا کہلاؤں۔

(قدسیہ خاموش رہتی ہے۔ فاطمہ تھوڑی دیر کھڑی رہ کر کچھ سوچتی رہتی ہے کہ پرویز کمرے میں آتا ہے اور فاطمہ کو دیکھ کر حیرت سے)

پرویز: فاطمہ بیگم آپ۔

فاطمہ: (چند سیکنڈ رک کر) ہاں۔ (آنکھوں میں آنسو بھر کر) میں تمھیں ایک منحوس خبر سنانے آئی ہوں۔

پرویز: منحوس خبر۔

فاطمہ: کچھ دن ہوئے ناظمہ کا بچہ مرگیا۔

پرویز: (حیرت سے) تو کیا اس کا بچہ — اس کا بچہ۔

فاطمہ: ہاں۔ ابھی تک میں اسے سینے سے لگائے پھرتی رہی مگر اب — مگر اب۔
(ایک دم خاموش ہوکر تیزی سے کمرے سے چلی جاتی ہے۔ پرویز سکتے کے عالم میں کھڑا رہتا ہے۔ قدسیہ چند سیکنڈ خاموش رہتی ہے پھر ایک دم جذباتی انداز میں چیخ کر۔

قدسیہ: پرویز اسے روکو وہ جھوٹ بول رہی ہے۔ بچہ زندہ ہے — بچہ زندہ ہے۔ پرویز اسے روکو — خدا کے لیے اسے روکو پرویز۔
(پرویز اسی طرح سکتے کے عالم میں کھڑا رہتا ہے پھر آہستہ سے ایک صوفے پر بیٹھ کر سامنے والی دیوار کو تاکنے لگتا ہے)

(پردہ)

(ماہنامہ کتاب لکھنؤ، جنوری 71)

پانچ، چھے ڈرامے

یہ ڈرامے

اپنی نوعیت کے اعتبار سے تجرباتی ڈرامے ہیں۔ تجرباتی اس لحاظ کہ ان میں وہ روایتی تصادم نہیں ہے جو ڈرامے کے لیے مخصوص اور لازمی قرار دیا جاتا ہے۔

ان ڈراموں میں افراد کے درمیان تصادم نہیں ہوتا بلکہ فرد اپنی ذات کے اندر خود سے جھگڑتا اور داخلی کش مکش میں مبتلا نظر آتا ہے اگر کہیں خفیف سا خارجی تصادم پیدا ہوا بھی ہے تو اس نے فوراً داخلی کشمکش کی شکل اختیار کر لی ہے اور کردار آپسی تصادم سے قطع نظر کر کے اپنی ہی ذات سے دست و گریباں ہو گیا ہے اور اسی داخلی کشمکش سے ڈراما اپنے نقطۂ عروج کو پہنچ جاتا ہے۔ موضوع کے اعتبار سے یہ ڈرامے صرف کرداری ڈرامے ہیں۔

ممکن ہے ہمارے بیشتر نقادوں کو ان میں افسانویت کی چھاپ نظر آئے کیونکہ ڈرامے کے بارے میں ہمارا انداز فکر اور نقطۂ نظر ابھی نہیں بدلا ہے۔ روایتی تصادم اور پرزور مکالمے ہی ہمارے ڈراموں کا معیار ہیں۔

ہم آج بھی تند و تیز پہاڑی ندی ہی کو ڈراما سمجھتے ہیں۔ سبک رو میدانی ندی میں ہمیں افسانویت ہی نظر آتی ہے جب کہ نفسیات کے علم اور اسٹیج کی تکنیکی ترقی نے ڈرامے

کے معنوں کو بہت وسعت دے دی ہے۔

بہرحال یہ چند یک بابی ڈرامے پیش خدمت ہیں۔ میں اپنے تجربات میں کہاں تک کامیاب ہوا ہوں اس کا فیصلہ آپ پر چھوڑتا ہوں۔

ابراہیم یوسف

ٹوٹے ہوئے خوابوں کا درماں

افرادِ تمثیل

(1) پروین (2) کنول شیخ (3) سلمٰی بہن (4) برج کشور (5) جانکی (6) مسز ممتاز (7) رنجنا دیوی

منظر

(ایک سجا ہوا ڈرائنگ روم جس میں دو دروازے اور دو کھڑکیاں ہیں۔ بائیں جانب کا دروازہ ایک دوسرے کمرے میں کھلتا ہے اور دائیں جانب کا مکان سے باہر جانے کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ کمرے میں ہر چیز سلیقے سے سجی ہوئی ہے۔ جب پردہ اٹھتا ہے تو بائیں جانب کے دروازے سے آگے آگے پروین اور اس کے پیچھے کنول شیخ آتے ہیں۔ پروین کے چہرے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ کسی گہری سوچ میں ہے۔ آہستہ آہستہ وہ کمرے کے بیچ میں آجاتی ہے پھر مڑ کر کنول شیخ کو دیکھ کر:

پروین : کنول! (کنول سوالیہ نظروں سے دیکھتا ہے۔ پروین سوچتے ہوئے آہستہ سے) ایسا محسوس ہوتا ہے کہ امی مجھے پسند تو کرتی ہیں مگر ہم دونوں کا ملنا جلنا

انھیں پسند نہیں ہے۔

کنول شیخ : نہیں پروین امی گریٹ ہیں (کچھ دیر خاموش رہ کر) اگر وہ تم کو پسند نہ کرتیں تو خاموشی کا سہارا ہرگز نہیں لیتیں۔

پروین : مگر میں نے کچھ ایسا ہی محسوس کیا کہ وہ یقین...

کنول شیخ : احساس کی دنیا ہی نرالی ہے (کنول شیخ خاموش ہو جاتا ہے پھر آہستہ آہستہ دروازے کے پاس جاتا ہے۔ پردہ ہٹا کر اندر جھانکتا ہے۔ پھر پروین کے پاس آکر) کبھی کبھی مجھے یہ احساس ہوتا ہے کہ جیسے وہ میری ماں نہیں ہیں۔

پروین : (حیرت سے کنول شیخ کو دیکھ کر) کنول ممتا کی توہین نہ کرو۔

کنول شیخ : نہیں پروین یہ بات نہیں ہے (سوچتے ہوئے صوفے پر بیٹھ کر) کبھی کبھی یادوں کی پرچھائیاں ذہن کے پردے پر ابھرتی ہیں جیسے کوئی دوسرا ہی مکان تھا جس میں میں رہتا تھا۔ وہاں کچھ دوسرے ہی قسم کے لوگ تھے جو...''

(پروین قہقہہ مار کر ہنستی ہے پھر کنول شیخ کے پاس جاکر)۔

پروین : تم نے ضرور دوسرا جنم لیا ہے اور پہلے جنم کی باتیں یاد رہ گئی ہیں۔

کنول شیخ : (تکلفاً مسکرا کر) تم پنر جنم پر عقیدہ رکھتی ہو۔

پروین : نہیں بھی رکھتی تو کون سا فرق پڑتا ہے (ہنس کر) سکون دل کی خاطر بہت سی باتیں مان لینی پڑتی ہیں (کنول شیخ صوفے سے اٹھ کر کھڑکی کے پاس جاتا ہے اور اس سے باہر دیکھنے لگتا ہے۔ پروین کنول شیخ کے پاس جاکر) خیر چھوڑو تو شام کو جلدی آرہے ہو۔

کنول شیخ : شیور شیور (آہستہ آہستہ دوسرے دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے) آؤ میں تم کو پہنچا دوں۔

(پروین بھی دروازے کی طرف بڑھتی ہے کہ سلمیٰ بہن پہلے دروازے میں آکر)

سلمیٰ بہن : ارے کنول کہاں جا رہا ہے؟

کنول شیخ : (مڑ کر سلمیٰ بہن کو دیکھ کر) امی! ذرا پروین کو گھر تک پہنچا دوں ابھی آجاؤں گی۔

سلمیٰ بہن : (کمرے میں آکر) مجھے تجھ سے ایک ضروری کام ہے۔ (پروین کی طرف دیکھ کر) اگر برا نہ مانو تو اکیلی چلی جاؤ مجھے اس سے ضروری کام ہے۔

پروین : واہ امی اس میں برا ماننے کی کون سی بات ہے۔ میں اکیلی چلی آئی تھی اکیلی چلی جاؤں گی۔ آپ تو اس طرح کہہ رہی ہیں کہ میں شرمندہ ہوئے بنا نہ رہ سکوں۔

سلمیٰ بہن : (سنجیدگی سے مسکرا کر) میں تمھیں شرمندہ کرنا نہیں چاہتی آج میرے یہاں کچھ مہمان آرہے ہیں۔

پروین : کہیں باہر سے آرہے ہیں؟ (سلمیٰ بہن اثبات میں سر ہلاتی ہیں) تو پھر شام کو انھیں بھی ساتھ لایئے گا۔

سلمیٰ بہن : ہاں ہاں ضرور لاؤں گی۔

پروین : اچھا تو مجھے اجازت دیجیے (سلمیٰ بہن خاموش رہتی ہیں) امی آداب۔

سلمیٰ بہن : خدا حافظ۔

(پروین دوسرے دروازے کی طرف بڑھتی ہے۔ کنول شیخ اس کے پیچھے جاتے ہیں)

کنول شیخ : راستہ میں سے کوئی ٹیکسی لے لینا۔

پروین : او کے۔

(پروین کمرے سے چلی جاتی ہے۔ کنول شیخ بھی باہر جاتا ہے۔ سلمیٰ بہن برابر دروازے کو دیکھتی رہتی ہیں۔ کچھ دیر بعد کنول شیخ کمرے میں آکر)

کنول شیخ : امی کون مہمان آرہا ہے؟ آپ نے مجھے بتایا بھی نہیں۔

سلمیٰ بہن : (سوچتے ہوئے) جب آجائیں تو دیکھ لینا۔

کنول شیخ : میں انھیں رسیو کرنے اسٹیشن چلا جاؤں؟

سلمیٰ بہن : نہیں وہ بائی روڈ آرہے ہیں۔ (کچھ دیر خاموش رہ کر) تو پروین کی سال گرہ کے لیے کوئی تحفہ نہیں لایا۔

کنول شیخ : کل بازار گیا تو تھا مگر (نظریں جھکا کر شرمندگی کے انداز میں) کچھ پیسے کم پڑ گئے تھے۔

سلمٰی بہن : (مسکرا کر) اور تو اس قدر سعادت مند ہے کہ کہا بھی نہیں۔ (کنول شیخ خاموش رہتا ہے۔ سلمٰی بہن آہستہ آہستہ کھڑکی کے پاس جاتی ہیں پھر مڑ کر کنول شیخ کو دیکھ کر) کنول (کنول شیخ نظریں اٹھا کر سلمٰی بہن کو دیکھتا ہے۔ سلمٰی بہن اس کے چہرے پر نظریں گاڑ کر) مجھے پروین پسند تو ہے مگر۔

کنول شیخ : وہ بہت اچھی لڑکی ہے۔ امی۔ مجھے یقین تھا کہ آپ اسے ضرور پسند کریں گی۔

سلمٰی بہن : میں ہر اس لڑکی کو پسند کرلوں گی جسے تو پسند کرتا ہے (کنول شیخ کے چہرے سے خوشی ظاہر ہوتی ہے۔ سلمٰی بہن کچھ دیر خلا میں گھورتی رہتی ہے جیسے وہ ایک انجانے خوف میں گھر گئی ہوں۔ کچھ دیر خاموش رہتی ہیں پھر آہستہ سے) کنول (پھر کچھ دیر خاموشی!) اگر تو کسی دن میرے لیے پرایا ہوگیا؟ پھر کیا ہوگا۔

(کنول شیخ حیرت سے سلمٰی بہن کو دیکھتا ہے پھر آہستہ آہستہ سلمٰی بہن کے پاس جاتا ہے کچھ دیر خاموش کھڑا رہتا ہے اس کے بعد آہستہ سے)

کنول شیخ : امی۔ (کچھ دیر اسی طرح خاموش رہتا ہے جیسے کوئی فیصلہ کر رہا ہو) اگر پروین آپ کو اس لیے پسند نہیں کہ میں آپ کے لیے پرایا ہو جاؤں گا تو پھر۔

سلمٰی بہن : (بات کاٹ کر) نہیں کنول (آنکھوں میں آنسو آجاتے ہیں۔ مگر اسی کے ساتھ ساتھ چہرے پر فخر اور غرور کی نمایاں جھلک پیدا ہوتی ہے۔ پھر دوپٹے سے آنسو پونچھ کر) کوئی ماں اپنے بچے کی خوشیوں کی قربانی نہیں چاہتی۔

کنول شیخ : تو پھر امی شاید آپ ـــــ

سلمٰی بہن : (پھر بات کاٹ کر) نہیں کنول تو مجھ کو غلط نہ سمجھ (چند سیکنڈ رک کر) ایک دن بیٹی کہیں بہو بن کر چلی جاتی ہے۔ ایک دن بیٹا شادی کرکے اپنا گھر بسا لیتا ہے اور پھر کوئی بڑھاپا کس قدر ویران اور اداس ہو جاتا ہے۔

کنول شیخ : (سلمٰی بہن کی گردن میں باہیں ڈال کر) آپ آج جانے کیسی باتیں کررہی ہیں (سلمٰی بہن کے دونوں بازو پکڑ کر اور انھیں اپنی نظروں کے سامنے کرکے) اچھا آپ کوئی لڑکی پسند کرلیں (مسکرا کر) اگر آپ نے کوئی لڑکی پسند کرلی ہے تو مجھے وہی پسند ہے۔ اب ہنس دیجیے۔

سلمٰی بہن : (مسکرا کر جس میں غم کی نمایاں جھلک ہے) میں نے کب کہا کہ پروین مجھے پسند نہیں مگر نہ جانے میرا دل آج کیوں دھڑک رہا ہے۔

کنول شیخ : ماؤں کا دل اپنی اولاد کے لیے دھڑکتا ہی رہتا ہے (مسکرا کر) وہ اولاد سب سے خوش قسمت ہوتی ہے جس کی ماں کا دل اس کے لیے سب سے زیادہ دھڑکے۔

سلمٰی بہن : (سوچتے ہوئے) کبھی تو نے مسز ممتاز کے دل کی بھی بات جاننے کی کوشش کی۔

کنول شیخ : واہ امی آپ بھی کمال کرتی ہیں (ہنس کر) اپنا فرض میری گردن پر ڈال رہی ہیں (کچھ دیر خاموش رہ کر) مگر شاید انھیں انکار نہ ہوگا۔

سلمٰی بہن : ہونٹوں اور پیالی کے درمیان بہت فاصلہ ہوتا ہے کنول اچھا خیر چھوڑو (تیز تیز قدموں سے دوسرے کمرے میں چلی جاتی ہیں۔ کنول شیخ تنہا رہ جاتا ہے اور فکر مندانہ انداز میں کمرے میں ٹہلنے لگتا ہے۔ کچھ دیر بعد سلمٰی بہن پھر کمرے میں آتی ہیں اور روپے کنول شیخ کو دیتے ہوئے) بازار چلا جاتا اور پروین کے لیے اپنا پسند کیا ہوا تحفہ خرید لا۔

کنول شیخ : (سوچتے ہوئے روپے لے کر) کیا مسز ممتاز کی اس سلسلے میں آپ سے کوئی بات ہوئی تھی؟

سلمٰی بہن : نہیں (کنول شیخ کا چہرہ دیکھ کر) اچھا اب تو بازار جا (کنول شیخ کچھ دیر خاموش رہتا ہے۔ پھر آہستہ آہستہ کمرے سے باہر چلا جاتا ہے۔ سلمٰی بہن کچھ دیر خاموش کھڑی رہتی ہیں۔ پھر ایک دم جیسے کچھ یاد آجانے پر تیزی سے کھڑکی کے پاس جا کر بلند آواز سے) کنول ارے کنول (کھڑکی کے باہر

سر نکال کر) ارے کنول ذرا ایک بات تو سنتا جا (کچھ دیر بعد کنول کمرے میں آتا ہے سلمٰی بہن اسے دیکھ کر) دیکھ کہیں سے مسز ممتاز کو فون کر دینا کہ وہ ابھی مجھ سے مل لیں ایک ضروری کام ہے۔

کنول شیخ : مگر ای آج تو وہ—

سلمٰی بہن : (بات کاٹ کر) اب بحث نہ کر جیسا کہہ رہی ہوں، ویسا کر۔

کنول شیخ : بہت اچھا۔

(سوچتا ہوا کمرے سے چلا جاتا ہے۔ سلمٰی بہن کچھ دیر کھڑکی کے پاس کھڑی رہتی ہیں۔ پھر آہستہ آہستہ اس دیوار کے پاس جاتی ہے جس پر کنول شیخ کی تصویر لگی ہے۔ تصویر کو اس طرح کھڑی ہوکر دیکھتی ہیں کہ ان کی پیٹھ کمرے کی طرف ہوتی ہے۔ تھوڑی دیر اسی طرح کھڑی رہتی ہیں اور جب مڑتی ہیں تو ان کی آنکھوں میں آنسو ہوتے ہیں جن کو وہ اپنے دوپٹے کے پلو سے پونچھتی ہیں پھر آہستہ آہستہ دوسرے کمرے کی طرف جاتی ہیں اتنے میں موٹر کے ہارن کی آواز آتی ہے۔ مڑکر کھڑکی کے پاس جاتی ہیں اور باہر جھانک کر دیکھتی ہیں پھر تیزی سے دروازے کی طرف جاتی ہیں مگر دروازے کے پاس رک جاتی ہیں اور پھر اس طرح پردہ اٹھا کر کھڑی ہوجاتی ہیں جیسے کسی کا انتظار کر رہی ہوں کچھ دیر بعد)۔

سلمٰی بہن : آیئے اندر تشریف لایئے۔ (ایک شخص اندر آتا ہے۔ چال ڈھال باوقار اور شخصیت پرکشش ہے۔ عمر پچاس کے لگ بھگ۔ قیمتی سوٹ میں ملبوس ہے۔ سلمٰی بہن اسی طرح پردہ اٹھائے کھڑی رہتی ہیں۔ پھر مسکرا کر) کیا آپ اندر تشریف نہیں لائیں گی (ایک عورت اندر آتی ہے جوانی میں خوبصورت رہی ہوگی مگر اب جوانی ڈھل چکی ہیں۔ لباس اگرچہ سادہ مگر قیمتی ہے۔ سلمٰی بہن صوفے کی طرف بڑھتے ہوئے) آیئے دونوں اس کے پیچھے آتے ہیں سلمٰی بہن صوفے کی طرف اشارہ کرکے) تشریف رکھیے راستہ میں کوئی تکلیف تو

نہیں ہوئی؟

برج کشور . بڑا تھکا دینے والا تکلیف دہ سفر تھا۔

سلمٰی بہن : ریل سے تشریف لے آئے ہوتے۔ موٹر سے سفر کرنے کی کیا ضرورت تھی (عورت کی طرف دیکھ کر جو دیواروں پر لگی ہوئی تصویروں کا جائزہ لے رہی ہے) رنجنا دیوی آپ تشریف رکھیے تھکی ہوئی ہوں گی (چند سیکنڈ رُک کر) پہلے آپ ایک ایک پیالہ چائے لیجیے (بلند آواز سے) جانکی ارے او جانکی۔

برج کشور : (مسکرا کر) یہ رنجنا بہت مذہبی ہوگئی ہیں بلا اشنان کیے اب کوئی چیز منہ میں نہیں رکھتیں۔

سلمٰی بہن : اچھا۔ (مسکرا کر) تو پہلے اشنان کرلیں۔ گرم پانی غسل خانے میں رکھواتی ہوں (بلند آواز سے) جانکی (اسی وقت جانکی کمرے میں آتی ہے۔ سلمٰی بہن اسے دیکھ کر) دیکھ گرم پانی غسل خانے میں رکھ دے اور چائے بنالا۔

جانکی : بہت اچھا گرم پانی موجود ہے۔

سلمٰی بہن : تو جا غسل خانے میں رکھ دے (جانکی خاموشی سے کمرے سے چلی جاتی ہے۔ سلمٰی بہن مڑ کر رنجنا دیوی کو دیکھتی ہیں جو کنول شخ کی تصویر کو غور سے دیکھ رہی ہیں۔ کچھ دیر خاموشی سے دیکھتی رہی ہیں پھر رنجنا دیوی کے پاس جاکر) یہ کنول شخ کی تصویر ہے۔

رنجنا دیوی : (اس قدر آہستہ سے جیسے خود سے کہہ رہی ہوں) کنول۔ شخ۔

سلمٰی بہن : (کچھ دیر خاموشی سے رنجنا دیوی کو دیکھتی رہتی ہیں پھر غمگین مسکراہٹ سے) بہت خوبصورت، بہت صحت مند اب انجینئر بھی ہوگیا ہے بازار گیا ہے آتا ہی ہوگا۔ (رنجنا دیوی برابر تصویر کو دیکھے جاتی ہیں جانکی کمرے میں آکر)

جانکی : گرم پانی رکھ دیا ہے۔

برج کشور : (رنجنا دیوی کی طرف دیکھ کر) رنجنا۔ بھئی اب تم جلدی سے نہا لو (جانکی کی طرف دیکھ کر) گاڑی میں سوٹ کیس رکھا ہے۔ اٹھا لاؤ۔ (جانکی خاموشی سے

کمرے سے باہر چلی جاتی ہے۔ پھر ایک سوٹ کیس لیے ہوئے اندر آتی ہے۔ برج کشور پھر رنجنا کی طرف دیکھ کر) بھئی رنجنا جلدی کرو (مسکرا کر) یوں تصویروں کو کیوں گھور رہی ہو (رنجنا دیوی مڑ کر برج کشور کو دیکھتی ہیں مگر خاموش رہتی ہیں پھر جانکی کے ہاتھ سے سوٹ کیس لے کر صوفے پر رکھتی ہیں اسے کھول کر ساڑی اور دوسری ضروری چیزیں نکالتی ہیں اور جانکی کی طرف دیکھتی ہیں)

جانکی : ادھر تشریف لائیے۔

(جانکی آگے اور رنجنا دیوی اس کے پیچھے دوسرے کمرے میں چلی جاتی ہیں کچھ دیر خاموشی رہتی ہے۔ پھر سلمٰی بہن برج کشور کی طرف دیکھ کر)

سلمٰی بہن : یہ رنجنا دیوی تو بہت خاموش ہوگئی ہیں۔

برج کشور : اسی وقت ہوگئی ہیں، ورنہ یہاں آنے کے لیے اتنی بے چین تھیں کہ راتوں کی نیند حرام کیے ہوئے تھیں۔

(سلمٰی بہن آہستہ آہستہ کنول شیخ کی تصویر کے پاس جاتی ہیں۔ اسے غور سے دیکھتی ہیں پھر مڑ کر۔ برج کشور کو دیکھ کر تصویر کی طرف اشارہ کرکے)

سلمٰی بہن : دیکھا آپ نے میں نے آپ کی امانت میں خیانت تو نہیں کی۔

برج کشور : (ایک اچٹتی نظر تصویر پر ڈال کر) آپ نے جوانی ہی نہیں ساری زندگی قربان کردی۔

سلمٰی بہن : وہ میری زندگی کا تنہا سہارا تھا اور۔ اور (خاموش ہوجاتی ہیں کچھ دیر بعد) آپ اپنے صاحب زادے کو نہیں لائے۔

برج کشور : صاحب زادہ!

(ٹھنڈی سانس بھرتے ہیں اور اب مڑ کر کنول شیخ کی تصویر کو دیکھتے ہیں سلمٰی بہن کچھ دیر خاموش رہ کر پھیکی مسکراہٹ سے)

سلمٰی بہن : اب میں ایسی بدنیت تو ہوں نہیں کہ اسے نظر لگا دیتی (ٹھنڈی سانس بھر کر)

بوڑھی ہوں کچھ دعائیں تو دے سکتی تھی۔

برج کشور : (مڑ کر سلمیٰ بہن کو دیکھ کر) جی نہیں ایسی بات نہیں ہے (چہرے پر ایسے آثار پیدا ہوتے ہیں جیسے وہ کچھ اور کہتے ہوئے ڈر رہا ہو پھر آہستہ سے) میرے یہاں پھر اور کوئی اولاد پیدا نہیں ہوئی۔

سلمیٰ بہن : (حیرت سے) پھر کوئی اولاد پیدا نہیں ہوئی۔

برج کشور : جی ہاں (مڑ کر سلمیٰ بہن کو دیکھ کر) مجھے امید تھی کہ میرے یہاں بچہ پیدا ہوگا۔ اور۔ اور۔

سلمیٰ بہن : مگر آپ تو اس کی صحت اس کی تعلیم اور اس کی شوخیوں کے بارے میں بھی لکھتے رہتے تھے۔

برج کشور : (بڑی پھیکی مسکراہٹ سے) میں نے تصور کرلیا تھا کہ میرا ایک لڑکا ہے میں نے اس کے بارے میں جو کچھ لکھا تھا، وہ اپنی اولاد کے بارے میں میرا صرف آئیڈیل تھا۔

سلمیٰ بہن : پھر تو آپ نے میرے ساتھ بڑا ظلم کیا ہے۔

برج کشور : اور اگر میں ایسا نہ کرتا تو آپ کی زندگی کس قدر سونی اور ویران ہوتی۔ میں تو پھر بھی اولاد پیدا کرسکتا تھا مگر آپ۔

سلمیٰ بہن : میں جانتی ہوں کہ قسمت سے لڑا نہیں جاسکتا (کنول شیخ کی تصویر کے پاس جاتی ہے اسے غور سے دیکھتی ہے پھر برج کشور کی طرف دیکھ کر) اگر وہ صرف آپ کا آئیڈیل تھا تو کنول شیخ اس پر پورا اترے گا۔

برج کشور : کنول آپ کا...

سلمیٰ بہن : (بات کاٹ کر حیرت بھرے لہجے میں) خدا کے لیے آج تو کنول شیخ کہہ لیجیے۔ (ٹھنڈی سانس بھر کر) کل کی کسے خبر کیا جانے کل وہ خود کو کیا کہلانا پسند کرے۔ (برج کشور کچھ کہنا ہی چاہتے ہیں کہ رنجنا دیوی کمرے میں آتی ہیں۔ وہ نہا چکی ہیں اور لباس بدل لیا ہے۔ سلمیٰ بہن رنجنا دیوی کو دیکھ کر)

کمرے سے باہر چلی جاتی ہے۔ پھر ایک سوٹ کیس لیے ہوئے اندر آتی ہے۔ برج کشور پھر رنجنا کی طرف دیکھ کر) بھئی رنجنا جلدی کرو (مسکرا کر) یوں تصویروں کو کیوں گھور رہی ہو (رنجنا دیوی مڑ کر برج کشور کو دیکھتی ہیں مگر خاموش رہتی ہیں پھر جانکی کے ہاتھ سے سوٹ کیس لے کر صوفے پر رکھتی ہیں اسے کھول کر ساڑی اور دوسری ضروری چیزیں نکالتی ہیں اور جانکی کی طرف دیکھتی ہیں)

جانکی : ادھر تشریف لائیے۔

(جانکی آگے اور رنجنا دیوی اس کے پیچھے دوسرے کمرے میں چلی جاتی ہیں کچھ دیر خاموشی رہتی ہے۔ پھر سلمیٰ بہن برج کشور کی طرف دیکھ کر)

سلمیٰ بہن : یہ رنجنا دیوی تو بہت خاموش ہوگئی ہیں۔

برج کشور : اسی وقت ہوگئی ہیں، ورنہ یہاں آنے کے لیے اتنی بے چین تھیں کہ راتوں کی نیند حرام کیے ہوئے تھیں۔

(سلمیٰ بہن آہستہ آہستہ کنول شیخ کی تصویر کے پاس جاتی ہیں۔ اسے غور سے دیکھتی ہیں پھر مڑ کر۔ برج کشور کو دیکھ کر تصویر کی طرف اشارہ کرکے)

سلمیٰ بہن : دیکھا آپ نے میں نے آپ کی امانت میں خیانت تو نہیں کی۔

برج کشور : (ایک اچٹتی نظر تصویر پر ڈال کر) آپ نے جوانی ہی نہیں ساری زندگی قربان کردی۔

سلمیٰ بہن : وہ میری زندگی کا تنہا سہارا تھا اور۔ اور (خاموش ہوجاتی ہیں کچھ دیر بعد) آپ اپنے صاحب زادے کو نہیں لائے۔

برج کشور : صاحب زادہ!

(ٹھنڈی سانس بھرتے ہیں اور اب مڑ کر کنول شیخ کی تصویر کو دیکھتے ہیں سلمیٰ بہن کچھ دیر خاموش رہ کر پھیکی مسکراہٹ سے)

سلمیٰ بہن : اب میں ایسی بدنیت تو ہوں نہیں کہ اسے نظر لگا دیتی (ٹھنڈی سانس بھر کر)

بوڑھی ہوں کچھ دعائیں تو دے سکتی تھی۔

برج کشور : (مڑ کر سلمٰی بہن کو دیکھ کر) جی نہیں ایسی بات نہیں ہے (چہرے پر ایسے آثار پیدا ہوتے ہیں جیسے وہ کچھ اور کہتے ہوئے ڈر رہا ہو پھر آہستہ سے) میرے یہاں پھر اور کوئی اولاد پیدا نہیں ہوئی۔

سلمٰی بہن : (حیرت سے) پھر کوئی اولاد پیدا نہیں ہوئی۔

برج کشور : جی ہاں (مڑ کر سلمٰی بہن کو دیکھ کر) مجھے امید تھی کہ میرے یہاں بچہ پیدا ہوگا۔ اور۔ اور۔

سلمٰی بہن : مگر آپ تو اس کی صحت اس کی تعلیم اور اس کی شوخیوں کے بارے میں بھی لکھتے رہتے تھے۔

برج کشور : (بڑی پھیکی مسکراہٹ سے) میں نے تصور کرلیا تھا کہ میرا ایک لڑکا ہے میں نے اس کے بارے میں جو کچھ لکھا تھا، وہ اپنی اولاد کے بارے میں میرا صرف آئیڈیل تھا۔

سلمٰی بہن : پھر تو آپ نے میرے ساتھ بڑا ظلم کیا ہے۔

برج کشور : اور اگر میں ایسا نہ کرتا تو آپ کی زندگی کس قدر سونی اور ویران ہوتی۔ میں تو پھر بھی اولاد پیدا کرسکتا تھا مگر آپ۔

سلمٰی بہن : میں جانتی ہوں کہ قسمت سے لڑا نہیں جاسکتا (کنول شیخ کی تصویر کے پاس جاتی ہے اسے غور سے دیکھتی ہے پھر برج کشور کی طرف دیکھ کر) اگر وہ صرف آپ کا آئیڈیل تھا تو کنول شیخ اس پر پورا اترے گا۔

برج کشور : کنول آپ کا...

سلمٰی بہن : (بات کاٹ کر حیرت بھرے لہجے میں) خدا کے لیے آج تو کنول شیخ کہہ لیجیے۔ (ٹھنڈی سانس بھر کر) کل کی کسے خبر کیا جانے کل وہ خود کو کیا کہلانا پسند کرے۔ (برج کشور کچھ کہنا ہی چاہتے ہیں کہ رنجنا دیوی کمرے میں آتی ہیں۔ وہ نہا چکی ہیں اور لباس بدل لیا ہے۔ سلمٰی بہن رنجنا دیوی کو دیکھ کر)

آپ نہالیں؟ (رنجنا دیوی خاموش رہتی ہیں اور ڈریسنگ ٹیبل کے پاس جاکر بالوں کا جوڑا باندھتی ہیں۔ سلمٰی بہن کچھ دیر خاموش رہ کر برج کشور کی طرف دیکھ کر) اب چائے منگواؤں (بلند آواز سے) جانکی ارے جانکی (خود دوسرے کمرے کی طرف جاتے ہوئے) میں ابھی آتی ہوں (سلمٰی بہن دوسرے کمرے میں چلی جاتی ہیں۔ برج کشور تھوڑی دیر خاموش رہتے ہیں۔ پھر آہستہ آہستہ رنجنا دیوی کے پاس جاکر)۔

برج کشور : رنجنا تم یہاں آکر اس قدر خاموش کیوں ہوگئی ہو تمھاری خاموشی کہیں...

رنجنا دیوی : (مڑ کر برج کشور کو دیکھ کر) مجھے ڈر لگ رہا ہے (آنکھوں میں آنسو بھر کر) میں ڈر رہی ہوں کہ کہیں میں آواز نکالوں تو وہ کوئی چیخ کوئی سسکی نہ بن جائے۔

برج کشور : آنسو پونچھ ڈالو رنجنا تم نے اٹھارہ سال تک —

رنجنا : ہاں میں نے اٹھارہ سال تک ان آنسوؤں کو روکا ہے اب وہ بند ٹوٹتا نظر آرہا ہے۔

برج کشور : ہمت سے کام لو رنجنا۔ تم نے صبر اور استقلال کا جو ثبوت دیا ہے کہیں وہ...

رنجنا دیوی : (بات کاٹ کر) میں سوچ رہی ہوں جب وہ میرے سامنے آئے گا تو کیا ہوگا۔ وہ مجھے کن نظروں سے دیکھے گا۔ اس کی آنکھوں میں محبت ہوگی یا حیرت۔ (اپنے آنسو پونچھتے ہوئے) اگر اس کی آنکھوں میں میرے لیے نفرت ہوئی تو پھر کیا ہوگا۔ وہ مجھ سے نفرت بھی تو کرسکتا ہے۔

برج کشور : (رنجنا دیوی کا کاندھا تھپتھپا کر) رنجنا اس کی آنکھوں میں تمھیں سب کچھ مل سکتا ہے مگر نفرت نہیں۔ خود پر قابو رکھو۔

رنجنا دیوی : ایسا جان پڑتا ہے کہ آج سب کچھ ہوجائے گا کسی ماں کا دل ٹوٹ بھی سکتا ہے (برج کشور کو دیکھتے ہوئے) کیوں کیا وہ مجھ کو ماں کہے گا۔ اس کو شرم تو نہیں آئے گی۔

برج کشور : وہ تم کو ضرور (آواز بھرا جاتی ہے اور خاموش ہوجاتے ہیں۔ کچھ دیر بعد پھر رنجنا دیوی کا کاندھا تھپ تھپا کر) ہمت کو ہاتھ سے نہ جانے دو رنجنا، کہیں ایسا

نہ ہو کہ تمھاری اٹھارہ سال کی تپسیا صرف چند منٹوں میں بھنگ ہو جائے۔
(رنجنا دیوی آہستہ آہستہ صوفے کی طرف آتی ہیں پھر کچھ سوچ کر دیوار پر لگی تصویر کو دیکھنے لگتی ہیں۔ برج کشور خاموشی سے رنجنا دیوی کو دیکھتے رہتے ہیں۔ سلمیٰ بہن کمرے میں آتی ہیں۔ ان کے پیچھے جانکی آتی ہے اور صوفے کے سامنے میز پر چائے کا سامان رکھ کر خاموشی سے واپس چلی جاتی ہے۔ سلمیٰ بہن برج کشور کی طرف دیکھ کر)۔

سلمیٰ بہن : آیئے (برج کشور آہستہ آہستہ صوفے کی طرف آتے ہیں (سلمیٰ بہن رنجنا دیوی کی طرف دیکھ کر) رنجنا دیوی تشریف لایئے (رنجنا دیوی خاموشی سے آکر صوفے پر بیٹھ جاتی ہیں۔ سلمیٰ بہن دونوں کو چائے پیش کرکے) کنول شیخ اب جوان ہو گیا ہے۔ اس کی شادی ہو جانا چاہیے۔ میں نے اسی لیے آپ کو تکلیف دی ہے۔

برج کشور : (نظریں اٹھا کر) آپ نے کوئی لڑکی پسند کی۔

سلمیٰ بہن : (مسکرا کر) اس نے خود پسند کرلی ہے۔

رنجنا دیوی : اچھا کیسی ہے وہ لڑکی۔ (سلمیٰ بہن خاموشی سے اٹھ کر میز کی دراز سے ایک تصویر نکال کر لاتی ہیں اور رنجنا دیوی کے سامنے رکھ دیتی ہیں۔ رنجنا دیوی غور سے تصویر کو دیکھتے ہوئے) آپ کو پسند ہے؟

سلمیٰ بہن : پسند تو آپ کو کرنا ہے اور کنول شیخ (مسز ممتاز کمرے میں آتی ہیں انھیں دیکھ کر سلمیٰ بہن خاموش ہو جاتی ہیں۔ مسز ممتاز آگے بڑھتی ہیں) آیئے آیئے مسز ممتاز (برج کشور اور رنجنا دیوی کھڑے ہو جاتے ہیں۔ سلمیٰ بہن دونوں کی طرف اشارہ کرکے مسٹر برج کشور مسز کشور (تینوں اپنے اپنے انداز سے سلام کرتے ہیں) تشریف رکھیے مسز ممتاز صوفے پر بیٹھ جاتی ہیں ان کی نظر تصویر پر پڑتی ہے چہرے پر حیرت کے آثار پیدا ہوتے ہیں تھوڑی دیر خاموش رہ کر)

مسز ممتاز : ابھی کنول شیخ کا فون ملا کہ آپ کو مجھ سے کوئی ضروری کام ہے۔ فوراً چلی آئی۔

سلمٰی بہن : جی ہاں اسی لیے آپ کو تکلیف دی ہے۔ آج پروین کی سال گرہ ہے۔

مسز ممتاز : آپ کو دعوت نامہ نہیں ملا۔ میں نے پروین کو بھیجا تھا کہ آپ آ کر میرا ہاتھ بٹائیے اس نے نہیں کہا؟

سلمٰی بہن : آپ کا دعوت نامہ بھی مل گیا تھا اور پیغام بھی (کھڑی ہو جاتی ہیں اور سوچتی ہوئی کھڑکی کے پاس جاتی ہیں۔ کچھ دیر سب کی طرف پیٹھ کیے کھڑی رہتی ہیں۔ پھر مڑ کر مسز ممتاز کی طرف دیکھ کر) میں آج ایک اہم راز کا انکشاف کرنا چاہتی ہوں۔

مسز ممتاز : (مسکرا کر) مجھے وہ راز معلوم ہے اور میں فیصلہ بھی کر چکی ہوں۔

سلمٰی بہن : اس قدر جلد فیصلہ نہ کیجیے مسز ممتاز کہیں پھر آپ کو بدلنا نہ پڑے۔ اور اگر آپ نے فیصلہ کرلیا تو میں جان دے دوں گی مگر بدلنے نہیں دوں گی۔

مسز ممتاز : (حیرت سے ان کا چہرہ دیکھ کر) میں آپ کا مطلب نہیں سمجھی۔ جب وہ دونوں آپس میں۔

سلمٰی بہن : (لقمہ دیتے ہوئے) محبت کرتے ہیں۔ مگر نوجوانوں کی محبت ہی سب کچھ نہیں ہوتی (کچھ دیر خاموش رہ کر) کنول شیخ میرا لڑکا نہیں ہے (مسز ممتاز حیرت سے) اُنھیں دیکھنے لگتی ہیں اور اس طرح خاموش ہو جاتی ہیں جیسے قوت گویائی سلب ہوگئی ہو۔ کمرے پر ایک تکلیف دہ خاموشی طاری ہو جاتی ہے۔ کچھ دیر بعد) اب کہیے۔

مسز ممتاز : تو آپ۔ تو آپ۔

سلمٰی بہن : سمجھ لیجیے کہ میں۔ کہ میں (آنکھوں میں آنسو آ جاتے ہیں جن کو وہ دوپٹے کے پلو سے پونچھتی ہیں۔ تھوڑی دیر رک کر) مسز ممتاز بہت ممکن ہے تھوڑی دیر بعد وہ کنول شیخ نہ رہے کنول کشور ہو جائے۔

رنجنا دیوی : ممتا کی توہین نہ کرو سلمٰی بہن جو بچے کو پال رہی ہے وہی اس کی ماں ہے۔

سلمٰی بہن : (رنجنا دیوی کی بات پر دھیان نہ دے کر) ان دونوں نے میرے ساتھ بڑا

ظلم کیا ہے میرا بڑا سخت امتحان لیا ہے۔ وہ شرافت بھی کیا۔ جو دوسروں کے لیے ظلم بن جائے۔

(سلمٰی بہن ہچکیاں لے کر رونے لگتی ہیں۔ رنجنا دیوی گھبرا کر کھڑی ہوتی ہیں اور سلمٰی بہن کا بازو پکڑ کر)

رنجنا دیوی : آپ بیٹھ جائیے سلمٰی بہن (صوفے پر بٹھلاتی ہیں۔ پھر بلند آواز سے) جانکی ارے او جانکی (جانکی کمرے میں آتی ہے) پینے کے لیے پانی لاؤ (جانکی تیزی سے چلی جاتی ہے سلمٰی بہن برابر ہچکیاں لے کر روتی رہتی ہیں۔ کچھ دیر بعد جانکی گلاس میں پانی لاتی ہے۔ رنجنا دیوی اس کے ہاتھ سے گلاس لے کر سلمٰی بہن کو دیتے ہوئے) ایک دو گھونٹ پانی پی لیجیے۔ طبیعت سنبھل جائے گی۔

(سلمٰی بہن ایک دو گھونٹ پانی پی لیتی ہیں۔ کچھ دیر خاموش رہتی ہیں پھر کھڑی ہو کر مسز ممتاز سے)

سلمٰی بہن : وہ میرا بچہ نہیں ہے میرے بچہ کا معاوضہ ہے۔

مسز ممتاز : (حیرت سے) بچہ کا معاوضہ!

سلمٰی بہن : ہاں مسز ممتاز (آہستہ آہستہ مسز ممتاز کے پاس آتے ہوئے) کوئی اٹھارہ بیس سال کی بات ہے جب میں بیوہ ہوئی تھی۔ میری زندگی کا سہارا میرا ایک بچہ تھا ایک دن وہ نہ رہا۔

مسز ممتاز : وہ نہ رہا۔

سلمٰی بہن : جی ہاں ایک حادثہ کا شکار ہو گیا (مسز ممتاز سوالیہ نظروں سے انھیں دیکھتی ہیں کچھ دیر خاموش رہ کر) موٹر کے حادثہ کا اس شخص کو میری تنہائی اور بے کسی کا احساس ہوا اور ایک دن وہ اپنے بچے کو لے کر میرے پاس آیا اور کہا کہ چند دن کے لیے آپ اس بچے کو اپنے پاس رکھ لیجیے آپ کا دل بہل جائے گا اور پھر وہ کبھی اپنے بچے کو واپس لینے نہیں آیا۔

مسز ممتاز : (حیرت سے) اپنا بچہ ہمیشہ کے لیے آپ کو دے گیا۔

سلمٰی بہن : جی ہاں اور وہ بھی اکلوتا بچہ اور پھر وہ اس شہر ہی سے چلا گیا (آنسو پونچھ کر) اس کی ماں نے کتنے آنسو بہائے ہوں گے (کچھ دیر رک کر) وہ یہی تھے (برج کشور کی طرف اشارہ کرتی ہیں) جن کی موٹر سے حادثہ ہوا تھا اور وہ ابھاگنی دیوی (رنجنا کی طرف اشارہ کرکے) یہ تھیں جو پھر آج تک بے اولاد پھر رہی ہیں (مسز ممتاز حیرت سے کبھی ان دونوں کو اور کبھی سلمٰی بہن کو دیکھتی ہیں سلمٰی بہن مسز ممتاز کا چہرہ دیکھ کر) کہو مسز ممتاز اب تمھارا فیصلہ کیا ہے۔

مسز ممتاز : کس قدر عجیب کہانی ہے۔

(سوچتی ہوئی کھڑی ہو جاتی ہیں اور کمرے میں ٹہلنے لگتی ہیں چہرے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ذہنی کش مکش میں مبتلا ہیں۔ سب انھیں امید و بیم کی حالت میں دیکھتے رہتے ہیں۔ سلمٰی بہن مسز ممتاز کے پاس جاکر)

سلمٰی بہن : اب آپ کا فیصلہ کیا ہے؟

مسز ممتاز : کیا پروین اس عجیب کہانی سے واقف ہے؟

سلمٰی بہن : نہیں خود کنول شیخ کو بھی اس کا پتا نہیں ہے کہ وہ کون ہے۔ وہ مجھ کو ہی اپنی ماں سمجھتا ہے (مسز ممتاز خاموش رہتی ہیں اور کمرے میں ٹہلتی ہیں کہ کنول شیخ کمرے میں آتا ہے اور مہمانوں کو دیکھ کر دروازے پر رک جاتا ہے سب کی نگاہیں کنول شیخ کی طرف اٹھتی ہیں) آؤ کنول شیخ۔

(برج کشور اور رنجنا دیوی کی طرف دیکھ کر) یہ ہے کنول شیخ۔

برج کشور : (اس کی طرف بڑھتے ہوئے) آؤ نوجوان۔ (اس سے ہاتھ ملاتے ہیں۔ پھر اس کا ہاتھ پکڑے ہوئے رنجنا دیوی کے پاس لے جاتے ہیں) یہ میری بیوی رنجنا ہیں۔

(کنول شیخ بہت ادب سے رنجنا دیوی کو جھک کر سلام کرتا ہے۔ رنجنا دیوی برابر خاموشی سے اسے دیکھتی رہتی ہیں۔ کنول شیخ ان کے اس طرح دیکھتے رہنے سے کچھ بے چین سا نظر آتا ہے۔ رنجنا دیوی کی آنکھوں میں آنسو آجاتے ہیں

اور ان کے ہونٹ ہلتے ہیں۔ سلمٰی بہن رنجنا دیوی کے پاس جاکر)

سلمٰی بہن : مسز کشور آپ بیٹھ جائیے (رنجنا دیوی اسی طرح کنول شیخ کو دیکھتی رہتی ہیں۔ سلمٰی بہن ایسے لہجہ میں جو بڑی حد تک شکست خوردہ معلوم ہوتا ہے) کنول تمھاری اصلی ماں یہی ہیں۔

کنول شیخ : (حیرت سے سلمٰی بہن کو دیکھ کر) امی۔

سلمٰی بہن : یہ سچ ہے کنول شیخ کہ میں نے تم کو پالا ہے اور انھوں نے تم کو جنم دیا ہے (برج کشور کی طرف دیکھ کر) اور یہ تمھارے باپ ہیں۔

کنول شیخ : ماں باپ۔ نہیں امی نہیں۔ میں۔

سلمٰی بہن : (آنکھوں میں آنسو بھر کر) اب تم فیصلہ کرلو کہ تمھیں کنول شیخ رہنا ہے یا کنول کشور۔

رنجنا دیوی : نہیں، نہیں، نہیں (ایک دم کنول شیخ سے لپٹ کر ہچکیاں لے کر رونے لگتی ہیں۔ کنول شیخ کے انداز سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ بالکل خالی الذہن ہو چکا ہے۔ رنجنا دیوی کچھ دیر برابر روتی رہتی ہیں پھر کنول شیخ کے دونوں بازو پکڑ کر اس کا چہرہ اپنے سامنے کرتے ہوئے) تیری ماں کا دودھ ایک شریف عورت کا دودھ ہے۔ (کنول شیخ کے بازو چھوڑ دیتی ہیں۔ کنول شیخ آہستہ آہستہ کھڑکی کے پاس جاتا ہے اور باہر دیکھنے لگتا ہے۔ پھر مڑ کر سب لوگوں کی طرف دیکھتا ہے۔ رنجنا دیوی کے چہرے پر امید وبیم کے آثار پیدا ہوتے ہیں۔ سلمٰی بہن صوفے پر بیٹھ جاتی ہیں اور نظریں جھکا لیتی ہیں جیسے وہ کنول شیخ سے نظریں ملاتے ہوئے کترا رہی ہوں۔ لیکن آنکھوں میں آنسو ہیں۔ کنول شیخ کچھ دیر بعد آہستہ سے)

کنول شیخ : تو ان ہی رشتوں سے میں کنول شیخ تھا۔ کبھی رنجنا دیوی اور کبھی سلمٰی بہن کو دیکھتا ہے۔ کچھ دیر بعد سلمٰی بہن اٹھ کر دوسرے کمرے کی طرف جانے لگتی ہیں۔ پہلے تو کنول شیخ چند سیکنڈ انھیں دیکھتا رہتا ہے۔ پھر تیزی سے ان کے سامنے آکر) امی! اپنے ہاتھوں سے اُن کے آنسو پونچھ کر کیا آپ نے مجھے اسی دن کے لیے پالا تھا کہ میں آپ کی آنکھوں میں یہ آنسو چھوڑ کر چلا

جاؤں۔ امی بولیے۔

(کنول شیخ سلمیٰ بہن سے لپٹ جاتا ہے رنجنا دیوی سسکیاں بھرنے لگتی ہیں۔ مگر چہرہ فخر و غرور سے چمکنے لگتا ہے۔ پھر آہستہ آہستہ اس کے پاس آ کر)

رنجنا دیوی : کنول شیخ تو نے آج میرے دودھ کی لاج رکھ لی اگر تو۔۔ اگر تو۔ (آواز حلق میں اٹک جاتی ہے اور پھر مسکرا کر اپنے آنسو پونچھنے لگتی ہیں۔ پھر سلمیٰ بہن کا ہاتھ پکڑ کر) آپ بیٹھ جائیے سلمیٰ بہن۔

(کمرے میں صرف سلمیٰ بہن کی ہچکیوں کی آواز رہ جاتی ہے۔ کچھ دیر بعد وہ بھی بند ہوجاتی ہے۔ کنول شیخ انھیں سہارا دیتے ہوئے صوفے پر بٹھلا دیتا ہے۔ مسز ممتاز جو ابھی تک کھڑکی کے پاس کھڑی اس ڈرامے کو دیکھ رہی ہیں، کچھ دیر بعد آگے بڑھ کر)

مسز ممتاز : سلمیٰ بہن آپ مجھے اجازت دیجیے کچھ انتظامات کرنا ہیں (سلمیٰ بہن خاموش رہتی ہیں۔ مسز ممتاز رنجنا دیوی اور برج کشور کی طرف دیکھ کر) آج پروین کی سال گرہ ہے آپ تشریف لائیے گا (مسکرا کر) مجھے ایک اہم اعلان بھی کرنا ہے۔

برج کشور : (مسکرا کر) ہم ضرور حاضر ہوں گے۔

مسز ممتاز : اچھا سلمیٰ بہن خدا حافظ۔

سلمیٰ بہن : (کھڑی ہو کر) خدا حافظ۔

مسز ممتاز : آپ تشریف رکھیے۔

(کمرے میں چلی جاتی ہیں۔ برج کشور کنول شیخ کے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر)

برج کشور : ینگ مین۔ نیچے جو گاڑی کھڑی ہے وہ میں تمھارے لیے خرید کر لایا تھا (مسکرا کر) اگر اب میں وہ اپنی ہونے والی بہو کو اس کی سال گرہ پر تحفے میں دے دوں تو تمھیں کوئی اعتراض ہے؟

(کنول شیخ نظریں جھکا لیتا ہے)

(پردہ)

ڈاکٹر تمکین کی الجھن

افراد تمثیل

(1) تمکین (ایک سرجن) (2) شیبانی (لیڈی ڈاکٹر) (3) ارچنا (نرس) (4) اویس (مریض) (5) دو وارڈ بوائے

منظر

اسپتال میں ڈاکٹروں کا رٹائرنگ روم۔ دو تین کرسیاں ایک دو میزیں۔ اس وقت لیڈی ڈاکٹر شیبانی ایک آرام کرسی پر آنکھیں بند کیے لیٹی ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ وہ بہت تھکی ہوئی ہے۔ سسٹر ارچنا ایک میز کے پاس کھڑی ہوئی چائے بنا رہی ہے۔ کمرے میں خاموشی ہے صرف اسٹوو کی آواز آرہی ہے۔ کچھ دیر بعد ارچنا اسٹوو بند کرکے اس پر سے کیتلی اتارتی ہے۔ گرم پانی دوسری کیتلی میں ڈالتی ہے۔ پھر شیبانی کی طرف دیکھ کر۔

ارچنا : ڈاکٹر۔ (آنکھیں کھول کر ارچنا کو دیکھتی ہے) ڈاکٹر تمکین کو آج کل کیا ہوگیا ہے۔ (شیبانی خاموش رہتی ہے) کچھ دنوں سے بہت ڈسٹرب نظر آتے ہیں۔

شیبانی : مجھے کیس پر جانا ہے سسٹر چائے ذرا جلدی دے دو۔

ارچنا : (تھوڑا سا مسکرا کر) کل انھوں نے آپریشن کیسیز بھی نہیں کیے اپنے کیس ڈاکٹر ماتھر کو دے دیے۔

شیبانی : طبیعت ٹھیک نہیں رہی ہوگی۔

ارچنا : نہیں ڈاکٹر ایسی بات نہیں ہے۔ وہ کچھ ڈسٹرب ہیں۔ آج صبح جب میں نے انھیں پھول دیا تو وہ اس قدر کھوئے کھوئے تھے کہ حسبِ عادت تھینک یو بھی نہیں کہا۔

شیبانی : دیکھو دودھ زیادہ نہ کر دینا۔

ارچنا : (مسکرا کر) دودھ ٹھیک ہے ڈاکٹر (پیالی میں شکر گھولتے ہوئے) دو چار دن سے تو وہ اور بھی کھوئے کھوئے سے ہیں۔

(شیبانی کو چائے کی پیالی دیتی ہے)

شیبانی : تھینک یو سسٹر۔

ارچنا : آج بھی شاید وہ آپریشن تھیٹر نہیں جا رہے ہیں۔ اس طرح تو وہ اپنا کریڈٹ لوز کر دیں گے (شیبانی خاموشی سے چائے پیتی رہتی ہے۔ ارچنا کچھ دیر خاموش رہ کر) آج کا کیس تو بہت اہم ہے (شیبانی پیالی ہونٹوں سے لگا کر سوالیہ نظروں سے ارچنا کو دیکھتی ہے)

شیبانی : بیڈ نمبر17؟

ارچنا : جی ہاں مسٹر اویس کا۔

شیبانی : ہاں وہ کیس سیریس ہے۔ خدا کرے۔ آپریشن کامیاب ہو جائے۔

ارچنا : پلیز ڈاکٹر آپ ان سے کہیے کہ وہ یہ آپریشن کر دیں۔ وہ آپ کی بات نہیں ٹالیں گے۔

شیبانی : میں ان سے ڈسکس کروں گی۔ ویسے وہ خود ہی اس کیس میں دلچسپی لے رہے ہیں۔

ارچنا : (کچھ دیر خاموش رہ کر) سعدیہ میں ان کی اس قدر دلچسپی لوگوں کی دلچسپی کا

38.

موضوع بن گئی ہے (شیبانی خاموش رہتی ہے) کیا وہ اسے پہلے سے جانتے ہیں۔

شیبانی : جانتے ہوں گے جب ہی تو دلچسپی لے رہے ہیں۔

ارچنا : مگر ڈاکٹر؟

شیبانی : (اس انداز سے بات کاٹ کر جسے موضوع بدلنا چاہتی ہو) سسٹر تم جا کر دیکھو اس کی کیا حالت ہے۔ اگر ضرورت ہو تو مجھے بلا لینا۔ شاید آپریشن کرنا پڑے گا کیس الجھ گیا۔

(ارچنا چند سیکنڈ خاموش کھڑی رہتی ہے۔ شیبانی پھر آنکھیں بند کر کے سوچنے لگتی ہے ارچنا کمرے سے چلی جاتی ہے شیبانی کچھ دیر یونہی کرسی پر پڑی سوچتی رہتی ہے۔ پھر اٹھ کر کھڑکی کے پاس چلی جاتی ہے اور باہر دیکھنے لگتی ہے کہ ڈاکٹر تمکین کمرے میں آتا ہے۔ وہ بہت تھکا ہوا نظر آرہا ہے۔ خاموشی سے آکر ایک آرام کرسی پر بیٹھ جاتا ہے۔ شیبانی مڑ کر کچھ دیر اسے خاموشی سے دیکھتی رہتی ہے پھر میز کے پاس جا کر پیالی میں چائے بناتی ہے اور ڈاکٹر تمکین کو دیتی ہے۔ تمکین پیالی لے کر)۔

تمکین : تھینک یو ڈاکٹر۔

(تمکین خاموشی سے چائے پینے لگتا ہے کچھ دیر بعد۔

(شیبانی آہستہ سے)

شیبانی : آپ بہت تھکے ہوئے نظر آرہے ہیں ڈاکٹر۔

تمکین : مجھے اپنے اعصاب پر قابو نہیں رہا ہے۔ ڈاکٹر شیبانی میں شاید پاگل ہو جاؤں گا۔

شیبانی : ہمت سے کام لیجیے (موضوع بدلنے کے انداز میں) مسٹر اولیس کا کیا حال ہے؟

تمکین : کچھ کہا نہیں جا سکتا کیس سیریس اور کامپلی کیٹڈ ہے۔

شیبانی : آج آپریشن کر رہے ہیں؟

تمکین : آج آپریشن ہو جانا چاہیے مگر جان بوجھ کر اسے موت کے منہ میں نہیں دے سکتا۔

شیبانی : مسٹر ارچنا کہہ رہی تھی کہ—

تمکین : آج میرا آپریشن ڈے نہیں ہے اور کوئی دوسرا ڈاکٹر اسے اٹینڈ نہیں کرسکتا۔

شیبانی : ڈاکٹر (تمکین سوالیہ نظروں سے اسے دیکھتا ہے شیبانی کچھ دیر رک کر) یہ تو اسپیشل کیس ہے۔

تمکین : ہاں مجھے آج یہ آپریشن کرنا ہی چاہیے۔ مگر—

شیبانی : پلیز ڈاکٹر۔ جانے کیوں اس سے ہمدردی پیدا ہوگئی ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اس کے اندر فرشتوں جیسی معصوم روح ہے (تمکین خاموش رہتا ہے۔ شیبانی تمکین کا چہرہ دیکھتے ہوئے) سسٹر ارچنا بھی اس کے لیے کچھ جذباتی نظر آتی ہے۔

تمکین : سسٹر ارچنا اس کے لیے جذباتی۔ (کچھ دیر سوچتے ہوئے سعدیہ کی کیا حالت ہے؟

شیبانی : (کچھ دیر سوچتی رہتی ہے پھر آہستہ سے) کیس بگڑ چکا ہے ڈاکٹر بچہ یا زچہ... دونوں میں سے ایک...

تمکین : (کچھ دیر خاموش بیٹھا سوچتا رہتا ہے۔ پھر اٹھ کر کھڑکی کے پاس جاتے ہوئے) بچہ یا زچہ دونوں میں سے ایک (کھڑکی سے باہر دیکھنے لگتا ہے پھر مڑکر شیبانی سے) نہیں ڈاکٹر نہیں، دونوں میں سے ایک نہیں دونوں کو بچانا ہوگا۔

شیبانی : آپریشن کرنا پڑے گا۔

تمکین : آپریشن!

شیبانی : ہاں ڈاکٹر (کچھ دیر خاموش رہ کر) مگر ڈاکٹر میں اسے اپنی زندگی کا سب سے اہم کیس سمجھ کر کروں گی۔ بی شیور۔

تمکین : آئی ایم شیور ڈاکٹر، تھینک یو (سگریٹ کیس سے سگریٹ نکال کر ہونٹوں میں دباتا ہے پھر جیبوں میں ماچس تلاش کرتا ہے۔ شیبانی کچھ دیر اسے خاموشی سے دیکھتی رہتی ہے پھر میز پر سے ماچس اٹھا کر اسے دیتی ہے) تھینک یو۔

شیبانی : (کچھ دیر خاموش رہ کر) ایکسکیوزمی ڈاکٹر۔ تم سعدیہ کے لیے اس قدر پریشانی

کا اظہار کر رہے ہو۔ لوگوں کے لیے یہ دلچسپی کا موضوع بن گیا ہے۔

تمکین : (کچھ دیر کھوئی نظروں سے شیبانی کو دیکھتا رہتا ہے۔ پھر آہستہ سے) بس تم مجھے غلط نہ سمجھو شیبانی انسان بعض وقت بدترین کمزوریوں کا شکار ہو جاتا ہے۔

شیبانی : میں نے تمھاری کمزوریوں کو انسانی کمزوریاں ہی سمجھا ہے تمکین! تمھاری صاف گوئی نے ہمیشہ مجھے حوصلہ دیا ہے۔

(سسٹر ارچنا کمرے میں آتی ہے اسے دیکھ کر شیبانی خاموش ہو جاتی ہے اور اسے سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگتی ہے۔ ارچنا کچھ دیر خاموش رہ کر)

ارچنا : آپریشن کرنا ہی پڑے گا ڈاکٹر صورت حال بڑی نازک ہو گئی ہے۔

شیبانی : اچھا سسٹر میں چلتی ہوں۔

(تمکین خاموشی سے شیبانی کو دیکھتا ہے۔ شیبانی کچھ دیر خاموش کھڑی رہتی ہے پھر دروازے کی طرف بڑھتی ہے۔

تمکین : ے گاڈ ہیلپ یو ڈاکٹر۔

شیبانی : تھینک یو ڈاکٹر! مجھ پر بھروسہ رکھنا۔

(چند سیکنڈ پھر رکتی ہے۔ تمکین خاموش رہتا ہے۔ شیبانی آہستہ آہستہ کمرے سے چلی جاتی ہے۔ تمکین پھر کھڑکی کے باہر دیکھنے لگتا ہے۔ تھوڑی دیر بعد ارچنا آہستہ سے)

ارچنا : آپ کے لیے کافی بناؤں ڈاکٹر۔

تمکین : (اسی طرح کھڑکی سے باہر دیکھتے ہوئے) شکریہ سسٹر میں نے چائے پی لی۔

ارچنا : (حیرت سے) چائے! آپ تو چائے نہیں پیتے۔

تمکین : (مڑ کر ارچنا کو دیکھ کر) آج جو کچھ ملا وہی پی لیا۔

ارچنا : (کچھ دیر خاموش رہ کر) ڈاکٹر کیا بات ہے۔ آپ کچھ پریشان نظر آ رہے ہیں۔

تمکین : نہیں سسٹر ایسی کوئی بات نہیں ہے۔

ارچنا : آپ کی پریشانی سے ڈاکٹر شیبانی غمگین اور اداس ہیں (تمکین کچھ دیر خاموش

رہتا ہے پھر اس انداز سے جیسے ٹال رہا ہو)

تمکین : ابھی ڈاکٹر شیبانی کہہ رہی تھیں کہ تم اویس کے لیے جذباتی ہوگئی ہو۔

ارچنا : ایسی کوئی بات نہیں ہے ڈاکٹر (کچھ دیر خاموش رہ کر) سعدیہ کے لیے آپ کے اس قدر فکر مند ہونے نے ان کو بہت دکھی کردیا ہے۔ (تمکین خاموش رہتا ہے) پلیز ڈاکٹر آپ انھیں دکھ نہ دیجیے (تمکین نظریں اٹھا کر ارچنا کو دیکھتا ہے) وہ کس قدر نیک اور خاموش ہیں (چند سیکنڈ رک کر) کیا آپ سچ سچ سعدیہ کے لیے۔

تمکین : (بات کاٹ کر تلخ لہجے میں) سسٹر یہ میرا پرسنل معاملہ ہے۔

ارچنا : (حیرت سے تمکین کو دیکھ کر) آئی ایم ساری ڈاکٹر۔ سو ساری (کچھ دیر خاموش کھڑی رہتی ہے۔ پھر آہستہ آہستہ دروازے کی طرف جاتی ہے۔ تمکین چند سیکنڈ اسے جاتا ہوا دیکھتا رہتا ہے پھر آہستہ سے)

تمکین : سسٹر! (ارچنا مڑ کر دیکھتی ہے تمکین کچھ دیر خاموش رہ کر) مجھے معاف کردو سسٹر میں جانے کیوں غیر مہذب ہوگیا تھا۔ میں نے ہمیشہ تمھارے خلوص اور ہمدردی کی قدر کی ہے۔ آئی ایم ساری سسٹر ویری ساری۔

ارچنا : میں آپ دونوں کو دکھی نہیں دیکھ سکتی ڈاکٹر (آنکھوں میں آنسو بھر کر) آپ دونوں۔ آپ دونوں۔

(خاموش ہوجاتی ہے اور منہ دوسری طرف کرکے رومال سے آنسو پونچھتی ہے۔ تمکین کچھ دیر خاموشی سے ارچنا کو دیکھتا رہتا ہے پھر اس کے قریب آکر)

تمکین : میں بہت برا ہوں سسٹر بہت کمینہ۔ تم مجھے برا بھلا کہو۔ گالیاں دو۔ میرے کپڑے نوچ ڈالو۔ میرے گالوں پر طمانچے مارو۔ میں اسی قابل ہوں۔

ارچنا : ڈاکٹر۔

تمکین : (اپنی ہی دھن میں) میں انسان نہیں حیوان ہوں سسٹر۔ جنگلی ہوں۔ وحشی ہوں۔

ارچنا : آپ بیٹھ جایئے ڈاکٹر۔ بہت تھک گئے ہیں (تمکین کا ہاتھ پکڑ کر کرسی پر بٹھا

دیتی ہے اور گلاس میں پانی بھر کر دیتے ہوئے) تھوڑا سا پانی پی لیجیے۔

تمکین : (پانی کا گھونٹ پی کر) میں نے تمھارا بھی دل دکھا دیا (ٹھنڈی سانس بھر کر) کیا انسان ہوں میں بھی، سب کا دل دکھا دیتا ہوں۔

ارچنا : میں آپ کے لیے کافی بناتی ہوں۔

تمکین : شکریہ! سسٹر ابھی نہیں (آنکھیں بند کر کے سوچنے لگتا ہے پھر کچھ دیر بعد) کیا تم واقعی اویس کے لیے جذباتی ہو سسٹر۔

ارچنا : (غور سے تمکین کو دیکھ کر) جذباتی نہیں ڈاکٹر مجھے اس سے صرف ہمدردی ہے۔

تمکین : مگر ڈاکٹر شیبانی۔

ارچنا : انھوں نے غلط سمجھ لیا ہے۔ اصل میں وہ کچھ اس قدر معصوم ہے کہ میں اسے صرف زندہ دیکھنا چاہتی ہوں۔

تمکین : اور میں بھی (کچھ دیر خاموش رہ کر) مجھے آج کل اپنے اعصاب پر قابو نہیں ہے سسٹر۔ ڈرتا ہوں کہ آپریشن بگڑ نہ جائے اور میں خود کو زندگی بھر گنہگار سمجھتا رہوں۔

ارچنا : (حیرت سے) گنہگار!

تمکین : ہاں۔ سسٹر (آنکھیں بند کر کے) وہ جوان ہے۔ اس کے دل میں بھی کچھ آرزوئیں ہوں گی۔ وہ بھی کسی کے دل میں ہوگا۔
(خاموش ہو جاتا ہے۔ ارچنا کچھ دیر خاموشی سے اسے دیکھتی رہتی ہے پھر آہستہ سے)

ارچنا : ڈاکٹر (تمکین آنکھیں کھول کر دیکھتا ہے۔ ارچنا کچھ دیر رک کر) آپ سے ایک بات پوچھوں (تمکین خاموش رہتا ہے اور سوالیہ نظروں سے ارچنا کو دیکھتا رہتا ہے۔ سعدیہ سے اس کا کیا رشتہ ہے۔

تمکین : سعدیہ سے۔

ارچنا : جی ہاں کل وہ مجھ سے کہہ رہی تھی کہ اگر میں مرجاؤں تو اسے خبر نہ کرنا۔ وہ اس صدمے کو برداشت نہ کر سکے گا۔ تمکین کچھ دیر خاموش رہ کر آہستہ سے)

تمکین : ابھی تک ڈاکٹر شیبانی نہیں آئیں۔

ارچنا : (گھڑی دیکھ کر) ابھی مشکل سے پندرہ منٹ ہوئے ہیں (دروازے کی طرف جاتے ہوئے) میں جا کر دیکھتی ہوں۔

(ارچنا کمرے سے چلی جاتی ہے۔ تمکین آنکھیں بند کیے کچھ دیر آرام کرسی پر لیٹا رہتا ہے۔ پھر سگریٹ نکال کر ہونٹوں میں دباتا ہے اور جیبوں میں ماچس تلاش کرتا ہے۔ آنکھیں کھول کر سامنے میز پر رکھی ہوئی ماچس اٹھا کر سگریٹ جلاتا ہے اور کھڑکی کے پاس جا کر کھڑا ہو جاتا ہے اور باہر دیکھنے لگتا ہے کہ ارچنا تیز تیز قدموں سے گھبرائی ہوئی کمرے میں داخل ہو کر)۔

ارچنا : ڈاکٹر (تمکین مڑ کر دیکھتا ہے) غضب ہو گیا۔

تمکین : (گھبرا کر) غضب ہو گیا۔

ارچنا : جی ہاں۔ مسٹر اویس۔

تمکین : (تیز تیز قدموں سے ارچنا کے پاس جا کر) مسٹر اویس— اویس کو کیا ہوا کیا وہ— کیا وہ—

ارچنا : وہ اپنے بیڈ سے غائب ہیں۔ سب لوگ بے حد پریشان ہیں۔

تمکین : مگر وہ تو چل پھر بھی نہیں سکتا تھا۔

ارچنا : جی ہاں مگر وہ اپنے بیڈ پر نہیں ہیں۔

تمکین : اسے تلاش کرو مسٹر خدا کے لیے جلدی۔ کہیں وہ اپنی تکلیف سے اُکتا کر۔

ارچنا : خودکشی نہ کر لے؟

تمکین : وہ خودکشی بھی کر سکتا ہے۔ پلیز سسٹر جلدی کرو۔ (ارچنا کمرے سے چلی جاتی ہے۔ تمکین بے چینی سے کمرے میں ٹہلنے لگتا ہے۔ کچھ دیر بعد باہر سے چلانے کی آوازیں)

پہلی آواز : مجھے چھوڑ دو میں ڈاکٹر تمکین کے پاس جاؤں گا (ڈاکٹر تمکین تیز تیز قدموں سے دروازہ کے پاس جاتا ہے۔ دروازہ کھول کر باہر دیکھتے ہوئے)

تمکین : کون ہے؟

دوسری آواز: بیڈ نمبر 17

پہلی آواز : مجھے چھوڑ دو۔ ڈاکٹر خدا کے لیے۔

تمکین : انھیں چھوڑ دو۔ اندر آجانے دو۔

(کچھ دیر بعد اویس کمرے میں آتا ہے وہ بہ مشکل چل سکتا ہے۔ آہستہ آہستہ بڑھ کر تمکین کے سامنے کھڑا ہو جاتا ہے۔ تمکین اسے خاموشی سے دیکھتا رہتا ہے۔ اویس چند سیکنڈ بعد۔)

اویس : میں بیٹھ جاؤں، ڈاکٹر صاحب بہت تھک گیا ہوں (تمکین نظروں سے اسے بیٹھنے کا اشارہ کرتا ہے۔ اویس کرسی پر بیٹھ کر آنکھیں بند کر لیتا ہے تمکین کچھ دیر اسے خاموشی سے دیکھتا رہتا ہے۔ پھر آہستہ سے)

تمکین : کہاں گئے تھے؟

اویس : (آنکھیں کھول کر تمکین کو دیکھ کر) سعدیہ کے پاس۔

تمکین : (حیرت سے) سعدیہ کے پاس!

اویس : جی ہاں۔ مگر مجھے اس کے پاس جانے نہیں دیا گیا۔

تمکین : تمھیں معلوم ہے کہ وہ۔

اویس : مجھے سب کچھ معلوم ہے ڈاکٹر صاحب۔ اسی لیے تو اس کے پاس گیا تھا۔ مجھے دیکھ کر اس میں حوصلہ پیدا ہو جاتا۔

تمکین : تمھیں معلوم ہے کہ خود تمھارا مرض کس قدر سیریس ہے۔

اویس : (نقاہت سے آنکھیں بند کرکے) مجھے سب معلوم ہے ڈاکٹر صاحب مجھے معلوم ہے کہ اب میں زندہ نہیں رہوں گا۔

تمکین : تم ضرور زندہ رہو گے۔

اویس : شکریہ ڈاکٹر صاحب! تھینک یو ویری مچ۔ مگر وہ مجھے سعدیہ کے پاس کیوں نہیں جانے دیتے۔

تمکین : اس لیے کہ اس کے بچہ۔

اویس : بچہ پیدا ہو رہا ہے یہ تو مجھے بھی معلوم ہے ڈاکٹر صاحب اور بچہ پیدا ہونا کوئی جرم تو نہیں ہے۔ میں تو صرف اس کے بچے کو دیکھنا چاہتا تھا (کمزوری سے نڈھال ہو کر کرسی سے ٹیک لگا کر نیم دراز ہو جاتا ہے۔ کچھ دیر خاموش رہ کر) پلیز ڈاکٹر مجھے اس کے پاس جانے دیجیے۔

تمکین : یہ اسپتال کے اصولوں کے خلاف ہے۔

اویس : (آنکھیں کھول کر) کیوں خلاف ہے (ٹھنڈی سانس بھر کر) اگر میں اس کے پاس ہوتا تو اسے اپنے تخلیقی عمل میں کس قدر آسانی ہو جاتی۔ وہ مجھ سے۔

تمکین : محبت کرتی ہے (اویس خاموش رہتا ہے۔ تمکین کچھ دیر بعد) تو یہ بچہ تمھارا ہے۔

اویس : نہیں ڈاکٹر صاحب بخدا نہیں (آنکھیں بند کر کے) میں تو ایک سال سے اس اسپتال میں قید ہوں۔ مگر کسی کا بھی ہو اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔

تمکین : (حیرت سے) یہ جانتے ہوئے بھی تم۔

اویس : (آنکھیں کھول کر تمکین کو دیکھ کر) ڈاکٹر صاحب! ہم ہیجانی لمحات میں قتل کر سکتے ہیں خودکشی کر سکتے ہیں تو پھر تخلیق کیوں نہیں کر سکتے۔ بچے کو جنم دینا بھی تو تخلیق ہی ہے۔ اس سے عورت بدلی تو نہیں جاتی۔ ماں بن جاتی ہے ماں۔

تمکین : (سوچتے ہوئے) تم عجیب انسان ہو۔

(اویس خاموش رہتا ہے۔ تمکین پھر کھڑکی کے پاس جا کر کھڑا ہو جاتا ہے اور باہر دیکھنے لگتا ہے۔ کچھ دیر اویس آنکھیں بند کیے کچھ سوچتا رہتا ہے۔ پھر آہستہ آہستہ آنکھیں کھول کر تمکین کو دیکھتے ہوئے ٹھنڈی سانس بھر کر۔

اویس : ڈاکٹر صاحب! (تمکین مڑ کر دیکھتا ہے) کاش میں ایک بار اس شخص سے مل سکتا۔ (تمکین برابر سوالیہ نظروں سے دیکھتا رہتا ہے) جس کے بچے کو سعدیہ جنم دے رہی ہے۔

تمکین : (ایک دم مشتعل ہو کر) تا کہ تم اسے ذلیل، بدمعاش، اوباش اور لفنگے کے

خطابات سے نوازتے۔

اویس : (کسی قدر سہم کر) نہیں ڈاکٹر صاحب، میں ایسا کچھ نہیں کہتا۔ میں تو اس سے یہ بھی نہیں کہتا کہ اس نے غلطی کی ہے۔

تمکین : تم جھوٹ کہہ رہے ہو تمھاری بیماری نے تمھیں جسمانی طور پر ہی نہیں دماغی طور پر بھی کمزور کر دیا ہے۔ ورنہ آج تم انتقام کی آگ میں جل رہے ہوتے۔ اس قدر بزدلی کی باتیں نہ کرتے۔

اویس : بزدلی! جی ہاں ڈاکٹر صاحب، بزدل ہی انتقام کی آگ میں جلتے ہیں۔ بہادر شکست کو قبول کر لیتے ہیں۔

تمکین : تمھارا سکون مجھے پاگل کر دے گا اویس بڑھ کر دیوار میں لگی ہوئی گھنٹی بجاتا ہے پھر مڑ کر اویس کو دیکھ کر) بچہ پیدا ہو جانے دو۔ پھر میں اس کے باپ کو تمھارے سامنے کھڑا کر دوں گا۔ (وارڈ بوائے کمرے میں آتا ہے۔ تمکین اسے دیکھ کر) اسٹریچر لاکر مسٹر اویس کو ان کے بیڈ پر پہنچا دو۔

اویس : مجھ میں سکت ہے ڈاکٹر صاحب حوصلہ ہے میں خود چلا جاؤں گا۔

تمکین : (اویس کا کاندھا تھپتھپا کر) نہیں، بے موقع ہمت نقصان دہ ہوتی ہے میرے دوست (وارڈ بوئے کی طرف دیکھ کر) جاؤ اسٹریچر لے آؤ (وارڈ بوائے چلا جاتا ہے۔ تمکین کچھ دیر خاموش رہ کر) یقین رکھو اویس میں اپنا علم اور تجربہ تمھارے لیے صرف کروں گا۔

اویس : شکریہ ڈاکٹر صاحب آپ کس قدر نیک اور شریف ہیں۔

تمکین : (طنزیہ مسکراہٹ کے ساتھ) جیسی نگاہیں ویسے نظارے (ٹھنڈی سانس بھر کر) نیک اور شریف (وارڈ بوائے اسٹریچر لے کر آتے ہیں۔ تمکین پھر اویس کا کاندھا تھپتھپا کر) میں جیسا بھی ہوں مگر تمھارا دوست ہوں میرے دوست۔

اویس : شکریہ ڈاکٹر صاحب (اٹھنے کی کوشش کرتا ہے مگر کمزوری کے باعث اٹھ نہیں سکتا۔ تمکین اور وارڈ بوائے سہارا دے کر اٹھاتے ہیں اور اسٹریچر پر لٹا دیتے

ہیں۔ اویس ہاتھ اٹھا کر سلام کرتے ہوئے) خدا حافظ ڈاکٹر صاحب۔

تمکین : تم زندہ رہو گے میرے دوست۔ ضرور زندہ رہو گے۔ (چند سیکنڈ رک کر) سعدیہ کو ضرور معاف کر دینا۔ (وارڈ بوائے اسٹریچر اٹھا کر چلنے لگتے ہیں۔ تمکین ایک وارڈ بوائے سے) ارچنا کو یہاں بھیج دینا۔ (تمکین اسٹریچر کو سہارا دیے ہوئے دروازہ تک جاتا ہے اور دروازہ کھولتا ہے۔ وارڈ بوائے کمرے سے نکل جاتے ہیں۔ تمکین کچھ دیر کھڑا ہوا باہر دیکھتا رہتا ہے پھر آرام کرسی پر بیٹھ جاتا ہے۔ اور سگریٹ جلا کر آنکھیں بند کر لیتا ہے۔ کچھ دیر بعد سسٹر ارچنا کمرے میں آکر)

ارچنا : ڈاکٹر آپ نے بلایا تھا۔

(آنکھیں کھول کر کچھ دیر کھوئی کھوئی سی نظروں سے ارچنا کو دیکھتا رہتا ہے۔ پھر آہستہ سے)

تمکین : ہاں سسٹر میں تمھارا ایک فیور چاہتا ہوں۔

ارچنا : (حیرت سے) فیور۔ میرا۔

تمکین : ہاں سسٹر۔ تم صرف دو دن اویس کی اسپیشل کیئر کرلو۔ پھر شاید میں اسے بچانے میں کامیاب ہو جاؤں پلیز سسٹر فار مائی سیک۔

ارچنا : فیور نہیں ڈاکٹر، میں اسے اپنا مذہبی فرض سمجھ کر کروں گی۔

تمکین : تھینک یو سسٹر (سوچتے ہوئے) اگر میں اسے بچانے میں کامیاب ہو گیا تو سمجھوں گا کہ میں نے اپنے سارے پاپ دھو ڈالے۔

ارچنا : (حیرت سے) ڈاکٹر آپ اور پاپ!

تمکین : (ٹھنڈی سانس بھر کر) زندگی میں کوئی لمحہ ایسا بھی آتا ہے سسٹر کہ انسان انجانے طور پر بھی گناہ کر بیٹھتا ہے۔

(ارچنا سوالیہ نظروں سے اسے دیکھتی رہتی ہے مگر تمکین خاموش رہتا ہے تھوڑی دیر بعد لیڈی ڈاکٹر شیبانی آہستہ آہستہ کمرے میں آتی ہے۔ تمکین

خاموشی سے اسے دیکھنے لگتا ہے۔ شیبانی کے چہرے سے مایوسی ظاہر ہورہی ہے اور چال میں تھکاوٹ کے آثار ہیں۔ تمکین برابر سوالیہ نظروں سے اسے دیکھتا رہتا ہے۔ شیبانی کچھ دیر خاموش رہتی ہے پھر ٹھنڈی سانس بھر کر)

شیبانی : ساری ڈاکٹر سو ساری (کچھ دیر خاموش رہ کر آہستہ سے) میں بچے کو نہیں بچا سکی۔ وہ پیٹ میں ہی مر چکا تھا...

(شیبانی کی آنکھوں میں آنسو آجاتے ہیں تمکین اس کی آنکھوں میں آنسو دیکھ کر)

تمکین : ارے ڈاکٹر تم۔ (شیبانی رومال سے آنسو پونچھتی ہے) ایک ڈاکٹر موت سے لڑ سکتا ہے مگر کسی کو زندگی نہیں دے سکتا۔ (پھر کچھ دیر خاموش رہ کر) سعدیہ بیڈ پر پہنچا دی گئی؟ (شیبانی اثبات میں سر ہلاتی ہے تمکین کچھ دیر خاموش کھڑا سوچتا رہتا ہے پھر آہستہ آہستہ دروازے کی طرف جاتا ہے دروازے کے پاس پہنچ کر رکتا ہے اور مڑ کر شیبانی کی طرف دیکھ کر) لڑکا تھا یا لڑکی۔

شیبانی : (چند سیکنڈ رک کر) لڑکا۔

(تمکین کچھ دیر کھڑا رہتا ہے۔ پھر آہستہ آہستہ کمرے سے چلا جاتا ہے۔ کچھ دیر بعد ارچنا ڈاکٹر شیبانی کو دیکھ کر آہستہ سے)

ارچنا : تو کیا یہ بچہ ڈاکٹر تمکین؟

شیبانی : (بات کاٹ کر) سسٹر! مجھے ایک پیالی چائے اور پلا دو۔ بہت تھک گئی ہوں (ارچنا، شیبانی کو دیکھتی ہے جو آنکھیں بند کر کے کرسی سے ٹیک لگا چکی ہے ارچنا آہستہ آہستہ اس میز کی طرف بڑھتی ہے جس پر اسٹوو رکھا ہے۔)

(پردہ)

دہکتے انگارے گرتی برف

افرادِ تمثیل

(1) کوثر (لیڈی ڈاکٹر) (2) نجم (ڈاکٹر کوثر کا دوست) (3) انتخاب (ڈاکٹر کوثر کا پرانا دوست) (4) پمیلا (نرس) (5) گلشن (نوکرانی)

منظر

لیڈی ڈاکٹر کا بیڈ روم کوثر لحاف اوڑھے بستر پر لیٹی ہے۔ یہ معلوم ہوا ہے کہ وہ ابھی ابھی جاگی ہے اور ابھی تک اس نے بستر نہیں چھوڑا ہے۔ سخت سردی کا موسم ہے۔ مسہری کے پاس ایک انگیٹھی رکھی ہے جس کے انگارے راکھ ہو چکے ہیں۔ کوثر لیٹے ہی لیٹے ہاتھ نیچا کر کے انگیٹھی ہلاتی ہے مگر اس میں سوائے راکھ کے اور کچھ نہیں ہے۔ ذرا اوپر سرک کر مسہری کے تکیہ سے ٹک جاتی ہے اور پاس کی ٹیبل پر سے ٹائم پیس اٹھا کر وقت دیکھتی ہے کہ دروازہ کھٹ کھٹایا جاتا ہے۔ کوثر ٹائم پیس میز پر رکھتی ہے اور بے حد کاہلی سے انگڑائی لیتے ہوئے۔

کوثر : کون ہے۔

آواز : ڈاکٹر۔ میں ہوں پمیلا۔

کوثر : کیا بات ہے سسٹر۔

آواز : ایک بہت سیریس کیس ہے ڈاکٹر۔

کوثر : اتنی صبح سے (کچھ دیر خاموش رہ کر پھر کاہلی سے) اچھا چلو میں آرہی ہوں۔

آواز : بہت اچھا ڈاکٹر۔

کوثر : کیا اور کوئی ڈاکٹر ڈیوٹی پر نہیں ہے۔

آواز : ڈاکٹر سشما ڈیوٹی پر تھیں۔ ابھی ابھی گئی ہیں۔ کہہ گئی تھیں کہ اگر ایمرجنسی ہو تو آپ سے ریکویسٹ کرلی جائے۔

کوثر : اچھا چلو میں آتی ہوں۔ (کاہلی سے پھر انگڑائی لے کر ذرا اونچی آواز سے) گلشن بی بی۔ گلشن بی بی۔ (کچھ دیر بعد گلشن دوسرے دروازے سے کمرے میں آتی ہے۔ کوثر اسے (دیکھ کر) جلدی سے ایک پیالی چائے دے دو (گلشن جانے کے لیے مڑتی ہے) انجم سوکر اٹھے یا نہیں۔

گلشن : وہ تو کب کے سوکر اٹھ گئے نہا رہے ہیں۔

کوثر : نہا رہے ہیں! اس قدر سردی میں! (گلشن خاموش رہتی ہے) گرم پانی دے دیا تھا؟

گلشن : گرم پانی تیار تھا مگر وہ کہنے لگے میں ٹھنڈے پانی سے نہانے کا عادی ہوں۔

کوثر : لعنت ہے۔ اچھا خیر جلدی سے چائے لادو۔

(گلشن کمرے سے چلی جاتی ہے۔ کوثر اسی طرح بستر پر پڑی رہتی ہے کہ انجم اسی دروازے سے آتا ہے اور کوثر کو بستر پر دیکھ کر)

انجم : ابھی تک صبح نہیں ہوئی۔

کوثر : (مسکرا کر) ہوجائے گی ایسی جلدی بھی کیا ہے۔ کہو رات نیند تو ٹھیک سے آئی؟

انجم : لاحول ولا قوۃ۔ سردی تو نام پوچھے لے رہی تھی۔

کوثر : اور پھر ٹھنڈے پانی سے نہایا جا رہا تھا۔

نجم : (ہنس کر) مجھے پانی سے ڈر نہیں لگتا۔ عادت سی پڑ گئی ہے۔

کوثر : (لحاف میں پیر ایک طرف کرتے ہوئے) ادھر آجاؤ۔ (نجم حیرت سے کوثر کو دیکھتا ہے۔ کوثر مسکرا کر) مجھے معلوم ہے تم شریف آدمی ہو (پھر دروازہ کھٹ کھٹایا جاتا ہے) کون ہے؟

آواز : پھیلا۔

کوثر : میں آرہی ہوں سسٹر ایسی جلدی بھی کیا ہے۔

آواز : جلدی ہی ہے ڈاکٹر۔ ڈلیوری کے بعد برابر بلیڈنگ ہو رہا ہے۔

کوثر : ڈلیوری ہاسپٹل میں ہوئی ہے؟

آواز : جی نہیں۔ گھر پر۔

کوثر : اچھا چلو۔ میں آرہی ہوں۔

نجم : (مسکرا کر) کاہلی چھوڑو اور چلی جاؤ۔ ایک زندگی خطرہ میں ہے۔

کوثر : چلی جاؤں گی۔ ایسی جلدی بھی کیا ہے۔ (اٹھ کر مسہری پر پاؤں لٹکا کر بیٹھ جاتی ہے اور سرہانے سے گاؤن اٹھاتے ہوئے) یہ جاہل لوگ پہلے تو گھر پر ڈلیوری کراتے ہیں اور جب کیس بگڑ جاتا ہے تو روتے ہوئے یہاں چلے آتے ہیں (گلشن چائے کی ٹرے لے کر کمرے میں آتی ہے اور میز پر رکھ دیتی ہے) گلشن بی بی۔ یہ میز مسہری کے پاس رکھ دو۔ (گلشن انگیٹھی اٹھا کر جس دروازے سے آئی تھی اسی سے واپس چلی جاتی ہے) یہاں سردی کا موسم خوشگوار ہوتا ہے۔

نجم : ہوتا ہوگا۔ (ایک کرسی اٹھا کر پاس بیٹھتے ہوئے مسکرا کر) میرا تو نام پوچھے لے رہا ہے۔ (چائے کی ٹرے کی طرف دیکھ کر) اب چائے بھی مجھے ہی بنانا پڑے گی۔

کوثر : میں بناؤں گی۔ ایسی جلدی بھی کیا ہے۔

نجم : (مسکرا کر) اس وقت تک چائے برف ہو چکی ہوگی۔ (پیالیوں میں چائے

ڈالتے ہوئے) بھئی آج واپسی کا ارادہ ہے۔

کوثر : ابھی سے؟ ایسی جلدی بھی کیا ہے چلے جانا۔ تمھیں آئے ہوئے چار ہی دن تو ہوئے ہیں۔

نجم : اور ان چار دنوں ہی میں سردی نے ایمان تازہ کردیا ہے۔ (پیالی کوثر کی طرف بڑھاتے ہوئے) امی کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ اچھا بتاؤ اب تم چھٹی لے کر کب آرہی ہو۔

کوثر : (پیالی لیتے ہوئے) بس آجاؤں گی۔ ایسی جلدی بھی کیا ہے۔

نجم : امی تم سے ملنا چاہتی ہیں۔ (مسکرا کر) اب انھیں جلدی ہی ہے۔

کوثر : انھیں یہیں لے آئے ہوتے۔ علاج بھی ہوجاتا ہے۔

نجم : بس پھر تو سارا بیڑا ہی غرق ہوگیا ہوتا (ہنس کر) وہ ہر کام میں جلدی کی عادی ہیں۔

کوثر : بخدا؟ خطرناک خبر سنا رہے ہو۔ (گلشن انگیٹھی میں دہکتے ہوئے انگارے لے کر آتی ہے) اسے یہاں میرے پاس رکھ دو۔ (گلشن انگیٹھی مسہری کے پاس رکھ دیتی ہے۔ دروازہ پیٹنے کی آواز) کون ہے (دروازہ برابر پیٹا جاتا رہتا ہے) دیکھنا گلشن بی بی کون ہے۔ (گلشن دروازے کے پاس جاکر اس کی چٹخنی کھولتی ہے کہ ایک شخص دروازے کو دھکا دے کر کھولتے ہوئے اندر داخل ہوتا ہے۔ چہرے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ بہت غصہ میں ہے مگر کوثر پر نظر پڑتے ہی غصہ حیرت میں تبدیل ہوجاتا ہے۔ کچھ دیر اسے حیرت سے دیکھتا ہے۔ کوثر چند سیکنڈ اسے دیکھتی رہتی ہے پھر آہستہ سے) کیا وہ مریضہ۔ تمھاری۔

نووارد : (اثبات میں سر ہلاتے ہوئے)، ہاں۔ میری بیوی ہے۔

(کوثر اس قدر تیزی سے مسہری سے اترتی ہے جیسے اسے بجلی کا کرنٹ لگ گیا ہو۔ تیزی سے میز پر سے اسٹیتھسکوپ اور کرسی پر سے کوٹ اٹھاتی ہے اور

39

تقریباً بھاگتی ہوئی کمرے سے چلی جاتی ہے۔ نجم حیرت سے کوثر کو دیکھتا ہے۔ کچھ دیر کمرے میں خاموشی رہتی ہے۔ پھر نجم آہستہ سے)

نجم : آپ کی وائف کی یہ پہلی ڈلیوری ہے؟ (نووارد اثبات میں سر ہلاتا ہے) مجھے نجم الدین کہتے ہیں۔

نووارد : میں انتخاب ہوں۔ انتخاب زماں۔

نجم : (ہاتھ بڑھاتے ہوئے) آپ سے مل کر بڑی خوشی ہوئی۔ (انتخاب ہاتھ ملاتا ہے) ادھر تشریف لائیے۔ انگیٹھی کے پاس۔ سردی زیادہ ہے (بلند آواز سے) گلشن بی بی۔ گلشن بی بی۔ ایک پیالی لانا۔

انتخاب : شکریہ۔ میں اس وقت۔

نجم : (بات کاٹ کر) آپ ڈسٹرب ہیں۔ ایک کپ چائے آپ کے لیے ضروری ہے ڈاکٹر کوثر چلی گئی ہیں۔ اب فکر کی کوئی بات نہیں۔ (گلشن ایک خالی پیالی لاتی ہے اور میز پر رکھ کر واپس چلی جاتی ہے) ادھر تشریف لائیے۔ (وہ مسہری پر بیٹھ جاتا ہے اور کرسی کی طرف اشارہ کرکے) ادھر آجائیے۔ (انتخاب آہستہ آہستہ کرسی کے پاس آتا ہے۔ نجم چائے کی پیالی اس کی طرف بڑھاتے ہوئے) شاید کوثر آپ کو پہلے سے جانتی ہیں۔

انتخاب : جی ہاں۔ اگلے وقتوں کی بات ہے۔ آپ شاید۔

نجم : (مسکرا کر) ابھی تک وہ صرف میری دوست ہے۔

انتخاب : اوہ میں غلط سمجھا۔ (خاموش ہو جاتا ہے اور آہستہ آہستہ سوچتے ہوئے کمرے کی دوسری طرف جاتا ہے۔ نجم برابر اس کو دیکھتا رہتا ہے۔ انتخاب مڑ کر نجم کو دیکھ کر) آپ کی والدہ۔

نجم : (پہلے تو انتخاب کو اس طرح دیکھتا ہے جیسے جملہ پورا کرنے کا انتظار کر رہا ہو۔ پھر آہستہ سے) وہ وطن میں ہیں۔ (چائے کی پیالی ہاتھ میں لیے کھڑا ہوتا ہے اور انتخاب کی طرف بڑھاتے ہوئے) کوثر سے آپ کی ملاقات پرانی ہے۔

انتخاب : جی ہاں ملاقات تھی۔ اور اب۔ (آہستہ آہستہ بڑھ کر خالی پیالی میز پر رکھتا ہے اور مڑ کر) اب یہ ملاقات پرانی داستان بن گئی ہے۔

نجم : پرانی داستان! شاید۔ (میز کی طرف بڑھتے ہوئے) مزاجوں کا اختلاف رہا ہوگا۔

انتخاب : جی نہیں۔ (کھڑکی میں سے باہر دیکھتے ہوئے) شاید آج برف باری ہوگی۔

نجم : جی ہاں۔ (انتخاب کے قریب آتے ہوئے) آثار تو کچھ ایسے ہی ہیں (کچھ دیر خاموش رہ کر) آپ نے بتایا نہیں کہ آپ کی دوستی۔

انتخاب : کوئی خاص بات نہیں۔ میں ہی کچھ زیادہ جذباتی ہوں۔

نجم : جذباتی! یعنی کہ آپ۔

انتخاب : (اس طرح بڑبڑاتے ہوئے جیسے خود سے کہہ رہا ہو) شاید اب بھی ایسا ہو شاید اب بھی۔ (نجم کی طرف دیکھ کر) کیا کوثر اب بھی تکیہ کلام کے طور پر۔ ''ایسی جلدی بھی کیا ہے۔'' کہتی رہتی ہے۔

نجم : (غور سے انتخاب کا چہرہ دیکھ کر) جی ہاں۔ مگر اس سے آپ کے جذباتی ہونے سے کیا واسطہ۔

انتخاب : کاش وہ ایسا نہ کہتی ہوتی۔ (نجم حیرت سے اسے دیکھتا ہے۔ انتخاب کچھ دیر خاموش رہ کر) ڈاکٹر کوثر کب سے یہاں ہیں۔

نجم : ابھی کوئی دو تین مہینے پہلے ان کی یہاں پوسٹنگ ہوئی ہے۔ شاید آپ کا قیام یہاں نہیں ہے۔

انتخاب : میں بھی چند مہینے پہلے ہی یہاں آیا ہوں۔

نجم : آپ کو علم نہیں تھا کہ کوثر اسی اسپتال میں ہیں۔

انتخاب : جی نہیں۔ مجھے یہ ابھی معلوم ہوا۔

(نجم خاموش ہو جاتا ہے۔ انتخاب تھکے تھکے قدموں سے دروازے کی طرف بڑھتا ہے کہ ڈاکٹر کوثر آہستہ آہستہ کمرے میں آتی ہے۔ اس کے بال بکھرے

ہوئے ہیں۔ چہرے سے پریشانی ظاہر ہو رہی ہے۔ انتخاب سوالیہ نظروں سے اسے دیکھنے لگتا ہے۔ کوثر مسہری کے پاس پہنچ کر اسٹیتھسکوپ اور کوٹ مسہری پر پھینک دیتی ہے۔ مڑ کر انتخاب کو دیکھتی ہے چند سیکنڈ اسے دیکھتی رہتی ہے پھر شرمندگی سے۔

کوثر : آئی ایم ساری انتخاب ویری ساری۔ میں زچہ کو نہیں بچا سکی۔ میں۔ میں (کوثر خاموش ہو جاتی ہے اور نظریں جھکا لیتی ہے۔ انتخاب اس طرح خاموش کھڑا اسے دیکھتا رہتا ہے جیسے اسے نہ دیکھ رہا ہو۔ کچھ دیر اسی طرح دیکھتا رہتا ہے پھر آہستہ سے)

انتخاب : تھینک یو ڈاکٹر کوثر۔ آپ کو اس سروی میں تکلیف ہوئی۔
(دروازے کی طرف بڑھتا ہے کوثر اسے جاتا ہوا دیکھ کر)

کوثر : مگر انتخاب وہ بچہ۔ (انتخاب مڑ کر نہیں دیکھتا۔ خاموشی سے کمرے سے چلا جاتا ہے۔ کوثر خاموش کھڑی رہ جاتی ہے۔ پھر آہستہ آہستہ کھڑکی کے پاس جاتی ہے باہر کی طرف دیکھنے لگتی ہے پھر جیسے خود سے کہہ رہی ہو) وہ بچائی جا سکتی تھی وہ بچائی جا سکتی تھی۔ (نجم آہستہ آہستہ اس کے قریب جاتا ہے اور کچھ کہنا چاہتا ہے کہ کوثر مڑ کر بلند آواز سے) گلشن بی بی۔ گلشن بی بی (کچھ دیر خاموش رہ کر ٹھنڈی سانس بھر کر) کاش میں کچھ پہلے پہنچ جاتی۔ (گلشن کمرے میں آتی ہے۔ کوثر اسے دیکھ کر) گلشن بی بی۔ پمیلا سسٹر کو بلاؤ (گلشن جانے کے لیے مڑتی ہے) دیکھو فوراً۔ ابھی۔ اپنے ساتھ لاؤ۔

گلشن : بہت اچھا۔
(گلشن کمرے سے چلی جاتی ہے۔ کوثر پھر کھڑکی سے باہر دیکھنے لگتی ہے پھر اس طرح جیسے خود سے کہہ رہی ہو)

کوثر : آج کی برق رفتار زندگی نے موت کو بھی برق رفتار بنا دیا ہے۔

نجم : (آہستہ سے) کوثر۔

کوثر : (مڑ کر نجم کو دیکھ کر) نجم۔ (ٹھنڈی سانس بھر کر) میں اس برق رفتار دنیا کا ساتھ نہیں دے سکتی۔ میں ہمیشہ پیچھے رہ جاتی ہوں۔ میں ہمیشہ سوچتی رہتی ہوں کہ ایسی جلدی بھی کیا ہے اور دنیا مجھے کچلتی ہوئی گزر جاتی ہے۔

نجم : کوثر! موت کا ایک وقت۔

کوثر : (بات کاٹ کر اپنی ہی دھن میں سوچتے ہوئے) شاید تم آج جانے کو کہہ رہے تھے۔ تمھاری والدہ بیمار ہیں۔ تم چلے جاؤ پہلی گاڑی سے چلے جاؤ۔

نجم : کوثر ایسی جلدی بھی کیا ہے چلا جاؤں گا۔ شاید مسز انتخاب کی موت نے تمھارے اعصاب پر برا اثر ڈالا ہے۔ تم جذباتی ہو رہی ہو۔

کوثر : (بات کاٹ کر) نجم۔ (سوچتے ہوئے) وقت برابر میرے منہ پر طمانچے مار رہا ہے (ایک دم جذباتی ہو کر) خدا کے لیے تم چلے جاؤ۔ تمھاری ماں بیمار ہیں۔اب کوئی طمانچہ اپنے منہ پر برداشت نہ کر سکوں گی۔

نجم : (ایسے لہجہ میں جس میں تکلیف کا احساس ہے) میں رہنے کے لیے نہیں آیا ہوں کوثر۔ چلا جاؤں گا مگر۔ (کچھ دیر بعد تمھارے اندر یکایک تبدیلی۔ (کچھ دیر خاموش رہ کر) مسٹر انتخاب سے تمھاری ملاقات کب سے نہیں ہوئی۔

کوثر : (مڑ کر نجم کو دیکھ کر) نجم! مجھے غلط نہ سمجھو۔ تمھاری طرح وہ بھی میرا دوست تھا بہت اچھا دوست (کچھ دیر خاموش رہ کر ٹھنڈی سانس بھر کر) آج تین سال بعد وہ یکایک میرے سامنے آ گیا۔

نجم : (خفیف سے طنز کے ساتھ) اور تمھاری دوستی اور محبت کے رشتے پھر تازہ ہو گئے ہیں۔

کوثر : نجم۔ (سر سے پیر تک نجم کو دیکھتی ہے اس کی نگاہوں سے خفیف کی جھنجھلاہٹ اور نفرت کی جھلک نمایاں ہے۔ میں نے سوچا بھی نہیں تھا کہ تمھارا دل اس قدر چھوٹا ہوگا (خاموش ہو جاتی ہے اور آہستہ آہستہ بڑھ کر مسہری پر جا کر بیٹھ جاتی ہے۔ اس کے چہرے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ کسی

گہری سوچ میں ہے۔ کچھ دیر بعد نظریں اٹھا کر نجم کو دیکھ کر) نجم! ہم دونوں ضرور محبت کرتے تھے مگر ایک دن اس نے فیصلہ کرلیا کہ وہ مجھ سے نہیں ملے گا۔

نجم : میں تم سے یہ نہیں پوچھوں گا کہ اس نے یہ فیصلہ کیوں کیا۔ مگر۔

کوثر : مگر میں تمھیں بتاؤں گی ضرور۔ (کھڑی ہوتی ہے اور نجم کا چہرہ دیکھ کر) اس کی ماں مرگئی۔ (آگے بڑھتے ہوئے) جانتے ہو وہ کیوں مرگئی۔

نجم : (بے پروائی سے) موت آئی مرگئی۔

کوثر : (نفرت سے نجم کو دیکھ کر) ہاں جس کی موت آتی ہے وہ مرتا ہی ہے۔ مگر ان کو زندہ رکھنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ (کھڑکی کی طرف بڑھتے ہوئے) اسے اپنی ماں کی دوا لے جانے کی جلدی تھی اور میں اس سے کہتی رہی کہ ایسی جلدی بھی کیا ہے چلے جانا اور اس نے دم توڑ دیا۔ (پمیلا کمرے میں آتی ہے۔ کوثر مڑ کر اسے دیکھ کر) سسٹر۔

پمیلا : یس ڈاکٹر۔

کوثر : بچہ مسز انتخاب کو نہ دیا جائے۔

پمیلا : مگر وہ بچہ ڈاکٹر۔

کوثر : (بات کاٹ کر) اس کی پرورش میں کروں گی۔

پمیلا : مگر ڈاکٹر۔ مسز انتخاب۔

کوثر : (پھر بات کاٹ کر) وہ انکار نہیں کریں گے۔

پمیلا : یس ڈاکٹر۔

(پمیلا کمرے سے چلی جاتی ہے۔ نجم انگیٹھی کے پاس جاکر اس پر ہاتھ سینکنے لگتا ہے کچھ دیر بعد نجم آہستہ آہستہ کھڑکی کے پاس جاتا ہے اور باہر کی طرف دیکھتے ہوئے۔

نجم : آج برف باری ہوگی۔ (کوثر مڑ کر نجم کو دیکھتی ہے مگر خاموش رہتی ہے۔ نجم کچھ دیر خاموش رہ کر) کوثر! ڈاکٹر موت اور زندگی سے کھیلتے ہیں، یوں متاثر

نہیں ہوتے۔

کوثر : موت اور زندگی خدا کے اختیار میں ہوتی ہے مگر ڈاکٹر کا فرض ہے کہ وہ موت سے لڑے۔

نجم : مگر کوثر۔

کوثر : (بات کاٹ کر) نجم۔ میں نے موت سے پنجہ لڑانے میں دیر کی۔ میں مجرم ہوں۔ قصور وار ہوں۔ گنہگار ہوں۔

نجم : جو کچھ ہونا تھا وہ ہو چکا اب اس کے لیے۔

کوثر : (اس طرح سوچتے ہوئے جیسے خود سے کہہ رہی ہو) مجھے اپنے گناہ کا کفارہ ادا کرنا چاہیے۔ میں ضرور کفارہ ادا کروں گی۔ ضرور۔

نجم : یعنی اس بچہ کی پرورش کرو گی۔ (کوثر اثبات میں سر ہلاتی ہے۔ نجم کچھ دیر خاموش رہ کر) اور ایک دن تم۔ بجائے ڈاکٹر کے یتیم خانہ کی منیجر نظر آؤ گی اور۔

(پمیلا پھر کمرے میں آتی ہے۔ نجم اسے دیکھ کر خاموش ہو جاتا ہے۔ کوثر سوالیہ نظروں سے پمیلا کو دیکھتی ہے۔ پمیلا کچھ دیر خاموش رہ کر)

پمیلا : ڈاکٹر۔ لاش مسٹر انتخاب کے سپرد کر دی گئی ہے مگر۔ (کوثر سوالیہ نظروں سے اس کا چہرہ دیکھتی ہے۔ پمیلا نظریں جھکا کر) وہ بچہ لے جانے پر بضد ہیں۔

کوثر : بچہ ہرگز نہ دیا جائے۔

پمیلا : مگر ڈاکٹر۔

کوثر : نہیں ہرگز نہیں۔ جاؤ ان سے کہہ دو کہ بچہ نہیں دیا جا سکتا۔

(پمیلا چلی جاتی ہے۔ نجم کوثر کے قریب آ کر)

نجم : مگر کوثر تم کسی کے بچہ کو کیسے چھین سکتی ہو۔ کون سا قانون۔

کوثر : (ذرا تلخ لہجے میں) ہر بات کے لیے قانون کی ضرورت نہیں ہوتی۔

نجم : اگر وہ بچہ لے جانا چاہتا ہے تو لے جانے دو بلا وجہ کی دردسری مول لینے سے فائدہ؟

کوثر : میں جانتی ہوں نجم کہ انتخاب کی ماں نہیں ہے۔ بہن نہیں ہے۔ بھائی نہیں

ہے اور اب بیوی بھی نہیں رہی۔

نجم : اور تم اس کی اولاد بھی چھین لینا چاہتی ہو۔

کوثر : اور اگر میں نے اسے نہیں چھینا تو وہ ایک دن مرجائے گا اور پھر انتخاب — وہ کس قدر تنہا ہوگا۔

نجم : آج کل کا انسان اپنے ہی بچوں سے اکتایا ہوا ہے اور تم دوسرے کی بلا اپنے گلے منڈھنا چاہتی ہو۔

(کوثر مشکوک نظروں سے نجم کو دیکھتی ہے اور اس کے چہرے پر نظریں جمائے رکھتی ہے چہرہ پر طنز اور نفرت کے آثار ظاہر ہوتے ہیں پھر آہستہ سے)

کوثر : میں یقین نہیں کرسکتی تھی نجم کہ تم اس قدر خودغرض ہوگے۔

نجم : سوال خودغرضی کا نہیں ہے۔ سوال یہ ہے کہ ہم کیوں دوسرے کی بلا اپنے سر لیں۔ (کوثر کی نگاہوں میں نفرت کی جھلک اور بڑھ جاتی ہے مگر نجم اسے محسوس نہ کرکے) ہم ماں کو کیسے یقین دلائیں گے کہ وہ تمھاری ہمدردی کا ثمر ہے۔

کوثر : (بگڑ کر) تو وہ اسے میرے گناہوں کا ثمر سمجھ لیں گی۔ (نفرت سے) اگر تمھاری ماں اس قدر عقلمند ہیں تو وہ ہماری زندگی تلخ کردیں گی۔

نجم : (طنزیہ) ''عقلمندوں'' کی زبان بھی نہیں پکڑی جاسکتی۔ آج کی دنیا میں کون کس کا بوجھ اٹھاتا ہے۔

کوثر : اٹھانا ہی پڑتا ہے۔ ہم حیوانیت کے دور میں نہیں ہیں جہاں 'میں' کے علاوہ کچھ نہیں ہوتا۔ میں کم از کم انسانوں کی طرح سوچتی ہوں۔

نجم : (کسی قدر برہم ہوکر) تم سمجھتی ہو کہ میں حیوان ہوں۔ حیوانوں کی طرح سوچتا ہوں۔ (کوثر خاموش رہتی ہے۔ آہستہ آہستہ کھڑکی کی طرف جاتی ہے۔ نجم کے چہرے پر غصے کے آثار اور گہرے ہوجاتے ہیں۔ کچھ دیر خاموش رہ کر) مسٹر انتخاب نے یہاں آکر پرانے رشتوں کی یاد تازہ کردی ہے (کوثر ایک دم مڑ کر کوئی جواب دینا چاہتی ہے مگر خاموش رہتی ہے)

شاید اب تم پھر کہوگی کہ میری امی بیمار ہیں مجھے چلا جانا چاہیے۔

کوثر : (اس طرح جیسے خود پر قابو نہ رہا ہو) اور یہ میں غلط نہیں کہوں گی۔ اگر تم اسے کسی اور معنی میں سمجھتے ہو تو میرے پاس اس کا کوئی علاج نہیں ہے۔

نجم : (غصہ سے) عورت کی تلون مزاجی کا علاج ہوتا بھی نہیں ہے۔

کوثر : (نفرت سے) بہت فرسودہ اعتراض ہے۔

نجم : ہر ثابت شدہ سچائی فرسودہ ہی ہوتی ہے۔ خیر اب مجھے چلا جانا چاہیے۔ (کچھ دیر کمرے میں خاموشی رہتی ہے۔ کوثر کرسی پر بیٹھ کر ہاتھ سینکنے لگتی ہے۔ نجم ٹھنڈی سانس بھر کر) خدا حافظ۔

(کوثر نظریں اٹھا کر نجم کو دیکھتی ہے مگر خاموش رہتی ہے۔ نجم چند سیکنڈ رکتا ہے پھر ہارے ہوئے انسان کی طرح آہستہ آہستہ دوسرے کمرے میں چلا جاتا ہے۔ کوثر کچھ دیر کرسی پر بیٹھی رہتی ہے پھر کچھ سوچ کر کھڑی ہوتی ہے کہ انتخاب کمرے میں آتا ہے۔ کوثر اسے دیکھ کر اپنی جگہ کھڑی رہتی ہے اور سوالیہ نظروں سے انتخاب کو دیکھتی ہے)

انتخاب : (کچھ دیر خاموش رہ کر) وہ نرس بچہ کیوں نہیں لے جانے دیتی۔

کوثر : میں نے منع کر دیا ہے۔ (انتخاب مستقل اس کا چہرہ دیکھتا رہتا ہے) تم پرورش نہ کرسکو گے۔

انتخاب : کیوں نہیں کرسکوں گا۔ (بگڑ کر) میں اپنا بچہ یتیم خانے کے حوالے نہیں کرسکتا۔

کوثر : میرا گھر یتیم خانہ نہیں ہے۔ میں اس کی پرورش کروں گی۔

انتخاب : (حیرت سے) تم پرورش کروگی۔ (کوثر اثبات میں سر ہلاتی ہے۔ انتخاب سوچتا ہوا کھڑکی کے پاس جاتا ہے۔ کچھ دیر باہر دیکھتا رہتا ہے پھر مڑ کر) تم نے یتیم خانہ کب سے کھول لیا ہے۔

کوثر : (ایک دم مشتعل ہو کر) یتیم خانہ۔ یتیم خانہ۔ کیا یتیم خانہ کھولنے پر ہی بچے کی

پرورش کی جاسکتی ہے۔

انتخاب : مگر میں اپنے بچے کو تمھارے حوالے نہیں کرسکتا۔

کوثر : کیوں؟ کیا میں پرورش نہیں کرسکتی؟ کیا مجھے اتنا بھی حق نہیں ہے۔

انتخاب : (کچھ دیر خاموش رہ کر) کوثر! کل تمھاری بھی شادی ہوجائے گی تمھارے بھی بچے ہوں گے۔ اس وقت کیا میرا بچہ ماں باپ کی محبت کو نہیں ترسے گا۔ کیا وہ۔

کوثر : (بات کاٹ کر) میں تمھارے بچہ کی پرورش ہی کو اپنی زندگی کا مقصد بنالوں گی۔

انتخاب : اور میں تم کو اتنی بڑی سزا نہیں دے سکتا۔ (دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے) میں بچہ لے جارہا ہوں۔

کوثر : نہیں۔ (انتخاب ٹھہر جاتا ہے اور مڑ کر کوثر کو دیکھتا ہے کوثر ٹھنڈی سانس بھر کر) انتخاب! تم ہمیشہ مجھے چھوڑ کر جاتے رہے ہو۔ مگر آج میں۔۔۔

(نجم ہاتھ میں سوٹ کیس لیے ہوئے آتا ہے۔ کوثر اسے دیکھ کر خاموش ہوجاتی ہے۔ نجم، کوثر اور انتخاب کو باری باری سے دیکھتا ہے۔ انتخاب چند سیکنڈ خاموش رہ کر)

انتخاب : مسٹر نجم الدین آپ کہاں چل دیے۔

(نجم، انتخاب کی بات پر دھیان نہ دے کر کوثر کی طرف دیکھتے ہوئے)

نجم : ڈاکٹر کوثر میں جارہا ہوں۔

(کوثر خاموش رہتی ہے۔ نجم اس کے جواب کے انتظار میں کھڑا رہتا ہے۔ کمرے میں مکمل خاموشی رہتی ہے۔ پملا کمرے میں آتی ہے۔ اس کے چہرے پر پریشانی کے آثار ہیں۔ کوثر سوالیہ نظروں سے اسے دیکھتی ہے۔ پملا نظریں جھکا کر)

پملا : ڈاکٹر آئی ایم ساری۔ (سب کی نظریں پملا کے چہرے پر جم جاتی ہیں۔ (پملا چند سیکنڈ رک کر) "دی چائلڈ از نو مور"

کوثر : (گھبرا کر) پملا سسٹر۔

پمیلا : ساری ڈاکٹر۔ بچہ بہت کمزور تھا۔

(کچھ دیر کے لیے سب بے حس و حرکت ہو جاتے ہیں۔ کچھ دیر بعد انتخاب اس خاموشی کو توڑتے ہوئے)

انتخاب : اب میں اپنے بچے کو لے جا سکتا ہوں ڈاکٹر کوثر۔

(کوثر خاموشی سے کرسی پر بیٹھ جاتی ہے۔ انتخاب چند سیکنڈ کھڑا رہتا ہے پھر آہستہ آہستہ کمرے سے چلا جاتا ہے۔ نجم کچھ دیر کھڑا کوثر کو دیکھتا رہتا ہے مگر وہ نظریں اٹھا کر اسے نہیں دیکھتی۔ نجم بھی کمرے سے چلا جاتا ہے۔ پمیلا آگے بڑھ کر انگیٹھی کو ہلاتی ہے۔ پھر اونچی آواز سے)

پمیلا : گلشن بی بی۔ گلشن بی بی۔ سارے انگارے راکھ ہو چکے ہیں۔ تھوڑے کوئلے ڈال دو۔ باہر برف گر رہی ہے۔

(پردہ)

اندھیری رات کا جگنو

افرادِ تمثیل

(1) نقوی (ایک ڈاکٹر) (2) تبسم (نقوی کی بیوی) (3) کلارک (ڈاکٹر نقوی کا پڑوسی) (4) الوا (کلارک کی بیوی) (5) گڈو (نقوی کا بچہ) ایک نوکرانی

منظر

ڈاکٹر نقوی کا ڈرائنگ روم بڑے سلیقے اور انتہائی قیمتی سامان سے آراستہ کیا گیا ہے۔ جدید فیشن اور عیش کا تمام ساز و سامان مہیا ہے۔ شام کا وقت ہے۔ ڈاکٹر نقوی ایک صوفے پر بیٹھا اخبار پڑھ رہا ہے کہ کلارک کمرے میں داخل ہو کر۔

کلارک : ہلو ڈاکٹر۔

نقوی : (اخبار پر سے نظریں ہٹا کر کلارک کو دیکھ کر) ہلو مسٹر کلارک (کھڑے ہو کر ہاتھ ملاتے ہوئے) کہیے کیسا مزاج ہے۔

کلارک : او کے۔ فائن۔ تھینک یو۔

نقوی : بیٹھو۔ (صوفے کی طرف اشارہ کرتا ہے) بہت دن میں راستہ بھولے۔

کلارک : (صوفے پر بیٹھتے ہوئے) بہت معروف بلکہ پریشان رہا۔ (مسکرا کر) مجھے افسوس ہے کہ ملاقات نہ ہو سکی۔ مسٹر نقوی تو خیریت سے ہیں۔

نقوی : بالکل خیریت سے ہیں (سگریٹ کیس کلارک کی طرف بڑھا کر) کہو اس وقت کیسے تکلیف کی۔ (کلارک سگریٹ لے کر جلاتا ہے پھر مسکرا کر)

کلارک : وقت بے وقت ڈاکٹر کے پاس آنے کا کیا مقصد ہو سکتا ہے۔

نقوی : (غور سے کلارک کو دیکھ کر) کیا بات ہے۔

کلارک : میں تو ٹھیک ہوں۔ مگر ایوا کے متعلق کچھ بات کرنا ہے۔

نقوی : ایوا۔ یعنی مسز کلارک۔ انھیں کیا ہوا۔

کلارک : مرض تو کچھ نہیں ہے مگر (چند سیکنڈ خاموش رہ کر) اسے تین مہینے کا کن سیپ شن ہے۔

نقوی : دیٹ از گڈ۔

کلارک : ناٹ ایٹ آل ڈاکٹر۔ ہم چاہتے ہیں کہ ابارشن ہو جائے۔

نقوی : ابارشن! کیا کہہ رہے ہیں آپ مسٹر کلارک۔ آپ کے یہاں تو ابھی کوئی بچہ نہیں ہے۔

کلارک : جی ہاں نہیں ہے۔ مگر یہ بچہ نہ میں چاہتا ہوں اور نہ ایوا۔ ہمیں ہونے والے بچے سے نفرت ہے۔

نقوی : (کلارک کا چہرہ حیرت سے دیکھ کر) نفرت! (کچھ دیر بعد مسکراتے ہوئے) پہلا بچہ تو بڑی تمناؤں اور آرزوؤں کا ہوتا ہے۔

کلارک : ہاں ڈاکٹر۔ مگر کبھی کبھی حالات اس کے برعکس ہوتے ہیں۔ (کچھ دیر خاموش رہ کر) مجھے معلوم ہے کہ آپ ابارشن کیسیز کے اکسپرٹ ہیں۔ میں اس ابارشن پر اچھی رقم خرچ کرنے کو تیار ہوں۔

نقوی : مگر مسٹر کلارک۔

کلارک : (بات کاٹ کر) ڈاکٹر۔ معاملہ کو بزنس کے نقطۂ نظر سے دیکھیے آپ کو ایک معقول رقم بطور فیس پیشگی ادا کر دی جائے گی۔

نقوی : مسٹر کلارک! پہلا اشو اور تین مہینے کا کن سیپ شن میں اس قدر خطرناک

رسک لینے کو تیار نہیں۔

کلارک : آپ کو ہماری خاطر یہ رسک لینا ہی ہوگا ڈاکٹر۔ (مسکرا کر) آپ کے لیے یہ کھیل کوئی نیا نہیں ہے۔

نقوی : مگر آپ اس قدر خطرناک کھیل کیوں کھیلنا چاہتے ہیں۔

کلارک : (کچھ دیر رک کر سوچتے ہوئے) ڈاکٹر! میں اور ایوا چاہتے ہیں کہ پہلا بچہ ہمارا ہو۔

نقوی : (حیرت سے) تو یہ بچہ۔

کلارک : ہاں۔ ہم دونوں کا نہیں ہے بلکہ مسٹر رائے کا ہے خود ایوا نے مجھ سے ایسا کہا ہے۔

نقوی : حیرت ہے۔ لیکن مسٹر کلارک۔

کلارک : ڈاکٹر! تمھیں معلوم ہے کہ مجھ پر رشوت کا سنگین الزام تھا میں معطل کیا جاتا اور یقینی تھا کہ نوکری سے بھی ہاتھ دھونا پڑتا۔

نقوی : تو گویا، آپ کا مطلب ہے کہ۔

کلارک : جی ہاں آپ ٹھیک سمجھ رہے ہیں۔ ہم دونوں کے پاس اس کے علاوہ اور کوئی چارہ نہیں رہ گیا تھا۔ لیکن اس سودے میں ہم مسٹر رائے کے بچے کو اپنے سینے سے نہیں لگا سکتے۔

نقوی : مسٹر کلارک۔

کلارک : (بات کاٹ کر) ڈاکٹر پانچ سو روپے اس کیس کے سلسلے میں آپ کی فیس کم نہیں ہوگی۔

نقوی : (مسکرا کر) ہو بھی سکتی ہے۔ (کچھ دیر خاموش رہ کر سوچتے ہوئے) جب تک کیس کا معائنہ نہ کرلوں کسی قسم کا فیصلہ نہیں کرسکتا۔

کلارک : اگر آپ کو فرصت ہو تو میں ابھی ایوا کو لے کر حاضر ہو جاؤں۔

نقوی : (مسکرا کر) ڈاکٹر مصروف بھی رہتا ہے اور اسے فرصت بھی ہوتی ہے، یہ تو کیس کی اہمیت پر منحصر ہے۔

کلارک : مگر میرے نزدیک کیس اہم ہی نہیں بہت اہم ہے (کھڑے ہو کر) میں دس

منٹ میں ایوا کو حاضر کرتا ہوں۔ (دروازے کی طرف بڑھتا ہے کہ تبسم
کمرے میں داخل ہوتی ہے۔ کلارک اسے دیکھ کر) گڈ ایوننگ مسز نقوی۔

تبسم : گڈ ایوننگ مسٹر کلارک۔ کہیے مزاج کیسا ہے۔

کلارک : فائن۔ آپ کا مزاج۔

تبسم : مہربانی ہے آپ کی۔ مسز کلارک بہت دن سے نظر نہیں آئیں۔

کلارک : (مسکرا کر) ابھی نظر آئی جاتی ہیں۔ (نقوی کی طرف دیکھ کر) ڈاکٹر میں
ابھی دس منٹ میں حاضر ہوتا ہوں۔

نقوی : او کے (کلارک کمرے سے چلا جاتا ہے۔ نقوی مسکرا کر تبسم کو سر سے پیر تک
دیکھ کر) کیا ارادہ ہے۔

تبسم : ذرا بازار تک جارہی ہوں۔ کچھ شاپنگ کرنا ہے۔

نقوی : (ہنس کر) شاپنگ کرنا ہے اور وہ بھی اس قدر بن ٹھن کر۔

تبسم : (آئینہ میں خود کو دیکھ کر) کوئی خاص بات تو نہیں ہے۔ آپ کو تو میرا پہننا
اوڑھنا بھی برا معلوم ہوتا ہے۔

نقوی : (مسکرا کر) ایسی بات نہیں ہے۔ آپ اس وقت اچھی معلوم ہوئیں تو کہہ دیا
(ہنس کر) اور اپنی بیوی کا اچھا لگنا کوئی جرم تو نہیں ہے۔

تبسم : (ہنس کر) آپ کے نزدیک تو دوسروں کو بیویوں کا اچھا لگنا بھی جرم نہیں ہوگا۔
(چند سیکنڈ رک کر) یہ مسٹر کلارک اس قدر تیزی سے کہاں گئے ہیں۔

نقوی : اپنی بیوی ایوا کو لینے۔

تبسم : کیوں۔ خیریت تو ہے۔

نقوی : خیریت ہی ہے۔ ایوا کو تین مہینے کا کن سیپ شن ہے۔

تبسم : کن سیپ شن!

نقوی : جی ہاں۔ آپ کو حیرت کیوں ہے (مسکرا کر) عورتوں کو کن سیپ شن ہوتا ہی ہے۔

تبسم : حیرت کی کیا بات ہے۔ جب ہی دو تین مہینے سے وہ نظر نہیں آئیں۔

نقوی: مگر وہ دونوں چاہتے ہیں کہ اسقاط ہو جائے۔

تبسم : لاحول ولا قوۃ۔ بڑا واہیات خیال ہے۔

نقوی : خیال تو واہیات نہیں۔ آج کل تو لوگ اپنی ہی اولاد کی پرورش نہیں کر سکتے۔

تبسم : کیا مطلب۔ کیا یہ بچہ۔

نقوی : (ہنس کر) ہاں ایوا کے پیٹ میں کلارک کا بچہ نہیں ہے۔ خود ایوا نے کلارک سے اس کا اعتراف کیا ہے۔

تبسم : کیا ایوا اس قدر گر چکی ہے کہ۔

نقوی : آج کا انسان ہر طرح اپنی بقا کے لیے جدوجہد کرتا ہے (ہنس کر) تمھارے اخلاقی مسائل پر سوچنے کی اسے فرصت نہیں ہے (بات ٹالنے کے انداز میں) ابھی گڈو اسکول سے نہیں آیا۔

تبسم : آتا ہی ہوگا۔ کیا مسٹر کلارک اسی سلسلے میں آپ کے پاس آئے تھے۔

نقوی : وہ ایوا کو اگزامن کرانا چاہتے ہیں۔ آج آپ کو کیا شاپنگ کرنا ہے۔

تبسم : مس جنید کی شادی ہو رہی ہے۔

نقوی : کون مس جنید۔

تبسم : کمال ہے۔ بعض وقت تو آپ ایسے بھولے بن جاتے ہیں۔ جیسے کچھ جانتے ہی نہیں۔

نقوی : (سوچتے ہوئے) مس جنید۔ آپ کا مطلب انوری۔ بیگم کی لڑکی سے ہے۔

تبسم : جی ہاں۔ (ہنس کر) یہ تو آپ کو یاد ہوگا کہ انوری بیگم کے شوہر کا نام مسٹر جنید ہے۔

نقوی : (ہنس کر) جی ہاں۔ بالکل معلوم ہے۔ کیا شادی کی تیاری کی کچھ ذمہ داریاں آپ پر بھی ہیں۔

تبسم : جی نہیں۔ مگر مس جنید کو کوئی تحفہ تو ہونا چاہیے۔ گڈو کی سال گرہ پر وہ تحفہ دے گئی تھیں۔

نقوی : (ہنس کر) آپ عورتوں میں بدلہ اتارنے کا عجیب جذبہ ہوتا ہے۔ چند سیکنڈ

رک کر) کیا تحفہ خریدنا ہے۔

تبسم : اسی پر تو میں آپ کا مشورہ چاہتی تھی۔ کیا خیال ہے آپ کا ساڑی مناسب رہے گی نا۔

نقوی : ضرور۔

تبسم : اور اگر ٹی سیٹ دیا جائے وہی جو اس روز ہم نے امر اسٹور میں دیکھا تھا۔

نقوی : وہ ٹی سیٹ بھی بڑھیا رہے گا۔

تبسم : (کسی قدر چڑ کر) تو گویا آپ کی کوئی رائے نہیں ہے۔ میں نے ساڑی کہا تو آپ نے کہہ دیا مناسب ہے۔ میں نے ٹی سیٹ کہا تو آپ نے کہہ دیا بڑھیا اور اگر میں کٹھل کہتی تو کہتے لاجواب تحفہ ہے۔

نقوی : بھئی تبسم! یہ گھریلو قسم کی باتیں میری سمجھ میں نہیں آتیں۔ تم جو مناسب سمجھو۔ دے دو۔ (ہنس کر) تم کو تو بدلہ چکانا ہے۔ تم اصل مع سود چکا دو۔

تبسم : آپ جانے کیوں گھریلو قسم کے معاملات میں غیر متعلق رہتے ہیں۔

نقوی : (مسکرا کر) اس لیے کہ ان کی ذمہ داری تمھاری ہے۔

تبسم : اچھا تو میں بازار تک ہو آؤں۔ آدھے گھنٹے میں واپس آجاؤں گی۔ گڈو آجائے تو آیا سے کہنا کہ وہ اسے کپڑے بدلوا کر چائے پلا دے۔
(تبسم کمرے سے چلی جاتی ہے۔ نقوی پھر اخبار اٹھا کر پڑھنے لگتا ہے کچھ دیر بعد ملازمہ کمرے میں آ کر)

ملازمہ : ڈاکٹر کا فون ہے۔ کسی کیس پر آپ سے مشورہ کرنا چاہتے ہیں۔

نقوی : (کچھ سوچ کر) کہہ دو۔ میں گھر پر نہیں ہوں۔

ملازمہ : مگر میں نے تو۔

نقوی : عجیب بے وقوف عورت ہو۔ جاؤ کہہ دو ابھی ابھی کہیں باہر چلے گئے ہیں۔

ملازمہ : بہت اچھا۔

نقوی : اور دیکھو گڈو آئے تو اسے کپڑے بدلوا کر چائے پلا دینا۔

ملازمہ : بہت اچھا۔

(ملازمہ کمرے سے چلی جاتی ہے۔ نقوی پھر اخبار اٹھاتا ہے کہ کلارک اور اس کے پیچھے ایوا داخل ہوتی ہے۔ کلارک نقوی کو دیکھ کر)

کلارک : مسز نقوی کہاں چل دیں۔

نقوی : شاپنگ کے لیے گئی ہیں۔ (کھڑے ہوکر ایوا کی طرف دیکھ کر) آیئے مسز کلارک کیسا مزاج ہے۔

ایوا : (نظریں جھکا کر) ٹھیک ہے۔

نقوی : (صوفے کی طرف اشارہ کرکے) تشریف رکھیے (ایوا صوفے پر بیٹھ جاتی ہے) ابھی تبسم آپ کو پوچھ رہی تھیں۔

ایوا : مجھے افسوس ہے کہ میں ان سے بہت دن سے مل نہیں سکی۔ پریشانیوں نے فرصت ہی نہیں دی۔

نقوی : آپ کو کن سیپ شن ہے۔ یہ سن کر تبسم بہت خوش ہوئی (ایوا نظریں جھکائے بیٹھی رہتی ہے کلارک کچھ دیر بعد)

کلارک : اگر آپ ایوا کو اگزامن کرنا چاہیں تو۔

نقوی : اگزامن تو کرنا ہی پڑے گا۔ (ایوا کی طرف دیکھ کر) آپ پاس والے کمرے میں چلیے۔ وہاں ٹیبل پڑی ہے۔ (ایوا خاموشی سے اٹھ کر پاس والے کمرے میں چلی جاتی ہے۔ نقوی آہستہ آواز میں) کیا مسز کلارک بخوشی ابارشن کے لیے تیار ہیں۔

کلارک : بخوشی۔ بلکہ اسی نے مجھ پر زور دیا ہے۔

نقوی : ابارشن کا تعلق بڑی حد تک عورت کے ذہنی تعاون سے ہوتا ہے۔ اگر عورت ذہنی طور پر تیار نہ ہو تو کامپلی کیشن پیدا ہوسکتی ہے۔ آپ پہلے ان کی ذہنی کیفیت کا جائزہ لے لیجیے۔

کلارک : میں نے اچھی طرح جائزہ لے لیا ہے۔ اگر آپ نے اس کی مدد نہیں کی تو مجھے ڈر ہے کہ کہیں وہ کچھ الٹا سیدھا نہ کر بیٹھے۔ اس کن سیپ شن سے وہ ذہنی

طور پر بہت ڈسٹرب ہے۔

نقوی : اچھا میں ان کو اگزامن کرلوں پھر اپنی رائے دے سکوں گا۔

(نقوی دوسرے کمرے میں چلا جاتا ہے۔ کلارک خاموش بیٹھا رہتا ہے کہ گڈو کمرے میں آ کر)

گڈو : ممی۔ ی۔

کلارک : ہلو مسٹر گڈو۔

گڈو : ممی کہاں ہیں۔

کلارک : بازار شاپنگ کے لیے گئی ہیں۔

(ملازمہ کمرے میں آ کر)

ملازمہ : گڈو بٹیا آؤ کپڑے بدل لو۔ تمھارے لیے چائے تیار رکھی ہے۔

(گڈو ہاتھ پکڑ کر دوسرے کمرے میں جاتا ہے۔ کلارک خاموش بیٹھا رہتا ہے اور بار بار گھڑی دیکھتا ہے۔ کچھ دیر بعد نقوی اور اس کے پیچھے ایوا آتی ہے۔ نقوی کے چہرے پر سنجیدگی ہے۔ ایوا نظریں جھکائے ہوئے آ کر صوفے پر بیٹھ جاتی ہے)

کلارک : کہیے ڈاکٹر صاحب کیا خیال ہے۔

نقوی : (کچھ اس انداز سے جیسے خود سے کہہ رہا ہو) امپاسبل۔ امپاسبل (کلارک کی طرف دیکھ کر) مسٹر کلارک۔ اب ممکن نہیں۔ کیس بہت سیریس ہے۔

کلارک : مگر ڈاکٹر۔ تم ابارشن کے اکسپرٹ ہو۔ جس طرح بھی ممکن ہو جیسے بھی ممکن ہو ابارشن ہونا چاہیے۔

نقوی : مگر میں ایک جان کے لیے دوسری جان خطرے میں نہیں ڈال سکتا۔

کلارک : ڈاکٹر۔ تم پیسے کی فکر نہ کرو۔ مگر تمھیں ایوا کی جان ہر قیمت پر بچانا ہوگی۔ (جیب میں سے پانچ سو روپے نکال کر میز پر رکھتے ہوئے) یہ آپ کی فیس پیشگی (نقوی پہلے نوٹوں کو پھر کلارک کو دیکھتا ہے) ویسے یہ رقم بھی کم نہیں ہے۔ آپ کامیاب ہو گئے تو۔

نقوی : ابھی یہ نوٹ جیب میں رکھیے۔ پہلے مجھے کیس کی کامپلی کیشن پر غور کرنے دیجیے۔

کلارک : مجھے معلوم ہے کہ آپ نے غور کرلیا ہے۔ مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ اس سے زیادہ کامپلی کیٹیڈ کیسز میں آپ کامیاب رہے ہیں۔ مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ آپ کی دیگر پریکٹس نل ہے اور آپ کے یہ سب ٹھاٹ باٹ صرف ابارشن کیسز سے ہیں۔

(کچھ دیر رک کر) آپ یہ روپے رکھیے میں بعد میں اور بھی خدمت کروں گا۔

(رقم اٹھا کر نقوی کی جیب میں رکھ دیتا ہے۔ نقوی سوچتے ہوئے)

نقوی : اچھا مجھے کل تک موقع دیجیے۔ پھر کوئی فیصلہ کرسکوں گا۔

کلارک : خیر آپ کل تک سوچ لیجیے مگر یہ رقم اپنے پاس رکھیے اور ہاں—

(تبسم کمرے میں آتی ہے۔ کلارک خاموش ہوجاتا ہے۔ تبسم نے ایک پیکٹ بغل میں دبا رکھا ہے۔ سب کی موجودگی کا خیال نہ کرکے)

تبسم : گڈو اسکول سے آگیا۔

کلارک : جی ہاں۔ آیا کے ساتھ ہے۔

تبسم : (اوہ مسٹر کلارک۔ ایوا کی طرف دیکھ کر) ہلو۔ ایوا۔ ایوا کھڑی ہوکر سلام کرتی ہے۔ تبسم نقوی کی طرف دیکھ کر) مجھے یہ ساڑی پسند آگئی۔ کانجی ورم کی ہے اور قیمت بھی مناسب ہے۔

نقوی : مس جنید کی شادی کس روز ہے۔

تبسم : کل ہے۔ میں نے انویٹیشن کا ذکر کیا تو تھا۔ (ایوا کی طرف دیکھ کر) مسز کلارک میں ابھی آتی ہوں۔

(تیزی سے دوسرے کمرے میں چلی جاتی ہے۔ نقوی کچھ سوچ کر)

نقوی : (مسٹر کلارک ادھر آیئے۔ مجھے آپ سے دوچار باتیں کرنا ہیں)

(کلارک کا ہاتھ پکڑ کر باہر جاتا ہے۔ ایوا خاموش صوفے پر بیٹھ جاتی ہے۔ اس کے چہرے سے پریشانی ظاہر ہورہی ہے۔ کچھ دیر بعد تبسم آکر اس کے پاس بیٹھ کر)

تبسم : مسز کلارک معاف کرنا۔ میں گڈو کو دیکھنے گئی تھی کہ اس نے چائے پی یا نہیں

کہو کیسی ہو۔

ایوا : فائن۔

تبسم : اتنے دنوں کہاں غائب رہیں۔

ایوا : ذرا مصروف اور پریشان رہی اس لیے حاضر نہ ہوسکی۔

تبسم : ابھی نقوی نے بتلایا کہ تم ماں بننے والی ہو۔

ایوا : ہاں۔ (کچھ سوچ کر) مگر میں یہ بچہ نہیں چاہتی۔

تبسم : (حیرت سے) کیوں۔

ایوا : ڈاکٹر نقوی نے نہیں بتلایا کہ میں یہ بچہ کیوں نہیں چاہتی۔

تبسم : نہیں انھوں نے مجھے کوئی ایسی بات نہیں بتلائی۔

ایوا : (طنزیہ) میں مجبوری کا نہیں اپنی مرضی کا بچہ چاہتی ہوں۔

تبسم : کوئی بھی عورت مجبور نہیں ہوتی کہ اس کی ناخوشی کا بچہ اس کے پیٹ میں جنم لے۔

ایوا : (غور سے تبسم کا چہرہ دیکھ کر) مسز نقوی! تم گھر میں بیٹھ کر بچوں کو پالنے والی یا زیادہ سے زیادہ شاپنگ کر کے خوش ہوجانے والی عورتیں ان عورتوں کی مجبوری کو نہیں سمجھ سکتیں جن کو زندہ رہنے کے لیے جدوجہد کرنا پڑتی ہے۔

تبسم : لیکن عورت زندہ رہنے کے لیے ضمیر تو نہیں بیچ دیتی۔

ایوا : (طنزیہ) ضمیر۔ ہنہ۔ (چند سیکنڈ خاموش رہ کر) تمھارے یہ آرام دہ صوفے تمھارے کمروں میں بچھے ہوئے یہ قیمتی قالین۔ تمھارے دروازوں پر پڑے ہوئے یہ قیمتی پردے اور یہ سامان آرائش مجھے بھی بہت اچھے معلوم ہوتے ہیں۔

تبسم : لیکن مسز کلارک۔

ایوا : (بات کاٹ کر) مسز نقوی۔ میرے گھر میں نہ ایسے قیمتی صوفہ سیٹ ہیں، نہ ایسے قیمتی قالین اور نہ اتنے خوبصورت پردے۔ دو چار ٹوٹی پھوٹی کرسیاں۔ ایک پھٹی ہوئی دری اور میلے کچیلے پردے ہیں۔ اگر میں یہ محسوس کروں کہ وہ بھی مجھ سے چھن رہے ہیں تو میں کیا کچھ نہ کروں گی۔

تبسم : (طنزیہ) مگر اخلاقی قدریں کسی سیاسی لیڈر کی تقریریں نہیں ہیں، جن کا مطلب وقت، حالات اور سیاسی الٹ پھیر کے ساتھ بدلتا رہتا ہے۔

ایوا : (طنزیہ تمھیں شاید فرصت زیادہ ہے مسز نقوی کہ تم ضمیر کی آواز سن لیتی ہو اور اخلاقی قدروں کی باتیں کرتی ہو۔ مگر میرے پاس اتنی فرصت کہاں ہے میں تو طوفان میں گھری ہوئی کشتی ہوں جس پر چاروں طرف سے تھپیڑے پڑ رہے ہیں۔

تبسم : اور ان تھپیڑوں سے گھبرا کر کوئی ماں اپنے پیٹ کا وزن ہلکا کر لینا نہیں چاہتی۔ وہ وزن اس کو اپنی جان سے زیادہ عزیز ہوتا ہے۔

ایوا : (جذباتی انداز میں) نہیں، نہیں، نہیں، (کھڑی ہوکر) میں اس بچے کو عزیز نہیں رکھ سکتی، اس کی پرورش نہیں کر سکتی۔ اپنے دونوں ہاتھ کانوں پر رکھ کر) میں کوئی آواز سننا نہیں چاہتی۔ نہ ضمیر کی اور نہ انسان کی۔

(تبسم گھبرا کر کھڑی ہو جاتی ہے اور ایوا کی طرف دیکھ کر)

تبسم : مسز کلارک آپ۔

ایوا : (بات کاٹ کر) نہیں، نہیں، نہیں۔ مجھے یہ بچہ نہیں چاہیے۔ (دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے) نہیں چاہیے، نہیں چاہیے، نہیں چاہیے۔

(کلارک اور نقوی گھبرائے ہوئے کمرے میں آتے ہیں۔ کلارک ایوا کو دیکھ کر)

کلارک : کیا بات ہے ایوا ڈارلنگ۔

ایوا : (بالکل جنونی انداز میں) مجھے یہ بچہ نہیں چاہیے۔ میں مرنے کو تیار ہوں مگر یہ بچہ نہیں چاہیے۔

کلارک : (اس کے دونوں بازو پکڑ کر) میں نے ڈاکٹر صاحب سے بات کر لی ہے۔ سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔

ایوا : میں مرنے کو تیار ہوں مگر یہ بچہ نہیں چاہیے۔

(بالکل بے جان سی ہو کر کلارک کی باہوں میں گر جاتی ہے۔ کلارک اسے سنبھالتے ہوئے)

کلارک : تم زندہ رہوگی ایوا۔تم زندہ رہوگی۔

(کلارک، ایوا کو سنبھالے ہوئے کمرے سے چلا جاتا ہے۔ کچھ دیر مکمل خاموشی رہتی ہے۔ کچھ دیر بعد...)

نقوی : کیا بات تھی۔ مسز کلارک ایک دم یوں کیوں چیخنے لگی تھیں۔

تبسم : جانے کیوں ایک دم جذباتی ہوگئیں۔ میں تو حیران رہ گئی۔ (کچھ دیر خاموش رہ کر) کیا یہ لوگ——

نقوی : ہاں یہ لوگ اسقاط چاہتے ہیں۔

تبسم : (طنزیہ) اور ان کی مدد کرنے کے لیے آپ تیار ہوگئے ہیں۔

نقوی : ان کی مدد کرنا ہی ہوگی ورنہ ایوا جان دے دے گی۔

تبسم : اسے یہ دنیا بہت اچھی معلوم ہوتی ہے، وہ جان نہیں دے سکتی۔

نقوی : کیا اس نے تم سے ایسی بات کہی۔

تبسم : کوئی ماں یوں اپنے بچے کو موت کے حوالے نہیں کرتی۔

نقوی : (ہنس کر) اور میرے پاس بہت سی مائیں یہی درخواست لے کر آتی ہیں۔

تبسم : (طنز اور نفرت سے) اور آپ ان کی درخواست قبول فرما لیتے ہیں۔

(نقوی اس طنز اور نفرت کو محسوس کرتا ہے اور تبسم کو غور سے دیکھ کر)

نقوی : ہاں۔ اس لیے کہ مجھے یہ قالین پسند ہیں۔ آرام دہ صوفہ سیٹ پسند ہیں۔ یہ بجلی کا پنکھا۔ یہ ٹیلی فون، یہ ریڈیو گرام، تمھارے آرام کے لیے گیس کا چولھا تحفے میں دینے کے لیے کانجی ورم کی ساڑیاں۔ یہ سب مجھے پسند ہیں۔ میری ضرورت ہیں۔

تبسم : اور ان سب کی قیمت آپ ہونے والے پیغمبروں کو قتل کر کے ادا کرتے ہیں۔

نقوی : (قہقہہ مار کر) اب پیغمبر پیدا نہیں ہوتے تبسم۔ ڈاکٹر پیدا ہوتے ہیں، انجینئر پیدا ہوتے ہیں۔ ٹیکنیشین پیدا ہوتے ہیں۔ اب زمین کا روپ بدلنے والے اسٹمک انرجی کے ماہر پیدا ہوتے ہیں۔

تبسم : اور دنیا کو جہنم بنانے والے پیدا ہوتے ہیں، جنت بنانے والے نہیں۔

(چند سیکنڈ رک کر) آپ ایوا کی اس سلسلے میں ہرگز مدد نہیں کریں گے۔ کیا معلوم اس کے پیٹ میں کوئی کرائسٹ اس دنیا کے لوگوں کو انسان بنانے کے لیے مچل رہا ہو۔

نقوی : مستقبل ایک تاریک خلا ہے جس میں انسان کی آنکھ کچھ نہیں دیکھ سکتی۔ (جیب میں سے پانسو روپے کے نوٹ نکال کر میز پر پھینکتے ہوئے) مگر ان سے میں زندگی کا بہت سا سامانِ عیش خرید سکتا ہوں۔ گرمیوں میں کسی پہاڑ پر جاسکتا ہوں۔ وہاں کے خوبصورت مناظر کی سیر کرسکتا ہوں۔ میں ملازم رکھ سکتا ہوں جو میرے آرام و آسائش کا خیال رکھیں۔ میں تمھیں جواہرات اور زیورات سے سجا سکتا ہوں۔ تمھارے حسن کو اور نکھار سکتا ہوں۔ گذو کی زندگی اور خوشگوار بنا سکتا ہوں۔

تبسم : اور ان کے لیے میں اپنے ضمیر کا گلا گھونٹ سکتا ہوں۔ میں یہ ہرگز برداشت نہیں کرسکتی کہ ان پانچ سو یا ہزار روپے کے لیے آپ کسی ماں کے پیٹ میں مچلتے ارمانوں کا خون کردیں۔

نقوی : یہ میرے پیشے کا معاملہ ہے اور ایوا کا ذاتی۔ کسی کو اس میں دخل دینے کی ضرورت نہیں۔

تبسم : کوئی چور یہ کہہ کر انسانی ذمہ داری سے سبکدوش نہیں ہوجاتا کہ یہ اس کا ذاتی معاملہ ہے اس کا پیشہ ہے۔

نقوی : ہزاروں سال سے یہ سبق پڑھایا جاتا رہا ہے مگر پھر بھی دنیا میں چوریاں ہوتی ہیں۔ ڈاکے پڑتے ہیں۔ قتل ہوتے ہیں۔ دنیا کو ان سب کی بھی ضرورت ہے۔

تبسم : ویسے تو کرائسٹ بھی صلیب پر چڑھائے جاتے رہے ہیں۔ مگر میں نہیں چاہتی کہ وہ میرے ہی گھر میں صلیب پر چڑھائے جائیں۔

نقوی : (ہنس کر) تو پھر ایک دن تم ہی صلیب پر چڑھا دی جاؤ گی۔

تبسم : اس کے مقابلے وہ مجھے منظور ہوگا۔

نقوی : یوں زبان سے کہہ دینا بہت آسان ہے تبسم۔ (کچھ دیر رک کر) ممکن ہے

کہو کیسی ہو۔

ایوا : فائن۔

تبسم : اتنے دنوں کہاں غائب رہیں۔

ایوا : ذرا مصروف اور پریشان رہی اس لیے حاضر نہ ہوسکی۔

تبسم : ابھی نقوی نے بتلایا کہ تم ماں بننے والی ہو۔

ایوا : ہاں۔ (کچھ سوچ کر) مگر میں یہ بچہ نہیں چاہتی۔

تبسم : (حیرت سے) کیوں۔

ایوا : ڈاکٹر نقوی نے نہیں بتلایا کہ میں یہ بچہ کیوں نہیں چاہتی۔

تبسم : نہیں انھوں نے مجھے کوئی ایسی بات نہیں بتلائی۔

ایوا : (طنزیہ) میں مجبوری کا نہیں اپنی مرضی کا بچہ چاہتی ہوں۔

تبسم : کوئی بھی عورت مجبور نہیں ہوتی کہ اس کی ناخوشی کا بچہ اس کے پیٹ میں جنم لے۔

ایوا : (غور سے تبسم کا چہرہ دیکھ کر) مسز نقوی! تم گھر میں بیٹھ کر بچوں کو پالنے والی یا زیادہ سے زیادہ شاپنگ کر کے خوش ہوجانے والی عورتیں ان عورتوں کی مجبوری کو نہیں سمجھ سکتیں جن کو زندہ رہنے کے لیے جدوجہد کرنا پڑتی ہے۔

تبسم : لیکن عورت زندہ رہنے کے لیے ضمیر تو نہیں بیچ دیتی۔

ایوا : (طنزیہ) ضمیر۔ ہنہ۔ (چند سیکنڈ خاموش رہ کر) تمھارے یہ آرام دہ صوفے تمھارے کمروں میں بچھے ہوئے یہ قیمتی قالین۔ تمھارے دروازوں پر پڑے ہوئے یہ قیمتی پردے اور یہ سامان آرائش مجھے بھی بہت اچھے معلوم ہوتے ہیں۔

تبسم : لیکن مسز کلارک۔

ایوا : (بات کاٹ کر) مسز نقوی۔ میرے گھر میں نہ ایسے قیمتی صوفہ سیٹ ہیں، نہ ایسے قیمتی قالین اور نہ اتنے خوبصورت پردے۔ دو چار ٹوٹی پھوٹی کرسیاں۔ ایک پھٹی ہوئی دری اور میلے کچیلے پردے ہیں۔ اگر میں یہ محسوس کروں کہ وہ بھی مجھ سے چھن رہے ہیں تو میں کیا کچھ نہ کروں گی۔

تبسم : (طنزیہ) مگر اخلاقی قدریں کسی سیاسی لیڈر کی تقریریں نہیں ہیں، جن کا مطلب وقت، حالات اور سیاسی الٹ پھیر کے ساتھ بدلتا رہتا ہے۔

ایوا : (طنزیہ تمھیں شاید فرصت زیادہ ہے مسز نقوی کہ تم ضمیر کی آواز سن لیتی ہو اور اخلاقی قدروں کی باتیں کرتی ہو۔ مگر میرے پاس اتنی فرصت کہاں ہے میں تو طوفان میں گھری ہوئی کشتی ہوں جس پر چاروں طرف سے تھپیڑے پڑ رہے ہیں۔

تبسم : اور ان تھپیڑوں سے گھبرا کر کوئی ماں اپنے پیٹ کا وزن ہلکا کر لینا نہیں چاہتی۔ وہ وزن اس کو اپنی جان سے زیادہ عزیز ہوتا ہے۔

ایوا : (جذباتی انداز میں) نہیں، نہیں، نہیں، (کھڑی ہو کر) میں اس بچے کو عزیز نہیں رکھ سکتی، اس کی پرورش نہیں کر سکتی۔ اپنے دونوں ہاتھ کانوں پر رکھ کر) میں کوئی آواز سننا نہیں چاہتی۔ نہ ضمیر کی اور نہ انسان کی۔

(تبسم گھبرا کر کھڑی ہو جاتی ہے اور ایوا کی طرف دیکھ کر)

تبسم : مسز کلارک آپ۔

ایوا : (بات کاٹ کر) نہیں، نہیں، نہیں۔ مجھے یہ بچہ نہیں چاہیے۔ (دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے) نہیں چاہیے، نہیں چاہیے، نہیں چاہیے۔

(کلارک اور نقوی گھبرائے ہوئے کمرے میں آتے ہیں۔ کلارک ایوا کو دیکھ کر)

کلارک : کیا بات ہے ایوا ڈارلنگ۔

ایوا : (بالکل جنونی انداز میں) مجھے یہ بچہ نہیں چاہیے۔ میں مرنے کو تیار ہوں مگر یہ بچہ نہیں چاہیے۔

کلارک : (اس کے دونوں بازو پکڑ کر) میں نے ڈاکٹر صاحب سے بات کر لی ہے۔ سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔

ایوا : میں مرنے کو تیار ہوں مگر یہ بچہ نہیں چاہیے۔

(بالکل بے جان سی ہو کر کلارک کی باہوں میں گر جاتی ہے۔ کلارک اسے سنبھالتے ہوئے)

کلارک : تم زندہ رہوگی ایوا۔ تم زندہ رہوگی۔

(کلارک، ایوا کو سنبھالے ہوئے کمرے سے چلا جاتا ہے۔ کچھ دیر مکمل خاموشی رہتی ہے۔ کچھ دیر بعد...)

نقوی : کیا بات تھی۔ مسز کلارک ایک دم یوں کیوں چیخنے لگی تھیں۔

تبسم : جانے کیوں ایک دم جذباتی ہوگئیں۔ میں تو حیران رہ گئی۔ (کچھ دیر خاموش رہ کر) کیا یہ لوگ۔۔

نقوی : ہاں یہ لوگ اسقاط چاہتے ہیں۔

تبسم : (طنزیہ) اور ان کی مدد کرنے کے لیے آپ تیار ہوگئے ہیں۔

نقوی : ان کی مدد کرنا ہی ہوگی ورنہ ایوا جان دے دے گی۔

تبسم : اسے یہ دنیا بہت اچھی معلوم ہوتی ہے، وہ جان نہیں دے سکتی۔

نقوی : کیا اس نے تم سے ایسی بات کہی۔

تبسم : کوئی ماں یوں اپنے بچے کو موت کے حوالے نہیں کرتی۔

نقوی : (ہنس کر) اور میرے پاس بہت سی مائیں یہی درخواست لے کر آتی ہیں۔

تبسم : (طنز اور نفرت سے) اور آپ ان کی درخواست قبول فرما لیتے ہیں۔

(نقوی اس طنز اور نفرت کو محسوس کرتا ہے اور تبسم کو غور سے دیکھ کر)

نقوی : ہاں۔ اس لیے کہ مجھے یہ قالین پسند ہیں۔ آرام دہ صوفہ سیٹ پسند ہیں۔ یہ بجلی کا پنکھا۔ یہ ٹیلی فون، یہ ریڈیوگرام، تمھارے آرام کے لیے گیس کا چولھا تحفے میں دینے کے لیے کانجی ورم کی ساڑیاں۔ یہ سب مجھے پسند ہیں۔ میری ضرورت ہیں۔

تبسم : اور ان سب کی قیمت آپ ہونے والے پیغمبروں کو قتل کرکے ادا کرتے ہیں۔

نقوی : (قہقہہ مار کر) اب پیغمبر پیدا نہیں ہوتے تبسم۔ ڈاکٹر پیدا ہوتے ہیں، انجینئر پیدا ہوتے ہیں۔ ٹیکنیشین پیدا ہوتے ہیں۔ اب زمین کا روپ بدلنے والے اسٹمک انرجی کے ماہر پیدا ہوتے ہیں۔

تبسم : اور دنیا کو جہنم بنانے والے پیدا ہوتے ہیں، جنت بنانے والے نہیں۔

(چند سیکنڈ رک کر) آپ ایوا کی اس سلسلے میں ہرگز مدد نہیں کریں گے۔ کیا معلوم اس کے پیٹ میں کوئی کرائسٹ اس دنیا کے لوگوں کو انسان بنانے کے لیے مچل رہا ہو۔

نقوی : مستقبل ایک تاریک خلا ہے جس میں انسان کی آنکھ کچھ نہیں دیکھ سکتی۔ (جیب میں سے پانچ سو روپے کے نوٹ نکال کر میز پر پھینکتے ہوئے) مگر ان سے میں زندگی کا بہت سا سامانِ عیش خرید سکتا ہوں۔ گرمیوں میں کسی پہاڑ پر جاسکتا ہوں۔ وہاں کے خوبصورت مناظر کی سیر کرسکتا ہوں۔ میں ملازم رکھ سکتا ہوں جو میرے آرام و آسائش کا خیال رکھیں۔ میں تمھیں جواہرات اور زیورات سے سجا سکتا ہوں۔ تمھارے حسن کو اور نکھار سکتا ہوں۔ گذو کی زندگی اور خوشگوار بنا سکتا ہوں۔

تبسم : اور ان کے لیے میں اپنے ضمیر کا گلا گھونٹ سکتا ہوں۔ میں یہ ہرگز برداشت نہیں کرسکتی کہ ان پانچ سو یا ہزار روپے کے لیے آپ کسی ماں کے پیٹ میں مچلتے ارمانوں کا خون کردیں۔

نقوی : یہ میرے پیشے کا معاملہ ہے اور ایوا کا ذاتی۔ کسی کو اس میں دخل دینے کی ضرورت نہیں۔

تبسم : کوئی چور یہ کہہ کر انسانی ذمہ داری سے سبکدوش نہیں ہوجاتا کہ یہ اس کا ذاتی معاملہ ہے اس کا پیشہ ہے۔

نقوی : ہزاروں سال سے یہ سبق پڑھایا جاتا رہا ہے مگر پھر بھی دنیا میں چوریاں ہوتی ہیں۔ ڈاکے پڑتے ہیں۔ قتل ہوتے ہیں۔ دنیا کو ان سب کی بھی ضرورت ہے۔

تبسم : ویسے تو کرائسٹ بھی صلیب پر چڑھائے جاتے رہے ہیں۔ مگر میں نہیں چاہتی کہ وہ میرے ہی گھر میں صلیب پر چڑھائے جائیں۔

نقوی : (ہنس کر) تو پھر ایک دن تم ہی صلیب پر چڑھادی جاؤ گی۔

تبسم : اس کے مقابلے وہ مجھے منظور ہوگا۔

نقوی : یوں زبان سے کہہ دینا بہت آسان ہے تبسم۔ (کچھ دیر رک کر) ممکن ہے

صلیب پر چڑھ کر کرائسٹ بھی پچھتائے ہوں۔ (کچھ دیر خاموش رہ کر) میں ان لوگوں سے وعدہ کر چکا ہوں۔

تبسم : لیکن اگر آپ نے یہ کام کیا تو۔

نقوی : (بات کاٹ کر) تم مجھے کوئی دھمکی نہ دو تبسم۔ میں زندہ رہنا چاہتا ہوں اور زندہ رہنے کے لیے مجھے سب کچھ کرنا ہوگا۔

تبسم : تو پھر سن لیجیے کہ میں اس گھر میں۔

نقوی : (بات کاٹ کر) بس خاموش رہو۔

(اسی وقت گڈو کمرے میں آ کر)

گڈو : ممی۔ آیا کہتی ہے میں کپڑے بدل لوں۔ میں کپڑے نہیں بدلوں گا۔

تبسم : نہ بدلو بیٹا۔ (گڈو کا ہاتھ پکڑ کر) کیا معلوم کسی دن کوئی اسی ننھے کرائسٹ کی کوئی اچھی قیمت لگا دے اور اسے بھی صلیب پر لٹکا دیا جائے۔

نقوی : تم ضرور جا سکتی ہو تبسم۔ (طنزیہ) جب اس ننھے کرائسٹ کو لوگ پھٹے پرانے کپڑوں اور بھوکا پیٹ دیکھیں گے تو انھیں اسے صلیب پر چڑھانے میں آسانی ہوگی۔

(کلارک گھبرایا ہوا کمرے میں آتا ہے)

کلارک : ڈاکٹر۔ ڈاکٹر۔

نقوی : کیا بات ہے مسٹر کلارک۔ آپ اس قدر گھبرائے ہوئے کیوں ہیں۔

کلارک : ایوا بے ہوش ہوگئی ہے اس پر ہسٹریا جیسا دورہ پڑا تھا آپ چل کر دیکھ لیجیے۔ کوئی ایسی ویسی بات نہ ہو جائے۔

نقوی : نہیں مسٹر کلارک کچھ نہیں ہوگا۔ یہ صرف سائیکالوجیکل ہے (دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے) چلیے میں دیکھتا ہوں۔

(کلارک اور نقوی کمرے سے چلے جاتے ہیں۔ تبسم کچھ دیر خاموش کھڑی رہتی ہے اور آنکھوں میں آنسو آ جاتے ہیں۔ اور گڈو کو گود میں اٹھا کر پیار کرنے لگتی ہے)

(پردہ)

اُداس راہی اُداس راہیں

افرادِ تمثیل

(1) نقوی (ایک ڈاکٹر) (2) تبسم (نقوی کی بیوی) (3) کلارک (نقوی کا ایک پڑوسی) (4) لطفی (ڈاکٹر نقوی کا دوست) (5) ملازمہ

منظر

ڈاکٹر نقوی کا ڈرائنگ روم۔ بیش قیمت سامان سے آراستہ و پیراستہ جدید فیشن اور عیش کے تمام سامان سے سجا ہوا۔ صبح کا وقت۔ کلارک اک صوفے پر اس طرح بیٹھا ہے جیسے کسی کا انتظار کر رہا ہو۔ کچھ دیر بعد نقوی کمرے میں آکر۔

نقوی : ہلو مسٹر کلارک۔

کلارک : (کھڑے ہوکر) ہلو ڈاکٹر۔ گڈ مارننگ۔ (نقوی سے ہاتھ ملاتے ہوئے) کہیے مزاج کیسا ہے۔

نقوی : مہربانی ہے۔ تشریف رکھیے۔ معاف کیجیے گا مجھے تھوڑی دیر ہوگئی۔

کلارک : جی نہیں کوئی بات نہیں۔

نقوی : آج کل ذرا تبسم کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے اس لیے۔

کلارک : کیسا مزاج ہے۔

نقوی : کن سیپ شن ہے اس لیے کچھ پریشان سی ہے۔ (سگریٹ جلاتا ہے) اب مسز کلارک کیسی ہیں۔

کلارک : میں اسی لیے حاضر ہوا تھا۔ (نقوی سگریٹ اس کی طرف بڑھاتا ہے۔ کلارک سگریٹ لیتے ہوئے) تھینک یو۔ (سگریٹ جلا کر) رات اس کی حرکتیں کچھ غیر معمولی سی تھیں۔ مجھے خوف ہے کہ کہیں وہ اپنا ذہنی توازن نہ کھو بیٹھے۔

نقوی :اوہ تو مسٹر کلارک ابارشن سے انھیں شاک لگا ہے اور کوئی بات نہیں۔ میں نے جو دوائیاں لکھی تھیں ان کا استعمال تو ہو رہا ہے۔

کلارک : جی ہاں۔ مگر رات اس کی حرکتیں دیکھ کر اس وقت آپ کے پاس آنا پڑا۔

نقوی: ذرا نسخہ مجھے دکھلایئے۔ (کلارک جیب سے نسخہ نکال کر دیتا ہے۔ نقوی نسخہ پر لکھ کر کلارک کو دیتے ہوئے) یہ انجکشن اور لے آیئے۔

کلارک : آپ چل کر معائنہ اور کر لیتے تو اچھا تھا۔

نقوی : ٹھیک ہے۔ میں معائنہ بھی کر لوں گا گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔

کلارک : اچھا میں انجکشن لے کر آتا ہوں۔ آپ کا کوئی اور پروگرام تو نہیں ہے۔

نقوی : جی نہیں۔ میں تقریباً ایک گھنٹے ابھی گھر ہی پر ہوں۔

کلارک : بہت اچھا۔ میں ابھی حاضر ہوتا ہوں۔

(کلارک کمرے سے چلا جاتا ہے۔ نقوی صوفے پر بیٹھ کر سگریٹ کے دھوئیں سے چھلے بنانے لگتا ہے۔ پھر کچھ سوچ کر بلند آواز سے)

نقوی : تبسم۔ ارے بھئی تبسم (کچھ دیر میں تبسم آتی ہے) کیا کر رہی تھیں۔

تبسم : گڈو کے لیے کپڑے تیار کر رہی تھی۔ آج اس سے ملنے جانا ہے۔

نقوی : (چند سیکنڈ خاموش رہ کر) بعض وقت تم بھی کمال کرتی ہو۔ (تبسم سوالیہ

نظروں سے نقوی کو دیکھتی ہے۔ نقوی کھڑے ہوتے ہیں) کل مسز جنید کی سال گرہ تھی اور تم نے کہا تک نہیں۔

تبسم : میں خود ہی بھول گئی تھی۔

نقوی : مسز جنید کو تم جانتی ہو زندگی بھر طعنے دیں گی۔ (تبسم خاموش رہتی ہے۔ نقوی اس کا چہرہ دیکھ کر) آخر تم اس قدر پریشان اور اُداس کیوں رہتی ہو۔

تبسم : (پھیکی مسکراہٹ سے) نہیں ایسی کوئی بات نہیں ہے۔

نقوی : ایسی بات ضرور ہے۔ تمھاری صورت سے ظاہر ہوتا ہے۔

تبسم : (کچھ دیر خاموش رہ کر) مجھے اس گھر کے ماحول میں عجب گھٹن سی محسوس ہوتی ہے۔

نقوی : گھٹن! آخر کیوں؟

تبسم : مجھے پتا نہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میرا دم گھٹا جارہا ہے۔

نقوی : کتنی بار کہا ہے کہ ان خیالوں کو دل میں نہ آنے دو۔ اس سے صحت پر کوئی اچھا اثر نہیں پڑتا۔

تبسم : (سوچتے ہوئے) جانے کیوں بار بار میرے دماغ میں آتا ہے کہ مسز کلارک کا بچہ کیسا ہوتا۔ لڑکا ہوتا یا لڑکی۔ اس کی آنکھیں کیسی ہوتیں کالی کہ نیلی۔ بال سنہری ہوتے یا کالے۔

نقوی : (قہقہہ مار کر) بھئی غضب ہے۔ وہ کیسا ہوتا کیا ہوتا کسے پتا۔ اب تو وہ پیدا ہی نہیں ہوا۔

تبسم : (سوچتے ہوئے) مسز کلارک بری عورت تو نہیں ہے پھر اس نے ایسا کیوں کیا۔ صرف پروموشن حاصل کرنے کے لیے؟

نقوی : بلکہ یوں کہو ایک اچھی زندگی حاصل کرنے کے لیے اور اچھی زندگی حاصل کرنے کے لیے انسان کو کیا کچھ نہیں کرنا پڑتا۔

تبسم : (کچھ دیر خاموش رہ کر) کچھ بھی ہو مگر میں محسوس کرتی ہوں کہ ایک کرائسٹ کو صلیب پر اسی گھر میں لٹکایا گیا ہے۔

نقوی : بھئی تبسم میں نے کہا نہیں کہ یہ دنیا ہے اور اس میں زندہ رہنے کے لیے بہت نیچے گرنا پڑتا ہے۔

تبسم : (طنزیہ) اور اوپر اٹھنے کے لیے معصوموں کا گلا دبانا پڑتا ہے۔

نقوی : (کس قدر بیزاری سے) ڈارلنگ۔ میں کتنی بار کہہ چکا ہوں کہ مجھے اس مسئلے پر بحث کرتے ہوئے خاصی کوفت ہوتی ہے۔ خدا کے لیے پلیز۔

تبسم : میں اسے بھلانے کی لاکھ کوشش کرتی ہوں مگر بھلا نہیں سکتی۔ (چند سیکنڈ خاموش رہ کر) میں جب ان قیمتی صوفوں پر بیٹھتی ہوں، ان بیش قیمت قالینوں پر چلتی ہوں تو ایسا محسوس کرتی ہوں کہ معصوم روحیں میرے پانوں کے نیچے دب کر کراہ رہی ہیں (نظروں سے سامان آرائش کا جائزہ لے کر) جب میری نظریں اس سامان آرائش پر پڑتی ہیں تو ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے ننھے ننھے بچے بڑی حسرت سے مجھے تک رہے ہیں۔ مجھے خواب میں دکھائی دیتا ہے کہ ہر چیز میں سے ننھی ننھی روحیں نکل کر میری طرف بڑھ رہی ہیں۔ (آنکھوں میں آنسو بھر کر) میں چاہتی ہوں کہ کچھ دن کے لیے اس ماحول سے کہیں دور چلی جاؤں۔

نقوی : ڈارلنگ۔ (سگریٹ کا لمبا سا کش لے کر سگریٹ ایش ٹرے میں ڈالتے ہوئے) اور مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ تمھیں مجھ پر بھروسا نہیں رہا ہے (مسکرا کر) تم خود سوچو کیا کوئی اپنی اولاد کا گلا دبا سکتا ہے۔

تبسم : کیا معلوم اس دنیا میں عیش کی زندگی گزارنے کے لیے انسان کو ایک دن اپنی اولاد کا گلا بھی دبانا پڑے۔

نقوی : (جھنجھلاہٹ سے) تبسم مجھے اس قدر ذلیل کرنے کی کوشش نہ کرو کہ ایک دن مجھے تم سے نفرت ہو جائے۔ میں — (ٹیلیفون کی گھنٹی بجتی ہے۔ نقوی رسیور اٹھا کر) ہلو۔ میں ڈاکٹر نقوی بول رہا ہوں۔ جی۔ اچھا۔ اچھا۔ میں ابھی آرہا ہوں۔ یس وِتھ ان فائیو منٹس۔ او کے۔ او کے۔ (رسیور رکھ کر تبسم سے) مسز

جنید زینے سے گر کر بے ہوش ہوگئی ہیں۔
(تیزی سے کمرے سے چلا جاتا ہے۔تبسم ایک صوفے پر بیٹھ جاتی ہے اور کمرے کے سامان کو اس طرح دیکھتی ہے جیسے وہ اس سے خوف زدہ ہو کہ کلارک کمرے میں آتا ہے)

کلارک : ہلو مسز نقوی۔ گڈ مارننگ۔

تبسم : گڈ مارننگ مسٹر کلارک (صوفے کی طرف اشارہ کرکے) آیئے۔

کلارک : (صوفے پر بیٹھ کر) کہیے مزاج کیسا ہے۔

تبسم : مہربانی ہے آپ کی۔

کلارک : ابھی ڈاکٹر صاحب نے بتلایا کہ آپ کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔

تبسم : (طنزیہ مسکرا کر) اگر ڈاکٹر ہر شخص کو مریض نہ سمجھے تو اس کا پیشہ کیسے چلے۔
(کلارک قہقہہ مار کر ہنستا ہے) کہیے مسز کلارک کا مزاج کیسا ہے۔

کلارک : اچھا نہیں ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ اپنا مینٹل بیلنس لوز کر رہی ہے۔

تبسم : مین ٹل بیلنس لوز کر رہی ہے! از اٹ سو؟

کلارک : جی ہاں۔ رات اس کی حرکتیں بڑی ابنارمل تھیں۔

تبسم : دیٹ از ویری بیڈ۔

کلارک : آف کورس ویری بیڈ۔ مسز نقوی میں بہت پریشان ہوں۔

تبسم : ابھی کسی مین ٹل اکسپرٹ کو دکھلا دیجیے کہیں صورت حال زیادہ خراب نہ ہو جائے۔

کلارک : ڈاکٹر نقوی کا خیال ہے کہ فورڈ ابارشن سے اس کی نفسیات ڈسٹرب ہوگئی ہیں۔ آہستہ آہستہ اس واقعہ کو بھول کر نارمل کنڈیشن میں آجائے گی۔

تبسم : مسٹر نقوی کا بھی خیال درست ہوگا مگر کسی ایکسپرٹ کو دکھلانے میں کیا حرج ہے۔

کلارک : حرج تو کوئی نہیں۔ میں ڈاکٹر لطفی کو کنسلٹ کروں گا۔

تبسم : جی ہاں ضرور۔ بلکہ میرا خیال ہے سائیکو انالیسس کرالیا جائے۔

کلارک : (سوچتے ہوئے) مسز نقوی اس کے لیے اسے کسی بڑے شہر میں لے جانا پڑے گا اور کم از کم یہ میرے بس کا نہیں۔ اس علاج معالجے میں بری طرح قرض کے نیچے دب گیا ہوں۔ (تبسم خاموش رہتی ہے کلارک چند سیکنڈ خاموش رہ کر) ڈاکٹر صاحب کہاں ہیں۔

تبسم : ابھی ابھی مسٹر جنید کا فون آیا تھا۔

کلارک : مسٹر جنید کا فون۔ خیریت تو ہے۔

تبسم : مسز جنید شاید زینے سے گر کر بے ہوش ہوگئی ہیں۔

کلارک : مسز جنید؟

تبسم : جی ہاں۔ فون پر تو یہی بتلایا گیا تھا۔

کلارک : مسز جنید بڑی مہربان خاتون ہیں خدا رحم کرے۔ گڈو کہاں ہے۔

تبسم : ہم نے اسے ہوسٹل میں داخل کر دیا ہے۔

کلارک : ہوسٹل میں داخل کر دیا ہے! اس قدر چھوٹے بچے کو۔

تبسم : نقوی تو اس کی مخالفت کرتے رہے مگر یہ خوف پیدا ہوگیا تھا کہ وہ یہاں خوش نہیں رہ سکتا۔ (چند سیکنڈ خاموش رہ کر) مسز کلارک چلنے پھرنے کے تو قابل ہوگئی ہوں گی۔

کلارک : جی ہاں۔ اس لحاظ سے تو وہ بالکل نارمل ہے۔

تبسم : تو پھر ایک روز ہمارے یہاں لایئے نا۔

کلارک : میں نے ایک دو بار اس سے کہا مگر اس نے انکار کر دیا۔ جانے اسے یہاں آتے ہوئے کیوں خوف محسوس ہوتا ہے۔

تبسم : (ٹھنڈی سانس بھر کر) یہ گھر ہی کچھ ایسا منحوس ہے کہ خود اس کے رہنے والوں کو اس میں خوف محسوس ہوتا ہے۔

کلارک : اوہ نو مسز نقوی میرا مطلب یہ نہیں تھا بس یوں ہی وہ یہاں آتے ہوئے گھبراتی ہے۔

ملازمہ : (کمرے میں آکر) بیگم صاحبہ ڈاکٹر لطفی تشریف لائے ہیں۔

تبسم : ڈاکٹر لطفی! انھیں یہیں لے آنا۔ (ملازمہ چلی جاتی ہے۔ تبسم کلارک کی طرف دیکھ کر) لیجیے۔ ہم ابھی ڈاکٹر لطفی سے بات کیے لیتے ہیں۔

کلارک : تھینک یو مسز نقوی۔ سو کائنڈ آف یو۔

لطفی : (کمرے میں آتے ہوئے) گڈ مارننگ مسز نقوی۔

تبسم : گڈ مارننگ ڈاکٹر لطفی۔ آیئے۔ مزاج تو اچھا ہے۔

لطفی : مہربانی ہے آپ کی۔ (کلارک کی طرف دیکھتا ہے۔ کلارک کھڑا ہوتا ہے) ہلو مسٹر کلارک ہاؤ آر یو۔

کلارک : او کے۔ فائن۔

لطفی : مسز کلارک تو اب ٹھیک ہیں۔

کلارک : جی نہیں، اس کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔

لطفی : طبیعت ٹھیک نہیں ہے ڈاکٹر نقوی نے تو کہا تھا کہ اب وہ مکمل صحت یاب ہو چکی ہیں۔

کلارک : ڈاکٹر (کچھ دیر رک کر) ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنا ذہنی توازن کھو رہی ہیں۔

لطفی : ذہنی توازن کھو رہی ہے!

کلارک : جی ہاں۔ کچھ دن سے وہ بہت ہی ابنارمل حرکتیں کر رہی ہے۔ کل رات تو اس کی حرکتیں قطعی ابنارمل تھیں۔

لطفی : دیٹ از ویری بیڈ۔

تبسم : ابھی مسٹر کلارک سے اسی سلسلے میں بات ہو رہی تھی۔ ڈاکٹر لطفی میرا خیال ہے آپ معائنہ کر لیجیے۔

لطفی : شیور۔ شیور۔ ڈاکٹر نقوی کا کیا خیال ہے۔

کلارک : وہ اسے صرف نفسیاتی الجھن بتلاتے ہیں۔

لطفی : کوئی نفسیاتی الجھن ہی تو مینٹل ڈس بیلنس کی بنیاد ہوتی ہے۔ خیر آپ کسی

وقت لے آیئے میں معائنہ کرلوں گا۔

کلارک : اوکے ڈاکٹر۔ تھینک یو۔ (گھڑی دیکھ کر تبسم سے) اب مجھے اجازت دیجیے ڈاکٹر صاحب سے کہیے گا کہ میں انتظار کرتے کرتے چلا گیا۔

تبسم : اچھا خدا حافظ مگر دیکھیے مسز کلارک کا خیال رکھیے گا۔

کلارک : جی ہاں ضرور۔ ضرور۔ خدا حافظ۔

(کلارک کمرے سے چلا جاتا ہے۔ لطفی تبسم سے)

لطفی : نقوی کہاں ہے۔

تبسم : مسٹر جنید کے یہاں گئے ہیں۔

لطفی : مسٹر جنید کے یہاں! اس قدر سویرے۔

تبسم : ابھی فون آیا تھا کہ مسز جنید زینے سے گر کر بے ہوش ہوگئی ہیں۔

لطفی : خدا رحم فرمائے۔ کل ہی تو بے چاری نے اپنی سال گرہ منائی ہے۔ اور ہاں کل آپ برتھ ڈے پارٹی میں کیوں نہیں آئیں۔

تبسم : کہیں آنا جانا اچھا نہیں معلوم ہوتا۔

لطفی : (مسکرا کر) آپ تو پڑھی لکھی ہیں ایسی فضول باتوں پر اعتقاد رکھتی ہیں۔

تبسم : (کسی قدر شرما کر) نہیں ایسی بات نہیں ہے، بلکہ حقیقتاً اب مجھے ایسے ہنگاموں سے نفرت ہوگئی ہے جو اظہار شان و شوکت کے لیے کیے جاتے ہیں۔

لطفی : (ہنس کر) آپ بھی خوب ہیں۔ انسان کماتا ہی اس لیے ہے کہ وہ ایک خوش گوار زندگی گزارے۔ دماغی سکون اور جسمانی راحت حاصل ہو۔

تبسم : مگر ڈاکٹر لطفی۔ اس خوشی کو حاصل کرنے کے لیے انسان کو کتنی نیچی سطح پر آنا پڑتا ہے۔ کتنوں کی معصوم تمناؤں اور خوشیوں کا خون کرنا پڑتا ہے۔ (لطفی خاموش رہتا ہے۔ تبسم کچھ دیر بعد) امینہ۔ امینہ۔ ملازمہ کمرے میں آتی ہے) چائے لاؤ۔

ملازمہ : بہت اچھا۔

41 لطفی : میں ابھی پی کر آ رہا ہوں۔ اب تکلیف نہ کیجیے۔

تبسم : (مسکرا کر) ایک مرتبہ اور سہی۔ (ملازمہ سے) جاؤ ذرا جلدی لے آؤ (ملازمہ چلی جاتی ہے۔ تبسم کچھ دیر خاموش رہ کر) ڈاکٹر لطفی۔ میرا ایک کام کر دیجیے۔ بڑی مہربانی ہوگی۔

لطفی : فرمایئے۔ مہربانی کی کیا بات ہے۔

تبسم : میں چند مہینوں کے لیے اس گھر کے ماحول سے دور ہو جانا چاہتی ہوں، آپ مسٹر نقوی کو تیار کر لیجیے۔

لطفی : حیرت سے) کیوں۔

تبسم : جانے کیوں اس گھر کے ماحول میں میرا دم گھٹ رہا ہے۔ (نظریں نیچی کرے) ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میں اس گھر میں ایک اور بچہ کی ماں نہ بن سکوں گی۔

لطفی : (تبسم کا چہرہ غور سے دیکھ کر) نہیں نہیں مسز نقوی۔ ایسی بات نہیں ہے آپ صحت مند ہیں۔ یہاں آپ کی دیکھ بھال اچھی طرح ہو رہی ہے اور ہو سکتی ہے آپ کو ہر قسم کی میڈیکل نے سے لیٹیز مل سکتی ہیں۔

تبسم : یہ تو سب ٹھیک ہے مگر۔ (لطفی سوالیہ نظروں سے تبسم کو دیکھتا ہے۔ تبسم کچھ دیر خاموش رہ کر) مجھے دن رات ایسا محسوس ہوتا ہے کہ مسز کلارک کا بچہ اس گھر کے ہر کونے سے نکل کر مجھے گھور رہا ہے۔

لطفی : (ہنس کر) یہ محض آپ کا وہم ہے۔ اس پیریڈ میں اکثر عورتیں ایسے وہموں کا شکار ہو جاتی ہیں۔

تبسم : میں بھی اسے وہم ہی سمجھتی ہوں۔ مگر ڈاکٹر لطفی جب میں بستر پر لیٹتی ہوں تو مجھے ہزاروں بچے نظر آتے ہیں جو اس گھر کی ہر قیمتی چیز سے نکل پڑتے ہیں اور مجھے دیکھ کر بسورنے لگتے ہیں۔ (آنکھوں میں آنسو بھر کر) خدا کے لیے آپ مسٹر نقوی کو راضی کر لیجیے کہ وہ چند مہینوں کے لیے مجھے باہر بھیج دیں

آپ کا بڑا احسان ہوگا۔

لطفی : میں نقوی کو مجبور کروں گا آپ مطمئن رہیے۔ (ملازمہ چائے میز پر رکھ کر چلی جاتی ہے۔ تبسم آنسو پونچھ کر چائے بنانے لگتی ہے۔ لطفی سوچتے ہوئے) مسز نقوی میری سمجھ میں نہیں آتا کہ مسز کلارک نے اباشن کیوں کرایا۔ یہ تو پہلا اشو تھا۔

تبسم : جی ہاں۔ (چائے کی پیالی لطفی کو دیتے ہوئے) کہتے ہیں کہ یہ ان کا مشترکہ بچہ نہیں تھا۔

لطفی : (حیرت سے) مشترکہ بچہ نہیں تھا۔ (سوچتے ہوئے) مگر مسز کلارک ایسی عورت تو نہیں ہے۔

تبسم : جی ہاں مگر اس کو ہر اس چیز کی تمنا تھی جو وہ حاصل نہیں کر سکتی تھی۔ (ٹھنڈی سانس بھر کر) یہاں ہر روز ایسی ہی عورتیں آتی رہتی ہیں جو معصوم پیدا ہونے والی روحوں کو پیدا ہی نہیں ہونے دیتیں۔ اسی نے میرے لیے اس گھر میں گھٹن پیدا کردی ہے۔

(لطفی خاموش ہوکر چائے پینے لگتا ہے۔ کچھ دیر بعد نقوی کمرے میں آکر)

نقوی : ہلو لطفی۔

لطفی : ہلو۔ مسز جنید کیسی ہیں۔

نقوی : ہوش میں آگئی ہیں مگر سر سے کافی خون نکل جانے سے کمزوری ہے۔

لطفی : مگر یہ حادثہ ہوا کیسے۔

نقوی : مکان کے بالائی حصہ میں جارہی تھیں کہ پیر پھسل گیا اور گر پڑیں (مسکرا کر) ان سے زیادہ مسٹر جنید پریشان نظر آرہے تھے۔

لطفی : مریض سے زیادہ تیمار دار پریشان ہوہی جاتا ہے۔ (ہنس کر) اور مسٹر جنید پر تو ویسے ہی وحشت کے دورے پڑتے ہیں۔

نقوی : (تبسم کی طرف دیکھ کر) آپ مزاج پرسی کے لیے چلی جانا۔

تبسم :ہاں۔ میں شام کو جاؤں گی اور کل پارٹی میں نہ جانے کی معذرت بھی کرلوں گی۔

لطفی : لیکن آج رات تو میں ڈنر پر مدعو کرنے آیا تھا۔

نقوی : (ہنس کر) یہ حاتم کی قبر پر لات کیوں ماری جارہی ہے۔

لطفی : تاکہ اس کی روح بیدار رہے اور دوسرے لوگوں کو بھی اس سے سبق ملے۔ (نقوی قہقہہ مار کر ہنستا ہے۔ تبسم صرف مسکراتی ہے۔ لطفی، تبسم کو دیکھ کر) دیکھیے کوئی بہانہ نہیں چلے گا۔

تبسم : ڈاکٹر لطفی۔ سچ سچ میری طبیعت خراب رہتی ہے اور کہیں آنے جانے میں تکلیف ہوتی ہے۔

لطفی : آپ تبدیلی، آب و ہوا کے لیے کچھ دن کے لیے باہر چلی جائیے (نقوی کی طرف دیکھ کر) ڈاکٹر! بہتر ہے کہ مسز نقوی کو چند دن کے لیے ان کے میکے بھیج دو۔

نقوی : پر گنین سی پیریڈ ہے لطفی۔ یہاں ہر قسم کی میڈیکل سے فیسلٹیز مل سکتی ہیں سوچتا ہوں کہ۔

لطفی : میڈیکل سے فیسلٹیز ہر جگہ مل سکتی ہیں۔ یہاں مسز نقوی ذہنی طور پر ڈسٹرب معلوم ہوتی ہیں۔ (تبسم کھڑی ہوتی ہے لطفی اسے دیکھ کر) ارے آپ کہاں چل دیں۔ بیٹھیے نا۔

تبسم : مجھے گڈو سے ملنے ہوسٹل جانا ہے۔ تین چار دن سے نہیں گئی ہوں۔ (کمرے سے چلی جاتی ہے)

نقوی : مسز کلارک کے ابارشن کے بعد سے تبسم بہت ڈسٹرب ہے سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا کیا جائے۔

لطفی : کچھ دن کے لیے انھیں میکے بھیج دو۔ وہاں ان کے دماغ سے یہ خیال نکل جائے گا (کچھ دیر خاموش رہ کر) مسٹر کلارک نے ابارشن کیوں کرایا یہ سمجھ میں نہیں آتا۔ یہ تو اس کا پہلا اشو تھا۔

نقوی : تمھیں معلوم ہے کہ کلارک رشوت خوری کے الزام میں ماخوذ تھا اور مسز کلارک کا پرموشن کھٹائی میں ڈال دیا گیا تھا۔

لطفی : تمھارا مطلب ہے کہ۔

نقوی : ہاں رشوت کے طور پر اس نے مسٹر رائے کو اپنا وجود پیش کیا تھا۔

لطفی : مسٹر رائے! تمھارا مطلب ہے کہ۔

نقوی : ہاں ہاں ان دونوں کا باس۔

لطفی : مگر یہ ممکن نہیں ہے۔ مسٹر رائے بچہ پیدا نہیں کرسکتا، ایک سال پہلے میں اس کا آپریشن کر چکا ہوں۔ اس کے چھ بچے ہیں۔

نقوی : تو گویا مسز کلارک کو محض شک تھا۔

لطفی : قطعی۔ بچہ ان دونوں میاں بیوی کا مشترکہ تھا۔ (کچھ دیر خاموش رہ کر) خیر بہرحال تم مسز نقوی کو چند دن کے لیے میکے بھیج دو۔

نقوی : اگر صرف یہی سوال ہوتا تو مجھے کوئی اعتراض نہ تھا، مگر سوال یہ ہے کہ وہ مجھ سے نفرت کرنے لگی ہے۔

لطفی : پرگنین سی پیریڈ میں ان کی نفسیاتی الجھن خطرناک ہے۔

نقوی : اس کا خیال ہے کہ میں نے چند پیسوں کے لالچ میں ایک کرائسٹ کو صلیب پر لٹکا دیا ہے (مسکرا کر) اور اس کے ہونے والے بچہ کو بھی مار ڈالوں گا۔

لطفی : یہ خیال بہت خطرناک ہے۔ چند ماہ کے لیے میکے بھیج دینے میں کیا اعتراض ہے۔

نقوی : اعتراض تو کوئی نہیں۔ مگر وہاں وہ خوش نہ رہ سکے گی۔

لطفی : کیوں۔

نقوی : اس لیے کہ گڈو یہاں رہے گا تو وہاں اسے اس کا خیال ستاتا رہے گا۔

لطفی : گڈو کو بھی اس کے ساتھ بھیجا جاسکتا ہے۔

نقوی : (مسکرا کر) گڈو کو بھی لڑ بھڑ کر اس نے ہوسٹل میں داخل کرایا ہے اس کا خیال تھا کہ میں اسے بھی مار ڈالوں گا وہ مجھے قاتل سمجھنے لگی ہے۔ تم اسے سمجھانے

کی کوشش کرو۔

لطفی : خوف کے ماحول میں رہنا مناسب نہیں ہے۔ اس سے مہلک نتائج برآمد ہوسکتے ہیں۔

نقوی : مگر یہ خوف محض فرضی ہے اس کی کوئی حقیقت نہیں۔

لطفی : اکثر خوف فرضی ہوتے ہیں جن کا حقیقت سے کوئی واسطہ نہیں ہوتا۔ لیکن وہ بڑی الجھنیں پیدا کرتے ہیں۔ (کچھ دیر خاموش رہ کر) میری سمجھ میں نہیں آتا کہ تم اسے میکے نہ بھیجنے پر کیوں بضد ہو۔

نقوی : میں اس کے میکے کے ماحول کو اس کے لیے اچھا نہیں سمجھتا۔

لطفی : یہ تو بچوں کی سی ضد ہے۔ (تبسم لباس تبدیل کیے ہوئے کمرے میں آتی ہے لطفی اسے دیکھ کر) ارے بہت جلدی تیاری کرلی آپ نے۔

نقوی : (مسکرا کر) گڈو کے پاس جانے کے لیے یہ اسی قدر پھرتی کا مظاہرہ کرتی ہیں۔

لطفی : (تبسم سے) آج ڈنر پر آرہی ہیں۔

تبسم : دیکھیے اگر طبیعت——

لطفی : (بات کاٹ کر) بہانہ نہیں چلے گا۔ ہماری خالہ زاد بہن آئی ہوئی ہیں (مسکرا کر) خدا کی خاص مخلوق ہیں۔ ان سے مل کر آپ بہت خوش ہوں گے۔

(کلارک گھبرایا ہوا کمرے میں آتا ہے۔ نقوی اسے دیکھ کر)

نقوی : کیا بات ہے مسٹر کلارک۔

کلارک : ڈاکٹر صاحب—— (اپنی گھبراہٹ پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے) اس نے خودکشی کرلی۔

نقوی : (گھبرا کر) خودکشی کرلی! کس نے؟ یعنی آپ کا مطلب ہے کہ۔

کلارک : جی ہاں میری وائف نے ڈاکٹر صاحب۔

تبسم : خودکشی۔ ایک اور قتل ایک اور قتل۔ (چکرا کر صوفے کے پاس گرپڑتی ہے۔ نقوی دوڑ کر اسے اٹھا کر صوفے پر لٹاتا ہے اور نبض پر ہاتھ رکھتا ہے اور معنی

خیز نظروں سے لطفی کو دیکھتا ہے۔ چہرے پر گھبراہٹ پیدا ہوتی ہے۔ لطفی تبسم کی نبض دیکھتا ہے اور پھر نقوی سے)

لطفی : کورامن ڈاکٹر کورامن۔ جلدی سے ڈاکٹر۔

(نقوی تیزی سے دوسرے کمرے میں جاتا ہے)

(پردہ)

ایک پہیلی

افرادِ تمثیل

(1) ہمدانی (ایک نوجوان) (2) حجاب (ہمدانی کی بیوی) (3) نظامی (ہمدانی کا دوست)
(4) نوکر اور نوکرانی

منظر

(ایک ریسٹ ہاؤس کا سادہ سا کمرہ۔ جس میں ایک پلنگ اور چند کرسیاں ہیں۔ شام کے تقریباً سات بجے ہیں۔ ہمدانی کھڑکی سے لگا کھڑا ہے۔ پاس ہی ایک کرسی پر حجاب بیٹھی ہے۔ ہمدانی مڑ کر کھڑکی سے باہر دیکھتے ہوئے)

ہمدانی : حجاب! بادل چھٹ رہے ہیں شاید اب بارش نہ ہو۔

حجاب : (کھڑی ہو کر کھڑکی کے پاس آتے ہوئے) مگر موسم یکایک بدل گیا ہے سردی کا احساس ہونے لگا ہے۔

ہمدانی : تم شال اوڑھ لو۔ یہاں کے موسم کا کوئی ٹھکانا نہیں ہے۔

حجاب : (کھڑکی سے باہر دیکھتے ہوئے) اگر ایسا معلوم ہوتا تو گرم کپڑے ساتھ لے آتے۔

ہمدانی : اب یہ کسے معلوم تھا۔ صرف چار دن کی چھٹیاں گزارنا تھیں۔ نوکر کہہ رہا تھا کہ ایسا موسم صرف چند گھنٹے رہتا ہے۔ بادلوں کے ساتھ سرد ہوائیں آتی ہیں اور بادل چھٹتے ہی موسم خوشگوار ہو جاتا ہے۔

حجاب : کہیں سارا پروگرام ہی اَپ سیٹ نہ ہو جائے۔ آپ نے نظامی صاحب کو بلاوجہ شہر بھیجا اگر بارش ہو گئی تو انھیں بڑی تکلیف ہو گی۔

ہمدانی : یہ کسے خیال تھا کہ موسم یوں ایک دم بدل جائے گا۔ (مسکرا کر) شکار کے لیے تو وہ جہنم میں بھی جانے کو تیار ہو جاتا ہے۔

حجاب : (ہنس کر) جی ہاں شکار کا نام سن کر تو وہ ایسے بے چین ہو جاتے ہیں جیسے انھیں دنیا جہان کی دولت ملنے والی ہو۔

ہمدانی : یہ جو سامنے پہاڑی ہے اس کے پیچھے ایک عمدہ جنگل ہے اس میں ہر قسم کا شکار ہے (مسکرا کر) نظامی تو ایسی جگہ دیکھ کر مچل جائے گا۔

نوکر : (کمرے میں آ کر) صاحب! چائے تیار ہے۔

ہمدانی : یہیں لے آؤ اور کھانا کس وقت مل جائے گا۔

نوکر : جس وقت آپ فرمائیں۔ (حجاب کو کھڑکی کے پاس کھڑا ہوا دیکھ کر) میم صاحب یوں کھڑکی کے پاس نہ کھڑی ہوئیے یہ ہوائیں زکام سے بھری ہوئی ہیں۔

حجاب : (مسکرا کر) بھئی یہاں کا موسم بھی عجیب ہے۔

ہمدانی : (نوکر سے) تمھارا کیا خیال ہے۔ بارش ہو گی؟

نوکر : (کھڑکی کے پاس آ کر باہر کی طرف دیکھتے ہوئے) صاحب بارش ضرور ہو گی۔ (انگلی سے اشارہ کر کے) ان دونوں پہاڑیوں کے بیچ سے جب بادل آتے ہیں بارش ضرور ہوتی ہے (بلند آواز سے) عزیزہ کی ماں۔ اری او عزیزہ کی ماں (ہمدانی کی طرف دیکھ کر) میں انگیٹھی میں آگ منگواتا ہوں کمرہ گرم رہے گا۔

آپ لوگ ان ہواؤں کے عادی نہیں ہیں۔ (کھڑکی بند کرتے ہوئے)

کھڑکیاں بند ہی رکھیے گا۔

ہمدانی : اگر بارش ہوجائے تو موسم کتنے دنوں میں صاف ہوجاتا ہے۔

نوکر : یہ تو بارش پر ہے (کھڑکی کے شیشے میں سے جھانکتے ہوئے) مگر بادل کچھ زیادہ گھنے اور کالے ہیں۔ (ایک عورت انگیٹھی میں آگ لیے ہوئے آتی ہے) واں کرسیوں کے پاس رکھ دے۔ (عورت انگیٹھی رکھ کر چلی جاتی ہے۔ نوکر بھی دروازے کی طرف جاتے ہوئے) میں چائے لاتا ہوں۔

(نوکر کمرے سے چلا جاتا ہے۔ ہمدانی اور حجاب کرسیوں پر بیٹھ کر آگ تاپتے ہیں۔ حجاب کچھ دیر بعد)

حجاب : اگر بارش ہوگئی تو نظامی صاحب پریشان ہوجائیں گے۔

ہمدانی : (سوچتے ہوئے) اگر مسز نظامی صبح احمد پور نہ جاتیں تو اچھا تھا۔ بارش ہوگئی تو وہاں پھنس کر رہ جائیں گی۔

حجاب : اور پروگرام میں بے لطفی پیدا ہوگی۔ ان کی باتیں کس قدر دلچسپ ہوتی ہیں۔ نظامی صاحب سے غیر معمولی محبت کرتی ہیں۔

ہمدانی : (مسکرا کر) اور نظامی بھی ان کے بغیر ایک دن نہیں رہ سکتا۔ وہ تو جانے کس مجبوری میں کہ دیا کہ چلی جاؤ۔

حجاب : سوچا ہوگا اپنے چچا سے مل لیں گی۔ (اپنے گلے میں پڑے ہوئے نکلس کے موتیوں سے کھیلتے ہوئے) کہہ رہیں تھیں ان سے کئی برس سے نہیں ملیں۔

(ہمدانی حجاب کو نکلس کے موتیوں سے کھیلتے ہوئے دیکھ کر مسکراتے ہوئے)

ہمدانی : آپ کو یہ نکلس سجانا کیوں اس قدر عزیز ہے (ہنس کر) اب تو یہ فیشن کی حد سے بھی گزر گیا ہے۔

حجاب : اچھا میری ایک پہیلی بتلایئے۔

ہمدانی : (ہنس کر) عورت خود ایک پہیلی ہے اس کی پہلی سننے سے پہلے ہی ہم ہار مان لیتے ہیں۔ (دونوں ہنستے ہیں۔ نوکر چائے لاکر میز پر رکھتا ہے اور جانے کے

لیے مڑتا ہے، ہمدانی اسے دیکھ کر) نظامی صاحب تو اب شہر پہنچنے ہی والے ہوں گے۔

نوکر : جی ہاں۔ اگر ندی پار کر لی ہو ورنہ مشکل ہے۔

ہمدانی : ندی! کیا راستے میں ندی بھی ہے۔

نوکر : جی ہاں جس راستے سے وہ گئے ہیں اس میں ندی ملتی ہے اور ناؤ سے پار کرنا پڑتا ہے۔ جب ناؤ کنارے پر نہیں ملتی تو چار چار گھنٹے انتظار کرنا پڑتا ہے۔ (کھڑکی کے شیشے سے باہر دیکھ کر) بادل گھرے ہوئے ہیں ناؤ شاید ہی ملے۔

ہمدانی : کیوں؟

نوکر : پہاڑی ندی ہے ایک دم تیزی سے باڑھ آتی ہے کہ اچھے اچھے ملاحوں کی ہمت پست ہوجاتی ہے اور ایسے گھنے بادل دیکھ کر وہ ناؤ ندی میں نہیں ڈالتے۔

ہمدانی : (سوچتے ہوئے حجاب کی طرف دیکھ کر) پھر تو شاید نظامی واپس آجائے۔

حجاب : واپس آجائیں تو اچھا ہے ورنہ بلا وجہ بوریت ہوگی۔

ہمدانی : (سوچتے ہوئے) مسز نظامی کو واپس لانے کو میں چلا جاؤں اگر وہ وہاں پھسل گئیں تو نظامی بور ہوگا اور سارا مزہ کرکرا ہوجائے گا۔ (نوکر کی طرف دیکھ کر) احمد پور کتنی دیر میں پہنچا جاسکتا ہے۔

نوکر : راستہ 40-45 منٹ کا ہے مگر جنگلی راستہ ہے اور ایک پہاڑی نالا بھی ہے۔

ہمدانی : کیا اسے پار کرنا مشکل ہے۔

نوکر : جی نہیں۔ مگر جنگل۔

ہمدانی : میں بندوق لے چلوں گا۔ (نوکر کی طرف دیکھ کر) گویا دو گھنٹے میں واپس آسکتے ہیں (گھڑی دیکھ کر) اس وقت سات بجے ہیں۔ جو ساڑھے نو تک واپس آسکتے ہیں۔

نوکر : احمد پور میں کس کے گھر جانا ہے۔

ہمدانی : رفیق میاں کے یہاں۔

نوکر : رفیق میاں کے یہاں۔ واپسی میں تو وہ گھوڑوں کا انتظام کردیں گے۔ ڈیڑھ گھنٹے سے کم میں واپس آجائیں گے۔

ہمدانی : یہ اور بھی اچھا ہے۔

حجاب : ارے۔

(ہمدانی حجاب کو دیکھتا ہے جو جھکی فرش پر بکھرے ہوئے موتی چن رہی ہے)

ہمدانی : کیا ہوا۔

حجاب : نکلس ٹوٹ گیا۔

ہمدانی : (ہنس کر) چلیے اچھا ہوا کہ پنشن سے پہلے ہی انتقال کرگیا۔ کم ازکم اس سے نجات تو ملی۔ اب آپ کسی معقول نکلس کو پہنا کریں گی۔

حجاب : مگر ادھر — دیکھیے ایک موتی آپ کے پیر کے نیچے ہے۔

(ہمدانی جھک کر موتی اٹھا کر حجاب کو دیکھتے ہوئے)

ہمدانی : (مسکرا کر) آخر آپ کو اس نکلس سے اس قدر محبت کیوں ہے۔

حجاب : (چند سیکنڈ خاموش رہتی ہے پھر مسکرا کر) تحفہ کی چیز ہمیشہ بیش قیمت ہوتی ہے۔

ہمدانی : تحفہ! (مسکرا کر) کس کا تحفہ؟

حجاب : (چند سیکنڈ رک کر) نظامی صاحب کا۔

ہمدانی : نظامی کا!

حجاب : جی ہاں جب ہم کالج میں پڑھتے تھے تو انھوں نے میری سال گرہ پر دیا تھا —

ہمدانی : (ہنس کر) اور جب ہی آپ ایسے موقعوں پر ضرور پہنتی ہیں جب وہ ساتھ ہوتا ہے۔

حجاب : جی ہاں۔ میں نے محسوس کیا ہے کہ وہ اسے میرے گلے میں دیکھ کر خوش ہوتے ہیں۔

ہمدانی : (شرارت سے مسکرا کر) بربنائے خلوص تھا یا —

حجاب : (مسکرا کر) دیکھیے چائے ٹھنڈی ہورہی ہے۔

(ہمدانی مسکرا کر خاموش ہو جاتا ہے اور چائے پینے لگتا ہے پھر نوکر کی طرف دیکھ کر)

ہمدانی : اگر کچھ دیر بارش ہونے کی امید نہ ہو تو ہم احمد پور چلیں۔

نوکر : (لالٹین جلاتے ہوئے کھڑکی سے باہر دیکھتے ہوئے) صاحب کہا تو نہیں جاسکتا۔ لیکن ضروری ہو تو چلیے۔ کسی نہ کسی طرح واپس آجائیں گے۔

ہمدانی : (حجاب کی طرف دیکھ کر) کیوں چلا جاؤں۔ دس بجے تک لوٹ آؤں گا۔ پھر ساتھ کھانا کھائیں گے۔

حجاب : جی ہاں چلے جایئے۔ دلچسپی کے لیے مسز نظامی کا ہونا ضروری ہے۔

ہمدانی : (نوکر سے) جاؤ تم تیار ہو کر آؤ۔ بھئی میں نے یہاں کے راستے نہیں دیکھے ہیں۔

نوکر : یہ پہاڑ کے نیچے نیچے جو پگڈنڈی جاتی ہے احمد پور گئی ہے۔ رات کا وقت ہے میں آپ کے ساتھ چلتا ہوں۔ (دروازے کی طرف جاتے ہوئے) میں ابھی آتا ہوں کمبل اوڑھ لوں۔

(نوکر چلا جاتا ہے۔ دونوں خاموشی سے چائے پینے لگتے ہیں۔ ہمدانی مسکرا کر حجاب سے)

ہمدانی : آپ کو تنہائی میں ڈر تو نہیں لگے گا۔

حجاب : کیوں؟ ڈر کی کیا بات ہے۔

ہمدانی : (شرارت سے) اس علاقے کے متعلق عجیب عجیب کہانیاں مشہور ہیں۔

حجاب : کیسی؟

ہمدانی : یہی بھوت پریت کی —

حجاب : پھر تو آپ بھی نہ جایئے (ہنس کر) راستے میں چڑیلیں بھی مل سکتی ہیں۔

(دونوں قہقہے مار کر ہنستے ہیں۔ نوکر کمرے میں آکر)

نوکر : چلیے صاحب۔ جلدی ہی نکل چلیں تو اچھا ہے۔

ہمدانی : (کھڑا ہو کر) چلو۔ (بندوق اٹھا کر حجاب سے) ہم زیادہ سے زیادہ دو گھنٹے

میں واپس آجائیں گے۔

حجاب : بہت اچھا۔ مگر دیکھیے مسز نظامی کو ضرور ساتھ لائیے گا۔

ہمدانی : ہاں۔ اور جاکس لیے رہا ہوں۔

نوکر : میں نے عزیزہ کی ماں سے کہہ دیا ہے وہ آپ کے پاس آکر بیٹھ جائے گی (ہنس کر) ذرا باتونی ہے اس کی بات کا برا نہ ماننا میم صاحب۔

حجاب : (کھڑی ہوکر) نہیں نہیں۔ (مسکرا کر) ایسی عورتیں دلچسپ ہوتی ہیں۔ (کھڑکی کے پاس جاکر کھڑی ہوجاتی ہے۔ نوکر اسے دیکھ کر)

نوکر : کھڑکی بند رہنے دیجیے۔ (ہمدانی کی طرف دیکھ کر) آپ مفلر گلے اور سر پر لپیٹ لیجیے ٹارچ رکھ لی آپ نے۔

ہمدانی : ارے ہاں ٹارچ بھی تو لینا ہے (حجاب کی طرف دیکھ کر) ٹارچ کہاں ہے— (حجاب، کونے میں رکھی میز پر سے ٹارچ اٹھا کر دیکھتی ہے)۔ اچھا۔ ابھی دو گھنٹے میں واپس آتے ہیں۔

حجاب : بہت اچھا۔

(ہمدانی اور نوکر کمرے سے چلے جاتے ہیں۔ حجاب کھڑکی کے شیشوں سے باہر دیکھنے کی کوشش کرتی ہے۔ کچھ دیر وہاں کھڑی رہتی ہے پھر آکر کرسی پر بیٹھ جاتی ہے اور سامنے میز پر رکھے ہوئے موتیوں کو دیکھتی ہے پھر انھیں اٹھا کر گنتی ہے پھر نیچے کچھ تلاش کرنے لگتی ہے کہ نوکرانی کمرے میں آکر)

نوکرانی : کیا ڈھونڈ رہی ہو میم صاحب۔

حجاب : (چونک کر) کون ہے۔ (نوکرانی کو دیکھ کر مسکراتے ہوئے) ارے عزیزہ کی ماں (فرش کو غور سے دیکھتے ہوئے) ایک موتی ہے دیکھنا یہیں کہیں ہوگا— (نوکرانی بھی جھک کر موتی تلاش کرنے لگتی ہے)۔

نوکرانی : کب گرا تھا۔

حجاب : ابھی ابھی گرا ہے۔ ارے وہ دیکھو کرسی کے نیچے ہے۔ (نوکرانی موتی اٹھا

کرحجاب کو دیتی ہے۔ حجاب موتی لیتے ہوئے) بیٹھو۔ (نوکرانی فرش پر بیٹھ جاتی ہے۔ حجاب کچھ دیر بعد) عزیزہ کی ماں۔ تم کتنے دنوں سے یہاں ہو۔

نوکرانی : دنوں کی کیا بات میم صاحب۔ زندگی ہی یہاں گزر گئی۔

حجاب : (مسکرا کر) اچھا۔

نوکرانی : جی ہاں۔ اب تو یہ جگہ پھر غنیمت ہے۔ جب میں بیاہ کر آئی تھی تو چاروں طرف بھوت پریت ہی رہتے تھے۔

حجاب : (ہنس کر) سچ سچ۔

نوکرانی : اب تو لوگ ایسی باتوں کا مذاق اڑاتے ہیں مگر میں نے اپنی آنکھوں سے یہ جو سامنے پیپل کا پیڑ ہے اس پر ایک عورت کو بیٹھے دیکھا ہے۔

حجاب : اچھا۔

نوکرانی : جی ہاں اور ایک انگریز نے تو اسی کمرے میں اپنی عورت کو گولی مار دی تھی۔

حجاب : گولی مار دی تھی! کیوں؟

نوکرانی : کیا پتا میم صاحب۔ میں نے تو بس سنا تھا کہ کسی اور صاحب کے ساتھ شکار کو چلی گئی تھی بس واپس آنے پر اس کے گھر والے نے گولی مار دی۔ دو دن تک لاش پڑی رہی پولس انگریز کے یہاں آئی۔ تحقیقات ہوئی تب لاش اٹھی۔ میں تو دو سال تک اس کمرے میں نہیں آئی۔ اب بھی آتے ہوئے۔ ڈر سا لگتا ہے۔

حجاب : ڈرنے کی کون سی بات ہے۔

نوکرانی : میم صاحب! ان موٹے فرنگیوں کا کیا بھروسہ۔ یہ جو سامنے پہاڑی ہے نا اس کے پیچھے ایک فرنگی کی قبر ہے اکیلے راہ گیروں سے دودھ ڈبل روٹی مانگتا ہے۔ (بادل غیر معمولی طور پر زور سے گرجتے ہیں اور بجلی چمکتی ہے۔ حجاب کسی قدر سہمے ہوئے لہجے میں)

حجاب : شاید بارش شروع ہوگئی۔

نوکرانی : (کھڑکی کے شیشوں میں سے باہر دیکھتے ہوئے نہیں مگر بارش ہوگی ضرور۔

حجاب : (کچھ دیر خاموش رہ کر) تمھارے کتنے بچے ہیں۔

نوکرانی : بس اللہ کا نام ایک بچی ہے میم صاحب۔ اس کے ہاتھ پیلے کردیے ہیں تو سر ہلکا سا لگتا ہے۔ اپنے گھر خوش ہے۔ سب سید صاحب کی برکت ہے۔

حجاب : کون سید صاحب۔

نوکرانی : احاطے میں ان کی قبر ہے۔ ہر جمعرات کو ان کی قبر پر کچھ خوشبو کردیتی ہوں۔

حجاب : اچھا۔ یہاں کسی سید صاحب کی قبر بھی ہے۔

نوکرانی : جی ہاں پاس ہی ہے۔ وہ احاطے کے پاس چنبیلی کا درخت ہے بس اسی کے نیچے ہے۔ مجھ سے خواب میں کہا تھا کہ مجھ پر سایہ کردے۔ تب ہی میں نے وہ چنبیلی لگائی تھی۔

(بادل زور سے گرجتے ہیں۔ بجلی چمکتی ہے۔ حجاب سہمی ہوئی سی بیٹھی رہتی ہے۔ دھیرے دھیرے بارش شروع ہوجاتی ہے۔ حجاب کھڑکی کے شیشے سے باہر دیکھتے ہوئے)

حجاب : اب تو بارش بھی شروع ہوگئی۔ (نوکرانی خاموش رہتی ہے۔ بارش کا زور تیز ہوتا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ حجاب کچھ دیر خاموش رہ کر) کل ہم نے آس پاس قبریں ہی قبریں دیکھی تھیں۔

نوکرانی : اب تو مٹ مٹا گئی ہیں۔ پہلے تو پورا علاقہ قبروں سے پٹا پڑا تھا۔ کہتے ہیں۔ انگریزوں سے یہاں کوئی لڑائی ہوئی تھی انھی لوگوں کی قبریں تھیں۔ پہلے تو ادھر آتے ہوئے بھی لوگ ڈرتے تھے (کھڑی ہوکر) میں ابھی آتی ہوں میم صاحب!

حجاب : (کسی قدر گھبرا کر) کہاں جارہی ہو۔

نوکرانی : ذرا بستر لپیٹ آؤں۔ چھت میں سے پانی چوتا ہے تو سارا بستر ستیاناس ہوجاتا ہے (نوکرانی کمرے سے چلی جاتی ہے۔ حجاب کے چہرے سے گھبراہٹ اور خوف ظاہر ہوتا ہے۔ بارش تیز ہوجاتی ہے۔ بادل کی گرج اور

بجلی کی چمک بڑھ جاتی ہے۔ کچھ دیر بعد برآمدے میں کسی کے قدموں کی آواز۔ کچھ دیر قدموں کی آواز پر حجاب کان لگاتی ہے پھر گھبرا کر)

حجاب : کون ہے۔ (کوئی جواب نہیں ملتا۔ قدموں کی آواز رک جاتی ہے) کون ہے؟ (پھر قدموں کی آواز) کون ہے۔ (گھبرا کر کھڑی ہو جاتی ہے اور لالٹین کی لو بڑھاتی ہے۔ نظامی کمرے میں آتا ہے۔ حجاب اسے دیکھ کر اطمینان کی سانس لے کر) نظامی صاحب آپ نے تو ڈرا دیا۔

نظامی : (مسکرا کر) کیوں۔ میں آپ سے دودھ ڈبل روٹی مانگنے تو نہیں آیا ہوں۔

حجاب : (ہنس کر) آپ بھی اس انگریز کے بارے میں جانتے ہیں۔

نظامی : وہ تو اس علاقے کا مشہور کردار ہے۔

حجاب : آپ شہر نہیں گئے۔

نظامی : میں ندی پار نہ کرسکا اور پھر ان بادلوں کی وجہ سے واپس آجانا پڑا۔ ہمدانی کہاں ہے۔

حجاب : احمد پور گئے ہیں۔

نظامی : احمد پور۔ کیوں؟

حجاب : آپ کی بیگم صاحب کو واپس لانے۔ ہم نے سوچا اگر بارش زیادہ ہوگئی تو وہ واپس نہ آسکیں گی اور سارا مزہ کرکرا ہوجائے گا۔

نظامی : مگر یہ علاقہ دیکھا ہوا نہیں ہے۔ (کرسی پر بیٹھ کر) اسے ایسے موسم میں نہیں جانا چاہیے تھا۔

حجاب : نوکر ساتھ گیا ہے۔ ارے آپ تو بالکل بھیگ گئے ہیں۔ (انگیٹھی اٹھا کر اس کے پاس رکھ کر) کوٹ اتار دیجیے۔ میں سکھانے کو ڈال دوں۔ (نظامی کوٹ اتار کر دیتا ہے۔ حجاب اسے جھٹک کر ایک کھونٹی پر لٹکاتے ہوئے) آپ کے لیے چائے منگاؤں۔ (بلند آواز سے) عزیزہ کی ماں، ارے عزیزہ کی ماں۔

نظامی : رہنے دیجیے۔ بدن ابھی گرم ہوا جاتا ہے (دونوں ہاتھ انگیٹھی پر کرتے ہوئے) غیر معمولی سردی کا احساس ہو رہا ہے (جھک کر جوتے کے بند کھولتے ہوئے) ایسی سردی کبھی محسوس نہیں کی (نوکرانی کمرے میں آتی ہے۔ حجاب اسے دیکھ کر)

حجاب : عزیزہ کی ماں۔ ذرا جلدی سے چائے بنا لاؤ۔ صاحب بری طرح بھیگ گئے ہیں۔

نوکرانی : ابھی لاتی ہوں میم صاحب۔

(نوکرانی کمرے سے چلی جاتی ہے۔ نظامی جوتے اور موزے اتار کر الگ رکھتا ہے اور انگیٹھی کے پاس اپنے پیر کرتے ہوئے)

نظامی : ایسا معلوم ہوتا ہے بدن کا سارا خون جم گیا ہے۔ پھیکی سی مسکراہٹ سے) اپنے جسم پر بھی قابو نہیں رہا ہے۔

حجاب : آپ پلنگ پر لیٹ جائیے۔ (پلنگ پر بچھا ہوا بستر برابر کرتے ہوئے) آئیے لحاف اوڑھ لیجیے۔ میں انگیٹھی پاس رکھ دوں گی۔

نظامی : جی نہیں رہنے دیجیے۔ میں یہیں ٹھیک ہوں۔

حجاب : میں جا کر چائے بنا لاؤں۔

نظامی : عزیزہ کی ماں تو گئی ہے۔ آپ کیوں تکلیف کرتی ہیں۔

حجاب : اس میں تکلیف کی کون سی بات ہے۔

نظامی : آپ باہر نہ جائیے سردی بہت ہے۔ (میز پر رکھے ہوئے موتیوں کو دیکھ کر) یہ نکلس۔

حجاب : (پاس ہی دوسری کرسی پر بیٹھتے ہوئے) ابھی اتفاق سے ٹوٹ گیا۔ (نظامی اس انداز کے موتیوں کو دیکھتا ہے جیسے نکلس کے ٹوٹ جانے کا اسے بہت افسوس ہو) شہر جاتے ہی اسے ٹھیک کرا لوں گی۔

نظامی : (مسکرا کر) یہ کوئی ایسی قیمتی چیز تو نہیں ہے کہ۔

حجاب : (بات کاٹ کر مسکراتے ہوئے) آپ کیا جانیں کہ یہ کس قدر قیمتی ہے۔

نظامی : (پھیکی مسکراہٹ سے) یہ تو اس وقت کی ایک حماقت تھی۔ اب اسے دیکھتا ہوں تو خود پر ہنسی آتی ہے۔

حجاب : کیوں۔

(حجاب نظامی کے جوتے اٹھا کر ایک طرف رکھتی ہے)

نظامی : ارے ارے۔ آپ یہ کیا کر رہی ہیں۔

حجاب : اس میں کیا فرق پڑتا ہے (مسکرا کر) ہاں تو آپ کو ہنسی کیوں آتی ہے۔

نظامی : کہا نہیں کہ اپنی حماقت پر۔ اس وقت میں اسے کوئی بڑا قیمتی تحفہ سمجھا تھا۔

حجاب : میں تو آج بھی اسے قیمتی چیز سمجھتی ہوں۔ (نظامی غور سے حجاب کا چہرہ دیکھتا ہے۔ حجاب کی نظریں جھک جاتی ہیں۔ نوکرانی چائے لے کر آتی ہے اور سامنے میز پر رکھ دیتی ہے (حجاب نوکرانی کو دیکھ کر) اب بارش کا کیا حال ہے۔

نوکرانی : بارش کا زور بڑھ رہا ہے میم صاحب۔ بادل ایسے گھرے ہیں کہ شاید رات بھر برسیں (نظامی کا چہرہ غور سے دیکھ کر) صاحب آپ کے ہونٹ نیلے کیوں پڑ گئے ہیں۔

نظامی : بارش میں بھیگ گیا ہوں۔

(نوکرانی غور سے نظامی کو دیکھتی ہے پھر اس کی پیشانی پر ہاتھ رکھ کر)

نوکرانی : آپ کا بدن تو بالکل ٹھنڈا ہو رہا ہے۔

حجاب : ٹھنڈا۔

نوکرانی : آپ پلنگ پر لیٹ کر لحاف اوڑھ لیجیے۔ (تیزی سے دروازے کی طرف جاتے ہوئے) میں ایک اور انگیٹھی میں آگ لاتی ہوں۔

(نوکرانی تیزی سے کمرے کے باہر چلی جاتی ہے۔)

حجاب : چلیے آپ پلنگ پر لیٹ جائیے۔

نظامی : (پھیکی مسکراہٹ سے) کھڑے ہونے کی ہمت ہی نہیں ہو رہی ہے۔ ہاتھ

پاؤں بری طرح کانپ رہے ہیں۔

حجاب : آیئے۔ میں آپ کو سہارا دیتی ہوں۔

نظامی : (کھڑے ہوتے ہوئے) نہیں نہیں میں چلا جاؤں گا۔

(لڑکھڑاتا ہوا سا جا کر پلنگ پر گر پڑتا ہے۔ حجاب اس پر لحاف ڈالتی ہے)

حجاب : میں انگیٹھی پاس لا کر رکھے دیتی ہوں۔ (انگیٹھی کو پاس رکھتی ہے پھر میز پر سے چائے کی پیالی لا کر) لیجیے چائے پی لیجے۔ اس سے گرمی آئے گی۔

(نظامی کو سہارا دے کر بٹھلاتی ہے اور چائے کی پیالی اس کے ہاتھ میں دیتی ہے۔ نظامی کے ہاتھ بری طرح کانپتے ہیں اور پیالی سے چائے چھلکنے لگتی ہے۔ نظامی پیالی واپس کرتے ہوئے)

نظامی : رہنے دیجیے۔

(پیالی حجاب کے ہاتھ میں دے کر لیٹ جاتا ہے۔ حجاب پیالی میز پر رکھ کر لحاف برابر کرتے ہوئے)

حجاب : آپ تو بری طرح کانپ رہے ہیں۔

نظامی : شاید میرے بدن میں گرمی نہیں رہی ہے۔

(نوکرانی دوسری انگیٹھی لے کر آتی ہے۔ حجاب اسے دیکھ کر)

حجاب : ادھر لے آؤ۔ پلنگ کے نیچے رکھ دو۔

نوکرانی : انگیٹھی تیز ہے کہیں بستر میں آگ نہ لگ جائے۔

حجاب : اچھا دوسری طرف رکھ دو۔ (نوکرانی انگیٹھی بستر کے دوسری طرف رکھ دیتی ہے) یہاں کوئی ڈاکٹر حکیم نہیں ہے؟

نوکرانی : احمد پور ہی میں ایک وید رہتا ہے مگر۔ (کچھ دیر رک کر) اگر آپ کہیں تو میں احمد پور چلی جاؤں۔

نظامی : بارش ہو رہی ہے اور سردی زیادہ ہے عزیزہ کی ماں۔ میں ٹھیک ہو جاؤں گا۔

نوکرانی : (دروازہ کی طرف جاتے ہوئے) میں ایک دو انڈے ابال لاتی ہوں۔ ان

سے بدن میں گرمی آجائے گی۔

حجاب : عزیزہ کی ماں۔ وہ دوسرا لحاف اور اٹھا دو۔ اسے اور اوپر ڈال دوں۔ (نوکرانی دوسرا لحاف اٹھا کر دیتی ہے اور کمرے سے چلی جاتی ہے۔ لحاف نظامی کے اوپر ڈالتے ہوئے) اب کچھ سردی کم ہوئی؟

نظامی : جی نہیں۔

(نظامی کے دانت کٹ کٹانے لگتے ہیں۔ حجاب لحاف کے اندر ہاتھ ڈال کر اس کے سینہ پر پھیرتے ہوئے)

حجاب : میں سینے پر ہاتھ پھیروں شاید کچھ گرمی آجائے۔

نظامی : ارے آپ یہ کیا کر رہی ہیں۔ دیکھیے۔

حجاب : (بات کاٹ کر) حرج ہی کیا ہے۔

نظامی : (حجاب کا ہاتھ الگ کرتے ہوئے) رہنے دیجیے یہ سب غلط ہے۔ ہمدانی تو اب احمد پور پہنچ گیا ہوگا۔ کیا بجا ہے۔

حجاب : (گھڑی دیکھ کر) آٹھ بجنے والے ہیں۔

نظامی : (کپکپاتی آواز میں) کس وقت گیا تھا۔

حجاب : سات بجے۔

نظامی : پھر تو پہنچ گیا ہوگا۔ (بری طرح کانپتا ہے کچھ عجیب نظروں سے حجاب کو دیکھتا ہے) ذرا نکلس تو لاؤ۔

حجاب : (غور سے نظامی کا چہرہ دیکھ کر) کون سا نکلس؟

نظامی : نکلس کون سا ہوتا ہے۔

حجاب : (گھبرا کر) وہ تو ٹوٹ گیا۔

نظامی : کیوں ٹوٹ گیا۔ تمھیں شرم نہیں آئی توڑتے ہوئے (حجاب گھبرا جاتی ہے اور خاموش رہتی ہے۔ پھر نظامی کی پیشانی پر ہاتھ رکھتی ہے) یہ میرے سر پر پتھر کون رکھ رہا ہے (حجاب گھبرا کر ہاتھ ہٹا لیتی ہے نوکرانی انڈے لے کر آتی

ہے۔ نظامی اسے دیکھ کر) یہ کون ہے۔ مجھے دیکھ کر کیوں ہنس رہی ہے۔
اسے مجھ سے دور کردو۔ یہ مجھے مار ڈالے گی، ہٹا دو اسے۔

حجاب : (گھبرائے ہوئے انداز میں) یہ یونہی جانے کیا کیا بک رہے ہیں۔

نوکرانی : میم صاحب دماغ پر اثر ہوگیا ہے اگر جلدی بدن گرم نہیں ہوا تو۔
(حجاب نوکرانی کے ہاتھ سے انڈوں کی پلیٹ لے کر)

حجاب : عزیزہ کی ماں جلدی سے گرم پانی لاؤ۔ اس سے بدن میں گرمی پہنچائیں
(نوکرانی تیزی سے کمرے سے چلی جاتی ہے۔ حجاب انڈوں کی پلیٹ میز پر
رکھ کر ٹہلنے لگتی ہے پھر جیسے خود سے کہہ رہی ہو) بدن کو گرمی پہنچانا چاہیے۔
گرمی— (سوچتے ہوئے) بدن کی گرمی۔ (چند سیکنڈ کھڑی ہوکر سوچتی ہے
پھر دروازہ اندر سے بند کرکے) بدن کی گرمی۔
(آہستہ آہستہ پلنگ کے پاس آکر چند سیکنڈ سوچتی ہے اور پلنگ پر لیٹ کر
لحافوں کے اندر گھس جاتی ہے کچھ دیر بعد نظامی)

نظامی : میرے پاس کون ہے۔ ارے آپ۔ آپ نے یہ کیا کیا ہیٹے۔ ہیٹے۔
(اٹھ کر بیٹھنے کی کوشش کرتے ہوئے) غضب کردیا آپ نے۔

حجاب : (آہستہ سے) ابھی لیٹے رہیے۔ آپ کے بدن میں بالکل گرمی نہیں رہی
تھی۔

نظامی : جی نہیں۔ (اٹھ کر بیٹھ جاتا ہے۔ حجاب آہستہ سے لحافوں میں سے نکل آتی
ہے اور نظریں جھکا کر کرسی پر بیٹھ جاتی ہے) آپ نے اچھا نہیں کیا۔

حجاب : مگر آپ۔

نظامی : میں مر ہی تو جاتا۔ مر جانے دیا ہوتا۔ (سوچتے ہوئے) ابھی ہمدانی نہیں آیا۔
(حجاب نفی میں سر ہلاتی ہے) کہیں وہ بھی سردی نہ کھا گیا ہو۔ اور اور (حجاب
کو دیکھ کر) آپ خدا کے لیے دوسرے کمرے میں چلی جائیے۔

حجاب : مگر آپ کی طبیعت۔

نظامی : تو پھر مجھے برآمدے میں جانا پڑے گا۔

(کھڑے ہونے کی کوشش کرتا ہے)۔

حجاب : آپ لیٹ جایئے۔ میں جارہی ہوں۔

(دروازہ کھول کر باہر چلی جاتی ہے۔ بارش تیز ہوتی معلوم ہوتی ہے۔ نظامی میز پر رکھے ہوئے موتیوں کو تاکنے لگتا ہے)

(پردہ)

اُداس موڑ

پیرول پر رہائی

افرادِ تمثیل (کردار)

(1) عمران (جیل میں چودہ سال کی سزا کاٹ رہا ہے) (2) محمودہ (عمران کی بیوی)
(3) جعفر (عمران کا قریبی عزیز) (4) غنی صاحب (ایک بزرگ اور شریف شہری)

منظر

(کمرہ، جیسا عام طور پر درمیانی طبقے کے پڑھے لکھے لوگوں کا ہوتا ہے۔ محمودہ ایک ڈھیلا ڈھالا لباس جیسا بالعموم حاملہ عورتیں پہنتی ہیں پہنے کھڑی ہے۔ اس کے چہرے پر غیر معمولی فکر اور تردّد کے آثار ہیں۔ پاس ہی ایک کرسی پر جعفر بیٹھا ہے۔ محمودہ کی عمر پچیس اور تیس سال کے درمیان ہے۔ محمودہ کی آنکھیں غیر معمولی طور پر حسین ہیں۔ ڈھیلے ڈھالے لباس کے باعث جسم کی ساخت کا اندازہ لگانا مشکل ہے مگر قد نکلتا ہوا ہے جعفر بھی تقریباً اسی عمر کا ہے۔ گالوں تک لمبی لمبی قلمیں ہیں۔ شوخ رنگ کا بش شرٹ اور پتلون پہنے ہے قد کو لمبا ہی کہا جاسکتا ہے رنگ گندی ہے۔ محمودہ کچھ دیر خاموش کھڑی رہتی ہے پھر ایک صوفے پر بیٹھ کر آنکھیں بند کرلیتی ہے۔ کچھ دیر خاموش بیٹھی رہتی ہے پھر آنکھیں کھول کر

چاند کے سنگ ریزے

ہٹورنے اور خلاؤں کا سینہ چیرنے پر فخر کرنے والا انسان اندر سے خود کتنا دُکھی اور ٹوٹا پھوٹا ہے، یہی ان ڈراموں کا موضوع ہے۔ خلاؤں کی تاریکیوں میں وہ اس طرح کھوگیا ہے کہ اپنے مسائل اور اپنے غموں کو بھول گیا ہے یا پھر ان کی طرف توجہ دینے کی اسے فرصت نہیں وہ اپنے دکھوں کو اپنے کاندھوں پر اُٹھائے پھرنے سے مطمئن ہے یا پھر انھیں قسام ازل کا تحفہ سمجھ کر بطور مقدر قبول کر چکا ہے۔ ان ڈراموں کا ہر کردار سوال کرتا ہے ''کیا آپ کے پاس ہمارے درد کا درماں ہے؟'' اور کہتا ہے کہ آپ اسے ہمارا مقدر یا نفسیاتی کیفیت کہہ کر ہمیں مطمئن نہیں کرسکتے۔ یہ سب کچھ آپ کا دیا ہوا ہے۔ آپ ہی کو اس کا علاج کرنا ہوگا۔ کیا آپ کے پاس ہمارے دکھوں کا علاج ہے؟ کیا یہ انسان کی زندگی کا سب سے بڑا المیہ نہیں ہے کہ وہ اپنے دکھوں کے علاج سے گریز کرتا ہے؟

ابراہیم یوسف

14۔ نیم روڈ، امامی گیٹ

بھوپال1

11 جون 1979

فکرمندانہ انداز میں جعفر کو دیکھتی ہے مگر خاموش رہتی ہے۔ جعفر سگریٹ ایش ٹرے میں مسلتے ہوئے جیسے اس خاموشی سے اُکتا کر۔)

جعفر : کیا آج سلمان واپس آجائے گا (محمودہ اس طرح جعفر کو دیکھتی رہتی ہے جیسے بالکل خالی الذہن ہو جعفر کچھ دیر خاموش رہ کر) غنی صاحب آئے تھے؟ (محمودہ اب بھی اسی طرح دیکھتی رہتی ہے جعفر جھنجھلا کر) آخر محمودہ تمھیں ہو کیا گیا ہے۔

محمودہ : اوہ۔ ہاں۔ کچھ نہیں۔

جعفر : تو پھر یہ سب کیا ہے۔ معلوم ہوتا ہے اس دنیا میں ہی نہیں ہو۔

محمودہ : شاید تم سچ کہہ رہے ہو (سوچتے ہوئے کھڑی ہوتی ہے دوچار قدم آگے بڑھتی ہے پھر مڑ کر جعفر کے چہرے پر نظریں جما دیتی ہے۔ کچھ دیر بعد) میں سوچتی ہوں کہ اگر آج وہ آجائیں تو کیا ہو!

جعفر : (نظریں اٹھا کر اسے دیکھ کر) کون؟ عمران! (قہقہہ مارتا ہے پھر کھڑے ہو کر) کہیں قتل کے مجرم یوں آجاتے ہیں۔ تم نے خواب تو نہیں دیکھا۔

محمودہ : نہیں میں نے کوئی خواب نہیں دیکھا۔ مگر میرا دل۔

جعفر : (ہنس کر بات کاٹتے ہوئے) تم نے ضرور کوئی خواب دیکھا ہے۔ (مذاق اڑانے کے انداز میں) کہتے ہیں حاملہ عورتوں کے خواب سچے ہوتے ہیں۔ بتاؤ کیا خواب دیکھا ہے۔

محمودہ : میرا مذاق نہ اڑاؤ جعفر۔ کبھی کبھی خواب بھی حقیقت بن جاتے ہیں۔

جعفر : (ہنس کر) اگر خواب نہیں دیکھا تو تمھیں ضرور الہام ہوا ہے (سنجیدہ ہو کر) لیکن پھر بھی چودہ سال، پانچ سال میں پورے نہیں ہو جاتے۔

محمودہ : (سوچتے ہوئے) پھر بھی میرا دل کہہ رہا ہے کہ آج...

جعفر : نہ آج کچھ ہوگا نہ کل۔ (سگریٹ جلا کر) تم ذہنی طور پر سلمان کو خود سے جدا کرنے کے لیے تیار نہیں۔ اس لیے مبہم خوف نئی نئی شکلوں میں تمھارا پیچھا کر رہے ہیں۔

محمودہ : (سوچتے ہوئے) ہوسکتا ہے تمھارا خیال درست ہو۔ (کچھ دیر خاموش رہ کر) سمجھ میں نہیں آتا کہ غنی صاحب اس قدر مہربان کیوں ہیں جب کہ...

جعفر : (لقمہ دیتے ہوئے) ان کے لڑکے کا قتل عمران نے کیا ہے۔ (محمودہ اثبات میں سر ہلاتی ہے۔ جعفر اس کا چہرہ دیکھ کر) کچھ لوگ فطرتاً نیک ہوتے ہیں۔ ان پر شک نہیں کرنا چاہیے۔

محمودہ : (کچھ دیر خاموش رہ کر سوچتے ہوئے) جعفر۔ کہیں انھوں نے کوئی لمبا منصوبہ نہ بنایا ہو۔

جعفر : کیسا لمبا منصوبہ؟

محمودہ : وہ مجھ سے میرا بچہ چھین لینا چاہتے ہوں۔ شاید وہ۔

جعفر : (بات کاٹ کر) تم ضرور پاگل ہوگئی ہو۔ کہیں یوں کسی کے بچے چھینے جاتے ہیں۔

محمودہ : ہاں میں کچھ پاگل ہوگئی ہوں۔ (کچھ دیر خاموش رہ کر آنکھوں میں آنسو بھر کر) کچھ بھی ہو میں اسے خود سے جدا کرنا نہیں چاہتی۔

جعفر : غنی صاحب اسے ہوسٹل ہی میں تو داخل کرا رہے ہیں (محمودہ کے پاس آکر) تم جب چاہو اس سے مل سکتی ہو بلکہ میں تو کہتا ہوں اگر وہ اس کو اپنے ساتھ رکھنا چاہیں تو تمھیں اس میں بھی کوئی اعتراض نہ ہونا چاہیے۔

محمودہ : (جذباتی انداز میں) نہیں نہیں نہیں۔ میں جان دے دوں گی مگر ایسا نہیں ہونے دوں گی۔

جعفر : اگر تمھاری جان اس قدر سستی ہے تو دے دو۔ مگر کیا جان دینے سے مسئلے حل ہوجاتے ہیں۔

محمودہ : (سوچتے ہوئے) جعفر۔ جب وہ آئیں گے تو کیا میں ان کو منہ دکھانے کے قابل رہوں گی۔ (جعفر خاموش رہتا ہے۔ محمودہ کچھ دیر اس کا چہرہ دیکھتی رہتی ہے پھر بڑے فکرمندانہ لہجے میں) جانے کیوں ایسا محسوس ہورہا ہے جیسے آج کچھ ہونے والا ہے۔

جعفر : کچھ ہونے والا نہیں ہے سب تمھارا وہم ہے۔ آج تم لیڈی ڈاکٹر کے پاس جانے والی تھیں۔

محمودہ : بے کار ہے۔ وہ کہہ چکی ہے کہ اب کچھ نہیں ہوسکتا۔

جعفر : سب کچھ ہوسکتا ہے۔ میڈیکل سائنس نے بہت ترقی کرلی ہے۔ تم۔۔۔ (دروازے پر دستک) کون صاحب۔ (دروازے کی طرف جاتا ہے۔ محمودہ صوفے پر بیٹھ کر اپنا لباس برابر کرتی ہے۔ جعفر دروازے میں سے جھانک کر) ارے آپ۔ (محمودہ کی طرف دیکھ کر) غنی صاحب ہیں (راستہ چھوڑ کر) آیئے۔ تشریف لایئے۔

(غنی صاحب کمرے میں آتے ہیں۔ عمر پچاس سال سے زیادہ ہے۔ چال میں ایک وقار ہے۔ لباس سے صاحب ثروت معلوم ہوتے ہیں۔ انھیں دیکھ کر محمودہ کھڑے ہوتے ہوئے جھجکتی ہے مگر کھڑے ہوکر انھیں سلام کرتی ہے۔ پہلے تو غنی صاحب اس کو سر سے پیر تک اُچٹتی ہوئی نظر سے دیکھتے ہیں پھر سر ہلا کر جواب دیتے ہیں۔ محمودہ کی نظریں جھک جاتی ہیں مگر ایک صوفے کی طرف اشارہ کرکے)

محمودہ : تشریف رکھیے۔ بہت دن میں تشریف لائے۔

(غنی صاحب پھر ایک مرتبہ اسے سر سے پیر تک دیکھتے ہیں اور کچھ اس طرح خاموش رہتے ہیں جیسے یکا یک کسی تبدیلی سے الجھن میں پڑ گئے ہوں۔ محمودہ سر جھکائے خاموش کھڑی رہتی ہے۔ غنی صاحب کچھ دیر خاموش رہ کر)

غنی صاحب: تم کچھ بیمار ہو۔

محمودہ : جی نہیں۔ (نظریں جھکائے ہوئے) میں ٹھیک ہوں۔ آپ تشریف رکھیے نا۔

غنی صاحب: سلمان کہاں ہے۔ اس کا ہوسٹل میں داخلہ کرادیا ہے۔

محمودہ : اپنی نانی کے یہاں گیا ہے۔ آپ تشریف رکھیے (دوسرے دروازے کی طرف جاتے ہوئے) میں چائے لاتی ہوں۔

غنی صاحب: دیکھو میں اس وقت۔ (محمودہ ان کی بات پر دھیان نہ دے کر تیزی سے دوسرے کمرے میں چلی جاتی ہے۔ اس کے انداز سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ غنی صاحب کی نظروں کے سامنے رہنا نہیں چاہتی۔ غنی صاحب خاموش ہوکر فکرمندانہ انداز میں کمرے میں ٹہلنے لگتے ہیں۔ کچھ دیر ٹہلتے رہتے ہیں پھر جعفر کی طرف دیکھ کر) مجھے اس کی صحت میں کچھ۔

جعفر : (بات کاٹ کر) جی ہاں کچھ فرق تو ہے۔ (بات ٹالنے کے انداز میں) وہ سلمان کو ہاسٹل میں داخل کیے جانے سے کچھ ڈسٹرب سی ہے۔

غنی صاحب: ایسی کوئی مجبوری تو ہے نہیں۔ میں نے تو سلمان کے مستقبل کے بارے میں سوچا تھا۔

جعفر : آپ بھی کہاں عورتوں کی اگر مگر میں پڑے ہیں۔ ان کے سوچنے کا ڈھنگ ہی نرالا ہوتا ہے۔ (غنی صاحب خاموش رہتے ہیں اور ٹہلنے لگتے ہیں ان کے چہرے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ کسی بڑی الجھن میں ہیں۔ جعفر کچھ دیر خاموش رہ کر ان کا چہرہ دیکھ کر) آپ کچھ—

غنی صاحب: (رُک کر جعفر کو دیکھتے ہوئے) ہاں اب میں پریشان ہوں۔ مجھ سے نادانستہ ایک غلطی ہوگئی ہے (جعفر سوالیہ نظروں سے انھیں دیکھتا ہے مگر خاموش رہتا ہے۔ غنی صاحب کچھ دیر خاموش رہ کر) وہ بیمار نہیں ہے بلکہ...

جعفر : (کچھ دیر رک کر) اور آپ کو اس کا احساس آج ہو رہا ہے۔

غنی صاحب: ہاں۔ (کچھ دیر خاموش رہ کر) میں عورتوں کے جسم کی مخبری نہیں کرتا پھرتا۔ (کچھ دیر خاموش رہ کر فکر مندانہ لہجے میں) مسٹر جعفر! شاید آج یا کل عمران آجائے۔

جعفر : جی۔ کیا فرما رہے ہیں آپ!

غنی صاحب: ہاں۔ میں نے پیرول پر اس کی رہائی کا انتظام کردیا ہے۔ (جعفر ایک دم نروس سا ہوجاتا ہے۔ غنی صاحب سوچتے ہوئے) اب کیا ہوگا یہ تو بہت غلط ہوا۔

فکرمندانہ انداز میں جعفر کو دیکھتی ہے مگر خاموش رہتی ہے۔ جعفر سگریٹ ایش ٹرے میں مسلتے ہوئے جیسے اس خاموشی سے اُکتا کر۔)

جعفر : کیا آج سلمان واپس آجائے گا (محمودہ اس طرح جعفر کو دیکھتی رہتی ہے جیسے بالکل خالی الذہن ہو جعفر کچھ دیر خاموش رہ کر) غنی صاحب آئے تھے؟ (محمودہ اب بھی اسی طرح دیکھتی رہتی ہے جعفر جھنجلا کر) آخر محمودہ تمھیں ہو کیا گیا ہے۔

محمودہ : اوہ۔ ہاں۔ کچھ نہیں۔

جعفر : تو پھر یہ سب کیا ہے۔ معلوم ہوتا ہے اس دنیا میں ہی نہیں ہو۔

محمودہ : شاید تم سچ کہہ رہے ہو (سوچتے ہوئے کھڑی ہوتی ہے دو چار قدم آگے بڑھتی ہے پھر مڑ کر جعفر کے چہرے پر نظریں جما دیتی ہے۔ کچھ دیر بعد) میں سوچتی ہوں کہ اگر آج وہ آجائیں تو کیا ہو!

جعفر : (نظریں اٹھا کر اسے دیکھ کر) کون؟ عمران! (قہقہہ مارتا ہے پھر کھڑے ہو کر) کہیں قتل کے مجرم یوں آجاتے ہیں۔ تم نے خواب تو نہیں دیکھا۔

محمودہ : نہیں میں نے کوئی خواب نہیں دیکھا۔ مگر میرا دل۔

جعفر : (ہنس کر بات کاٹتے ہوئے) تم نے ضرور کوئی خواب دیکھا ہے۔ (مذاق اڑانے کے انداز میں) کہتے ہیں حاملہ عورتوں کے خواب سچے ہوتے ہیں۔ بتاؤ کیا خواب دیکھا ہے۔

محمودہ : میرا مذاق نہ اڑاؤ جعفر۔ کبھی کبھی خواب بھی حقیقت بن جاتے ہیں۔

جعفر : (ہنس کر) اگر خواب نہیں دیکھا تو تمھیں ضرور الہام ہوا ہے (سنجیدہ ہو کر) لیکن پھر بھی چودہ سال، پانچ سال میں پورے نہیں ہو جاتے۔

محمودہ : (سوچتے ہوئے) پھر بھی میرا دل کہہ رہا ہے کہ آج...

جعفر : نہ آج کچھ ہوگا نہ کل۔ (سگریٹ جلا کر) تم ذہنی طور پر سلمان کو خود سے جدا کرنے کے لیے تیار نہیں۔ اس لیے مبہم خوف نئی نئی شکلوں میں تمھارا پیچھا کر رہے ہیں۔

محمودہ : (سوچتے ہوئے) ہوسکتا ہے تمھارا خیال درست ہو۔ (کچھ دیر خاموش رہ کر) سمجھ میں نہیں آتا کہ غنی صاحب اس قدر مہربان کیوں ہیں جب کہ...

جعفر : (لقمہ دیتے ہوئے) ان کے لڑکے کا قتل عمران نے کیا ہے۔ (محمودہ اثبات میں سر ہلاتی ہے۔ جعفر اس کا چہرہ دیکھ کر) کچھ لوگ فطرتاً نیک ہوتے ہیں۔ ان پر شک نہیں کرنا چاہیے۔

محمودہ : (کچھ دیر خاموش رہ کر سوچتے ہوئے) جعفر۔ کہیں انھوں نے کوئی لمبا منصوبہ نہ بنایا ہو۔

جعفر : کیسا لمبا منصوبہ؟

محمودہ : وہ مجھ سے میرا بچہ چھین لینا چاہتے ہوں۔ شاید وہ۔

جعفر : (بات کاٹ کر) تم ضرور پاگل ہوگئی ہو۔ کہیں یوں کسی کے بچے چھینے جاتے ہیں۔

محمودہ : ہاں میں کچھ پاگل ہوگئی ہوں۔ (کچھ دیر خاموش رہ کر آنکھوں میں آنسو بھر کر) کچھ بھی ہو میں اسے خود سے جدا کرنا نہیں چاہتی۔

جعفر : غنی صاحب اسے ہوسٹل ہی میں تو داخل کرا رہے ہیں (محمودہ کے پاس آکر) تم جب چاہو اس سے مل سکتی ہو بلکہ میں تو کہتا ہوں اگر وہ اس کو اپنے ساتھ رکھنا چاہیں تو تمھیں اس میں بھی کوئی اعتراض نہ ہونا چاہیے۔

محمودہ : (جذباتی انداز میں) نہیں نہیں نہیں۔ میں جان دے دوں گی مگر ایسا نہیں ہونے دوں گی۔

جعفر : اگر تمھاری جان اس قدر سستی ہے تو دے دو۔ مگر کیا جان دینے سے مسئلے حل ہوجاتے ہیں۔

محمودہ : (سوچتے ہوئے) جعفر۔ جب وہ آئیں گے تو کیا میں ان کو منہ دکھانے کے قابل رہوں گی۔ (جعفر خاموش رہتا ہے۔ محمودہ کچھ دیر اس کا چہرہ دیکھتی رہتی ہے پھر بڑے فکرمندانہ لہجے میں) جانے کیوں ایسا محسوس ہو رہا ہے جیسے آج کچھ ہونے والا ہے۔

جعفر : کیا کسی طرح اس کو رُکوایا نہیں جاسکتا۔

غنی صاحب: ہاں ایسا ہونا ہی چاہیے۔ دیکھو میں کوشش کرتا ہوں۔ (جعفر اس طرح خاموش رہتا ہے جیسے اس کی سمجھ میں نہیں آرہا ہو کہ وہ کیا کہے۔ غنی صاحب فکرمندانہ انداز میں ٹہلتے رہتے ہیں کہ محمودہ چائے کی ٹرے لیے داخل ہوتی ہے اور میز پر رکھ کر چائے پیالیوں میں نکال کر ایک پیالی غنی صاحب کی طرف بڑھاتی ہے دونوں کی نظریں چار ہوتی ہیں محمودہ کا ہاتھ کانپ جاتا ہے۔ اور چائے چھلک جاتی ہے) دیکھو کپڑوں پر نہ گرالینا (محمودہ خاموش رہتی ہے اور دوسری پیالی جعفر کو دیتی ہے۔ غنی صاحب چائے کا گھونٹ لے کر) شاید تمھیں سلمان کا ہوسٹل میں داخل کیا جانا پسند نہیں ہے۔

محمودہ : (نظریں جھکائے جھکائے) جب آپ کو پسند ہے تو مجھے کیا انکار ہوسکتا ہے۔ (جعفر پیالی ہاتھ میں لیے ہوئے دوسرے کمرے میں جاتا ہے۔ محمودہ اور غنی صاحب خاموشی سے اسے دیکھتے رہتے ہیں۔ اس کے دوسرے کمرے میں جانے کے بعد)

غنی صاحب: اولاد تمھاری ہے میں کون ہوں۔ (محمودہ خاموش رہتی ہے۔ غنی صاحب کچھ دیر خاموش رہ کر اس انداز میں جیسے خود سے کہہ رہے ہوں) جب تک بچہ ماں کے پاس رہتا ہے وہی اس کی دلچسپیوں کا مرکز بنا رہتا ہے وہ اس کے علاوہ کچھ نہیں سوچ سکتی۔

محمودہ : مگر میں— مگر میں۔ (زبان لڑکھڑا جاتی ہے اور وہ خاموش ہوجاتی ہے غنی صاحب کچھ کہنے کے لیے منہ کھولتے ہیں کہ محمودہ ایک دم مشتعل انداز میں کھڑے ہوکر) کیا آپ مجھ کو گنہگار کہتے ہیں۔ (غنی صاحب حیرت سے اس کا چہرہ دیکھتے ہیں) اگر کوئی بھوک سے نڈھال ہوکر روٹی چرالے تو کیا آپ اس کو چور کہیں گے۔

غنی صاحب: (غور سے اس کا چہرہ دیکھتے ہوئے) شاید ہاں اور شاید نہیں بھی۔ (کچھ دیر

خاموش رہ کر) اس کا جواب صرف مجرم کا ضمیر دیتا ہے۔

محمودہ : (اسی طرح مشتعل انداز میں) میرا ضمیر مجھے ملامت نہیں کرتا۔

غنی صاحب: پھر تو ٹھیک ہے۔ (کچھ دیر خاموش رہتے ہیں پھر دروازے کی طرف جاتے ہوئے) تم اچھی طرح غور کرلو کہ سلمان کو ہوسٹل میں داخل کرانا چاہتی ہو یا نہیں۔ میں نے اس کے کپڑے درزی کے یہاں ڈالے تھے وہ لے کر آتا ہوں۔

(غنی صاحب کمرے سے چلے جاتے ہیں۔ محمودہ بے حد مشتعل انداز میں کمرے میں ٹہلتی ہے پھر ایک دم پاگلوں کے انداز میں چیخ کر)

محمودہ : جعفر۔ (اور بلند آواز سے) جعفر۔ (تیز تیز قدموں سے دوسرے کمرے کی طرف جاتی ہے کہ جعفر کمرے میں آتا ہے۔ محمودہ غصے سے جعفر کو دیکھ کر نفرت سے) بزدل (جعفر اس غیر متوقع طرز کلام سے گھبرا جاتا ہے) اس بڈھے کا نشانہ بننے کے لیے مجھے تنہا چھوڑ کر کہاں چلے گئے تھے۔

جعفر : میں نے سوچا کہ...

محمودہ : (بات کاٹ کر) تم نے کچھ نہیں سوچا سوائے اس کے کہ تمھارے اندر کے چور نے تمھیں بھاگ جانے پر مجبور کیا۔ آخر وہ ہے کون۔ تمھارا باپ۔ میرا شوہر۔ شہر کوتوال، منصف، جج، محتسب کیا وہ ہم کو پھانسی پر چڑھا دے گا۔ تمھارا ضمیر مجرم ہے۔

جعفر : محمودہ بات کو سمجھو۔ ایسے معاملات میں لوگ مرد ہی کو قصوروار ٹھہراتے ہیں۔

محمودہ : (غصے سے پیٹ کی طرف اشارہ کرکے) تو گویا یہ سب میرا قصور ہے۔ (ایک دم خاموش ہوجاتی ہے۔ کچھ دیر بے حس و حرکت کھڑی رہتی ہے پھر ایک دم پھوٹ پھوٹ کر رونے لگتی ہے۔ جعفر اس کے پاس جاکر)۔

جعفر : محمودہ کیا پاگل پن ہے۔ تمھیں ہو کیا گیا ہے۔ سمجھنے کی کوشش کرو۔ وہ ہمارے محسن ہیں اور میں ان سے بات بڑھانا نہیں چاہتا تھا (محمودہ اب بھی برابر ہچکیوں سے روتی رہتی ہے۔ جعفر اس کا ہاتھ پکڑ کر صوفے پر بٹھلاتا ہے اور

دوسرے کمرے میں چلا جاتا ہے۔ پھر گلاس میں پانی لے کر آتا ہے اور گلاس محمودہ کو دے کر) لو ایک دو گھونٹ پی لو۔

(محمودہ دو چار گھونٹ پی کر گلاس میز پر رکھ دیتی ہے۔ کچھ دیر خاموش رہتی ہے پھر ٹھنڈی سانس بھر کر)

محمودہ : لوگ جانے کیوں تھوڑی سی ہمدردی دکھلا کر سمجھتے ہیں کہ انھوں نے انسان کو خرید لیا ہے۔

جعفر : تم فضول باتیں سوچنے کی عادی ہو چکی ہو۔ چھوڑو ان باتوں کو۔ ابھی تو تم ڈاکٹر کے پاس جاؤ۔

محمودہ : اب میں کسی ڈاکٹر واکٹر کے پاس نہیں جاؤں گی۔ دیکھتی ہوں دنیا میرا کیا بگاڑ لیتی ہے۔

جعفر : اوہو، بات کو سمجھو تمھارا ڈاکٹر کے پاس جانا ضروری ہے۔

محمودہ : میں ہرگز نہیں جاؤں گی۔ آج وہ بڑھا مجھے چیلنج کر کے گیا ہے دیکھوں تو دنیا میرا کیا بگاڑ لیتی ہے۔

جعفر : پھر وہی ضد (سمجھانے کے انداز میں) دنیا کیا کہتی ہے کہنے دو مگر اپنی اولاد کا تو خیال کرو۔

محمودہ : اولاد کا خیال! اولاد کا کیسا خیال؟ کیڑے مکوڑوں کی طرح بے گنتی اولاد پیدا کرنے والے بھی کسی نہ کسی طرح ان کی پرورش کر لیتے ہیں۔

جعفر : سوال پرورش کا نہیں ہے۔ اس عزت کا ہے جو ماں باپ کو اولاد کی طرف سے ملتی ہے بڑا ہو کر سلمان کیا سوچے گا (ٹھنڈی سانس بھر کر) وہ ماں باپ کس قدر بدقسمت ہوتے ہیں جن کو اولاد کی طرف سے عزت نہیں ملتی۔

محمودہ : (سوچتے ہوئے) مگر۔

جعفر : (بات کاٹتے ہوئے) اب سوال اگر مگر کا نہیں ہے، عزت کا ہے (محمودہ کا ہاتھ پکڑ کر دروازے کی طرف لے جاتے ہوئے) ابھی تو تم ڈاکٹر کے پاس

جاؤ۔ راستے میں رکشا لے لینا (محمودہ رکتی ہے) ارے بھئی کسی اور کی بھی
بات مان لیتے ہیں۔

محمودہ : (جھنجھلا کر) اچھا جاتی ہوں۔ ذرا بیگ تو اٹھا لینے دو۔

جعفر : (میز پر سے بیگ اٹھا کر دیتے ہوئے) یہ لو۔ تالا کہاں ہے۔

محمودہ : میز کی دراز میں۔

جعفر : دوسری چابی ہے تمھارے پاس۔ (محمودہ اثبات میں سر ہلاتی ہے) میں بھی جارہا ہوں۔ جب آؤں گا تو سلمان کو لیتا آؤں گا۔

محمودہ : تم اس بڈھے سے کہہ دینا میں سلمان کو ہوسٹل وسٹل میں داخل کرانا نہیں چاہتی۔

جعفر : اچھا ابھی تو تم جاؤ۔ اس مسئلے پر بعد میں سوچیں گے۔

(محمودہ کا ہاتھ پکڑ کر دروازے کے باہر کر کے دروازہ بند کردیتا ہے۔ کچھ دیر فکرمندانہ انداز میں کھڑا سوچتا رہتا ہے۔ سگریٹ جلاتا ہے۔ چہرے سے فکرمندی ظاہر ہورہی ہے۔ کچھ دیر کمرے میں ٹہلتا رہتا ہے۔ پھر میز کے پاس جاکر اس کی دراز سے تالا نکالتا ہے اور مڑتا ہے کہ ایک شخص کمرے میں داخل ہوتا ہے اس کی داڑھی بڑھی ہوئی ہے۔ جعفر حیرت سے اسے دیکھنے لگتا ہے۔ نو وارد آگے بڑھ کر مسکراتے ہوئے)۔

نووارد : مجھے پہچانے نہیں۔

جعفر : (چند سیکنڈ رک کر) ارے تم عمران! (عمران خاموش کھڑا مسکراتا رہتا ہے۔ جعفر جس نے اب اپنی حیرت پر قابو پالیا ہے تیزی سے آگے بڑھتا ہے۔ عمران سے معانقہ کرتا ہے۔ پھر سر سے پیر تک اسے دیکھ کر) بھئی خوب آئے۔ واللہ معجزہ ہے معجزہ۔

عمران : (حیرت سے) معجزہ! کیسا معجزہ؟ یہ بھی خوب مذاق ہے۔ (ہنستا ہے) ارے بھئی میں پیرول پر چھوڑا گیا ہوں۔

جعفر : پیرول پر۔ اوہ ہاں۔

عمران : (مسکرا کر) کیا محمودہ نے درخواست نہیں دی تھی۔ (جعفر خاموش رہتا ہے) محمودہ کہاں ہے۔

جعفر : (سوچتے ہوئے) اسپتال گئی ہے۔

عمران : اسپتال! کیوں خیریت تو ہے۔ (جعفر خاموش رہتا ہے۔ چہرے پر پریشانی ظاہر ہونے لگتی ہے مگر عمران اس پر دھیان نہ دے کر) اچھا یہ عورت جو ابھی گھر سے گئی ہے محمودہ تھی۔ کافی موٹی ہوگئی ہے۔ میں نے تو پہچانا ہی نہیں اور وہ بھی میرے پاس سے گزر گئی۔ شاید اس نے بھی مجھے نہیں پہچانا۔ سلمان کہاں ہے؟

جعفر : اپنے نانا کے یہاں گیا ہے۔ میں اسے لینے ہی جا رہا تھا۔

(جعفر پھر سوچنے لگتا ہے۔ عمران اسے غور سے دیکھتا ہے اور اس کے قریب آ کر)

عمران : کیا بات ہے تم کچھ پریشان نظر آ رہے ہو۔ میرا آنا ناگوار گزرا؟

جعفر : کیسی باتیں کرتے ہو۔ (کھسیانی ہنسی ہنس کر) ناگوار! خوب۔ (عمران کو سر سے پیر تک دیکھ کر) تمھاری صحت۔

عمران : ہاں۔ ابھی پندرہ دن میں خاصا بیمار رہا۔ محمودہ بھی تین چار مہینے سے مجھ سے ملنے نہیں آئی۔ کیا بات ہے۔ سلمان تو مجھے اب کیا پہچانے گا۔ سات سال کا ہوگیا ہوگا۔

جعفر : محمودہ کو اسی کی زیادہ فکر ہے (عمران سوالیہ نظروں سے اسے دیکھتا ہے) غنی صاحب اسے ہوسٹل میں داخل کرانا چاہتے ہیں۔ اس لیے وہ—

عمران : کون غنی صاحب۔ مغنی کے باپ (جعفر اثبات میں سر ہلاتا ہے۔ عمران مشتعل ہو کر) وہ کون ہوتے ہیں اس گھر کے معاملات میں دخل دینے والے۔

جعفر : ایک طرح سے وہی اس کی پرورش کر رہے ہیں۔ (چند سیکنڈ رک کر) اور اب

تو ان کی حیثیت اس گھر کے ایک فرد کی سی ہوگئی ہے۔

عمران : کیا مطلب؟ (غور سے جعفر کا چہرہ دیکھ کر) اور تم یہ سب برداشت کر رہے ہو۔

جعفر : برداشت نہ کرتا تو اور کیا کرتا۔ محمودہ نے۔

عمران : (غصے سے) گولی مار دیتے محمودہ کو۔ (جعفر کی طرف بڑھتے ہوئے) تم بزدل ہی نہیں بے غیرت بھی ہو۔

جعفر : وہ میرا مطلب ہے کہ۔

عمران : اماں تو مطلب جلد ہی بیان کرو۔ مجھے سولی پر لٹکا نہ رہنے دو۔

جعفر : بات دراصل یہ ہے کہ — میرا مطلب ہے کہ۔

عمران : پھر وہی مطلب۔

(محمودہ کمرے میں آتی ہے اور عمران پر دھیان نہ دے کر)

محمودہ : آج تو اسپتال بند ہوگا۔ بلاوجہ وہاں تک۔ (عمران پر نظر پڑتی ہے اور خاموش ہوجاتی ہے اور اسے حیرت سے دیکھنے لگتی ہے۔ عمران اسے گھورتا رہتا ہے۔ کچھ دیر بعد محمودہ سہمے ہوئے لہجے میں) تم یعنی کہ — میرا مطلب ہے کہ۔

عمران : یہاں سب کا مطلب ہی مطلب ہے مگر مطلب کوئی بیان نہیں کرتا۔ (سر سے پیر تک محمودہ کو دیکھتا ہے۔ محمودہ کے چہرے پر خوف کے آثار پیدا ہوتے ہیں۔ عمران اس کی طرف بڑھتا ہے۔ محمودہ پیچھے ہٹتی ہے۔ عمران آگے بڑھتے ہوئے) تم نے مجھے پیرول پر اسی لیے رہا کرایا تھا کہ تمھیں اس حالت میں دیکھ کر خوشی کے نعرے لگاؤں۔

محمودہ : میں نے پیرول پر رہا کرایا ہے۔

(عمران آگے بڑھتے بڑھتے ایک دم رک جاتا ہے کچھ دیر خاموش رہ کر)

عمران : تم نے رہا نہیں کرایا۔ (محمودہ خاموش رہتی ہے۔ عمران، جعفر کی طرف دیکھتا ہے۔ وہ بھی خاموش رہتا ہے۔ عمران کچھ دیر خاموش رہ کر شکست خوردہ لہجے میں ٹھنڈی سانس بھر کر) خیر کسی نے بھی رہا کرایا ہو مگر محمودہ تم اس قدر کیوں

گر گئی تھیں۔ تمھیں شرم نہیں آئی۔

محمودہ : (ایسے لہجے میں جیسے اس نے اپنی خوداعتمادی حاصل کر لی ہو) انسان سانسیں لینے پر شرمندہ نہیں ہوتا۔

عمران : تم شرمندہ بھی نہیں ہو (محمودہ خاموش رہتی ہے۔ عمران کچھ دیر اس کا چہرہ دیکھتا ہے۔ پھر ایک دم جیسے محمودہ کی خاموشی سے اس نے اپنا ذہنی توازن کھودیا ہو) اگر وہ بڈھا اس وقت میرے سامنے آجائے تو میں اسے گولی ماردوں گا۔

محمودہ : کون بڈھا۔

عمران : وہی غنی۔ اس بڈھے نے مجھ سے زبردست انتقام لیا ہے۔ میں اسے زندہ نہیں چھوڑوں گا۔

محمودہ : کیسا انتقام (جعفر دروازے کی طرف جاتا ہے۔ محمودہ اسے دیکھ کر) تم کہاں جارہے ہو۔

جعفر : میں سلمان کو لے آؤں کہ وہ۔

محمودہ : (لقمہ دے کر) یہ قتل و غارت گری دیکھ لے۔

جعفر : نہیں۔ بلکہ وہ اپنے باپ سے مل لے۔

محمودہ : اسے لانے کی ضرورت نہیں۔ میں نے اس سے کہہ دیا ہے کہ اس کا باپ مر چکا ہے۔

جعفر : لیکن شاید۔

محمودہ : (بات کاٹ کر) بزدلوں کی طرح بھاگنے کی ضرورت نہیں ہے (عمران کی طرف اشارہ کر کے) انھیں حالات سے سمجھوتا کرنا ہوگا۔

عمران : حالات سے سمجھوتا (پاگلوں کی طرح قہقہہ لگا کر) اگر میں حالات سے سمجھوتا کرسکتا تو آج تمھیں یوں گناہ کا ڈھیلا ڈھالا لباس پہنے ہوئے نہ دیکھ رہا ہوتا۔

محمودہ : گناہ کا ڈھیلا ڈھالا لباس،! (طنزیہ) گویا میں نے قتل سے بھی بڑا کوئی گناہ کیا ہے۔

عمران : تم نے خودکشی کی ہے۔قتل سے بھی بڑا گناہ۔

محمودہ : چودہ سال کون سی عورت سولی پر لٹکی رہ سکتی ہے۔ میں نے کون سا گناہ کیا تھا جو مجھے چودہ سال کے لیے سولی پر لٹکا دیا گیا۔تم نے صرف قتل ہی نہیں کیا بلکہ ایک عورت کو—

(غنی صاحب کمرے میں آتے ہیں۔محمودہ انھیں دیکھ کر خاموش ہوجاتی ہے۔ غنی صاحب محمودہ سے)

غنی صاحب: میں سلمان کے کپڑے درزی سے لے آیا ہوں (ان کی نظر عمران پر پڑتی ہے۔ ایک دم حیرت سے) ارے تم آگئے! کب آئے؟ (عمران خاموشی سے انھیں گھورتا رہتا ہے) مجھے پہچانے نہیں۔

عمران : (انتہائی حقارت سے) لوگ خدا سے زیادہ شیطان کو پہچانتے ہیں (غنی صاحب کے چہرے پر ناگواری کے آثار پیدا ہوتے ہیں۔عمران ان کی طرف بڑھتے ہوئے) اب بولتے کیوں نہیں۔ خاموش کیوں ہو۔(طنزیہ) تمھارے پاس بولنے کو ہے ہی کیا۔ (غنی صاحب کے پاس پہنچ کر) تم نے سمجھا ہوگا کہ عمران تمھارے بیٹے کے ہاتھ سے نہیں مرا تو جیل میں ضرور مرجائے گا۔

غنی صاحب: (کپڑوں کا بنڈل ایک صوفے پر ڈالتے ہوئے) شاید تم اپنے حواس میں نہیں ہو۔

عمران : ہاں شاید نہیں ہوں۔تم نے میری عزت سے کھیل کر مجھ سے انتقام لے ہی لیا۔

غنی صاحب : (دروازے کی طرف جاتے ہوئے) جب تم ہوش میں ہوگے اس وقت تم سے بات کروں گا۔

عمران : (غنی صاحب کا راستہ روک کر) پھر کسی اور وقت تم بات کرنے کے لیے زندہ نہیں رہو گے۔

محمودہ : (آگے بڑھ کر) راستہ چھوڑ دو عمران۔تمھیں شرم آنا چاہیے۔

عمران : مجھے یا تم دونوں کو۔ (محمودہ کے پیٹ کی طرف اشارہ کرکے) یہ کارنامہ میرا ہے نا۔

محمودہ : (چیخ کر) عمران۔

عمران : (اور بلند آواز سے) خاموش رہو۔ (غنی صاحب کی طرف دیکھ کر) مجھے پیرول پر کس نے رہا کرایا ہے۔

غنی صاحب : میں نے۔

عمران : نہیں۔ بلکہ تمھاری موت نے مجھے پکارا ہے۔ (ایک دم جعفر کی طرف پلٹ کر) بزدل تم دیکھتے رہے کہ تمھارے خاندان کی عزت لٹ رہی ہے اور خاموش رہے۔ دونوں کو گولی کیوں نہیں مار دی۔

جعفر : میں نے! یعنی کہ تمھارا مطلب ہے کہ —

غنی صاحب: (بات کاٹ کر) مسٹر جعفر آپ جایئے۔ میں عمران کو موقع دینا چاہتا ہوں کہ وہ میرے بیٹے کی طرح مجھے بھی قتل کردے۔

عمران : موت تیرا مقدر بن چکی ہے بڈھے تو اسے ٹال نہیں سکتا۔

غنی صاحب: عمران کی بات پر دھیان نہ دے کر) آپ جایئے مسٹر جعفر (جعفر کا ہاتھ پکڑ کر دروازے کی طرف ڈھکیلتے ہیں)

محمودہ : (گھبرا کر) نہیں جعفر تم نہ جانا۔ ان پر خون سوار ہے یہ پاگل ہورہے ہیں۔

غنی صاحب : آپ جایئے مسٹر جعفر اور سلمان کو لے آیئے۔ اپنے باپ سے مل لے گا۔ (جعفر رکتا ہے) آپ جایئے اگر عمران اس قدر پاگل ہے تو اسے اپنے دل کی بھڑاس نکال لینے دیجیے۔

جعفر : مگر دیکھیے میرا مطلب ہے کہ —

غنی صاحب: (جعفر کا ہاتھ پکڑ کر کمرے سے باہر کرتے ہوئے) آپ جایئے (دروازہ بند کرکے عمران سے) لیجیے آپ کا گنہگار حاضر ہے۔

عمران : یہ نہ سمجھ بیٹھے کہ مجھے اس طرح مرعوب کرے گا (غنی صاحب کی طرف

بڑھتے ہوئے) میرے لیے اب چودہ اور اٹھائیس سال سب برابر ہیں۔

محمودہ : (دونوں کے درمیان آ کر) کیا سچ مچ پاگل ہو گئے ہو۔ (عمران اسے راستے سے ہٹا دینا چاہیے۔ محمودہ غصے سے) تمھیں پہلے مجھے۔۔۔

عمران : تمھاری خواہش بھی پوری کر دوں گا۔

(پھر محمودہ کو درمیان سے ہٹانے کی کوشش کرتا ہے۔ محمودہ اپنی جگہ سے نہ ہٹتے ہوئے)

محمودہ : پہلے مجھے طلاق دے دو۔ پھر جو تمھارا جی چاہے کرنا۔

(عمران ایک دم اس طرح رک جاتا ہے جیسے اس کو سکتہ ہو گیا ہو۔ اس کے چہرے پر کرب کے آثار پیدا ہوتے ہیں۔ وہ ایک صوفے پر اس طرح بیٹھ جاتا ہے۔ جیسے بازی ہار گیا ہو۔ کچھ دیر خاموش رہتا ہے پھر شکست خوردہ لہجے میں غنی صاحب سے)۔

عمران : آپ نے مجھے پیرول پر رہا کیوں کرایا۔ (ٹھنڈی سانس بھر کر) آپ نے مجھ سے میری زندگی چھین لی۔ میرے تصورات مجھ سے چھین لیے۔ مجھے وہیں رہنے دیا ہوتا، میں وہیں خواب دیکھتے دیکھتے مر جاتا۔ اب تو موت بھی سکون سے نہیں آئے گی۔

غنی صاحب: حالات سے مقابلہ کرو میرے دوست حالات سے مقابلہ (عمران کا کاندھا تھپ تھپا کر دروازے کی طرف جاتے ہوئے) میں پھر کسی وقت تم سے ملوں گا۔

(غنی صاحب کمرے سے چلے جاتے ہیں۔ کچھ دیر خاموشی رہتی ہے۔ عمران تھکے تھکے انداز میں کھڑا ہوتا ہے۔ کچھ دیر کھڑا رہتا ہے پھر محمودہ کی طرف دیکھ کر)

عمران : محمودہ! (ٹھنڈی سانس بھر کر) اب یہ دنیا میری نہیں رہی (آنکھوں میں آنسو آ جاتے ہیں۔ انھیں آستین سے پونچھ کر) سلمان سے کبھی نہ کہنا کہ میں اس کا باپ تھا۔

محمودہ : (جذباتی انداز میں چیخ کر) خدا کے لیے۔۔۔

عمران : (اپنی ہی دھن میں ٹھنڈی سانس بھر کر) تم نے اچھا ہی کیا کہ اس سے کہہ دیا کہ اس کا باپ مر چکا ہے۔

محمودہ : نہیں نہیں۔ نہیں نہیں۔ (ہچکیوں سے رونے لگتی ہے پھر ہچکیوں کے درمیان) میں۔ میں (آواز رندھ جاتی ہے اور خاموش ہو جاتی ہے۔ عمران بے تعلق سا کھڑا خلا میں گھورتا رہتا ہے۔)

(عمران کی طرف جذباتی انداز میں بڑھتی ہے جیسے اس سے لپٹ جائے گی۔ عمران پیچھے ہٹ کر)

عمران : نہیں محمودہ مجھ سے دور رہو۔ میں اس دنیا کا انسان نہیں ہوں جہاں محبت اور خلوص کا سکہ چلتا ہے۔

(محمودہ رک جاتی ہے اور عمران کو بے کسی کے انداز میں دیکھتے ہوئے)

محمودہ : شاید تم مجھے معاف نہیں کر رہے ہو۔

عمران : اگر میرے کہہ دینے سے تمھیں سکون مل سکتا ہے تو میں نے تمھیں معاف کر دیا۔

(آہستہ آہستہ دروازے کی طرف جاتا ہے)

محمودہ : کہاں جا رہے ہو۔

عمران : جہاں سے آیا تھا۔

محمودہ : ٹھہرو۔

عمران : (دروازے کے پاس پہنچ کر) جب بھی تم کہوگی محمودہ۔ میں تمھیں طلاق دے دوں گا۔

محمودہ : نہیں نہیں۔ نہیں نہیں۔ میں — میں —

(ہچکیوں سے رونے لگتی ہے۔ عمران چند سیکنڈ کھڑا رہتا ہے پھر کمرے سے چلا جاتا ہے۔ محمودہ حسرت سے بند دروازے کو تاکنے لگتی ہے)

(پردہ)

افشاں یا نورافشاں

افرادِ تمثیل (کردار)

(1) خالد (ایک نوجوان) (2) وحید (نوکر) (3) ناظم (ایک بوڑھا) (4) نورافشاں (ایک نوجوان خاتون)

منظر

(ایک ریسٹ ہاؤس کا کمرہ۔ دوچار کرسیاں۔ ایک میز، چارپائی جس پر صاف ستھرا بستر۔ غیر معمولی سردی کی وجہ سے آتش دان میں آگ روشن ہے۔ کھڑکیوں اور دروازوں پر پردے پڑے ہیں۔ خالد آتش دان کے پاس کھڑا ہے۔ وحید، آتش دان میں لکڑیاں ڈالتے ہوئے)

وحید : ایسی سردی برسوں ہی میں پڑتی ہے۔ باہر بہت ٹھنڈی ہوائیں چل رہی ہیں۔ بادل بھی گھرے ہوئے ہیں۔

خالد : بادل گھرے ہوئے ہیں!

وحید : جی ہاں۔ بارش کے آثار ہیں۔

خالد : بارش! (ایک کھڑکی کے پاس جا کر اسے کھولتا ہے۔ سرد ہوا کا تیز جھونکا اندر

آتا ہے۔ خالد پھر کھڑکی بند کر کے) اندھیرا ابھی کافی ہو گیا ہے۔

وحید : میں لیمپ جلائے دیتا ہوں۔ کھڑکیاں نہ کھولیے۔ آپ میدانوں میں رہنے والے ان ہواؤں کے عادی نہیں ہوتے۔

(وحید لیمپ روشن کرتا ہے۔ کمرے میں روشنی پھیل جاتی ہے۔ خالد آتش دان کے پاس ایک کرسی پر بیٹھ کر ہاتھ سینکتے ہوئے)

خالد : دیکھو— کیا نام ہے تمھارا۔

وحید : (چارپائی پر بستر برابر کرتے ہوئے) مجھے وحید کہتے ہیں۔

خالد : کیا اس وقت کافی کا انتظام ہو سکتا ہے۔

وحید: جی ہاں۔ کیوں نہیں۔ ابھی انتظام ہو جائے گا۔

خالد : یہاں سے قریب ترین گانو کتنی دور ہوگا۔

وحید : یہی کوئی دو تین میل— کیا آپ کو یہاں کوئی تکلیف ہے۔

خالد : نہیں نہیں۔ ایسی کوئی بات نہیں ہے۔

وحید : شکار کے لیے جو لوگ آتے ہیں وہ یہیں قیام کرتے ہیں۔ آج اتفاق سے موسم خراب ہو گیا ہے۔

خالد : کوئی ہرج نہیں۔ تم فکر نہ کرو۔ بس کافی کا انتظام کر دو۔

وحید : ابھی کیے دیتا ہوں۔ کیا آپ شکار کے لیے آئے ہیں۔ اگر بڑے شکار کا شوق ہے تو دو چار دن انتظار کرنا ہوگا۔ ویسے پرندے آسانی سے مل جائیں گے۔

خالد : میں تو ویسے ہی سیر و تفریح کے لیے آیا ہوں۔ میرے آنے سے پہلے تو کوئی یہاں نہیں آیا تھا۔

وحید : دو تین دن سے تو یہاں کوئی نہیں آیا۔ آپ کو کسی کا انتظار ہے۔

خالد : ہاں۔ (سوچتے ہوئے) ابھی تک اسے آجانا چاہیے تھا۔

وحید : ممکن ہے موسم کی خرابی کی وجہ سے رک گئے ہوں۔

خالد : ناممکن ہے۔ اسے ضرور آنا ہے۔

وحید : ممکن ہے گانو میں رک گئے ہوں۔ صبح آئیں۔

خالد : نہیں اسے یہیں آنا ہے) گھڑی دیکھ کر) سات بج گئے (وحید سے) اچھا تم کافی لاؤ۔

وحید : بہت اچھا۔ (جاتے ہوئے) میں پاس والے کمرے میں سوتا ہوں۔ آپ کسی وقت بھی بلا سکتے ہیں۔

(وحید کمرے سے چلا جاتا ہے۔ خالد سگریٹ جلا کر اس کے چھلے بنانے لگتا ہے۔ پھر جیب میں سے تاش نکال کر سامنے رکھی ہوئی میز پر پھیلانے لگتا ہے۔ کچھ دیر بعد باہر برآمدے میں کسی کے چلنے کی آہٹ، خالد کان لگا کر سنتا ہے اور اٹھ کھڑا ہوجاتا ہے۔ پھر دروازے پر آہستہ آہستہ دستک، خالد دروازے کے پاس جاکر اسے کھولتے ہوئے)۔

خالد : بہت راہ دکھلائی۔ (دروازہ کھولتا ہے۔ خالد کے سامنے ایک بوڑھا کھڑا ہے۔ اس نے سیاہ اوورکوٹ پہن رکھا ہے۔ سر پر فیلٹ ہیٹ ہے۔ لباس اور چہرے سے بھلا آدمی معلوم ہوتا ہے۔ خالد کچھ دیر اسے دیکھتا رہتا ہے۔ پھر آہستہ سے) اندر آجایئے۔ باہر سردی بہت ہے۔

(بوڑھا آہستہ آہستہ اندر آتا ہے۔ خالد دروازہ بند کردیتا ہے۔ بوڑھا آتش دان کے پاس جاکر کھڑا ہوجاتا ہے اور ہاتھ سینکتا ہے۔ خالد بھی اس کے پاس آکر کھڑا ہوجاتا ہے۔ کچھ دیر خاموشی کے بعد بوڑھا نظریں اٹھا کر خالد کو غور سے دیکھ کر)

بوڑھا : آپ کسی کا انتظار کر رہے تھے۔ (غمگین مسکراہٹ سے) یہاں اکثر لوگ کسی کا انتظار کرنے آتے ہیں۔ اوہ معاف کیجیے گا۔ آپ تشریف رکھیے میرا نام ناظم ہے۔ ناظم علی میں آپ کی تنہائی میں مخل ہوا۔

خالد : جی نہیں ہرگز نہیں۔ مجھے خالد کہتے ہیں۔ (کرسی کی طرف اشارہ کرکے) آپ تشریف رکھیے۔ آج موسم بہت خراب ہے۔

ناظم : (کرسی پر بیٹھتے ہوئے) کوئی زیادہ خراب موسم نہیں ہے۔

خالد : (حیرت سے اس کا چہرہ دیکھ کر) مگر نوکر تو کہہ رہا تھا۔ ایسا موسم کئی سال بعد آیا ہے۔

ناظم : میں نے اس سے ہزار گنا خراب موسم دیکھا ہے اور نوکر تو یوں ہی مسافروں سے کچھ اینٹھ لینے کے لیے موسم کو خراب کہہ دیتے ہیں۔ شاید آپ اس علاقے میں پہلی بار آئے ہیں۔

خالد : جی نہیں۔ میں اکثر ادھر آیا ہوں مگر ایسا موسم پہلی بار دیکھ رہا ہوں۔

ناظم : تو پھر یوں سمجھ لیجیے کہ میں اس موسم کا عادی ہو چکا ہوں۔ کم از کم اب سال میں ایک بار ضرور آتا ہوں۔ آج 21 جولائی ہے نا۔

خالد : جی ہاں آج 21 جولائی ہے۔

ناظم : پہلے میں ہر روز آیا کرتا تھا۔ پھر ہفتے میں ایک بار آنے لگا پھر مہینے میں ایک بار اور اب سال میں ایک بار۔ 21 جولائی کو۔

خالد : (مسکرا کر) اس سلسلے میں آپ کافی وضع دار ہیں۔

ناظم : وضع دار! جی ہاں یوں ہی سمجھ لیجیے۔ (میز پر تاش دیکھ کر) آپ کو انڈور گیمس سے دل چسپی معلوم ہوتی ہے۔

خالد : جی ایسی کوئی خاص دل چسپی تو نہیں۔ اس وقت تو صرف وقت گزاری کے لیے لے بیٹھا تھا۔

ناظم : مجھے انڈور گیمس سے کبھی دل چسپی نہیں رہی ہمیشہ آؤٹ ڈور گیمس کھیلتا رہا ہوں۔

خالد : اچھا۔ (دل چسپی لیتے ہوئے) آپ کا پسندیدہ کھیل کون سا تھا۔

ناظم : ویسے تو میں ہر کھیل میں دل چسپی لیتا تھا مگر میرا پسندیدہ کھیل فٹ بال تھا۔ صحت مند نوجوانوں کا کھیل۔ کالج چھوڑنے کے بعد شکار کھیلتا رہا اور اب (مسکرا کر) آپ کہیں گے میں بھی کس قدر باتونی آدمی ہوں۔

خالد : جی نہیں۔ اس عمر میں اتنے دل چسپ آدمی میں نے کم ہی دیکھے ہیں۔

ناظم : عمر! عمر کیا ہوتی ہے۔ اچھا خیر۔ میری عمر کیا ہوگی۔

خالد : یہی کوئی۔

ناظم : آج میں پورے 65 سال کا ہوگیا ہوں۔ 65 سال کا۔ 21 جولائی۔

خالد : (حیرت سے) 65 سال! لیکن آپ کی صحت۔

ناظم : جی ہاں میری صحت کافی اچھی ہے۔ میں اونچے اونچے پہاڑوں پر چڑھ سکتا ہوں دوڑ سکتا ہوں اور کبھی کبھی تو سچ مچ مجھے حسین تتلیوں کے پیچھے دور دور تک دوڑنا پڑتا ہے۔

خالد : (مسکرا کر) تتلیاں!

ناظم : جی ہاں آج کل میرا مشغلہ صبح سے شام تک تتلیاں پکڑنا ہے۔ آج بھی میں نے سات آٹھ تتلیاں پکڑی ہیں۔ بہت خوبصورت۔ بے حد حسین۔

(وحید کافی لے کر آتا ہے اور ناظم کو حیرت سے دیکھ کر)

وحید : تم۔ یعنی کہ آپ!

ناظم : آج 21 جولائی ہے۔ شاید تم بھول گئے کہ میں اس تاریخ کو یہاں ضرور آتا ہوں۔ آج میری عمر 65 سال کی ہوگئی ہے اور میں چالیس سال سے برابر آرہا ہوں۔ اسی تاریخ کو— (مسکرا کر) یوں سمجھ لو کہ اپنی سال گرہ منانے۔

(وحید کشتی میز پر رکھتا ہے) شاید تم سوچ رہے ہوگے کہ میں مرگیا۔

وحید : جی نہیں— میں ایسا بھلا کیوں سوچنے لگا۔

ناظم : (مسکرا کر) میرے اکثر دوست ایسا ہی سوچنے لگتے ہیں اور جب میں دوچار سال بعد اچانک ان کے سامنے آجاتا ہوں تو انھیں بڑی حیرت ہوتی ہے۔

وحید : میں آپ کے لیے پیالی لاتا ہوں۔

(تیزی سے کمرے سے چلا جاتا ہے)

ناظم : یہ میرا بڑا پرانا دوست ہے۔ بہادر بھی ہے (خالد اب اسے ایسی نظروں سے دیکھتا ہے جیسے ناظم بہت پراسرار ہو۔ ناظم اس پر دھیان نہ دے کر) ہم دونوں اکثر خطرناک جنگلوں میں خطرناک درندوں کا شکار کھیلتے رہے ہیں (خالد خاموش رہتا ہے اور ویسی ہی نظروں سے اسے دیکھتا رہتا ہے۔ ناظم

غور سے خالد کو دیکھ کر مسکراتے ہوئے) آپ ایسی نظروں سے مجھے کیوں گھور رہے ہیں۔

خالد : جی کوئی بات نہیں۔

ناظم : (قہقہہ مار کر) شاید آپ مجھے ان پہاڑوں کا کوئی بھوت سمجھ رہے ہیں۔ نہیں بھائی۔ میں انسان ہوں بھوت پریت نہیں۔ اس دنیا میں پورے 65 سال سے انسانوں کی طرح رہتا رہا ہوں۔ یہ بات ضرور ہے کہ میں ابھی کنوارا ہوں۔

خالد : کنوارا۔

ناظم : جی ہاں۔ بالکل کنوارا۔ فی الحال میں نے شادی کا خیال ملتوی کر رکھا ہے۔ (ہنس کر) میرے دوست مجھے اولڈ بیچلر کہتے ہیں۔ مجھے اولڈ کے لفظ پر سخت اعتراض ہوتا ہے لیکن بیچلر کا لفظ سن کر اتنی ہی خوشی ہوتی ہے (مسکرا کر) اب تو آپ مجھے بھوت پریت نہیں سمجھ رہے ہیں۔

خالد : جی نہیں۔ میں نے پہلے بھی۔

ناظم : (بات کاٹ کر) پہلے تو آپ نے ایسی ہی کوئی مخلوق سمجھ لیا تھا۔ (خالد گھڑی دیکھتا ہے) آپ کسی کا انتظار کر رہے ہیں؟ یہ کم بخت منحوس جگہ کچھ ایسی ہی ہے کہ جو بھی یہاں آتا ہے اسے کسی نہ کسی کا انتظار ہوتا ہے اور کسی کسی کو تو چالیس چالیس سال انتظار کرنا پڑتا ہے۔

(وحید پیالی لاکر میز پر رکھتا ہے۔ ناظم اسے غور سے دیکھ کر) تیسری پیالی کہاں ہے۔

وحید : تیسری۔

ناظم : ہاں تیسری۔ تمھارے لیے۔ کیا آج تم میرے ساتھ کافی نہیں پیو گے۔

وحید : مگر میں تو۔

ناظم : جھوٹ مت بولو۔ ابھی تم نے کافی نہیں پی (خالد کی طرف دیکھ کر) آپ کو کوئی اعتراض ہے۔

خالد : جی نہیں۔ مجھے کیا اعتراض ہوگا۔

ناظم : یہ چالیس سال سے میرے ساتھ بیٹھ کر چائے اور کافی پی رہا ہے۔ جاؤ ایک پیالی اور لاؤ (وحید کمرے سے چلا جاتا ہے) ہم نے عجیب عجیب کامپلیکس پیدا کر لیے ہیں یہ چھوٹا ہے وہ بڑا۔ یہ امیر ہے وہ غریب (خالد سگریٹ کیس ناظم کی طرف بڑھاتا ہے) شکریہ۔ میں پائپ پیتا ہوں۔ (جیب سے پائپ نکال کر اس میں تمباکو بھرتا ہے۔ اسے جلا کر دو چار کش لے کر) ٹھنڈی راتوں میں آتش دان کے پاس بیٹھ کر اس طرح پائپ پینا مجھے بہت پسند ہے۔ (ٹھنڈی سانس بھر کر) مگر یہ مواقع زندگی میں بہت کم آتے ہیں یوں سمجھ لیجیے سال میں ایک بار 21 جولائی— آپ نے بتایا نہیں آپ کس کا انتظار کر رہے ہیں۔

خالد : جی— میں اپنے ایک دوست کا انتظار کر رہا ہوں۔

ناظم : (قہقہہ مار کر) اور یقینی ہی کوئی خاتون دوست ہوگی۔ نوجوان اپنا وقت ضائع نہ کرو (پائپ جلانے کے لیے ماچس جلاتا ہے جس کی روشنی میں اس کے چہرے کی جھریاں اور گہری نظر آنے لگتی ہیں ٹھنڈی سانس بھر کر) کوئی خاتون دوست وقت پر نہیں آتی۔

(دونوں خاموش ہو جاتے ہیں۔ ناظم کے چہرے پر سنجیدگی کچھ زیادہ ہو جاتی ہے۔ وحید تیسری پیالی لے کر آتا ہے)۔

وحید : آج انتہائی خراب موسم ہے۔ سردی غیر معمولی ہے اور ہوا تو اس قدر تند و تیز ہے کہ

ناظم : (بات کاٹ کر) سب فضول بکواس ہے۔ موسم ہر سال یونہی آتا ہے اور چلا جاتا ہے— (قہقہہ مار کر) وحید! ابھی ایک دلچسپ لطیفہ ہوا۔ (خالد کی طرف اشارہ کر کے) ہمارے نوجوان دوست نے مجھے پہاڑوں کا بھوت سمجھ لیا (پھر قہقہہ لگاتا ہے) خالد میاں 65 سال میں انسان بھوت نہیں ہو جاتا۔

خالد : (کسی قدر شرمندگی کے لہجے میں) آپ تو مجھے بلا وجہ شرمندہ کر رہے ہیں۔

ناظم : خیر چھوڑیے آپ نے مجھے بھوت نہیں سمجھا۔ مگر میرے متعلق کوئی غلط رائے

ضرور قائم کی تھی۔ ہوسکتا ہے آپ نے مجھے چور ڈاکو سمجھا ہو۔

خالد : جی نہیں ایسی بھی کوئی بات نہیں تھی۔

ناظم : (ہنس کر) ایسی بات تو ضرور تھی۔ آپ سوچ رہے ہوں گے کہ میں یوں جیب میں ہاتھ ڈالوں گا (جیب میں ہاتھ ڈالتا ہے) پھر ایک ریوالور نکالوں گا (ریوالور نکالتا ہے) اور اس کا رخ آپ کی طرف کر کے کہوں گا ہینڈز اَپ (خالد غیراختیاری طور پر ہاتھ اوپر کر لیتا ہے۔ ناظم قہقہہ لگاتا ہے) اپنے ہاتھ نیچے کرلیجیے۔ یہ ریوالور میں اپنی حفاظت کے لیے رکھتا ہوں دوسروں کو ستانے کے لیے نہیں۔

خالد : (شرمندگی سے مسکرا کر) آپ نے تو مجھے ڈرا دیا۔

ناظم : میرے ساتھ اکثر ہوا ہے (ریوالور جیب میں رکھ کر) میں پہاڑوں پر تتلیاں پکڑ رہا ہوں اور لوگوں نے مجھے جانے کیا سمجھ لیا (ہنس کر) ایک دو مرتبہ تو پولیس اسٹیشن بھی جانا پڑا آپ سوچ رہے ہوں گے کہ آخر میں یوں مارا مارا کیوں پھرتا ہوں۔ میرے آگے پیچھے کوئی نہیں ہے صرف ایک بہن ہے، اس سے بھی کبھی کبھی ہی ملاقات ہوتی ہے (ہنس کر) اور وہ بھی اس وقت جب وہ یہ سمجھ لیتی ہے کہ میں مرگیا ہوں۔ میرے سامنے آنے پر وہ مجھے ایسے حیرت سے دیکھتی ہے جیسے میں ناظم نہیں ناظم کا بھوت ہوں۔ آپ میری باتوں سے بور تو نہیں ہو رہے ہیں۔

خالد : جی نہیں۔ آپ کی باتیں اس قدر دلچسپ ہیں کہ موسم کی خرابی کا احساس ہی نہیں رہا۔

ناظم : آج جانے کیوں خوب باتیں کرنے کو جی چاہ رہا ہے (ایک دم وحید کی طرف دیکھ کر) تمھاری لڑکی کی شادی میں نہ آسکا۔ مجھے افسوس ہے۔ تم تو جانتے ہو کہ اب میں سال میں ایک مرتبہ آتا ہوں۔ 21 جولائی کو۔ شادی تو بخیر و خوبی ہوگئی؟ بچی خوش تو ہے؟

وحید : ہاں۔ بہت خوش ہے۔ جب بھی آتی ہے تمھیں ضرور پوچھتی ہے۔

ناظم : اچھا۔ اسے اپنا چاچا یاد ہے۔لڑکیاں ہمیشہ یونہی بے وقوف ہوتی ہیں۔ (کچھ دیر خاموش رہ کر) کبھی کوئی مجھے پوچھتا ہوا تو نہیں آیا تھا۔

وحید : (غور سے اس کا چہرہ دیکھ کر) تم چالیس سال سے یہی سوال کرتے رہے ہو اور میں ہمیشہ ایک ہی جواب دیتا رہا ہوں کہ مجھے افسوس ہے۔۔

ناظم : کچھ عادت سی ہوگئی ہے۔ خیر کوئی بات نہیں۔

(باہر سے کسی بچے کی آواز۔ بابا۔ بابا۔کوئی موٹر آرہی ہے)

وحید : اچھا— میں آرہا ہوں۔

(خالد بے چینی سے اٹھ کر کھڑا ہوتا ہے)

ناظم : (خالد سے) بیٹھ جاؤ۔ تمھیں جس کا انتظار ہے وہ، وہ نہیں ہے۔

خالد : وہ، وہی ہے۔

ناظم : وہ، وہ ہرگز نہیں ہے۔ موسم خراب ہے اور تم اس کے عادی نہیں ہو (وحید کمرے سے باہر چلا جاتا ہے۔ خالد بھی دروازے کی طرف بڑھتا ہے۔ ناظم اس کا ہاتھ پکڑ کر) میں کہتا ہوں بیٹھ جاؤ۔

خالد : میرا ہاتھ چھوڑ دیجیے۔

ناظم : نہیں۔ بے وقوف نہ بنو۔ اوّل تو وہ، وہ نہیں ہے اور اگر وہ، وہ ہے تو اسے خود یہاں آنے دو۔

خالد : لیکن آپ۔

ناظم : میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ تم اپنی خاتون دوست کا انتظار کررہے ہو اور اس سے ملنے کے لیے بے چین ہو۔

(خالد کرسی پر بیٹھ جاتا ہے۔ وحید تیزی سے کمرے میں آتا ہے اور ٹارچ اٹھا کر جاتے ہوئے)

وحید : شاید ڈرائیور راستہ بھول گیا ہے۔ غلط راستے پر جارہا ہے ادھر گہری کھائیاں

ہیں۔ (وحید تیزی سے کمرے میں چلا جاتا ہے۔ خالد پھر کھڑا ہوجاتا ہے۔ ناظم اس کا ہاتھ پکڑ کر بٹھانے کی کوشش کرتے ہوئے)

ناظم : میں کہتا ہوں بیٹھ جاؤ۔

خالد : مگر وہ غلط راستے پر جارہی ہے۔

ناظم : وہ صحیح راستے پر آجائے گی باہر بہت سردی ہے۔

خالد : مجھے اس کی پروا نہیں (جھٹکا دے کر ہاتھ چھڑانے کی کوشش کرتے ہوئے) میرا ہاتھ چھوڑ دیجیے۔ میں آپ سے اتنا بے تکلف نہیں ہوں کہ آپ میرا راستہ روکیں۔

ناظم : بزدل نہ بنو نوجوان ہمت سے کام لو۔

خالد : آپ کی بہادری آپ کو مبارک (دروازے کی طرف جاتا ہے۔ ناظم کھڑا ہوکر سامنے آتا ہے) میرا راستہ نہ روکیے۔ ورنہ۔

ناظم : تم طاقت کا استعمال کروگے (بے پروائی سے مسکرا کر) میں طاقت کی دھمکی سے نہیں ڈرتا 65 سال کی عمر میں بھی تم جیسے نوجوانوں کا مقابلہ کرسکتا ہوں۔

خالد : مگر آپ میرا راستہ کیوں روک رہے ہیں۔

ناظم : اس لیے کہ تم مردوں کی توہین کر رہے ہو۔ یہ شیولری نہیں ہے۔ (باوقار لہجے میں) جاؤ اپنی کرسی پر بیٹھ جاؤ۔ اگر وہ، وہی ہے تو وہ خود تمھارے پاس آجائے گی۔ (خالد بے چینی سے کمرے میں ٹہلنے لگتا ہے۔ موٹر کی آواز قریب تر ہوتی جاتی ہے اور پھر بالکل قریب آکر بند ہوجاتی ہے) کرسی پر باوقار انداز سے بیٹھ جاؤ۔ (خالد دروازے کی طرف بڑھتا ہے) میں کہتا ہوں کرسی پر بیٹھ جاؤ۔ (خالد مجبوراً بیٹھ جاتا ہے مگر اس کے انداز سے برابر بے چینی ظاہر ہوتی رہتی ہے۔ ناظم اپنے پائپ میں تمباکو بھرتا ہے اور اسے جلاتا ہے۔ خالد پھر کھڑے ہونے کی کوشش کرتا ہے) بیٹھے رہو۔

ناظم آتش دان کے پاس جاکر کھڑا ہوجاتا ہے اور دروازے کی طرف بیٹھ کر کے پائپ پینے لگتا ہے۔ کچھ دیر بعد دروازہ کھلتا ہے اور ایک نوجوان لڑکی

کمرے میں داخل ہوتی ہے۔ وہ سردی سے کانپ رہی ہے۔ خالد کو دیکھ کر)۔

لڑکی : بہت خراب موسم ہے۔

خالد : (اس کے پاس جا کر) آتش دان کے پاس آجاؤ۔ سردی زیادہ ہے۔

(لڑکی آہستہ آہستہ آتش دان کے پاس آتی ہے اور ناظم پر ایک اچٹتی ہوئی نظر ڈالتی ہے۔ ناظم اسے حیرت سے دیکھ کر)

ناظم : افشاں — آخر چالیس سال بعد تم آ ہی گئیں۔ آج 21 جولائی ہے۔

لڑکی : جی — افشاں — آپ نے غلط سمجھا۔ میں افشاں نہیں ہوں۔

ناظم : تم افشاں نہیں ہو۔ وہی قد، وہی صورت، وہی آواز، وہی لہجہ، وہی لباس۔ تم افشاں کیسے نہیں ہو۔

لڑکی : (گھبرا کر) جی نہیں میرا نام نورافشاں ہے۔ افشاں میری ماں کا نام ہے — آپ۔

خالد : یہ مسٹر ناظم ہیں۔

(ناظم کرسی پر بیٹھ جاتا ہے اور غور سے لڑکی کو دیکھنے لگتا ہے۔ پھر آہستہ سے)

ناظم : تم افشاں نہیں ہو اس کی لڑکی ہو۔ کیا افشاں نے شادی کر لی۔

(غور سے لڑکی کو دیکھتا ہے۔ ہاتھ سے پائپ چھوٹ کر گر پڑتا ہے اور آنکھیں برابر لڑکی کے چہرے پر جمی رہتی ہیں)

(پردہ)

موت سے پہلے آدمی

افرادِ تمثیل (کردار)

(1) زیتون (کالج میں لیکچرر) (2) عباس (زیتون کا شوہر) (3) محسن (عباس کا دوست) (4) امتیاز (ڈاکٹر زیتون کا پہلا شوہر) (5) مٹّن (عباس کا نوکر)

منظر

(ایک ریسٹ ہاؤس کا کمرہ جس میں ایک صوفہ سیٹ اور دو چار کرسیاں ہیں ایک جانب چارپائی ہے جس پر صاف ستھرا بستر ہے۔ چھت میں پنکھا ہے جو آہستہ آہستہ چل رہا ہے۔ پنکھے کے نیچے زیتون بیٹھی ایک کتاب کے مطالعے میں مشغول ہے آنکھوں پر چشمہ ہے۔ سامنے ایک گول میز رکھی ہے جس پر قلم اور کچھ کاغذات رکھے ہیں۔ دائیں جانب دروازہ ہے جو ایک برآمدے میں کھلتا ہے۔ کچھ دیر بعد عباس اسی دروازے سے اندر آتا ہے۔ زیتون نظر اٹھا کر اسے دیکھتی ہے مگر عباس ایک اچٹتی ہوئی نظر اس پر ڈال کر آگے بڑھ جاتا ہے اور کھڑکی کے پاس کھڑا ہو کر باہر دیکھنے لگتا ہے۔ زیتون کچھ دیر خاموشی سے اسے دیکھتی رہتی ہے پھر آہستہ سے)۔

زیتون : آپ نے چائے پی لی

(عباس مڑ کر اسے دیکھتا ہے چند سیکنڈ خاموش رہ کر انتہائی طنزیہ لہجے میں)

عباس : آپ کو اس کتاب سے فرصت مل گئی۔

(زیتون کچھ دیر خاموش رہتی ہے پھر شکست خوردہ لہجے میں مایوسی سے)

زیتون : میں نے ممّن سے چائے کے لیے کہا تھا جانے کہاں غائب ہو گیا۔

عباس : جب آپ ہی کو میرا خیال نہیں تو اسے کیوں ہونے لگا نوکر آخر نوکر ہوتا ہے۔

زیتون : (کتاب بند کرتی ہے۔ عینک اُتار کر میز پر رکھتے ہوئے) آپ تشریف رکھیے۔ میں کچن میں جا کر دیکھتی ہوں۔۔

عباس : (بے حد جارحانہ انداز میں) آپ کیوں تکلیف فرماتی ہیں بلاوجہ وقت ضائع ہوگا۔

زیتون : آپ تو بلا ضرورت الجھنے کے مواقع پیدا کرتے ہیں۔ آپ نہانے چلے گئے تھے اسی لیے میں نے جلدی نہیں کی۔

عباس : میں آخری غسل تو نہیں کر رہا تھا۔ آپ جانتی تھیں کہ مجھے ذرا جلدی تھی۔

زیتون : آپ بیٹھیے۔ چائے ابھی آجاتی ہے۔

(کھڑے ہو کر دروازے کی طرف بڑھتی ہے)

عباس : بس بس رہنے دیجیے۔ آپ کا وقت بہت قیمتی ہے۔

زیتون : میرے وقت کا کیا ہے — میں —

عباس : (بات کاٹ کر) ہے کیوں نہیں (بہت ہی طنزیہ لہجے میں) آپ کے وقت کا ایک ایک لمحہ اس محبت سے زیادہ قیمتی ہے جو آپ کا شوہر آپ کو دیتا ہے۔ وہ ان خوشیوں سے زیادہ قیمتی ہے جو آپ کا شوہر اپنی دلچسپیوں سے حاصل کرتا ہے۔

زیتون : لیکن آپ کی دلچسپیاں۔

عباس : (لقمہ دیتے ہوئے) ایسی ہیں جن سے آپ کو کوئی دلچسپی نہیں۔ (طنزیہ انداز میں) اور ہونے بھی کیوں لگی۔ آپ کی دلچسپی تو کالج اسٹاف روم میں بیٹھ کر قہقہے لگانے میں ہے۔

زیتون : (کسی قدر ناگواری سے) دیکھیے آپ بلا وجہ۔

عباس : (بات کاٹ کر) مسز زیتون عباس۔ حقیقت ہمیشہ کڑوی ہوتی ہے آپ خود فیصلہ کیجیے اور انصاف سے کہیے کہ آپ کو میری ذات میں زیادہ دلچسپی ہے یا ان خرانٹ موٹے موٹے چشموں سے مسلح پروفیسروں سے۔

زیتون : اگر آپ ایمان داری اور انصاف سے پوچھتے ہیں تو خدا گواہ ہے کہ۔۔۔

عباس : (بات کاٹ کر طنزیہ قہقہہ لگا کر) کیوں بے چارے خدا کی مٹی پلید کرتی ہو۔ وہ پہلے ہی ہم انسانوں کو پیدا کر کے پچھتا رہا ہے۔

زیتون : (غصے سے) وہ انسان پیدا کر کے پچھتا رہا ہے یا نہیں۔ یہ تو مجھے معلوم نہیں مگر شکی مرد پیدا کر کے ضرور پچھتا رہا ہوگا (چند سیکنڈ خاموش رہ کر) آپ کی دلچسپیاں۔

عباس : (لقمہ دیتے ہوئے طنزیہ) غیر دلچسپ ہیں۔ غیر انسانی ہیں اور بور کر دینے والی ہیں بے چارا ڈاکٹر امتیاز تو ان غیر دلچسپ اور غیر انسانی دلچسپیوں کا شکار نہیں تھا، پھر آپ نے اس سے طلاق کیوں لے لی۔

زیتون : دیکھیے آپ بلا وجہ (کچھ دیر خاموش رہ کر اُکتائے ہوئے لہجے میں) جانے آپ بار بار اس موضوع کو کیوں چھیڑتے ہیں جس سے مجھے تکلیف ہوتی ہے۔ آپ جانتے ہیں کہ میرے اور ان کے اختلافات کسی اور وجہ سے تھے۔

عباس : کسی اور وجہ سے! وہ کوئی بدچلن انسان بھی نہیں تھا پھر اختلافات کی کیا وجہ ہو سکتی ہے۔

زیتون : میں کئی بار کہہ چکی ہوں کہ بات صرف اتنی تھی کہ وہ اپنے پیشے میں اس قدر مشغول رہتے تھے کہ میں ازدواجی زندگی سے تقریباً محروم ہو گئی تھی۔ ویسے وہ ایک عظیم انسان۔ خیر۔

عباس : ویسے میری دلچسپیاں آپ کو پسند نہیں ہیں اور آپ کا یہ دن رات کتابیں پڑھتے رہنا مجھے پسند نہیں پھر آپ مجھ سے۔

زیتون : (دروازے کی طرف جاتے ہوئے نفرت سے) آپ بیٹھیے میں چائے لاتی ہوں۔

عباس : رہنے دیجیے ایسی جلدی بھی کیا ہے۔ چائے بھی آجائے گی۔

زیتون : اور اگر میں ہی لے آؤں تو کوئی ہرج ہے۔

(زیتون باہر چلی جاتی ہے۔ عباس سگریٹ جلا کر دو چار کش لیتا ہے کہ محسن کمرے میں آتا ہے)

عباس : جانے کہاں غائب ہوگئے تھے میں کب سے تمھارا انتظار کر رہا ہوں۔

محسن : جنگل ہی سے آرہا ہوں مگر ایک سخت ہیبت ناک خبر لے کر۔

عباس : (کرسی پر بیٹھ کر) ہیبت ناک خبر!

محسن : (چہرے کا پسینا پونچھتے ہوئے) ہاں — (جیب میں سے سگریٹ کا پیکٹ نکالتا ہے اسے خالی پاکر پھینک دیتا ہے۔ کرسی پر بیٹھ کر) سگریٹ دینا (عباس سگریٹ کا پیکٹ دیتا ہے۔ محسن سگریٹ جلا کر) قصبہ میں سخت ہیضہ پھیل گیا ہے کئی آدمی مر چکے ہیں۔

عباس : خبر تو واقعی ہیبت ناک ہے (کچھ دیر خاموش رہ کر) ہانکا کرنے والوں کا انتظام ہوا۔

محسن : مچان تو تیار ہوگیا ہے مگر ہانکا کرنے کو کوئی تیار نہیں۔

عباس : پھر کیا کیا جائے۔

محسن : میرا خیال ہے پروگرام ختم کردیا جائے۔

عباس : کمال کرتے ہو۔ مچان تو اسی جگہ تیار ہوا ہے جہاں ہم نے پسند کیا تھا۔

محسن : ہاں۔

عباس : ٹھیک ہے۔ ہم چل کر مچان پر بیٹھتے ہیں گرمی میں جانور وہاں پانی پینے آتا ہوگا۔

محسن : لیکن ہیضے کا حملہ بڑا سخت ہے۔ ہمارا یہاں ٹھہرنا مناسب نہیں۔

عباس : یار تم بھی غضب کے بزدل ہو جیسے ہیضہ ہماری تمھاری تاک لگائے بیٹھا ہے۔

محسن : تاک لگائے نہ بھی بیٹھا ہو مگر احتیاط کہاں کی بری چیز ہے (مسکرا کر) اور پھر شکاری کے لیے احتیاط پہلی شرط ہے۔

عباس : (ہنس کر) اور بزدلی آخری شرط بھی نہیں۔ بس چائے پی لیں پھر چلتے ہیں۔

محسن : مگر — (کچھ دیر رک کر) بھابی کہاں ہیں۔

عباس : چائے لانے گئی ہیں (بلند آواز سے) مُنّن — ارے مُنّن چائے تیار ہوئی۔

زیتون : (چائے کی کشتی لیے ہوئے کمرے میں آ کر) مُنّن بازار گیا ہے۔

عباس : بازار! کیوں؟

زیتون : کچھ سامان منگوایا ہے (چائے کی کشتی میز پر رکھتی ہے۔ ایک کرسی پر بیٹھ کر چائے پیالیوں میں نکالتے ہوئے محسن سے) آپ کب تشریف لے آئے۔

محسن : بس ابھی۔ (زیتون چائے کی پیالیاں محسن اور عباس کو دیتی ہے۔ محسن سگریٹ پھینک کر پلیٹ میں سے ایک بسکٹ اٹھاتے ہوئے مسکرا کر) بھابی آپ کو شکار سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔

زیتون : جی ہاں کچھ زیادہ نہیں۔

عباس : کچھ سے کیا مطلب۔ یوں کہیے بالکل نہیں ہے۔ انھیں تو بس کتابیں ہونا چاہیں۔

زیتون : یوں ہی سمجھ لیجیے۔ ویسے بھی شکار عورتوں کا گیم نہیں ہے۔

محسن : (قہقہہ لگاتا ہے۔ پھر زیتون کی طرف دیکھ کر) مغل شہزادیوں کا تو یہ پسندیدہ اسپورٹ تھا اور یہ تو کوئی دور کی بات نہیں کہ بیگمات بھوپال شیر تک کا شکار کرتی تھیں۔

زیتون : (ہنس کر) ویسے تو مغل شہزادیاں چوگان بھی کھیلا کرتی تھیں کل آپ کہیں گے کہ میں پولو کیوں نہیں کھیلتی۔

(محسن قہقہہ لگاتا ہے۔ زیتون مسکرا کر خاموش ہو جاتی ہے۔ عباس اپنی پیالی میز پر رکھ کر)

عباس : جیپ سے چلنا ہے؟

محسن : پیدل چل سکتے ہیں صرف ڈیڑھ دو میل کا فاصلہ ہے۔ مگر—

عباس : یہ اگر مگر چھوڑو۔ نہانا ہے تو جلدی نہالو اور چلو۔

محسن : (سوچتے ہوئے) اب میں واپس آ کر ہی نہاؤں گا۔

عباس : بس تو پھر چلو۔ (اٹھ کر باہر جاتے ہوئے) میں ابھی آیا۔

(عباس باہر چلا جاتا ہے۔ زیتون کچھ دیر خاموش رہ کر)

زیتون : محسن صاحب! آخر یہ پروگرام کتنے دن کا اور ہے۔

محسن : ابھی تو چار پانچ دن کا اور ہے۔

زیتون : اب میں بری طرح اکتا گئی ہوں خدا کے لیے اسے کسی طرح مختصر کرلیجیے

(منن کمرے میں آتا ہے اس کے چہرے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ بہت گھبرایا ہوا ہے۔ زیتون اسے دیکھ کر) کیا بات ہے بہت جلدی آگیا سامان نہیں لایا۔

منن : (پسینا پونچھتے ہوئے) کیسے لاتا۔ قصبے کے چاروں طرف تو پولس کا پہرہ بیٹھا ہے۔

زیتون : (حیرت سے) پولس کا پہرہ! کیوں؟

منن : قصبے میں ہیضہ پھیل گیا ہے۔ لوگ پھٹا پھٹ مر رہے ہیں۔

زیتون : ہیضہ پھیل گیا ہے! (محسن کی طرف دیکھ کر) محسن صاحب۔

محسن : جی ہاں۔ بڑا سخت اٹیک ہوا ہے۔

زیتون : تب تو ہمیں یہاں نہیں ٹھہرنا چاہیے۔ قصبہ ہے ہی کتنی دور!

محسن : جی ہاں۔ میں عباس سے کہہ چکا ہوں مگر اس پر بھلا کہیں اثر ہوتا ہے۔

زیتون : اُنھیں کسی طرح واپس چلنے پر آمادہ کر لیجیے بلا وجہ کا رسک لینا کہاں کی عقل مندی ہے؟

محسن : وہ ایک نمبر کا ضدی ہے۔ آپ بھی کوشش کیجیے میں بھی کروں گا۔

زیتون : ایسی بھی کیا ضد کہ انسان اپنی زندگی ہی خطرے میں ڈال دے۔

(دونوں خاموش ہوجاتے ہیں۔ کچھ دیر بعد عباس دو بندوقیں لیتے ہوئے آتا

ہے۔ ایک محسن کی طرف بڑھا کر)

عباس : لو — چلو۔

زیتون : لیکن سنیے تو سہی۔

عباس : میں سن چکا ہوں کہ قصبے میں ہیضہ پھیل گیا ہے۔

زیتون : پھر یہاں ٹھہرنا کون سی عقل مندی ہے۔

عباس : عقل مند لوگ واپس جا سکتے ہیں۔

(جواب کا انتظار کیے بغیر کمرے سے چلا جاتا ہے۔ محسن بھی نیم دلی سے اس کے پیچھے پیچھے جاتا ہے۔ زیتون کچھ دیر خاموش رہتی ہے۔ پھر منّن کی طرف دیکھ کر برتنوں کی طرف اشارہ کر کے)۔

زیتون : انھیں لے جاؤ۔

منّن : (برتن سمیٹتے ہوئے) جانے صاحب کبھی کبھی اس قدر ضدی کیوں ہو جاتے ہیں۔

زیتون : کل تک تو ہیضے کی کوئی خبر نہیں تھی۔

منّن : کل بھی جب بازار گیا تھا تو لوگ پریشان نظر آرہے تھے۔

زیتون : پھر تو نے کل ہی کیوں نہیں کہا۔

منّن : میں نے ادھر دھیان ہی نہیں دیا تھا۔ بس سودا لے کر لوٹ آیا تھا۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ ایک ہی رات میں قصبے کا قصبہ چوپٹ ہو جائے گا (برتن اٹھا کر) بیگم صاحب جیسے بھی ہو۔ اِس منحوس قصبے سے بھاگ چلیے۔ مجھے یوں بلا وجہ مرنے سے گھبراہٹ ہوتی ہے۔

زیتون : (مسکرا کر) بلاوجہ مرنے سے!

منّن : جی ہاں۔ بلاوجہ مرنا نہیں تو اور کیا ہے۔ بس کھایا پیا اور مر گئے۔ اب صاحب آئیں تو چلنے کا پھر کہیے گا۔

(زیتون کوئی جواب نہیں دیتی۔ منّن برتن اٹھا کر چلا جاتا ہے۔ زیتون تھوڑی دیر بیٹھی سوچتی رہتی ہے۔ پھر چشمہ آنکھوں پر رکھ کر کتاب پڑھنے لگتی ہے۔ ڈاکٹر

امتیاز کمرے میں آتا ہے اور زیتون کو دیکھ کر ٹھٹھک جاتا ہے۔ زیتون بھی نظریں اٹھا کر اسے دیکھتی ہے اور گھبرا جاتی ہے۔ کچھ دیر دونوں ایک دوسرے کو خاموشی سے دیکھتے رہتے ہیں۔ پھر امتیاز واپس جانے کے لیے مڑتا ہے۔ زیتون اسے واپس جاتا دیکھ کر)

زیتون : آیئے۔ (ایک کرسی کی طرف اشارہ کر کے) تشریف رکھیے۔

امتیاز : مگر تم۔۔ یعنی آپ۔۔ میرا مطلب ہے کہ آپ یہاں۔

زیتون : (ایسی مسکراہٹ سے جیسے خود پر طنز کر رہی ہو) جی ہاں۔ میں یہاں شکار کھیلنے آئی ہوں۔

امتیاز : شکار! یعنی آپ کا مطلب ہے کہ

زیتون : جی ہاں میرا مطلب شکار ہی سے ہے۔

امتیاز : (مسکرا کر) یہ مرض کب سے لاحق ہوگیا۔

زیتون : بس ہوگیا اتنا ہی سمجھ لیجیے۔ (چند سیکنڈ خاموش رہ کر نظریں نیچی کر کے) کیا آپ تشریف نہیں رکھیں گے۔

امتیاز : میں تو نہانے چلا آیا تھا۔ ہم نے پاس ہی اپنا کیمپ لگایا ہے۔

زیتون : کیمپ۔ کیسا کیمپ!

امتیاز : قصبے پر ہیضے کا سخت حملہ ہوا ہے۔ میں ایک امدادی پارٹی لے کر آیا ہوں۔

زیتون : جی ہاں۔ ابھی ابھی معلوم ہوا ہے کہ کافی لوگ ہیضے کا شکار ہو چکے ہیں۔

امتیاز : اگر فوری امداد نہیں دی گئی تو بہت سی اور جانیں خطرے میں پڑ سکتی ہیں۔

زیتون : (چند سیکنڈ رک کر) چائے پی جیے گا (بلند آواز سے) ممن۔ ارے ممن۔

امتیاز : دیکھیے اس وقت۔ یعنی میرا مطلب ہے کہ مجھے جلدی قصبے میں پہنچنا ہے۔ (زیتون ایسی نظروں سے دیکھتی ہے جن میں بڑی مایوسی ہے امتیاز اسے محسوس کر کے) اگر آپ بضد ہیں تو منگوا لیجیے۔

زیتون : شکریہ! بلند آواز سے) ممن۔ ارے ممن (ممن آتا ہے) ذرا جلدی سے چائے

بڑا لا (امتیاز کی طرف دیکھ کر) نہانے کے لیے پانی رکھوادوں (امتیاز خاموش رہتا ہے۔ مُنی کی طرف دیکھ کر) غسل خانے میں نہانے کے لیے پانی رکھ دے۔

(مُنی کمرے سے چلا جاتا ہے)

امتیاز : آپ بھی احتیاط رکھیے گا کوئی چیز قصبے سے منگوا کر نہ کھائیے بلکہ مناسب تو یہ ہے (مسکرا کر) یہ شکار کا شوق کسی اور وقت پورا کر لیجیے گا۔

(زیتون اور امتیاز دونوں کچھ دیر خاموش رہتے ہیں مگر کبھی کبھی چور نظروں سے ایک دوسرے کو دیکھتے ہیں۔ کچھ دیر بعد امتیاز اس خاموشی کو توڑتے ہوئے)

امتیاز : اب تو آپ کی صحت ٹھیک رہتی ہے۔

زیتون : جی ہاں ایسی کوئی بری بھی نہیں رہتی۔

امتیاز : (مجرمانہ لہجے میں) مسٹر عباس تو ٹھیک ہیں۔

زیتون : جی ہاں وہ بھی ٹھیک ہیں (پھر دونوں اس طرح خاموش ہو جاتے ہیں جیسے ان کے پاس بات کرنے کو کوئی موضوع نہ ہو۔ زیتون کچھ دیر بعد نظریں نیچی کر کے) آپ نے دوسری — میرا مطلب ہے کہ۔

امتیاز : (زیتون کو دیکھتا ہے پھر پھیکی مسکراہٹ سے) جی نہیں۔ میں نے دوسری شادی نہیں کی۔

زیتون : کیوں۔ (امتیاز خاموش رہتا ہے زیتون ٹھنڈی سانس بھر کر) خوش قسمت ہیں آپ۔

امتیاز : (حیرت سے) جی۔

زیتون : جی کچھ نہیں (بات ٹالنے کے انداز میں) پھر تو آپ کو بڑی تکلیف ہوتی ہوگی۔

امتیاز : جی نہیں۔ کوئی تکلیف نہیں ہے۔

زیتون : مسز ثمینہ اب بھی آپ کے ساتھ کام کرتی ہیں۔

امتیاز : جی نہیں۔ میں نے امی کو بلا لیا ہے وہ گھر کی دیکھ بھال کر لیتی ہیں۔

زیتون : اور نور؟

امتیاز : جی ہاں وہ تو ہے باہر کا سارا کام اسی کے ذمے ہے اور باغیچے کی دیکھ بھال

کرتا ہے۔ اس مرتبہ گلابوں کی اچھی فصل آئی تھی۔ شہزادے پر بھی اس نے کچھ نئے تجربات کیے ہیں۔

زیتون : شہزادے پر!

امتیاز : جی ہاں وہی جو آپ نے فوارے کے پاس لگایا تھا اور شہزادہ نام رکھا تھا۔ نور کا خیال ہے کہ وہ اس کا رنگ تبدیل کر دے گا۔

زیتون : مگر اس کا رنگ تو پہلے ہی دل کش تھا۔

امتیاز : اس کا خیال ہے کہ وہ اس کا رنگ سیاہ نہیں تو سیاہی مائل ضرور کرسکتا ہے (زیتون خاموش رہتی ہے۔ خواب گاہ کے پاس جہاں آپ چاہتی تھیں میں نے دو کمرے بنوا لیے ہیں۔

زیتون : اچھا۔

امتیاز : مہمان آجاتے تھے واقعی تکلیف ہوتی تھی۔ آپ کا خیال ٹھیک تھا (کچھ دیر رُک کر) ٹائیگر مر گیا۔

زیتون : برا ہوا۔ بڑا شان دار کتا تھا۔ چھم چھم تو ہوگی۔

امتیاز : جی ہاں وہ تو ہے۔ اس سال اس نے بچے بھی دیے تھے۔

زیتون : (چند سیکنڈ رک کر) مسز ثمینہ اب کہاں کام کرتی ہیں مجھ سے ملنے تو ایک بار بھی نہیں آئیں۔

امتیاز : پتا نہیں۔ شاید کسی مشن ہاسپٹل میں اسے جگہ مل گئی ہے (دونوں خاموش ہوجاتے ہیں زیتون نظریں جھکا کر زمین کو دیکھنے لگتی ہے۔ اس کے چہرے پر تھکاوٹ کے آثار ہیں امتیاز اسے غور سے دیکھ کر) آپ کچھ بیمار نظر آرہی ہیں۔

زیتون : (نظریں اٹھا کر) جی نہیں۔

امتیاز : آپ کے چہرے سے تو ـــــ

زیتون : صرف تھکاوٹ ہے (طنز اور مایوسی سے) ہر غیر دلچسپ کام میں تھکاوٹ ہو ہی جاتی ہے۔

امتیاز : کیسا غیر دلچسپ کام۔

زیتون : جیسے یہی شکار کا مشغلہ۔

(امتیاز کھڑکی کے پاس جاکر کھڑا ہوجاتا ہے اور باہر دیکھنے لگتا ہے۔ کچھ دیر خاموشی رہتی ہے۔ امتیاز مڑ کر زیتون کو دیکھتا ہے جو دوپٹے کے پلو سے عینک پونچھ رہی ہے)

امتیاز : شاید آپ خوش نہیں ہیں۔

زیتون : (نظریں جھکا کر) جی۔ (پھر ایسے لہجے میں جس میں شدید تکلیف کا احساس ہوتا ہے) میں خوش ہوں۔ مجھے کوئی تکلیف نہیں۔

امتیاز : مگر (کچھ سوچ کر خاموش ہوجاتا ہے اور موضوع بدلنے کے انداز میں) آپ کا کالج کیسا چل رہا ہے۔

(ممن کمرے میں آ کر)

ممن : پانی غسل خانے میں رکھ دیا ہے اور چائے بھی تیار ہوگئی ہے۔

زیتون : پہلے نہایئے گا یا چائے پی جیے گا۔

امتیاز : پہلے نہالوں (دروازے کی طرف جاتے ہوئے) مسٹر عباس کہاں ہیں۔

(زیتون خاموش رہتی ہے۔ امتیاز کچھ اس طرح کمرے سے چلا جاتا ہے جیسے یہ سوال رسمی طور پر کیا ہو۔ زیتون عینک لگا کر کچھ دیر سوچتی رہتی ہے پھر کھڑے ہوکر کھڑکی کے پاس جاکر باہر کی طرف دیکھنے لگتی ہے۔ پھر مڑ کر ممن کو دیکھ کر)

زیتون : تولیا اور صابن غسل خانے میں رکھ دیا تھا۔

ممن : جی ہاں۔

زیتون : جب وہ نہا کر آجائیں تو چائے لے کر آجانا۔

ممن : بہت اچھا۔

(ممن کمرے سے چلا جاتا ہے۔ زیتون پھر کھڑکی سے باہر دیکھنے لگتی ہے۔

کچھ دیر بعد عباس اور محسن کمرے میں آتے ہیں۔ محسن، عباس کو سہارا دیے ہوئے ہیں۔ عباس کے چہرے سے کمزوری ظاہر ہورہی ہے اور وہ آہستہ آہستہ چل رہا ہے۔ زیتون مڑ کر دونوں کو دیکھتی ہے پھر گھبرا کر)

زیتون : کیا بات ہے (محسن، عباس کو ایک کرسی پر بٹھلا دیتا ہے۔ زیتون عباس کے پاس آکر) آخر بات کیا ہے آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے؟

(عباس کوئی جواب نہیں دیتا۔ محسن دونوں بندوقیں دیوار سے لگاتے ہوئے)

محسن : انھیں راستے میں قے ہوگئی۔

زیتون : (گھبرا کر) قے! میں نے پہلے ہی کہا تھا مگر آپ سنتے ہی کس کی ہیں (دروازے کے پاس آکر بلند آواز سے (منن۔ ارے منن ذرا دوڑ کر ادھر آ۔

منن : (باہر سے) آیا بیگم صاحب۔ چائے لا رہا ہوں۔

زیتون : چائے کو مار گولی۔ پہلے ادھر آ۔ (عباس کے پاس آکر) آپ کیسا محسوس کررہے ہیں (عباس کوئی جواب نہیں دیتا۔ اس کے چہرے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ خود کو بہت کمزور محسوس کررہا ہے۔ منن کمرے میں آتا ہے۔ زیتون اسے دیکھ کر) ڈاکٹر صاحب نہا چکے۔

منن : (عباس کو دیکھ کر گھبرا کر) صاحب۔ کیا بات ہے۔

زیتون : پہلے جا کر تو ڈاکٹر صاحب کو تو دیکھ۔

(منن کمرے سے چلا جاتا۔ عباس، زیتون کو کمزور آواز میں)

عباس : کون ڈاکٹر صاحب۔

زیتون : وہ— میرا مطلب ہے ڈاکٹر امتیاز۔

عباس : ڈاکٹر امتیاز! یہاں کس سلسلہ میں تشریف لائے ہیں۔

زیتون : سلسلہ بھی معلوم ہوجائے گا۔ فی الحال آپ آرام سے لیٹے رہیے۔

عباس: مگر میں ڈاکٹر امتیاز کا کوئی احسان لینا نہیں چاہتا۔

محسن : (کسی قدر بگڑ کر) عباس! فضول باتیں نہ کرو۔ پہلے ہی کہا تھا کہ یہاں ٹھہرنا

مناسب نہیں ہے مگر تم کسی کی سنتے ہو۔

(ڈاکٹر امتیاز تولیا ہے سر پونچھتا ہوا آتا ہے۔ عباس پر ایک اچٹتی نظر ڈال کر محسن سے)

امتیاز : کیا بات ہے؟

محسن : راستے میں انھیں قے ہوئی ہے اور ایک دم۔ میرا مطلب ہے انتہائی کمزوری محسوس کرنے لگے ہیں۔

امتیاز : اچھا۔ (عباس کی طرف بڑھتا ہے کہ اسے ایک اور قے ہوتی ہے۔ امتیاز قے میں نکلتے ہوئے مادے کو غور سے دیکھتا ہے پھر زیتون سے) آپ کا نوکر کہاں ہے؟

زیتون : یہیں ہے (بلند آواز سے) غن۔ ارے غن۔

امتیاز : (محسن کی طرف دیکھ کر) مسٹر۔

محسن : مجھے محسن کہتے ہیں۔

امتیاز : مسٹر محسن آپ چلے جائیے۔ شاید گاڑی باہر کھڑی ہے۔ اسی سڑک پر دائیں جانب ایک آدھ فرلانگ کے فاصلے پر ہمارا کیمپ ہے۔ وہاں سے دواؤں کا بکس اور ایک کمپاؤنڈر کو ساتھ لانا ہے۔

محسن : بہت اچھا۔

(محسن تیزی سے کمرے سے چلا جاتا ہے امتیاز عباس کی نبض پر ہاتھ رکھ کر)

امتیاز : اب آپ۔

عباس : (اپنا ہاتھ کھینچ کر) میں ٹھیک ہوں۔

امتیاز : یقینی طور پر ٹھیک ہیں۔ بلاوجہ اپنے جذبات کو۔

عباس : (غصے سے) میرے جذبات بھی نارمل ہیں۔

امتیاز : آپ آرام کیجیے۔

عباس : (اسی طرح غصے سے) قے ہو جانے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ مجھے ہیضہ ہو گیا ہے۔

امتیاز : آپ پرسکون رہیے۔ غصے سے بلاوجہ اعصاب میں—

عباس : (بات کاٹ کر) غصے کی بات ہی ہے (کھڑے ہونے کی کوشش کرتے ہوئے) بلاوجہ مجھے بیمار سمجھا جارہا ہے۔

امتیاز : (عباس کو بٹھانے کی کوشش کرتے ہوئے) آپ آرام کیجیے۔

(عباس بری طرح امتیاز کا ہاتھ جھٹکتا ہے۔ امتیاز بڑی مایوسی سے زیتون کی طرف دیکھتا ہے۔ زیتون آگے بڑھ کر اس کے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر)

زیتون : آپ آرام تو کیجیے۔ ڈاکٹر صاحب نے دوا منگوائی ہے۔ آپ کو جلد آرام ہوجائے گا۔

عباس : میں کہہ رہا ہوں کہ میں علاج کرانا نہیں چاہتا۔ آخر یہ سازش میرے خلاف کیوں کی جارہی ہے۔

زیتون : سازش! (نفرت اور غصے سے) گویا قصبے میں ہیضہ میں نے پھیلایا ہے۔ آپ کو تے میں نے کرائی ہے۔

عباس : کچھ بھی ہو مگر ڈاکٹر امتیاز کو تم نے بلایا ہے تاکہ وہ من مانا علاج کرسکیں۔ وہ تو چائے پیتے ہی میری طبیعت پر گرانی شروع ہوگئی تھی۔

زیتون : کیسی باتیں کرتے ہیں آپ۔ وہی چائے میں نے بھی پی تھی اور مسٹر محسن نے بھی۔

عباس : (چیختے ہوئے) مگر میں ڈاکٹر امتیاز سے علاج کرانا نہیں چاہتا۔

(نڈھال ہوکر کرسی سے ٹک جاتا ہے اور آنکھیں بند کرلیتا ہے۔ زیتون مایوسی سے امتیاز کو دیکھتی ہے اور آنکھوں میں آنسو آجاتے ہیں)

امتیاز : گھبرائیے نہیں۔ چائے کا دودھ قصبے سے آیا تھا؟

زیتون : جی ہاں— مگر ڈاکٹر صاحب یہ—

امتیاز : معمولی حملہ ہے۔ جلد ہی طبیعت سنبھل جائے گی۔ (دروازے کے پاس جاکر باہر کی طرف دیکھتے ہوئے) ابھی تک مسٹر محسن نہیں آئے۔

عباس : (آہستہ آہستہ آنکھیں کھولتے ہوئے) میں — میں —

امتیاز : (عباس کے پاس آتے ہوئے) آپ آرام تو کیجیے —

عباس : میں آپ سے علاج کرانا نہیں چاہتا۔ آپ چلے جایئے۔ ورنہ میں سچ مچ جان دے دوں گا۔

(نڈھال ہو کر کرسی سے ٹک جاتا ہے۔ اس پر بے ہوشی طاری ہو جاتی ہے۔ امتیاز، زیتون کی طرف دیکھ کر)۔

امتیاز : آیئے انھیں چار پائی پر لٹا دیں۔ گھبرایئے نہیں آیئے میری مدد کیجیے (فن کرے میں آتا ہے امتیاز اسے دیکھ کر) اے مسٹر ذرا سی میری مدد کرنا۔ (فن اور امتیاز بدقت اسے چار پائی پر لٹاتے ہیں۔ امتیاز، زیتون کی آنکھوں میں آنسو دیکھ کر) گھبرانے کی بات نہیں۔ بہت معمولی حملہ ہے سب ٹھیک ہو جائے گا۔

زیتون : مگر ڈاکٹر صاحب —

امتیاز : آپ مجھ پر بھروسا کیجیے۔

زیتون : مجھے بھروسا ہے ڈاکٹر صاحب (اپنے آنسو پونچھ کر) آپ کو ان کے رویے سے تکلیف نہیں پہنچی ہوگی؟

امتیاز : (پھیکی مسکراہٹ سے) ڈاکٹروں کی زندگی میں ایسے ہزاروں مواقع آتے ہیں جب لوگوں کو ان پر بھروسا نہیں رہتا۔

عباس : (آہستہ آہستہ آنکھیں کھول کر) ڈاکٹر امتیاز آپ ابھی تک نہیں گئے۔ کیا میری موت دیکھنے کا ارادہ ہے اور اب تو آپ نے (طنزیہ) مسز زیتون عباس سے ملاقات بھی کر لی۔

(امتیاز کچھ دیر خاموش کھڑا رہتا ہے۔ پھر آہستہ آہستہ دروازے کی طرف بڑھتا ہے)

زیتون : (مایوسی کے انداز میں) ڈاکٹر صاحب —

امتیاز : مسز عباس مجھے افسوس صرف اس قدر ہے کہ آپ نے ایک چھوٹے سے آدمی سے شادی کر لی۔

(آگے بڑھتا ہے کہ محسن دواؤں کا بکس ہاتھ میں لیے کمرے میں آتا ہے اور امتیاز کو جاتا ہوا دیکھ کر)

محسن : ڈاکٹر صاحب۔ یہ دوائیاں۔

امتیاز : شاید عباس صاحب اپنا دماغی توازن کھو چکے ہیں۔ میں دوسرے ڈاکٹر کو بھیجتا ہوں۔ (کمرے سے چلا جاتا ہے۔ محسن حیرت اور زیتون مایوسی سے اسے چلا جاتا ہوا دیکھتے رہ جاتے ہیں)

(پردہ)

تصویر اور جھوٹ

افرادِ تمثیل (کردار)

(1) مجاہد (ایک نوجوان) (2) نجمہ (مجاہد کی بیوی) (3) شہاب (مجاہد کا دوست)

منظر

(ایک درمیانی طبقے کے مکان کا کمرہ جو ڈرائنگ روم ہے مگر کسی مہمان کے آجانے پر گیسٹ روم میں تبدیل کردیا جاتا ہے۔ صبح کا وقت ہے۔ نجمہ میز پر بکھرے ہوئے سامان کو ترتیب دے رہی ہے۔ کچھ دیر بعد مجاہد کمرے میں آتا ہے۔ نجمہ نظریں اٹھا کر اسے دیکھتی ہے اور پھر اپنے کام میں مشغول ہوجاتی ہے۔ مجاہد سگریٹ جلا کر کھڑکی کے پاس جاتا ہے اور کمرے کی طرف منہ کرکے کھڑکی سے ٹیک لگا کر کھڑا ہوجاتا ہے اور خاموشی سے نجمہ کو کام کرتے ہوئے دیکھتا رہتا ہے نجمہ میز پر سامان کو ترتیب دے کر میز پر رکھی ہوئی اپنی تصویر اٹھاتی ہے اسے غور سے دیکھتی ہے پھر کپڑے سے صاف کرکے اسی جگہ رکھ دیتی ہے۔ مجاہد سگریٹ کا دھواں چھوڑ کر۔)

مجاہد : شہاب کہاں چلا گیا؟

نجمہ : ابھی تو یہیں تھے۔ نہانے گئے ہیں۔

مجاہد : ناشتہ تیار کیا۔

نجمہ : (پھر اپنے کام میں مشغول ہوکر) کب کا تیار ہے وہ نہا کر تو آجائیں (کچھ دیر خاموش رہ کر) آج وہ جانے کو کہہ رہے تھے۔

مجاہد : اچھا۔ (کچھ دیر خاموش رہ کر سوچتے ہوئے) وہ جب سے یہاں آیا ہے کچھ خاموش اور ڈسٹرب سا ہے (نجمہ خاموشی سے اپنا کام کرتی رہتی ہے۔ مجاہد سگریٹ کا کش لے کر) تم بھی مجھے کچھ پریشان نظر آرہی ہو۔

نجمہ : (نظریں اٹھا کر مجاہد کو دیکھ کر) ایسی تو کوئی بات نہیں۔

(نجمہ پھر اپنے کام میں مشغول ہوجاتی ہے۔ مجاہد تپائی کے پاس جاکر ایش ٹرے میں سگریٹ ڈالتا ہے جس کا دھواں ایش ٹرے سے نکلتا رہتا ہے مجاہد پھر کھڑکی کے پاس جاکر اسے کھولتا ہے اور پردہ ہٹا دیتا ہے۔ پھر نجمہ کی طرف دیکھ کر جو چارپائی پر بستر برابر کررہی ہے)۔

مجاہد : مگر نجمہ (سوچتے ہوئے) خیر — (چند سیکنڈ رُک کر) کوئی بات ضرور ہے جو تم کھوئی کھوئی سی ہو۔

نجمہ : (اُسی طرح کام میں مشغول رہتے ہوئے) کوئی بات بھی ہو۔ کچھ مصروفیت بڑھ گئی ہے۔ اس لیے تھکاوٹ ہوجاتی ہے۔

مجاہد : (سوچتے ہوئے) تم شہاب کو پہلے سے جانتی ہو؟

نجمہ : ہاں اکثر انور بھائی اور — ثاقب صاحب ان کا ذکر کیا کرتے تھے۔

مجاہد : ثاقب بھائی! تم انھیں کہاں سے جانتی ہو۔

نجمہ : انور بھائی کے دوست تھے اور ہمارے یہاں آیا جایا کرتے تھے۔ (مجاہد خاموش رہتا ہے۔ نجمہ دروازے کی طرف جاتے ہوئے) اب تو نہا چکے ہوں گے۔ ناشتہ لگا دوں۔ (مجاہد خاموش رہتا ہے۔ نجمہ دروازے کی طرف جاتی ہے کہ شہاب کمرے میں آتا ہے نجمہ خاموشی سے کمرے سے چلی جاتی ہے۔ شہاب ڈریسنگ ٹیبل

کے پاس جا کر بال سنوارتا ہے اور نجمہ کی تصویر کو غور سے دیکھتا ہے۔ اس دوران مجاہد برابر شہاب کو دیکھتا رہتا ہے۔ شہاب بال سنوار کر مڑتا ہے تو مجاہد کو اپنی طرف دیکھتے ہوئے یوں شرما جاتا ہے جیسے چوری کرتے ہوئے پکڑا گیا ہو۔ مجاہد مسکراتے ہوئے)۔

مجاہد : یہ شادی سے پہلے کی تصویر ہے۔ اب بیگم صاحبہ کچھ موٹی ہوتی جارہی ہے (شہاب خاموش رہتا ہے) تم نے شادی سے پہلے بھی دیکھا ہوگا؟

شہاب : کسے؟ نجمہ بھابی کو؟ نہیں میں نے نہیں دیکھا۔

مجاہد : مگر وہ تو تم کو پہلے سے جانتی ہیں۔

شہاب : جانتی ہوں گی۔ ثاقب بھائی کا ان کے یہاں آنا جانا تھا مگر— (کچھ دیر خاموشی سے سوچتا ہے پھر آہستہ سے) یہ تصویر شادی سے پہلے کی ہے؟

مجاہد : ہاں۔ (ہنس کر) ان کے آنے سے پہلے یہ تصویر میرے پاس آگئی تھی۔ تمھیں شک کیوں ہے۔

شہاب : شک! نہیں۔ شک کیوں ہونے لگا۔ مگر یہ تصویر۔ (خاموش ہوجاتا ہے۔ مجاہد سوالیہ نظروں سے اسے دیکھتا رہتا ہے۔ شہاب کچھ دیر خاموش رہ کر) میں نے یہ تصویر پہلے بھی کہیں دیکھی ہے۔

مجاہد : ضرور دیکھی ہوگی۔ (ہنستا ہے) پھر اس میں شک، حیرت یا پریشانی کی کون سی بات ہے۔ (چند سیکنڈ خاموش رہ کر) ممکن ہے کبھی تمھاری نظر نجمہ پر پڑگئی ہو۔

شہاب : نہیں میں نے انھیں کبھی نہیں دیکھا۔ ایک دو مرتبہ ان کے گھر گیا ضرور مگر باہر ہی سے واپس آگیا۔ (کچھ دیر رُک کر) یہ تصویر میرے لیے ایک کامپلیکس بنتی جارہی ہے۔

مجاہد : کیسا کامپلیکس!

شہاب : عجیب سا۔ جس روز سے یہاں آیا ہوں برابر سوچ رہا ہوں کہ یہ تصویر کہاں دیکھی ہے مگر یاد نہیں آرہا۔ جانے میری یادداشت کو کیا ہوگیا ہے۔

مجاہد : (ہنستے ہوئے) تو پھر مارو گولی۔

نجمہ : (کمرے میں آتے ہوئے) کسے گولی ماری جارہی ہے۔

مجاہد : (ہنس کر تصویر کی طرف اشارہ کرکے) آپ کی تصویر کو۔

نجمہ : (چائے کا سامان میز پر رکھتے ہوئے) میری تصویر کو (مڑ کر تصویر کو دیکھتے ہوئے) کیوں بے چاری نے ایسا کون سا قصور کیا ہے۔

مجاہد : (مسکراتے ہوئے) اس نے شہاب کو اس کامپلیکس میں مبتلا کردیا ہے کہ وہ اپنی یادداشت کھوتا جارہا ہے۔

نجمہ : یادداشت کھوتے جارہے ہیں! وہ کیسے؟

مجاہد : اسے یہ یاد نہیں آرہا کہ اس نے یہ تصویر کہاں دیکھی ہے۔ (نجمہ نظر اٹھا کر مجاہد کو دیکھتی ہے مگر خاموش رہتی ہے۔ ایک کرسی پر بیٹھ کر چائے بنانے لگتی ہے۔ مجاہد دوسری کرسی پر بیٹھ کر شہاب سے) ارے بھئی آؤ (مسکرا کر) تصویر کے بارے میں پھر سوچ لینا اور پھر اب تصویر کے بارے میں سوچنا بھی کیا۔ (ہنستے ہوئے) اصل تصویر ہی تمھارے سامنے ہے (ایک پلیٹ میں مٹھائی دیکھ کر) یہ کس سلسلے میں ہے؟

نجمہ : (چائے کی پیالی شہاب کے سامنے رکھتے ہوئے) سلسلہ تو کوئی نہیں۔ آصفہ بیگم کی لڑکی کا رشتہ طے ہوا ہے۔ انھوں نے بھیجی تھی۔

مجاہد : اچھا۔ (مٹھائی منہ میں رکھتے ہوئے) کہاں طے ہوا؟

نجمہ : کوئی انجینئر ہے مگر سنا ہے بے روزگار ہے۔

مجاہد : چلو ایک دن باروزگار بھی ہوجائے گا (ایک دم جیسے کچھ یاد آجانے پر شہاب کی طرف دیکھ کر) میں تمھاری بہن کی شادی میں نہ آسکا۔ مجھے بہت افسوس ہوا۔

شہاب : تمھارا بہت انتظار رہا۔ تمھارے نہ آنے پر امی کو بہت دکھ ہوا۔

مجاہد : پروگرام بالکل طے تھا (نجمہ کی طرف اشارہ کرکے) مگر عین موقعے پر آپ کو بیمار پڑ جانے کا شوق چرا گیا اور مجھے مجبور ہوجانا پڑا۔

شہاب : اگر تم آجاتے تو مجھے بڑا سہارا مل جاتا۔ اکیلے ہی وہ دوڑ بھاگ کرنا پڑی کہ دل ہی جانتا ہے۔

مجاہد : مجھے یقین تھا کہ تم ضرور ناراض ہوگے مگر کیا بتلاؤں کہ کیسی مجبوری آن پڑی تھی۔ انھیں تنہا چھوڑ نہیں سکتا تھا۔ (ہنس کر) مگر یقین کرو میں تمھاری شادی مس نہیں کروں گا (شہاب پیالی میز پر رکھ کر کھڑا ہوتا ہے۔ مجاہد اسے دیکھ کر) کیوں خیریت تو ہے؟

شہاب : پروفیسر خانی سے ملنا ہے مجھ پر ہمیشہ مہربان رہا کرتے تھے۔

مجاہد : اچھا تو ابھی تک ان سے ملاقات نہیں ہوئی۔

شہاب : دو مرتبہ ان کے گھر جاچکا ہوں مگر ملاقات نہ ہو سکی۔ سوچا آج صبح صبح ہی ان کو پکڑ لیا جائے۔

مجاہد : ڈاکٹر صاحب کے کلینک سے فون کرلینا (مسکرا کر) یاد ہے ہم انھیں پروفیسر دُخانی کہا کرتے تھے کیا ٹھکانا کہ بھاپ بن کر اور کدھر اڑ جائیں اور تمھیں دو میل پریڈ کرنا پڑے۔ (شہاب خاموشی سے کمرے سے چلا جاتا ہے۔ مجاہد کچھ دیر خاموش رہ کر مسکرا کر) جھوٹ بولنا بھی ایک آرٹ ہے۔ مجھے شادی میں نہ جانے کا بہانہ بنانے میں کیسی الجھن ہورہی تھی کہ دل ہی جانتا ہے۔

نجمہ : اس میں جھوٹ کی کون سی بات تھی؟

مجاہد : اور سچائی کون سی تھی۔ وہاں جانے میں جانے کون سی قباحت تھی۔

نجمہ : بس میرا جی نہیں چاہ رہا تھا۔

مجاہد : اس لیے ٹال مٹول کرتی رہیں۔ بہانے بناتی رہیں پھر عین وقت پر بیمار پڑگئیں۔ (سگریٹ جلا کر) اور اب بھی اس کے آنے سے تم خوش نہیں ہو۔

نجمہ : آپ نے یہ کیاسے سمجھ لیا کہ میں خوش نہیں ہوں۔

مجاہد : (دیکھ تو رہا ہوں کہ تم نے ایک ناخوشگوار موڈ طاری کررکھا ہے (نجمہ خاموش رہتی ہے۔ چائے کے برتن کشتی میں رکھنے لگتی ہے۔ مجاہد کچھ دیر خاموش رہ

کر) کیا شہاب بھی تمھارے یہاں آتا جاتا تھا۔

نجمہ : (غور سے مجاہد کو دیکھ کر) ایک دو مرتبہ ثاقب صاحب کے کاموں سے آئے تھے اور انور بھائی سے مل کر باہر ہی سے چلے گئے تھے۔ میں کبھی ان کے سامنے نہیں آئی۔ انور بھائی ضرور ان کی تعریف کیا کرتے تھے۔

(مجاہد خاموش ہوجاتا ہے۔ نجمہ برتن اٹھا کر دوسرے کمرے میں چلی جاتی ہے۔ مجاہد دو چار سگریٹ کے کش لیتا ہے۔ پھر اٹھ کر نجمہ کی تصویر کے پاس جاتا ہے کہ شہاب کمرے میں آتا ہے۔ مجاہد اسے دیکھ کر)۔

مجاہد : کیوں پروفیسر خانی سے ملنے نہیں گئے؟

شہاب : میں نے فون کیا تو معلوم ہوا وہ کل شام کہیں باہر چلے گئے ہیں۔

مجاہد : میں نے پہلے ہی کہا تھا ان سے ملنا کوئی آسان کام نہیں ہے۔

شہاب : مجھے ان سے ملاقات نہ ہونے کا افسوس رہے گا۔

مجاہد : ایک دو دن میں واپس آجائیں گے۔ پھر ملاقات کر لینا۔

شہاب : مگر مجھے آج واپس جانا ہے۔

مجاہد : ایسی جلدی بھی کیا ہے۔ ابھی نجمہ کہہ رہی تھیں کہ تم واپس جانے کے لیے پرتول رہے ہو۔

شہاب : آٹھ دن تو ہو گئے — اور —

مجاہد : پھر کہاں کا غضب ہو گیا۔

شہاب : غضب تو نہیں ہوا مگر امّی پریشان ہو رہی ہوں گی۔ ویسے بھی دو چار دن کا کہہ کر آیا تھا (نجمہ پان لے کر کمرے میں آتی ہے) اب پورے گھر کی دیکھ بھال میرے ہی ذمے ہے۔

(مجاہد اس طرح خاموش ہوجاتا ہے جیسے کچھ سوچ رہا ہو۔ شہاب غیر اختیاری طور پر پھر تصویر کو دیکھنے لگتا ہے مگر مجاہد اس طرف دھیان نہیں دیتا۔ نجمہ ضرور کچھ بے چین نظر آتی ہے۔ پھر کچھ اس انداز سے جیسے وہ شہاب کی توجہ ہٹانا چاہتی ہو)۔

نجمہ : شہاب صاحب ابھی تو آپ کو چند دن اور قیام کرنا ہوگا۔

شہاب : (ایک دم چونک کر) جی۔ (چند سیکنڈ رُک کر) میں ضرور ٹھہر جاتا مگر ـــــ

نجمہ : (بات کاٹ کر) کیا آپ کو یہاں کوئی تکلیف ہے؟

شہاب : کیسی باتیں کرتی ہیں آپ۔ اگر آپ لوگوں کے یہاں تکلیف ہوگی تو پھر آرام کہاں ملے گا!

نجمہ : (مسکرا کر) بھئی مجاہد کو شکایت ہے کہ میں آپ کی خاطر نہیں کر رہی ہوں۔ خدا کی قسم اگر آپ یوں چلے گئے تو یہ تمام زندگی طعنے دیں گے۔

شہاب : (ہنس کر) کیوں صاحب۔ آپ نے یہ کیسے سمجھ لیا کہ بھابی میری خاطر نہیں کر رہی ہیں۔

مجاہد : اس لیے کہ تم جب سے آئے ہو اُداس اور خاموش ہو۔

شہاب : (ہنس کر) تم خالص انسان ہو یا تھوڑے بہت چقندر بھی۔ (ایک دم سنجیدہ ہو کر) مجاہد بخدا ثاقب بھائی کی بے وقت موت نے جانے کیوں مجھے اس قدر اُداس کر دیا ہے کہ کسی بات میں دل ہی نہیں لگتا۔ (آنکھوں میں آنسو آجاتے ہیں۔ پہلے تو انھیں پینے کی کوشش کرتا ہے پھر رومال سے پونچھ کر) اب میں ہنستا ہوں تو ایسا محسوس کرتا ہوں کہ ہنسی کا مذاق اڑا رہا ہوں۔

(ماحول ایک دم سنجیدہ ہو جاتا ہے۔ کچھ دیر خاموشی کے بعد)

مجاہد : ثاقب بھائی کی موت اس قدر غیر متوقع تھی کہ یقین نہیں آتا کہ اس قدر ہنس مکھ اور زندہ دل انسان مر بھی سکتا ہے (کچھ دیر خاموش رہ کر) سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ سب کچھ کیسے ہو گیا۔

شہاب : (سوچتے ہوئے) مجھے تو آج تک یقین نہیں کہ وہ مر گئے ہیں۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ میرے پاس کھڑے ہوئے کہہ رہے ہوں۔ شہاب تم بہت نالائق ہو۔

مجاہد : ان کے نالائق کہنے میں کس قدر خلوص ہوتا تھا۔ حالانکہ انھوں نے نالائق کبھی صحیح معنوں میں استعمال نہیں کیا (کچھ دیر خاموش رہ کر) پتا نہیں چلا کہ انھیں

بیماری کیا تھی۔

شہاب : بس تمھاری شادی سے لوٹے تو اُداس، کھوئے کھوئے اور کمزور نظر آئے۔ ہم نے سوچا شاید تھکاوٹ ہے پھر بخار آیا۔ معمولی سا اور یہ معمولی بخار موت کا پیغام بن گیا۔ (نجمہ کی آنکھوں میں آنسو آجاتے ہیں۔ شہاب نجمہ کو دیکھ کر) ارے بھابی آپ (بات ٹالنے کے انداز میں مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے) میں بھی کہاں کا موضوع چھیڑ بیٹھا۔ (نجمہ ایک دم ہچکیوں سے رونے لگتی ہے۔ شہاب اور مجاہد گھبرا جاتے ہیں۔ مجاہد، نجمہ کو دیکھ کر)

مجاہد : ارے نجمہ تمھیں کیا ہوگیا!

نجمہ : (اپنی ہچکیوں پر قابو پاکر آنسو پونچھتے ہوئے) کچھ نہیں — مجھے انور بھائی کا خیال آگیا تھا وہ بھی ثاقب صاحب کی موت سے اس قدر متاثر ہوئے تھے کہ ہم لوگ سوچتے تھے کہ خدانخواستہ انھیں کچھ نہ ہوجائے۔

شہاب : ثاقب بھائی کی موت سے یہ احساس ہوا کہ انسان کی کچھ ذمہ داریاں بھی ہیں (خلا میں گھورتے ہوئے) ایک دن امی نے مجھے سبزی لانے کو بازار بھیج دیا اور مجھے کالج پہنچنے میں دیر ہوگئی تو بہت ناراض ہوئے اور کہنے لگے۔ ابے نالائق کیا میں مرگیا تھا جو تو بازار چلا گیا اور سچ مچ مجاہد وہ مرگئے اب مجھے روز ہی سبزی خریدنے بازار جانا پڑتا ہے۔

مجاہد : شہاب! کبھی کبھی انسان دوسروں کو یوں بھی دھوکا دیتا ہے (ٹھنڈی سانس بھر کر) دوسروں کو نالائق کہنے والا خود ہی نالائقی کا ثبوت دے کر ہم سے جدا ہوگیا۔

(کچھ دیر خاموشی رہتی ہے۔ پھر مجاہد آہستہ آہستہ دروازے کی طرف بڑھتا ہے۔ شہاب اسے جاتا ہوا دیکھ کر)۔

شہاب : کہاں چل دیے؟

مجاہد : ابھی آتا ہوں۔ کل کے پروگرام کے سلسلے میں ذرا منیر کو فون کرنا ہے۔

شہاب : مگر مجاہد —

مجاہد : (بات کاٹ کر) نہیں شہاب ابھی تم نہیں جاسکتے (کچھ دیر رُک کر) اب پھر اگر جانے کو کہا تو مجھے دکھ ہوگا۔ (دروازے پر دستک) کون صاحب؟

(دروازہ کھول کر باہر چلا جاتا ہے۔ نجمہ آہستہ آہستہ کھڑکی کے پاس جاتی ہے اور باہر دیکھنے لگتی ہے۔ شہاب اپنی جگہ پر خاموش کھڑا رہتا ہے پھر اس کی نظر نجمہ کی تصویر پر پڑتی ہے۔ چند سیکنڈ اسے دیکھتا رہتا ہے مگر فوراً ہی طنزیہ طور پر مسکرا کر اپنے سر کو اس طرح جھٹکتا ہے جیسے کسی خیال کو اپنے دماغ سے نکالنے کی کوشش کررہا ہو کہ مجاہد کمرے میں آتا ہے۔ نجمہ مڑ کر سوالیہ نظروں سے مجاہد کو دیکھتی ہے مگر مجاہد خاموش رہتا ہے۔ نجمہ کچھ دیر خاموش رہ کر)

نجمہ : کون تھا؟

مجاہد : (انتہائی طنز اور نفرت سے) ملک الموت۔ (نجمہ اور شہاب دونوں خاموش رہتے ہیں مگر سوالیہ نظروں سے اسے دیکھتے ہیں۔ مجاہد کچھ دیر بعد ٹھنڈی سانس بھر کر) میری چھٹی کینسل کردی گئی ہے اور مجھے کل ہی باہر جانا ہوگا۔

نجمہ : لیکن باہر جانے کا کام اور کوئی بھی تو کرسکتا ہے؟

مجاہد : (طنزیہ) یہ کیسے ہوسکتا ہے ابھی تو میاں مجاہد زندہ ہیں (کچھ دیر کمرے میں ٹہلتا رہتا ہے پھر شہاب کی طرف دیکھ کر) شہاب! میں آفس کو فون کرتا ہوں کہ میری چھٹی کینسل نہ کی جائے۔ اگر انھوں نے اتفاق نہیں کیا۔ تو تمھیں میرے آنے تک انتظار کرنا ہوگا۔

شہاب : مگر مجاہد۔

مجاہد : (بات کاٹ کر) یہاں نجمہ تو ہوں گی۔ تمھیں کوئی تکلیف نہ ہوگی۔ ویسے یہ بھی تنہائی سے گھبراتی ہیں۔

شہاب : سوال تکلیف کا نہیں ہے بلکہ۔

مجاہد : تو پھر سوال کیا ہے۔ دیکھو شہاب مجھے یہ تکلف بازی پسند نہیں آخر تم خود کو اس گھر میں غیر کیوں سمجھتے ہو؟

شہاب : خیر کیوں سمجھنے لگا۔ (سوچتے ہوئے) مجھے امی کا خیال ہے۔ وہ پریشان ہو رہی ہوں گی۔

مجاہد : انھیں تار سے اطلاع کر دو کہ ابھی چند دن اور نہیں آسکتے۔

شہاب : مگر اب میرا گھر پہنچنا بے حد ضروری ہے گھر پر کوئی نہیں ہے۔ امی کو تکلیف ہو رہی ہوگی۔

مجاہد : دو چار دن کا کیا ہے (مسکرا کر) اور اتنی بات تو جانتی ہی ہیں کہ مہمان آنا اپنی مرضی سے ہے اور جانا میزبان کی مرضی سے ہے۔

شہاب : اور جب تم یہاں نہیں ہو گے تو میں پڑا پڑا کیا کروں گا۔

مجاہد : (ہنس کر جس میں طنز کا احساس ہوتا ہے) نجمہ کو کیا اس قدر اَن سوشل سمجھتے ہو کہ وہ تمھیں گھاس بھی نہیں ڈالیں گی۔ (شہاب مشکوک نظروں سے اسے دیکھتا ہے۔ مگر مجاہد اس پر دھیان نہ دے کر) اچھا میں تمھیں ایک کام بتلائے دیتا ہوں (شہاب خاموش رہتا ہے مگر سوالیہ نظروں سے اسے دیکھتا ہے۔ مجاہد، نجمہ کی تصویر کی طرف اشارہ کر کے) تم یہ ریسرچ کر ڈالنا کہ تم نے یہ تصویر کہاں دیکھی ہے۔

نجمہ : (غور سے مجاہد کو دیکھ کر) اگر امی وہاں تنہا ہیں تو آپ کو اصرار نہیں کرنا چاہیے۔

مجاہد : ارے واہ۔ گویا میرا اس پر کوئی حق ہی نہیں ہے۔

نجمہ : مگر حق کا یہ مطلب نہیں کہ۔

مجاہد : (بات کاٹ کر) حق کا مطلب سب کچھ ہوتا ہے۔

شہاب : مگر اب میں ہر حالت میں واپس جانا چاہتا ہوں۔ تم میری پوزیشن کو نہیں سمجھ رہے ہو۔

مجاہد : میں سب پوزیشن سمجھ رہا ہوں (دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے) اچھا پہلے مجھے فون کرنے دو۔

(شہاب خاموش رہتا ہے۔ مجاہد کمرے سے چلا جاتا ہے۔ شہاب آہستہ آہستہ کھڑکی کے پاس جا کر باہر دیکھنے لگتا ہے۔ نجمہ کچھ دیر خاموش کھڑی رہتی ہے

پھر نظر تپائی پر رکھے خاصدان پر پڑتی ہے)۔

نجمہ : ارے آپ نے پان نہیں کھایا۔

شہاب : (مڑ کر نجمہ کو دیکھ کر) جی۔

نجمہ : آپ نے پان نہیں کھایا (شہاب خاموش رہتا ہے۔ نجمہ خاصدان اٹھا کر شہاب کے پاس آتے ہوئے) کیا بات ہے آپ ایک دم خاموش کیوں ہوگئے۔

شہاب : (کھوئے کھوئے انداز میں) کوئی بات نہیں (خاصدان سے پان اٹھا کر منہ میں رکھتا ہے اور پھر سوچتے ہوئے) شاید یہاں آ کر میں نے غلطی کی۔

نجمہ : (حیرت سے) کیوں۔

شہاب : (مڑ کر کھڑکی کے باہر دیکھتے ہوئے) مجاہد کا ایٹی چیوڈ سمجھ میں نہیں آ رہا ہے۔ اب مجھے واپس جانا چاہیے۔ دیکھیے نا۔
(شہاب خاموش ہو جاتا ہے۔ نجمہ سوالیہ نظروں سے اسے دیکھتی ہے مگر شہاب خاموش رہتا ہے۔ نجمہ کچھ دیر بعد)

نجمہ : شہاب صاحب۔
(شہاب سوالیہ نظروں سے اُسے دیکھتا ہے مگر نجمہ خاموش رہتی ہے پھر اس کی آنکھوں میں آنسو آجاتے ہیں جن کو وہ پلو سے پونچھتی ہے۔ شہاب کچھ حیرت زدہ اور کچھ پریشان نظر آتا ہے۔ پھر آہستہ سے)۔

شہاب : نجمہ بھابی (کچھ دیر خاموش رہتا ہے۔ نجمہ خاصدان تپائی پر رکھتی ہے۔ پھر میز پر رکھی ہوئی اپنی تصویر کو دیکھتی ہے) کیا بات ہے نجمہ بھابی!
(کچھ دیر خاموشی سے تصویر کو دیکھتی ہے پھر مڑ کر شہاب کو دیکھ کر)

نجمہ : اس طرح کی ایک تصویر اور بھی تھی؟

شہاب : ایک تصویر اور تھی!

نجمہ : ہاں — اور وہ تصویر — ثاقب صاحب کے پاس تھی۔

شہاب : (حیرت سے) ثاقب بھائی کے پاس!

نجمہ : ہاں انھوں نے مجھ سے مانگ لی تھی۔

شہاب : (سوچتے ہوئے) کیا یہ تصویر میں نے انھی کے پاس دیکھی تھی۔ مگر انھوں نے کیوں مانگ لی تھی۔ (نجمہ خاموش رہتی ہے) تو کیا وہ— میرا مطلب ہے کہ— کیا وہ—

نجمہ : (پھر آنکھوں میں آنسو بھر کے) میں تو عورت تھی شہاب میاں۔ مگر وہ— وہ بھی خاموش رہے۔

شہاب : کیوں خاموش رہے۔ کیا وہ اس قدر بزدل تھے...

نجمہ : نہیں وہ بزدل نہیں تھے مگر سوچتے رہے کہ انور بھائی کہیں یہ نہ سوچیں کہ ان کے اعتماد کو ٹھیس پہنچی ہے۔ بس اسی لیے وہ خاموش رہے۔ حالاں کہ انور بھائی خود— (شہاب حیرت زدہ کھڑا رہتا ہے جیسے اسے سکتہ ہوگیا ہو۔ نجمہ کچھ دیر خاموش رہ کر) آپ مجھ پر یہ احسان کیجیے کہ وہ تصویر ضائع کر دیجیے۔

مجاہد : (کمرے میں آتے ہوئے) کون سی تصویر ضائع کرا رہی ہو۔ (نجمہ اور شہاب مڑ کر مجاہد کو دیکھتے ہیں جو بڑے معنی خیز انداز میں مسکرا رہا ہے۔ مجاہد آگے بڑھتے ہوئے) ہاں بھئی کس تصویر کی بات ہو رہی تھی۔ (شہاب کی نظر میز پر رکھی ہوئی تصویر کی طرف جاتی ہے) اس تصویر کو کیوں؟

شہاب : یہ نہیں— اس کی ایک کاپی میرے گھر پر بھی ہے۔

مجاہد: اچھا— تمھارے گھر پر! (طنزیہ) مگر وہاں کیوں ہے؟

نجمہ : (آنسو پونچھتے ہوئے) میری شادی سے پہلے اس کی ایک کاپی ثاقب صاحب کو بھی بھیجی گئی تھی— مگر— مگر—

(خاموش ہو جاتی ہے۔ مجاہد اور شہاب حیرت سے نجمہ کو دیکھنے لگتے ہیں)

(پردہ)

تمانچا

افرادِ تمثیل (کردار)

(1) علیم (ایک نوجوان) (2) نجمہ (علیم کی بیوی) (3) بجن (علیم کی بہن) (4) حامد (علیم کا ایک عزیز)

منظر

(ایک متوسط گھرانے کا کمرہ۔ دوسری جنگ عظیم کے کچھ سال بعد۔ جس وقت پردہ اٹھتا ہے تو سامنے کرسی پر نجمہ بیٹھی ہوئی نظر آتی ہے۔ اس کے چہرے پر گہرے غم اور فکرمندی کے آثار ہیں وہ خاموشی سے ایک دیوار کو تاکے جارہی ہے۔ بجن اس کے پاس بیٹھی بے پروائی سے ایک کتاب کی ورق گردانی کررہی ہے کبھی کبھی نظریں اٹھا کر نجمہ کو دیکھ لیتی ہے کچھ دیر بعد پاس رکھی ہوئی ایک گول میز پر کتاب رکھ کر نجمہ کی طرف دیکھتے ہوئے آہستہ سے۔)

بجن : بھابی۔ آپ اتنی پریشان اور کھوئی کھوئی کیوں ہیں؟

نجمہ : نہیں بجن ایسی تو کوئی بات نہیں ہے۔

بنّن : ضرور ہے۔ میں کل سے برابر دیکھ رہی ہوں کہ آپ نہ کچھ کھاتی ہیں نہ پیتی ہیں چپ چپ اور اُداس اُداس ہیں۔ آخر کوئی بات تو ہوگی؟

نجمہ : کوئی بات نہیں۔ (مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے) ممکن ہے موسم کا اثر ہو۔

بنّن : اگر آپ اس کوئلہ فروش کے بارے میں سوچتی ہیں تو چھوڑیے کم بخت کو (مسکرا کر) مجھے کیا معلوم تھا کہ وہ ایسا کچھ ہے ورنہ اسے کبھی بھی لفٹ نہ دیتی۔ میں نے تو اسے محض کوئلہ فروش سمجھا تھا۔

نجمہ : چھوڑو اس بات کو (ٹالنے کے انداز میں) تمھارے بھائی جان آتے ہی ہوں گے ان کے لیے چائے کا انتظام کرلو (اٹھ کھڑکی کے پاس جاتی ہے اور باہر کی طرف دیکھنے لگتی ہے) یہ لو۔ تمھارے بھائی جان آرہے ہیں۔

(مڑ کر بنّن کو دیکھتی ہے۔ بنّن خاموشی سے دوسرے کمرے میں چلی جاتی ہے۔ نجمہ پھر کھڑکی سے باہر دیکھنے لگتی ہے کچھ دیر بعد علیم کمرے میں آکر مسکراتے ہوئے)۔

علیم : کیا ہو رہا ہے۔

نجمہ : آپ کا انتظار کر رہی تھی۔ آج تو آپ نے بہت دیر کردی۔

علیم : (مسکرا کر) میرا انتظار ہو رہا تھا (گھڑی دیکھ کر) میں تو وقت پر ہی آیا ہوں (ایک صوفے پر بیٹھتے ہوئے) سچ بتاؤ کیا سوچ رہی تھیں (خود ہی قہقہہ مار کر) اس کوئلہ فروش کے بارے میں سوچ رہی ہوں گی۔

(نجمہ پہلے تو مشکوک نظروں سے علیم کو دیکھتی ہے پھر مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے)

نجمہ : خوب جی بھر کر مذاق اڑا لیجیے کوئی ارمان جی میں نہ رہ جائے۔

علیم : بھئی مذاق اڑانے کی کون سی بات ہے (ہنس کر) مگر یہ کون سا مسخرہ پن تھا کہ جانے کہاں کے کوئلہ فروش کو چائے پر مدعو کرلیا۔

نجمہ : اپنے مکان کے سامنے والی ٹال ہے اس کی۔

علیم : میں جانتا ہوں (مسکرا کر) مگر اس قدر دریادلی کی کیا ضرورت تھی۔

نجمہ : بٹن کی شرارت تھی مگر اب خود شرمندہ ہے۔

علیم : اس قسم کی حرکتوں سے سوائے شرمندگی کے اوپر کیا ملتا ہے (دبی مسکراہٹ سے) کوئلہ فروشوں سے کون سی تہذیب کی امید کی جاسکتی ہے (چند سیکنڈ رُک کر بلند آواز سے) بٹن۔ ارے بٹن (کچھ دیر بعد بٹن کمرے میں آتی ہے علیم شرارت آمیز مسکراہٹ سے اسے دیکھتے ہوئے) کیا ہو رہا تھا؟

بٹن : آپ کے لیے چائے کا انتظام کر رہی تھی۔

علیم : (ہنس کر) یا اس کوئلہ فروش کے لیے۔

بٹن : (کسی قدر جھنجھلا کر) جی بھر کے جو جی چاہے سنا لیجیے۔ کوئی کسر باقی نہ رہ جائے۔

علیم : دوسروں کا مذاق اُڑانے میں کبھی کبھی انسان کو خود بھی مذاق کا نشانہ بن جانا پڑتا ہے۔

بٹن : مجھے کیا معلوم تھا کہ وہ کم بخت اس قدر پڑھا لکھا اور مہذب ہے۔

علیم : (ہنس کر) تو تم اس پر اپنا رعب نہیں جھاڑ سکیں؟

بٹن : خدا کے لیے اب اس کے ذکر کو چھوڑیے۔ مجھے کل سے سخت کوفت ہو رہی ہے۔

علیم : اس لیے کہ تمھاری ساری شیخی کرکری ہوگئی (ہنس کر) ایسا ہوتا ہی رہتا ہے۔ خیر چھوڑو تمھارا امتحان کب ہو رہا ہے؟

بٹن : بس ایک مہینا رہ گیا ہے!

علیم : (ہنس کر) پاس ہونے کا بھی ارادہ ہے یا صرف کوئلہ فروش کی خاطر مدارات ہی کرتی رہوگی۔

بٹن : پھر وہی۔ کل سے آپ نے میرا خاصا مذاق اڑا لیا ہے۔

(بٹن کسی قدر غصے سے دروازے کی طرف جاتی ہے۔ علیم قہقہہ مار کر)

علیم : بھئی چائے ضرور پلا دینا ویسے میں کوئلہ فروشی نہیں کرتا (بٹن دوسرے کمرے میں چلی جاتی ہے۔ علیم کچھ دیر خاموش رہ کر) یہ حضرت تم لوگوں کے ہاتھ کہاں سے پڑ گئے تھے۔

نجمہ : اپنے کوئلے کا بل لے کر آیا تھا مجھے تو پتا بھی نہ چلا۔ بٹن نے اسے چائے پر مدعو کرلیا اس کا خیال تھا کہ وہ ٹال جائے گا مگر وہ تو بے تکلفی سے آ گیا۔

علیم : (مسکرا کر) تم جانتی ہو کہ وہ انگلش میں ایم اے ہونے کے ساتھ ساتھ لاگریجویٹ بھی ہے۔

نجمہ : سچ سچ! اور اس پر کوئلہ فروشی کرتا ہے۔

علیم : اس میں حیرت کی کیا بات ہے۔ خیر۔ آج میں نے اسے چائے پر مدعو کرلیا ہے۔

نجمہ : (گھبرا کر) جی۔ تاکہ ہم لوگوں کا اور مذاق اڑایا جاسکے۔

علیم : کیوں؟ پڑھا لکھا آدمی بلا وجہ کسی کا مذاق نہیں اُڑاتا (قہقہہ مار کر پھر کچھ دیر خاموش رہ کر) شاید تم لوگ اسے پہچانتی نہیں (نجمہ گھبرا سی جاتی ہے۔ علیم نظریں جھکا کر سگریٹ جلاتا ہے اور سگریٹ کا دھواں چھوڑ کر) وہ چچا صادق کا لڑکا ہے۔

نجمہ : (ایک ہاتھ سے اپنے چہرے پر سے دھواں ہٹاتے ہوئے) دھواں آپ میرے ہی منہ پر چھوڑتے ہیں) (علیم پھر ایک لمبا سا کش لیتا ہے۔ نجمہ کچھ پیچھے ہٹ کر) آپ کو یقین ہے۔

علیم : ہاں۔ کیوں نہیں۔ میرے بچپن کا ساتھی جو ہے۔

نجمہ : وہ تو کئی دن سے ٹال کھولے ہوئے ہے آپ نے پہلے کیوں نہیں بلایا؟

علیم : میں نے کئی مرتبہ کہا مگر وہ ٹال گیا۔

نجمہ : اور آپ نے کبھی اس کا ذکر بھی نہیں کیا۔

علیم : کبھی موقع ہی نہیں آیا۔

نجمہ : تو لڑائی میں مارے جانے کی خبر غلط تھی۔

علیم : غلط ہی تھی (مسکرا کر) یوں سمجھ لو کہ دوبارہ پیدا ہو گیا۔

نجمہ : دوبارہ پیدا ہو گیا!

علیم : ہاں دوسرا ہی جنم لیا ہے۔ خیر وہ آتا ہی ہوگا۔ ذرا ٹھاٹ دار اچھا رعب پڑ جائے۔

نجمہ : مگر مجھے اس سے ڈر معلوم ہوتا ہے۔ میں اس کے سامنے آنا نہیں چاہتی۔

علیم : کیوں۔ (طنزیہ) کیا اس کا چہرہ اتنا بھیانک ہو گیا ہے کہ تمھیں اس سے ڈر معلوم ہونے لگا ہے۔

نجمہ : نہیں۔ بلکہ اس کے چہرے پر جو اُداسی چھائی رہتی ہے اس کی آنکھوں میں جو غم کی جھلک ہے، اس کی آواز میں جو درد پیدا ہو گیا ہے اور اس کی آنکھوں میں جو غم ہے وہ سب مجھ سے برداشت نہیں ہوتا۔

علیم : مگر اپنوں کو بھلایا بھی تو نہیں جاسکتا (نجمہ کا چہرہ غور سے دیکھ کر) اگر تمھارے دو میٹھے بول اس کی زندگی میں اُمنگ پیدا کر سکتے ہیں تو کہاں کی برائی ہے؟

نجمہ : (مشکوک نظروں سے علیم کو دیکھ کر) مگر میں اس سے دور رہنا چاہتی ہوں میں اس سے نظریں نہیں ملا سکتی۔

علیم : مگر آج وہ یہاں آئے گا ضرور (مسکرا کر) کسی کو دعوت نامہ دے کر میں واپس نہیں لیا کرتا۔

نجمہ : تو پھر میں اس کے سامنے نہیں آؤں گی۔

علیم : کیوں؟

نجمہ : اس لیے کہ — اس لیے کہ —

علیم : (طنزیہ مسکرا کر) میں اس سے کہہ دوں گا کہ وہ کل کی باتوں کو بھول جائے۔

(مسکراتا ہوا دوسرے کمرے میں چلا جاتا ہے۔ نجمہ کے ے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ پریشان ہوگئ دروازے کو دیکھتی

رہتی ہے پھر بلند آواز سے)

نجمہ : بٹن — ارے بٹن (کچھ دیر بعد بٹن کمرے میں آتی ہے۔ نجمہ اسے دیکھ کر) بٹن۔ اب تو رہی سہی بھی کٹ گئی۔

بٹن : (گھبرا کر) خیریت تو ہے۔

نجمہ : خاک بھی خیریت نہیں۔ آج وہ پھر آرہا ہے (بٹن سوالیہ نظروں سے نجمہ کو دیکھتی ہے) ارے وہی کل والا کوئلہ فروش!

بٹن : کوئلہ فروش۔ یعنی وہ بھوت۔

نجمہ : آج تمھارے بھائی جان نے اسے چائے پر بلایا ہے۔

بٹن : آپ کا مطلب ہے کہ (کچھ دیر خاموش رہ کر) تو گویا بھائی جان ہمارا اور مذاق اڑاوانا چاہتے ہیں۔

نجمہ : وہ چچا صادق کا لڑکا ہے بٹن۔

بٹن : چچا صادق کا! مگر وہ تو —

نجمہ : ہاں مارا گیا تھا مگر پھر پیدا ہوگیا۔

بٹن : مگر اس نے پہلے کیوں نہیں بتلایا اور آپ تو اسے پہلے سے جانتی ہوں گی (نجمہ اس طرح خاموش رہتی ہے جیسے کچھ سوچ رہی ہو۔ بٹن سوالیہ نظروں سے اسے دیکھتی رہتی ہے۔ نجمہ کچھ دیر بعد)

نجمہ : چچا صادق سے ہمارے گھریلو تعلقات اچھے نہیں تھے۔ اس لیے میں نے اسے صرف ایک دو بار ہی دیکھا تھا اور پھر داڑھی بھی تو خود رو جھاڑیوں کی طرح بڑھا رکھی ہے (سوچتے ہوئے) پیشانی کے پاس جو زخم ہے وہ شاید جنگ کی دین ہے (پھر سوچتے ہوئے) اب اس کی خاطر مدارات تم ہی کرنا میں تو اس کے سامنے بھی نہ آسکوں گی۔

بٹن : کیوں؟

نجمہ : بس یونہی — مجھے اس سے ڈر معلوم ہوتا ہے۔

بجن : واہ یہ بھی خوب رہی۔ گویا نشانہ بننے کے لیے آپ مجھے چھوڑ رہی ہیں۔

نجمہ : خدا کے لیے۔ میری پیاری بہن۔ اس کی نگاہوں میں جو اُداسی ہے اسے دیکھ کر مجھے رونا آنے لگتا ہے۔

(بجن کچھ دیر کھڑی رہتی ہے۔ پھر کچھ سوچتی ہوئی کمرے سے چلی جاتی ہے۔ نجمہ کمرے میں ٹہلنے لگتی ہے اس کے انداز سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ پریشان ہے۔ کچھ دیر بعد علیم دروازے کے پاس آکر)

علیم : ارے بھئی میرا سفید پینٹ کہاں ہے؟

نجمہ : (ایک دم گھبرا کر) جی ہو رہا ہے۔

علیم : (غور سے نجمہ کو دیکھتا ہے پھر مسکرا کر) کیا ہو رہا ہے؟

نجمہ : چائے کا انتظام۔

علیم : مگر میں پوچھ رہا ہوں میرا سفید پینٹ کہاں ہے؟

نجمہ : (ذرا شرمندہ ہوکر) میں سمجھی آپ چائے کے انتظام کا پوچھ رہے ہیں۔ آپ کے کپڑے میں نے سونے کے کمرے میں رکھ دیے تھے۔

(علیم مسکراتا ہوا کمرے سے چلا جاتا ہے۔ نجمہ پھر اسی طرح خیالات میں کھو جاتی ہے کچھ دیر بعد حامد دوسرے کمرے سے آتے ہوئے)

حامد : میں آداب عرض کرتا ہوں۔

نجمہ : (گھبرا کر اس کی طرف دیکھ کر) جی آپ۔ (حامد مسکراتا ہے) آیئے (حامد آہستہ آہستہ بڑھ کر صوفے پر بیٹھ جاتا ہے) ابھی آپ ہی کے بارے میں گفتگو ہو رہی تھی۔

حامد : اچھا ـــ کس سے ہو رہی تھی؟

نجمہ : یعنی میرا مطلب ہے کہ ـــ

حامد : علیم سے ـــ یعنی علیم صاحب سے (مسکرا کر) اب تو علیم صاحب ہی کہنا ہوگا۔ جی ٹھیک ہے نا (نجمہ خاموش رہتی ہے اور شرمندگی کے انداز میں نظریں

جھکا لیتی ہے) ایک زمانے میں، میں اسے علیم ہی کہا کرتا تھا۔ ارے ہاں بٹن
کہاں ہے؟

نجمہ : باورچی خانے میں ہے۔

حامد : اور علیم— صاحب—

نجمہ : ابھی دفتر سے آئے ہیں لباس تبدیل کر رہے ہیں۔

حامد : کل آپ مجھے پہچانی نہیں تھیں۔

نجمہ : یہ کیسے ممکن ہے میں نے تو پہلے ہی دن آپ کو پہچان لیا تھا (نجمہ ٹالنے کے انداز میں) آپ نے داڑھی کب سے رکھ لی ہے؟

حامد : (نجمہ کا چہرہ غور سے دیکھ کر) داڑھی رکھنے پر فی الحال حکومت نے کوئی ٹیکس تو لگایا نہیں ہے۔

(حامد خود ہی زوردار قہقہہ لگاتا ہے اسی وقت علیم کمرے میں داخل ہوکر)

علیم : ارے کب آئے؟

حامد : ابھی آیا ہوں۔

علیم : (مسکرا کر) مگر یہ قہقہے کیوں لگائے جا رہے ہیں!

حامد : (بے حد سنجیدگی سے) تمھاری بیگم صاحب کو داڑھی کے قومی فوائد بتلا رہا تھا۔

علیم : (پاس ایک کرسی پر بیٹھ کر) قومی فوائد!

حامد : جی ہاں۔ مثلاً اگر ہندوستان کے تمام مرد داڑھی منڈانا چھوڑ دیں تو لاکھوں کا زرمبادلہ حاصل ہوسکتا ہے۔

علیم : گویا سب کو غیر ممالک کے چڑیا گھروں اور عجائب خانوں میں بھیجا جاسکتا ہے۔

حامد : (ہنس کر) ہاں یہ بھی ہوسکتا ہے۔ ویسے بلیڈ برآمد کرکے بھی زرمبادلہ کمایا جاسکتا ہے۔

علیم : (ہنس کر) اگر ہم سب ننگے رہنے لگیں تو کپڑا برآمد کرکے بھی زرمبادلہ کمایا جاسکتا ہے۔ اچھا کہو تمھارے کوئلے کا بزنس کیسا چل رہا ہے۔

حامد : نیا نیا کاروبار ہے مگر میں ناامید نہیں ہوں۔

علیم : (نجمہ کی طرف دیکھ کر) بنّن کہاں ہے (پھر خود ہی بلند آواز سے) بنّن— ارے بنّن— (حامد کی طرف دیکھ کر) کل ان لوگوں نے تمھیں پہچانا نہیں تھا۔

حامد : (ایسے لہجے میں جس میں طنز چھپا ہوا ہے) قسمت ہی بری ہے (بات بدلنے کے انداز میں) صورت بھی تو بدل گئی ہے۔

علیم : کل سے یہ لوگ تم سے بہت ناراض ہیں (حامد پہلے نجمہ کو دیکھتا ہے پھر سوالیہ نظروں سے علیم کو۔ علیم مسکرا کر) سنا ہے کل تم نے لوگوں کی کافی کھنچائی کردی تھی۔

حامد : ایسی تو کوئی بات نہیں ہے (بنّن کمرے میں آتی ہے۔ حامد کو دیکھ کر دروازے پر رک جاتی ہے۔ حامد مسکرا کر) آیئے۔ آیئے۔ میں آج کوئلہ کا بل لے کر نہیں آیا ہوں۔

بنّن : (شرما کر) آداب عرض ہے۔

حامد : (صوفے کی طرف اشارہ کرکے) تشریف رکھیے۔ کہیے آج کیا ارادہ ہے (مسکرا کر) ویسے کل میں آپ لوگوں کی مہمان نوازی کا قائل ہوگیا۔

بنّن : خدا کے لیے اب تو کرم کیجیے (علیم کی طرف دیکھ کر) چائے تیار ہوگئی ہے یہیں لے آؤں۔ (علیم، حامد کی طرف دیکھتا ہے جو کنکھیوں سے نجمہ کی طرف دیکھ رہا ہے۔ نجمہ نظریں جھکائے بیٹھی ہے۔ علیم بنّن کی طرف دیکھ کر)

علیم : ہاں یہیں لے آؤ (بنّن خاموشی سے کمرے سے چلی جاتی ہے۔ علیم مسکرا کر حامد کو دیکھ کر) تم نجمہ کو اس قدر غور سے کیا دیکھ رہے ہو (حامد چونک پڑتا ہے اور چہرے پر شرمندگی کے آثار پیدا ہوتے ہیں۔ علیم قہقہہ لگا کر) مگر تم نے داڑھی کی واقعی اچھی خاصی کھیتی کررکھی ہے۔

حامد : (ٹھنڈی سانس بھر کر) مجبوری ہے۔ اگر داڑھی نہ ہوتی تو میں دنیا کو منہ دکھانے کے قابل نہ ہوتا (علیم اور نجمہ سوالیہ نظروں سے حامد کو دیکھتے ہیں۔

حامد کچھ دیر خلا میں گھورتا رہتا ہے پھر آہستہ سے) میری ایک آنکھ اور ناک اپنی نہیں ہے صرف سرجری کا کمال ہے اور چہرہ اتنا مسخ ہو چکا ہے کہ اسے سوائے داڑھی میں چھپانے کے کوئی چارہ نہیں رہ گیا تھا (ٹھنڈی سانس بھر کر) یورپ کے بہترین ڈاکٹر بھی مجھے ایک معمولی چہرہ دینے میں ناکام رہے میں کیوں کر زندہ رہ گیا بس یہ خدا کی قدرت کا ایک نمونہ ہے۔ (بٹن چائے کا سامان لیے کمرے میں آتی ہے اور خاموش بیٹھ کر چائے بنانے لگتی ہے۔ حامد اسے غور سے دیکھ کر) جب میں لڑائی پر گیا تھا بٹن اس وقت چھے سات سال کی رہی ہوگی۔

علیم : ہاں اتنی ہی بڑی تھی۔

حامد : اور — (نجمہ کی طرف دیکھ کر) تمھاری بیگم صاحب کی صحت اب کافی اچھی ہوگئی ہے۔ اس وقت تو کافی دبلی پتلی تھیں۔

علیم : (شرارت سے مسکرا کر نجمہ کی طرف دیکھ کر) ہاں شادی کے بعد سے برابر پھیلتی جارہی ہیں۔

حامد : تمھارے کوئی بچہ نہیں ہے۔

علیم : ہاں۔ (نجمہ نظریں جھکا لیتی ہے۔ علیم حامد کو غور سے دیکھتا ہے پھر چند سکنڈ خاموش رہ کر) ڈاکٹروں کا کہنا ہے کہ یہ بچہ پیدا کرنے کے قابل نہیں ہیں۔

حامد : معاف کرنا علیم۔ مجھے افسوس ہے۔

علیم : مگر میں اور نجمہ دونوں مطمئن ہیں۔ ہمیں اس کا غم نہیں۔ ہماری گھریلو زندگی خوش گوار ہے۔ بٹن ہی کو ہم اپنی اولاد سمجھتے ہیں۔

(بٹن چائے کی پیالی حامد کو دیتی ہے۔ حامد مسکرا کر)

حامد : آج اس میں کتنا نمک ہے۔

بٹن : بالکل نہیں۔ ہم تو صرف لوگوں کو ایک بار ہی اپنا نمک خوار بناتے ہیں۔

(حامد اور علیم قہقہہ مار کر ہنستے ہیں۔ نجمہ مسکراتی ہے)

علیم : بے حد شریر ہے۔ اس سال بی اے پاس کر لے گی (سب چائے پینے لگتے ہیں۔ علیم چائے کا گھونٹ لے کر) جب میں نے تم کو پہلی بار دیکھا تو پہچانا نہیں۔ ذہن میں جو تمھاری خوبصورت شخصیت تھی تم اس سے بالکل مختلف تھے۔

حامد : موت اور زندگی کی کشمکش نے مجھ سے سب کچھ چھین لیا۔ (ٹھنڈی سانس بھر کر) صورت ہی نہیں بدلی شاید دل بھی بدل گیا ہے۔ واپسی پر بڑی بڑی تمنائیں لے کر لوٹا تھا مگر آکر دیکھا تو نشیمن ہی لٹ چکا تھا۔ نہ ماں نہ باپ — علیم میری صورت کی طرح میرا دل بھی داغ دار ہو چکا ہے۔

علیم : (خفیف سی طنزیہ مسکراہٹ سے) ابھی تک دل کی باتیں نہیں بھولے (چند سیکنڈ خاموش رہ کر) جس شخص نے جنگ کے ہولناک مصائب سہہ لیے ہوں اس کی زبان سے ناامیدی کی باتیں اچھی نہیں لگتیں۔

حامد : شاید تم سچ کہتے ہو علیم مگر اب میں اس دنیا کو اپنی دنیا بھی کہنا نہیں چاہتا تھا مگر کل بشن کے اصرار نے مجھے جانے کیوں اس دنیا میں کھینچ لیا جو میں بھول چکا تھا یہ عزیزوں اور دوستوں کی دنیا مجھے جانے کیوں اب عذاب معلوم ہوتی ہے جانے کیوں میں محسوس کرتا ہوں کہ اس دنیا میں انسان سب کچھ لٹاتا ہی لٹاتا ہے۔

علیم : سب کچھ لٹا کر ہی محبت اور خلوص جیسی شے پاتا ہے (سگریٹ جلا کر اس کا کش لے کر) تم اس گھر میں آجاؤ تم کو یہاں محبت ہی محبت ملے گی۔ تمھیں بشن کی شوخیاں ملیں گی۔ نجمہ کا خلوص ملے گا اور ایک بھائی کا پیار۔

حامد : جب گود میں سمیٹی ہوئی خوشیاں بکھر جاتی ہیں تو انسان بہت ناامید ہو جاتا ہے (آنسو پونچھ کر) زندگی تاریکی میں چلنے کا نام رہ جاتا ہے جس کی منزل کسی گہرے کھڈ کی تاریکیاں ہوتی ہیں۔

علیم : تم بہت ناامید ہو گئے ہو جو زندگی تم نے موت سے لڑ کر چھینی ہے اس کی قدر کرو حامد۔ خدا نے وہ تم کو تاریکی کی نذر کر دینے کے لیے نہیں دی ہے۔

حامد : زندگی تو اب مر کر کے جیے جانے کا نام رہ گیا ہے (ٹھنڈی سانس بھر کر) جانے ان کم بخت ڈاکٹروں کو میری موت سے کون سی دشمنی پیدا ہوگئی تھی کہ اس کا پنجہ موڑ کر ہی دم لیا۔

بٹن : (بہت جذباتی انداز میں) ایسا نہ کہیے حامد بھائی ایسا نہ کہیے۔ میں رو پڑوں گی۔

حامد : (بٹن کو دیکھ کر جو دوپٹے سے آنسو پونچھ رہی ہے) نہیں بٹن۔ نہیں (اپنی آنکھ سے آنسو پونچھتے ہوئے مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے) میری دوسری آنکھ جانے کس خوش قسمت کی آنکھ ہے کہ اس میں آنسو آتے ہی نہیں (کچھ دیر خاموش رہ کر) جس کی آنکھ اپنی نہ ہو، ناک اپنی نہ ہو جس کی شریانیں مانگے کے خون کا بوجھ اٹھائے ہوں، اس کا دل کیا ہوگا یہ وہ خود نہیں سمجھ سکتا۔

علیم : یہ سب فضول تصورات ہیں حامد۔ تم اس ٹال سے اس مکان میں اُٹھ آؤ۔ یہاں جگہ کی کمی نہیں ہے۔ گھریلو ماحول تمھارے خیالات پر اچھا اثر ڈالے گا۔

حامد : شکریہ علیم مگر تم مجھے میری دنیا سے باہر نکالنے کی کوشش نہ کرو۔ ایک دن شاید میں پھر اس خوبصورت دنیا سے محبت کرنے لگوں (سب خاموش رہتے ہیں ماحول پر سنجیدگی اور اُداسی چھا جاتی ہے۔ کچھ دیر بعد بٹن چائے کا سامان اٹھا کر دوسرے کمرے میں چلی جاتی ہے۔ علیم سگریٹ حامد کی طرف بڑھاتا ہے۔ حامد نفی میں سر ہلاتے ہوئے) نہیں شکریہ۔ ڈاکٹروں نے سختی سے منع کر دیا ہے۔ میرے پھیپھڑے خطرناک حد تک کمزور ہیں۔

علیم : (کھڑے ہوکر) آج کھانے کے وقت تک یہیں رکو تمھارا دل بہلے گا (حامد خاموش رہتا ہے) اچھا مجھے اجازت دو۔ ایک ضروری کام ہے۔

(حامد خاموش رہتا ہے۔ علیم چند سیکنڈ رُکتا ہے پھر آہستہ آہستہ کمرے سے چلا جاتا ہے۔ کچھ دیر حامد نظریں جھکائے بیٹھا رہتا ہے پھر نجمہ کو دیکھتا ہے جو خیالات میں کھوئی ہوئی برابر دیوار کو تاکے جا رہی ہے۔ حامد چند سیکنڈ پھر اسے غور سے دیکھتا ہے اور آہستہ سے)

حامد : نجمہ۔ (نجمہ نظریں اٹھا کر حامد کو دیکھتی ہے) کیا سوچ رہی ہو؟

نجمہ : کچھ نہیں۔ آپ کی ایسی ناامیدی کی باتوں نے بڑا دکھی کردیا ہے۔

حامد : تمھاری زندگی خوشگوار ہے مجھے اس سے بڑا اطمینان ہوا مگر اس کا بڑا دکھ ہے کہ تمھارے کوئی اولاد نہیں ہے۔

نجمہ : (آنکھوں سے آنسو پونچھتے ہوئے) ٹھیک ہے۔ مجھے اولاد کی کوئی تمنا نہیں۔

(حامد کھڑکی کے پاس جاتا ہے اور باہر دیکھنے لگتا ہے۔ کچھ دیر خاموشی رہتی ہے پھر حامد پلٹ کر نجمہ کو دیکھ کر ٹھنڈی سانس بھر کر)

حامد : آج میری شکل دیکھ کر کوئی بھی عورت مجھ سے نفرت کرے گی۔ میری زندگی—

نجمہ : ایسا نہ کہیے— ایسا نہ کہیے۔

حامد : (بات کاٹ کر) میں نے مرجانا چاہا تو موت مسکرا کر مجھ سے روٹھ گئی۔ میں نے ذلت چاہی تو حکومت نے میرے سینے کو تمغوں سے لاد دیا۔ میں دوسرے کی آنکھ سے دیکھتا ہوں۔ دوسرے کی ناک سے سونگھتا ہوں، دوسروں کے خون کی حرارت پر زندہ ہوں۔ کیا یہ کوئی زندگی ہے (طنزیہ مسکرا کر) قدرت نے بھی مجھ سے کیسے کیسے انتقام لیے ہیں (ٹھنڈی سانس بھر کر) میرے کرتوت کی سزا تم کو بھی بھگتنا پڑی ہوگی۔

نجمہ : تمھاری موت کی خبر نے میرے سارے حوصلے پست کردیے— ڈاکٹروں نے مجھے بدنامی سے تو بچالیا مگر میری ماں بننے کی خواہش ہمیشہ کے لیے مجھ سے چھین لی اور میں اس سے مطمئن ہوگئی۔

(نجمہ ہچکیوں سے رونے لگتی ہے۔ حامد اس کا کاندھا تھپ تھپاتے ہوئے)

حامد : ہمت سے کام لو نجمہ۔ ہمت سے کام لو۔ تم ایک خوش گوار زندگی گزار رہی ہو یہ قدرت کا کتنا بڑا انعام ہے تمھارے لیے۔

نجمہ : میں نے خوشیوں کی یہ دنیا چرا کر حاصل کی ہے مجھے اس سے نفرت ہے۔ میں چیخ چیخ کر کہہ دینا چاہتی ہوں کہ میری خوشیاں چرائی ہوئی ہیں۔ دھوکے

اور فریب سے حاصل کی ہوئی یہ زندگی میرے سینے پر ایک بوجھ ہے آخر اس بوجھ سے دب کر مر کیوں نہیں جاتی!

(نجمہ ہچکیوں سے رونے لگتی ہے۔ حامد اس کا کاندھا تھپ تھپا کر)

حامد : جو کچھ دنیا کی نظر سے پوشیدہ ہے کہیں وہ تمھارے ان آنسوؤں میں ڈھل کر ایک ناخوش گوار حقیقت نہ بن جائے نجمہ۔

نجمہ : (حامد کے سینے پر سر رکھ کر) میرے ماں باپ یہ غم لے کر مر گئے کہ میں بدچلن ہوں۔ میرے بھائی نے یہ شہر چھوڑ دیا کہ اسے میری صورت سے نفرت ہوگئی تھی مگر میں زندہ ہوں۔ ایک قاتل کی طرح جو جیل کی چاردیواری میں پشیمان رہ کر بھی دنیا والوں کو بخشی گئی خوشیوں میں سے چوری کرتا رہتا ہے اور جو خوشیاں حقیقت میں اس کا حصہ نہیں ہیں۔

حامد : کیا علیم کو اس کا علم ہے کہ تم ــــ؟

نجمہ : یہ مجھے نہیں معلوم مگر کبھی انھوں نے اس کا اظہار نہیں کیا۔

(حامد خاموشی سے نجمہ کا کاندھا تھپ تھپاتا ہے اور خلا میں گھورتا رہتا ہے کچھ دیر بعد آہستہ سے)

حامد : میں اب یہاں سے چلا جاؤں گا۔ تمھاری خوشیاں تم سے چھیننا نہیں چاہتا۔

نجمہ : نہیں حامد نہیں۔ اب میری زندگی کو بے چینیوں کا تحفہ نہ دو۔

حامد : علیم میرے بچپن کا دوست اور ساتھی رہا ہے وہ زندگی کو کھیل سمجھ کر اس سے کھیلتا رہا ہے (مڑ کر نجمہ کو دیکھ کر) ہماری کسی بھی لاپروائی سے اس کے خوابوں کا محل گر پڑے گا اور وہ دکھی ہوکر بلبلا اٹھے گا (آنکھوں سے آنسو پونچھ کر) نجمہ مجھے جانا ہی ہوگا۔

نجمہ : نہیں، نہیں، نہیں۔ میری زندگی میں تمھارے آنے سے جو ہلچل پیدا ہوگئی ہے وہ ایک طوفان بن جائے گی اور یہ طوفان مجھے لے ڈوبے گا۔

حامد : مگر نجمہ میری موجودگی تم دونوں کی خوشیوں کی دنیا لوٹ لے گی۔ زندگی ایک

دہکتا ہوا انگارا بن جائے گی جو سب کچھ جلا کر رکھ دے گی۔

نجمہ : جو کچھ بھی ہو حامد میں زندگی میں لگی ہوئی ہر آگ میں جلتے رہنے میں لذت محسوس کروں گی خدا کے لیے اب مجھے اکیلا نہ چھوڑو۔
(علیم کمرے میں داخل ہو کر)

علیم : بٹن کہاں ہے۔حامد منہ پھیر کر آنسو پونچھتا ہے۔ نجمہ دوپٹے سے منہ چھپا کر آنسو پونچھتی ہے۔علیم دونوں کو غور سے دیکھ کر) کیا بات ہے۔

نجمہ : کوئی بات نہیں۔ یہ چلے جانا چاہتے ہیں۔

علیم : کون۔ حامد۔ کیوں (مسکرا کر) کیا اب کوئلہ فروشی نہیں کرنا۔ (دونوں خاموش رہتے ہیں) اب یہ ہرگز نہیں جاسکتا۔

حامد : مجھے جانا ہی ہوگا علیم میں زندگی میں بری طرح ہار چکا ہوں۔

علیم : (حامد کے پاس جا کر) تم ہم لوگوں کو چھوڑ کر چلے جاؤ گے۔بٹن کو بھی چھوڑ کر جس سے تم کتنا پیار کرتے تھے اپنے کاندھے پر لاد کر بازار لے جایا کرتے تھے۔ مجھ کو چھوڑ کر جس کی خاطر ایک مرتبہ تم اسکول میں آٹھ دس لڑکوں سے الجھ پڑے تھے اور نجمہ کو چھوڑ کر جس سے تم—

حامد : نہیں علیم تم نہیں سمجھتے۔ میری زندگی—

علیم : (بات کاٹ کر) تم زندگی کو جوا سمجھ کر اسے برباد نہیں کرسکتے۔ اب تم کو اسی گھر میں رہنا ہوگا۔

حامد : (بہت جذباتی انداز میں) تاکہ ایک روز تم مجھ سے نفرت کرنے لگو۔

علیم : آخر کیوں۔

حامد : کیا معلوم میرے یہاں رہنے سے کیا پیچیدگیاں پیدا ہوں۔ مستقبل کو کسی نے نہیں دیکھا۔

علیم : دنیا کی ہر پیچیدگی سلجھائی جاسکتی ہے۔ دنیا کا ہر غم بھلایا جاسکتا ہے۔

حامد : نہیں علیم۔ مجھے جانا ہی ہوگا۔ تمھیں کیا معلوم علیم کہ میں کتنا کمینہ ہوں۔

علیم : اور مجھے معلوم بھی ہو تو میں اسے بھول چکا ہوں۔ اور جب تم اس قدر محتاط رہنا چاہتے تھے تو اس شہر اور پھر اس محلے میں کیوں آئے۔

حامد : علیم۔

علیم : کیا تم نجمہ کو اب بہن نہیں کہہ سکتے۔

حامد : علیم — میرے منہ پر ایسا تمانچا نہ مارو کہ میں بلبلا اٹھوں اور برداشت نہ کر سکوں۔ (علیم کچھ دیر خاموش کھڑا دونوں کو دیکھتا رہتا ہے۔ پھر خاموشی سے دوسرے کمرے میں چلا جاتا ہے۔ کچھ دیر دونوں خاموش کھڑے رہتے ہیں۔ پھر نجمہ، حامد کو دیکھ کر)۔

نجمہ : آپ یہاں سے چلے جایئے۔ خدا کے لیے چلے جایئے۔ ورنہ یہ تمانچے ہماری جان لے لیں گے۔ (ہچکیوں سے رونے لگتی ہے۔ حامد چند سیکنڈ خاموش کھڑا رہتا ہے پھر آہستہ آہستہ کمرے سے چلا جاتا ہے)

(پردہ)

خطوط کی واپسی

افرادِ تمثیل (کردار)

(1) فاروقی (ایک مشہور بیرسٹر) (2) ناہید (فاروقی کی بیٹی) (3) نازنین (فاروقی کی ایک عزیز لڑکی جو فاروقی کے ساتھ رہتی ہے) (4) عارف (ایک نوجوان وکیل) (5) ملازم

منظر

(ایک سجا ہوا ڈرائنگ روم جس میں تمام سامان قیمتی ہے جس وقت پردہ اٹھتا ہے تو ناہید صوفے پر بیٹھی سوئٹر بنتی نظر آتی ہے۔ کچھ دیر بعد نازنیں داخل ہوتی ہے کتابیں صوفے پر رکھ کر ناہید کے پاس بیٹھتے ہوئے)

نازنیں : ارے ناہید آپا ابھی تک یہ سوئٹر تیار نہیں ہوا؟

ناہید : (بغیر نظریں اٹھائے کام میں مشغول رہتے ہوئے) دن بھر فرصت ہی کہاں ملی!

نازنیں : مگر شیڈ کچھ زیادہ شوخ ہوگیا ہے۔

ناہید : (اپنے کام میں مشغول رہتے ہوئے) آج کالج میں بہت دیر کردی؟

ناز نیں : جی۔ وہ۔ آج۔ ہمارے کالج میں ایک لیکچر تھا۔

ناہید : اچھا۔ (نظریں اٹھا کر نازنیں کو دیکھ کر) کس کا لیکچر تھا؟

نازنیں : جی وہ میرا مطلب ہے۔ باہر سے ایک صاحب۔ میرا مطلب ہے یونیورسٹی کے ایک پروفیسر آئے تھے۔

ناہید : (پھر اپنے کام میں مشغول ہوکر) کس ٹاپک پر بولے تھے؟

نازنیں : ٹاپک۔ یہی اپنی خارجہ پالیسی پر (مسکرا کر) بڑے مزے دار شعر بھی سنا رہے تھے۔

ناہید : اچھا۔ (اپنے کام میں مشغول رہتے ہوئے) آج بہت خوش ہو۔ کیا بات ہے۔

نازنیں : کوئی خاص بات نہیں۔ ویسے ہی آج موڈ کچھ اچھا ہے۔ میرا کوئی خط تو نہیں آیا۔

ناہید : (نظریں اٹھا کر نازنیں کو غور سے دیکھ کر) کس کا خط؟

نازنیں : (کچھ دیر خاموش رہ کر نظریں جھکا کر) گھر سے۔ دیکھیے نا ابا جی کتنے دن تک خط نہیں لکھتے۔

ناہید : (پھر اپنے کام میں مشغول ہوکر) نہیں تمھارے گھر سے کوئی خط نہیں آیا (نازنیں مشکوک نظروں سے ناہید کو دیکھتی ہے) تم جنگل میں تو بیٹھی نہیں ہو کہ انھیں فکر ہو (نازنیں خاموش رہتی ہے مگر اس کے چہرے پر پریشانی کے آثار پیدا ہوتے ہیں۔ کچھ دیر بعد ناہید پھر نظریں اٹھا کر نازنیں کو دیکھتے ہوئے) بھئی تم وقت پر گھر آجایا کرو۔ مجھے ہول سا اٹھنے لگتا ہے۔

نازنیں : (اس طرح ناہید کو دیکھتی ہے جیسے اس سے نظریں ملاتے ہوئے شرما رہی ہو) میں سیدھی گھر چلی آتی ہوں وہ تو آج اتفاق سے دیر ہوگئی (کچھ دیر خاموش رہ کر) ناہید آپا۔ آج پکچر چلیے نا۔ کل اتوار ہے۔

ناہید : نہیں بھئی آج تو مجھے بہت سے ضروری کام کرنے ہیں۔

نازنیں : واہ ناہید آپا۔ جب بھی میں پکچر کا کہتی ہوں آپ کام کا بہانہ کر دیتی ہیں۔ آج تو میں کچھ سہیلیوں سے بھی وعدہ کر آئی ہوں (ناہید خاموش رہتی ہے۔

ناز نیں کچھ دیر بعد) آپ تو اس سوئٹر پر ایسی جھکی ہوئی ہیں کہ اگر آج یہ تیار نہیں ہوا تو سردی ہی گزر جائے گی (ناہید کوئی جواب نہیں دیتی) تو پھر آج چل رہی ہیں پکچر؟

ناہید : نہیں آج نہیں (اپنے کام میں مشغول رہتے ہوئے) اب تم جا کر منہ ہاتھ دھولو اور عبدل سے چائے کے لیے کہہ دو کہ یہیں لے آئے۔ میں کب سے تمھارا انتظار کر رہی ہوں۔

ناز نیں : (کھڑے ہو کر ایسے لہجے میں جس سے بددلی نمایاں ہے) آپ نے چائے پی لی ہوتی۔

ناہید : (نظریں اٹھا کر ناز نیں کو دیکھ کر) کبھی میں نے اکیلے چائے پی ہے جو آج پی لیتی۔ ڈیڈی بھی ابھی تک نہیں لوٹے۔ آج جانے کیوں سب ہی دیر کر رہے ہیں۔

ناز نیں : (مسکرا کر دوسرے کمرے کی طرف جاتے ہوئے) ناہید آپا ہم بچے تو ہیں نہیں کہ راستہ بھول جائیں گے۔

(دوسرے کمرے میں چلی جاتی ہے۔ ناہید اسے جاتا ہوا دیکھتی رہتی ہے۔ پھر ایک خط اٹھا کر اسے غور سے دیکھتی ہے۔ پھر ڈاک خانہ کی مہر کو غور سے دیکھتی ہے اور پھر اسے رکھ کر اپنے کام میں مشغول ہو جاتی ہے۔ کچھ دیر بعد فاروقی صاحب کمرے میں آتے ہیں۔ ان کے انداز سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ بہت خوش ہیں)

فاروقی : کہو بیٹی کیا ہو رہا ہے (ناہید کھڑی ہو جاتی ہے) ارے ابھی تمھارا یہ سوئٹر پورا نہیں ہوا۔ (ناہید کوٹ اتارنے میں ان کی مدد کرتی ہے) ناز نیں کالج سے آ گئی؟

ناہید : جی ہاں آ گئی (کوٹ صوفے کی پشت پر ڈالتے ہوئے) آج وہ بھی دیر سے آئی ہے۔

فاروقی : ہوگئی ہوگی کسی وجہ سے دیر (صوفے پر بیٹھ کر) کیا چائے کا پروگرام نہیں ہے۔

ناہید : چائے آرہی ہے۔ مگر اس کا کالج سے دیر میں آنا—

فاروقی : (بات کاٹ کر) کیا بوڑھی کھوسٹ عورتوں کی سی باتیں کرتی ہو۔ کوئی کام ہوگا دیر ہوگئی۔ (محبت سے اس کے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر) اس عمر میں بوڑھیوں جیسی باتیں اچھی نہیں لگتیں (کچھ دیر خاموش رہ کر) بیٹی۔ آج ہم وہ کیس جیت گئے۔

ناہید : کون سا کیس ڈیڈی؟

فاروقی : وہی مرڈر کیس۔ بہت اہم کیس تھا۔ اس کے جیتنے پر تمام بار حیرت زدہ ہے (مسکرا کر) سچ پوچھو تو اس کیس میں میری پرسٹیج اسٹیک پر لگی ہوئی تھی (نازنیں کمرے میں آتی ہے۔ فاروقی اسے دیکھ کر) ارے نازنیں یہ ناہید تمھاری شکایت کررہی ہے کہ تم کالج سے دیر میں آئی ہو۔

نازنیں : انکل ناہید آپا تو بلاوجہ پریشان ہوجاتی ہیں۔ کالج میں ایک لیکچر تھا اسے سننے لگی تھی۔

ناہید : چائے کو کہہ دیا۔

نازنیں : جی ہاں عبدل لارہا ہے (فاروقی کو دیکھ کر) انکل! اس بار چھٹیاں کہاں گزاری جائیں گی۔

فاروقی : یہ پروگرام تو تم دونوں کو بنانا ہے (عبدل چائے لاکر سامنے میز پر رکھتا ہے اور واپس چلا جاتا ہے۔ نازنیں چائے بنانے لگتی ہے۔ فاروقی کچھ دیر خاموش رہ کر) عارف پرسوں انگلینڈ جارہا ہے (ناہید نظریں اٹھا کر فاروقی کو دیکھتی ہے مگر خاموش رہتی ہے) بہت ذہین ہے اور سچ پوچھو تو آج کا مقدمہ اسی کی ذہانت سے جیتا ہے۔ اسی وقت عارف کمرے میں داخل ہوتا ہے۔ فاروقی اسے دیکھ کر) ارے بھئی عارف آؤ ابھی تمھارا ہی ذکر ہورہا تھا۔ کہو تمھاری تیاری مکمل ہوگئی۔

عارف : جی ہاں۔ تیاری تو ہوگئی ہے۔ میں آپ کو آج کی کامیابی پر مبارک باد دینے حاضر ہوا تھا۔

فاروقی :سارا بار حیرت زدہ ہے۔ کسی کو اس میں جان نظر نہیں آتی تھی۔

عارف : مجرم خود ناامید تھا۔

فاروقی : مگر مجھے پوری امید تھی۔ تم نے ڈیفنس تیار کرنے میں جو محنت کی تھی وہ قابل مبارک باد ہے۔

عارف : یہ تو آپ کا کرم ہے کہ آپ اس قدر اہم مقدمات میں مجھ پر بھروسا کرتے ہیں۔

فاروقی : ذہین اور محنتی آدمی پر اعتماد نہ کرنا بزدلی ہے۔ (کھڑے ہوکر) اچھا ذرا میں کپڑے بدل لوں۔ آج کلب میں ایک اہم میٹنگ ہے (عارف کھڑا ہوتا ہے) ارے بھئی بیٹھو تمھارا پلین کس وقت پرواز کرے گا؟

عارف : دس بج کر پندرہ منٹ پر۔

فاروقی : دس بج کر پندرہ پر۔ اچھا تو سب ساتھ ہی ایئرپورٹ چلیں گے۔ (کمرے سے چلے جاتے ہیں)

نازنیں : آپ کتنے عرصے انگلینڈ میں رہیں گے؟

عارف : ویسے پروگرام تو ایک سال کا ہے (مسکرا کر) اگر خدا نے مجھے آپ کے سایے سے محفوظ رکھا تو!

نازنیں : جی۔ کیا مطلب؟

عارف : چائے کا گھونٹ لے کر مسکراتے ہوئے) اگر امتحان ایک ہی سال میں پاس کرلیا تو ایک ہی سال بعد واپس آجاؤں گا۔

نازنیں : (کسی قدر برہم ہوکر) بس ایک سال کیا ڈیمن ہوگئی کہ آپ نے میرا مذاق بنا رکھا ہے جیسے آپ تو کبھی ڈیمن ہوئے ہی نہیں ہوں گے۔

عارف : (ہنس کر) فی الحال تو ریکارڈ میں ڈیمن ہونے کی کوئی انٹری نہیں ہے۔

نازنیں : (طنزیہ) چالاک لوگ ایسی ہی باتیں اپنا ڈیفنس تیار کرنے میں پیش کرتے ہیں۔

(ناہید مسکراتی ہے۔ عارف قہقہہ لگاتا ہے۔ پھر مسکرا کر)

عارف : آپ کا یہ کامپلی مینٹ انکل تک پہنچا دیا جائے گا۔

نازنیں : کامپلی مینٹ آپ کے لیے ہے انکل کے لیے نہیں۔ ضرور پہنچا دیجیے (کچھ دیر خاموش رہ کر) آپ سے ملنے نجمہ بھی آرہی ہیں یا نہیں؟

عارف : جی ہاں تشریف تو وہ بھی لا رہی ہیں۔

نازنیں : چلیے دو چار دن اسی کے ساتھ تفریح رہے گی۔ ہاؤ سوئٹ شی از!

عارف : پھر انگریزی کی ٹانگ توڑی۔ (ہنس کر) یوں فرمائیے۔ لذیذ ہے۔ مزیدار ہے۔ خوش ذائقہ ہے۔ یہ سوئٹ کیا؟

نازنیں : اسی انگریزی کے بل بوتے پر آپ انگلینڈ تشریف لے جارہے ہیں (کھڑے ہو کر بلند آواز سے) عبدل یہ چائے کے برتن لے جاؤ۔

(نازنیں کمرے سے چلی جاتی ہے۔ ناہید نظریں جھکائے سوئٹر بنتی رہتی ہے عارف کچھ دیر خاموش رہ کر)۔

عارف : شیڈ تو آپ نے خوب پسند کیا ہے۔

ناہید : (نظریں اٹھا کر عارف کو دیکھتی ہے پھر نظریں جھکا کر) آپ کو پسند ہے؟

عارف : پسند تو ہے مگر — (ناہید پھر نظریں اٹھا کر اسے دیکھتی ہے۔ دونوں کی نظریں ملتی ہیں۔ ناہید پھر نظریں جھکا لیتی ہے) جانے کس خوش قسمت کے لیے ہے (ناہید تھوڑا سا مسکراتی ہے مگر خاموش رہتی ہے۔ عارف کچھ دیر خاموش رہ کر) میرے انگلینڈ جانے کے بعد آپ مجھے بھول تو نہیں جائیں گی؟

ناہید : (مسکرا کر) بھولنے والی چیز ہی کو انسان بھولتا ہے۔

عارف : اور میں بھول جانے والی چیز ہوں۔

ناہید : (چند سیکنڈ خاموش رہ کر) آپ کے والد صاحب کس وقت آرہے ہیں؟

عارف : (غور سے ناہید کو دیکھ کر جو پھر نظریں جھکا کر اپنے کام میں مشغول ہو چکی ہے) رات کے ڈیڑھ بجے۔

ناہید : (نظریں اٹھا کر عارف کو دیکھ کر) اور آپ نے بتلایا تک نہیں کہ ان کے لیے کمرہ تیار کرادیا جاتا۔

عارف : اس مرتبہ میرا خیال تھا کہ وہ میرے ساتھ ہی قیام کریں۔

ناہید : ڈیڈی سے اجازت لے لی ہے۔ کہیں وہ ناراض نہ ہوجائیں۔ اور پھر یہ کسی غیر کا مکان تو ہے نہیں۔

عارف : آپ کو بلا وجہ تکلیف ہوتی۔

ناہید : اس سے پہلے بھی تکلیف ہوئی ہے جو اَب ہوگی۔ ہاں اگر وہ یہاں قیام نہیں کریں گے تو ضرور دکھ ہوگا— آپ کی والدہ بھی آرہی ہیں؟

عارف : آپ کو تو معلوم ہے کہ وہ ہارٹ پے شینٹ ہیں اتنا لمبا سفر کیسے کرسکتی ہیں۔

ناہید : یہ اچھا ہے کہ نجمہ آرہی ہے۔ اس بہانے اس سے ملاقات ہوجائے گی اور آپ کے والد کو بھی تو ایک عرصے سے نہیں دیکھا ہے۔

عارف : وہ بھی آپ کو بہت یاد کرتے ہیں (ناہید خاموش رہتی ہے اور سویٹر کو اُلٹ پلٹ کر دیکھنے لگتی ہے۔ عارف کچھ دیر خاموش رہ کر) آپ ایئرپورٹ تو آئیں گی۔

ناہید : کوشش تو کروں گی۔

عارف : صرف کوشش!

ناہید : (مسکرا کر) جی ہاں۔ اس لیے کہ کہیں آپ مجھے بداخلاق نہ سمجھ لیں۔

(نازنیں کمرے میں آکر عارف سے)

نازنیں : آپ کو انکل یاد کررہے ہیں۔

عارف : اچھا— کہاں ہیں۔

نازنیں : اپنے کمرے میں ہیں۔

(عارف کمرے سے چلا جاتا ہے۔ نازنیں واپس جانے کے لیے مڑتی ہے ناہید اسے دیکھ کر)

ناہید : نازنیں! عارف صاحب کے والد کے لیے کمرہ تیار کرادو۔ وہ آج ہی آرہے ہیں۔
نازنیں : بہت اچھا۔ (مسکرا کر) مگر بعد میں اعتراضات کی چارج شیٹ ہاتھ میں نہ تھما دیجیے گا۔ (عبدل کمرے میں آتا ہے۔ نازنیں اسے دیکھ کر) مہمانوں کا کمرہ تیار کرنا ہے (عبدل خاموشی سے چائے کے برتن اٹھا کر چلا جاتا ہے) مہاشے ایسے خاموش رہتے ہیں جیسے چوبیں گھنٹے کا مون برت رکھتے ہوں (ناہید کی طرف دیکھ کر) انھیں ریسیو کرنے اسٹیشن چلنا ہے۔
ناہید : گاڑی شاید رات کے ڈیڑھ بجے آتی ہے۔
نازنیں : رات کے ڈیڑھ بجے! انھیں کوئی اور ٹرین نہیں ملی کہ ہم بھلے آدمیوں کی طرح انھیں ریسیو کرنے جاتے۔
ناہید : (مسکرا کر) انھیں تم جیسے بھلے آدمیوں کی ضرورت نہیں ہے۔
نازنیں : تو گویا میں۔
ناہید : (ناہید بات کاٹ کر) اب جا کر کمرہ تیار کرادو۔ اور ذرا دیکھ لینا۔ آج رات کھانے کے لیے کیا تیاری ہو رہی ہے۔
نازنیں : یہ آج آپ ساری ذمہ داریاں مجھے کیوں سونپ رہی ہیں (ناہید خاموش رہتی ہے نازنیں کچھ دیر بعد) بے چارے عارف بھائی انگلینڈ چلے جائیں گے تو عجیب سونا سونا سا لگے گا۔
ناہید : (مسکرا کر) ہاں اب تم سے جھگڑنے والا کوئی نہ رہے گا۔
نازنیں : ان کے دل میں کس قدر خلوص اور پیار ہے شاید وہ نجمہ کو بھی اس قدر نہ چاہتے ہوں گے جتنا مجھے چاہتے ہیں۔ ان کی موجودگی میں کبھی یہ احساس نہیں ہوا کہ میرا کوئی بھائی نہیں ہے۔ (کچھ دیر خاموش رہ کر) گئے سال جب ہم پہاڑ پر گئے تھے تو انھوں نے ہمارے آرام کا کس قدر خیال رکھا تھا۔ نئے نئے کھیل ایجاد کرتے تھے۔ جانے کے بعد وہ کس قدر یاد آئیں گے۔ (نازنیں کی آنکھوں میں آنسو آجاتے ہیں۔ جن کو وہ اپنے دوپٹے کے پلو

سے پوچھتی ہے۔ ناہید نازنیں کو دیکھ کر)

ناہید : انسان کو اتنا جذباتی نہیں ہونا چاہیے۔ آخر وہ تمام زندگی کے لیے تھوڑا ہی جا رہے ہیں۔ دعا کرو کہ کامیاب لوٹیں۔

نازنیں : میں تو ایئرپورٹ پر انھیں سی آف کرنے نہ جاسکوں گی نہیں تو وہیں رو پڑوں گی۔

ناہید : بھئی کبھی کبھی تو تم اتنی جذباتی ہو جاتی ہو کہ دوسرے کی بھی ہمت جواب دینے لگتی ہے۔

نازنیں : ناہید آپا۔ کیا آپ کو ان کے جانے کا غم نہیں ہے۔

ناہید : تو کیا صرف آنسو بہا کر ہی غم ظاہر کیا جاتا ہے۔ آنسو پونچھ ڈالو، نہیں تو انھیں دکھ ہوگا (نازنیں آنسو پونچھ کر کھڑکی کے پاس جاتی ہے اور باہر دیکھنے لگتی ہے۔ ناہید کچھ دیر خاموش رہ کر) تم جا کر ان کے والد کے لیے کمرہ تیار کرادو۔ ہم آج کھانے پر روک لیں گے) نازنیں خاموش رہتی ہے۔ ناہید پھر سوئٹر بننے لگتی ہے۔ کچھ دیر بعد نظریں اٹھا کر) جا رہی ہو، نا!

نازنیں : جا رہی ہوں ناہید آپا۔

(جانے کے لیے مڑتی ہے کہ فاروقی صاحب اور عارف آتے ہیں۔ فاروقی صاحب ناہید سے)۔

فاروقی : بیٹی! میں نے آج عارف کو کھانے پر روک لیا ہے۔ میں کلب جا رہا ہوں ساڑھے آٹھ بجے تک واپس آجاؤں گا۔

(فاروقی صاحب دروازے کی طرف بڑھتے ہیں)

نازنیں : (مسکرا کر) انکل! من دو من نمک کا انتظام کرتے جائیے گا۔

عارف : (ہنس کر) بھئی ہم تو جس کا نمک کھاتے ہیں دل کھول کر کھاتے ہیں کہ نمک حرامی کا احتمال نہ رہے۔

(فاروقی صاحب ہنستے ہوئے کمرے سے چلے جاتے ہیں)

نازنیں : (عارف سے) فرمائیے آپ کے لیے کیا کیا انتظام کیا جائے؟

عارف : یہ تو کھلانے والے کی ہمت پر ہے۔ مہمان کیا کہہ سکتا ہے۔

نازنیں : آج آپ کی دعوت کی میں انچارج ہوں۔ ذرا میری سخاوت بھی دیکھ لیجیے۔ انگلینڈ میں بھی یاد آئے گی۔

عارف : اچھا۔ چوہے کو چندی مل گئی ہے جب ہی خود کو بزاز سمجھ رہا ہے۔

(ناہید مسکراتی ہے)

نازنیں : خیر آج چوہے کی بزازی بھی دیکھ لیجیے کیا یاد کریں گے کہ کبھی چوہا بزاز بنا تھا۔

(نازنیں ہنستی ہوئی کمرے سے چلی جاتی ہے۔ عارف خاموش کھڑا ناہید کو دیکھتا رہتا ہے جو نظریں جھکائے اپنے کام میں مشغول ہے کچھ دیر بعد نظریں اٹھا کر عارف کو دیکھ کر)

ناہید : ابھی نازنیں آپ کے جانے کے تصور ہی سے رو پڑی۔

عارف : اس کی موجودگی میں، میں تجمہ کا خیال تک بھول جاتا ہوں (کچھ دیر خاموش رہ کر ٹھنڈی سانس بھر کر) میں یہاں سے جو یادیں اور ناکامیاں لے کر جارہا ہوں وہ مجھے وہاں کس قدر ستائیں گی میں ان کا تصور ابھی سے کر رہا ہوں۔

ناہید : (غور سے عارف کا چہرہ دیکھ کر) ناکامیاں!

عارف : جی ہاں۔ انسان زندگی میں کچھ غلطیاں کرتا ہے۔ جذباتی بن کر، اور پھر ان پر اسے تمام زندگی پچھتانا پڑتا ہے۔ میں ایک مہینے سے جس ذہنی الجھن میں مبتلا ہوں آپ اس کا تصور بھی نہیں کرسکتیں۔

ناہید : ذہنی الجھن!

عارف : جی ہاں— (ٹھنڈی سانس بھر کر) میں نے اکثر آپ سے کچھ کہنا چاہا۔ مگر آپ کی خاموشی نے کچھ نہ کہنے دیا تو میں نے لکھ کر اس کا اظہار کردیا جس میں کچھ منت تھی کچھ درخواست تھی۔ یہ میری غلطی تھی میں جذباتی ہوگیا تھا۔ مجھے ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا جس سے آپ کو تکلیف ہوئی۔

ناہید : (نظریں اٹھا کر عارف کو دیکھ کر) لیکن میں نے تو ایسا کبھی نہیں سوچا کبھی

نہیں کہا۔

عارف : لیکن آپ کی اس خاموشی نے تو سب کچھ کہہ دیا۔

ناہید : ہر بات کا جواب بھی تو نہیں دیا جاتا۔

عارف : اسی لیے تو مجھے افسوس ہے۔ میں نے چاند کو پکڑنے کی کوشش کی۔ یہ نہیں سوچا کہ وہاں تک پہنچنے کی میری اوقات نہیں ہے (کچھ دیر خاموش رہ کر ٹھنڈی سانس بھر کر) آپ میرا وہ خط واپس کر دیجیے۔

(ناہید حیرت سے عارف کو دیکھتی ہے اور اس کے چہرے پر غم کے آثار پیدا ہوتے ہیں کہ نازنیں کمرے میں آکر)

نازنیں : ناہید آپا۔ نجمہ کا انتظام میں اپنے کمرے ہی میں کیے لیتی ہوں۔

ناہید : (نظریں جھکائے جھکائے) ہاں کرلو۔

(نازنیں جانے کے لیے مڑتی ہے پھر پلٹ کر عارف کو دیکھ کر جو دوسری طرف منہ کیے کھڑا ہے)

نازنیں : اے جناب! شاید آپ ناہید آپا سے جھگڑ لیے ہیں جو منہ پھلا کر ادھر کھڑے ہوگئے ہیں (عارف خاموش رہتا ہے) اجی جناب ادھر تو دیکھیے۔ (عارف مڑ کر نہیں دیکھتا۔ نازنیں چند سیکنڈ انتظار کرتی ہے پھر اس کے سامنے جا کر) ارے آپ کی آنکھوں میں آنسو۔ عارف بھائی اگر آپ کی آنکھوں میں آنسو آئے تو میں بھی رو پڑوں گی۔

عارف : (نازنیں کا کاندھا تھپ تھپا کر) نہیں نازنیں نہیں۔

نازنیں : آپ کیوں رو رہے ہیں؟

عارف : تم لوگوں سے جدا ہونے کا افسوس ہے۔

نازنیں : ایک سال کا کیا ہے چٹکی بجاتے گزر جائے گا۔

عارف : ہاں ہاں۔ مگر پھر بھی۔

(عارف تیزی سے کمرے سے چلا جاتا ہے۔ نازنیں حیرت زدہ کھڑی رہ

جاتی ہے پھر مڑ کر ناہید کو دیکھتی ہے جس کی آنکھوں میں آنسو ہیں)

ناز نیں : آپ بھی رو رہی ہیں! آخر بات کیا ہے؟

ناہید : (آنسو پونچھ کر) کوئی بات نہیں ناز نیں۔

ناز نیں : مگر—

ناہید : (بات کاٹ کر) تم نے کھانے کا انتظام کرلیا؟

ناز نیں : وہ تو ہو رہا ہے مگر—

ناہید : جاؤ تم جا کر خود دیکھ لو (ناز نیں کچھ دیر خاموش کھڑی رہتی ہے پھر کچھ سوچ کر جانے کے لیے مڑتی ہے۔ ناہید اسے جاتا ہوا دیکھ کر) تمھارا خط ہے (خط اس کی طرف بڑھا کر) لو— مگر اسے یونہی واپس کر دینا۔

ناز نیں : (خط لے کر) واپس کر دینا!

ناہید : تمھارے گھر سے نہیں آیا ہے۔ اس پر کالج کے پوسٹ آفس کی مہر ہے (ٹھنڈی سانس بھر کر) لوگ ایسے خط واپس مانگنے کے لیے لکھتے ہیں۔ (نظریں جھکا کر سویٹر ادھیڑنے لگتی ہے)

ناز نیں : ارے آپ اسے ادھیڑ رہی ہیں۔ آپ نے تو اس پر دن رات محنت کی ہے۔

ناہید : یہ ڈزائن ٹھیک نہیں ہے اب کسی اور اچھے ڈزائن سے بنوں گی۔

(ناز نیں حیرت سے اس کا چہرہ دیکھنے لگتی ہے۔ ناہید نظریں جھکائے برابر اپنے کام میں مشغول رہتی ہے)

(پردہ)

قدم قدم اُداس موڑ

افرادِ تمثیل (کردار)

(1) پروین (لیڈی ڈاکٹر) (2) ناظمہ (پروین کی چھوٹی بہن) (3) وحید بیگ (پروین کے والد) (4) آصفہ بیگم (پروین کی والدہ) (5) منظر حسین (ایک نوجوان۔ پروین کا منگیتر) (6) کلکرنی (پروفیسر آف سرجری۔ اس خاندان کا دوست)

منظر

(ڈاکٹر پروین کا ڈرائنگ روم۔ قیمتی فرنیچر سے آراستہ۔ خوبصورت پردے اور قیمتی قالین۔ کونے میں ایک ٹیبل پر ٹیلیفون رکھا ہے۔ اسی کے پاس ایک کھڑکی ہے جس سے دور تک کا منظر نظر آتا ہے۔ کمرے کی سجاوٹ سے معلوم ہوتا ہے کہ لوگ باذوق اور کھاتے پیتے ہیں۔ دن کے گیارہ بجے ہیں ناظمہ ایک گل دان کے پاس یونہی بے مقصد پھولوں کو برابر کررہی ہے کہ ڈاکٹر کلکرنی اور پروین کمرے میں آتے ہیں۔ کلکرنی ناظمہ کو دیکھ کر)

کلکرنی : ہلو ناظمہ—

ناظمہ : آداب ڈاکٹر صاحب!

کلکرنی : (مسکرا کر) خوش رہو (پروین کی طرف دیکھ کر) پروین! اب تم آرام کرو (ناظمہ کی طرف دیکھ کر) ناظمہ بیٹی۔ پروین کو آرام کی سخت ضرورت ہے۔ یہ رات بھر جاگتی رہی ہے۔

ناظمہ : بہت اچھا ڈاکٹر صاحب۔

کلکرنی : (پروین کا کاندھا تھپ تھپا کر) ڈاکٹر کو اتنا جذباتی نہیں ہونا چاہیے (مسکرا کر) اگر ہمارا اپنے جذبات پر قابو نہ ہوگا تو ہم علاج کیا کریں گے۔

پروین : اسے ہر حالت میں زندہ رہنا چاہیے ڈاکٹر صاحب۔ ہر حالت میں۔

کلکرنی : آپریشن کیا ہے خدا بہتر صورت پیدا کرے گا۔ موت اور زندگی تو خدا کے ہاتھ میں ہے۔

پروین : مگر ڈاکٹر صاحب۔

(پروین کی آواز رندھ جاتی ہے اور آنکھوں میں آنسو آجاتے ہیں کلکرنی اس کا کاندھا تھپ تھپا کر بزرگانہ انداز میں)

کلکرنی : خدا پر بھروسا رکھو ڈاکٹر۔ تم نے تین راتیں اس کے سرہانے گزار دیں اس سے بڑھ کر ایک ڈاکٹر اور کیا کرسکتا ہے (ناظمہ کی طرف دیکھ کر) دیکھو بیٹی اب اس کے آرام کا پورا بند و بست کردو (پھر پروین سے) میں نے ڈاکٹر عصمت کو پابند کردیا ہے وہ وہاں رہیں گے اور ہر گھنٹے تمھیں اطلاع دیتے رہیں گے (محبت آمیز لہجے میں) جاؤ اب تم آرام کرو۔

پروین : بہت اچھا ڈاکٹر صاحب۔

کلکرنی : اچھا۔ دیکھو آرام کرنا۔ ویسے پریشانی کی کوئی بات نہیں ہے۔

(ڈاکٹر کلکرنی کمرے سے چلا جاتا ہے۔ پروین بے چینی سے کمرے میں ٹہلنے لگتی ہے۔ ناظمہ اس کا چہرہ دیکھ کر)

ناظمہ : آپا۔ آپ آرام کیجیے۔ دیکھیے تو آپ کی آنکھیں سرخ ہورہی ہیں (پروین کوئی جواب نہیں دیتی برابر کمرے میں ٹہلتی رہتی ہے) ناظمہ کچھ دیر خاموش رہ کر)

منظر بھائی کا تار آیا ہے۔

پروین : اچھا۔

ناظمہ : وہ ابھی آنے والے ہیں۔ ابا جی انھیں ریسیو کرنے اسٹیشن گئے ہیں۔

پروین : ہوں (ریسور اٹھا کر نمبر ڈائل کرکے) ہلو— کون مس کٹی۔ میں ڈاکٹر پروین بول رہی ہوں۔ اب حالت کیسی ہے۔ بے ہوش ہے! ابھی ہوش نہیں آیا؟ ڈاکٹر عصمت موجود ہیں اچھا کوئی خاص بات ہو تو مجھے فون کرنا۔
(ریسور رکھ کر ایک آرام کرسی پر بیٹھ جاتی ہے اور آنکھیں بند کرلیتی ہے۔ ناظمہ کچھ دیر بعد)

ناظمہ : آپا۔ آپ کچھ دیر آرام کرلیجے۔ منظر بھائی کے آنے پر میں آپ کو جگا دوں گی۔

پروین : (آنکھیں کھول کر ناظمہ کو دیکھ کر) کب آرہے ہیں۔

ناظمہ : ابھی۔ ابا جی انھیں ریسیو کرنے اسٹیشن گئے ہیں (پروین خاموش رہتی ہے اور آنکھیں بند کرلیتی ہے) میں نے ان کے ٹھہرنے کا انتظام آپ کے کمرے کے پاس والے کمرے میں کردیا ہے (پروین کوئی جواب نہیں دیتی۔ ناظمہ اس کا چہرہ غور سے دیکھتے ہوئے) آخر آپا آپ کو ہو کیا گیا ہے!

پروین : کچھ نہیں ناظمہ (کھڑے ہوکر ٹہلتے ہوئے جیسے آپ اپنے سے کہہ رہی ہو) اسے زندہ رہنا چاہیے۔

ناظمہ : لیکن آپا۔

پروین : (سوچتے ہوئے) یہ ڈاکٹروں کے ساتھ ناانصافی ہے کہ مریض مرض سے لڑنا چھوڑ دے تنہا ڈاکٹر مرض سے نہیں لڑسکتا۔

ناظمہ : آپا۔ اسپتال میں ہزاروں مریض روزانہ آتے ہیں۔ ڈاکٹر ان کے لیے یوں پریشان تو نہیں ہوتے۔

پروین : ہاں ناظمہ۔ مگر یہ میری زندگی کی سب سے بڑی خواہش ہے کہ وہ زندہ رہے۔

ناظمہ : خدا آپ کی خواہش پوری کرے گا مگر—

(ٹیلی فون کی گھنٹی بجتی ہے پروین تیزی سے ریسیور اٹھاتی ہے اس کے ہاتھ کانپ رہے ہیں چہرے پر پریشانی کے آثار اور گہرے ہوجاتے ہیں)

پروین : ہلو۔ میں ڈاکٹر پروین بول رہی ہوں۔ جی (ماؤتھ پیس پر ہاتھ رکھ کر ناظمہ سے) ابا جی کہاں ہیں؟

ناظمہ : اسٹیشن گئے ہیں۔

پروین : (ماؤتھ پیس سے ہاتھ ہٹا کر) اسٹیشن گئے ہیں۔

(ریسیور رکھ دیتی ہے۔ ناظمہ پھر اس کا چہرہ دیکھ کر)

ناظمہ : کس کا فون تھا؟

پروین : جانے کس کا تھا۔ شاید ابا جی کو پوچھ رہا تھا۔

ناظمہ : آپ اس قدر پریشان ہیں کہ — آپ تھوڑی دیر آرام کر لیجیے تھکاوٹ دور ہوجائے گی (مسکرا کر) آپ کے اس طرح پریشان ہونے سے مریض اچھا تو نہیں ہوجائے گا۔

پروین : ہاں ناظمہ تم سچ کہتی ہو مگر۔ (خاموش ہوکر دروازے کی طرف بڑھتی ہے پھر مڑ کر ناظمہ کو دیکھ کر) میرا فون آئے تو فوراً مجھے اطلاع دینا۔

ناظمہ : بہت اچھا۔ (پروین دروازے کی طرف بڑھتی ہے۔ ناظمہ چند سیکنڈ خاموش رہ کر) آپا۔ (پروین مڑ کر سوالیہ نظروں سے اسے دیکھتی ہے) وہ مریض ہے کون؟

(پروین کچھ دیر اس طرح خاموش رہتی ہے جیسے جواب دینے کے لیے خود کو تیار کر رہی ہو پھر آہستہ سے)

پروین : وہ ایک لڑکی ہے۔

ناظمہ : (حیرت سے) لڑکی! (پروین اثبات میں سر ہلاتی ہے) کون ہے وہ لڑکی؟

پروین : انجم۔ (ناظمہ سوالیہ نظروں سے اسے دیکھتی رہتی ہے۔ پروین کچھ دیر خاموش رہ کر) جسے دیکھنے شاید تمھارے منظر بھائی آرہے ہیں۔

ناظمہ : (حیرت سے) اسے دیکھئے! لیکن انجم اور منظر بھائی!

پروین : کالج کے زمانے میں وہ ان کی گہری دوست تھی۔

ناظمہ : گویا وہ اس سے محبت کرتے تھے۔ مگر وہ تو آپ سے...

پروین : ہاں— مگر— شاید—

ناظمہ : کیا ان سے—

پروین : میں ان سے محبت کرتی ہوں اور اسی لیے چاہتی ہوں کہ ان کو ہر وہ چیز مل جائے جو وہ چاہتے ہیں۔

(ناظمہ حیرت سے اس کا چہرہ دیکھتی ہے۔ پروین آہستہ آہستہ قدموں سے دوسرے کمرے میں جاتی ہے۔ ناظمہ حیرت زدہ کمرے میں کھڑی رہ جاتی ہے کچھ دیر بعد آصفہ بیگم کمرے میں آکر)

آصفہ بیگم : ناظمہ (ناظمہ مڑ کر آصفہ بیگم کو دیکھتی ہے) یہاں کیا کر رہی ہو؟ منظر میاں کے لیے کمرہ تیار کرادیا؟

ناظمہ : جی ہاں۔ وہ تو کب کا تیار کرادیا ہے۔

آصفہ بیگم : پروین کہاں ہے اسپتال سے واپس آگئی۔

ناظمہ : جی ہاں، ابھی آئی ہیں۔ بہت تھکی ہوئی تھیں۔ اپنے کمرے میں آرام کرنے چلی گئی ہیں۔

آصفہ بیگم : رات ڈیوٹی کرنے کے بعد اب گیارہ بجے تک وہاں کیا کرتی رہی۔

ناظمہ : کوئی اہم کیس تھا۔ صبح آپریشن کے بعد واپس آئی ہیں۔ ڈاکٹر صاحب انھیں چھوڑنے آئے تھے۔

آصفہ بیگم : کون ڈاکٹر صاحب؟

ناظمہ : ڈاکٹر کلکرنی۔

آصفہ بیگم : (غور سے ناظمہ کا چہرہ دیکھ کر) لیکن تو اتنی پریشان کیوں ہے؟ (ناظمہ خاموش رہتی ہے) ابھی تک تیرے باپ اسٹیشن سے نہیں لوٹے (گھڑی دیکھ

کر) ساڑھے گیارہ بجنے والے ہیں۔ گیارہ بجے کا کہہ گئے تھے۔

ناظمہ : گاڑی لیٹ ہوگئی ہوگی (چند سیکنڈ خاموش رہ کر) منظر بھائی کا تار سے پہلے کوئی خط تو نہیں آیا تھا۔

آصفہ بیگم : نہیں— کیا بات ہے۔

ناظمہ : کوئی بات نہیں۔ مجھے حیرت ہے کہ اس طرح یکایک آنے کا کیا مطلب ہے؟

آصفہ بیگم : حیرت کی کیا بات ہے کئی مہینے سے نہیں آیا تھا اب فرصت ہوگی آ رہا ہے۔

ناظمہ : (سوچتے ہوئے) کیا سچ مچ وہ پروین آپا کو چاہتے ہیں؟

آصفہ بیگم : سچ مچ کی کیا بات ہے اب تو بات بھی پکی ہو چکی ہے خدا نے چاہا تو دسمبر جنوری تک شادی ہوجائے گی (ناظمہ کا چہرہ دیکھ کر) تجھے یہ فکر کیوں پڑ گئی؟

ناظمہ : کچھ نہیں امی میں نے ویسے ہی پوچھ لیا۔

آصفہ بیگم : مگر پروین ہے بہت غیر ذمے دار۔ آج تو اسے جلدی آجانا چاہیے تھا۔ اچھا ہوتا کہ وہ اپنے باپ کے ساتھ اسٹیشن چلی جاتی۔

ناظمہ : وہ اپنے فرض کو دنیا کی ہر چیز پر مقدم سمجھتی ہیں۔ ایک جاں بلب مریض کو کیسے چھوڑ سکتی تھیں۔

آصفہ بیگم : یہ تو اسپتال ہے۔ روز ہی متعدد جاں بلب مریض آتے اور جاتے رہتے ہیں اگر ڈاکٹر یونہی ان کی گنتی کرتے رہیں تو زندگی حرام ہوجائے اور ڈاکٹر خود مریض بن کر رہ جائے۔

ناظمہ : کچھ مریض ڈاکٹروں کی نظر میں خصوصی توجہ کے لائق ہوتے ہیں۔ شاید کوئی—

آصفہ بیگم : (بات کاٹ کر) اور ہاں ڈاکٹر کلکرنی کو فون کر دے کہ آج رات کھانا یہیں کھائیں منظر سے بھی ملاقات ہوجائے گی۔

ناظمہ : (فون کی طرف بڑھتے ہوئے) بہت اچھا۔

آصفہ بیگم : اور دیکھ مسز کلکرنی کا ضرور کہہ دینا (مسکرا کر) بڑھیا کی باتیں بڑے مچھے دار ہوتی ہیں۔

ناظمہ : مگر امی وہ تو خالص ویجی ٹیرین ہیں!

آصفہ بیگم : ایک دن ویجی ٹیرین کھانا ہی کھالیں گے تو کہاں کا غضب ہوجائے گا اور ہاں دیکھ آج کے انتظام کی ساری ذمے داری تیری ہے۔

ناظمہ : مگر امی۔

آصفہ بیگم : (بات کاٹ کر) میں آخر کہاں تک دیکھ بھال کرتی رہوں گی۔ تم لوگوں کو بھی تو کچھ سیکھنا چاہیے۔ تم تو آکر ایسے میز پر بیٹھ جاتی ہو جیسے مہمان ہو اور نور کمبخت سے کہہ دینا آج کھانے میں کوئی بے پروائی نہ ہو۔ اس دن ڈاکٹر عصمت کی دعوت میں سارے مرغ کا ستیاناس کردیا تھا۔

ناظمہ : (مسکرا کر) سب اس کے موڈ کی بات ہوتی ہے۔

آصفہ بیگم : ایسا بھی موڈ کیا کہ مہمانوں کے سامنے شرمندہ ہونا پڑے (باہر موٹر کا ہارن) وہ لوگ آگئے (کھڑکی سے باہر جھانکتی ہیں۔ پھر پلٹ کر ناظمہ سے) اور دیکھو منظر کے سامنے اپنی زبان پر قابو رکھنا۔ قینچی کی طرح چلتی ہے تو رُکنے کا نام نہیں لیتی۔ (کچھ دیر بعد وحید بیگم اور منظر حسین کمرے میں آتے ہیں۔ منظر، آصفہ بیگم کو جھک کر سلام کرتا ہے) خوش رہو منظر میاں۔ اچھے تو ہو۔

منظر : دعا ہے آپ کی (مسکرا کر ناظمہ کی طرف دیکھ کر) ناظمہ بیگم آپ کا مزاج کیسا ہے۔

ناظمہ : مہربانی اور دعا ہے آپ کی۔

(ناظمہ غور سے منظر کا چہرہ دیکھتی ہے جیسے اس کے چہرے پر کچھ پڑھنے کی کوشش کررہی ہو۔ منظر مسکرا کر)

منظر : کیا بات ہے (ہنس کر) کسی ڈاکٹر نے میرے چہرے پر پلاسٹک سرجری تو نہیں کی ہے!

ناظمہ : (بات ٹالنے کے انداز میں) میں دیکھ رہی تھی کہ یہ مونچھیں۔

منظر : (ہنس کر) کب اُگ آئیں۔ بھئی یہ ایک لمبی کہانی ہے پھر کبھی سنائیں گے

(مسکراتے ہوئے) بچوں کو ڈرانے کے لیے نہیں ہیں۔

وحید بیگ : پروین کہاں ہے؟

ناظمہ : ابھی ابھی اسپتال سے آئی ہیں۔ بہت تھک گئی تھیں۔ تھوڑی دیر آرام کرنے کے لیے اپنے کمرے میں چلی گئی ہیں۔

وحید بیگ : اس کو تو نائٹ ڈیوٹی تھی۔ نائٹ ڈیوٹی کے بعد تو وہ بہت سویرے آجاتی ہے۔

ناظمہ : جی ہاں کوئی اہم کیس تھا اس کے آپریشن کے بعد آئی ہیں (منظر کا چہرہ دیکھ کر) کسی اہم لڑکی کا کیس تھا۔

وحید بیگ : اہم لڑکی!

ناظمہ : (جی ہاں۔ جانے کیوں اس کے لیے بہت پریشان ہیں۔

وحید بیگ : (مسکرا کر) ہر مریض کے لیے یہ لڑکی یونہی پریشان ہوجاتی ہے کہیں خود مریض نہ ہو جائے (ناظمہ سے) جاؤ اسے منظر میاں کے آنے کی اطلاع دے دو۔

ناظمہ : بہت اچھا۔

(ناظمہ کمرے سے چلی جاتی ہے۔ آصفہ بیگم منظر کی طرف دیکھ کر)

آصفہ بیگم : منظر میاں۔ اپنے آنے کی اطلاع دو چار دن پہلے تو دی ہوتی۔

منظر : یکا یک پروگرام بن گیا (چند سیکنڈ خاموش رہ کر) میں ایک بزنس کے سلسلے میں افریقہ جارہا ہوں۔ جانے سے پہلے آپ سے ملنا ضروری تھا۔

آصفہ بیگم : افریقہ۔

منظر : ہماری فرم کو وہاں سے ایک اچھا آرڈر ملنے کی امید ہے اسی سلسلے میں جانا ضروری تھا۔

آصفہ بیگم : اس سے پہلے تو کبھی تم نے اس پروگرام کے بارے میں نہیں لکھا۔

منظر : جی ہاں۔ پروگرام یکا یک بن گیا۔ فرم کو بڑے نفع کی امید ہے۔

آصفہ بیگم : کتنے دن کا پروگرام ہے۔

منظر : ویسے تو دو مہینے کا ہے۔ اگر کام جلد ہوگیا تو جلد واپس آجاؤں گا۔ دعا کیجیے کہ مجھے اس سفر میں کامیابی ہو۔

(ناظمہ کمرے میں آکر وحید بیگ سے)

ناظمہ : ابا جی۔ آپا تو نماز پڑھ رہی ہیں۔

وحید بیگ : (حیرت سے) نماز پڑھ رہی ہیں (ہنس کر) یہ بھی خدا کی شان ہے (سوچتے ہوئے) اس وقت کون سی نماز کا وقت ہے۔

ناظمہ : (منظر کی طرف دیکھ کر) شاید اسی لڑکی کے لیے دعا کر رہی ہیں۔

وحید بیگ : (مسکرا کر) آخر وہ کون خوش قسمت لڑکی ہے جس کے لیے ڈاکٹر دوا کے ساتھ ساتھ نماز پڑھ رہا ہے دعائیں مانگ رہا ہے۔

ناظمہ : پتا نہیں (منظر کی طرف دیکھ کر) انجم نام بتلا رہی تھیں۔

وحید بیگ : (آصفہ بیگم کی طرف دیکھ کر) میں جا کر کپڑے بدلتا ہوں۔ تم منظر میاں کے آرام کا انتظام کر دو۔ تھکے ہوئے آئے ہیں۔

آصفہ بیگم : کمرہ تو ان کے لیے تیار ہے (ناظمہ کی طرف دیکھ کر) نور سے کہہ دو کہ گرم پانی غسل خانے میں رکھ دے (پھر وحید بیگ کو دیکھ کر) کھانا کس وقت کھایئے گا۔

وحید بیگ : منظر میاں نہا دھولیں — کھانا تیار ہے؟

آصفہ بیگم : کھانا تو تیار ہے اور ہاں آج شام ڈاکٹر کلکرنی کو کھانے پر بلا لیتے ہیں۔ منظر میاں سے ملاقات ہوجائے گی (منظر کی طرف دیکھ کر) بڑا بھلا اور نیک ڈاکٹر ہے پروین پر تو غیر معمولی طور پر مہربان ہے۔ میڈیکل کالج میں پروفیسر آف سرجری ہے۔

وحید بیگ : ہاں ضرور بلالو اور دیکھو مسز اور مسٹر جمیل کو بھی بلا لینا کئی دن سے ان سے ملاقات نہیں ہوئی۔

آصفہ بیگم : بہت اچھا (وحید کمرے سے چلے جاتے ہیں۔ آصفہ بیگم ناظمہ کی طرف دیکھ

کر) مسز جمیل کو فون کر دینا۔ منظر میاں کا کہہ دینا کہ آئے ہوئے ہیں۔ ڈاکٹر کلکرنی سے کہ مسز کلکرنی کو ضرور ساتھ لائیں۔

ناظمہ : بہت اچھا (منظر کی طرف دیکھ کر) لیجیے آج رات تو ساگ پات کا انتظام ہوگیا۔ (منظر سوالیہ نظروں سے دیکھتا ہے) مسز کلکرنی خالص ویجی ٹیرین ہیں۔

آصفہ بیگم : میں جا کر باورچی خانہ دیکھتی ہوں (منظر سے) منظر میاں تم بھی جلدی تیار ہو جاؤ۔

منظر : جی۔ بہت اچھا (آصفہ بیگم کمرے سے چلی جاتی ہیں۔ منظر مسکرا کر ناظمہ کو دیکھ کر) کہیے آپ نے گریجویشن تو کرلیا۔ اب کیا ارادہ ہے؟

ناظمہ : (روکھے پن سے) ایم اے میں داخلہ لے لیا ہے۔

(منظر غور سے ناظمہ کو دیکھتا ہے جیسے اسے ناظمہ کے اس روکھے پن پر حیرت ہوئی ہو۔ چند سیکنڈ خاموش رہ کر)

منظر : کس مضمون میں؟

ناظمہ : تاریخ میں۔

منظر : تاریخ سے آپ کو کافی دلچسپی ہے۔

ناظمہ : بس یونہی سمجھ لیجیے۔

منظر : (پھر غور سے ناظمہ کو دیکھ کر مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے) آپ کچھ ناراض نظر آرہی ہیں۔ میرا آنا ناگوار گزرا۔

ناظمہ : جی نہیں ایسی تو کوئی بات نہیں ہے۔

منظر : آپ کے چہرے سے معلوم ہو رہا ہے کہ آپ پریشان ہیں۔ کوئی خاص بات ہے۔

ناظمہ : جی ہاں۔ کچھ پریشانی تو ہے۔ اپنے لیے نہیں آپا کے لیے۔

منظر : آپا کے لیے۔ کیوں خیریت تو ہے!

ناظمہ : ہیں تو خیریت سے مگر۔

(منظر سوالیہ نظروں سے اسے دیکھتا ہے مگر ناظمہ خاموش رہتی ہے۔ منظر کچھ دیر بعد)

منظر : پھر ایسی کیا بات ہے جس کے لیے آپ اس قدر پریشان ہیں؟

ناظمہ : تین دن سے وہ ایک مریضہ کے لیے پریشان ہیں۔ کھانا پینا حرام کر رکھا ہے (منظر خاموش رہتا ہے۔ ناظمہ کچھ دیر بعد) انجم نام ہے اس لڑکی کا۔ آپ اسے جانتے ہیں؟

منظر : انجم! (منظر سوچنے لگتا ہے۔ چہرے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ پرانی یادوں میں کھو گیا ہو۔ ناظمہ برابر اس کا چہرہ تاکتی رہتی ہے۔ منظر آہستہ سے) انجم! (اثبات میں سر ہلا کر کسی قدر مجرمانہ لہجے میں) ہاں۔ اس نام کی اک لڑکی کو میں جانتا ہوں۔

ناظمہ : وہ اسی لڑکی کے لیے پریشان ہیں (غور سے پھر منظر کا چہرہ دیکھ کر) میرا تو خیال تھا آپ سیدھے اسپتال جائیں گے۔

منظر : (ناظمہ کا چہرہ اس طرح دیکھتا ہے جیسے اس طنز کو محسوس کرلیا ہو) ناظمہ بیگم! بعض اتفاقات زندگی کے بڑے حادثات بن جاتے ہیں (ٹھنڈی سانس بھر کر کھڑکی کے پاس جاتا ہے کھڑکی سے باہر دیکھتے ہوئے) اب جا کر بھی کیا کرتا "وہ شاخ ہی نہ رہی جس پہ آشیانہ تھا۔"

ناظمہ : (طنزیہ لہجے میں) جی نہیں شاخ تو ابھی موجود ہے۔ کوئی خونِ دل سے اسے سینچ رہا ہے۔

(منظر مڑ کر ناظمہ کو دیکھتا ہے۔ چند سیکنڈ بہت غور سے دیکھتا رہتا ہے۔ پھر آہستہ سے)

منظر : کون سینچ رہا ہے؟

ناظمہ : آپا پروین۔

منظر : پروین یا ڈاکٹر پروین!

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی چند مطبوعات

کلیاتِ میر (جلد اوّل)

مرتبین: ظل عباس عباسی، احمد محفوظ

صفحات: 318

قیمت: -/340 روپے

کلیاتِ میر (جلد دوم)

مرتبین: ظل عباس عباسی، احمد محفوظ

صفحات: 632

قیمت: -/256 روپے

کلیاتِ مُلّا رموزی (جلد اوّل۔ حصہ اوّل)

مرتب: خالد محمود

صفحات: 453

قیمت: -/151 روپے

کلیاتِ مُلّا رموزی (جلد اوّل۔ حصہ دوم)

مرتب: خالد محمود

صفحات: 444

قیمت: -/140 روپے

کلیاتِ ماجدی

مرتب: عطاء الرحمن قاسمی

صفحات: 666

قیمت: -/196 روپے

معاصر تنقیدی رویے

مصنف: ابوالکلام قاسمی

صفحات: 246

قیمت: -/84 روپے

₹ 1343/- (Set)

ISNB: 978-93-5160-072-5

9 789351 600725

राष्ट्रीय उर्दू भाषा विकास परिषद्

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

National Council for Promotion of Urdu Language

Farogh-e-Urdu Bhawan, FC- 33/9, Institutional Area,
Jasola, New Delhi-110 025